کلیاتِ پریم چند

11



مُرتبہ

مدن گوپال

قومی کونسل برائے فروغِ اُردو زبان، نئی دہلی

کلیاتِ پریم چند

11



پچاس افسانے

مرتبہ

مدن گوپال





قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل (حکومتِ ہند)
ویسٹ بلاک ا، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی

Kulliyat -e- Premchand- 11

Edited by: Madan Gopal
Project Assistant: Dr. Raheel Siddiqi
Project Coordinator: Dr. Md. Ahsan

سنہ اشاعت : اکتوبر، دسمبر 2001 شک 1923
پہلا اڈیشن :1100
قیمت :=/183
سلسلہ مطبوعات : 890

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1- آر کے پورم نئی دہلی 110066
طابع: ویپ انٹرپرائزز گرین پارک، نئی دہلی 110016

پیش لفظ

اردو زبان و ادب میں پریم چند کو خاص مقبولیت حاصل ہے۔ عرصۂ دراز سے ان کی تصانیف مختلف سطحوں کے تعلیمی نصابوں میں شامل رہی ہیں۔ ایک عرصے سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پریم چند کی تمام تصانیف کے مستند اڈیشن یکجا صورت میں منظر عام پر آئیں۔ بالآخر قومی اردو کونسل نے پریم چند کی تمام تحریروں کو "کلیاتِ پریم چند" کے عنوان سے مختلف جلدوں میں ایک مکمل سِٹ کی صورت میں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ کلیات 22 جلدوں پر مشتمل ہوگا جس میں پریم چند کے ناول، افسانے، ڈرامے، خطوط، تراجم، مضامین اور اداریے بہ اعتبار اصناف یکجا کیے جائیں گے۔ جن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

ناول: جلد1سے8 تک، افسانے: جلد9سے جلد 14 تک، ڈرامے: جلد15 وجلد 16، خطوط: جلد17، متفرقات: جلد 18 سے جلد 20 تک ، تراجم: جلد21 و جلد22 تک۔

"کلیاتِ پریم چند" میں متون کے استناد کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ مواد کی فراہمی کے لیے مختلف شہروں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا گیا ہے اور پریم چند سے متعلق شخصیتوں سے بھی ذاتی طور پر ملاقات کرکے مدد لی گئی ہے۔ اس سلسلے میں پریم چند کے پسرزاد پروفیسر آلوک رائے نے بہت سی مفید معلومات بہم پہنچائیں۔

"کلیاتِ پریم چند" کی ترتیب میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ ہر صنف کی تحریریں زمانی ترتیب کے ساتھ شاملِ اشاعت ہوں اور ہر تحریر کے آخر میں اول سنِ اشاعت، جس میں شائع ہوئی ہو، اس رسالہ کا نام اور مقامِ اشاعت بھی درج ہو۔ اس سے مطالعہ پریم چند کے نئے امکانات پیدا ہوں گے۔ ہماری کوشش ہے کہ "کلیاتِ پریم چند" میں شامل تمام تحریروں کا مستند متن قارئین تک پہنچے۔

"کلیاتِ پریم چند" کی شکل میں یہ منصوبہ نقشِ اولیں ہے ہماری پوری کوشش کے باوجود جہاں تہاں کوئی کوتاہی راہ پاسکتی ہے۔ مستقبل میں پریم چند کی نودریافت تحریروں کا خیرمقدم کیا جائے گا اور نئی اشاعت میں ان کا لحاظ رکھا جائے گا۔ کلیات سے متعلق قارئین کے مفید مشوروں کا بھی خیرمقدم کیا جائے گا۔

اردو کے اہم کلاسکی ادبی سرمایے کو شائع کرنے کا منصوبہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی ترجیحات میں شامل ہے۔ ان ادبی متون کے انتخاب اور ان کی اشاعت کا فیصلہ قومی اردو کونسل کے ادبی پینل نے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کی سربراہی میں کیا۔ ادبی پینل نے اس پروجیکٹ سے متعلق تمام بنیادی امور پر غور کرکے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے میں ہماری رہنمائی کی۔ قومی اردو کونسل ادبی پینل کے تمام ارکان کی شکرگزار ہے۔ "کلیاتِ پریم چند" کے مرتب مدن گوپال اور معاون ڈاکٹر رحیل صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پریم چند کی تحریروں کو یکجا کرنے اور انھیں ترتیب دینے میں بنیادی رول ادا کیا۔

امید ہے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی دیگر مطبوعات کی طرح "کلیاتِ پریم چند" کی بھی پذیرائی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغِ اردوزبان
وزارتِ ترقیِ انسانی وسائل، حکومتِ ہند،
نئی دہلی

فہرست

پیش گفتار

منشی پریم چند نے اپنے سوانحی مضمون ”میری کہانی“ میں لکھا کہ ان کی ادبی زندگی کی شروعات 1900 میں مضمون اور ناول سے ہوئی۔ انھوں نے اسی مضمون میں لکھا تھا کہ اپنی پہلی کہانی 1907 میں لکھی تھی اور اس کہانی کا عنوان تھا دُنیا کا سب سے انمول رتن، یہ کانپور کے رسالہ زمانہ میں چھپی تھی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کہانی زمانہ میں نہیں چھپی، یہی نہیں بلکہ اس دور کی تین اور کہانیاں بھی شیخ مخمور، یہ میرا وطن ہے، صلہ ماتم۔ جس مجموعہ میں یہ شائع ہوئی اس کی صرف ایک کہانی حبِ وطن زمانہ (اپریل 1908) میں شائع ہوئی۔ جون 1908 میں ان پانچوں کہانیوں کو سوزِ وطن مجموعے میں زمانہ پریس نے نواب رائے کے نام سے شائع کیا۔

پریم چند کے اپنے الفاظ میں، اس وقت ملک میں تقسیم بنگال کی سورش برپا تھی اور کانگریس میں گرم دل کی بنیاد پڑچکی تھی۔ ان پانچوں کہانیوں میں حب وطن کا ترانہ گایا گیا تھا۔ یہ نئے زمانے کی آمد...... دیباچے میں لکھاتھا۔ ”ہرایک قوم کا علم ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتاہے۔ جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں۔ وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہورہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصوں کے اوپر کچھ نہیں تھا۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پُرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے کے قصص وحکایات زیادہ تر اصلاحی اور تجدیدی کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے اور حب وطن کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے۔ کیوں کر ممکن تھا کہ اِس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند

کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں۔ اور یقین ہے کہ جیوں جیوں ہمارے خیال رفیع ہوجائیں گے اس رنگ کے لٹریچر کو روز افزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے جو نئ نسل کے جگر پر حبِ وطن کی عظمت کا نقطہ جمائیں"۔سوزوطن کا اشتہار اگست 1908 میں زمانہ میں شائع ہوا۔ اشتہار شاید مصنف نے آپ ہی لکھاتھا، یہ تھا۔

"سوزوطن سوزوطن سوزوطن"۔

"زمانہ کے مشہور اور مقبول مضمون نگار منشی نواب رائے کی تازہ ترین اور بہترین اردو زبان میں حُسن و عشق، وصل و فراق، عیاری و مکاری، جنگ و جدل وغیرہ کی بہت سی داستانیں موجود ہیں اور ان میں بعض بہت ہی دلچسپ ہیں۔ مگر ایسے قصے جن میں سوز وطن کی چاشنی ہو، جن میں حب وطن ایک ایک حرف سے ٹپکے، اس وقت تک معدوم تھے۔ اس کتاب میں پانچ قصے لکھے گئے اور سب دردِ وطن کے جذبات سے پُر ہیں ممکن ہے کہ انھیں پڑھ کر ناظرین کے دل میں وطن کی الفت کا پاک جذبہ موجزن ہوجائے۔ بیانیہ نہایت لطیف اور دلکش ہے اور اندازِ بیان رقت آمیز۔ سائز چھوٹا، لکھائی چھپائی عمدہ، کاغذ اعلیٰ قسم کا سودیشی قسم اول اور نیز معمولی سودیشی کاغذ پر۔ قیمت چار آنہ قسم دوم معمولی سودیشی کاغذ پر قیمت تین آنہ ۔ چھ جز کی کتاب اس قیمت پر مفت ہے۔"

فرمائش بنام منیجر زمانہ۔ نیاچوک کانپور۔

سوز وطن کے تبصرے آریہ گزٹ، سوراجیہ، ہندوستان وغیرہ میں شائع ہوئے، فروری 1909 میں نواب رائے نے سوزِ وطن کی ایک کاپی ہندی کے مشہور رسالے سرسوتی کے ایڈیٹر کو تبصرہ کے لیے بھیجی۔ ایڈیٹر مہابیرپرساد دویدی نے لکھا "اس کتاب کی رچنا اردو کے مشہور ادیب نواب رائے نے کی ہے۔ قیمت ۴/ ملنے کا پتہ بابو وجے نرائن لال نیاچوک کانپور۔" یہ وجے نرائن لال نواب رائے کے ہم عمر اور سوتیلی ماں کے بھائی تھے اور نواب رائے کے گھر پر ہی رہتے تھے۔ مصنف نواب رائے کا پتہ اس طرح پبلک کے سامنے تھا۔

سوزِ وطن زمانہ پریس میں چھپی تھی۔ غلطی سے زمانہ پریس کے نام کو کتاب پر نہیں دیاگیا ۔ اس وقت کے قانون کے تحت یہ ایک جرم تھا۔ پولیس نے تفتیش شروع کردی، اور انھیں پتہ چلاکہ کتاب کا مصنف نواب رائے ایک سرکاری ملازم ہے جس کا اصل نام ہے

دھنپت رائے ہے۔ اطلاع حکام تک پہنچی۔ ضلع کے کلکٹر نے دھنپت رائے کو طلب کیا اور جیسا پریم چند نے ''اپنی کہانی'' میں لکھا ہے۔ دھنپت رائے سے سوزِ وطن کی ہر کہانی کے بارے میں جانکاری حاصل کرکے کہا کہ ان سب کہانیوں میں Sadition (بغاوت) بھرا ہے۔ اگر تم مغل راج میں ہوتے تو تمھارے ہاتھ کاٹ دئے جاتے۔ شکرہے برٹش سرکار ہے۔ جتنی کاپیاں پڑی ہیں ان کو کلکٹر کے حوالے کردو'' دھنپت رائے کو تاکید بھی کی گئ کہ آگے سے لکھنا بند کرو۔ اگر لکھو تو سرکاری محکمے کی اجازت لے کر چھپواؤ۔

ادھر نواب رائے کے افسانوں کی شہرت اور اُدھر یہ پابندی ۔ ایک قصہ آتش کدہٗ گناہ زمانہ کے دفتر میں پڑا تھا۔ دیانرائن نگم نے اس کے مصنف کا نام نواب رائے کے بجائے افسانہ کہن رکھا۔ یہ مارچ 1910 کے زمانہ مین چھپا۔ اپریل 1910 کے شمارے میں ایک اور افسانہ چھپا۔ عنوان تھا سیر درویش اس پر مصنف کا نام نواب رائے ہی دیا گیا، مگر اپریل اور مئ کی قسطوں پر کوئی نام نہیں۔ صرف جملہ حقوق محفوظ لکھا گیا۔ اگست 1910 کے شمارے میں ایک قصہ چھپا رانی سارندھا مصنف کا نام نہیں دیا گیا۔ سرکاری حکم کی تعمیل سے بچنے کے لیے دھنپت رائے نے ایک نیا قلمی نام اختیار کیا۔ یہ تھا پریم چند۔ کیونکہ اسے دیانرائن نگم نے ہی تجویز کیا تھا۔ یہ نام صرف زمانہ کے لیے ہی محدود تھا۔ ایک نیا رسالہ ادیب نکلا تھا اس کے ایڈیٹر تھے ان کے دوست پیارے لال شاکر میرٹھی۔ اس میں مصنف کا نام اس طرح لکھا جاتا تھا۔ ''د۔ر'' (دھنپت رائے)۔

پریم چند کے نام سے شائع ہونے والی پہلی کہانی تھی بڑے گھر کی بیٹی یہ دسمبر 1910 کے زمانہ کے شمارے میں شائع ہوئی۔ نام میں کچھ جادو تھا۔ یہ قصہ دنیا بھر کی زبانوں سے ٹکر لے سکتا ہے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب دھنپت رائے بندیل کھنڈ کے کئ مقامات کا دورہ کرتے تھے۔ بندیلوں اور راجپوتوں کی بہادری کے قصے سُنتے تھے۔ انھیں قلم بند کرنے لگے۔ یہ بھی حبِ وطن کا دوسرا پہلو تھا۔ رانی سارندھا کے علاوہ وکرمادتیہ کا تیغہ، راجہ ہردول، آلہا وغیرہ قصے لکھے گئے۔ کرشمۂ انتقام زمانہ میں شائع ہوا۔ دونوں طرف سے، خوفِ رسوائی، بڑی بہن، دھوکے کی ٹٹی ادیب میں۔ منزلِ مقصود، عالم بے عمل، راج ہٹ، مامتا وغیرہ بھی انھیں دنوں چھپے۔

پریم چند کے افسانے بہت مقبول ہوئے۔ دھوم مچ گئی۔ اردو سے ہندی میں ترجمے ہوئے اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی ان کے ترجمے شائع ہونے لگے۔ پریم چند نے سوچا پچیس افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کیا جائے، وہ افسانے تھے: ماں، وکرمادتیہ کا تیغہ، بڑے گھر کی بیٹی، رانی سارندھا، راج ہٹ، راجہ ہردول، نمک کا داروغہ، عالم بے عمل، گناہ کا اگن کنڈ، بے غرض محسن، آہ بیکس، آلہا، خون سفید، صرف ایک آواز، اندھیر، بانکا زمیندار، تریا چرتر، سوت، شکاری راج کمار، کرموں کا پھل، مناؤن، مرھم، اماوس کی رات، غیرت کی کٹار، منزل مقصود، افسانے مقبول تھے مگر پبلیشروں کا قحط تھا۔ کوئی شائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ پریم چند نے فیصلہ کیا کہ اسے زمانہ پریس سے شائع کرایا جائے۔ دیانرائن سے شرکت کی بات کی۔ اگر نقصان ہوا تو آدھا آدھا۔ زمانہ پریس کو پیشگی درکار تھی مگر منیجر نے مطلع کیا کہ ان کو رسالہ سے ملنے والی رقم پیشگی رقم سے زیادہ ہے۔ خیر خط و کتابت شروع ہوئی یکم اکتوبر 1913 کو پریم چند نے دیا نرائن نگم کو لکھا "غالباً پریم پچیسی اب شب بلا تک نہ چھپ سکے گی...... اگر آپ کا پریس اتنا وقت ہی نہ نکال سکے تو میں بدرجہ مجبوری یہ التماس کروں گا کہ یا تو میرے 72 روپے عطا فرمائیں یا پریم پچیسی کے $4\frac{1}{2}$ جزو چھپے ہوئے ریل کے ذریعے میرے پاس بھیج دیں۔ غالباً ان درخواستوں میں میں غیر معقولیت سے کام نہیں لے رہا ہوں۔ میں کسی دوسرے پبلیشر کو ڈھونڈوں گا۔ اور نہ مل سکا تو اس ساڑھے چار جزو کو ٹائیٹل پیج لگاکر ساڑھے چار جزو کی کتاب بنالوں گا۔ صرف دیباچہ اور ٹائیٹل کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بھی نہ ہوسکا تو شہد اور گھی لگاکر ان اوراق پریشاں کو چاٹوں گا اور سمجھوں گا کہ زرخود میخورم، یا میوۂ محنت خود میخورم۔ بہرحال آپ جو کچھ فیصلہ کریں جلد کریں اور مجھے مطلع فرمائیں۔ قیامت کے انتظار میں بیٹھنے سے تو یہی بہتر ہے کہ جو کچھ، اس وقت ملتا ہے مل جائے"۔

اگلے ہی مہینے: "آپ میری کتاب جلدی سے چھپوا دیجیے تاکہ اس کی قدردانی دیکھ کر دوسرے حصے میں ہاتھ لگے۔ اور کچھ منافع بھی ہو۔ کیا کہوں آپ نے مجھے اچھالنے میں کوئی کسر نہیں رکھی، خوب اچھالا، مگر میں ہی قسمت کا اندھا ہوں کہ پرواز نہیں کرسکتا بلکہ نیچے گرنے کے لیے ڈرتا ہوں"۔ بعد میں پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا کہ پریم پچیسی میں نے اپنے خرچ پر زمانہ پریس سے چھپوائی تھی۔

پریم پچیسی کی کاپیوں کو اعلیٰ ادیبوں اور نقادوں کو بھیجا گیا تاکہ ان کی رائے آئے اور ان کا رسائل میں دئے جانے والے اشتہاروں میں استعمال کیا جاسکے۔ تبصرہ کے لیے بھی کاپیاں ارسال کی گئی۔ اشتہار چھپوائے گئے۔

پریم پچیسی دو حصوں میں شائع ہوئی۔ حصہ اول کو چھپنے میں تین سال لگ گئے۔ یہ 1914میں شائع ہوئی۔ الناظر لکھنؤ کے ستمبر 1915 کے شمارے میں ایک اشتہار شائع ہوا جس میں ڈاکٹر محمد اقبال کی رائے درج ہے۔ علامہ اقبال نے مصنف کو تحریر فرمایا تھا۔ ''آپ نے اس کتاب کی اشاعت سے اردو لٹریچر میں ایک نہایت قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ چھوٹے چھوٹے نتیجہ خیز افسانے جدید اردو لٹریچر کی اختراع ہیں۔ میرے خیال میں آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس راز کو سمجھا ہے اور سمجھ کر اس سے اہل ملک کو فائدہ پہنچایا ہے۔ ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف انسانی فطرت کے اسرار سے خوب واقف ہے اور اپنے مشاہدات کو ایک دلکش زبان میں ادا کرسکتاہے''۔

منشی جی کی کہانیاں مقبول تو تھیں مگر کتابی صورت میں یہ بکتی نہیں تھیں۔ 2؍مارچ 1917کو پریم چند نے دیانرائن نگم کو لکھا پریم پچیسی حصہ دوم میں ذرا سرگرمی فرمایئے...... جلدی ختم ہوجائے۔ ابھی بہت کچھ چھپوانا ہے۔ اگر پہلی منزل میں اتنا رُکے تو پھر اتنی لمبی زندگی کہاں سے آئے گی۔ تعطیل گرما کے پہلے ختم ہوجانا ضروری ہے۔

پریم پچیسی حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاؔج کو لکھا کہ اس کے چھپوانے کا کام شروع کردیا ہے۔ اور یہ یکم جولائی 1917تک پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا''۔ زمانہ کے مدیر نے لکھا ''یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ منشی پریم چند کے افسانوں نے پبلک میں کتنی شہرت حاصل کی ہے۔ یہ امر تسلیم ہے کہ صاحب موصوف کے زبردست اور عظیم قلم نے اپنے جادو بھرے قصوں میں اخلاقی اوصاف، حبِ وطن و حُسن و عشق کی بولتی چالتی تصویریں اور ان کے نہایت پاکیزہ پہلو کو نرالے ڈھنگ میں دکھائے ہیں۔ پریم پچیسی حصہ دوم میں ایسے دلچسپ اور پُراثر قصے درج کئے گئے ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شائقین جو منشی پریم چند صاحب کے جادونگار کا نتیجہ دیکھنا چاہتے ہیں قیمت ایک روپیہ''۔

پریم پچیسی کا حصہ اول 1914 میں شائع ہوا تھا حصہ دوم 1918 میں۔ ایک سال

بعد پریم چند نے نگم کو لکھا کہ "آپ کے منیجر کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ پریم پچیسی حصہ دوم کی کل 119 جلدیں نکلی ہیں۔ اس حساب سے تو شاید کتاب میری زندگی میں بھی نہ نکل سکے گی"۔

اس ناامیدی کے برعکس وہ پریم بتیسی کی اشاعت کے لیے تیار تھے۔ اگست 1919 میں نگم کو لکھا کہ "ذرا منیجر صاحب زمانہ سے دریافت کر کے مطلع کریں کہ بتیسی کی چھپائی فی جز کتنی ہوگی۔ اس معاملے میں مجھے امید ہے کہ آپ کے امکان میں جتنی رعایت ہوگی اس سے دریغ نہ فرمائیں گے"۔ تین مہینے بعد "پریم بتیسی کے مضامین کی ترتیب بھیجتا ہوں کتاب شروع کردیجیے"۔ دو حصوں میں بتیس قصے تھے: سرپُرغرور، راجپوت کی بیٹی، نگاہِ ناز، بیٹی کا دَھن، دھوکا، پچھتاوا، شعلۂ حسن، اناتھ لڑکی، پنچایت، سوت، بانگِ سحر، مرضِ مبارک، قربانی، دفتری، دو بھائی، باز یافت، بوڑھی کاکی، بینک کا دیوالا، زنجیر ہوس، سوتیلی ماں، مشعلِ ہدایت، خنجر وفا، خوابِ پریشان، راہِ خدمت، جج اکبر، آتما رام، ایمان کا فیصلہ، فتح، دُرگا کا مندر، خونِ حرمت، اصلاح اور جگنو کی چمک۔

امتیاز علی تاج کو لکھا "پریم پچیسی کے دونوں حصے خود ہی شائع کیے تھے لیکن پبلیشر اور مصنف جدا جدا ہستیاں ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ لاہور میں میرے پریم بتیسی کے لیے کوئی پبلیشر مل جائے۔ میں اپنی بتیس کہانیوں کو دو حصوں میں نکالنا چاہتا ہوں۔ دونوں حصے مل کر غالباً 500 صفحات کی کتاب ہوگی۔ اس میں سے پانچ سو جلدیں میں لاگت کی قیمت پر خرید لوں گا...... ایک اور تکلیف دیتاہوں۔ لاہور میں کتابت اور چھپائی کا نرخ کیا ہے اس سے بھی مطلع فرمائیں۔ اگر میں پریم بتیسی بارہ پاؤنڈ کے کاغذ پر چھپواؤں تو 32 جزو کی کتاب پر کیا لاگت آئے گی۔ ممکن ہے چھپائی ارزاں پڑے تو میں خود ہی جرأت کرپاؤں"۔ کچھ ہی دنوں بعد پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا "پریم بتیسی حصہ اول چھپ رہی ہے۔ غالباً دو مہینے میں تیار ہوجائے گی۔ کیا آپ پریم بتیسی کا حصہ دوم اپنے اہتمام (دارالاشاعت) سے شائع نہیں کرسکتے۔ بازارِ حسن تو ابھی معلوم نہیں کب تک تیار ہو۔ اس اثنا میں اگر بتیسی حصہ دوم آپ شائع کر سکیں تو خوب ہو۔ کچھ قصے آپ ہی کے دونوں پرچوں میں نکلے ہیں بقیہ میں دے دوں گا۔ کوئی دس جزو کی کتاب ہوگی"۔ امتیاز علی تاج حصہ دوم کی اشاعت کے لیے تیار ہوگئے۔ پریم چند نے 30 ستمبر 1919 کو لکھا "حصہ دوم کے لیے میں نے

کون کون سے قصے تجویز کیے تھے۔ ان کی فہرست مجھے بھیج دیجیے۔ مجھے یاد نہیں آتا"۔ "مسطر 21سطروں کا ہونا چاہیے اس پر حصہ اول چھپ رہا ہے۔ کاغذ میں نے حصہ اول کے لیے بیس پاؤنڈ کا لگایا ہے اگر آپ بھی یہی کاغذ لگائیں تو دونوں حصوں میں یکسانیت آجائے اور تب قیمت بھی یکساں رکھی جائے گی۔ گھٹیا کاغذ لگانا بے جوڑ ہوگا"۔ 16دسمبر1919 کے خط میں "کاغذ برا نہیں ہے۔ اس پر چھپنے دیجیے۔ چھپے ہوئے فارم ردکردینے سے نقصان ہوگا۔ میرا کاغذ ان سے کہیں بہتر ہے۔ لیکن مضائقہ نہیں۔ سستا کاغذ رہے گا تو کتاب بھی ارزاں ہوگی۔ مسطر یہی رکھا جائے مگر کاتب کو تاکید کردی جائے کہ مکالمے ہمیشہ نئ سطروں سے شروع کیا کرے"۔ چار مہینے بعد 22اپریل 1920 کو "معلوم نہیں کاغذ دستیاب ہوا یا نہیں۔ میرے ہندی پبلیشر کلکتہ سے آپ کے پاس ہر قسم کا کاغذ سُبھتے کے ساتھ بھیجنے پر آمادہ ہیں۔ نصف قیمت پیشگی درکار ہوگی۔ اگر آپ اسے منظور فرمائیں تو کاغذ آجائے گا۔" 16جون1920 "سن کر خوشی ہوئی کہ کاغذ آگیا اور پریم بتیسی کی کتابت مکمل ہوگئی اب تو اسے چھپوا بھی ڈالیں۔ حصہ اول بھی غالبًا آخر جولائی تک تیار ہوجائے گا۔جولائی تو کیا اگست آخر تک۔ حصہ اول ابھی تک دیانرائن نگم صاحب کی بے توجہی کے سبب معرض التوا میں پڑا ہوا ہے۔ مگر امید ہے کہ حصہ دوم کا شائع ہونا تازیانے کا کام دے گا۔ اور یہی میری غرض تھی"۔

دیانرائن نگم کو کاغذ کے دستیاب ہونے میں مشکلات تھیں۔ پریم چند نے 10 دسمبر 1920کو لکھا "پریم بتیسی کا ٹائیٹل ابھی لگایا یا نہیں؟ اب تو للہ دیر نہ کیجیے۔ جیسا کاغذ ملے اچھا یا بُرا بڑھیا یا گھٹیا، براؤن، کالا، پیلا، نیلا، سبز، سرخ، نارنگی، لیکن ٹائیٹل پیج چھپوا دیجیے۔ اور کتاب کی چھ سو جلدیں (قسم اول 500 قسم دوم 100) لاہور بھجوا دیجیے۔" دس دن بعد "بتیسی کا پیکٹ ملا۔ ٹائیٹل دیکھ کر رُو دیا۔ بس اور کیا لکھوں۔ کتاب کی مٹی خراب ہوگئی آپ نے بہتر کاغذ نہ پاکر وہ کاغذ استعمال کرلیا ہوگا۔ غالبًا کتاب کی تقدیر میں اس طرح بگڑنا لکھاتھا۔ خیر فی الحال چلنے دیجیے۔ لاہور والوں سے کہہ دوں گا کہ وہ ٹائیٹل بدل ڈالیں۔ آپ کے یہاں بھی اچھا کاغذ ملتے ہی ٹائیٹل بدلنا پڑے گا۔ کچھ نقصان ہوگا مگر غم نہیں"۔

پریم چند نے دیانرائن کو پھر لکھا "پریم بتیسی ابھی تیار ہوکر نہیں آئی۔ ٹائیٹل پیج میں زیادہ تردد اور جلدیں تیار ہونے کی امید نہ ہو تو آپ اس کی سات سو جلدیں بغیر

ٹائیٹل کے لاہور دفتر کہکشاں کو روانہ کردیں۔ وہ اپنا ٹائیٹل چھپواکر لگالیں گے اجرت مجھ سے وضع کرلیں گے۔"

پریم بتیسی حصہ اول کا تو یہ حال رہا ادھر حصہ دوم کے بارے میں امتیاز علی تاج کو 30اکتوبر 1920 کو لکھا "پریم بتیسی دیکھا، باغ باغ ہوگیا۔ مجھے یہ مجموعہ نہایت پسند آیا۔ کتابت اور جلی ہوتی تو بہتر ہوتا، تب قیمت اور زیادہ رکھنی پڑتی فی الجملہ کتاب خوب چھپی ہے۔ اور میں اس کے لیے آپ کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔ دیکھیں پبلک اس کی کیا قدر کرتی ہے۔ پہلا حصہ بھی شاید اس ماہ میں تیار ہوجائے۔ میں نے زمانہ کو لکھ دیا ہے کہ آپ کے یہاں پانچ سو کتابیں بھیج دیں"۔

اپنے دوست دیانرائن نگم کے زمانہ پریس سے اتنے پریشان تھے کہ جب زمانہ پریس کے منیجر نے پریم چند کو لکھا کہ پریم پچیسی کے دونوں حصے ختم ہوچکے ہیں اور انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے لیے اصرار کیا تو پریم چند نے امتیاز علی تاج کو (14ستمبر1920)لکھا کہ "میں نے عہد کرلیا ہے کہ زمانہ کی گردش میں نہیں پڑوں گا، اگر آپ اسے نکال سکیں تو بہتر ہے"۔

ستمبر 1920 میں پریم چند نے تاج صاحب کو ایک قصہ بھیجا تھا عنوان تھا دفتری اسی خط میں تاج کو مطلع کیا کہ یہ قصہ پریم چالیسی کا پہلا قصہ ہوگا۔چالیسی کی اشاعت نو سال بعد ہوسکی نہ تو زمانہ پریس سے نہ ہی دارالاشاعت سے، اسے گیلانی الیکٹرک پریس لاہور کے مالک سعید مبارک علی نے شائع کیا۔ انھوں نے خود پریم چند سے لکھنؤ میں ملاقات کی اور سوزِ وطن اور پریم چالیسی کے لیے اجازت مانگی اور یہ بھی پوچھا کہ صفحے میں کتنی سطریں ہوں۔ پریم چالیسی کے بارے میں اب مزید معلومات نہیں ہے۔ بس یہی معلوم ہے کہ پریم چالیسی 1930 میں دوحصوں میں شائع ہوئی۔ اس میں شائع ہوئے قصےّ یوں ہیں: حصہ اول میں:۔ چوری، قزاقی، انتقام، رام لیلا، دین داری، سہاگ کا جنازہ، داروغہ کی سرگزشت، خانۂ برباد، کشمکش، الزام ،منتر، انسان کا مقدس فرض، استعفٰا، کفارہ، دیوی، قوم کا خادم، ترسول، مندر، نُہنی، آنسوؤں کی ہولی۔ حصہ دوم میں:۔ مجبوری، چکمہ، ابھاگن، حسرت، دیوی، جنت کی دیوی، سزا، دو سکھیاں، ماں، بیوی سے شوہر، پوس کی رات، جلوس، لیلےٰ، حرزجاں، مزارالفت، عفو، جہاد، امتحان، بند دروازہ۔

اس سے قبل پریم چند نے نگم کو 29اگست 1928 کے خط میں لکھا: ''اپنی کہانیوں کے ایک مجموعہ کو میں نے یہاں خود چھپوانا شروع کیا ہے۔ دس فارم چھپ گئے ہیں شاید ایک فارم اور ہو۔ اس کا نام رکھا ہے خاک پروانہ۔ اس میں سولہ کہانیاں ہیں: کپتان، خاک پروانہ، ملاپ، بڑے بابو، فکردنیا، ستیاگرہ، تالیف، مستعار گھڑی، نغمۂ روح، علٰحیدگی، عجیب ہولی، دعوت، مزار آتشیں، خودی، تحریک، نادان دوست۔ زمانہ کے اکتوبر نومبر 1928 شمارہ میں اشتہار تھا اور فروری 1929 میں تبصرہ۔

اسی سال (1928 میں ہی)خواب و خیال کے نام سے ایک مجموعہ لاہور کے لاجپت رائے اینڈ سنز نے شائع کیا۔ اس میں مندرجہ ذیل چودہ کہانیاں تھیں: نوک جھونک، دست غیب، لال فیتہ، موٹھ، شطرنج کی بازی، مایۂ تفریح، نخل امید، فلسفی کی محبت، فتح، عبرت، خودی، دعوتِ شیراز، شدھی، ستی۔

اسی سال ایک اور مجموعہ، انڈین پریس آلہ آباد سے چھپوایا۔ یہ تھا فردوسِ خیال، اس میں بارہ افسانے تھے: نزولِ برق، بھوت، توبہ، ڈگری کے روپے، تہذیب کا راز، بھاڑے کا ٹٹو، راہِ نجات، سواسیر گیہوں، لیلیٰ، عفو، مریدی، نیک بختی کے تازیانے۔ 23 اپریل 1930دیانرائن نگم کو لکھے خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی سے اردو میں ترجمہ پریم چند نے خود کیا۔

مارچ 1934 نرائن دت سہگل نے لاہور سے تیرہ کہانیوں کا مجموعہ ''آخری تحفہ'' شائع کیا۔ قصے تھے: جیل، آخری تحفہ، طلوع محبت، دو بیل، ادیب کی عزت، ڈیمانسٹریشن، نجات، شکار، آخری حیلہ، قاتل، وفا کی دیوی، برات، ستی۔

اردوگھر دہلی سے 1936میں ''زادِ راہ'' شائع ہوا۔ اس میں پندرہ کہانیاں تھیں: آشیاں برباد، ڈامُل کا قیدی، قہرخدا کا، بڑے بھائی صاحب، لعنت، لاٹری، خانہ داماد، فریب، زیور کا ڈبّہ، وفا کی دیوی، زادِ راہ، مِس پدما، حقیقت، ہولی کی چھٹی۔

عصمت ڈپو دلّی نے پریم چند کی وفات کے بعد 1937 میں ''دودھ کی قیمت'' شائع کیا، اس میں نو کہانیاں ہیں: عصمت، کُسم، وفا کا دیوتا، اکسیر، عیدگاہ، سکون قلب، ریاست کا دیوان، دودھ کی قیمت، زاویہ نگاہ۔

پریم چند نے 19مارچ 1935 کو حسام الدین غوری کو لکھا تھا ''واردات چھپ

رہاہے۔" اس میں تیرہ افسانے ہیں: گلی ڈنڈا، مفت کرم داشتن، بدنصیب ماں، انصاف کی پولس، بیوی، مالکن، شکوہ شکایت، روشنی، معصوم بچہ، سوانگ، شانتی، قاتل کی ماں، غم نداری بُز بخر۔

اپنی وفات سے تین سال پہلے پریم چند نے"میرے بہترین افسانے" (جو کتاب منزل کشمیری گیٹ۔ لاہور 1933 نے شائع کی تھی) کے دیباچہ میں لکھا:"میرے دوست مدت سے مصر تھے کہ میں اپنی کہانیوں کا ایک ایسا نمائندہ مجموعہ منتخب کروں جس کے مطالعہ سے لوگ زندگی کے متعلق میرے نظریات معلوم کرسکیں۔ یہ انتخاب اس مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے تیار کیا گیا ہے۔ اس میں میں نے محض ان کہانیوں کو چنا ہے جنھیں میں پسند کرتا ہوں اور جنھیں جدا جدا نوعیت کے نقادوں نے بھی سراہا ہے۔" یہ کہانیاں ہیں: راہِ نجات، منتر، مہا تیرتھ، پنچ پر میشور، رانی سارندھا، دو بیل، شطرنج کی بازی، ستی، پرائشچت، سجان بھگت۔

واردات کے بعد پریم چند کے قصوں کا کوئی مصدقہ مجموعہ شائع نہیں ہوا۔1978 میں میں نے تیس قصوں کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ کو اشاعت کے لیے دیا تھا۔ کاپی رائٹ کی وجہ سے یہ کئی سال تک شائع نہیں ہوسکا، تب میں نے اسے واپس لے کر سٹار پبلیشر کو دے دیا کچھ سال بعد پتہ چلا کہ وہ مسودہ گم ہوگیا۔ اس میں بہت سی وہ کہانیاں تھی جو گویئنکا کے اپراپتیہ ساہتیہ میں پیش کی گئی ہیں ایک کہانی تھی اشکِ ندامت، وہ کہانی اب دستیاب نہیں ہے۔

کچھ محققین نے "داراشکوہ کا دربار" کو افسانوں میں شامل کرنا چاہا ہے۔ ستمبر 1908 میں لاہور کے ماہ وار رسالہ آزاد میں شائع ہوا یہ افسانہ نہیں انشائیہ ہے۔ پریم چند تاریخی واقعات کو موضوع بناکر افسانے ضرور لکھتے تھے جیسے امتحان، نزول برق، دل کی رانی، زنجیرِ ہوس، مگر ان سب میں وہ ڈرامائی کیفیت پیدا کردیتے تھے۔ مگر داراشکوہ کا دربار میں مغل بادشاہ شاہ جہاں کے فرزند عظیم کی زندگی کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ تو مضمون ایسے ہی ہے جیسے پریم چند کا کراوم ویل پر مضمون۔ اسے اس مجموعہ میں شامل نہیں کیا جارہا ہے۔

1907 میں نواب رائے کا شائع ہونے والا ایک قصہ تھا روٹھی رانی یہ ہندی سے ترجمہ تھا کیونکہ اس کے آخر میں لکھا تھا "ماخوذ و ترجمہ از ہندی نواب رائے" اس قصہ کے

مصنف تھے منشی دیوی پرساد ساکن جودھپور، ان کے والد اجمیر کی درگاہ کے نائب رہ چکے تھے۔ دیوی پرساد فارسی اور ہندی کے مصنف تھے ریاست جودھپور میں ہندی کو سرکاری زبان قرار دلوایا تھا۔ تقریباً ساٹھ ہندی کتابوں کے مصنف تھے۔ مغل باشاہ اور راجستھان کے مہاراجاؤں پر کتابیں لکھی تھیں۔ ایک کتاب کا عنوان تھا روٹھی رانی۔ منشی دھنپت رائے جو نواب رائے کے نام سے رسائل میں لکھتے تھے (اور آگے چل کر پریم چند بنے) اس کتاب سے متاثر ہوئے اور اس کا اردو ترجمہ کرکے اسے زمانہ کے اپریل تا اگست 1907 کے شماروں میں شائع کرایا۔ مدیر دیا نرائن نگم نے اسے قصہ کا خطاب دیا ہے۔ اور اسے ایک کتابچہ کی شکل میں بھی چھاپ کر زمانے کے دفتر سے فروخت بھی کیا تھا۔ اس کے ٹائٹل پر بھی لکھا تھا، ''ایک قصہ'' میں نے یہ معلومات اپنی کتاب پریم چند لٹریری بایو گرافی میں پیش کی تھی۔ امرت رائے نے روٹھی رانی کو ایک ناول قرار کرکے منگلا چرن میں شائع کیا۔ حالانکہ زمانہ میں کوئی ناول شائع نہیں ہوا۔میں بھی دیا نرائن نگم کی طرح روٹھی رانی کو قصہ مانتا ہوں اور اسے پریم پچاسا میں شامل کیا ہے۔

پریم چند کے جو قصے اردو اور ہندی میں شائع ہوئے ہیں ان کی اشاعت کے بارے میں کچھ باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ ۔ایک دلچسپ امر یہ ہے کہ وفات سے دس پندرہ سال پہلے پریم چند نے لگ بھگ دس افسانے لکھے، جن کا تعلق ان کے بچپن یا معلّمی کے زمانے کے تجربات سے تعلق رکھتے تھے۔ قزاقی، بڑے بھائی صاحب، چوری، گلی ڈنڈا، میری پہلی رچنا، ہولی کی چھٹی، میری کہانی، آپ بیتی، ڈھپورسنکھ، لال فیتہ، مفت کرم داشتن، لائٹری وغیرہ۔

عام طور پر پریم چند کے قصے 10، 15 صفحات کے ہوتے تھے مگر کچھ قصے ایسے بھی ہیں جن کی ضخامت 50 ، 60 صفحات ہیں، روٹھی رانی، دو سکھیاں وغیرہ۔ کچھ کہانیاں اتنی چھوٹی ہیں کہ کہانی لفظ کا استعمال زیب نہیں دیتا۔ جیسے بانسری (یہ صرف 8 یا 10 لائنس کی کہانی ہے) کہکشاں لاہور کے جس شمارہ میں یہ کہانی چھپی تھی اس کی فہرست میں لکھا تھا بانسری۔ (کہانی مصنف پریم چند) گیلانی الکٹرانک پریس کے مالک سید مبارک شاہ گیلانی نے 1941میں راقم الحروف کو بتلایا تھا کہ جب پریم چالیسی چھپ رہی تھی تو انھوں نے پریم چند کو ایک خط لکھا کہ فارم چھپ رہا ہے دو صفحے خالی ہیں، کچھ لکھ دیجیے، اور پریم چند نے دو صفحے کی کہانی لکھ دی۔ شاید اس کہانی کا عنوان تھا، دیوی۔ ایک دوسری

تھی قوم کا خادم، نادان دوست بھی اسی صف میں آتی ہیں۔

ابتدائی دور سے پریم چند کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا۔ رابندرناتھ ٹیگور کی کہانیوں کے اردو ترجمے کیے تھے اور شائع کرائے تھے۔ ان کی تفصیل دستیاب نہیں ہے ٹالسٹائی کی بیس سے زیادہ کہانیوں کے ترجمے بھی کیے۔ کچھ کہانیاں بچوں کے لیے ہیں۔ جیسے جنگل کی کہانیاں یا کتے کی کہانی۔ ان کہانیوں کو ان کے افسانوں میں شامل نہیں کیا گیا۔ پریم پچاسا کی چھ جلدوں میں ایک درجن سے زائد افسانے ایسے ہیں جو انگریزی اور بنگلہ کے افسانوں کے ترجمے ہیں۔ ان افسانوں کے ترجموں کو مجموعہ میں شامل کیا ہے کچھ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہیں۔ پریم چند کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ ایک میٹرک پاس اسکول ماسٹر بندیل کھنڈ کے جنگلوں میں بسے، گاؤں یا چھوٹے قصبوں میں اسکول کا معائنہ کرنے والا کہاں سے ڈکنس، ہاتھرن اوسکروائلڈ، ٹیگور کو تلاش کرکے پڑھتا اور افسانے لکھتا تھا۔ انگریزی کی کتابوں کے علاوہ وہ روسی اور فرانسیسی مصنفوں کی کتابوں کے انگریزی ترجمے پڑھتے اگر ان کہانیوں سے متاثر ہوتے تو ان کے پلاٹ کو لے کر اردو میں کہانی لکھ تو ڈالتے۔ مگر انھوں نے ذکر نہ کیا کہ یہ افسانے کہاں سے ماخوذ ہیں۔ عام طور پر ترجموں کے اختتام پر پریم چند یا نواب رائے یا د۔ ر۔ لکھتے تھے مگر اصل مصنف کا نام نہیں دیتے تھے۔ سگِ لیلیٰ میں کرداروں کے نام وہی ہیں جو اصل افسانے میں ہے مگر یہ افسانہ کس کا لکھا ہے اس کی کوئی جانکاری نہیں۔ کبھی ماحول بدیشی ہوتا کبھی ہندستانی، چارلس ڈکنس کی ایک کہانی کے کردار سے متاثر ہوکر اشکِ ندامت لکھی اس کے کردار بدیشی ہیں۔ کبھی کبھی بنگلہ کہانیوں کے ہندی ترجمے کو لے کر اسے اردو میں لکھ ڈالتے۔ جیسے دھوکے کی ٹٹی، خوفِ رسوائی، اپنے فن کا استاد، قاتل، یہ بالکل ترجمے نہیں تھے بنگلہ (ہندی ترجمے) تھیم کو لے کر لکھتے۔ اور ان کہانیوں کو صرف اردو رسائل میں ہی چھپواتے تھے۔ رتن ناتھ سرشار کی سیر کہسار کو ہندی میں پروت یاترا کے نام سے لکھا۔ یہ کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوا۔ پریم چند نے امتیاز علی تاج کو لکھا تھا کہ اشکِ ندامت اور آبِ حیات کے بعد وہ ترجمہ نہیں کریں گے۔ حقیقت برعکس ہے انھیں جب کوئی افسانہ اچھا لگتا تھا تو اس کے بنا پر افسانہ لکھ کر رسائل کو بھیج دیتے ایک بار قبول کیا کہ انھوں نے Eternal city کے ایک جزو سے متاثر ہوکر ایک کہانی وشواس لکھی ہے۔ ایک روسی فنکار کنپین سیو جنھوں نے پریم چند کا

ہندی میں مطالعہ کیا تھا۔ مجھے 1950 میں بتایا تھا کہ پریم چند کی ایک کہانی گورکی کی کہانی تھی۔ نام یاد نہیں آرہا ہے مگر "ییلو" لفظ اس میں تھا۔

قارئین کو مدنظر رکھتے ہوئے پریم چند کرداروں کے نام بدل دیتے تھے۔کہکشاں میں ایک افسانہ حجِ اکبر شائع ہوا تھا اس میں کردار تھے صابر حسین، شاکرہ نصیر عباسی جب یہ ہندی میں شائع ہوا تو کردار تھے۔ رودمنی، سکھدا، کیلاسی۔ دو بھائی جو زمانہ میں شائع ہوئی تھی اس کے کردار تھے کرشن، بلدیو، واسودیو، یشودھا، رادھا اس پر دوستوں نے اعتراض کیا۔ ایڈیٹر کو خط لکھ کر صفائی پیش کی۔ جب یہ کہانی ہندی رسائل میں چھپی تو کرداروں کے نئے نام تھے۔شیودت، کیدار، کلاوتی، مادھو وغیرہ۔ ایک کہانی آتما رام کے متعلق کہکشاں کے مدیر امتیاز علی تاج کو لکھا۔ "یہ اس قدر ہندو ہوگئی ہے کہ کہکشاں کے لائق نہیں آپ خود ہندو سہی مگر آپ کے ناظرین تو ہندو نہیں۔"

عام طور پر پریم چند کہانی کا خاکہ اردو یا انگریزی میں بناتے پھر اس بنیاد پر کہانی لکھتے۔ بعد میں ترجمے کرواتے یا خود کرتے اور رسائل میں بھیجنے سے پہلے کچھ ترمیم و اضافہ بھی کردیتے تھے۔ ڈاٹل کا قیدی کا خاکہ انگریزی میں ہے۔

1921 کے بعد پریم چند کے زیادہ افسانے ہندی میں شائع ہوتے پھر ان کا ترجمہ رسائل یا اخبار میں شائع کراتے۔ کبھی ترجمے خراب ہوتے، کبھی کبھی ان کے ہندی کے افسانوں کا اردو میں ترجمہ بغیر اجازت کردیا جاتا۔ جو اصل افسانے سے مختلف ہوتا۔ اکتوبر 1922 کو دیا نرائن نگم کو ایک خط میں لکھا "زمانہ کے لیے ایک مضمون لکھا اس کا ہندی ترجمہ کلکتہ کے ایک رسالے میں نکلا تھا۔ میں نے مضمون صاف کیا مگر ہندی میں نکلنے کے تیسرے دن ہی اس کا ترجمہ لاہور کے پرتاب میں نظر آیا...... حالانکہ لاہوری ترجمہ بالکل بھدا ہے مگر قصہ تو وہی ہے۔ اب کچھ اور لکھوں گا۔" آخری تحفہ میں ایک افسانہ ہے وفا کی دیوی یہ ہندی کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ زبان بھی پریم چند کی نہیں ہے اور انھیں شاید اس کا علم بھی نہیں تھا یہی کیفیت کچھ اور قصوں کی بھی ہوسکتی ہے۔ ایک محقق کے مطابق پنجابی ناشروں نے ایک اور پریم چند (ایم اے) کے افسانوں کے سترہ 17 مجموعے شائع کیے۔

ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ پریم چند کو افسانہ نگاری میں غیر معمولی کامیابی حاصل

ہوئی تھی، اردو ہندی رسالوں سے فرمائش آتی رہتی تھی۔ پریم چند قصہ لکھتے۔ رسالہ کو بھیج
دیتے، یہ چھپ جاتا، رسالہ کی کاپی آتی، اسے دیکھتے۔ دوست اور احباب پڑھنے کے لیے لے
جاتے اس کی تعریف ہوتی اور پریم چند بھول جاتے کون لے گیا۔ عام طور پر واپس بھی
کوئی نہ کرتا تھا، مگر انھیں تو اس کی اشاعت اور معاوضہ کی فکر تھی معاوضہ آیا بات ختم
ہوگئی۔ جب نئے مجموعے کی اشاعت کی بات شروع ہوتی تب دماغ پر زور ڈالا جاتا۔ اگر قصہ
یاد آگیا اور قصہ دستیاب نہیں ہوتا تو ایڈیٹر کو نقل کے لکھتے۔ اگر قصہ یاد نہیں رہا تو اسے
اس مجموعے میں شامل نہیں کیا جاسکا۔ اور جب یاد آگیا تو اس کی نقل یا اس کی کاپی کرواکر
کسی رسالے کو بھیج دیتے اور پھر بعد کے مجموعے میں شامل کرلیتے۔ ایک دو مثال پیش کرنا
چاہوں گا۔

جون 1910 کے زمانہ میں ایک قصہ چھپا شکار، جب پریم پچیسی یا پریم بتیسی کے لیے
قصے اکٹھے کررہے تھے تو اس کا دھیان نہیں آیا، اکتوبر 1931 میں اُسے چندن میں شائع
کروایا اور اسے آخری تحفہ میں شامل کیاگیا۔ ایک اور کہانی تھی ملاپ، یہ زمانہ جون1913
میں شائع ہوئی تھی۔ پندرہ سال بعد اسے خاکِ پروانہ میں شامل کیا گیا۔ ایک افسانہ دونوں
طرف سے زمانہ مارچ 1911 میں شائع ہوئی۔ کسی مجموعہ میں نہیں ہے۔

بعض اوقات قصہ کا عنوان بھی بدل دیتے تھے۔ ایک کہانی تھی دوا اور دارو ۔اس کا
نام بدل کر کپتان کردیا۔ شامتِ اعمال کو بدل کر خاکِ پروانہ کردیا۔ موت اور زندگی کی جگہ
امرت، حُسن و شباب کو بدل کر کشمکش نام دیاگیا، ہندی میں آگا پیچھا، سکونِ قلب کو بدل کر
شانتی۔ زمانہ میں شائع کہانی معمہ کو بدل کرسمسیا کردیا۔ ایک مجموعے میں وِشم سمسیا بھی اسی کا
نام رکھا۔

پریم چند کوشش کرتے کہ افسانے کو اردو اور ہندی رسائل کو ایک ساتھ ہی بھیجتے۔
اردو سے ہندی اور ہندی سے اردو میں ترجمہ خود کرتے یا کسی شاگرد یا دوست سے کرواکر
رسالوں کو بھیج دیتے تھے۔ ایک بار نگم کو لکھا کہ ترجمہ اقبال ورما سحر ہنگامی سے کروا لیں۔

جب پریم چند نے سرکاری نوکری سے عدم تشدد کے بعد نوکری سے استعفا دے دیا
تو ان کی آمدنی کا اہم ذریعہ افسانے ہی تھے۔ ناول سے انھیں بہت کچھ نہیں ملا، نہ ہی
افسانوں کے مجموعوں سے۔ ان کا گذر رسالوں میں چھپے قصوں پر ہی ہوتا تھا۔ معقول رقم

ملتی تھی۔ پہلے پانچ روپیہ، پھر دس روپیہ پھر بیس، رسالوں میں ہوڑ تھی اور پریم چند قصوں کے معاوضے کے بارے میں سودے بازی سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ہمدرد کے مدیر مولانا محمد علی انھیں ایک قصہ کے لیے ایک گنّی پیش کرتے تھے اور اُسے باقاعدہ پیکٹ میں رکھ کر بھیجتے تھے۔

پریم چند کے اردو ہندی افسانوں کا تقابلی مطالعہ میں نے1957 میں کیا تھا اور دو حصوں میں ایک فہرست تیار کی تھی جس میں یہ بتایا گیا کہ کون سا افسانہ کب اور کہاں ہندی، اردو میں شائع ہوا اور کس مجموعہ میں شامل ہے۔ اس کی ایک کاپی گوئنکا لے گئے تھے دوسری میرے پاس ابھی تک محفوظ ہے لیکن آج تک شائع نہ کراسکا۔ 1962 میں امرت رائے نے صرف 224 ہندی افسانوں کی فہرست پیش کی تھی اس کے سات سال بعد ڈاکٹر جعفر رضا نے ایک فہرست تیار کی تھی پھر شیلس زیدی نے بھی ایک فہرست شائع کی، مگر کسی بھی فہرست میں مکمل اور مستند جانکاری نہیں ہے۔ قصوں کے عنوان بدلنے کی وجہ سے اور ترجمہ میں ترمیم کی وجہ سے ہندی اور اردو میں قصوں کے تقابل میں کافی دقتیں پیش آتی ہیں کیوں کہ کچھ رسالوں کو چھوڑ کر باقی کی زندگی پانچ سال سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ سید علی اکبر اکبرآبادی نے 1910 میں آگرہ سے ادیب نکالا جو صرف ایک سال چلا پھر نوبت رائے نظر نے اسی نام سے الہ آباد سے رسالہ شائع کیا یہ تین سال چلا۔ لکھنؤ سے چکبست نے 1918 میں صبح امید نکالا 1926میں ان کی وفات ہوئی۔ سدرشن نے لاہور سے چندن نکالا جو کچھ ہی سال چلا۔ زمانہ ہی ایک ایسا رسالہ تھا جس کو 1902میں شیوبرت لال برمن نے شروع کیا اور 1903 میں نگم کو دے کر سنیاسی ہوگئے۔ اسے دیانرائن نگم اور پھر ان کے فرزند نے 1948 تک نکالا۔ زمانہ کی فائلیں کچھ لائبریریوں میں دستیاب تو ہیں مگر سب شمارے مشکل سے ملتے ہیں کچھ شماروں سے صفحات بھی غائب ہیں۔ دوسرے کم عمر رسالوں کی فائلوں کے بارے میں میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ پُرانے رسالوں کی فائلیں جنھیں میں نے پچاس سال پہلے دیکھی تھی اب غائب ہیں۔ اس لیے حواشی میں ساری تفصیلات ممکن نہیں ہیں۔ آج ادیب، العصر، کہکشاں، عصمت، ذخیرہ، نیرنگ خیال، صبح امید، ہمدرد، آزاد، تہذیب نسواں، پھول، ہزار داستان کے شماروں کی عدم موجودگی میں سارے قصص کی نقل اور ترتیب کا کام آسان نہیں ہے۔

ہندی میں پریم چند کی حیات میں ان کی بہت سی کتابوں کے دوسرے ایڈیشن نہیں شائع ہوئے۔ بعد کے کچھ ایڈیشنوں میں سنِ اشاعت نہیں دیا گیا۔ ہندی میں مانسروور کی جن جلدوں کی تفصیل پریم پچاسا میں دی گئی ہے وہ ہنس پرکاشن کے ایڈیشن ہیں کیوں کہ امرت رائے نے مستند ایڈیشن شائع کرنے کی کوشش کی ہے ۔ ڈاکٹر کمل کشور گوئنکا نے ہندی میں اور جعفر رضا نے اردو میں تسلیم کیا ہے کہ لگ بھگ پچیس تیس قصے ایسے ہیں جن کی پہلی اشاعت کی تفصیل دستیاب نہیں ہے پھر بھی تحقیق کا کام جاری ہے۔

پریم چند قصے کیسے لکھتے تھے۔ اس بارے میں ان کے ایک خط کو پڑھیے جسے انھوں نے فروری 1934 میں نے نیرنگ خیال کے ایڈیٹر کو لکھا تھا:

"میرے قصے اکثر کسی نہ کسی مشاہدہ یا تجربہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس میں میں ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر محض واقعہ کے اظہار کے لیے میں کہانیاں نہیں لکھتا۔ میں اسی میں کسی فلسفیانہ یا جذباتی حقیقت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔ جب تک اس قسم کی کوئی بنیاد نہیں ملتی میرا قلم ہی نہیں اُٹھتا۔ زمین تیار ہونے پر میں کیرکٹروں کی تخلیق کرتا ہوں بعض اوقات تاریخ کے مطالعہ سے بھی پلاٹ مل جاتے ہیں۔ لیکن کوئی واقعہ افسانہ نہیں ہوتا تاوقتیکہ وہ کسی نفسیاتی حقیقت کا اظہار نہ کرے۔

میں جب تک کوئی افسانہ اول سے آخر تک ذہن میں نہ جما لوں لکھنے نہیں بیٹھتا۔ کیرکٹروں کا اختراع اس اعتبار سے کرتا ہوں کہ افسانے کے حسبِ حال ہوں۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ افسانے کی بنیاد کسی پُرلطف واقعہ پر رکھوں۔ اگر افسانے میں نفسیاتی کلائمکس موجود ہوں تو خواہ وہ کسی واقعہ سے تعلق رکھتا ہو میں اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ ابھی میں نے ہندی میں ایک افسانہ لکھا ہے جس کا نام ہے "دل کی رانی" میں نے تاریخ اسلام میں تیمور کی زندگی کا ایک واقعہ پڑھا تھا جس میں حمیدہ بیگم سے اس کی شادی کا ذکر ہے۔ مجھے فوراً اس تاریخی واقعہ کے ڈرامائی پہلو کا خیال آیا۔ تاریخ ٹیں کلائمکس کیسے پیدا ہو۔ اس کی فکر ہوئی۔ حمیدہ بیگم نے بچپن میں اپنے باپ سے فنِ حرب کی تعلیم پائی تھی اور میدانِ جنگ میں کچھ تجربہ بھی حاصل کیا تھا۔ تیمور نے ہزارہا ترکوں کو قتل کردیا تھا۔ ایسے دشمنِ قوم سے ایک ترک عورت کس طرح مانوس ہوئی؟ یہ عقدہ حل ہونے سے کلائمکس نکل آتا ہے۔ تیمور وجیہہ نہ تھا۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ اس میں ایسے اخلاقی و جذباتی محاسن

پیدا کئے جائیں جو ایک عالی نفس خاتون کو اس کی طرف مائل کرسکیں۔ اس طرح وہ قصہ تیار ہوگیا۔

کبھی کبھی سُنے سُنائے واقعات ایسے ہوتے کہ ان پر افسانہ کی بنیاد آسانی سے رکھی جاسکتی ہے۔ لیکن کوئی واقعہ محض لچھے دار اور چست عبارت میں لکھنے اور انشاپردازانہ کمالات کی بنیاد پر افسانہ نہیں ہوتا۔ میں ان میں کلائمکس لازمی چیز سمجھتا ہوں اور وہ بھی نفسیاتی۔ یہ بھی ضروری ہے کہ افسانے کے مدارج اس طرح قائم کئے جائیں کہ کلائمکس قریب تر آتا جائے۔ جب کوئی ایسا موقع آجاتا ہے۔ جہاں ذرا طبیعت پر زور ڈال کر ادبی یا شاعرانہ کیفیت پیدا کی جاسکتی ہے تو میں اس موقعہ سے ضرور فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہی کیفیت افسانے کی روح ہے۔

میں سست رفتار بھی ہوں۔ مہینے بھر میں شاید میں دو افسانے سے زیادہ نہیں لکھے۔ بعض اوقات تو مہینوں کوئی افسانہ نہیں لکھتا۔ واقعہ اور کیریکٹر تو سب مل جاتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی بنیاد بمشکل ملتی ہے۔ یہ مسئلہ حل ہوجانے پر افسانہ لکھنے میں دیر نہیں لگتی۔ مگر ان چند سطور سے افسانہ نویسی کے حقائق نہیں بیان کرسکتا۔ یہ ایک ذہنی امر ہے سیکھنے سے بھی لوگ افسانہ نویس بن جاتے ہیں۔ لیکن شاعری کی طرح اس کے لیے بھی اور ادب کے ہر شعبہ کے لیے کچھ فطری مناسبت ضروری ہے۔ فطرت آپ سے پلاٹ بناتی ہے۔ ڈرامائی کیفیت پیدا کرتی ہے، تاثر لاتی ہے ادبی خوبیاں جمع کرتی۔ نادانستہ طور پر آپ ہی آپ سب کچھ ہوتا رہتا ہے۔ ہاں قصہ ختم ہوجانے کے بعد میں اسے خود پڑھتا ہوں۔ اگر اس میں مجھے کچھ ندرت، کچھ جدّت، کچھ حقیقت کی تازگی، کچھ حرکت پیدا کرنے کی قوت کا احساس پیدا ہوتا ہے تو میں اسے کامیاب افسانہ سمجھتا ہوں ورنہ سمجھتا ہوں فیل ہوگیا۔ حالانکہ فیل اور پاس دونوں افسانے شائع ہوجاتے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس افسانے کو میں نے فیل سمجھا تھا اسے احباب نے بہت زیادہ پسند کیا اس لیے میں اپنے معیار پر زیادہ اعتبار نہیں کرتا۔"

پریم چند نے "میرے بہترین افسانے" کے دیباچہ میں لکھا تھا، ان کے قصوں کی تعداد تین سو ہے مگر ڈرامائی کیفیت والے قصّوں کی تعداد دو سو سے زیادہ نہیں ہے۔ افسانوں میں لگ بھگ ایک سو افسانے ایسے ہیں جو پہلی بار اردو میں لکھے گئے۔

اندازاً 120افسانے پہلی بار ہندی میں لکھے گئے۔ اور بعد میں اردو ترجمہ ہوا۔ تقریباً 70 افسانے ہیں جو ہندی میں لکھے گئے اور جن کا ابھی تک اردو میں ترجمہ نہیں ہوا ہے۔

پریم چند نے اپنے شروع کے افسانوں میں راجپوتوں اور بندیلوں کی بہادری کی تصویریں پیش کی تھیں، ان کی کچھ کہانیاں ٹھاکر کا کنواں، ستہ گتی ہریجنوں پر ظلم کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ ایک درجن سے زائد کہانیوں میں۔ جیسے پوس کی رات، پنچایت، قربانی، سہاگ کا جنازہ، راہِ نجات وغیرہ میں دیہاتی زندگی کے روشن پہلو نمایاں ہیں۔پریم چند کے اپنے قصوں میں سیاسی آزادی کی جھلک ملتی ہے، تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں انھوں نے لاگ ڈاٹ، لال فیتہ، مجسٹریٹ کا استعفیٰ جیسے افسانے لکھے۔ جلوس اورسمر یاترا میں 1930کی تحریک کی جھلک کی گونج سنائی دیتی ہے۔

دو کہانیاں قاتل اور بارات اردو میں پریم چند کے نام سے چھپی ہیں اور یہی دونوں کہانیاں شیورانی دیوی کے مجموعے ناری ہردے میں بھی چھپی ہیں۔ میں نے 1959 میں امرت رائے کو خط لکھ کر پوچھا بھی تھا (شیورانی دیوی حیات تھیں) جواب نہیں آیا میرا خیال ہے یہ کہانیاں پریم چند کی ہی ہیں۔

کچھ محققین بمبوق اور پلشم کے نام سے شائع شدہ کہانیوں کو پریم چند کی کہانی سمجھتے ہیں میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں۔ بمبوق کے نام سے ایک ادیب زمانہ میں لکھتے تھے مگر وہ اپنے نام کے ساتھ ایم ایس سی بھی لکھتے تھے۔ نیرنگ خیال میں ایک خواتین انیس فاطمہ بنت بمبوق کے نام سے استاد تھے۔ جب بمبوق کی کہانیاں شائع ہوئیں اس وقت پریم چند بہت مقبول تھے اورکوئی وجہ نہیں کہ وہ اس نام سے افسانے لکھتے پلشم ایک قلمی نام تھا۔ مشہور فلمی ایکٹرس مینا کماری کے نانا پیارے لال شاکر میرٹھی کا جنھوں نے دیانرائن نگم کے ساتھ کام کیا تھا اور بعد میں ادیب کے مدیر بنے۔ یہاں یہ لکھنا بھی واجب ہوگا کہ ایک دوسرے پریم چند بھی تھے۔ یہ پنجابی تھے جنھوں نے اپنے مجموعوں کو لاہور سے چھپوایا تھا۔ اپنے نام کے بعد ایم ۔ اے۔ لکھتے تھے جبکہ منشی پریم چند صرف بی۔ اے ہی تھے۔

ٹالسٹائی کی بیس بائیس کہانیاں اور بچوں کے لیے جنگل کی کہانیوں کے علاوہ ہندی میں پریم چند کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔"سپت سروج، اگنی سمادھی، پریم چتور تھی، پریم تیرتھ، پریم دوادشی، پریم پنچمی، پریم پچیسی، پریم پی یوش، پریم پورنما، پریم کنج، پریم پرتکیا، پریتما،

پریم پرمود، پریم سوتر، پرسون، سمر یاترا، پریم چند کی سروشریشٹ کہانیاں، پریم پچیسی کو چھوڑکر باقی سب چھوٹے چھوٹے مجموعے تھے۔ کوئی تین، کوئی چار، کوئی پانچ، کوئی سات، کوئی نو، کوئی بارہ قصوں کے۔ وفات کے تھوڑا پہلے پریم چند نے مان سروور کے عنوان سے دو مجموعے شائع کیے تھے۔ ان میں 53 قصے تھے۔ وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے شری پت نے ایک مجموعہ "کفن" شائع کیا جس میں بارہ قصے تھے۔ اس کے علاوہ 150 قصے ہندی اور اردو کے رسالوں سے تلاش کرانھیں مان سروور کے اگلے چھ حصوں میں شائع کیا۔ پھر 1962 میں پریم چند کے چھوٹے بیٹے امرت رائے نے 56کہانیوں کو زمانہ اور دوسرے اردو ہندی رسالوں سے اکٹھا کرکے گپت دھن کے دو حصوں میں شائع کیا۔ اس کے کئ سال بعد کمل کشور گوینکا نے 32 قصے ڈھونڈ نکالے انھیں پریم چند کے اپراپتیہ ساہتیہ میں شائع کیا۔ مان سروور (آٹھ حصے) کفن، گپت دھن (دو حصے) اور پریم چند کے اپراپتیہ ساہتیہ میں شائع ہوئے افسانوں کی تعداد 304 ہوجاتی ہے ویسے یہ تعداد صحیح نہیں ہے کیونکہ لال فیتہ کسی مجموعے میں شامل نہیں کیا گیا، نہ ہی وفا کی دیوی۔

مان سروور (حصہ چار) کی سمسیا وہی افسانہ ہے جو مان سروور (آٹھ) میں وشم سمسیا کے عنوان سے ہے۔ گوینکا کے اپراپتیہ ساہتیہ میں روئے سیاہ وہی کہانی ہے جو اسی کتاب میں پرتگیا کے عنوان سے ہے۔ گوینکا کے اپراپتیہ ساہتیہ میں پرتشٹھا کی ہتیا وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں عزت کا خون کے عنوان سے شامل ہے۔ اسی طرح بہنی بھی دوبار شامل ہوگئی ہے۔ مان سروور حصہ دوم کی نیائے وہی افسانہ ہے جو گپت دھن میں نبی کا نیتی نرواہ کے عنوان سے شائع ہوا۔ ان افسانوں کے علاوہ ببوق کے نام شائع ہونے والی کہانی تانگے کی بڑ اور شادی کی پریم چند کی تخلیق نہیں ہے اگر ان سب کو خارج کردیا جائے تو پریم چند کے افسانوں کی تعداد 296 ہوجاتی ہے۔ پریم چند کے افسانوں کی تعداد گھٹانے یا بڑھانے میں میری کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری کوشش صرف یہ ہے کہ پریم پچاسا کی چھ٦ جلدوں میں تمام افسانوں کو جو نواب رائے، د۔ ر۔ افسانہ کہن یا پریم چند کے قلمی یا فرضی نام سے شائع ہوئے ہیں یکجا صورت میں پیش کردیا جائے۔

اردو کے مجموعوں میں افسانوں کی تعداد صرف 192 ہے یہ تعداد سوز وطن، پریم پچیسی، پریم بتیسی، پریم چالیسی، خاک پروانہ، خواب و خیال، فردوس خیال، آخری تحفہ،

زادِ راہ، دودھ کی قیمت اور واردات میں شائع ہوئے قصوں کی ہے۔ لگ بھگ ایک سو قصے ہیں جو کسی اردو مجموعے میں شائع نہیں ہوئے۔ 1942 میں میں نے پریم چند کے فرزند شری پت رائے سے پیشکش کی تھی کہ پریم چند کے افسانوں کو ایک سلسلے میں شائع کریں (میری خط و کتابت میری "پریم چند کی چٹھی پتری" (ہندی) میں شائع ہوچکی ہے) مگر یہ ممکن نہ ہوسکا۔ ایک دو ناشروں سے غیر رسمی بات ہوئی۔ کوئی تیار نہ ہوا۔ پریم چند کی پیدائش کے ایک سو سال بعد ان کی بہت تقریبیں ہوئی ہیں مگر اس طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے جس اسکیم کو اپنایا ہے اس کے تحت دیگر تنقیحات کے علاوہ ان کے تقریباً تین سو قصوں کو اشاعت کی تاریخ کے مطابق شائع کیا جا رہا ہے۔

پریم بتیسی کے دیباچے میں پریم چند نے لکھا تھا "میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ پریم پچیسی کئ سال ہوئے شائع ہواتھا۔ جہاں تک معاصر اخباروں کا تعلق ہے انھوں نے میری ناچیز کاوش کی داد دی لیکن شائقین پر اس کا بہت کم اثر ہوا۔ پہلا اڈیشن ختم ہونے میں کم و بیش پانچ سال لگ گئے۔ یہ قدردانی بہت حوصلہ انگیز تو نہ تھی۔ لیکن مصنف کو تصنیف کے سوا چارہ نہیں۔ اس لیے یہ دوسرا مجموعہ پریم بتیسی کے نام سے اردو پبلک کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ پہلے مجموعہ کی نسبت اس کا زیادہ چرچا ہو۔ یا سارا تومار اشاعت کے گودام ہی میں پڑا سڑے۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہوچکا۔ اب صرف یہی آرزو ہے کہ ایک منتخب مجموعہ پریم چالیسا یا پریم پچاسا کے نام سے اور نکل جائے ۔ بس یہی زندگی کا ماحصل ہوگا اور اسی پر قناعت کروں گا"۔ پریم چالیسی شائع ہوئی، مگر پریم پچاسا ان کی زندگی میں نہیں شائع ہوا۔

اب یہ افسانے پریم پچاسا کے نام سے کلیات کی چھ جلدوں میں پیش کیے جارہے ہیں۔

مدن گوپال

سہاگ کی ساڑی

یہ کہنا بھول ہے کہ دامپتیہ (شادی شدہ) سکھ کے لیے استری پُروش کے سوبھاو میں میل ہونا آوشیک (ضروری) ہے۔ شریمتی گورا اور شریمان کنور رتن سنگھ میں کوئی بات نہ ملتی تھی۔ گورا اُدار تھی، رتن سنگھ کوڑی کوڑی کو دانتوں سے پکڑتے تھے۔ وہ ہنس مکھ تھی، رتن سنگھ چنتا شیل تھے۔ وہ کُل مریادا پر جان دیتی تھی، رتن سنگھ اسے آڈمبر سمجھتے تھے۔ ان کے ساماجِک وَیوہار اور وِچار میں بھی گھور انتر تھا۔ یہاں اُدارتا کی بازی رتن سنگھ کے ہاتھ تھی۔ گورا کو سہ بھوج (دعوتوں) سے آپتی (اعتراض) تھی۔ ودھوا وواہ سے گھرنا اور اچھوتوں کے پرشن سے ورودھ۔ رتن سنگھ ان سبھی ویوستھاؤں (اہتماموں) کے انوموَدک (حامی) تھے۔ راجنیتک وِشیوں (سیاسی موضوعات) میں یہ وِبھِنّتا (تفریق) اور بھی جٹِل تھی۔ گورا ورتمان اِستھتی (موجودہ حالات) کو اٹل، امر، اپریہاریہ (لازمی) سمجھتی تھی۔ اس لیے وہ نرم گرم، کانگریس، سوراجیہ، ہوم رول سبھی سے وِرکت (دور) تھی۔ کہتی۔ ''یہ مٹھی بھر پڑھے لکھے آدمی کیا بنا لیں گے۔ چنے کہیں بھاڑ پھوڑ سکتے ہیں؟'' رتن سنگھ پکّے آشاوادی تھے، راجنیتک سبھا کی پہلی پنکتی میں بیٹھنے والے، کرم چھیتر میں سب سے پہلے قدم اُٹھانے والے، سوَدیش ورت دھاری اور بہشکار کے پورے انویائی (حامی) تھے۔ اتنی وشمتاؤں (اختلافات) پر بھی ان کا دامپتیہ جیون سُکھ مئے تھا۔ کبھی کبھی ان میں مت بھید اوشیہ ہو جاتا تھا، پر وے سمیر کے وہ جھونکے تھے جو استھر جل کو ہلکی ہلکی لہروں سے آبھوشت (مزین) کر دیتے ہیں۔ وہ پرچنڈ (بلپھرے) جھونکے نہیں جن سے ساگر وِپلو چھیتر (ہل چل والا علاقہ) بن جاتا ہے۔ تھوڑی سی سداچِھّا (صحیح آرزو) ساری وِشمتاؤں (تفریق) اور مت بھیدوں کا پرتِکار (ختم) کر دیتی تھی۔

(۲)

ودیشی کپڑوں کی ہولیاں جلائی جا رہی تھیں۔ سَیم سیوکوں کے جتھے بھکاریوں کی بھانتی

دواروں پر کھڑے ہو ہوکر ولایتی کپڑوں کی بھکشا مانگتے تھے اور ایسا کداچت (شاید) ہی کوئی دوار تھا جہاں انھیں نراش ہونا پڑتا ہو۔ کھدر اور گاڑھے کے دن پھر گئے تھے۔ نین سکھ، نین دکھ، ململ مململ اور تن زیب تنبیدھ ہوگئے تھے۔ رتن سنگھ نے آکر گورا سے کہا۔ لاؤ، اب سب کپڑے صندوق سے نکال دو، دے دوں۔

گورا۔ ارے تو اسی گھڑی کوئی ساعت نکلی جاتی ہے، پھر کبھی دے دینا۔

رتن۔ وہ لوگ دُوار پر کھڑے کولاہل (شور) مچا رہے ہیں اور تم کہتی ہو، پھر کبھی دے دینا۔

گورا۔ تو یہ کنجی لو۔ نکال کر دے دو۔ مگر یہ سب ہے لڑکوں کا کھیل۔ گھر پھونکنے سے سوراجیہ نہ کبھی ملا ہے اور نہ ملے گا۔

رتن۔ میں نے کل ہی تو اس وشے پر تم سے گھنٹوں سر پچی کی تھی اور اس سمے تو مجھ سے سہمت (متفق) ہوگئی تھیں۔ آج پھر تو وہی شنکائیں کرنے لگیں؟

گورا۔ میں تمھارے اپرسن (ناخوش) ہوجانے کے ڈر سے چپ ہوگئی تھی۔

رتن۔ اچھا، شنکائیں پھر کرلینا اس سمے جو کرنا ہے وہ کرو۔

گورا۔ لیکن میرے کپڑے تو نہ لوگے نہ؟

رتن۔ سب دینے پڑیں گے۔ ولایت کا ایک سوت بھی گھر میں رکھنا میرے عہد کو بھنگ کر دے گا۔

اتنے میں رام ٹہل سائیس نے باہر سے پکارا۔ سرکار، لوگ جلدی مچا رہے ہیں کہتے ہیں، ابھی کئی محلّوں کا چکّر لگانا ہے۔ کوئی گاڑھے کا ٹکرا ہو تو مجھے بھی مل جائے، میں نے بھی اپنے کپڑے دے دیے۔

کیسر مہری کپڑوں کی ایک گٹھری لے کر باہر جاتی ہوئی دکھائی دی۔ رتن سنگھ نے پوچھا۔ کیا تم بھی اپنے کپڑے دینے جاتی ہو؟

کیسر نے لجاتے ہوئے کہا۔ ہاں، سرکار جب دیش چھوڑ رہا ہے تو میں کیسے پہنوں؟

رتن سنگھ نے گورا کی اُور آدیش پورن نیتروں (تحکمانہ نظروں) سے دیکھا۔ اب وہ وِلمب (دیر) نہ کرسکی۔ لجّا سے سر جھکائے صندوق کھول کر کپڑے نکالنے لگی۔ ایک صندوق خالی ہوگیا تو اس نے دوسرا کھولا۔ سب سے اوپر ایک سندر ریشمی سوٗٹ رکھا ہوا تھا جو کنور صاحب نے کسی انگریزی کارخانے میں سِلایا تھا۔

گورا نے پوچھا۔ کیا سوٗٹ بھی نکال دوں؟

رتن۔ ہاں ہاں اِسے کس دن کے لیے رکھوگی؟

گورا۔ یدی میں یہ جانتی کہ اتنی جلدی ہوا بدلے گی تو کبھی سوٗٹ نہ بنوانے دیتی۔ سارے روپے خون گئے۔

رتن سنگھ نے کچھ اُتر نہ دیا۔ تب گورا نے اپنا صندوق کھولا اور جلن کے مارے سودیشی۔ ودیشی سبھی کپڑے نکال نکال کر پھینکنے لگی۔ وہ آویش پرواہ میں آگئی۔ ان میں کتنی ہی بہومولیہ (بیش قیمتی) فینسی جاکیٹ اور ساڑیاں تھیں جنھیں کسی سمے پہن کر وہ پھولی نہ سماتی تھی۔ بعض بعض ساڑیوں کے لیے تو اسے رتن سنگھ سے باربار تقاضے کرنے پڑتے تھے۔ پر اس سمے سب کی سب آنکھوں میں کھٹک رہی تھیں۔ رتن سنگھ اس کے بھاوؤں کو تاڑ رہے تھے۔ سَودیشی کپڑوں کا نکالا جانا انھیں اکھر رہا تھا، پر اس سمے چپ رہنے ہی میں کشل سمجھتے تھے۔ تِس پر بھی دو۔ ایک بار واد۔ وِواد کی نوبت آگئی۔ ایک بنارسی ساڑی کے لیے تو وہ جھگڑ بیٹھے، اسے گورا کے ہاتھوں سے چھین لینا چاہا، پر گورا نے ایک نہ مانی نکال ہی پھینکا۔ سہسا صندوق میں سے ایک کیسریا رنگ کی تنزیب کی ساڑی نکل آئی جس پر پکّے آنچل اور پلے ٹنکے ہوئے تھے۔ گورا نے اسے جلدی سے لے کر اپنی گود میں چھپا لیا۔

رتن سنگھ نے پوچھا۔ کیسی ساڑی ہے۔

گورا۔ کچھ نہیں تنزیب کی ساڑی ہے۔ آنچل پکّا ہے۔

رتن۔ تن زیب کی ہے تو وہ ضرور ہی ولایتی ہوگی۔ اسے الگ کیوں رکھ لیا؟ کیا وہ بنارسی ساڑیوں سے اچھی ہے؟

گورا۔ اچھی تو نہیں ہے، پر میں اِسے نہ دوں گی۔

رتن۔ واہ، ولایتی چیز کو میں نہ رکھنے دوں گا۔ لاؤ اِدھر۔

گورا۔ نہیں میری خاطر سے اسے رہنے دو۔

رتن۔ تم نے میری خاطر سے ایک بھی چیز نہ رکھی، میں کیوں تمھاری خاطر کروں۔

گورا۔ پیروں پڑتی ہوں۔ ضد نہ کرو۔

رتن۔ سَودیشی ساڑیوں میں جو چاہو رکھ لو، لیکن اس ولایتی چیز کو میں نہ رکھنے دوں گا۔ اسی کپڑے کی بدولت ہم غلام بنے، یہ غلامی کا داغ میں اب نہیں رکھ سکتا۔ لاؤ اِدھر۔

گورا۔ میں اِسے نہ دوں گی۔ ایک بار نہیں ہزار بار کہتی ہوں کہ نہ دوں گی۔

رتن۔ میں اِسے لے کر چھوڑوں گا، اس غلامی کے چِنکے کو، اِس داسّتو (غلامی) کے بندھن کو کسی طرح نہ رکھوں گا۔

گورا۔ ناحق ضد کرتے ہو۔

رتن۔ آخر تم کو اِس سے کیوں اِتنا پریم ہے؟

گورا۔ تم تو بال کی کھال نکالنے لگتے ہو۔ اتنے کپڑے تھوڑے ہیں؟ ایک ساڑی رکھ ہی لی تو کیا؟

رتن۔ تم نے ابھی تک اِن ہولیوں کا آشے (مقصد) ہی نہیں سمجھا۔

گورا۔ خوب سمجھتی ہوں۔ سب ڈھونگ ہے۔ چار دن میں جوش ٹھنڈا پڑجائے گا۔

رتن۔ تم کیول اتنا بتا دو، کہ یہ ساڑی تمھیں کیوں اتنی پیاری ہے، شاید میں مان جاؤں۔

گورا۔ یہ میری سہاگ کی ساڑی ہے۔

رتن۔ (ذرا دیر سوچ کر) تب تو میں اسے کبھی نہ رکھوں گا۔ میں ودیشی وستر کو یہ شُبھ استھان نہیں دے سکتا۔ اس پوتر سنسکار کا یہ اَپوتر اسمرتی چِہن گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ میں اِسے سب سے پہلے ہولی کی بھینٹ کروں گا۔ لوگ کتنے ہت بدھی ہو گئے تھے کہ ایسے شبھ کاریوں میں بھی ودیشی وستوؤں کا وَیوہار کرنے میں سکوچ نہ کرتے تھے۔ میں اسے اوّشیہ ہولی میں دوں گا۔

گورا۔ کیسا اشگُن منہ سے نکالتے ہو۔

رتن۔ ایسی سہاگ کی ساڑی کا گھر میں رکھنا ہی اشگن، اسمنگل، انِشٹھ (خراب) اور اَنرتھ (بے معنی) ہے۔

گورا۔ یوں چاہے زبردستی چھین لے جاؤ، پر خوشی سے نہ دوں گی۔

رتن۔ تو پھر میں زبردستی ہی کروں گا۔ مجبوری ہے۔

یہ کہہ کر وہ لپکے کہ گورا کے ہاتھوں سے ساڑی چھین لوں۔ گورا نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا اور رتن کی طرف کاترا نیتروں سے دیکھ کر کہا۔ تمھیں میرے سر کی قسم۔

کیسر مہری بولی۔ بہو جی کی اچھا ہے تو رہنے دیجیے۔

رتن سنگھ کے بڑھے ہوئے ہاتھ رُک گئے۔ مُکھ مَلِن ہوگیا۔ اداس ہوکر بولے۔ مجھے

اپنا ورت توڑنا پڑے گا۔ پرتگیا پتر (عہدنامے) پر جھوٹے ہستاکچھر (دستخط) کرنے پڑیں گے۔ خیر یہی سہی۔

(۳)

شام ہوگئی تھی۔ دوار پر سیَم سیوک گنڑ شور مچا رہے تھے۔ کنور صاحب جلدی آیئے، شریمتی جی سے بھی کہہ دیجیے، ہماری پرارتھنا سویکار کریں۔ بہت دیر ہو رہی ہے۔ اُدھر رتن سنگھ اسمنجس میں پڑے ہوئے تھے، کہ پرتگیا پتر پر کیسے ہستاکچھر کروں۔ ودیشی وستر گھر میں رکھ کر سودیشی ورت کا پالن کیوں کر ہوگا؟ آگے قدم بڑھا چکا ہوں پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔ لیکن پرتگیا کا اکشرشہ پالن کرنا ابھیشٹ بھی تو نہیں، کیوں اُس کے آشے پر لکشیہ رہنا چاہیے۔ اس وچار سے مجھے پرتگیا پتر پر ہستاکچھر کے کرنے کا پورا ادھکار ہے۔ تریا ہٹ کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ یوں چاہوں تو ایک چھن میں کام نکل سکتا ہے، پر اسے بہت دُکھ ہوگا، بڑی بھاؤک ہے، اس کے بھاوؤں کا آدر کرنا میرا کرتویہ ہے۔

گورا بھی چنتا میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سہاگ کی ساڑی سہاگ کا چنہہ ہے، اُسے آگ ...... کتنے اشگن کی بات ہے۔ یہ کبھی کبھی بالکوں کی بھانتی ضد کرنے لگتے ہیں، اپنی دُھن میں کسی کی سنتے نہیں۔ بگڑتے ہیں تو مانوں منہ ہی سیدھا نہیں ہوتا۔

لیکن وہ بے چارے بھی تو اپنے سِدھانتوں سے مجبور ہیں۔ جھوٹ سے انھیں گھرنا (نفرت) ہے۔ پرتگیا پتر پر جھوٹی سویکرتی لکھنی پڑے گی۔ ان کے آتما کو بڑا دکھ ہوگا۔ گھور دھرم سنکٹ میں پڑے ہوں گے، یہ بھی تو نہیں ہوسکتا کہ سارے شہر میں سودیشا نوراگیوں کے سر مور بن کر اُس پرتگیا پتر پر ہستاکچھر کرنے سے آنا کانی کریں۔ کہیں منہ دکھانے کو جگہ نہ رہے گی، لوگ سمجھیں گے، بنا ہوا ہے۔ پرشگن کی چیز کیسے دوں؟

اتنے میں اسے رام ٹہل سائیس کو سر پر کپڑوں کا گٹھّر لیے باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ کیسر مہری بھی ایک گٹھّر سر پر رکھے ہوئے تھی۔ پیچھے پیچھے رتن سنگھ ہاتھ میں پرتگیا پتر لیے جارہے تھے۔ ان کے چہرے پر گلانی کی جھلک تھی۔ جیسے سچّا آدمی جھوٹی گواہی دینے جارہا ہو۔ گورا کو دیکھ کر انھوں نے آنکھیں پھیر لیں اور چاہا کہ اس کی نگاہ بچا کر نکل جاؤں۔ گورا کو جان پڑا کہ ان کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔ وہ راہ روک کر بولی ۔ ذرا سنتے جاؤ۔

رتن۔ جانے دو دق نہ کرو، لوگ باہر کھڑے ہیں۔

انھوں نے چاہا کہ پتر کو چھپالوں، پر گورا نے اسے ان کے ہاتھ سے چھین لیا، اُسے غور سے پڑھا اور ایک چھن (لمحہ) چنتامگن رہنے کے بعد بولی۔ وہ ساڑی بھی لیتے جاؤ۔

رتن۔ رہنے دو، اب تو میں نے جھوٹ لکھ ہی دیا۔

گورا۔ میں کیا جانتی تھی کہ تم ایسی کڑی پرتکیا کر رہے ہو۔

رتن۔ یہ تو میں تم سے پہلے ہی کہہ چکا تھا۔

گورا۔ میری بھول تھی۔ چھما کر دو اور اسے لیتے جاؤ۔

رتن۔ جب تم اسے دینا اشگن سمجھتی ہو تو رہنے دو۔ تمھارے خاطر تھوڑا سا جھوٹ بولنے میں مجھے کوئی آپتی نہیں۔

گورا۔ نہیں لیتے جاؤ۔ امنگل کے بھئے سے تمھاری آتما کا ہنن نہیں کرنا چاہتی۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی سہاگ کی ساڑی اُٹھاکر پتی کے ہاتھوں میں رکھ دی۔ رتن نے دیکھا، گورا کے چہرے پر ایک رنگ آتا ہے، ایک رنگ جاتا ہے، جیسے کوئی روگی انترستھ وِشم ویدنا (اندرونی درد) کو دبانے کی چیشٹا (کوشش) کر رہا ہو۔ انھیں اپنی اُہردیتۃ (سخت دلی) پر لجا آئی۔ ہاں۔ کیؤل اپنے سِدھانت کی رکچھا کے لیے اپنی اُتما کے سمان کے لیے، میں اس دیوی کے بھاووں کا ودھ (قتل) کر رہا ہوں۔ یہ اتیاچار ہے۔ ساڑی گورا کو دے کر بولے۔ تم اِسے رکھ لو، میں پرتکیا پتر کو پھاڑے ڈالتا ہوں۔

گورا نے دِرڑھتا سے کہا۔ تم نہ جاؤگے تو میں خود جاکر دے آوں گی۔

رتن سنگھ وِوش (مجبور) ہوگئے۔ ساڑی لی اور باہر چلے آئے۔

(۴)

اسی دن سے گورا کے ہردئے پر ایک بوجھ سا رہنے لگا۔ وہ دل بہلانے کے لیے نانا اُپائے کرتی۔ جلسوں میں بھاگ لیتی، سیر کرنے جاتی، منورنجک پستکیں پڑھتی، یہاں تک کہ کئی بار نیم کے وِرودھ (خلافِ اصول) تھیٹروں میں بھی گئی، کسی پرکار امنگل کلپنا کو شانت کرنا چاہتی تھی۔ پر یہ آشنکا ایک میگھ منڈل کی طرح اس کے ہردئے پر چھائی رہتی تھی۔

جب ایک پورا مہینا گزر گیا اور اس کے مانسِک ویدنا دنوں دن بڑھتی ہی گئی تو کنور صاحب نے اسے کچھ دنوں کے لیے اپنے علاقے پر لے جانے کا نشچئے کیا۔ اس کا من

انھیں ان کے آدرش پریم پر بنیہ ترسکار کیا کرتا تھا۔ وہ اکثر دیہاتوں میں پرچار کا کام کرنے جایا کرتے تھے۔ پر اب اپنے گاؤں سے باہر نہ جاتے، یا جاتے تو سندھیا تک ضرور لوٹ آتے۔ ان کی ایک دن کی دیر، ان کا سادھارن سردرد اور زکام سے اَبِیوستھِت (پریشان) کردیتے تھے۔ وہ بہودھا بُرے سُوپن دیکھا کرتی۔ کسی انشٹ کے کالپنِک اَستِتو (تصوراتی وجود) کی چھایا اسے اپنے چاروں اُور منڈراتی ہوئی پرتیت ہوتی تھی۔

وہ تو دیہات میں پڑھی ہوئی آشنکاؤں کی کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی۔ ادھر اس کی سہاگ کی ساڑی سودیش ۔ پریم کی ویدی پر بھَسم ہوکر رِشی۔ پردابنی بھبھوت بنی ہوئی تھی۔

دوسرے مہینے کے انت میں رتن سنگھ اسے لے کر لوٹ آئے۔

(۵)

گورا کو واپس آئے تین چار دن ہوچکے تھے، پر اسباب کے سنبھالنے اور یہم استھان پر رکھنے میں وہ اتنی وِیَست (مصروف) رہی کہ گھر سے باہر نہ نکل سکی تھی۔ کارن یہ تھا کہ کیسر مہری اس کے جانے سے دوسرے ہی دن چھوڑ کر چلی گئی تھی اور ابھی اُتنی چُتر دوسری مہری ملی نہ تھی۔ کنورصاحب کا سائیس رام ٹہل بھی چھوڑ گیا تھا۔ بے چارے کوچوان کو سائیس کا بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

سندھیا کا سمے تھا۔ گورا برآمدے میں بیٹھی آکاش کی اُور ایک ٹک ہوکر تاک رہی تھی۔ چنتا گرست پرانیوں کا ایک ماتر یہی اَولمب ہے۔ سہسا رتن سنگھ نے آکر کہا۔ چلو آج تمھیں سودیشی بازار کی سیر کرا لاویں۔ یہ میرا ہی پرستاو تھا، پر چار دن یہاں آئے ہوگئے، ادھر جانے کا اوکاش ہی نہ ملا۔

گورا۔ میرا تو جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہیں بیٹھ کر کچھ باتیں کرو۔

رتن۔ نہیں چلو دیکھ آویں۔ ایک گھنٹے میں لوٹ آویں گے۔

اَنت میں گورا راضی ہوگئی۔ اِدھر مہینوں سے باہر نہ نکلی تھی۔ آج اسے چاروں طرف ایک وچتر شوبھا دکھائی دی۔ بازار کبھی اتنے رونق پر نہ تھا۔ وہ سودیشی بازار میں پہنچی تو جلاہوں، کوریوں کو اپنی اپنی دُکانیں سجائے بیٹھے دیکھا۔ سَہسا ایک وِردھ کوری نے آکر رتن سنگھ کو سلام کیا۔ رتن سنگھ چونک کر بولے۔ رام ٹہل تم اب کہاں ہو؟

رام ٹہل کا چہرا شری سمپنّ تھا۔ اس کے انگ انگ سے آتم سمّان کی آبھا جھلک رہی

تھی۔ آنکھوں میں گورُو جیوتی تھی۔ رتن سنگھ کو کبھی انومان نہ ہوا تھا کہ اصطبل صاف کرنے والا بڈھا رام ٹہل اتنا سومیّہ، اتنا بھدر پُروش ہے۔ وہ بولا۔ سرکار اب تو اپنا کاروبار کرتا ہوں۔ جب سے آپ کی غلامی چھوڑی تب سے اپنے کام میں لگ گیا۔ آپ لوگوں کی نگاہ ہم غریبوں پر ہوگئی۔ ہمارا بھی گزر ہو رہا ہے، نہیں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ کس حالت میں پڑا ہوا تھا۔ جات کا کوری ہوں، پر پاپی پیٹ کے لیے چمار بن گیا تھا۔

رتن۔ تو بھائی اب مُنہ میٹھا کراؤ۔ یہ بازار لگانے کی میری ہی صلاح تھی، بکری تو اچھی ہوتی ہے۔

رام ٹہل۔ ہاں سرکار۔ آج کل خوب بکری ہو رہی ہے۔ مال ہاتھوں ہاتھ اُڑ جاتا ہے۔ یہاں بیٹھتے ہوئے ایک مہینا ہوگیا ہے، پر آپ کی کِرپا سے لوگوں کے چار پیسے تھے وہ بے باک ہوگئے۔ بھگوان کی دیا سے روکھا سوکھا بھوجن بھی دونوں سے مل جاتا ہے اور کیا چاہیے۔ مالکن کی سہاگ کی ساڑی کا ہولی میں آنا کہیے اور بازار کا چمکنا کہیے لوگوں نے کہا، جب اتنے بڑے آدمی ہوکر ایسے شگن کی چیز کی پرواہ نہیں کرتے تو پھر ہم ودیشی کپڑے کیوں رکھیں۔ جس دن ہولی جلی ہے اس کے دو تین دن پہلے ہی سرکار علاقے پر چلے گئے تھے۔ اس کے پہلے بھی سرکار کئی دنوں تک گھر سے بہت کم نکلتے تھے۔ میں تو یہی کہوں گا کہ ساری مایا اسی سہاگ کی ساڑی کی ہے۔

اتنے میں ایک ادھیڑ استری گورا کے سامنے آکر بولی۔ بہو جی، مجھے بھول تو نہیں گئیں؟

گورا نے سر اُٹھایا تو سامنے کیسر مہری کھڑی تھی۔ وہ سندر ساڑی پہنے ہوئے تھی۔ ہاتھ پاؤں میں معمولی گہنے بھی تھے۔ چہرا کِھلا ہوا تھا۔ سوادھین جیون کا گورَو ایک ایک بھاؤ سے پَرس فُٹِت ہو رہا تھا۔

گورا نے کہا۔ اتنی جلدی بھول جاؤں گی؟ اب کہاں ہو؟ ہمیں لوٹنے بھی نہ دیا، بیچ میں ہی اڑ بھاگی۔

کیسر۔ کیا کروں سرکار، اپنا کام چلتے دیکھ کر صبر نہ ہوسکا۔ جب تک روزگار نہ چلتا تھا تب تک لاچاری تھی۔ پیٹ کے لیے سیوا، ٹہل، کرم کوکرم سبھی کرنا پڑتا تھا۔ اب آپ

لوگوں کی دَیا سے ہمارے بھی دن لوٹے ہیں، اب دوسرا کام نہیں کیا جاتا۔ اگر بازار کا یہی رنگ رہا تو اپنی کمائی کھائے نہ چکے گی۔ یہ سب آپ کی ساڑی کی مہماں ہے۔ اس کی بدولت ہم غریبوں کے کتنے ہی گھر بس گئے۔ ایک مہینہ پہلے ان دُکان والوں میں سے کسی کو روٹیوں کا ٹھکانا نہ تھا۔ کوئی سائیسی کرتا تھا، کوئی تاسا بجاتا تھا، یہاں تک کہ کوئی آدمی مہتر کا کام کرتے تھے۔ کتنے ہی بھیک مانگتے تھے۔ اب سب اپنے دھندے میں لگ گئے ہیں۔ سچ پوچھو تو تمھاری سہاگ کی ساڑی نے ہمیں سہاگن بنا دیا نہیں تو ہم سہاگن ہوتے ہوئے بھی وِدھوائیں تھیں۔ سچ کہتی ہوں سیکڑوں زبانوں میں نِتیہ یہی دعا نکلتی ہے کہ آپ کا سہاگ اَمر ہو، جس نے ہماری رانڈ جات کو سہاگ دان دیا۔

رتن سنگھ ایک دُکان پر بیٹھ کر کچھ کپڑے دیکھنے لگے۔ گورا کا بھاوک ہردے آنند سے پُلکِت ہو رہا تھا۔ اس کی ساری امنگل، کلپنائیں سوپنوت وچّھن ہوتی جاتی تھیں۔ آنکھیں سجل ہو گئی تھیں اور سہاگ کی دیوی اَشر وسنچت نیتروں کے سامنے کھڑی آنچل پھیلا کر اسے آشرواد دے رہی تھی۔

اس نے رتن سنگھ کو بھکتی پورن آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ میرے لیے بھی ایک ساڑی لے لو۔

(۶)

جب گورا یہاں سے چلی تو سڑک کی بجلیاں جل چکی تھیں۔ سڑکوں پر خوب پرکاش تھا۔ اس کا ہردے بھی آنند کے پرکاش سے جگمگا رہا تھا۔

رتن سنگھ نے پوچھا۔ سیدھے گھر چلوں؟

گورا۔ نہیں چھاؤنی کی طرف ہوتے چلو۔

رتن۔ بازار خوب سجا ہوا تھا۔

گورا۔ یہ زمین لے کر ایک ا-تھائی بازار بنوا دو۔ سودیشی کپڑوں کی دُکانیں ہوں اور کسی سے کرایہ نہ لیا جائے۔

رتن۔ بہت خرچ پڑے گا۔

گورا۔ مکان بیچ دو روپے ہی روپے ہو جائیں گے۔

رتن۔ اور رہیں پیڑ تلے؟

گورا۔ نہیں گاؤں والے مکان میں۔

رتن۔ سوچوں گا۔

گورا۔ (ذرا دیر میں) علاقے بھر میں خوب کپاس کی کھیتی کراؤ۔ جو کپاس بوئے اس کی بیگار معاف کردو۔

رتن۔ ہاں تدبیر اچھی ہے، دونی اپج ہوجائے گی۔

گورا۔ (کچھ دیر سوچنے کے بعد) لکڑی بنا دام دو تو کیسا ہو؟ جو چاہے چرخے بنوانے کے لیے کاٹ لے جائے۔

رتن۔ لوٹ مچ جائے گی۔

گورا۔ ایسی بے ایمانی کوئی نہ کرے گا۔

جب اس نے گاڑی سے اُتر کر گھر میں قدم رکھا تو چت شبھ کلپناؤں سے پرفلِت ہو رہا تھا۔ مانوں کوئی بچھڑا کھونٹے سے چھوٹ کر کلولیں کر رہا ہو۔

یہ افسانہ پہلی بار ہندی میں جنوری 1922 کے ماہنامہ پربھا میں شائع ہوا، مان سرو ور نمبر 7 میں شامل ہے۔ ہندی سے رسم خط بدل کر شائع کیا جا رہا ہے۔

موٹھ

ڈاکٹر جے لال نے اعلیٰ درجے کی سند حاصل کی تھی۔ لیکن اسے تقدیر کہیے یا کاروباری اصولوں سے لاعلمی کہ انھیں اپنے پیشے میں کبھی فروغ نہ ہوا۔ ان کا مکان ایک تنگ گلی میں واقع تھا۔ لیکن انھیں کشادہ مکان لینے کا کبھی خیال نہ ہوا۔ دواخانے کی الماریاں شیشیاں اور دوسرے طبی آلات بھی صاف ستھرے نہ تھے۔ اس کفایت شعاری کے اُصول کو وہ اپنی خانہ داری میں سختی سے ملحوظ رکھے تھے۔ لڑکا جوان ہوگیا تھا۔ لیکن ابھی تک اس کی تعلیم کی فکر نہ تھی۔ سوچتے تھے اتنے دنوں کتابوں سے سر مار کر ایسی کون سی ثروت پیدا کرلی کہ خواہ مخواہ اس کی تعلیم پر ہزاروں روپے خرچ کر دوں۔ ان کی بیوی صابر اور جفاکش عورت تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ان اوصاف پر اتنا بوجھ رکھ دیا تھا کہ ان کی کمر بھی خم ہوگئی تھی۔ ماں بھی زندہ تھیں۔ زندگی سے بیزار۔ جو گنگا اشنان کے لیے ترس ترس کے رہ جاتی تھیں۔ دوسرے متبرک مقاموں کی جاترا کا ذکر ہی کیا۔ ان بے دردانہ کفایت شعاریوں کا نتیجہ یہ تھا کہ اس گھر میں اطمینان اور مسرت کا نام نہ تھا۔ اگر کوئی مدِ فاضل تھی تو وہ بُڑھیا مہری جگیا تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب کو گود میں کھلایا تھا اور اُسے اس گھر میں کچھ ایسی محبت ہوگئی کہ سب طرح کی سختیاں جھیلتی تھی پر ٹلنے کا نام نہ لیتی تھی۔

(۲)

ڈاکٹر صاحب طبّی آمدنی کی کمی کو کپڑے اور شکر کے کارخانوں میں حصّہ لے کر پورا کرتے تھے۔ آج سوئے اتفاق سے بمبئی کے ایک کارخانے نے ان کے پاس سالانہ نفع کے ۷۵۰ روپے بھیجے۔ ڈاکٹر صاحب نے بیمہ کھولا۔ نوٹ گنے اور ڈاکیہ کو رخصت کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈاکیے کے پاس روپے زیادہ تھے۔ بوجھ سے دبا جاتا تھا۔ بولا حضور روپے لے لیں اور مجھے نوٹ دے دیں تو بڑا احسان ہوگا۔ بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔ ڈاکٹر صاحب ڈاکیوں کو خوش رکھنا چاہتے تھے۔ انھیں مُفت دوائیں دے دیا کرتے تھے۔ سوچے آخر مجھے بینک جانے کے

لیے ٹانگا منگانا ہی پڑے گا۔ کیوں نہ مفت کرم داشتن کے اصول پر عمل کروں۔ روپے گن کر ایک تھیلی میں رکھ دیے اور سوچ ہی رہے تھے کہ چلوں انھیں بینک میں رکھتا آؤں کہ ایک مریض نے بلا بھیجا۔ ایسے موقعے یہاں شاذ ہی آتے تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر صاحب کو صندوقچے پر بھروسہ نہ تھا۔ لیکن مجبوراً تھیلی کو صندوقچے میں رکھا اور مریض کو دیکھنے چلے گئے۔ وہاں سے لوٹے تو تین بج چکے تھے۔ بینک بند ہوچکا تھا۔ آج روپے کسی طرح جمع نہ ہوسکتے تھے۔ حسب معمول شفاخانے میں بیٹھ گئے۔ آٹھ بجے رات کو جب اندر جانے لگے تو احتیاطاً تھیلی کو اندر رکھنے کے لیے صندوق سے نکالا۔ تھیلی کچھ ہلکی معلوم ہوئی۔ اُسے فوراً دواؤں کے ترازو پر تولا۔ ہوش اُڑگئے۔ پورے ڈھائی سو روپے کم تھے۔ اعتبار نہ ہوا۔ تھیلی کھول کر روپے گنے۔ ڈھائی سو روپے کم نکلے۔ مجنونانہ بے صبری کے ساتھ صندوق کے دوسرے خانوں کو ٹٹولنا شروع کیا۔ لیکن بے سود! روپے غائب ہوگئے تھے۔ مایوس ہوکر ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور حافظے کو مجتمع کرنے کے لیے آنکھیں بند کرکے سوچنے لگے۔ میں نے روپے کہیں الگ تو نہیں رکھ دیے؟ ڈاکیے نے روپے کم تو نہیں دیے؟ میں نے شمار کرنے میں تو غلطی نہیں کی۔ ہرگز نہیں۔ میں نے پچیس روپے کی گڈیاں لگائی تھیں۔ پوری تیس گڈیاں تھیں۔ خوب یاد ہے میں نے ایک ایک گڈی گن کر تھیلی میں رکھی۔ حافظہ مطلق خطا نہیں کرتا۔ صندوق کی کنجی بھی بند کردی تھی۔ مگر اوہو! اب سمجھ میں آگیا۔ کنجی میز پر چھوڑ دی۔ عجب نہیں اسے جیب میں رکھنا بھول گیا ہوں۔ وہ ابھی تک میز پر پڑی ہے۔ بس یہی بات ہے۔ کنجی جیب میں ڈالنے کا خیال نہ رہا۔ لیکن لے کون گیا؟ باہر کے دروازے بند تھے۔ گھر میں کوئی میرے روپے پیسے کو چھوتا نہیں۔ آج تک کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ ضرور کسی باہر کے آدمی کی حرکت ہے۔ ممکن ہے کوئی دروازہ کھلا رہ گیا ہو۔ یا کوئی شخص دوا لینے آیا ہو۔ میز پر کنجی پڑی دیکھی ہو اور صندوق کھول کر روپے نکال لیے ہوں۔ اسی سے میں روپے نہیں لیا کرتا۔ کیا عجب ہے ڈاکیے ہی کی شرارت ہو۔ بہت ممکن ہے اس نے مجھے صندوق میں تھیلی رکھتے دیکھا تھا۔ یہ روپے جمع ہوجاتے تو میرے پاس پورے ہزار روپے ہوجاتے۔ سود کا حساب لگانے میں آسانی ہوتی۔ کیا کروں؟ پولیس میں اطلاع کروں؟ بالکل بے سود خواہ مخواہ کا دردِ سر ہے۔ محلّہ بھر کے آدمیوں کا دروازے پر مجمع ہوگا۔ دس پانچ آدمیوں کو گالیاں کھانی پڑیں گی۔ اور حاصل کچھ نہیں۔ تو کیا صبر کر کے

بیٹھ رہوں؟ کیسے صبر کروں۔ یہ کوئی مال مفت کا نہ تھا۔ حرام کی رقم ہوتی تو سمجھتا مال حرام بود بجائے حرام رفت۔ یہاں تو ایک ایک پیسہ اپنے پسینے کا ہے۔ میں جو اتنی کفایت سے بسر کرتا ہوں۔ اتنی تکلیفیں اُٹھاتا ہوں۔ بخیل مشہور ہوں۔ گھر کے ضروری مصارف میں بھی قطع و برید کرتا رہتا ہوں۔ کیا اسی لیے کہ کسی اُچکے کے لیے سامانِ تفریح مہیّا کروں؟ مجھے ریشم سے بھی نفرت نہیں۔ نہ میوے کم مرغوب ہیں۔ نہ سوئے ہضم کی شکایت ہے کہ بالائی ہضم نہ کرسکوں۔ نہ ضعفِ بصر ہے کہ تھیٹر یا سینما کا لُطف نہ اُٹھاسکوں۔ آخر نفس کشی اسی لیے تو کرتا ہوں کہ میرے پاس چار پیسے ہوجائیں۔ ضرورت کے وقت کسی کا دستِ نگر نہ ہوں۔ کچھ جائداد لے سکوں۔ اور نہیں تو اچھا گھر ہی بنا لوں اور اس نفس کشی کا یہ نتیجہ! گاڑھی محنت کے روپے یوں گاؤ خورد ہوں۔ کاش مجھے معلوم ہوجاتا کہ یہ کس ظالم کی حرکت ہے۔ ستم ہے کہ میں یوں دن دھاڑے لُٹ جاؤں۔ اور اس غارت گر کا بال بیکا نہ ہو۔ اس کے گھر عید ہو رہی ہوگی۔ جشن منایا جا رہا ہوگا۔ سب کے سب بغلیں بجا رہے ہوں گے۔

اس خیال سے ڈاکٹر صاحب پر ایک پُراضطراب جذبۂ انتقام کا غلبہ ہوا۔ میں نے کبھی کسی فقیر کو، سادھو کو دروازے پر کھڑا ہونے نہیں دیا۔ باوجود تقاضوں کے احباب کی کبھی دعوت نہیں کی۔ عزیزوں اور مہمانوں سے محترز رہا۔ کیا اسی لیے کہ یوں ایک شاطر حریف کا تختۂ مشق بنوں۔ کاش مجھے اس کا سراغ مل جاتا تو میں ایک زہریلی سوئی سے اس کا کام تمام کردیتا۔

مگر کوئی علاج نہیں۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش کا معاملہ ہے۔ خفیہ پولیس والے بھی بس نام ہی کے ہیں۔ سُراغ رسانی کا مادہ نہیں۔ ان کی ساری کارروائی سیاسی تقریروں کی غلط رپورٹیں لکھنے پر ختم ہوجاتی ہے۔ انسان کتنا معذور ہے۔ کسی مسمرائزر کے پاس چلوں۔ وہ اس عقدے کو حل کرسکتا ہے۔ سُنتا ہوں یورپ اور امریکہ میں اکثر چوریوں کا سُراغ اس ترکیب سے مل جاتا ہے۔ مگر یہاں ایسا اِکمال کون ہے۔ اور پھر مسمریزم کے جوابات ہمیشہ معتبر نہیں ہوتے۔ جوتشیوں کی طرح وہ بھی قیاسات کے بحرِ بے کنار میں غوطے کھانے لگتے ہیں۔ کچھ لوگ نام بھی تو نکالتے ہیں۔ ان کے بڑے حیرت انگیز معجزے سُنتے ہیں۔ میں نے کبھی ان روایتوں پر اعتبار نہیں کیا۔ مگر کچھ نہ کچھ حقیقت ضرور ہے ورنہ اس مادی

دور میں اس علم کا وجود ہی نہ رہتا۔ آج کل کے علماء طبیعات کے قائل ہوتے جاتے ہیں۔ مگر بالفرض کسی مُلّا نے کسی بے جرم کا نام بتلا بھی دیا تو میرے ہاتھ میں اس کے پاداش کا کون سا آلہ ہے۔ وہ ضمیر گوئی شہادت کا کام نہیں دے سکتی۔ بجز اس کے ایک لمحے کے لیے میری طبیعت کو سکون ہوجائے اور اس سے کیا حاصل ہے۔

ہاں خوب یاد آیا۔ ندی کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک اوجھا بیٹھتا ہے۔ اس کے کرتب کے اکثر واقعات سُننے میں آئے ہیں۔ سُنتا ہوں دفینوں کا پتہ بتلا دیتا ہے۔ مریضوں کو بات کی بات میں چنگا کر دیتا ہے۔ چوری کے مال کا پتہ لگا دیتا ہے۔ موٹھ چلاتا ہے۔ موٹھ کی بڑی تعریف سُنی ہے۔ موٹھ چلا اور چور کے مُنہ سے خون جاری ہوا۔ جب تک وہ مال واپس نہ کردے خون بند نہیں ہوتا۔ یہ ترکیب اگر کارگر ہوجائے تو میری دلی منشاء پوری ہوجائے۔ مُنہ مانگی مُراد برآئے۔ روپے بھی مل جائیں۔ چور کو بھی تنبیہ ہوجائے۔ اس کے یہاں ہمیشہ غرض مندوں کا ہجوم لگا رہتا ہے۔ اگر اس میں کچھ کرتب نہ ہوتا تو اتنے لوگ کیوں جمع ہوتے۔ اس کے چہرے سے ایک ہیبت برستی ہے۔ آج کل کے تعلیم یافتہ لوگوں کو تو ان باتوں پر اعتقاد نہیں ہے۔ لیکن نیچ آدمیوں اور جہلا میں اس کا کافی چرچا ہے۔ بھوت آسیب جن کے فسانے روز ہی سُنا کرتا ہوں۔ کیوں نہ اسی اوجھے کے پاس چلوں! بالفرض کوئی فائدہ نہ بھی ہوتو میرا نقصان ہی کیا ہے۔ جہاں ڈھائی سو گئے ہیں دوچار روپے کا خون اور سہی۔ مال مل گیا تو پوچھنا ہی کیا۔ چور کی قرار واقعی سرزنش بھی ہوجائے گی۔ یہ موقع بھی اچھا ہے۔ آدمیوں کا ہجوم کم ہوگا۔ چلنا چاہیے۔

(۳)

دل میں یوں فیصلہ کرکے ڈاکٹر صاحب اس سیانے کے گھر کی طرف چلے۔ جاڑے کی رات تھی۔ نو بج گئے تھے۔ راستہ قریب قریب بند ہوگیا تھا۔ کبھی کبھی گھروں میں سے رامائن کی صدا کانوں میں آجاتی تھی۔ کچھ دُور کے بعد بالکل سناٹا ہوگیا۔ راستے کے دونوں طرف سبزیوں کے کھیت تھے۔ گیدڑوں کے ہوآنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ معلوم ہوتا ہے ان کا غول قریب ہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اکثر دُور سے ان کا نغمۂ مکروہ سُننے کا اتفاق ہوا تھا۔ مگر اس وقت اس سناٹے میں اور اتنے قریب سے ان کی چیخ سُن کر انھیں ڈر لگا۔ کئی بار اپنی چھڑی زمین پر پٹکی۔ پیر دھم دھمائے۔ یہ جانور بزدل ہوتے ہیں۔ آدمی کے قریب

نہیں آتے۔ لیکن پھر اندیشہ ہوا۔ کہیں ان میں کوئی پاگل ہو تو اس کا کاٹا تو بچتا ہی نہیں۔ یہ فکر ہوتے ہی جراثیم و بیکٹریا اور پاسٹیور انسٹیٹیوٹ اور کسولی کے خیالات ان کے دماغ میں چکر کھانے لگے۔ وہ تیزی سے قدم بڑھائے چلے آتے تھے۔ دفعتاً خیال آیا، کہیں میرے گھر میں کسی نے روپے اُڑا دیئے ہوں تو؟ فوراً ٹھٹک گئے۔ مگر ایک ہی لمحے میں انھوں نے اس صورتِ حال کا بھی فیصلہ کرلیا۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ گھر والوں کو تو اور بھی سخت سزا ملنی چاہیے۔ چور کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہیں ہوسکتی۔ لیکن گھر والوں کی ہمدردی کا مستحق میں ہوں۔ انھیں جاننا چاہیے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں انھیں کے لیے کرتا ہوں۔ اگر اس پر بھی وہ مجھے یوں دغا دینے پر آمادہ ہوں تو ان سے زیادہ کافر نعمت، ان سے زیادہ احسان فراموش، ان سے زیادہ بے رحم اور کون ہوگا! انھیں اور بھی سخت سزا ملنی چاہیے۔ ایسی عبرتناک کی پھر کبھی کسی کو ایسی جرأت نہ ہو۔

آخر وہ اوجھے کے گھر کے قریب جا پہنچے۔ آدمیوں کی بھیڑ نہ تھی۔ انھیں تسکین ہوئی۔ ہاں ان کے تیز قدم ذرا دھیمے پڑگئے۔ اور پھر خیال ہوا کہیں یہ سب ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہو تو خواہ مخواہ شرمندہ ہونا پڑے۔ جو سُنے احمق بنائے۔ شاید اوجھا بھی مجھے اپنے دل میں حقیر سمجھے۔ لیکن اب تو آگئے یہ تجربہ بھی حاصل کرلوں۔ اور کچھ نہ ہوگا تو امتحان ہی سہی۔ اوجھا کا نام بدھو تھا۔ لقب چودھری۔ ذات کا چمار مکان بہت تنگ۔ اور بوسیدہ سائبان اتنا نیچا کہ جھکنے پر بھی سر میں ٹکر لگنے کا خوف ہوتا تھا۔ دروازے پر ایک نیم کا درخت تھا۔ اس کے نیچے ایک چبوترہ۔ نیم کے درخت پر دُور سے ایک جھنڈی سی لہراتی ہوئی نظر آتی۔ چبوترے پر مٹی کے سینکڑوں ہاتھی سیندور سے رنگے ہوئے کھڑے تھے۔ کئی لوہے کے نوک دار ترسول بھی نظر آتے تھے۔ جو گویا ان سُست رفتار ہاتھیوں کے لیے آنکس کا کام دے رہے تھے۔ دس بجے تھے۔ بدھو چودھری جو ایک سیاہ فام قوی ہیکل، توندیلا رعب دار آدمی تھا ایک پھٹے ہوئے ٹاٹ پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ بوتل اور گلاس بھی سامنے رکھے ہوئے تھے۔

بدھو نے ڈاکٹرصاحب کو دیکھ کر فوراً بوتل چھپا دی۔ اور نیچے اُترکر سلام کیا۔ گھر میں سے ایک بُڑھیا نے مونڈھا لاکر ان کے لیے رکھ دیا۔ ڈاکٹرصاحب نے کچھ جھینپتے ہوئے سارا واقعہ مفصّل بیان کیا۔ بدھو نے کہا۔ ہجور یہ کون بڑا کام ہے۔ ابھی اسی اتوار کو دُرگاجی

کی گھڑی چوری گئی تھی۔ بہت کچھ تحقیقات کی۔ پتہ نہ چلا۔ مجھے بلایا میں نے بات کی بات میں پتہ لگا دیا۔ پانچ روپے انعام دیے۔ کل کی بات ہے جمعدار کی گھوڑی کھوئی گئی تھی۔ چاروں طرف دوڑے پھرے۔ میں نے ایسا پتہ بتایا کہ گھوڑی کھڑی چرتی ہوئی مل گئی۔ اس بدیا کی بدولت ہجور حاکم حکام سب مانتے ہیں۔

ﺟﮯ لال کو داروغہ اور جمعدار کا ذکر ناگوار گزرا۔ ان جاہلوں کی نگاہوں میں جو کچھ ہیں وہ داروغہ اور جمعدار ہیں۔ بولے میں محض چوری کا پتہ لگانا نہیں چاہتا، میں چور کو سزا دینی چاہتا ہوں۔

بدھو نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں۔ جمائیاں لیں، چٹکیاں بجائیں۔ اور بولا۔ یہ گھر کے کسی آدمی کا کام ہے۔

ﺟﮯ لال۔ کچھ پرواہ نہیں۔ کوئی ہو۔

بُڑھیا۔ پیچھے سے کوئی بات بنے بگڑے گی تو حضور ہمیں کو بُرا کہیں گے۔

ﺟﮯ لال۔ اس کی کچھ فکر نہ کرو۔ میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ میرا اپنا لڑکا ہی ہو تو بھی اُسے سبق دینے سے باز نہ آؤں گا۔ بلکہ اگر گھر کے کسی آدمی کی شرارت ہے تو میں اس کے ساتھ اور بھی سختی کرنا چاہتا ہوں۔ باہر کا آدمی میرے ساتھ دغا کرے تو معافی کے قابل ہے۔ لیکن گھر کے آدمی کو میں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

بدھو۔ تو ہجور چاہتے کیا ہیں؟

ﺟﮯ لال۔ بس یہی کہ میرے روپے مل جائیں اور چور کسی سخت عذاب میں گرفتار ہو جائے۔

بدھو۔ موٹھ چلا دوں؟

بُڑھیا۔ ”نہ بیٹا، موٹھ کے پاس نہ جانا۔ نہ جانے کیسی پڑے۔ کیسی نہ پڑے۔“

ﺟﮯ لال۔ تم موٹھ چلادو اس کا جو کچھ مختتانہ، شکرانہ ہو، وہ میں دینے کو تیار ہوں۔

بُڑھیا۔ ”بیٹا میں پھر کہتی ہوں۔ موٹھ کے پھیر میں نہ پڑ۔ کوئی جوکھم کی بات آپڑے گی۔ تو یہی بابو جی پھر تیرے سر ہوں گے۔ اور تیرے بنائے کچھ نہ بنے گی۔ کیا جانتا نہیں، موٹھ کا اتار کتنا کٹھن ہے؟

بدھو۔ ”بابو جی۔ سوچ لیجیے۔ موٹھ تو میں چلا دوں گا۔ لیکن اُس کو اتارنے کا جمہ (ذمہ) نہیں لے سکتا۔

جے لال۔ ''ابھی کہہ تو دیا۔ میں تم سے اُتارنے کو نہ کہوں گا۔ چلاؤ بھی تو''۔

بدھو نے ضروری سامان کی طویل فہرست پیش کی۔ ڈاکٹرصاحب نے چیزیں خریدنے کے مقابلے میں نقد روپے دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ بدھو بخوشی راضی ہوگیا۔ چلتے وقت بولے۔''ایسا منتر چلاؤ کہ صبح ہوتے ہوتے چور میرے پاس مال لیے ہوئے آکر حاضر ہوجائے۔''

بدھو نے کہا۔ آپ نسا کھاتر رہیں۔ ایسا ہی ہوگا۔

(۴)

جے لال گھر پہنچے تو گیارہ بج گئے تھے۔ جاڑے کی رات۔ کڑاکے کی سردی تھی۔ ان کی ماں اور بیوی دونوں بیٹھی ہوئی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ طبیعت بہلانے کے لیے بیچ میں ایک انگیٹھی رکھ لی تھی جس کا اثر جسم کی نسبت خیال پر زیادہ پڑتا تھا۔ یہاں کوئلہ تکلف سمجھا جاتا تھا۔ بڑھیا مہری جگیا جو مادی حرارت سے اس قدر بے نیاز تھی، وہیں ایک پھٹا ٹاٹ کا ٹکڑا اوڑھے پڑی ہوئی تھی۔ وہ باربار اٹھ کر اندھیری کوٹھڑی میں جاتی، طاق پر کچھ ٹٹول کر دیکھتی، اور پھر اپنی جگہ پر آکر پڑ رہتی۔ بار بار پوچھتی کتنی رات گئی ہوگی؟ ذرا بھی کھٹکا ہوتا تو چونک پڑتی اور متردد نگاہوں سے اِدھراُدھر دیکھنے لگتی۔ آج ڈاکٹرصاحب نے خلافِ معمول کیوں اتنی دیر لگائی؟ اس کا سب کو تعجب تھا۔ ایسا بہت کم موقع ہوتا تھا کہ انھیں مریضوں کو دیکھنے کے لیے رات کو جانا پڑتا ہو۔ اگر کچھ لوگ ان کے دستِ شفا کے قائل بھی تھے تو رات کو اس گلی میں آنے کی زحمت نہ گوارا کرتے تھے۔ ملکی یا مجلسی معاملات سے ان کو اتنا شوق نہ تھا جو اس تاخیر کا باعث ہو۔ مجلس احباب میں وہ کبھی شریک نہ ہوتے تھے۔ کسی تھیٹر میں جانا ان کے دائرہ خیال سے بھی باہر تھا۔ ماں نے کہا۔

جانے کہاں چلے گئے؟ کھانا بالکل پانی ہوگیا ہوگا۔

اہلیہ۔ آدمی جاتا ہے تو کہہ کے جاتا ہے۔ آدھی رات سے اُوپر ہوگئی۔

ماں۔ کوئی ایسی ہی اٹک ہوگئی۔ نہیں تو وہ کب گھر سے باہر نکلتے ہیں۔

اہلیہ۔ میں تو اب سونے جاتی ہوں۔ ان کا جب جی چاہے آئیں۔ کوئی ساری رات بیٹھا ہوا پہرہ دے گا۔

یہی باتیں ہورہی تھیں کہ ڈاکٹرصاحب اندر داخل ہوئے۔ اہلیہ سنبھل بیٹھی۔ جگیا

اُٹھ کھڑی ہوئی اور ان کی طرف سہمی ہوئی آنکھوں سے تاکنے لگی۔ ماں نے پوچھا آج کہاں دیر لگا دی؟

جے لال۔ تم لوگ آرام سے بیٹھی ہو نہ مجھے دیر ہوگئی۔ اس کی تمھیں کیا فکر۔ جاؤ آرام سے سوؤ۔ ان ظاہرداریوں سے میں دھوکے میں نہیں آتا۔ موقع پاؤ تو گلا کاٹ لو۔ اس پر چلی ہو، باتیں بنانے۔

ماں نے شرمندہ اور خفیف ہوکر کہا۔ ”بیٹا۔ ایسی دل دُکھانے والی باتیں کیوں کرتے ہو۔ گھر میں تمھارا کون بیری ہے جو تمھارا بُرا چاہے گا۔“

جے لال۔ میں کسی کو اپنا دوست نہیں سمجھتا۔ سبھی میرے دشمن ہیں۔ میری جان کے گاہک ۔نہیں تو کیا آنکھ اوجھل ہوتے ہی میز پر سے ڈھائی سو روپے غائب ہوجاتے۔ دروازے باہر سے بند تھے۔ کوئی غیر آیا نہیں اور روپے رکھتے ہی رکھتے اُڑگئے۔ جو لوگ اس طرح میرا گلا کاٹنے پر آمادہ ہوں انھیں کیوں کر اپنا سمجھوں۔ میں نے خوب پتہ لگا لیا ہے۔ ابھی ایک سیانے کے پاس سے چلا آرہا ہوں۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ گھر ہی کے کسی آدمی کا فعل ہے۔ خیر جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ میں بھی ثابت کردوں گا کہ میں اپنے دشمنوں کا دوست نہیں ہوں۔ اگر باہر کے کسی آدمی نے مجھے زک دیا ہوتا تو شاید میں درگزر کر دیتا۔ لیکن جب گھر کے آدمی جن کے لیے میں رات دن چکی پیتا ہوں، میرے ساتھ ایسی دغا کریں تو وہ اسی لائق ہیں کہ ان کے ساتھ ذرا بھی رو رعایت نہ کی جائے۔ دیکھنا صبح تک چور کی کیا حالت ہوتی ہے۔ میں نے سیانے کو موٹھ چلانے کو کہہ دیا ہے۔ موٹھ چلا اور ادھر چور کی جان کی خیریت نہیں۔

جگیا گھبرا کر بولی۔ بھیا، موٹھ میں تو جان جوکھم ہے۔

جے لال۔ ”چور کی یہی سزا ہے۔“

بڑھیا۔ ”کس سیانے نے چلایا ہے؟“

جے لال۔ ”بدھوچودھری نے۔“

بُڑھیا۔ ”ارے رام۔ اس کے موٹھ کا تو اُتار ہی نہیں۔“

جے لال اپنے کمرے میں چلے گئے تو ماں نے کہا۔ سُوم کا دھن شیطان کھاتا ہے۔

ڈھائی سو روپے کو کوئی مُنہ مار کر لے گیا۔ اتنے میں تو میرے ساتوں دھام ہو جاتے۔

اہلیہ بولی۔ کنگن کے لیے برسوں سے جھینک رہی ہوں۔ اچھا ہوا میری آہ پڑی ہے۔

ماں ۔ ''بھلا گھر میں ان کے روپے کون چھوئے گا۔''

اہلیہ۔ ''کواڑ کھلے ہوں گے۔ کوئی باہر کا آدمی اُڑا لے گیا ہو گا۔''

ماں ۔ ''ان کو بشواش کیوں کر آگیا کہ گھر کے کسی آدمی نے روپے چُرائے ہیں۔''

اہلیہ۔ ''روپے کا لوبھ آدمی کو شکی بنا دیتا ہے۔''

(۵)

رات کا ایک بجا تھا۔ ڈاکٹر جے لال وحشت ناک خوابوں کے نرغے میں پڑے ہوئے تھے۔ دفعتاً اہلیہ نے آکر کہا۔ ذرا چل کر دیکھو۔ جگیا کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے زبان اینٹھ گئی۔ کچھ بولتی ہی نہیں۔ آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔

جے لال چونک کر اُٹھ بیٹھے۔ ایک لمحہ اِدھر اُدھر تاکتے رہے۔ گویا تحقیق کر رہے تھے۔ یہ بھی تو خواب نہیں ہے۔ تب بولے کیا کیا۔ جگیا کو کیا ہو گیا؟

بیوی نے پھر جگیا کی حالت بیان کی۔ جے لال کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم نظر آیا۔ بولے چور پکڑا گیا۔ موٹھ نے اپنا کام کیا۔

بیوی۔ ''اور جو گھر کے کسی آدمی نے لیے ہوتے؟''

جے لال۔ ''تو اس کی بھی یہی حالت ہوتی۔ ہمیشہ کے لیے سبق مل جاتا۔''

بیوی۔ ''ڈھائی سو روپے کے پیچھے جان لے لیتے؟''

جے لال۔ ''ڈھائی سور روپے کے لیے نہیں۔ ضرورت پڑے تو ڈھائی ہزار خرچ کر سکتا ہوں۔ صرف دغابازی کی سزا دینے کے لیے۔''

بیوی ۔ ''بڑے بے رحم ہو۔''

جے لال۔ ''تمھیں سر سے پاؤں تک سونے سے لاد دوں۔ تو مجھے نیکی کا پُتلہ سمجھنے لگو۔ کیوں؟ افسوس ہے کہ تم سے یہ سند نہیں لے سکتا؟

یہ کہتے ہوئے وہ جگیا کی کوٹھڑی میں گئے۔ اس کی حالت اس سے کہیں زیادہ خراب تھی جو اہلیہ نے بیان کی تھی۔ اعضا اکڑ گئے تھے۔ نبض کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ان کی ماں اسے ہوش میں لانے کے لیے بار بار اس کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے دے رہی تھی۔ جب جے لال

نے یہ حالت دیکھی تو ہوش اُڑگئے۔ انھیں اپنی تدبیر کے کارگر ہونے پر خوش ہونا چاہیے تھا۔ جگیا نے روپے چرائے۔ اس کے لیے مزید ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن موٹھ ایسی سریع الاثر اور قاتل چیز ہے۔ اس کا انھیں گمان بھی نہ تھا۔ وہ چور کو ایڑیاں رگڑتے، درد سے کراہتے اور تڑپتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کی یہ خواہش انتقام غیر متوقع طور پر پوری ہورہی تھی۔ مگر وہ یہ نمک کی کثرت تھی جو لقمہ کو مُنہ کے اندر جانے نہیں دیتی۔ یہ نظارۂ درد دیکھ کر انھیں خوشی کی بجائے روحانی صدمہ ہوا۔ طیش میں ہم اپنی بے رحمی اور بے دردی کا مبالغہ آمیز انداز کر لیا کرتے ہیں۔ واقعہ تخئیل سے کہیں زیادہ موثر ہوتا ہے۔ جنگ کا تخئیل کتنا شاعرانہ ہے، رزمیہ شاعری کتنی شرارت انگیز۔ مگر کچلی ہوئی لاشیں اور کٹے ہوئے اعضا دیکھ کر کون بشر ہے جس کے رونگٹے نہ کھڑے ہوجائیں۔ بلاشبہ درد، انسان کی سرشت ہے!

اس کے علاوہ مجرم کی خستہ حالی نے اس جذبۂ درد کو اور بھی متحرک کر دیا جگیا جیسا وجود نحیف ان کے طیش کا شکار ہوگا، اس کا انھیں گمان نہ تھا۔ وہ سمجھے تھے میرے انتقام کا وار کسی جاندار آدمی پر ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بیوی اور لڑکے کو بھی اس وار کے قابل سمجھتے تھے۔ لیکن مرے کو مارنا۔ کچلے کو کچلنا انھیں اپنے شانِ انتقام کے خلاف معلوم ہوا۔ جگیا کی یہ حرکت معافی کے قابل تھی۔ جسے روٹیوں کے لالے ہوں جو کپڑوں کو ترسے، جس کا خانۂ آرزو ہمیشہ اندھیرا رہا ہو، جس کی خواہشیں کبھی مسکراتی نہ ہوں۔ اس کی نیت خام ہوجائے تو تعجب کی بات نہیں۔ وہ فوراً دواخانے میں گئے۔ بہترین ہوش آور ادویات کا ایک مرکب تیار کر لائے اور جگیا کے حلق میں ڈال دیا۔ اس سے کچھ افاقہ نہ ہوا تو برقی آلات لائے اور جگیا کو ہوش میں لانے کی کوشش شروع کی۔ ایک لمحے میں جگیا کی آنکھیں کھُل گئیں۔ اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے جے لال کو دیکھا۔ جیسے لڑکا اپنے مدرس کی قچی کی طرف دیکھتا ہے۔ اور اُکھڑی ہوئی آواز میں بولی۔ ہائے رام کلیجہ پھنکا جاتا ہے۔ اپنے روپے لے لے۔ طاق پر ایک ہانڈی ہے، اس میں رکھے ہوئے ہیں۔ مٹھی بھر روپیوں کے لیے مجھے آگ پر جلا رہا ہے۔ میں تمھیں اتنا کالا نہ سمجھتی تھی۔ ہائے رام!

یہ کہتے کہتے اس پر غشی عارض ہوگئی۔ نبض بند ہوگئی۔ ہونٹ نیلے پڑگئے۔ اعضا میں تشنج ہونے لگا۔ جے لال نے بیکسانہ ندامت سے بیوی کی طرف دیکھا اور بولے میں تو اپنی

ساری حکمت کر چکا۔ اب اسے ہوش میں لانا میرے امکان سے باہر ہے۔ میں کیا جانتا تھا کہ یہ کمبخت موٹھ اتنا قاتل ہوتا ہے۔ کہیں اس کی جان پر بن گئی تو ساری عمر پچھتانا پڑے گا۔ ضمیر کی ٹھوکروں سے کبھی نجات نہیں ملے گی۔ کیا کروں۔ کچھ عقل کام نہیں کرتی۔

اہلیہ۔ سول سرجن کو بلاؤ۔ شاید وہ کوئی اچھی دوا دے دے۔ کسی کو جان بوجھ کر آگ میں ڈھکیلنا نہ چاہیے۔

جے لال۔ ''سول سرجن اس سے زیادہ کچھ نہیں کرسکتے جو میں کرچکا۔ ہر لمحہ اس کی حالت نازک ہوتی جاتی ہے۔ نہ جانے ظالم نے کون سا منتر چلا دیا۔ اس کی ماں مجھے بہت سمجھاتی رہی۔ لیکن میں نے طیش میں اس کی باتوں کی ذرا پروا نہ کی۔

ماں۔ ''بیٹا، تم اسی کو بلاؤ جس نے منتر چلایا ہے۔ وہی اسے اُتار سکے گا۔ رات تو بہت گئی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے گا۔ کہیں مرگئی تو ہتیا سر پر پڑے گی۔ خاندان کو ہمیشہ ستائے گی۔

(٦)

دو کا عمل تھا۔ ٹھنڈی ہوا ہڈیوں میں چبھی جاتی تھی۔ جے لال قدم بڑھائے بدھو چودھری کے گھر کی طرف چلے جاتے تھے۔ اِدھراُدھر بے سُود نگاہیں دوڑاتے تھے کہ کوئی یکہ یا ٹانگہ مل جائے۔ انھیں معلوم ہو رہا تھا کہ بدھو کا مکان بہت دُور ہوگیا ہے۔ کئی بار دھوکا ہوا۔ کہیں راستہ تو نہیں بھول گیا۔ کئی بار اِدھر آیا ہوں، یہ باغیچہ کبھی نہ ملا۔ یہ لیٹر بکس بھی سڑک پر کبھی نہیں دیکھا۔ یہ پُل تو ہرگز نہ تھا۔ ضرور راستہ بھول گیا۔ کس سے پوچھوں۔ وہ اپنی یادداشت پر جھنجھلائے اور اسی رو میں تھوڑی دُور تک دوڑے۔ معلوم نہیں ظالم اس وقت ملے گا بھی یا نہیں۔ شراب میں مست پڑا ہوگا۔ کہیں وہ غریب چل نہ بسی ہو۔ کئی بار دوسرے راستوں پر گھوم جانے کا خیال ہوا۔ لیکن تحریک باطن نے سیدھے راستے سے ہٹنے نہ دیا۔ یہاں تک کہ بدھو کا مکان نظر آیا۔ ڈاکٹر صاحب کی جان میں جان آئی بدھو کے دروازے پر جاکر زور سے کنڈی کھٹکائی۔ اندر سے ایک کتے نے ناشائستہ انداز سے جواب دیا۔ لیکن کوئی انسانی آواز نہ سُنائی دی۔ پھر اور زور سے کواڑ کھٹکھٹائے۔ کتا اور بھی تُند ہوا۔ بڑھیا کی نیند ٹوٹی۔ یہ کون اتنی رات گئے کیواڑ توڑے ڈالتا ہے۔

ڈاکٹر ۔ میں ہوں۔ جو تھوڑی دیر ہوئی تیرے پاس آیا تھا۔

بڑھیا نے آواز پہچانی۔ سمجھ گئی۔ ان کے گھر کے کسی آدمی پر آفت آئی۔ نہیں تو اتنی رات گئے کیوں آتے۔ مگر ابھی تو بُدھو نے موٹھ چلایا نہیں اس کا اثر کیوں کر ہوا سمجھاتی تھی، تب نہ مانا۔ خوب پھنسے۔ اُٹھ کر کُپی جلائی۔ اور اسے لیے ہوئے باہر نکلی۔

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ بدھو چودھری سورہے ہیں کیا۔ ذرا جگادو۔

بڑھیا۔ ”نہ بابوجی۔ اس بکھت (وقت) میں نہ جگاؤں گی مجھے کچا کھا جائے گا۔ رات کو لاٹ صاحب بھی آئیں تو نہیں اُٹھتا۔

ڈاکٹر صاحب نے چند لفظوں میں سارا ماجرا بیان کیا۔ اور بڑی منت کے ساتھ التجا کی کہ بدھو کو جگائیے۔ اتنے میں بدھو خودہی باہر نکل آیا۔ اور آنکھیں ملتے ہوئے بولا۔ کہیے بابوجی۔ کیا حکم ہے؟

بُڑھیا نے چڑھ کر کہا۔ تیری نیند آج کیسے کھل گئی؟ جگانے گئی ہوتی تو مارنے اُٹھتا۔

ڈاکٹر۔ میں نے سارا ماجرا بڑھیا سے کہہ دیا ہے انھیں سے پوچھو۔

بڑھیا۔ کچھ نہیں۔ تو نے موٹھ چلایا تھا۔ روپے ان کے گھر کی مہری نے لیے ہیں۔ اب اس کا اب تب ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر۔ غریب مر رہی ہے۔ کچھ ایسی تدبیر کرو کہ اس کی جان بچ جائے۔

بدھو۔ یہ تو اب بُری سُنائی۔ موٹھ کا پھیرنا سہج نہیں ہے۔

بڑھیا۔ ”ارے بیٹا۔ جان جوکھم ہے۔ کیا تجھے مالوم (معلوم) نہیں ہے۔ کہیں اُلٹے پھیرنے والے ہی پر پڑے تو جان بچنی مشکل ہوجائے۔

ڈاکٹر۔ ”اب اس کی جان تمھارے ہی بچائے بچے گی۔ اتنا دھرم کرو۔“

بڑھیا۔ دوسرے کی جان کھاتر (خاطر) کوئی اپنی جان گاڑھ میں ڈالے گا۔“

ڈاکٹر۔ تم رات دن یہی کام کرتے رہتے ہو۔ تمھیں اس کے داؤں گھات سب معلوم ہیں۔ مار بھی سکتے ہو۔ جلا بھی سکتے ہو۔ میرا تو اِن باتوں پر بالکل بشواش ہی نہ تھا۔ لیکن تمھارا کمال دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تمھارے ہاتھوں کتنے ہی آدمیوں کا بھلا ہوتا ہے۔ اس غریب بڑھیا پر رحم کرو۔

بدھو کچھ پسیجا۔ لیکن اس کی ماں معاملہ داری میں اس سے کہیں زیادہ فائق تھی۔ اسے خوف ہوا کہیں یہ نرم ہوکر معاملہ نہ بگاڑ دے۔ اس نے بدھو کو کچھ کہنے کا موقع نہ

دیا۔ بولی۔ بابوجی یہ تو سب ٹھیک ہے مگر ہمارے بھی تو بال بچے ہیں۔ نہ جانے کیسی پڑے کیسی نہ پڑے۔ وہ تو ہمارے سر جائے گی نا۔ آپ تو اپنا کام نکال کر الگ ہوجائیں گے۔ موٹھ پھیرنا دِل لگی نہیں ہے۔

بدھو۔ ''ہاں بابوجی۔ کام بڑے جوکھم کا ہے۔''

ڈاکٹر۔ ''کام جوکھم کا ہے تو میں تم سے مفت نہیں کروانا چاہتا۔''

بُڑھیا۔''آپ بہت دیں گے۔ سو پچاس روپے دے دیں گے۔ اتنے میں ہم کے دن کھائیں گے۔ موٹھ پھیرنا، سانپ کے بل میں ہاتھ ڈالنا، آگ میں کودنا ہے۔ بھگوان کی ایسی ہی نگاہ ہو تو جان بچتی ہے۔''

ڈاکٹر۔ ''تو ماتاجی، میں تم سے باہر تو نہیں ہوتا ہوں۔ جو کچھ تمھاری مرضی ہو وہ کہو۔ مجھے تو اس غریب کی جان بچانی ہے۔ یہاں باتوں میں دیر ہو رہی ہے۔ وہاں معلوم نہیں اس کا کیا حال ہوگا؟''

بڑھیا۔ ''دیر تو آپ ہی کر رہے ہیں۔ آپ بات پکی کردیں تو آپ کے ساتھ جائے گا اور جو کچھ اس کے لیے ہوسکے گا کرے گا۔ آپ کی خاطر یہ جوکھم اپنے سر لے رہی ہوں۔ دوسرا ہوتا تو ٹکا سا جواب دے دیتی۔ آپ کے ملاہجے (ملاحظے) میں پڑکر جان بوجھ کر جہر (زہر) پی رہی ہوں۔''

ڈاکٹرصاحب کو ایک ایک لمحہ ایک ایک برس معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بدھو کو اسی وقت اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ کہیں اس کا دم نکل گیا تو یہ جاکر کیا بنائے گا۔ اس وقت ان کی نگاہوں میں روپے کی کوئی قیمت نہ تھی۔ صرف یہی فکر تھی کہ جگیا موت کے مُنہ سے نکل آئے۔ جس روپے پر وہ اپنی ضرورتیں اور آسائشیں، اپنے گھر والوں کی خوشی اور خواہش تصدق کرتے تھے اسے جذبۂ درد نے بالکل ناچیز بنا دیا تھا۔ بولے تمھیں بتلادو۔ اب میں کیا کہوں۔ مگر جو کچھ کہنا ہو فوراً کہہ دو۔''

بڑھیا۔ اچھا۔ تو پانسو روپے دے دیجیے۔ اس سے کم میں کام نہ ہوگا۔

بدھو نے ماں کی طرف حیرت سے دیکھا۔ اور ڈاکٹرصاحب کو تو سکتہ سا ہوگیا۔ مایوسانہ انداز سے بولے۔ اتنا تو میرے قابو سے باہر ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس کی تقدیر میں مرنا ہی لِکھا ہے۔''

بڑھیا۔ تو جانے دیجیے۔ ہمیں اپنی جان بھاری تھوڑے ہی ہے۔ ہم تو آپ کے ملاحظے (ملاحظے) سے اس کام کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ جاؤ بدھو، سوؤ۔

ڈاکٹر۔ بوڑھی ماتا۔ اتنی بے رحمی نہ کرو۔ آدمی کا کام آدمی ہی سے نکلتا ہے۔

بدھو۔ نہیں بابو جی میں ہر طرح سے آپ کا کام کرنے کو تیار ہوں۔ اس نے پانسو کہے۔ آپ کچھ کم کردیجیے۔ ہاں جوکھم کا دھیان رکھیے گا۔

بڑھیا۔ تو جاکے سوتا کیوں نہیں۔ انھیں روپے پیارے ہیں۔ تو کیا تجھے اپنی جان پیاری نہیں ہے۔ کل کو لہو تھوکنے لگے گا۔ تو کچھ بنائے نہ بنے گی۔ بال بچوں کو کس پر چھوڑے گا؟ گھر میں کچھ......)

ڈاکٹر صاحب نے شرماتے ہوئے ڈھائی سو روپے کہے۔ بدھو راضی ہوگیا۔ معاملہ طے ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اسے ساتھ لے کر گھر کی طرف چلے۔ انھیں ایسی روحانی مسرت کبھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ ہارا ہوا مقدمہ جیت کر عدالت سے لوٹنے والا مقدمہ باز بھی اتنا خوش نہ ہوتا ہوگا۔ لپکے چلے جاتے تھے۔ بدھو سے باربار قدم بڑھانے کو کہتے۔ گھر پہنچے تو جگیا کو نزاع کی حالت میں پایا۔ معلوم ہوتا تھا، دمِ واپسیں ہے۔ ان کی ماں اور بیوی دونوں باچشم تر مایوس بیٹھی ہوئی تھیں۔ بدھو کو دونوں نے منت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب کے آنسو بھی نہ رُک سکے۔ بڑھیا کے سر کی طرف جھکے تو اشک کے کئی قطرے اس کے مرجھائے ہوئے زرد رخساروں پر ٹپک پڑے۔ بدھو کی فراست اب بیدار ہوئی۔ بڑھیا کے بدن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ اب میرے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ دم توڑ رہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے گڑگڑا کر کہا۔ نہیں چودھری۔ ایشور کے لیے اپنا منتر چلاؤ۔ اس کی جان بچ گئی تو میں ہمیشہ کے لیے تمھارا غلام بنا رہوں گا۔

بدھو۔ آپ مجھ سے جان بوجھ کر زہر کھانے کو کہتے ہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ موٹھ کے دیوتا اس بکھت (وقت) اتنے گرم ہیں۔ وہ میرے من میں بیٹھے کہہ رہے ہیں۔ تم نے ہمارا شکار چھینا تو ہم تجھے نگل جائیں گے۔

ڈاکٹر۔ دیوتا کو کسی طرح راضی کرلو۔

بدھو۔ مشکل سے راضی ہوں گے۔ پانچ سو روپے دیجیے تو اس کی جان بچے۔ اُتارے کے لیے بڑے بڑے جتن کرنے پڑیں گے۔

ڈاکٹر۔ پانچ سو روپے دے دوں تو اس کو بچا دو گے؟

بدھو۔ ہاں سرط بدکر۔

ڈاکٹر صاحب بجلی کی طرح لپک کر اپنے گھر میں گئے اور باقی پانچ سو روپوں کی تھیلی لاکر بدھو کے سامنے رکھ دی۔ بدھو نے فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ تب جگیا کا سر اپنی گود میں رکھ کر اس پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ کچھ بُدبُدا کر چھُو چھُو کرتا جاتا تھا۔ ایک لمحے میں اس کی صورت وحشتناک ہوگئی۔ آنکھوں سے شعاعیں سی نکلنے لگیں۔ باربار انگڑائیاں لینے لگا۔ اسی عالم میں اس نے ایک بے سرگیت گانا شروع کیا۔ مگر ہاتھ جگیا کے سر پر ہی تھے۔ آخر آدھ گھنٹے میں بڑھیا نے آنکھیں کھول دیں جیسے بجھے ہوئے چراغ میں تیل پڑجائے۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی حالت رو بہ اصلاح ہونے لگی۔ اور مُرغ کی پہلی بانگ سُنائی دی۔ اُدھر بڑھیا نے ایک انگڑائی لی اور اُٹھ بیٹھی۔ گویا اِس بانگ سحر نے اسے بیدار کر دیا۔

(۷)

سات بجے تھے۔ جگیا میٹھی نیند سو رہی تھی۔ اس کا چہرہ بشاش تھا۔ بدھو روپوں کی تھیلی لے کر ابھی ابھی رخصت ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی ماں نے کہا۔ بات کی بات پانچ سو روپے مار لے گیا۔

ڈاکٹر۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ ایک مُردہ کو جِلا گیا۔ کیا اس کی جان کی قیمت اتنی بھی نہیں ہے؟

ماں۔ دیکھو طاق پر ہانڈی میں ڈھائی سو روپے ہیں یا نہیں؟

ڈاکٹر۔ نہیں۔ ان روپوں میں ہاتھ مت لگانا۔ انھیں وہیں پڑا رہنے دو۔ اس نے تیرتھ کرنے کے لیے تھے۔ وہ اسی کام میں خرچ ہوں گے۔

ماں۔ یہ ساڑھے سات سو روپے اسی کے بھاگ کے تھے۔

ڈاکٹر۔ اس کے بھاگ کے تو ڈھائی سو ہی تھے۔ باقی میرے بھاگ کے تھے۔ ان کی بدولت مجھے ایسا سبق مل گیا جو عمر بھر نہ بھولے گا۔ تم اب مجھے جائز خرچ میں مٹھی بند کرتے ہوئے نہ پاؤ گی۔

اردو ماہنامہ زمانہ جنوری 1922 میں شائع ہوا۔ اردو مجموعہ خواب و خیال میں شامل ہے۔ ہندی میں اسی عنوان سے مان سرور 8 میں شامل ہے۔

بزم پریشان

لکھنؤ کے محلّہ نوبستہ میں ایک منشی میکولال مختار رہتے تھے۔ بہت ہی مہمان نواز، خوش طبع اور نیک آدمی تھے۔ قانون میں اتنے ماہر کہ ایسا شاذ ہی کوئی مقدمہ ہوتا تھا جس میں وہ ایک فریق کی طرف سے نہ رہتے ہوں۔ سادھو سنتوں سے بھی انھیں عقیدت تھی۔ ان کے فیضِ صحبت سے مختار صاحب نے کچھ علم حقیقی اور کچھ چرس گانجہ کی مشق حاصل کرلی تھی۔ رہی شراب، وہ اُن کی خاندانی صفت تھی۔ شراب کے نشہ میں وہ قانونی مسودے خوب لکھتے تھے۔ طائر فکر آسمان پر جا پہنچتا تھا۔ گانجے اور چرس سے ان کی نگاہِ باطن روشن ہوتی تھی۔ محلے والوں پر اُن کا بڑا رعب تھا۔ لیکن یہ اُن کی قانونی وقار کا نہیں ان کی طبعی شرافت کا نتیجہ تھا۔ محلے کے یکہ بان، گوالے، کہار، سب اُن کے بن داموں غلام تھے۔ اپنے سو کام چھوڑ کر اُن کی خدمت بجا لاتے تھے۔ مختار صاحب کی مخمر فیاضی نے انھیں رام کرلیا تھا۔ وہ روز کچہری سے آتے ہی الگو کہار کے سامنے تین روپے پھینک دیتے تھے۔ الگو اُن کا منشا سمجھ جاتا تھا۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ تھی۔ شام کو شراب کی ایک بوتل، کچھ گانجہ اور چرس آجاتا بزم نشاط آراستہ ہوجاتی تھی۔ یاران جاں نثار آپہنچتے۔ ایک طرف موکلوں کی قطار بیٹھتی۔ دوسری طرف احباب کی۔ معرفت اور ویراگ کے مسئلے پیش ہوجاتے۔ اثناء تقریر میں موکلوں سے بھی دو چار باتیں کرلیتے تھے۔ دس بجے تک مجلس گرم رہتی تھی۔ منشی جی کو اپنے پیشے اور اس ذکر معرفت کے سوا دنیا کے اور کسی معاملے سے سروکار نہ تھا۔ ملک کی کسی تحریک، کسی تقریب، کسی مسئلہ سے انھیں تعلق نہ تھا۔ اس معاملہ میں وہ سچے تارک تھے۔ بنگالہ کی تقسیم ہوئی سودیشی تحریک کا چرچا ہوا۔ نرم اور گرم فرقے کھڑے ہوئے۔ سیاسی اُصولوں کا ظہور ہوا۔ سوراجیہ کی تمنائیں پیدا ہوئیں۔ قوم اور قومیت کے ترانوں سے آسمان گونج اُٹھا۔ مگر منشی جی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ عدالت اور شراب کے سوا دنیا کی اور سبھی چیزیں اُن کی نظروں میں خواب و خیال تھیں۔

(۲)

چراغ جل چکے تھے۔ منشی میکولال کی اندرسبھا جم گئی تھی۔ پر ابھی لال پری جلوہ افروز نہ ہوئی تھی۔ الگو بازار سے نہ لوٹا تھا۔ لوگ بار بار مشتاق نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک آدمی برآمدے میں چشم براہ کھڑا تھا۔ دو تین آدمی اس کی ٹوہ لینے کے لیے سڑک پر کھڑے تھے۔ لیکن الگو آتا نظر نہ آتا تھا۔ آج زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ منشی جی کو یہ تکلیف اُٹھانی پڑی۔ انتظار کی بے قراری نے محویت کی صورت اختیار کرلی تھی۔ نہ کسی سے بولتے تھے، نہ کسی طرف تاکتے تھے۔ ساری دماغی قوتیں نقطۂ انتظار پر مرکوز ہوگئی تھیں۔

دفعتاً شور اُٹھا، الگو آرہا ہے۔ منشی جی جاگ پڑے، احباب شگفتہ ہوگئے، پہلو بدل بدل کر سنبھل بیٹھے۔ آنکھیں مسرور ہوگئیں۔ انتظار سے لطف وصال دوچند ہوجاتا ہے۔ ایک لمحہ میں الگو سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ منشی جی نے اُسے ڈانٹا نہیں۔ یہ پہلی خطا تھی۔ کسی وجہ سے دیر ہوگئی ہوگی۔ دبی ہوئی، پُرشوق نگاہوں سے الگو کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ بوتل نہ تھی حیرت ہوئی۔ یقین نہ آیا۔ پھر غور سے دیکھا بوتل نہ تھی۔ شاید اس نے کہیں باہر رکھ دی ہوگی ملائمت سے بولے۔"بوتل کہاں ہے۔"

الگو۔ "آج نہیں ملی۔"

میکولال۔ "یہ کیوں۔"

الگو۔ "سوراج والے دوکان کے دونوں ناکے روکے کھڑے ہیں۔ کسی کو اُدھر جانے ہی نہیں دیتے۔ اب مختار صاحب کو غصہ آیا۔ الگو پر نہیں، سوراج والوں پر۔ انھیں میری شراب بند کرنے کا کیا مجاز ہے؟ معترضانہ انداز سے بولے۔"تم نے میرا نام نہیں لیا؟"

الگو۔ "بہت کہا۔ وہاں کون کسی کی سُنتا تھا۔ سبھی لوگ خالی ہاتھ لوٹے آتے تھے۔ میں بھی لوٹ آیا۔"

میکولال۔ "چرس لائے؟"

الگو۔ "وہاں بھی یہی حال تھا۔"

میکولال۔ "تم میرے نوکر ہو یا سوراج والوں کے۔"

الگو۔ ”مُنہ میں کالکھ لگوانے کے لیے تھوڑے ہی نوکر ہوں۔“
میکولال۔ ”تو کیا وہ بدمعاش لوگ مُنہ میں کالکھ لگا رہے تھے؟“
الگو۔ ”دیکھا تو نہیں، پر سب یہی کہتے تھے۔“
میکولال۔ ”اچھی بات ہے۔ میں خود جاتا ہوں۔ دیکھوں کس کی مجال ہے جو مجھے روکے۔ ایک ایک کو لال گھر دکھا دوں گا۔ یہ سرکار کا راج ہے۔ کوئی بدعملی نہیں ہے۔ وہاں کوئی پولیس کا سپاہی نہ تھا۔“
الگو۔ ”تھانہ دار صاحب آپ ہی کھڑے سب سے کہتے تھے جس کا جی چاہے اندر جائے، لائے یا پئے۔ لیکن نہ جانے کیوں لوگ لوٹے آتے تھے۔ کوئی اُن کی نہ سُنتا تھا۔“
میکولال۔ ”تھانہ دار صاحب میرے دوست ہیں۔ چلو جی عیدو چلتے ہو۔ رام بلی۔ بچن۔ جھنکو سب چلیں۔ ایک ایک بوتل لے لو۔ دیکھوں کون روکتا ہے؟ کل ہی تو مزہ چکھا دوں گا۔“

(۳)

منشی جی اپنے چاروں رفیقوں کے ساتھ شراب خانہ کی گلی کے سامنے پہنچے تو وہاں بہت بھیڑ تھی۔ بیچ میں دو نورانی صورتیں نظر آئیں۔ ایک مولانا ضامن تھے جو شہر کے مشہور مجتہد تھے۔ دوسرے سوامی گھٹانند تھے جو لکھنؤ کی سیوا سمتی کے بانی اور رعایا کے سچے خدمت گزار تھے۔ اُن کے سامنے ہی تھانہ دار صاحب کئی کانسٹبلوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ منشی جی اور اُن کے رفیقوں کو دیکھتے ہی تھانہ دار صاحب خوش ہوکر بولے۔ ”آیئے مختار صاحب۔ کیا آج آپ ہی کو تکلیف کرنی پڑی۔ یہ چاروں آدمی آپ ہی کے ساتھ ہیں نہ؟“
میکولال۔ ”جی ہاں۔ پہلے اپنا آدمی بھیجا تھا۔ وہ ناکام واپس گیا۔ سُنا آج یہاں ہڑبونگ مچی ہوئی ہے۔ سوراجیہ والے کسی کو اندر جانے ہی نہیں دیتے۔
تھانہ دار۔ جی نہیں۔ یہاں کس کی مجال ہے جو کسی کے کام میں مخل ہوسکے۔ آپ شوق سے جایئے۔ کوئی چوں تک نہیں کرسکتا۔ آخر میں یہاں کس لیے ہوں؟
منشی جی نے اپنے رفیقوں کو فخر آمیز نظروں سے دیکھا اور گلی میں گھسے۔ دفعتاً مولانا ضامن نے عیدو سے نہایت عاجزانہ انداز سے کہا، دوست یہ تو تمھاری نماز کا وقت ہے۔

یہاں کیسے آئے؟ کیا اسی دینداری کی بل پر خلافت کا مسئلہ حل کروگے، تمھارے لاکھوں بھائی انگورہ میں بھوکوں مر رہے ہیں کچھ اُن کی بھی خبر ہے۔

عیدو کے پیروں میں جیسے کسی نے لوہے کی بیڑیاں ڈال دیں۔ ندامت سے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ آگے قدم رکھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

سوامی گھٹانند نے منشی جی اور اُن کے تینوں ساتھیوں سے کہا۔ بھائیو یہ پنچامرت لیتے جاؤ تمھارا کلیان ہوگا۔

جھنکو۔ رام بلی اور بچن نے اضطراری طور پر ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور سوامی جی سے پنچامرت لے کر پی گئے۔ منشی جی نے کہا۔ اسے آپ خود پی جایئے۔ مجھے ضرورت نہیں۔

سوامی جی اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوگئے اور بڑی منّت آمیز لہجہ میں بولے۔ ''اس سادھو پر آج دَیا کیجیے۔ اُدھر نہ جایئے۔

لیکن منشی جی نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر سامنے سے ہٹا دیا اور گلی میں داخل ہوگئے۔ اُن کے تینوں دوست سر جُھکائے کھڑے رہے۔

منشی جی۔''رام بلی۔ آتے کیوں نہیں؟ کس کی طاقت ہے کہ ہمیں روک سکے۔''

جھنکو۔''آپ کاہے ناہیں لوٹ آوت ہیں۔ سادھو سنتن کی بات مانے کا ہوت ہے۔''

منشی جی۔''تو اسی حوصلہ پر گھر سے نکلے تھے؟''

رام بلی۔'' نکلے تھے اس ارادہ سے کہ کوئی زبردستی روکے گا تو اُس سے سمجھیں گے۔ سادھو سنتوں سے رار کرنے تھوڑے ہی چلے تھے۔''

منشی جی۔''سچ کہا ہے گنوار لوگ بھیڑ ہوتے ہیں۔ جہاں ایک گری وہاں سب گرنے دوڑے۔''

بچن۔ ''آپ سیر ہوجایئے۔ ہم بھیڑ ہی بنے رہیں گے۔''

منشی جی اکڑتے ہوئے شراب خانہ میں داخل ہوئے۔ دُکان پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ مہاجن اپنی گدی پر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ منشی جی کی آہٹ پاکر چونک پڑا۔ انھیں تجسّس کی نگاہ سے دیکھا گویا وہ کوئی نادر وجود ہیں، بوتل بھر دی اور پھر اونگھنے لگا۔

منشی جی خوش خوش گلی کے دروازہ پر آئے تو اپنے رفیقوں کو نہ پایا۔ کتنے ہی آدمیوں نے اُنھیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور اُن پر آوازے کسنے لگے۔

ایک نے کہا۔ ''دلاور ہو تو ایسا ہو۔''

دوسرا بولا۔ ''شرم چہ کتیست کہ پیش مرداں بیاید۔''

تیسرا بولا۔ ''ہے کوئی پُرانا پھکڑ۔ پکا دھتیا۔

معلوم نہیں ابھی منشی جی کو اور کتنی دلآزار باتیں سننا پڑتیں۔ لیکن تھانہ دار صاحب نے آکر بھیڑ کو منتشر کردیا۔ منشی جی نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور گھر چلے۔ ایک کانسٹبل بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔

(۴)

منشی میکولال کے چاروں دوستوں نے بوتلیں پھینک دی تھیں اور آپس میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔

جھنکو۔ ''ایک دائیں ہمارا یکّا بیگار میں پکڑا جات رہے۔ یہی سوامی جی چپراسن سے کہہ سُن کے چُھڑوائے دہن رہا۔

رام بلی۔ پچھلے سال جب ہمارے گھر میں آگ لگی تھی تب بھی تو یہی سوامی جی سیوا سمتی والوں کو ساتھ لے کر پہنچ گئے تھے۔ نہیں تو ایک سوت بھی نہ بچتا۔

بچن۔ مختار اپنے سامنے کسی کو گنتے ہی نہیں۔ آدمی کوئی بُرا کام کرتا ہے تو چھپا کے کرتا ہے یہ نہیں کہ بے حیائی پر کمر باندھ لے۔

جھنکو۔ بھائی پیٹھ پیچھے کوؤ کی بُرائی نہ کرو۔ اور جون کچھ ہوئے پر آدمی بڑا اکبالی ہے۔ اتنے آدمین کے بیچ مان کیسا گھُست چلا گو۔

رام بلی۔ یہ کوئی اقبال نہیں ہے۔ تھانہ دار نہ ہوتے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔

بچن۔ مجھے تو کوئی پچاس روپیہ دیتا تو بھی میں گلی میں پیر نہ رکھتا۔ شرم سے سر ہی نہیں اُٹھتا تھا۔

عیدو۔ ان کے ساتھ آکر بڑی آفت میں پھنس گیا۔ مولانا جہاں دیکھیں گے وہیں آڑے ہاتھوں لیں گے۔ میں آج شرم کے مارے گڑ گیا۔ آج سے توبہ کرتا ہوں۔ اب اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا۔

رام بلی۔ شرابیوں کی توبہ کچے دھاگے سے مضبوط نہیں ہوتی۔''

عیدو۔ اگر پھر کبھی پیتے دیکھنا تو مُنہ میں کالکھ لگا دینا۔

بچن۔ اچھا تو اسی بات پر آج سے میں بھی چھوڑتا ہوں۔ اب پیوں تو گئو رکت برابر۔
جھنکو۔ تب کا ہم ہی سب سے پاپی ہیں۔ پھر کبھی جو ہم کا پٹ دیکھیو تو بیٹھا لے کے پچاس جوتے لگایو۔
رام بلی۔ ارے جا۔ ابھی منشی جی بلائیں گے تو کتے کی طرح دوڑتا جائے گا۔
جھنکو۔ منشی جی کے ساتھ بیٹھے دیکھیو تو سو جوتے لگایو۔ جس کی بات میں پھرک ہے اُس کے باپ میں پھرک ہے۔"
رام بلی۔ تو بھئی میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ آج سے گانٹھ کے پیسے خرچ کرکے میں بھی نہ پیوں گا ہاں مُفت کی پینے میں انکار نہیں۔
جھنکو۔ گانٹھ کے پیسے کبھی پہلے بھی خرچ کیے ہیں؟"

اتنے میں منشی میکولال لپکے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ اگرچہ وہ بازی جیت کر آئے تھے مگر چہرہ پر غرور کی جگہ خفت چھائی ہوئی تھی۔ کسی نامعلوم سبب سے وہ اس فتح کا لطف دل سے نہ اُٹھاسکتے تھے۔ دل کے کسی گوشہ میں چھپی ہوئی ندامت جگر میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ رام بلی نے کہا۔ آیئے مختار صاحب بڑی دیر لگائی۔
میکولال۔ تم سب کے سب بڑے گاودی ہی نکلے۔ ایک سادھو کے چکمے میں آگئے۔
رام بلی۔ ان لوگوں نے تو آج سے پینے کی قسم کھا لی ہے۔
میکولال۔ ایسا تو میں نے مرد ہی نہیں دیکھا جو اس کے پنجہ میں ایک بار پھنس کر پھر نکل جائے۔ مُنہ سے بکنا دوسری بات ہے۔
عیدو۔ جندگانی رہی تو دیکھ لیجیے گا۔
جھنکو۔ دانا پانی تو کوؤ سے ناہین چھوٹ سکت ہے۔ اور باتین تو پیٹ بھرے کی ہیں۔ پس چوٹ لگ جائے۔ نشا کھائے بنا کوؤ مر نہیں جات ہے۔
میکولال۔ دیکھوں گا تمھاری بہادری بھی۔
بچن۔ دیکھنا کیا ہے، نشہ چھوڑ دینا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہی نہ ہوگا دو چار روز طبیعت ذرا سُست رہے گی۔ لڑائی میں سُنتے ہیں انگریزوں نے چھوڑ دیا تھا جو اسے پانی کی طرح پیتے ہیں۔ تو ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔
یہی باتیں کرتے ہوئے لوگ مختار صاحب کے مکان پر آپہنچے۔

(۵)

دیوان خانہ میں سناٹا تھا۔ موکل چلے گئے تھے۔ الگو پڑا سو رہا تھا۔ منشی جی مسند پر جا بیٹھے اور الماری سے گلاس نکالنے لگے۔ انھیں ابھی تک اپنے ہم مشربوں کی توبہ پر یقین نہ تھا انھیں کامل اعتماد تھا کہ شراب کی خوشبو اور سُرخی دیکھتے ہی سبھوں کی توبہ ٹوٹ جائے گی دور چلنے لگیں گے۔ جب عیدو سلام کر کے چلنے لگا اور جھنکو نے اپنا سونٹا سنبھالا تو منشی جی نے دونوں کے ہاتھ پکڑ لیے اور نہایت رقت آمیز لہجہ میں بولے۔"یارو یوں ساتھ چھوڑنا اچھا نہیں۔ آؤ آج اِس کا مزہ تو چکھو۔ خاص طور پر اچھی ہے۔ اس کے لیے آج کتنا ریاض کرنا پڑا ہے۔"

عیدو۔ اب تو جو بات ٹھان لی وہ ٹھان لی۔

منشی جی۔ اجی آؤ تو۔ اِن باتوں میں کیا رکھا ہے۔ چار دن کی زندگی ہنس کھیل کر گزارنی چاہیے۔

عیدو۔ آپ کو مبارک رہے۔ مجھے جانے دیجیے۔

جھنکو۔ ہم تو اب بھگوان چاہے تو اس کے تیر نہ جاب۔ جوتے کون کھائے۔

یہ کہہ کر دونوں اپنے ہاتھ چُھڑا کر چلے گئے۔ تب مختار صاحب نے بچن کا ہاتھ پکڑا جو برآمدے سے نیچے اُتر رہا تھا اور بولے۔ بچن۔ "کیا تم بھی بے وفائی کرو گے؟"

بچن۔ میں نے تو بڑی کڑی قسم کھائی ہے۔ جب ایک بار اِسے گئورکت کہہ چکا تو پھر اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتا۔ کتنا ہی گیا بیتا ہوں تو کیا اس قسم کو بھی نہ مانوں گا۔ میں تو کہوں گا اب آپ بھی چھوڑیے۔ کچھ دن رام رام کیجیے۔ بہت دن تو پیتے ہوگئے۔ یہ کہہ کر وہ بھی چلتا ہوا۔

اب اکیلا رام بلی رہ گیا۔ منشی جی نے اُس سے بڑے دردناک لفظوں میں کہا تم نے اُن سبھوں کی بے وفائی دیکھی۔ مجھے ان کے اوپر غصہ نہیں ہے۔ صرف ان کی سرد مہری کا صدمہ ہے۔ میں نہ جانتا تھا کہ یہ سب ایسے بھگوڑے نکلیں گے۔ برسوں کی صحبت ایک لمحہ میں بھول گئے۔ آؤ آج ہمیں تم سہی۔ دو سچے دوست ایسے درجنوں کچ لوہیوں سے اچھے ہیں آؤ بیٹھ جاؤ۔ مہاجن نے آج مسالے کی دے دی ہے۔ نیند میں بچاّ کو سر پیر کی خبر تک نہ تھی۔

رام بلی۔ میں تو حاضر ہی ہوں۔ لیکن میں نے بھی قسم کھائی ہے کہ کبھی گانٹھ سے پیسے خرچ کر کے نہ پیوں گا۔

مختار۔ ہوشیار لوگ ایسی ہی قسمیں کھایا کرتے ہیں۔ جب تک میرے دم میں دم ہے جتنا چاہے پیو۔ غم کس بات کا ہے۔

رام بلی۔ لیکن آپ نہ رہے تب؟ پھر ایسا سخی کہاں پاؤں گا۔

مختار۔ اجی تب دیکھی جائے گی۔ میں آج مرا تھوڑے ہی جاتا ہوں۔

رام بلی۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ آپ مجھ سے پہلے ضرور ہی مریں گے تو اُس وقت کس کے ماتھے یہ مزے اُڑاؤں گا۔ تب تو چھوڑ بھی نہ سکوں گا۔ اس سے بہتر یہی ہے کہ ابھی سے فکر کروں۔

مختار۔ یار ایسی باتیں کر کے مزہ نہ کرکرا کرو۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ ایک ہی گلاس لے لینا۔

رام بلی۔ مختار صاحب۔ مجھے اب زیادہ مجبور نہ کیجیے۔ جب عیدو اور جھنکو جیسے دھتیوں نے قسم کھا لی جو عورتوں کے زیور بیچ بیچ کر پی گئے جو نرے جاہل ہیں، تو میں اتنا بے شرم نہیں ہوں کہ اِس کا غلام بنا رہوں سوامی جی نے مجھے تباہ ہونے سے بچایا تھا۔ اُن کے حکم کو کسی طرح نہیں ٹال سکتا۔

یہ کہہ کر رام بلی بھی رخصت ہوگیا۔

(۶)

منشی جی نے مایوسانہ انداز سے گلاس بھرا اور پی گئے۔ لیکن دوسرا پیالہ بھرنے کے پہلے ان کا ولولہ مے کشی غائب ہوگیا تھا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ انھیں یوں تخلیہ میں شراب پینا پڑی۔ وہ لطف سرور ہی نہیں، لطف صحبت بھی چاہتے تھے۔ اس وقت ایک ایک گھونٹ دوا کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ خود ہی ساقی تھے، خود ہی بادہ کش۔ نہ بذلہ سنج احباب تھے، نہ دل میں اُمنگ، پہلے تو اپنے رفیقوں پر طبیعت جھنجھلائی۔ ان دغابازوں کو میں نے ہزاروں روپے پلا دیے ہوں گے۔ پر آج ذرا سی بات پر سب کے سب دغا دے گئے۔ اب میں بھوت کی طرح اکیلا پڑا ہوا ہوں۔ کوئی ہنسنے بولنے والا نہیں۔ یہ تو صحبت کی چیز ہے جب لطف صحبت ہی نہیں رہا تو پی کر سو رہنے سے کیا حاصل۔ یہ کوئی ایشور کا دھیان تھوڑے ہی ہے کہ تنہائی کی ضرورت ہو۔

مجھے آج کتنا خفیف ہونا پڑا۔ جب گلی میں گھسا ہوں تو سیکڑوں آدمی میری طرف غضب ناک نظروں سے تاک رہے تھے۔ شراب لے کر لوٹا ہوں تو لوگ اتنے برہم تھے کہ اُن کا بس چلتا تو میری بوٹیاں نوچ لیتے۔ تھانہ دار نے کانسٹبل کو ساتھ نہ کردیا ہوتا تو گھر تک آنا مشکل تھا۔ یہ ذلت اور تحقیر کس لیے؟ اسی لیے کہ بیٹھ کر مُنہ تلخ کروں اور کلیجہ جلاؤں۔

دُنیا اسے کتنا ممنوع سمجھتی ہے اس کا مجھے آج تجربہ ہوا نہیں ایک سنیاسی کے اشارے پر برسوں کے بلانوش، دائم الخمر اس طرح میری تحقیر نہ کرتے۔ بات یہ ہے کہ دل سے سبھی اسے حرام سمجھتے ہیں۔ جب میرے ساتھ کے یکّے والے، گوالے اور چپراسی تک ترک کرسکتے ہیں تو کیا میں اُن سے گیا گزرا ہوں۔ اتنی ذلت اُٹھا کر، عوام کی نظروں سے گِر کر، شہر میں رُسوا ہوکر، سارے زمانہ میں نکّو بن کر، ایک لمحہ کے لیے چلّر پیدا کرلینا کون سی دانشمندی ہے۔ حظ نفس کے لیے اتنی شرمندگی کیوں اُٹھاؤں؟ چاروں اِس وقت میرا مضحکہ اُڑا رہے ہیں ہوں گے۔ یہ دُرگت اب نہیں سہ سکتا۔ آج اس سفلہ پن کا خاتمہ کردوں گا۔ اس ذلت کا داغ مٹا دوں گا۔

ایک لمحہ میں تڑاقے کی آواز ہوئی۔ الگو چونک کر اُٹھا۔ دیکھا تو منشی جی برآمدے میں کھڑے ہیں اور بوتل زمین پر ٹوٹی پڑی ہے۔

یہ افسانہ ماہنامہ 'زمانہ' کے اپریل 1922 کے شمارے میں شائع ہوا۔ ہندی میں 'آج' بنارس جون 1922 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرودر 8 میں دُھساہس کے عنوان سے شامل ہے۔ اردو کے کسی مجموعے میں نہیں ہے۔

شکست کی فتح

کیشو میرا پرانا رقیب تھا۔ تحریر اور تقریر، مجلس اور محفل، غرض زندگی کے ہر ایک شعبے میں وہ مجھ سے پیش پیش رہتا تھا۔ اس کے مہر درخشاں کے سامنے میرے ستارے کو وہ فروغ کبھی نصیب نہ ہوا جس کا میں اپنے تئیں مستحق سمجھتا تھا۔ اُسے ایک بار زک دینا میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ مگر بہت سعی و عمل کے باوجود بھی پوری نہ ہوئی۔ اس زمانے میں میں نے کبھی اعتراف نہ کیا۔ لیکن فی الواقعہ میں اس کی سی فطری ذہانت سے بے بہرہ تھا۔ اگر مجھے تسکین تھی تو یہ کہ میدانِ علم میں چاہے مجھے اس پر سبقت پانا کبھی نصیب نہ ہوا۔ لیکن دائرۂ عمل میں میری ہی فتح کا نقارہ بجے گا۔ لیکن جب بدقسمتی سے بحرالفت میں بھی اس نے میرے ہی ساتھ غوطہ مارا اور موتی اس کے ہاتھ لگتا ہوا معلوم ہوا تو میں مایوس ہوگیا۔ ہمارے پروفیسر بابو ہری داس بھاٹیہ۔ خواہ اصول کے لحاظ سے دولت کے قائل نہ ہوں مگر دولت سے بے نیاز نہ تھے۔ اپنی لجیاوتی کے لیے انھوں نے روشن طبع کیشو کو نہیں مجھے منتخب کیا۔ ایک دن شام کو وہ میرے کمرے میں آئے اور متفکرانہ لہجے میں بولے۔ شاردا چرن مجھے مہینوں سے ایک فکر دامن گیر ہے مجھے اُمید ہے کہ تم اُسے دُور کرسکتے ہو۔ میرے کوئی لڑکا نہیں۔ میں نے تمھیں اور کیشو دونوں ہی کو بیٹوں کی طرح سمجھا ہے۔ اگرچہ وہ تم سے زیادہ ذہین اور ذکی ہے لیکن مجھے یقین ہے دنیا میں جو کامیابی تمھیں حاصل ہوگی وہ اُسے نہیں ہوسکتی۔ میں نے تمھیں اپنی لجیاوتی کے لیے تجویز کیا ہے۔ کیا اُمید کروں کہ تم اُسے قبول کروگے۔

میں آزاد تھا۔ میرے والدین مجھے بچپن ہی میں چھوڑ کر رخصت ہوگئے تھے۔ میرے خاندان میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جس کی رضامندی کی مجھے فکر ہوتی۔ لجیاوتی جیسی حسینہ، ہنس مکھ اور محبت شعار بیوی پاکر ایسا کون شخص تھا جو اپنی قسمت کو نہ سراہتا۔ میں پھولا نہ سمایا۔ لجیاوتی ایک شگفتہ باغ تھی۔ جہاں گلاب کی دلآویز مہک تھی اور سبزہ کی روح پرور مہک۔ نسیم کی مستانہ لہریں تھیں۔ اور چڑیوں کے پیارے چہچہے، وہ خود بھی مساوات کے

اصول کی دلدادہ تھی۔ عورتوں کے حقِ نیابت اور ایسے ہی دیگر مسائل پر اس نے بارہا گفتگو کی تھی۔ لیکن پروفیسر بھاٹیہ کی طرح محض اصولوں کی قائل نہ تھی۔ اس پر عمل بھی کرنا چاہتی تھی۔ روشن طبع کیشو اس کا منظورِ نظر تھا۔ اگرچہ میں جانتا تھا کہ پروفیسر بھاٹیہ کی مرضی اس کے لیے قانون ہے۔ لیکن میرے لیے اس کی مرضی مقدم تھی۔ میں اس معاملہ میں کامل آزادی کا قائل تھا۔ اس لیے میں کیشو کی دلگیری اور مایوسی سے وہ لطف نہ اُٹھا سکا جس کی مجھے تمنا تھی۔ ہم دونوں ہی اپنے اپنے غم میں ڈوبے ہوئے تھے اور مجھے پہلی بار کیشو سے ہمدردی ہوئی۔ میں لجیاوتی سے صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کیوں مجھے نظروں سے گرا دیا۔ پر اُس کے رُوبرو ایسے نازک مسئلہ کو چھیڑتے ہوئے مجھے تامل ہوتا تھا اور یہ ایک قدرتی امر تھا کیونکہ کوئی حسینہ ایسی حالت میں اپنے دل کی باتیں کہنا پسند نہیں کرسکتی۔ لیکن لجیاوتی اپنی باطن کیفیات کو مجھ پر ظاہر کرنا اپنا فرض سمجھ رہی تھی۔ وہ اس موقعہ کی تلاش کر رہی تھی کہ حسنِ اتفاق سے موقع بھی جلد مل گیا۔

شام کا وقت تھا۔ کیشو راجپوت ہوسٹل میں اقتصادیات پر مضمون پڑھنے گیا ہوا تھا۔ پروفیسر بھاٹیہ صاحب اس جلسے کے صدر تھے۔ لجیا اپنے بنگلہ میں اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے سوزِ باطن کو چھپائے یاس و غم وحسد کی آگ سے جلتا ہوا اس کے قریب بیٹھ گیا۔ لجیا نے میری طرف ایک اُڑتی ہوئی نگاہ ڈالی اور ہمدردانہ انداز سے بولی۔ کچھ اُداس نظر آتے ہو۔

میں نے مصنوعی لاپرواہی سے کہا۔ تمھاری بلا سے۔

لجیا۔ کیشو کی تقریر سننے نہیں گئے۔

میری آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ ضبط کرکے بولا۔ کچھ طبیعت ناساز تھی۔

یہ کہتے کہتے میری آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپک پڑے۔ میں آنسوؤں سے اس کے درد کو بیدار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ رونا میرے خیال میں تو عورتوں ہی کے لیے مخصوص تھا۔ اس پر اپنا غصہ ظاہر کرنا چاہتا تھا اور نکل پڑے آنسو۔ جذبات کبھی ارادے کے مطیع نہیں ہوتے۔

اب تک شاید لجیاوتی میرے خلوص اور الفت کا اندازہ نہ کرسکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو ٹپکنے لگے۔ میں کینہ پرور نہیں ہوں۔ میں نے کبھی دل میں کدورت نہیں

رکھی۔ مگر معلوم نہیں کیوں مجھے لجیا کے رونے پر اس وقت گونہ مسرت ہوئی۔ اس حالت میں بھی نیش زنی سے باز نہ رہ سکا۔ لجیا۔ میں تو اپنے نصیبوں کو روتا ہوں۔ غالباً تمھارے ستم کی فریاد کر رہا ہوں۔ لیکن یہ تمھارے آنسو کیوں نکل رہے ہیں۔

لجیا نے میری طرف شکوہ کے انداز سے دیکھا۔ اور بولی میرے آنسوؤں کا راز تم نہ سمجھوگے۔ کیونکہ تم نے سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ تم مجھے طعنے دے کر اپنے دل کو تسکین دیتے ہو۔ میں کسے جلاؤں۔ تمھیں کیا معلوم ہے کہ میں دل پر کتنا جبر کرکے، کتنا صبر کرکے، کتنی راتیں کروٹیں بدل کر اور رو رو کر یہ فیصلہ کیا ہے تمھارا اونچا گھرانہ، تمھاری ریاست، تمھاری ثروت ایک دیوار کی طرح میرے راستہ میں حائل ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اس وقت تمھیں اپنے خاندان اور ریاست کا مطلق خیال نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ تمھارے کالج کی ٹھنڈی چھاؤں میں پلے ہوئے خیالات زیادہ عرصے تک زندگی کے گرم اور تند جھونکے نہ برداشت کرسکیں گے۔ اس وقت شاید تم اپنے فیصلے پر پچھتاؤ اور کڑھو۔ میں تمھارے دودھ کی مکھی اور دل کا کانٹا نہیں بننا چاہتی۔

میں نے نرم ہوکر کہا۔ جن اثروں سے میرے خیالات فنا ہوجائیں گے کیا وہ تمھارے خیالات باقی رکھیں گے؟

لجیاوتی۔ ہاں مجھے یقین ہے کہ مجھ پر ان کا مطلق اثر نہ ہوگا۔ میرے خاندان میں کبھی ریاست نہیں رہی۔ بابو نے محض اپنی محنت اور کوشش سے پرائیویٹ ٹیوشن کرکے یہ درجہ حاصل کیا۔ مجھے امارت اور ریاست کا غرور کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔ اُسی طرح جیسے تم اس غرور کو کبھی دل سے مٹا نہیں سکتے یہ غرور مجھے اس وقت ہوگا جب اپنے کو بھول جاؤں گی۔

میں نے دلیرانہ لہجہ میں کہا۔ خاندانی وقار کو تو میں مٹا نہیں سکتا میرے امکان سے باہر ہے۔ لیکن ریاست سے تمھارے لیے آج دست بردار ہوسکتا ہوں۔ اسے کسی کارِ خیر کے لیے وقف کرکے ہم تم اپنی اپنی محنت کی کمائی کھاکر آرام سے زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

لجیاوتی نے بے رحمانہ تبسم کے ساتھ کہا۔ پھر وہی جذبہ پرستی۔ ایسے اہم معاملے میں جس پر دو زندگیوں کا دار و مدار ہے میں محض جذبات کو اپنا رہنما نہیں بناسکتی۔ شاردا تصنع نہیں ہے۔ دھرم سے کہتی ہوں۔ مجھے ابھی خود نہیں معلوم کہ میری ناؤ کدھر جائے گی۔

لیکن حالات سے مجبور ہوں۔ میں تمھاری زندگی تلخ نہیں کرنا چاہتی۔

میں یہاں سے چلا تو اتنا مایوس نہ تھا۔ جتنا فکرمند۔ لجیاوتی نے میرے سامنے ایک نیا مسئلہ پیش کردیا تھا۔

(۲)

ہم دونوں ایک ہی ساتھ ایم، اے ہوئے۔ کیشو درجہ اوّل میں آیا اور میں درجہ دوم میں۔ اُسے ناگپور کے ایک کالج میں پروفیسری مل گئی۔ میں گھر آکر اپنے علاقہ کا انصرام کرنے لگا۔ چلتے وقت ہم دونوں گلے مل کر بادلِ پُردرد رخصت ہوئے۔ رقابت کالج کے اندر چھوڑ دی۔ اب ہمارے راستے الگ الگ تھے اور حلقۂ عمل جُدا جُدا۔

میں شاید اپنے صوبہ میں پہلا تعلقہ دار تھا جس نے ایم، اے کی ڈگری حاصل کی ہو۔ حکام نے پہلے تو میری خوب آؤ بھگت کی۔ لیکن جب میرے تمدنی اُصولوں سے واقف ہوئے تو سردمہری کا اظہار کرنے لگے۔ میں نے بھی ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا میں اپنا بیشتر وقت اپنے ہی علاقے میں صرف کرتا تھا۔ سال بھر نہ گزرنے پایا تھا کہ ایک تعلقہ دار صاحب کا انتقال ہوگیا وہ کونسل کے قطب ہو رہے تھے۔ ان کی جگہ خالی ہوئی۔ میں نے کونسل میں جانے کی اپنی طرف سے مطلق کوشش نہیں کی۔ لیکن کاشتکاروں نے اپنی نیابت کا بار میرے ہی سر رکھا۔ غریب کیشو کالج میں لیکچر دیتا تھا۔ کتابوں کے مطالعے سے صحت اور نگاہ دونوں ہی کمزور ہوتی جاتی تھی۔ کسی کو خبر بھی نہ تھی کہ یونیورسٹی کا وہ نام روشن کرنے والا نوجوان کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ ادھر میں اپنی خاندانی ثروت اور امتیاز کی بدولت کونسل کا ممبر ہوگیا۔ میری تقریریں اخباروں میں درج ہونے لگیں میرے سوالات کی داد ملنے لگی۔ کونسل میں بھی میرا خاص اعزاز ہونے لگا وہی حکّام جو پہلے مجھ سے بے التفاتی کا برتاؤ کرتے تھے اب میری عزت کرنے لگے۔ میں نے چند ہم خیال ممبروں کے ساتھ کونسل میں احباب کی ایک جماعت بھی بنا لی۔ اور کاشتکاروں کے حقوق کے زوروں کے ساتھ وکالت کرنے لگا۔ اکثر تعلقہ داروں نے مجھ سے قطع تعلق کرلیا۔ کئی اصحاب نے دھمکیاں بھی دیں۔ لیکن میں نے اپنے رویّہ میں ذرا بھی ترمیم نہیں کی۔ میں خدمت کے ایسے زرّیں موقع کو کیوں کر ہاتھ سے جانے دیتا۔ دوسرا سال ختم ہوتے ہوتے کونسل میں میری شخصیت نمایاں ہوگئی۔ قوم کے خاص آدمیوں میں میرا شمار ہونے

لگا۔ مجھے شاقہ محنت کرنی پڑتی تھی۔ پڑھنے لکھنے اور بولنے میں مجھے کالج میں اتنی محنت نہ کرنی پڑتی تھی اکثر سوالوں کی تیاری میں رات کے ایک دو بج جاتے۔ پر میں ذرا بھی نہ گھبراتا تھا۔ یہ سب کیشو کی رقابت کا نتیجہ تھا۔ جس نے محنت کا عادی بنا دیا تھا۔

میرے پاس کیشو اور پروفیسر بھاٹیہ کے خطوط برابر آتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی لجیاوتی بھی لکھتی۔ اس کے خطوط روز بروز زیادہ ہمدردانہ اور محبت آمیز ہوتے جاتے تھے۔ وہ میرے قومی انہماک کی فیاضانہ داد دیتی۔ میری نسبت اس کے دل میں جو شکوک تھے وہ بظاہر مٹتے جاتے تھے۔ میری تپیا سپھل ہونے لگی۔ کیشو کے خطوط سے افسردہ دلی کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے کالج میں سرمایہ کافی نہ تھا، اُسے پروفیسری کرتے تین سال ہوگئے تھے۔ پر اس کی ترقی نہ ہوئی تھی اور خطوط سے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا وہ زندگی سے بیزار ہے۔ غالبًا اس کا خاص سبب یہ تھا کہ ابھی تک اس کی زندگی کا سنہرا خواب پورا نہ ہوا تھا۔

تیسرے سال گرمیوں کی تعطیل میں پروفیسر بھاٹیہ مجھ سے ملنے آئے، اور بہت خوش گئے۔ اس کے ایک ہی ہفتہ بعد لجیاوتی کا خط آیا۔ عدالت نے فیصلہ سنا دیا۔ میری ڈگری ہوگئی۔ کیشو کو میرے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ میری مسرّت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ پروفیسر بھاٹیہ کا قصد تھا کہ ہندوستان کے ہر ایک صوبہ کا دَورہ کریں۔ وہ اقتصادیات پر ایک کتاب لکھ رہے تھے جس کے لیے ہر ایک بڑے شہر میں کچھ تحقیقات کرنے کی ضرورت تھی۔ لجیاوتی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ طے ہوا کہ ان کی واپسی پر چیت کے مہینے میں شادی رچے۔ میں یہ انتظار کا زمانہ بڑے اشتیاق اور بے صبری کے عالم میں کاٹنے لگا۔ جب تک مجھے معلوم تھا کہ بازی کیشو کے ہاتھ رہے گی میں مایوس تھا۔ دل نے صبر کی پناہ لی تھی۔ اب اُمید تھی اور اسی کے ساتھ بے صبری بھی۔

(۳)

مارچ کا مہینہ تھا۔ انتظار کی مدت پوری ہوگئی تھی۔ کڑی محنت کے دن گئے۔ فصل کاٹنے کے دن آئے۔ پروفیسر صاحب نے ڈھاکہ سے خط لکھا تھا۔ کئی وجوہ سے میں مارچ میں نہ آسکوں گا۔ مئی میں آوں گا۔ یہ التوا اب شاق گزرتا تھا، اسی اثنا میں ایک ریاست کے دیوان لالہ سومناتھ کپور نینی تال کی سیر کرنے آئے، گورنر کی جانب سے ان کی دعوت ہوئی، کونسل کے ممبروں کو بھی نوید ملا۔ طرفین سے رسمی تقریریں ہوئیں، کونسل

کی طرف سے میں نے مہمان نوازی کا فرض ادا کیا۔ میری تقریر سے دیوان صاحب کچھ زیادہ متاثر ہوئے، چلتے وقت مجھ سے خاص طور سے ہاتھ ملایا اور اپنے فرودگاہ پر آنے کی دعوت دی ان کے ساتھ ان کی صاحبزادی سوشیلا بھی تھی وہ پیچھے سر جھکائے کھڑی رہی اس کی آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں پَر میں اپنی نگاہوں پر قادر نہ ہوسکا وہ دورانِ گفتگو میں ایک بار نہیں کئی بار اُٹھیں۔ اور جیسے بچہ کسی اجنبی کی گود کی طرف لپکتا ہے اور پھر خائف ہوکر ماں کی گود سے چمٹ جاتا ہے اسی طرح آدھے راستے سے ڈر کر لوٹ آئیں۔ اس کی طرف تاکنے کی ہمّت نہ پڑی۔ لجیاوتی اگر شگفتہ باغ تھی تو سوشیلا خنداں کوہسار جہاں دل فریب ہریالی تھی اور ترنّم ریز جھرنے اور غزالانِ مست کے غول۔ سارا منظر قدرت کے رنگ میں رنگا ہوا جس سے انسان کے دل پر ایک رعب سا طاری ہوجاتا ہے۔ میں گھر پر آیا تو ایسا تھکا ہوا تھا گویا منزل طے کرکے آیا ہوں۔ حسنِ تناسب ازلی ہے۔ معلوم نہیں اس کا اثر اتنا جاں فرساں کیوں ہوتا ہے۔

لیٹا تو وہی صورت سامنے تھی۔ میں اسے ہٹانا چاہتا تھا۔ مجھے خوف تھا کہ ایک لمحہ کی بے احتیاطی بھی مجھے مغلوب کردے گی۔ میں اب لجیاوتی کا ہوچکا تھا۔ وہی اب میرے دل کی مالک تھی۔ میرا اس پر کوئی اختیار نہ تھا۔ لیکن میری ساری احتیاط میری ساری دلیلیں بے سود تھیں۔ سیلاب میں کشتی کو دھاگے سے کون روک سکتا ہے، یہاں تک کہ مایوس ہوکر میں نے اپنی کشتی کو خیال کی رَو میں ڈال دیا۔ کچھ دُور کشتی تند لہروں کے ساتھ چلی۔ پھر اسی دور میں سما گئی۔ اسی سیلاب کا ایک جزو بن گئی۔

دوسرے دن معینہ وقت پر دیوان صاحب کے بنگلے پر پہنچا۔ اس طرح کانپتا اور ہچکچاتا۔ جیسے کوئی بچہ بجلی کی کڑک سے ڈرکر آنکھیں بند کرلیتا ہے کہیں وہ چمک نہ جائے۔ کہیں اسے دیکھ نہ لوں۔ کہیں وہ مجھ سے کچھ پُوچھ نہ بیٹھے۔ عدالت کے سامنے کوئی بھولا بھالا کسان بھی اتنا سراسیمہ نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بالکل مغلوب اور پامال ہوچکا تھا۔ مجھ میں اب مقابلہ کی بالکل قوت نہ تھی۔

دیوان صاحب نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔ کوئی گھنٹہ بھرتک ملکی اور مالی مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی وسعتِ معلومات پر حیرت ہوتی تھی۔ ایسا لطیفہ گو، بزلہ سنج شخص میں نے نہیں دیکھا تھا۔ ساٹھ سال کا سن تھا۔ مگر ظرافت اور خوش طبعی چھلکتی تھی۔

نہ جانے کتنے اشعار کتنے اشلوک انھیں حفظ تھے اور دیوانِ حافظ انھیں وردِ زبان تھا۔ میں رہ رہ کر اِدھر اُدھر بیتاب آنکھوں سے تاکتا تھا۔ اس کی آواز سننے کے لیے میرے کان لگے ہوئے تھے۔ آنکھیں کہیں تھیں، دل کہیں اور تھا اور کشش بھی۔ تلخی بھی پُرسرور کے ساتھ۔

رات کے نو بج گئے۔ میرے چلنے کا وقت آگیا۔ دل میں نادم تھا دیوان صاحب کیا کہتے ہوں گے؟ اسے کوئی کام نہیں ہے کیا؟ جاتا کیوں نہیں؟ دو ڈھائی گھنٹے ہوگئے ساری باتیں ختم ہوگئیں۔ اِن کے لطیفے بھی ختم ہوگئے۔ دِلوں پر افسردگی چھاگئی جو زندہ دِلانہ گفتگو کا تتمہ ہوتی ہے۔ کئی بار اُٹھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن انتظار میں تو عاشق کی جان بھی نہیں نکلتی۔ یہاں تک کہ ساڑھے نو بجے۔ اور اب مجھے رخصت ہوجانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ تمنائیں پامال ہوگئیں۔ میں جسے وحشت سمجھتا تھا وہ فی الواقع انتہائے اشتیاق تھی۔

یہاں سے چلا تو ایسا مغموم اور پژمردہ تھا، گویا جان نکل گئی۔ اپنے تئیں نفرین کرنے لگا۔ اپنی شوریدہ سری کو خوب ملامت کی۔ تم سمجھتے ہو کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ یہاں کسی کو تمھاری خبر ہی نہیں۔ کسی کو تمھارے عدم یا وجود کی فکر بھی نہیں۔ وہ علامتوں سے کنواری سہی۔ دنیا میں کنواری لڑکیوں کی کمی نہیں۔ حُسن کی بھی انتہا نہیں۔ اگر ہر ایک حسین اور کنواری لڑکی کو دیکھ کر تمھاری یہی حالت ہوتی رہی تو تمھاری زندگی برباد ہوجائے گی۔

دل نے جواب دیا۔ علیٰ ہٰذا القیاس یہی دلیل اس کی طرف سے بھی ہوسکتی ہے ہر ایک خوش رو، خوش زبان نوجوان کی طرف اس کی نگاہ کیوں اُٹھے۔ مردوں کے لیے یہ اگر باعثِ رسوائی ہے تو عورتوں کے لیے باعثِ بربادی۔ دوئی سے توحید کو بھی اتنا صدمہ نہیں ہوسکتا جو حُسن کو ہوسکتا ہے۔

دوسرے روز شام کو میں اپنے بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا ہوا اخبار دیکھ رہا تھا۔ کلب جانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ طبیعت کسل مند تھی۔ دفعتاً میں نے دیوان صاحب کو فٹن میں جاتے ہوئے دیکھا۔ ان کے پہلو میں سوشیلا بھی تھی۔ مجھے ایسا وہم ہوا کہ وہ میرے بنگلے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس کی نگاہ اوپر اُٹھی ہو یا نہ اُٹھی ہو۔ پر میری ٹکٹکی اس وقت تک بندھی رہی جب تک فٹن نظروں سے اوجھل نہ ہوگئی۔

دوسرے دن میں اسی وقت پھر برآمدہ میں آکر بیٹھا۔ آنکھیں سرراہ تھیں، فٹن آئی

اور چلی گئی۔ اب قریب قریب ان کا روزانہ یہی معمول ہوگیا۔ میرا کام اب یہی تھا کہ سارا دن برآمدہ میں بیٹھا رہوں۔ معلوم نہیں۔ فٹن کب نکل جائے۔ خصوصاً سہ پہر کے بعد تو میں ہلنے کا نام بھی نہ لیتا تھا۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ مجھے کونسل سے اب کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اخباروں میں، مباحثوں میں، ملکی معاملات میں اب جی نہ لگتا۔ کبھی سیر کرنے کو بھی جی نہ چاہتا۔ عشاق نہ جانے صحرا کی طرف کیوں کر جاتے ہیں۔ میرے جیسے پیروں میں بیڑیاں پڑگئی ہوں۔ بس برآمدہ تھا اور میں اور فٹن کا انتظار۔ میری قوتِ فکر بھی شاید سلب ہوگئی تھی۔ میں کم از کم ہفتہ میں ایک بار دیوان صاحب کی فرودگاہ پر جاسکتا تھا۔ انھیں اپنے یہاں بلا سکتا تھا۔ لیکن حقیقت میں میں ابھی تک اس سے خائف اور ہراساں تھا، لجیاوتی کو اب بھی اپنے دل کی رانی سمجھتا تھا۔ گو ایک خاصیت نے اس پر چند روز قبضہ کرلیا ہو۔ ایک مہینہ گزر گیا لیکن میں نے لجیاوتی کو ایک خط بھی نہ لکھا۔ مجھ میں خط لکھنے کی شاید سکت ہی نہ تھی۔ شاید اُسے خط لکھنے کی مجھ میں اخلاقی جرأت ہی نہ تھی۔ میں اب خطا وار تھا۔ مجھے اپنے خیال سے بھی اسے ملوث کرنے کا مجاز نہ تھا۔

اس کا انجام کیا ہوگا؟ میرے دل پر ہر دم یہی فکر مسلط رہتی تھی۔ زندگی کی کسی شے سے دلچسپی نہ تھی۔ روزبروز گھلتا جاتا تھا۔ احباب اکثر پوچھتے آپ کو کیا شکایت ہے چہرے پر زردی اور بے رونقی تھی۔ کھانا دوا کی طرح کھاتا۔ سونے جاتا تو جیسے کوئی پنجرہ میں بند کر دیا گیا ہو۔ کوئی ملاقات کو آتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا روپے کا تقاضہ کرنے آیا ہے۔ عجیب حالت تھی۔

ایک روز شام کو دیوان صاحب کی فٹن میرے دروازے پر آکر رُکی اُنھوں نے اپنی تقریروں کا ایک مجموعہ شائع کرایا تھا۔ اس کی ایک جلد مجھے نذر کرنے آئے تھے۔ میں نے ہرچند بیٹھنے کا اصرار کیا۔ لیکن انھوں نے کہا۔ سوشیلا کو یہاں بیٹھنے میں تامل ہوگا۔ اور فٹن پر اکیلی بیٹھی گھبرا رہی ہوگی۔ یہ کہہ کر چلے۔ میں بھی ساتھ ہولیا۔ اور فٹن تک آیا۔ جب وہ فٹن پر بیٹھ گئے تو میں نے سوشیلا کی طرف بے خوف ہوکر دیکھا معلوم نہیں کب یہ زریں موقع پھر ملے۔ وہ التجا۔ وہ اشتیاق۔ وہ اضطراب۔ وہ بیکسی۔ وہ پرستش۔ وہ اصرار جو میری ایک نگاہ میں تھا۔ پتھر کو بھی مائل کردیتا۔ سوشیلا تو پھر بھی انسان تھی۔ اس نے

میری طرف دیکھا، بے تکلف، بے باک نگاہوں سے۔ ذرا بھی جھجک نہیں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے اس نے مجھ پر اپنی نگاہوں سے کوئی جادو کردیا۔ میری روح اور دل میں کوئی نئی طاقت پھونک دی جیسے ڈوبتے کو بچا لیا۔ برآمدہ کی طرف لوٹا تو ایسا خوش تھا گویا قارون کا خزانہ مل گیا۔ وہ ایک نگاہ میرے لیے کونین کی دولت سے کم نہ تھی۔

دوسرے دن میں نے پروفیسر بھاٹیہ کو ایک خط لکھا مجھے کچھ عرصہ سے کثرتِ کار کے باعث ایک شکایت پیدا ہوگئی ہے۔ جو ممکن ہے تپِ دق کا آغاز ہو اس لیے میں اپنے تئیں تاہل کے قابل نہیں سمجھتا۔ میں لجیاوتی سے الگ ہونا چاہتا تھا کہ اس کی نظروں میں میری عزت بدستور قائم رہے۔ میں کبھی کبھی اپنی خودغرضی پر جھنجھلاتا۔ لجیاوتی کے ساتھ یہ بے وفائی اور دغا کرتے ہوئے میں اپنی ہی نگاہ میں حقیر معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہوتی تھی۔ لیکن طبیعت سے مجبور تھا اس غریب کو کتنا صدمہ ہوگا۔ اس خیال سے مجھے کئی بار رونا آیا۔ سوشیلا اب تک میرے لیے ایک سربستہ راز تھی۔ اس کے حسن کی بناء پر میں اپنی مدتوں کی تمناؤں کا خون کر رہا تھا۔ بچّوں کی طرح مٹھائی کے نام پر اپنے دودھ چاول کو ٹھکرائے دیتا ہے۔ میں نے پروفیسر صاحب سے التماس کیا تھا کہ میری حالت کا لجیا سے ذکر نہ کیجیے گا۔ مگر چوتھے دن لجیا کا خط آگیا۔ جس میں اس نے اپنا دِل کھول کر رکھ دیا تھا۔ وہ میرے لیے سب کچھ یہاں تک کہ بیوگی کا عذاب سہنے کے لیے آمادہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ جلد سے جلد ہم ایک دوسرے کے ہوجائیں اب اُسے ایک دن کی دیر بھی اَکھرتی تھی۔ میں اس خط کو لیے گھنٹوں ایک محویت کے عالم میں بیٹھا رہا۔ جیسے سکتہ سا ہوگیا تھا۔

(۴)

لجیاوتی

ساوتری نے کیا سب کچھ جان بوجھ کر ستیاوان سے شادی نہیں کی۔ میں کیوں ڈروں؟ میں ان کے لیے بَرت رکھوں گی۔ تیرتھ کروں گی۔ تپسّیا کروں گی مگر محض مصیبتوں کا خوف ان سے جدا نہیں کرسکتا۔ ہرگز نہیں۔ مجھے کبھی ان سے اتنی محبت نہ تھی۔ میں کبھی اتنی بے قرار نہ تھی۔ یہی میری آزمائش کا وقت ہے۔ اور میں نے آخری فیصلہ کرلیا ہے۔ والدصاحب ابھی سفر سے واپس آئے ہیں۔ ہاتھ خالی ہے کوئی تیاری نہیں

کر سکتے۔ دو چار مہینوں کے التوا سے انھیں کچھ تیاری کا موقع مل جاتا۔ پر میں اب دیر نہیں کر سکتی۔ ہم اور وہ اسی مہینے میں ہمیشہ کے لیے مل جائیں گے۔ پھر کوئی حادثہ، کوئی آفت، کوئی بلا مجھے ان سے جدا نہیں کر سکتی۔

اب مجھے ایک منٹ علاحدہ رہنا دوبھر ہو رہا ہے۔ میں رسموں کی غلام نہیں ہوں۔ نہ وہ ہی ہیں۔ بابو جی بھی نرم پرور نہیں۔ پھر میں کیوں نہ آج ہی نینی تال چلوں؟ ان کی خدمت کروں، لجیاوت کروں، تشفی دوں۔ میں انھیں زندگی کے سارے فکر اور تردّد سے آزاد کردوں گی۔ علاقہ کا سارا نظام اپنے اوپر لے لوں۔ کار کونسل میں اس درجہ مصروف رہنے کے باعث ہی ان کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اخباروں میں زیادہ تر انھیں کے سوالات، انھیں کی نکتہ چینیاں۔ انھیں کی تقریریں نظر آتی ہیں۔ میں ان سے استدعا کروں گی کہ کچھ دنوں کے لیے کونسل سے استعفیٰ دے دیں۔ وہ جب چاہیں کونسل میں جا سکتے ہیں۔ ان کے لیے ہمیشہ جگہ خالی رہے گی وہ میرا گانا کتنے شوق سے سنتے تھے۔ میں اپنے گیت سُنا کر ان کا دل بہلاؤں گی۔ قصّے پڑھ کر سناؤں گی۔ ان کے اطمینان میں کسی بات کو مخل نہ ہونے دوں گی اس بیماری کا علاج یہاں تو معقول نہیں ہوتا میں ان سے پیروں پڑ کر کہوں گی کہ یورپ کے کسی سینی ٹوریم (صحت افزا مقام) میں معالجے کے لیے چلیے۔ میں کل ہی کالج کے کتب خانہ سے اس مرض کی متعلق کتابیں لاؤں گی اور غور سے پڑھوں گی اب میرا یہاں ایک پل بھر رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ کالج دو چار دن میں بند ہوجائے گا۔ میں آج ہی بابو جی سے نینی تال چلنے کی گفتگو کروں گی۔

(۵)

آہ میں نے کل انھیں دیکھا تو پہچان نہ سکی۔ کیسا سُرخ و سفید چہرہ تھا۔ کیسا بھرا ہوا بدن معلوم ہوتا تھا۔ صحت انھیں کے لیے بنی ہے۔ تین سال میں یہ کیفیت ہوگئی۔ چہرہ پر کتنی غضب کی زردی چھائی ہوئی ہے۔ خوراک آدھی بھی نہیں رہی نہ جانے کس فکر میں غرق رہتے ہیں۔ کہیں آتے جاتے نہیں دیکھتی۔ اتنے نوکر چاکر ہیں۔ ایسا وسیع اور پُرفضا بنگلہ ہے۔ اس قدر سامان موجود ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سے اب انھیں کوئی دلچسپی ہی نہیں رہی۔ اس کلموہی بیماری کا ستیا ناس ہو۔ اگر اس کم بخت کو کسی شکار کی ضرورت تھی تو مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ میں بڑے شوق سے اس کا خیر مقدم کرتی۔ کاش کوئی

ایسی تدبیر ہوتی کہ یہ مرض ان کے بدلے مجھے ہوجاتا۔ مجھے دیکھ کر پہلے کیسے باغ باغ ہوجاتے تھے۔ آنکھیں مسکرانے لگتی تھیں۔ ایک ایک عضو سے مسرت ٹپکنے لگتی تھی۔ جیسے فوّارے سے ترشح ہونے لگتا ہے پر مجھے یہاں آئے دوسرا دن ہے ایک بار بھی چہرے پر ہنسی نہیں آئی۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے ضرور تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا محض مجھے خوش کرنے کے لیے۔ بابو جی آنسوؤں کو نہ روک سکے۔ الگ کمرے میں دیر تک روتے رہے۔ کہتے ہیں لوگ کونسلوں میں محض اعزاز و نمود کے لیے جاتے ہیں۔ محض ناموری کی ہوس انھیں کھینچ کر لے جاتی ہے۔ لوگ ان غریب ممبروں کے ساتھ کتنی نا انصافی کرتے ہیں۔ کتنی بے قدری ہے۔ قومی خدمت میں جسم کا یہ حال ہوتا ہے۔ خون جلانا پڑتا ہے۔ آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں۔ مرتاض بننا پڑتا ہے۔ مگر ان کی تو یہ حالت ہے کہ نوکر چاکر سب اپنی دھن میں مست ہیں کسی کو متفکر نہیں دیکھتی۔ دو ایک احباب ملنے آئے تھے۔ وہ بھی متردد نظر آتے تھے۔ بابو جی نے ان سے ذکر بھی کیا تو وہ ملتفت نہ ہوئے۔ یہ ہے انسانی ہمدردی کا حال کسی کو خبر نہیں کہ دوسروں پر کیا گزر رہی ہے۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں تپِ دق کا وہم ہے اس کی کوئی علامت نہیں دیکھتی۔ پرماتما کرے میرا قیاس صحیح ہو۔ مجھے تو کوئی اور ہی شکایت معلوم ہوتی ہے میں نے کئی بار حرارت دیکھی۔ معمولی حرارت تھی کوئی تغیّر نہیں ہوا۔ اگر وہی بیماری ہے تو ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے کہ کافی احتیاط سے صحت کیوں نہ ہوجائے۔ میں کل ہی سے انھیں ہوا خوری کے لیے مجبور کروں گی۔ موٹر کی ضرورت نہیں۔ فٹن پر آہستہ آہستہ چلنے میں زیادہ تفریح ہوگی۔ مجھے تو یہ اپنی طرف سے کچھ بے پرواہ نظر آتے ہیں۔ اس مرض کے مریضوں کو بہت احتیاطیں کرتے دیکھا ہے۔ دن میں بیسیوں بار تو حرارت کا اندازہ کرتے دیکھا ہے۔ انواع و اقسام کی مرغن اور مقوی غذائیں کھاتے ہیں۔ ضرور انھیں کوئی شکایت ہے۔ ذرا اطمینان ہوجائے تو ایک بار ان سے مفصل گفتگو کروں۔ خدا نخواستہ مالی تردداُت تو نہیں ہیں۔ ریاست پر کوئی بار تو نہیں۔ کوئی نہ کوئی باعث ضرور ہے۔

(۶)

دل گونا گوں فکروں سے اتنا دبا ہوا ہے کہ کچھ کہنے کو جی نہیں چاہتا میری ساری تمنائیں پامال ہوگئیں۔ وائے حسرت میں اپنے آپ کو کتنا خوش نصیب سمجھتی تھی۔ اب دنیا

میں مجھ سے زیادہ بدنصیب کوئی نہ ہوگا۔ کیا شومئے تقدیر ہے کتنی نارسائی بخت! جو نعمت مجھے مدت دراز کی ریاضت اور عبادت سے بھی نہ ملی وہ اس غزال چشم حسینہ کو بہ ستم مل جاتی ہے۔ شاردا نے ابھی اُسے صرف تین چار مہینوں سے دیکھا ہے۔ شاید یکجا بیٹھ کر ہم کلام ہونے کی نوبت تک نہیں آئی ہے۔ لیکن کتنے دیوانہ ہو رہے ہیں۔ مردوں کے دل پر حُسنِ ظاہر کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ وہ دل کی قدر کرنا جانتے ہی نہیں۔ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ سوشیلا انھیں مجھ سے زیادہ خوش رکھ سکے گی تو میں بڑے شوق سے انھیں اس کے ہاتھوں میں دے دوں۔ مجھے یہ اطمینان نہیں ہوتا۔ وہ اتنی مغرور ہے، اتنی خود پرور، اتنی بے مہر کہ مجھے اندیشہ ہے کہ شاردا کو پچھتانا پڑے گا۔

مگر یہ میری خود غرضی ہے۔ سوشیلا مغرور سہی، بے مہر سہی، شاردا اس پر دل و جان سے شیدا ہو رہے ہیں۔ وہ خود ذی فہم، دُوراندیش ہیں، دانا ہیں اپنا نفع و نقصان خود سوچ سکتے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیا ہے تو مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ ان کی راہِ مسرت کا کانٹا بنوں۔ مجھے اپنے دل پر جبر کرکے، صبر کرکے یہاں سے بصد حسرت رخصت ہوجانا چاہیے، میری یہی خواہش ہے۔ پرماتما انھیں خوش رکھے۔ مجھے ذرا بھی حسد، ذرا بھی ملال نہیں ہے۔ میں ان کی خوشی کی طالب ہوں۔ اگر انھیں مجھے زہر دینے سے خوشی ہوتی تو مجھے زہر کھانے میں بھی دریغ نہ تھا۔ اگر محض میری کنارہ کشی سے سارے کام سنور سکتے ہیں تو مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے۔ یہی ان کا فیصلہ ہے۔ ان کے سامنے میرا سر خم ہے۔ مگر آخر انسان ہوں، کمزور ہوں، جن آرزوؤں کو مدت سے پالا تھا ان کی پامالی سے مجھے صدمہ ہوتا ہے۔ ہائے اب نگاہ کام نہیں کرتی۔ آنسو اُمڈے چلے آتے ہیں۔ کیسے ضبط کروں۔ جسے اپنا سمجھتی تھی، جسے اپنے تئیں نثار کرچکی تھی، جس پر زندگی کی دیوار کھڑی تھی، جسے گوشہ جگر میں بٹھا کر پوجتی تھی، جس کی خوشیوں کے خواب دیکھنا زندگی کا سب سے پیارا مشغلہ تھا۔ اس سے اب جدا ہو رہی ہوں،آہ! ہمیشہ کے لیے کس سے فریاد کروں۔ کِس کے سامنے روؤں۔ اس صدمہ سے جانبر نہیں ہوسکتی۔ اب قسمت کی یہ چوٹ میری جان لے کر چھوڑے گی۔ دنیا تاریک ہے۔ زندگی خشک ہے۔

میں جانتی ہوں۔ شاردا سے بابو جی آج شادی کے لیے زور دے کر کہیں تو وہ تیار ہوجائیں گے۔ وہ مروّت پر، دل جوئی پر، محض میرا دل رکھنے کے لیے اپنی خواہشوں کو

قربان کرسکتے ہیں۔ انھوں نے ابھی تک سوشیلا کی نسبت کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے وہ میرا رُخ دیکھ رہے ہیں۔ غالبًا اسی کشمکش نے ان کی یہ حالت کردی ہے۔ لیکن میں تو ان کی محبت کی بھوکی ہوں۔ مجھے ثروت و حشمت کی ضرورت نہیں وہ مجھے ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش کریں گے۔ کبھی میرا دل نہ دُکھائیں گے۔ سوشیلا کا ذکر کبھی بھول کر بھی ان کے لب پر نہ آئے گا۔ وہ دل میں کُڑھیں گے اگھا لیں گے۔ مگر ان کی ذات سے بعید ہے کہ میرے ساتھ سرد مہری یا بے وفائی کا برتاؤ کریں۔ میں ان کے مزاج سے خوب واقف ہوں۔ لیکن میں ان کے پاؤں کی زنجیر بننا نہیں چاہتی، جو کچھ گزرے اپنے ہی اوپر گزرے۔ انھیں کیوں سمیٹوں۔ خود ہی کیوں نہ ڈوبوں۔ انھیں اپنے ساتھ کیوں ڈباؤں؟ یہ بھی جانتی ہوں کہ اگر اس صدمے نے مجھے گھلاگھلا کر مار ڈالا تو وہ اپنے تئیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ ان کی ساری زندگی تلخ ہوجائے گی ان کا سکونِ قلب رخصت ہوجائے گا۔ میں انھیں ہمیشہ رُلایا کروں گی۔ میری یاد ہمیشہ انھیں تڑپایا کرے گی۔ ہائے ستم! مجھے مرنے کی بھی آزادی نہیں۔ مجھے ان کو خوش رکھنے کے لیے اپنے کو خوش رکھنا ہوگا۔ ان سے بے وفائی کرنی پڑے گی۔ دکھانا پڑے گا کہ اس بیماری کے باعث ہماری شادی خارج از بحث ہے۔ پیمان شکنی کا الزام اپنے سر لینا پڑے گا۔ زہر کھانا ہے اور دعائیں دینی ہیں۔ کوئی چارہ نہیں۔ پرماتما! مجھے ہمت دو کہ میں ان مصیبتوں کا سامنا کرسکوں۔

(۷)

شاردا چرن

ایک نگاہ نے میرے دل کا فیصلہ کردیا۔ لجیاوتی نے مجھے جیت لیا۔ ایک ہی نگاہ سے سوشیلا نے بھی مجھے جیتا تھا۔ اس نگاہ میں غضب کی کشش تھی۔ ایک دلآویز پُرشوخی ایک طفلانہ مسرت، گویا اسے کوئی کھلونہ مل گیا ہے۔ ایک فاتحانہ غرور گویا تاش کی بازی جیت لی۔ لجیاوتی کی نگاہ میں نرمی تھی، حسرت، درد اور ایثار تھا۔ وہ اپنے کو میری خوشیوں پر قربان کر رہی تھی۔ قیافہ میں اُسے ملکہ ہے۔ اس نے محض فراست سے میرے دل کی کیفیت کا مطالعہ کر لیا۔ سوشیلا کے انداز اور میری فریفتگی نے اس کے خیال کی تائید کردی۔ اس نے فوراً فیصلہ کرلیا۔ وہ میری خوشیوں میں مخل نہ ہونا چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ اسے میرے انحراف سے کچھ ملال ہے وہ یہ دِکھانا نہ

چاہتی تھی کہ اگر تم مجھ سے بالشت بھر ہٹوگے تو میں تم سے گز بھر ہٹ جاؤں گی۔ مگر دل پر پردہ ڈالنا مشکل کام ہے اس کی بے اعتنائی میں مایوسانہ حسرت تھی۔ اس کے تبسم میں پژمردگی۔ وہ میری نگاہ بچا کر کیوں رسوئی چلی جاتی تھی۔ اور کوئی چیز جسے وہ جانتی ہے کہ مجھے مرغوب ہے بنا آتی ہے۔ وہ خدمتگاروں سے کیوں مجھ سے چھپاکے میرے آرام کی تاکید کرتی تھی۔ وہ اخباروں کو کیوں میری نگاہ سے پوشیدہ رکھتی تھی۔ وہ شام کے وقت کیوں مجھے سیر کرنے کے لیے مجبور کرتی تھی۔ اس کی ایک ایک حرکت، ایک ایک بات، اس کے رازِ دل کو افشا کر رہی تھی۔ دل شناسی صنفِ نازک ہی کے حصّے میں نہیں آئی ہے۔ اس کا شاید اسے علم نہیں ہے اُسی دن جب پروفیسر بھاٹیہ نے باتوں ہی باتوں میں مجھ پر طنز کیے۔ مجھے ثروت اور دولت کا غلام کہا اور میری مساوات کی تضحیک کرنی چاہی تو اس کا چہرہ کیسا تمتما اُٹھا۔ معلوم نہیں بعد کو باپ بیٹی میں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ پر میں برآمدہ میں بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا کہ ان میں کوئی گرم مباحثہ ہو رہا ہے، کون ایسا انسان ہے جو اس بے غرض خدمت کا غلام نہ ہوجائے۔ لجیاوتی کو میں بہت دنوں سے جانتا ہوں لیکن میں نے اس کی حقیقت اسی ملاقات میں پہچانی ہے۔ پہلے میں اس کے حُسن کا اس کی شیریں گفتاری کا۔ اس کی خوش ادائی کا شیدا تھا۔ اس کے دل کے نازک ترین احساسات میری نظروں سے چھپے ہوئے تھے میں نے اب کے جانا کہ اس کی محبت کتنی گہری ہے۔ کتنی بے غرض، کتنی پاک، دوسری عورت ایسے موقعہ پر حسد سے باؤلی ہوجاتی۔ مجھ سے نہیں تو سوشیلا سے تو ضرور ہی جلنے لگتی۔ خود جلتی، اسے جلاتی اور مجھے بے وفا، دغا شعار، بوالہوس، جانے کیا کیا کہتی۔ مگر لجیاوتی کو جب یقین ہوگیا کہ سوشیلا نے میرے دل میں اس کی جگہ لے لی تو وہ کتنی خندہ پیشانی سے اس سے ملی۔ کیسے خلوص سے اُسے گلے لگایا۔ میل کدورت تنگ ظرفی کا شائبہ تک نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا بڑی بہن ہے۔ سوشیلا پر تسخیر عمل ہوگیا۔ آہ وہ رخصتی سماں مجھے کبھی نہ بھولے گا۔ پروفیسر بھاٹیہ موٹر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ سے کچھ بدظن ہوگئے تھے یہاں سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ لجیاوتی ایک سفید سادہ ساڑی پہنے میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ عفت اور پاکیزگی کی دیوی تھی۔ اس نے مسکرا کر مجھ سے کہا کبھی کبھی خط بھیجتے رہنا۔ میرا اتنا حق تو ہے ہی۔

میں نے جوش سے کہا۔ روزانہ نہیں تو دوسرے روز ضرور میرا خط پہنچے گا تم بھی

اپنی خیریت سے اطلاع دیتی رہنا۔

لجیاوتی نے پھر کہا۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔ معلوم نہیں میں کہاں ہوں گی۔ کہاں جاؤں گی۔ نہیں معلوم کل کیا ہو۔ اگر میری زبان سے کوئی بات نکل گئی ہو جس سے تمھیں صدمہ ہوا ہو تو اسے معاف کر دینا۔ اور سب سے بڑی التجا یہ ہے کہ اپنی صحت کا بہت خیال رکھنا۔

یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف ہاتھ بڑھا دیے وہ کانپ رہے تھے۔ شاید آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب آرہا تھا۔ وہ جلدی سے کمرے کے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ اپنے ضبط پر اُسے اب اعتماد نہ تھا۔ اس نے میری طرف ایک دبی ہوئی آواز سے دیکھا۔ نظر ملانے کی اُسے جرأت نہ تھی۔ مگر ان نیم وا آنکھوں میں بندھے ہوئے پانی کی تیزی اور شورش تھی۔ میں اس سیلاب میں بہہ گیا۔ میں نے فوراً اس کے ہاتھ پکڑ لیے اور بولا۔ نہیں لجیاوتی۔ اب ہم اور تم کبھی جدا نہ ہوں گے۔

دفعتاً ایک آدمی نے سوشیلا کا خط میرے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ لکھا تھا۔

ڈیر شاردا۔

ہم لوگ یہاں سے چلے جائیں گے۔ میں آج بہت مصروف ہوں اس لیے ملاقات نہ ہوسکے گی۔ میں نے آج رات کو فیصلہ کرلیا۔ میں لجیاوتی بہن کی آرزوؤں کا خون نہیں کرنا چاہتی۔ مجھے یہ بات پہلے مطلق معلوم نہ تھی ورنہ اتنے ارتباط کی نوبت نہ آتی۔ میری آپ سے بھی سفارش ہے کہ لجیاوتی کو ہاتھ سے نہ جانے دیجیے۔ میں جانتی ہوں کہ میں ان سے زیادہ حسین ہوں۔ مگر مجھ میں وہ روحانی عروج، وہ تیاگ، وہ بے نفسی نہیں ہے۔ میں آپ کو خوش رکھ سکتی ہوں۔ لیکن آپ کی زندگی کو سنوار نہیں سکتی۔ اسے زیادہ رفیع، زیادہ پاک نہیں بنا سکتی۔ لجیاوتی دیوی ہے وہ آپ کو دیوتا بنا دے گی۔ میں اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتی۔ والسلام۔ کل مجھ سے ملنے کا ارادہ نہ کیجیے گا۔ رونے رُلانے سے کیا فائدہ۔ الوداع!

میں نے خط لجیاوتی کو دے دیا۔ وہ پڑھ کر بولی میں اس سے آج ہی ملنے جاؤں گی
میں نے اس کا منشا سمجھ کر کہا۔ معاف کرو۔ میں تمھاری فیاضی کا دوبارہ امتحان نہیں لینا چاہتا۔

یہ کہہ کر پروفیسر بھاٹیہ کے پاس گیا۔ وہ موٹر پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے میری جگہ اگر لجیاوتی آئی ہوتی تو ضرور اس پر برس پڑتے۔

میں نے ان کے قدموں پر سر جھکا کر کہا۔ آپ نے مجھے ہمیشہ بیٹا تصور کیا ہے اب اس رشتے کو اور بھی مضبوط کر دیجیے۔

پروفیسر بھاٹیہ نے پہلے تو میری طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر مسکرا کر بولے یہ تو میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔

یہ افسانہ پہلی بار بنارس کے ہندی ماہنامہ مریادا کے مئی1922 کے شمارے میں شائع ہوا عنوان تھا ''ہار کی جیت'' ہندی میں ''مان سرور''8 میں شامل ہے اور اردو میں ہزار داستان کے جولائی1922 کے شمارے میں شائع ہوا۔''خواب و خیال'' میں شامل ہے۔

ناگ پوجا

پراتہ کال تھا۔ آساڑ کا پہلا دونگڑا نکل گیا تھا۔ کیٹ، پتنگ چاروں طرف رینگتے دکھائی دیتے تھے۔ تِلوتما نے واٹیکا کی اُور دیکھا تو پیڑ پودھے ایسے نکھر گئے تھے جیسے صابن سے میلے کپڑے نکھر جاتے ہیں۔ ان پر ایک وِچترادھیاتمِک (روحانی) شوبھا چھائی ہوئی تھی مانو یوگی ور آنند میں مگن پڑے ہوں۔ چڑیوں میں آسادھارن (غیر معمولی) چنچلتا تھی۔ ڈال ڈال، پات پات چہکتی پھرتی تھیں۔ تِلوتما باغ میں نکل آئی۔ وہ بھی انھیں پکشیوں کی بھانتی چنچل ہوگئی تھی۔ کبھی کسی پودھے کو دیکھتی، کبھی کسی پھول پر پڑی ہوئی جل کی بوندوں کو ہلا کر اپنے منہ پر ان کے شیتل چھینٹے ڈالتی لال بیر بہوٹیاں رینگ رہی تھیں۔ وہ انھیں چن کر ہتھیلی پر رکھنے لگی۔ سہسا اسے ایک کالا ورِہتکائے (بڑا) سانپ رینگتا دکھائی دیا۔ اس نے چلّا کر کہا۔ اماں، ناگ جی آرہے ہیں۔ لاؤ تھوڑا سا دودھ ان کے لیے کٹورے میں رکھ دوں۔

اماں نے کہا۔ جانے دو بیٹی ہوا کھانے نکلے ہوں گے!

تلوتما۔ گرمیوں میں کہاں چلے جاتے ہیں؟ دکھائی نہیں دیتے۔

ماں۔ کہیں جاتے نہیں بیٹی، اپنی بابنی میں پڑے رہتے ہیں۔

تلوتما۔ اور کہیں نہیں جاتے؟

ماں۔ بیٹی، ہمارے دیوتا ہیں اور کہیں کیوں جائیں گے؟ تمھارے جنم کے سال سے یہ برابر یہیں دکھائی دیتے ہیں۔ کسی سے نہیں بولتے۔ بچّہ پاس سے نکل جائے، پر ذرا بھی نہیں تاکتے۔ آج تک کوئی چوہیا بھی نہیں پکڑی۔

تلوتما۔ تو کھاتے کیا ہوں گے؟

ماں۔ بیٹی یہ لوگ ہوا پر رہتے ہیں۔ اسی سے ان کی آتما دِبیہ (خوبصورت) ہوجاتی ہے۔ اپنے پورو جنم کی باتیں انھیں یاد رہتی ہیں۔ آنے والی باتوں کو بھی جانتے ہیں۔ کوئی بڑا یوگی جب اہنکار کرنے لگتا ہے تو اسے دنڈ سوُروپ اس یونی میں جنم لینا پڑتا ہے۔ جب تک یہ پرائشچت (کفارہ) پورا نہیں ہوتا تب تک وہ اسی یونی میں رہتا ہے۔ کوئی

کوئی تو سو۔سو، دو۔ دوسو ورش تک جیتے رہتے ہیں۔

تلوتما۔ اس کی پوجا نہ کرو تو کیا کریں۔

ماں۔ بٹی کیسی بچّوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ ناراض ہوجائیں تو سر پر نہ جانے کیا پتی آپڑے۔ تیرے جنم کے سال پہلے پہل دکھائی دیے تھے۔ تب سے سال میں دس پانچ بار اوشئے درشن دے جاتے ہیں۔ ان کا ایسا پربھاو ہے کہ آج تک کسی کے سر میں درد تک نہیں ہوا۔

(۲)

کئی برس ہوگئے۔ تلوتما بالیکا سے یووتی ہوئی بواہ کا شبھ اوسر آپہنچا۔ بارات آئی، وِواہ ہوا، تلوتما کے پتی گرہ جانے کا مہورت آپہنچا۔

نئی ودھو کا شرنگار ہو رہا تھا۔ بھیتر باہر ہل چل مچی ہوئی تھی، ایسا جان پڑتا تھا بھگدڑ پڑی ہوئی ہے۔ تلوتما کے ہردے میں بیوگ (جدائی) دکھ کی ترنگیں اُٹھ رہی ہیں۔ وہ ایکانت میں بیٹھ کر رونا چاہتی ہے آج ماتا پتا بھائی بند، سکھیاں سہیلیاں سب چھوٹ جائیں گی۔ پھر معلوم نہیں کب ملنے کا سنجوگ (موقع) ہو۔ نہ جانے اب کیسے آدمیوں سے پالا پڑے گا۔ اماں کی آنکھیں ایک چھن بھی نہ تھمیں گی۔میں ایک دن کے لیے کہیں چلی جاتی تھی وہ رو رو کر ویتھت (رنجیدہ) ہوجاتی تھیں۔ اب یہ جیون پرینت (زندگی بھر) کا بیوگ کیسے سہے گی؟ اس کے سر میں درد ہوتا تھا تو جب تک میں دھیرے دھیرے نہ ملوں، انھیں کسی طرح کل چین ہی نہ پڑتی تھی۔ بابو جی کو پان بنا کر کون دے گا؟ مجھ سے ان کو دیکھے بنا کیسے رہا جائے گا؟ یہاں ذرا سر میں درد بھی ہوتا تھا تو اماں‌اور بابوجی گھبرا جاتے تھے۔ تورنت وید، حکیم آجاتے تھے۔ وہاں نہ جانے کیا حال ہوگا۔ بھگون، بند گھر میں کیسے رہا جائے گا؟ نہ جانے وہاں کھلی چھت ہے کہ نہیں۔ ہوگی بھی تو مجھے کون سونے دے گا؟ بھیتر گھٹ گھٹ کر مروں گی۔ جگنے میں ذرا دیر ہوجائے گی تو طعنے ملیں گے۔ یہاں صبح کو کوئی جگاتا تھا، تو اماں کہتی تھیں، سونے دو۔ کچی نیند جاگ جائے گی۔ تو سر میں پیڑا ہونے لگے گی۔ وہاں بینگ (طنز) سننے پڑیں گے، بہو آلسی ہے، دن بھر کھاٹ پر پڑی رہتی ہے۔ وے (پتی) تو بہت سشیل (نیک) معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں، کچھ ابھیمانی (متکبر) اوشئے ہیں۔ کہیں ان کا سوبھاؤ (برتاؤ) نٹھر (بُرا) ہوا تو؟

سہسا ان کی ماتا نے آکر کہا۔ بیٹی، تم سے ایک بات کہنے کی یاد نہیں رہی۔ وہاں ناگ پوجا اوشے کرتی رہنا۔ گھر کے اور لوگ چاہے منع کریں، پر تم اسے اپنا کرتبیّہ (فرض) سمجھنا۔ ابھی میری آنکھیں ذرا جھپک گئیں تھیں۔ ناگ بابا سُوپن میں درشن دیے۔

تلوتما۔ اماں مجھے بھی ان کے درشن ہوئے ہیں، پر مجھے تو انھوں نے بڑا وِکرال (خوفناک) روپ دکھایا بڑا بھینکر سوپن تھا۔

ماں۔ دیکھنا تمھارے گھر میں کوئی سانپ نہ مارنے پائے۔ یہ منتر نتیہ اپنے پاس رکھنا۔

تلوتما ابھی کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ اچانک بارات کی اُور سے رونے کے شبد سنائی دیے، ایک چھن میں ہاہاکار مچ گیا۔ بھینکر شوک گھٹنا ہوگئی۔ وَر کو سانپ نے کاٹ لیا۔ وہ بہو کو وداع کرانے آرہا تھا۔ پالکی میں مسند کے نیچے ایک کالا سانپ چھپا ہوا تھا۔ وَر جیوں ہی پالکی میں بیٹھا، سانپ نے کاٹ لیا۔ چاروں اور کُہرام مچ گیا۔ تلوتما پر تو مانو وجر پات (بجلی گر پڑی) ہوگیا۔ اس کی ماں سر پیٹ پیٹ رونے لگی۔ اس کے پتا بابو جگدیش چندر مورچھت (بے ہوش) ہوکر گر پڑے۔ ہردے روگ سے پہلے ہی سے گرست تھے۔ جھاڑ پھونک کرنے والے آئے، ڈاکٹر بلائے گئے، پر وِش گھاتک تھا۔ ذرا دیر میں وَر کے ہونٹھ نیلے پڑگئے۔ آنکھ کالے ہوگئے، مورچھا آنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے شریر ٹھنڈا پڑ گیا۔ ادھر اوشا کی لالیما لے پرکرتی کو آلوکت (روشن) کیا، ادھر ٹمٹماتا ہوا دیپک بجھ گیا۔

جیسے کوئی منُشیہ بوروں سے لدی ہوئی ناؤ پر بیٹھا ہوا من میں جھنجھلاتا ہے کہ یہ اور تیز کیوں نہیں چلتی، کہیں آرام سے بیٹھنے کی جگہ نہیں، یہ اتنی ہل کیوں رہی ہے، میں ویرتھ ہی اس پر بیٹھا۔ پر اکسمات (اچانک) ناو کو بھنور میں پڑتے دیکھ کر اس کے مستول سے چپٹ جاتا ہے، وہی دشا تلوتما کی ہوئی۔ ابھی تک وہ بیوگ دُکھ میں ہی مگن تھی، سُسرال کے کشٹوں اور دُرویوستھاؤں (بدانتظامیوں) کی چنتاؤں میں پڑی ہوئی تھی۔ پر اب اسے ہوش آیا کہ اس ناؤ کے ساتھ میں بھی ڈوب رہی ہوں۔ ایک چھن پہلے وہ کداچت (بالکل) جس پروش پر جھنجھلا رہی تھی، جسے لُٹیرا اور ڈاکو سمجھ رہی تھی، وہ اب کتنا پیارا تھا۔ اس کے بنا اب جیون ایک دیپک تھا بجھا ہوا۔ وِرکشھ (درخت) تھا پھل پھول وِہین (بے برگ و بار)۔ ابھی ایک چھن پہلے وہ دوسروں کی ایرشیا (جلن) کا کارن تھی، اب دَیا اور کرونا (محبت) کی۔

تھوڑے ہی دنوں میں اسے گیات ہوگیا کہ میں پتی وِہین ہوکر سنسار کے سب سکھوں سے ونچت (محروم) ہوگئی۔

(۳)

ایک برش بیت گیا۔ جگدیش چندر پکّے دھرما ولمبی (مذہبی) آدمی تھے پر تلوتما کو ویدھوے (بیوگی) اس سے نہ سہا گیا انھوں نے تلوتما کے پُنہ بواہ (دوبارہ شادی) کا نشچیہ کرلیا۔ ہسنے والوں نے تالیاں بجائیں پر جگدیش بابو نے ہردے سے کام لیا۔ تلوتما پر سارا گھر جان دیتا تھا۔ اس کی اِچھّا کے ورودھ (خلاف) کوئی بات نہ ہونے پاتی یہاں تک کہ وہ گھر کی مالکن بنا دی گئی تھی۔ سبھی دھیان رکھتے کہ اس کا رنج تازہ نہ ہونے پائے۔ لیکن اس کے چہرے پر اُداسی چھائی رہتی تھی۔ جسے دیکھ کر لوگوں کو دُکھ ہوتا تھا۔ پہلے ماں بھی اس ساماجک اتیاچار پر سہمت (متفق) نہ ہوئی۔ لیکن برادری والوں کا ورودھ جیوں جیوں بڑھتا گیا اس کا ورودھ ڈھیلا پڑتا گیا۔ سدھانت روپ (اصول کی رو) سے تو پرایہ کسی کو آپتّی (اعتراض) نہ تھی کنتو اسے ویوہار (عمل) میں لانے کا ساہس کسی میں نہ تھا۔ کئی مہینوں کے لگاتار پریاس کے بعد ایک کلین (خاندانی) سدھانتوادی (بااصول)، سوشکچھت (تعلیم یافتہ) ور ملا۔ اس کے گھر والے بھی راضی ہوگئے۔ تلوتما کو سماج میں اپنا نام بکتے دیکھ کر دُکھ ہوتا تھا۔ وہ من میں کڑھتی تھی کہ پتا جی ناحق میرے لیے سماج میں نکّو بن رہے ہیں۔ اگر میرے بھاگیہ میں سہاگ لکھا ہوتا تو یہ وجر ہی کیوں گرتا۔ اسے کبھی کبھی ایسی شدکا (خوف) ہوتی تھی کہ میں پھر وِدھوا ہوجاؤں گی۔ جب وِیواہ نشچِت ہوگیا اور ور کی تصویر اس کے سامنے آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ چہرے سے کتنی سجّنتا، کتنی دڑتا (صلابت)، کتنی وچارشیلتا ٹپکتی تھی۔ وہ چترّ کو لیے ہوئے ماتا کے پاس گئی اور شرم سے سر جھکا کر بولی۔ اماں مجھے منہ تو نہ کھولنا چاہیے، پر اوستھا ایسی آپڑی ہے کہ بِنا منہ کھولے رہا نہیں جاتا۔ آپ بابو جی کو منع کردیں۔ میں جس دشا میں ہوں سُنتشٹ ہوں مجھے ایسا بھے ہو رہا کہ اب کہ پھر وہ شوک گھٹنا ....

ماں نے سہمی ہوئی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ بیٹی کیسی اشگن کی بات منہ سے نکال رہی ہو۔ تمھارے میں بھے سما گیا ہے اسی سے یہ بھرم ہوتا ہے۔ جو ہونی تھی، وہ ہوچکی۔ اب کیا ایشور تمھارے پیچھے پڑے ہی رہیں گے؟

تلوتما۔ ہاں مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے؟

ماں۔ کیوں، تمھیں ایسی شنکا کیوں ہوتی ہے؟

تلوتما۔ نہ جانے کیوں؟ کوئی مرے من میں بیٹھا ہوا کہہ رہا ہے کہ پھر انشٹھ (بُرا) ہوگا۔ میں پرایہ نتیہ سوپن دیکھا کرتی ہوں۔ رات کو مجھے ایسا جان پڑتا ہے کہ کوئی پرانی جس کی صورت سانپ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ میری چارپائی کے چاروں اُور گھومتا ہے۔ میں بھئے کے مارے چپی سادھ لیتی ہوں۔ کسی سے کچھ کہتی نہیں۔

ماں نے سمجھا یہ سب بھرم ہے۔ وِواہ کی تتھی نیت ہوگئی۔ یہ کیول تلوتما کا پُنہ سنسکار نہ تھا، بلکہ سماج سدھار کا ایک کریاتمک اداہرن (عملی مثال) تھا۔ سماج سدھارکوں کے دَل دور سے بواہ میں سملت ہونے کے لیے آنے لگے بواہ ویدک ریتی سے ہوا۔ مہمانوں نے خوب ویاکھیان دیے۔ پتروں نے خوب آلوچنائیں کی۔ بابو جگدیش چندر کے نیتک (اخلاقی) ساہس (حوصلے) کی سراہنا ہونے لگی۔ تیسرے دن بہو وداع ہونے کا مہورت تھا۔

جنواسے میں یتھا سادھیہ رکھشا (حفاظت کے ممکنہ) کے سبھی سادھنوں (طریقوں) سے کام لیا گیا تھا۔ بجلی کی روشنی سے سارا جنواسا دن سا ہوگیا تھا۔ بھومی پر رینگتی ہوئی چیونٹی بھی دکھائی دیتی تھی۔ کیشوں میں نہ کہیں شکن تھی، نہ سلوٹ اور نہ جھول۔ شامیانے کے چاروں طرف قناطیں کھڑی کردی گئی تھیں۔ کسی طرف سے کیڑے مکوڑوں کے آنے کی سنبھاونا (امکان) نہ تھی۔ پربھاوی (اثر) پربل (طاقت ور) ہوتی ہے۔ پراتا کال کے چار بجے تھے۔ تارا گنوں (تاروں) کی بارات وداع ہو رہی تھی بہو کی وداعی کی تیاری ہو رہی تھی۔ ایک طرف شہنائیاں بج رہی تھیں۔ دوسری طرف سے ولاپ کی اَترتیہ دھونی اُٹھ رہی تھی۔ پر تلوتما کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے، سمے نازک تھا۔ وہ کسی طرح گھر سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ اس کے سر پر تلوار لٹک رہی تھی۔ رونے اور سہیلیوں سے گلے ملنے میں کوئی آنند نہ تھا۔ جس پرانی کا پھوڑا چلک رہا ہو اسے جرّاح کا گھر باغ میں سیر کرنے سے زیادہ اچھا لگے، تو کیا آشچریہ ہے۔

وَر کو لوگوں نے جگایا۔ باجا بجنے لگا۔ وہ پالکی میں بیٹھنے کو چلا کہ بدھو کو بدا کرا لائے۔ پر جوتے میں پیر ڈالا ہی کہ چیخ مار کر پیر کھینچ لیا۔ معلوم ہوا کہ پاؤ چنگاریوں پر پڑگیا۔ دیکھا تو ایک کالا سانپ جوتے میں سے نکل کر رینگتا ہوا چلا جاتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے

غائب ہوگیا۔ وَر نے ایک سرد آہ بھری اور بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھاگیا۔

ایک چھن میں سارے جنواسے میں خبر پھیل گئی، لوگ دوڑ پڑے۔ اُوشدھیاں پہلے ہی رکھ لی گئی تھیں۔ سانپ کا منتر جاننے والے کئی آدمی بلا لیے گئے تھے۔ سبھی نے دوائیاں دیں۔ جھاڑ پھونک شروع ہوئی اوشدھیاں بھی دی گئیں۔ پر کال کے سامنے کسی کا بس نہ چلا۔ شاید موت سانپ کا بھیس دھر کر آئی تھی۔ تلوتما نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ وہ وکل (مضطرب) ہوکر جنواسے کی طرف دوڑی۔ چادر اوڑھنے کی بھی سدھ نہ رہی۔ وہ اپنی پتی کے چرنوں کو ماتھے سے لگا کر اپنا جنم سپھل کرنا چاہتی تھی۔ گھر کی استریوں نے روکا۔ ماتا بھی رو رو کر سمجھانے لگیں۔ لیکن بابو جگدیش چندر نے کہا کوئی ہرج نہیں، جانے دو پتی کا درشن کرلے۔ یہ ابھیلاشا کیوں رہ جائے۔ اسی شوکانِوت دِشا (غم زدہ حالت) میں تلوتما جنواسے میں پہنچی، پر وہاں اس کی تسکین کے لیے مرنے والے کی اُلٹی سانسیں تھیں۔ ان ادھ کھولے نیتروں میں اساہیہ آتم ویدنا (ناقابلِ برداشت تکلیف) اور دارُن نراشیہ (انتہائی نا امیدی)۔

(۴)

اس ادبھُت گھٹنا کا ساچار دور دور تک پھیل گیا۔ جڑوادی گڑن (دہریے) چکت (حیران) تھے، یہ کیا ماجرا ہے آتم واد (روحانیت پسندی) کے بھکت گیات بھاوسے سر ہلاتے تھے مانوں وے ترکالرشی (تینوں زمانوں کے عالم) ہیں۔ جگدیش چندر نے نصیب ٹھونک لیا۔ نشچت ہوگیا کہ کنیا کے بھاگیہ میں بدھوا رہنا ہی لکھا ہے۔ ناگ کی پوجا سال میں دوبارہ ہونے لگی۔ تلوتما کے چرتر میں بھی ایک وشیش انتر دِکھنے لگا۔ بھوگ اور وہار (عیش و عشرت) کے دن بھکتی اور دیو آرادھنا (پوجا) میں کٹنے لگے۔ نراش پرانیوں کا یہی اولمب ہے۔

تین سال بیتے تھے کہ ڈھاکا وِشو ودھیالہ کے ادھیاپک دَیا رام نے اس قصّے کو پھر تاجا کیا۔ وے پشو شاستر کے گیاتا تھے۔ انھوں نے سانپوں کے آچار وچار و بیوہار کا وِشیش (خاص) ریتی (طریقے) سے ادھین (مطالعہ) کیا۔ وے اس رہسیہ کو کھولنا چاہتے تھے۔ جگدیش چندر کو بواہ کا سندیش بھیجا۔ انھوں نے ٹال مٹول کیا۔ دیا رام نے اور بھی آگرہ کیا۔ لکھا میں نے ویگیانک انویشن (سائنسی تحقیق) کے لیے یہ نشچیہ کیا ہے میں اس وشدھر (زہریلے) ناگ سے لڑنا چاہتا ہوں۔ وہ اگر سو دانت لے کر آئے تو بھی مجھے کوئی ہانی

(نقصان) نہیں پہنچا سکتا، وہ مجھے کاٹ کر آپ ہی مر جائے گا۔ اگر وہ مجھے کاٹ بھی لے تو میرے پاس ایسے منتر اور اُوشیدھیاں (دوائیاں) ہیں کہ میں ایک چھن میں اس کے بِش کو اُتار سکتا ہوں۔ جگدیش چندر کو اب کوئی عذر نہ سوجھا۔ ہاں انھوں نے ایک ویشیش پریتن (خاص کوشش) کیا کہ ڈھاکہ میں ہی بواہ ہو۔ اَت ایو (اس لیے) وے اپنے کٹمبیوں کو ساتھ لے کر بواہ کے ایک سپتاہ (ہفتہ) پہلے گئے۔ چلتے سے اپنے صندوق، بستر آدی (وغیرہ) خوب دیکھ بھال کر رکھے کہ سانپ کہیں ان میں چھپ کر نہ بیٹھ جائے۔ شبھ لگن میں بواہ سنسکار ہوگیا۔ تلوتما وکل ہو رہی تھی۔ مکھ پر ایک رنگ آتا تھا، ایک رنگ جاتا تھا، پر سنسکار میں کوئی بگھن (خلل) بادھا (اڑچن) نہ پڑی۔ تلوتما رو دھوکر سسرال گئی۔ جگدیش چندر گھر لوٹ آئے پر ایسے چنتت (فکرمند) تھے جیسے کوئی آدمی سرائے میں کھلا ہوا صندوق چھوڑ کر بازار چلا جائے۔

تلوتما کے سوبھاؤ میں اب ایک وچتر روپانتر (تبدیلی) ہوا۔ وہ اوروں سے ہنستی بولتی آرام سے کھاتی پیتی سیر کرنے جاتی، تھیٹروں انیہ (دیگر) سماجک سمیلنوں (جلسوں) میں شریک ہوتی۔ ان اوَسروں پر پروفیسر دیا رام سے بھی بڑے پریم کا ویوہار کرتی، ان کے آرام کا بہت دھیان رکھتی۔ کوئی کام ان کی اِچھا کے وِرودھ نہ کرتی۔ کوئی اجنبی آدمی اُسے دیکھ کر کہہ سکتا تھا گرہنی ہو تو ایسی ہو۔ دوسروں کی درشٹی (نظر) میں اس دمپتی (شادی شدہ) کا جیون آدرش (مثالی) تھا۔ کنتو آنترک دشا (اندرونی حالت) کچھ اور ہی تھی۔ ان کے ساتھ شیناگار (کمرے) میں جاتے ہی اس کا مکھ وکرت (خوفناک) ہوجاتا، بھویں تن جاتیں، ماتھے پر بل پڑجاتے، شریر اگنی کی بھانتی جلنے لگتا، پلکیں کھلی رہ جاتیں، نیتروں سے جوالا سی نکلنے لگتی اور اس میں سے جھلستی ہوئی لپٹیں نکلتیں، مکھ پر کالیما چھا جاتی اور یدیپی سوروپ میں کوئی وشیش انتر (خاص فرق) نہ دکھائی دیتا، پر نہ جانے کیوں بھرم ہونے لگتا، یہ کوئی ناگن ہے۔ کبھی کبھی وہ پھنکارنے بھی لگتی۔ اس استھتی میں دیارام کو اس کے سمیپ جانے یا اس سے کچھ بولنے کی ہمت نہ پڑتی۔ وے اس کے روپ، لاونیہ (حسن) پر مگدھ (فریفتہ) تھے، کنتو اس اوستھا میں انھیں اس سے گھرنا (نفرت) ہوتی۔ اسے اس انماد (دیوانگی) کے آویگ (لہر) میں چھوڑ کر باہر نکل آتے۔ ڈاکٹروں سے صلاح لی، سویم اس وشے پر کتنی ہی کتابوں کا ادھین کیا، پر رہسیہ (راز) کچھ سمجھ میں نہ آیا، انھیں بھوتک

وِگیان (علم طبیعات) میں اپنی الپ گیاتا (کم علمی) سویکار (ماننا) کرنی پڑی۔

انھیں اب اپنا جیون اسہائے جان پڑتا۔ اپنے دوساہس (غلط حوصلے) پر پچھتاتے۔ ناحق اس وِپتّی میں اپنی جان پھنسائی۔ انھیں شنکا ہونے لگی کہ اوشیہ کوئی پریت لیلا ہے۔ متھیا وادی (غیر حقیقت پسند) نہ تھے، پر جہاں بدھی اور ترک کا کچھ وش نہیں چلتا، وہاں مُنشیہ ویوش (مجبور) ہوکر متھیا وادی ہوجاتا ہے۔

شنیہ شنیہ ان کی یہ حالت ہوگئی کہ سدیو تلوتما سے سشنک رہتے۔ اس کا اُنماد وکرت، مکھا کرِتی ان کے دھیان سے نہ اُترتے۔ ڈر لگتا کہ کہیں یہ مجھے مار نہ ڈالے۔ نہ جانے کب انماد کا آویگ ہو۔ یہ چنتا ہردے کو ویتھت کیا کرتی۔ ہپناٹزم، ودھوت شکتی (برقی قوت) اور کئی نئے آروگیہ ودھانوں (طبی طریقوں) کی پریکشا کی گئی۔ انھیں ہپناٹزم پر بہت بھروسا تھا، لیکن جب یہ یوگ بھی نشپھل (بے فائدہ) ہوگیا تو وے نراش ہوگئے۔

(۵)

ایک دن پروفیسر دیا رام کسی ویگیانک سمّیلن میں گئے ہوئے تھے۔ لوٹے تو بارہ بج گئے تھے۔ ورشا کے دن تھے۔ نوکر چاکر سو رہے تھے۔ وے تلوتما کے شین گرہ (سونے کے کمرہ) میں یہ پوچھنے گئے کہ میرا بھوجن کہاں رکھا ہے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ تلوتما کے سرہانے کی اُور انھیں ایک اتی بھیم کائے کالا سانپ بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ پروفیسر صاحب چپکے سے لوٹ آئے۔ اپنے کمرے میں جاکر کسی اَوشدھی کی خوراک پی اور پستول تتھا (اور) سانگا لے کر پھر تلوتما کے کمرے میں پہنچے۔ وشواس ہوگیا کہ یہ وہی میرا پُرانا شترو ہے۔ اتنے دن میں ٹوہ لگاتا ہوا یہاں آپہنچا پر اسے تلوتما سے کیوں اتنا اسنیہ ہے۔ اس کے سرہانے یوں بیٹھا ہوا ہے مانو کوئی رسّی کا ٹکڑا ہے۔ یہ کیا رہسیہ ہے! انھوں نے سانپوں کے سلسلے میں بڑی ادبھوت کتھائیں پڑھی اور سنی تھیں، پر ایسی کوتوہل جنک (عجیب و غریب) گھٹنا کا اُلیکھ کہیں نہ دیکھا تھا۔ وے اس بھانتی سشستر (مسلح) ہوکر پھر کمرے میں پہنچے تو سانپ کا پتہ نہ تھا۔ ہاں تلوتما کے سر پر بھوت سوار ہوگیا تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی آگنیہ نیتروں سے دوار کی اور تاک رہی تھی۔ اس کے نینوں سے جوالا نکل رہی تھی، جس کی آنچ دو گز تک لگتی۔ اس سمئے اُنماد اتیشے پرَچنڈ (بہت زیادہ تیز) تھا۔ دیا رام کو دیکھتے ہی بجلی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑی اور ہاتھوں سے آگھات کرنے کے بدلے انھیں دانتوں سے کاٹنے کی چیشٹا کرنے لگی۔

اس کے ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھ اُن کی گردن میں ڈال دیے۔ دیارام نے بہوتیرا چاہا، ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا کہ اپنا گلا چھڑا لیں، لیکن تلوتما کا باہو باش پرتی چھنڑ (لگاتار) سانپ کی کیڑلی کی بھانتی کٹھور (سخت) اِوم (اور) سنکوچت (تنگ) ہوتا جاتا تھا۔ ادھر یہ سندیہہ تھا کہ اس نے مجھے کاٹا تو کداچت اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ انھوں نے ابھی جو اَوشدھی پی تھی، وہ سرپ وِش (سانپ کے زہر) سے ادھک گھاتک (زیادہ مہلک) تھی۔ اس دَشا میں انھیں یہ شوک مئے وِچار اُتپن ہوا۔ یہ بھی کوئی چیز ہے کہ دمپتی کا اُتردائتو (ذمہ داری) تو سب سر پر سوار، پر اس کا سکھ نام کا نہیں اُلٹے رات دن جان کا کھٹکا۔ یہ کیا مایا ہے۔ وہ سانپ کوئی پریت تو نہیں ہے جو اس کے سر آکر یہ دَشا کردیا کرتا ہے۔ کہتے ہیں ایسی اَوستھا میں روگی پر جو چوٹ کی جاتی ہے وہ پریت پر ہی پڑتی ہے۔ نیچی جاتیوں میں اس کے اداہرن بھی دیکھے ہیں۔ وے اسی حیص بیص (رد و قبول) میں پڑے تھے کہ ان کا دم گھٹنے لگا۔ تلوتما کے ہاتھ رسّی کے پھندوں کے بھانتی ان کی گردن کو کس رہے تھے۔ وے دین اساہائے بھاؤ سے ادھر اُدھر تاکنے لگے۔ کیوں کر جان بچے، کوئی اُپائے نہ سوجھ پڑتا تھا۔ سانس لینا دوبھر ہوگیا، دیہہ (جسم) شتھل (ڈھیلا) پڑگئی، پیر تھر تھرانے لگے۔ سہسا تلوتما نے ان کی باہوں کی اُور منہ بڑھایا۔ دیا رام کانپ اُٹھے۔ مرتیو آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ من میں کہا۔ یہ اس سمئے میری استری نہیں، وِشیلی بھینکر ناگن ہے۔ اس کے وِش سے جان بچانا مشکل ہے۔ اپنی اَوشدھی پر جو بھروسا تھا وہ جاتا رہا۔ چوہا اُنمت دَشا میں کاٹ لیتا ہے تو جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ بھگوان؟ کتنا وکرال سَوروپ ہے؟ پرتیکش ناگن معلوم ہورہی ہے۔ اب اُلٹی پڑے یا سیدھی اس دَشا کا انت کرنا ہی پڑے گا۔ انھیں ایسا جان پڑا کہ اب گِرا ہی چاہتا ہوں۔ تلوتما بار بار سانپوں کی بھانتی پھنکار مار کر جیبھ نکالے ہوئے ان کی اُور جھپٹتی تھی، یکایک وہ بڑے کرکش سُور میں بولی۔ مورکھ؟ تیرا اتنا ساہس کہ تو اس سندری سے پریم لِنگن کرے۔ یہ کہہ کر وہ بڑے ویگ سے کاٹنے کو دوڑی۔ دیا رام کا دھریہ جاتا رہا۔ انھوں نے داہنا ہاتھ سیدھا کیا اور تلوتما کی چھاتی پر پستول چلا دیا۔ تلوتما پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کی باہیں اور بھی کڑی ہوگئیں۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ دیا رام نے دوسری گولی داغ دی۔ یہ چوٹ پوری پڑی۔ تلوتما کا باہو بندھن ڈھیلا پڑگیا۔ ایک چھن میں اس کے ہاتھ نیچے لٹک گئے، سر جھک گیا اور بھومی پر گر پڑی۔

تب وہ دِرشیہ دیکھنے میں آیا جس کا اداہرن کداچت الف لیلا اور چندر کانتا میں بھی نہ ملے۔ وہی پلنگ کے پاس، زمین پر ایک کالا، وِردھ کائے سَرپ پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کی چھاتی اور منہ سے خون کی دھارا بہہ رہی تھی۔

دیا رام کو اپنی آنکھوں پر وشواس نہ آتا تھا۔ یہ کیسی اَدبھت پریت لیلا تھی! سمسیا کیا ہے کس سے پوچھوں؟ اس طلسم کو توڑنے کا پریتن کرنا میرے جیون کا ایک کرتبیہ ہوگیا۔ انھوں نے سانگے سے سانپ کی دیہہ میں ایک کوچا مارا اور پھر وہ اسے لٹکائے ہوئے آنگن میں لائے۔ بالکل بے دم ہوگیا تھا۔ انھوں نے اسے اپنے کمرے میں لاکر ایک خالی صندوق میں بند کردیا۔ اس میں بھونس بھروا کر برآمدے میں لٹکانا چاہتے تھے۔ اتنا بڑا گیھون سانپ کسی نے دیکھا نہ ہوگا۔

تب وے تلوتما کے پاس گئے۔ ڈر کے مارے کمرے میں قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ہاں، اس وِچار سے کچھ تسکین ہوتی تھی کہ سرپ پریت مر گیا ہے تو اس کی جان بچ گئی ہوگی۔ اس آشا اور بھئے کی دَشا میں وہ اندر گئے تو تلوتما آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر کیش سنوار رہی تھی۔

دیا رام کو مانو چاروں پدارتھ مل گئے۔ تلوتما کا مکھ ۔کمل کھلا ہوا تھا۔ انھوں نے کبھی اسے اتنا پرپُھللت (پُرجوش) نہ دیکھا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی وہ ان کی اُور پریم سے چلی اور بولی۔ آج اتنی رات تک کہاں رہے؟

دیا رام پریمونمت ہوکر بولے۔ ایک جلسے میں چلا گیا تھا۔ تمھاری طبیعت کیسی ہے؟ کہیں درد نہیں ہے؟

تلوتما نے ان کو آشچریہ سے دیکھ کر پوچھا۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ میری چھاتی میں ایسا درد ہو رہا ہے، جیسے چلک پڑگئی ہو۔

یہ افسانہ پہلی بار تہذیبِ نسواں کے اگست 1922 کے شمارے میں 'سانپ کی معشوقہ' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ہندی میں مان سرودر 7 میں ناگ پوجا کے عنوان سے شامل ہے یہاں "ناگ پوجا" کو رسم خط بدل کر اردو میں شائع کیا جارہا ہے۔

فکرِ دُنیا

جیک یوں دیکھنے میں بہت موٹا تازہ لحیم شحیم تھا۔ بھونکتا تو سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹ جاتے۔ ڈیل ڈول بھی ایسا تھا کہ اندھیری رات میں اس پر گدھے کا شُبہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کی دلیری کسی معرکہ میں کبھی ظاہر نہ ہوئی تھی۔ دوچار بار جب بازار کے مربھوکے شہدوں نے اسے للکارا تو وہ ان کی جسارت کا مزہ چکھانے کے لیے میدان میں آیا اور دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جب تک لڑا جیوٹ سے لڑا۔ پنجے اور دانتوں سے زیادہ کارہائے نمایاں اس کی دُم نے کیے۔ تحقیقی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ بالآخر میدان کس کے ہاتھ رہا لیکن جب فریقِ مخالف کو اپنی حمایت کے لیے اور کمک منگانی پڑی۔ تو اُصولِ حرب کے مطابق فتح کا سہرا جیک ہی کے سر رکھنا زیادہ قرنِ انصاف معلوم ہوتا ہے۔ جیک نے اس وقت مصلحت سے کام لیا اور صلح کرلی۔ لیکن تب سے اس نے ایسے نا اصول پرور اور بے راہ رقیبوں کو مُنہ نہ لگایا۔

اتنا صلح پسند اور فروتن اور متحمل مزاج ہونے پر بھی جیک کے رقیبوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے ہمسر تو اس لیے اس سے جلتے کہ یہ اتنا جسیم اور عظیم الجثہ ہوکر بھی اس قدر سلامت رو کیوں ہے۔ ان کے خیال میں سلامت روی اس کے شایانِ شان نہ تھی۔ بازاری غول اس سے محض اس لیے بدگمان رہتا تھا کہ جیک کے مارے گھوروں پر کی ہڈیاں اور تیل بھی نہ بچنے پاتے تھے وہ گھڑی رات رہے اُٹھتا اور حلوائیوں کی دُکانوں کے سامنے کے دونے اور نانبائیوں کی دُکانوں کے سامنے کی ہڈیاں ایک ایک کرکے اُڑا جاتا۔ وہ اپنے بقائے حیات کی دُھن میں بھول جاتا کہ یہ علاقہ دوسروں کا ہے اور میں بلا ان کی مرضی کے اس کے اندر قدم رکھنے کا مجاز نہیں ہوں تا وقتیکہ اپنے پنجہ و دنداں سے اپنا استحقاق ثابت کردوں۔ چنانچہ اتنے دشمنوں کی نگاہوں پر چڑھ کر جیک کی زندگی ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی۔ مہینوں گزرجاتے اور سیری نصیب نہ ہوتی۔ کئی بار اسے سیری کی ہوس نے مشکوک ذرائع سے کام لینے پر مجبور کیا مگر جب نتیجہ اُمید کے خلاف

ظہور میں آیا اور لقمہ ہائے لطیف اور پُر کے بدلے زیادہ ثقیل اور تحمل آزما چیزیں شکم پُری کو ملیں تو مجبور ہوکر پھر وہی روش سلامت روی اختیار کی۔

مگر اس نیرنگیٔ تقدیر اور سعی ناموفور نے اشتیاق کو فرو کرنے کے بدلے اور بھی مشتعل کر دیا۔ اس کے دل میں ایک بیتاب کن آرزو پیدا ہوئی۔ کسی ایسی جگہ جاؤں جہاں شکار بہ افراط ہو۔ ہرن اور خرگوش اور بھیڑوں کے گلے مرغزاروں میں چرتے ہوں۔ نہ ان کا کوئی مالک ہو نہ محافظ کسی رقیب کا اندیشہ تک نہ ہو۔ آرام کرنے کو گھنے درختوں کا سایہ ہو۔ پینے کو ندی کا صاف ستھرا پانی۔ من مانا شکار کھیلوں کھاؤں اور میٹھی نیند سوؤں۔ چاروں طرف میری دھاک جم جائے۔ ایسا رُعب قائم ہوجائے۔ دلوں میں میری اتنی ہیبت سما جائے کہ جدھر نکل جاؤں ہلچل پڑجائے سب جانور مجھی کو اپنا فرماں روا حتیٰ کہ اپنا راجا سمجھنے لگیں۔ ایسا سکہ بیٹھ جائے کہ کسی رقیب کو اِدھر نگاہ اُٹھانے کی ہمت تک نہ ہو۔

قضا را ایک دن وہ انھیں دل خوش کن خیالات کے سرور میں سر جھکائے سڑک چھوڑ کر گلیوں سے چلا جارہا تھا کہ دفعتاً ایک جوان ہمت حریف سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ جیک نے دبی ہوئی نگاہوں سے اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو تھرآ گیا۔ چاہتا تھا کہ بچ کر نکل جائے مگر حریف روسیاہ اتنا صلح پسند نہ تھا اس نے فوراً جھپٹ کر جیک کی گردن پکڑ لی۔ جیک نے بہت منت و سماجت کی، گڑگڑا کر کہا۔ خدا را مجھے چلا جانے دو۔ قسم لے لو جو پھر ادھر قدم رکھوں مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ علاقہ تمھارے ممالک محروسہ میں شامل ہے ورنہ مجھ سے ایسی حماقت ہرگز نہ سرزد ہوتی۔ تم شیر ہو۔ دلیر ہو۔ مردِ میدان ہو۔ میں فاقہ کش غریب خستہ حال بھلا تم سے آنکھیں ملانے کا دعوا کرسکتا ہوں۔ پر اس نشہ خودی کے متوالے شقی اور سیہ باطن وجود کا دل ذرا بھی نہ پسیجا بلکہ اس عجز و الحاح نے اسے اور بھی آمادۂ پُرخاش کردیا۔ ضرر کا اندیشہ نہ رہا۔ آخر بدرجہ مجبوری جیک نے نہایت بیکسانہ انداز سے نالۂ فریاد بلند کیا۔ یہ شور سُن کر علاقہ کے چند اور شریر حضرات جمع ہوگئے لیکن وہ بھی جوہر انسانیت سے عاری تھے۔ بجائے اِس کے کہ بیکس پر رحم کریں اور بے رحم حملہ آور کو نشانۂ ملامت و تحقیر بنائیں الٹے جیک ہی پر ٹوٹ پڑے۔ جیک نے راہِ فرار اختیار کی۔ پر ان بہائم نے بہت دُور تک اس کا تعاقب کیا یہاں تک کہ راستہ میں ایک دریا حائل ہوگیا اور جیک نے توکل بخدا اس میں کود کر اپنی جان بچائی۔ ان ظالموں کو ندی میں

کودنے کی ہمت نہ پڑی۔

کہتے ہیں ایک کوڑے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ جیک کے دن بھی ندی میں کودتے ہی پھر گئے۔ کودا تھا جان بچانے کے لیے۔ ہاتھ لگ گئے موتی۔ تیرتا ہوا اس پار پہنچا۔ تو وہاں اس کی دیرینہ تمناؤں کی کلیاں کھلی ہوئی تھیں۔

(۲)

یہ ایک نہایت وسیع خطہ تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی سبزہ کا زمردیں فرش بچھا ہوا نظر آتا۔ کہیں مترنم آبشار تھے۔ کہیں متبسم مرغزار۔ ایک دل فریب منظر تھا۔ فرحت و نزہت سے بھانت بھانت کے طیور و چوپائے نظر آئے بعض ایسے دراز قد کہ جیک انھیں دیکھ کر تھرا اُٹھا۔ بعض ایسے خونخوار کہ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ایسے ایسے مہیب اژدھے نظر آئے جو ایک کش میں اسے نگل جائیں۔ جیک سخت تشویش میں مبتلا ہوا۔ دل فریب منظر نے جو اُمیدیں بیدار کردی تھیں وہ غائب ہوگئیں۔ اس وادیٔ پُرخطر میں رات کیوں کر بسر ہوگی وہ اسی فکر میں غوطے کھا رہا تھا کہ شام ہوگئی اور تاریکی کے تسلط ہوتے ہی وہاں ایک شور قیامت برپا ہوگیا۔ درند و پرند قطاروں میں کھڑے ہوگئے اور پنجہ و ناخن منقار و دنداں سے ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ ان کی گرج اور تڑپ چوٹ اور وار دیکھ کر جیک کے ہوش اُڑ گئے ایک گوشۂ محفوظ میں دُبکا ہوا یہ معرکۂ خونریز دیکھتا رہا۔ ساری رات میدانِ کارزار گرم رہا۔ خون کی ندی بہتی رہی۔ صبح کو وہاں اس نے جاکر دیکھا۔ تو معرکہ آراؤں کا نشان نہ تھا۔ مقتولوں کے انبار لگے تھے۔ کتنے ہی زخم خوردہ سورما ایڑیاں رگڑ رہے تھے اب کیا تھا۔ جیک کے پوبارہ ہوگئے۔ ایک زخمی ہرن پر ٹوٹ پڑا۔ اور چشم زدن میں اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ آج مدّت دراز کے بعد شاید زندگی میں پہلی بار اسے سیری کا احساس ہوا۔

مگر یہ خونیں نظارے کسی علت یا سبب کے پابند نہ تھے۔ دن اپنے اپنے گوشے میں آرام کرنے کے بعد شام کو اس وادی کے سبھی باشندے نکل آتے اور معرکۂ کارزار شروع ہوجاتا اور پھر صبح کو جیک اپنے لیے اغذیہ لطیف کا دسترخوان بچھا ہوا پاتا یہ روز کا معمول تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں عیش بے خلل اور غذائے قوت بخش نے جیک پر جادو کا سا

اثر پیدا کیا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ کیم، دراز قد اور خوفناک ہوگیا اپنے قویٰ میں اُسے حیرت انگیز توانائی اور چُستی کا احساس ہونے لگا۔ اس کی ہمت بھی کھل گئی۔ وہ اب پیٹ میں مُنہ دبائے سمیٹے کسی گوشہ میں نہ بیٹھتا بلکہ دلیرانہ انداز غرور سے سبزہ زار میں چھلانگیں بھرتا اور کسی چھوٹے موٹے جانور کا شکار بھی کرلیتا۔ اِدھر اس خطّہ کے دلیروں میں روزانہ خونریزی و معرکہ آرائی کے باعث ضعف و انحطاط کے آثار نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور اب اس وادیٔ پُرفضا میں جیک کا مدِّ مقابل نہ رہا۔

جیک کو اب اپنی شجاعت اور مردانگی کے اظہار کا موقع ملا۔ اس کی آواز میں شیروں کی سی گرج تھی۔ بشرہ سے رُعب اور ہیبت کی شعاعیں نکلتیں۔ جنگل کے جانور اسے بچہ شیر سمجھنے لگے۔ جیک بھی اپنی صید افگنی کے کمال دِکھا کر ان کے اس خیال کی تائید کرنے لگا۔ خدا نے مجھے تمھارے اوپر حکومت کرنے کے لیے بھیجا ہے یہ مشیت الٰہی ہے تم بے غل و غش اپنے اپنے گھروں میں پڑے رہو۔ میں تم سے کچھ نہ بولوں گا۔ اگر کوئی دشمن باہر سے آجائے گا۔ تو خود اس سے مقابلہ کروں گا۔ میری ذات سے تمھیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔ میں تمھیں خوابِ غفلت سے بیدار نہ کروں گا۔ محض تمھاری خدمت کرنے کے صلہ میں کبھی کبھی تم میں سے کسی کا شکار کر لیا کروں گا اس ذرا سی تکلیف سے تم اپنے ملک کے تحفظ کے بار سے سبکدوش ہوجاؤ گے۔ تمھیں انصاف کرو۔ میرا یہ مطالبہ انصاف سے بعید تو نہیں ہے کیونکہ گو میں آسمانی وجود ہوں پر مجھے بقائے حیات کے لیے خوراک کی ضرورت ہے۔

(۳)

لیکن تھوڑے ہی دنوں میں جیک کو ایک نئی فکر پیدا ہوئی۔ اس خطّہ میں کوئی میرا رقیب نہ آجائے، وہاں کے باشندوں سے اسے مدد کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ملک داری کا سارا بار اپنے ہی قوتِ بازو پر تھا۔ اس کے لیل و نہار اب تشویش میں گزرنے لگے۔ جوں جوں دن گزرتے تھے۔ اس کا احتمال ضرور بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دو پتّے کے کھڑکنے پر چونک پڑتا اور اپنی صدائے مہیب سے سارے خطّے میں تلاطم برپا کردیتا۔ لقمۂ لطیف اور خواب شیریں کا مزہ جاتا رہا۔ کبھی کبھی مایوسی کے عالم میں جانوروں سے کہتا خدا کا شکر کرو کہ تم میرے منقاد ہو۔ ورنہ کسی دوسرے خونخوار فرمانروا کے مطیع ہوتے تو تمھاری زندگی

وبال ہو جاتی۔ میں تمھارا بہی خواہ ہوں۔ ہمیشہ تمھاری بہبود اور فلاح کی فکر میں سرگرم رہتا ہوں۔ کسی دوسرے علاقے کے جانور تمھاری حالت پر رشک کرتے۔ وادی کے جانور یہ سُن کر کہتے ہم جب تک زندہ رہیں گے۔ آپ کی اطاعت سے کبھی منحرف نہ ہوں گے۔

بالآخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ جیک کو ایک لمحہ کے لیے سکون نصیب نہ ہوتا۔ وہ ساری رات ندی کے کنارے اس حد سے اس حد تک چکّر لگایا کرتا دوڑتے دوڑتے بے دم ہو جاتا۔ ہانپنے لگتا۔ مگر آرام لینے کی مہلت کہاں۔ اندیشہ ضرر بھوت کی طرح سر پر سوار رہتا تھا۔

مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ اضطراب اور انتشار اس کے نفس پر عنان کے بدلے مہمیز کا کام کرتا تھا۔ وہ اپنے ہم چشموں کو اپنے جاہ و حشم سے مرعوب کرنا چاہتا تھا چنانچہ جب کنوار کا مہینہ آیا تو شاہانِ سلف کی روش قدیم کے مطابق اس نے کوچہ عشق کو ہنگامۂ کارزار بنانے کا فیصلہ کیا شام کا وقت تھا وہ اپنے کس بل پر غرور سے اکڑتا ہوا دریا کے پار اُترا اور ایک حسینہ پر ڈورے ڈالنے لگا۔ مئے الفت سے سرشار ہو کر اپنے کو ایک لمحہ کے لیے بھول گیا اور اس حسینہ کے نقشِ قدم کو بوسے دیتا ہوا خود مصلحت سے آگے بڑھ گیا رات ہو گئی اور حسینہ اس کی طرف مخاطب نہ ہوئی۔ اس کی ترغیب اور تخویف ایک بھی کارگر نہ ہوئی۔

حسینہ اس کی دلآوری اور مردانگی کو کسوٹی پر کسے بغیر اسے مُنہ نہ لگانا چاہتی تھی۔ اس کے قد و قامت تن و توش پر اسے اعتبار نہ تھا۔ اسی ارادہ سے وہ اسے کوچوں اور گلیوں کی خاک چھنواتی بالآخر ایک قصاب کی دُکان پر پہنچی جہاں شب و روز حرص و حسد عشق و محبت کے معرکے ہوتے رہتے تھے۔ وہ اس علاقہ کے فرمانرواؤں کا جولانگاہ تھا اور روز پانچ نشۂ خودی کے متوالے ہر دم غِلّ و غش اینڈتے رہتے تھے۔ یہ جمگھٹ دیکھ کر ایک بار تقاضائے فطرت سے جیک کے پیروں میں لغزش آئی مگر اپنے شان و شکوہ اختیار و اقتدار کی یاد آتے ہی وہ سنبھل گیا۔ اس کے دل نے کہا میں ان استخواں ریزوں کے مقابلے میں قدم پیچھے ہٹا لوں! میں جو وادیٔ امن کا فرمانروا ہوں۔ سورماؤں نے بھی اس کا کس بل دیکھا۔ تھرا اُٹھے۔ وہ یکہ و تنہا ایک گروہ پر بھاری تھا۔ شیر کا سا سینہ چیتے کی سی آتشیں آنکھیں گینڈے کا سا گٹھا ہوا جسم کسی کی ہمت نہ پڑی کہ تنہا پیش قدمی کرسکے۔ مگر غیرت

بھی گوارا نہ کرتی تھی کہ ایک بیگانہ وجود اِتراتا ہوا ہمارے علاقہ میں گھس آئے اور یوں ہماری بے حرمتی کرکے زندہ و سلامت واپس جائے۔ سبھوں نے ایک دوسرے کی طرف نگاہِ تحریک سے دیکھا۔ اُٹھ بیٹھے غیظ و غضب کے چند الفاظ زبان سے نکالے اور تب یکبارگی جیک سے اُلجھ گئے۔ حسینہ نے بھی آئینِ محبت اور وفا کی پروا نہ کرکے حریفوں کا ساتھ دیا۔ جیک نے دل کو بہت مضبوط کیا مگر اس کا مُنہ خود بخود سکڑ گیا۔ دانت باہر نکل آئے اور دُم نیچے جھک گئی۔ وہ ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوگیا اور مدافعت کرنے لگا۔ ایک بار زور سے ڈپٹ کر اُن پر حملہ کرتا تو ساری جمعیت دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ غرض جیک نے اس معرکہ میں مردانگی کی خوب داد دی۔ اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر دیکھیں تو حسینہ کو اسے کم ہمت سمجھنے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ مگر جب شمع سوزاں پر صدہا پروانے گر پڑیں تو شمع کیوں کر روشن رہ سکتی ہے۔ جیک تنہا اتحادیوں کا مقابلہ نہ کرسکا۔ مگر وہاں سفید جھنڈی کی قدر کرنے والے رقیب نہ تھے۔ اُنھوں نے جیک پر اتنے وار کیے کہ محض اس کی سخت جانی اس کی ضامن ہوئی سارا جسم زخموں سے چھلنی ہوگیا جب بھی اس نے حریفوں کی آتشِ قہر کو فرو ہوتے نہ دیکھا تو توکل بخدا راہِ فرار اختیار کی اور پھر اسی ندی میں کود کر اپنی جان بچائی۔ پانی میں تیرتا تھا اور اپنی جسارت اور ہوس پر کفِ افسوس ملتا تھا۔ ہاں رہ رہ کر پیچھے کی طرف تاکتا جاتا تھا کہ کہیں دشمن تعاقب نہ کرتا آتا ہو۔

اس دن سے جیک کو اپنی قوت پر جو غرّہ تھا وہ غائب ہوگیا اسے معلوم ہوا کہ میں باوجود اس حشمت و ثروت کے بازاری غول کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ احتمال ضرر حد سے بڑھ گیا خواب و خور حرام ہوگیا۔ ہفتوں گزر جاتے اور طبیعت غذا کی جانب مائل نہ ہوتی۔ کبھی سوچتا انھیں جانوروں کو لڑنا سکھاؤں۔ مگر پھر خوف ہوتا کہیں یہ سب میری ہی تباہی پر آمادہ نہ ہوجائیں۔ اس نے ان سے مدد لینے کے مقابلے میں باہر کے دشمنوں کا مقابلہ زیادہ آسان سمجھا۔ ایک روز اسے ایسا وہم ہوا کہ وادی کے سب جانور کسی رقیب سے خط و کتابت کر رہے ہیں، اس نے عالمِ غیظ میں کئی گیدڑوں اور خرگوشوں کو کاٹ کھایا۔ مگر وہم نہ دُور ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے کانوں میں حملہ آوروں کی یلغار کی آوازیں آنے لگیں وہ ندی کے کنارے آیا۔ اور اتنی دیر تک اور اتنے شور سے گرجا کہ اس کا گلا پھٹ گیا۔ شاید پھیپھڑے پر بھی کچھ صدمہ پہنچا۔ سارا دن چکر لگاتے گزر گیا۔ رات گزر گئی

پر یلغار کی صدا اس کے کانوں میں پیہم آتی رہی۔ دوسرے دن وادیٔ امن کے باشندے اس کے پاس گئے اور اس وہم کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ آپ مطلق پریشان نہ ہوں بجز حضور کے ادھر صدیوں سے کوئی غنیم آنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اب تو کوئی ادھر نگاہ بھی نہیں اُٹھاسکتا۔ کس کی مجال ہے جو حضور سے آمادۂ پُرخاش ہو اور پھر ایسا موقع آ بھی جائے تو ہم سب حضور کے قدموں پر نثار ہونے کو تیار ہیں مگر جیک کو ان باتوں سے تسکین نہ ہوئی۔ وہ لبِ دریا سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ہٹتا۔ اپنے دل میں خیال کیا۔ تمھارے نثار ہونے سے مجھے کیا فائدہ۔ میں کس کا شکار کروں گا۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ غریب بے خواب و خور، بے آب و دانہ مجسّم فکر و ابتلا ندی کے کنارے گوئے چوگاں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑتا رہا۔ پیر لڑکھڑانے لگے۔ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ آنتیں سکڑ گئیں۔ اعضا مفلوج سے ہوگئے۔ آٹھویں دن وہ نامراد کشتہ ہوس فکر مند دل لیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ وادیٔ امن کے باشندے اس کی میت پر جمع ہوگئے۔ مگر رونے کے لیے نہیں۔ قیدِ اطاعت سے آزاد ہونے پر خوشی منانے کے لیے۔

یہ افسانہ پہلی بار 'مادھوری' کے اگست 1922 میں 'ادھیکار جنتا' کے عنوان سے شائع ہوا، ہندی میں 'مان سروور'6 اور اردو میں 'خاک پروانہ' میں شامل ہے۔

گپت دھن

بابو ہری داس کا اینٹوں کا پژاوا شہر سے ملا ہوا تھا۔ آس پاس کے دیہاتوں سے سینکڑوں استری پُرش لڑکے نتیہ (روز) آتے اور پژاوے سے اینٹیں سر پر اُٹھا کر اوپر قطاروں سے سجاتے۔ ایک آدمی پژاوے کے پاس ایک ٹوکری میں کوڑیاں لیے بیٹھا رہتا تھا۔ مزدوروں کو اینٹوں کی سنکھیا (تعداد) کے حساب میں کوڑیاں بانٹتا۔ اینٹیں جتنی ہی زیادہ ہوتیں اتنی ہی زیادہ کوڑیاں ملتیں۔ اس لوبھ سے بہت سے مزدور بوُتے کے باہر کام کرتے۔ وِردھوں(بوڑھوں) اور بالکوں کو اینٹوں کے بوجھ سے اکڑے ہوئے دیکھنا بہت کرونزاجنک (ترسناک) دِرشیہ تھا۔ کبھی کبھی بابو ہری داس سویم (خود) آکر کوڑی والے کے پاس بیٹھ جاتے اور اینٹ لادنے کو پروتساہت (حوصلہ افزائی) کرتے۔ یہ دِرشیہ تب اور بھی دارُون (خوف ناک) ہوجاتا تھا جب اینٹوں کی کوئی اسادھارن. (غیر معمولی) آوشکیتا (ضرورت) آپڑتی۔ اسی میں مجوری دونی کر دی جاتی اور مجور لوگ اپنی سامرتھ سے دونی اینٹیں لے کر چلتے۔ ایک ایک پگ اُٹھانا کٹھن ہوجاتا۔ انھیں سر سے پیر تک پسینے میں ڈوبے پژاوے کی راکھ چڑھائے اینٹوں کا ایک پہاڑ سر پر رکھے بوجھ سے دبے دیکھ کر ایسا جان پڑتا تھا مانو لوبھ کا بھوت انھیں زمین پر پٹک کر ان کے سر پر سوار ہوگیا ہے۔ سب سے کرُون دَشا (ترسناک حالت) ایک چھوٹے لڑکے کی تھی جو سدَیو اپنی اوستھا (عمر) کے لڑکوں سے دُگنی اینٹ اُٹھاتا اور سارے دن اوشیرانت (مسلسل) پریشرم (محنت) اور دھیریہ (حوصلے) کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہتا۔ اس کے مکھ پر ایسی دینتا (غربت) چھائی رہتی تھی، اس کا شریر، اتنا کرش (دبلا پتلا) اور دُربل (کمزور) تھا کہ اسے دیکھ کر دَیا آجاتی تھی۔ اور لڑکے بنیے کی دُکان سے گڑ لاکر کھاتے، کوئی سڑک پر جانے والے اکّوں اور ہوا گاڑیوں کی بہار دیکھتا اور کوئی ویکتیگت سنگرام (آپسی لڑائی) میں اپنی جیبھ (زبان) اور باہو کے جوہر دکھاتا، لیکن اس غریب لڑکے کو اپنے کام سے کام تھا۔ اس میں لڑکپن کی نہ چپلتا تھی نہ شرارت، نہ کھلاڑی پن، یہاں تک کہ اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی بھی نہ آتی تھی۔ بابو ہری داس کو اس

کی دَشا (حالت) پر دَیا آتی۔ کبھی کبھی کوڑی والے کو اشارا کرتے کہ اسے حساب سے اَدِھک کوڑیاں دے دو۔ کبھی کبھی وہ اسے کچھ کھانے کو دے دیتے۔

ایک دن انھوں نے اس لڑکے کو بلاکر اپنے پاس بٹھایا اور اس کے سماچار (حال چال) پوچھنے لگے۔ گیات ہوا کہ اس کا گھر پاس ہی کے گاؤں میں ہے۔ گھر میں ایک وِردھا (بوڑھی) ماتا کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور وہ وِردھا بھی کسی پرانے روگ سے گرَست رہتی ہے۔ گھر کا سارا بھار اسی لڑکے کے سر تھا۔ کوئی اسے روٹیاں بنا کر دینے والا بھی نہ تھا۔ شام کو جاتا تو اپنے ہاتھوں سے روٹیاں بناتا اور اپنی ماں کو کھلاتا تھا۔ جاتی (ذات) کا ٹھاکر تھا۔ کسی سمئے اس کا کُل (خاندان) دھن دھانیہ سمپنّ (دھن دولت سے بھرا تلا) تھا۔ لین دین ہوتا تھا اور شکر کا کارخانہ چلتا تھا۔ کچھ زمین بھی تھی کنتو (لیکن) بھائیوں کی اَسپردھا (ہم سری) اور وِدّویش (حسد) نے اسے اتنی ہین اوستھا (بری حالت) کو پہنچا دیا کہ اب روٹیوں کے لالے تھے۔ لڑکے کا نام مگن سنگھ تھا۔

ہری داس نے پوچھا۔ گاؤں والے تمھاری کچھ مدد نہیں کرتے؟

مگن۔ واہ، ان کا بس چلے تو مجھے مار ڈالیں۔ سب سمجھتے ہیں کہ میرے گھر میں روپے گڑے ہیں۔

ہری داس نے اتسکتا (بے چینی) سے پوچھا۔ پُرانا گھرانا ہے، کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی۔ تمھاری ماں نے اس ویشے (سلسلے) میں تم سے کچھ نہیں کہا؟

مگن۔ بابو جی نہیں، ایک پیسہ بھی نہیں۔ روپے ہوتے تو اماں اتنی تکلیف کیوں اُٹھاتیں۔

(۲)

بابو ہری داس مگن سنگھ سے اتنے پرسنّ (خوش) ہوئے کہ مجوروں کی شرینی (درجے) سے اُٹھا کر اپنے نوکروں میں رکھ لیا۔ اسے کوڑیاں بانٹنے کا کام دیا اور پزاوے میں منشی جی کو تاکید کردی کہ اسے کچھ پڑھنا لکھنا سکھائیے۔ اناتھ کے بھاگیہ جاگ اُٹھے۔

مگن سنگھ بڑا کرتویہ شیل (فرض شناس) اور چتر لڑکا تھا۔ اسے کبھی دیر نہ ہوتی، کبھی ناغہ نہ ہوتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے بابو صاحب کا وِشواس (اعتماد) پراپت کر لیا۔ لکھنے پڑھنے میں کُشل (ماہر) ہوگیا۔

برسات کے دن تھے۔ پزاوے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کاروبار بند تھا۔ مگن سنگھ تین

دنوں سے غیر حاضر تھا۔ ہری داس کو چنتا ہوئی کیا بات ہے، کہیں بیمار تو نہیں ہوگیا، کوئی دُرگھٹنا تو نہیں ہوگئی؟ کئی آدمیوں سے پونچھ تاچھ کی، پر کچھ پتہ نہ چلا! چوتھے دن پوچھتے پوچھتے مگن سنگھ کے گھر پہنچے۔ گھر کیا تھا پُرانی سمر دھی (شان) کا دُھونس اَوشیش ماتر (باقی ماندہ کھنڈر کی طرح) تھا۔ ان کی آواز سنتے ہی مگن سنگھ باہر نکل آیا۔ ہری داس نے پوچھا۔ کئی دن سے آئے کیوں نہیں، ماتا کا کیا حال ہے؟

مگن سنگھ نے اَورُودھ کنٹھ (رودھی ہوئی آواز) سے اُتر دیا۔ اماں آج کل بہت بیمار ہے، کہتی ہے کہ اب نہ بچوں گی۔ کئی بار آپ کو بلانے کے لیے مجھ سے کہہ چکی ہے، پر میں سنکوچ (جھجھک) کے مارے آپ کے پاس نہ آتا تھا۔ اب آپ سوبھاگیہ (قسمت) سے آگئے ہیں۔ تو ذرا چل کر اسے دیکھ لیجیے۔ اس کی لالسا (تمنا) بھی پوری ہوجائے۔

ہری داس بھیتر گئے۔ سارا گھر بھوتک نِسسارتا کا پریچایک (طبعی محرومیوں کا مظہر) تھا۔ سُرخی کنکڑ اینٹوں کے ڈھیر چاروں اُور پڑے تھے۔ وناش (تباہی) کا پرتیکش سَوروپ (واضح نمونہ) تھا۔ کیول دو کوٹھریاں گزر کرنے لائق تھیں۔ مگن سنگھ نے ایک کوٹھری کی اُور انھیں اشارے سے بتایا۔ ہری داس بھیتر گئے تو دیکھا کہ وردھا (بوڑھی) ایک سڑے ہوئے کاٹھ کے ٹکڑے پر پڑی کراہ رہی ہے۔

ان کی آہٹ پاتے ہی آنکھیں کھولیں اور انومان (قیاس) سے پہچان گئی، بولی۔ آپ آگئے، بڑی دَیا کی۔ آپ کے درشنوں (دیدار) کی بڑی ابھیلاشا (تمنا) تھی۔ میرے اناتھ بالک کے ناتھ (سرپرست) اب آپ ہی ہیں۔ جیسے آپ نے اب تک اس کی رَکشا (حفاظت) کی ہے وہ نگاہ اس پر سدَیو بنائے رکھیے گا۔ میری وِپتی (مصیبت) کے دن پورے ہوگئے۔ اس مٹی کو پار لگا دیجیے گا۔ ایک دن گھر میں لکشمی کا واس (قیام) تھا۔ ادِن (برے دن) آئے تو انھوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ پُرکھوں نے اسی دن کے لیے کچھ تھاتی (امانت) دھرتی ماتا کو سونپ دی تھی۔ اس کا بیجک بڑے یتن (کوشش) سے رکھا تھا، پر بہت دنوں سے اس کا کہیں پتہ نہ لگتا تھا۔ مگن کے پتا نے بہت کھوجا پر نہ پاسکے۔ نہیں تو ہماری دَشا اتنی ہین (بری) نہ ہوتی۔ آج تین دن ہوئے مجھے وہ بیجک آپ ہی آپ ردّی کاغذوں میں مل گیا۔ تب سے اسے چھپا کر رکھے ہوئے ہوں، مگن باہر ہے؟ میرے سرہانے جو صندوق رکھی ہے، اسی میں وہ بیجک ہے۔ اس میں سب باتیں لکھی ہیں۔ اسی سے ٹھکانے

کا بھی پتہ چلے گا۔ اَوسر (موقع) ملے تو اسے کھدوا ڈالیے گا۔ مگن کو دے دیجیے گا۔ یہی کہنے کے لیے آپ کو بار بار بلواتی تھی۔ آپ کے سوا مجھے کسی پر وشواس نہ تھا۔ سنسار سے دھرم اُٹھ گیا۔ کس کی نیت پر بھروسا کیا جائے۔

(۳)

ہری داس نے بیجک کا سماچار کسی سے نہ کہا۔ نیت بگڑ گئی۔ دودھ میں مکھی پڑ گئی۔ بیجک سے گیات ہوا کہ دھن اس گھر سے ۵۰۰ ڈگ پشچم کی اُور ایک مندر کے چبوترے کے نیچے ہے۔

ہری داس دھن کو بھوگنا چاہتے تھے، پر اس طرح کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ کام کشٹ سادھیہ (مشکل ترین) تھا۔ نام پر دھبہ لگنے کی پربل آشنکا (بہت گمان) تھی جو سنسار میں سب سے بڑی پیڑا (تکلیف) ہے۔ کتنی گھور بیچتا تھی۔ جس اناتھ کی رکشا کی، جسے بچّے کی بھانتی پالا، اس کے ساتھ وشواس گھات (بدعہدی)۔ کئی دنوں تک آتم ویدنا کا پیڑا (ضمیر کے کچوکے) سہتے رہے۔ انت میں کُوبترکوں (غلط دلیلوں) نے وِویک (عقل) کو پراست کردیا۔ میں نے کبھی دھرم کا پریتیاگ (ترک) نہیں کیا اور نہ کبھی کروں گا۔ کیا کوئی ایسا پرانی (جاندار) بھی ہے جو جیون میں ایک بار بھی وِچلت (ڈانوا ڈول) نہ ہوا ہو۔ یدی (اگر) ہے تو وہ مُنشیہ نہیں، دیوتا ہے۔ میں منشے ہوں۔ مجھے دیوتاؤں کی پنکتی (لائن) میں بیٹھنے کا دعوا نہیں ہے۔

من کو سمجھانا بچّے کو پھسلانا ہے۔ ہری داس سانجھ کو سیر کرنے کے لیے گھر سے نکل جاتے۔ جب چاروں اُور سناٹا چھا جاتا تو مندر کے چبوترے پر آبیٹھتے اور ایک کدالی سے اسے کھودتے۔ دن میں دو ایک بار ادھر ادھر تانک جھانک کرتے کہ کوئی چبوترے کے پاس کھڑا تو نہیں ہے۔ رات کو نِستبدھتا (سناٹا) میں انھیں اکیلے بیٹھے اینٹوں کو ہٹاتے ہوئے اتنا ہی بھے (خوف) ہوتا تھا جتنا کسی بھرشٹ ویشنو کو آمیش بھوجن سے ہوتا ہے۔

چبوترا لمبا چوڑا تھا۔ اسے کھودتے ایک مہینہ لگ گیا اور ابھی آدھی منزل بھی طے نہ ہوئی۔ ان دنوں ان کی دَشا (حالت) اس پُروش کی سی تھی جو کوئی منتر جگا رہا ہو۔ چت (دل) پر چنچلتا چھائی رہتی۔ آنکھوں کی جیوتی (روشنی) تبر (تیز) ہوگئی تھی۔ بہت گم سم رہتے، مانو دھیان میں ہوں۔ کسی سے بات چیت نہ کرتے، اگر کوئی چھیڑ کر بات کرتا تو

جھنجھلا پڑتے۔ پڑاوے کی اُور بہت کم جاتے۔ وِچار شیل (فکر کرنے والے) پُرش تھے۔ آتما بار بار اس کُٹل ویاپار (بُرے کام) سے بھاگتی، نشچے (فیصلہ) کرتے کہ اب چبوترے کی اُور نہ جاؤں گا، پر سندھیا (شام) ہوتے ہی ان پر ایک نشہ سا چھا جاتا، بدھی (دانش) ۔وویک (عقل) کا اپہرن (اغوا) ہوجاتا۔ جیسے کتا مار کھا کر تھوڑی دیر کے بعد ٹکڑے کی لالچ میں جا بیٹھتا ہے، وہی دَشا ان کی تھی۔ یہاں تک کہ دوسرا ماس بھی وِیتیت ہوا۔

اماوس کی رات تھی۔ ہری داس ملِن ہردئے (سیاہ دل) میں بیٹھی ہوئی کالیما (سیاہی) کی بھانتی چبوترے پر بیٹھے ہوئے تھے آج چبوترا کُھد جائے گا۔ ذرا دیر تک اور محنت کرنی پڑے گی۔ کوئی چِنتا نہیں۔ گھر میں لوگ چِنتِت ہو رہے ہوں گے۔ پر ابھی نشچت (فیصلہ) ہوا جاتا ہے کہ چبوترے کے نیچے کیا ہے۔ پتھر کا تہ خانہ نکل آیا تو سمجھ جاؤں گا کہ دھن اوشے ہوگا۔ تہ خانہ نہ ملے تو معلوم ہوجائے گا کہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے کہیں سچ مچ تہ خانہ نہ ملے تو بڑی دل لگی ہو۔ مفت میں الّو بنوں۔ پر نہیں، کدالی کھٹ کھٹ بول رہی ہے۔ ہاں پتھر کی چٹان ہے۔ انھوں نے ٹٹول کر دیکھا۔ بھرم دور ہوگیا۔ چٹان تھی۔ تہ خانہ مل گیا۔ لیکن ہری داس خوشی سے اُچھلے کودے نہیں۔

آج وہ لوٹے تو سر میں درد تھا۔ سمجھے تھکان ہے۔ لیکن یہ تھکان نیند سے نہ گئی۔ رات کو ہی انھیں زور سے بخار ہوگیا۔ تین دن تک جُور میں پڑے رہے۔ کسی دوا سے فائدہ نہ ہوا۔

اس رُگن اوستھا (بیماری کی حالت) میں ہری داس کو باربار بھرم (وہم) ہوتا تھا۔ کہیں یہ میری ترشنا (ہوس) کا دنڈ (سزا) تو نہیں ہے۔ جی میں آتا تھا، مگن سنگھ کو بیجک دے دوں اور چھما یاچنا کروں، پر بھانڈا پھوڑ ہونے کا بھے منہ بند کردیتا تھا۔ نہ جانے عیسیٰ کے انویائی (ماننے والے) اپنے پادریوں کے سمّکھ (سامنے) کیسے اپنے جیون کے پاپوں (گناہوں) کی کتھا سنایا کرتے تھے۔

(۴)

ہری داس کی مرتیو (موت) کے پیچھے یہ بیجک ان کے پُتر پربھو داس کے ہاتھ لگا۔ بیجک مگن سنگھ کے پرکھوں کا لکھا ہوا تھا۔ اس میں لیش ماتر (رتی بھر) بھی سندیہہ (شک) نہ تھا۔ لیکن انھوں نے سوچا۔ پتا جی نے کچھ سوچ کر ہی اس مارگ پر پگ (راستے پر قدم)

رکھا ہوگا۔ وے کتنے نیتی پراڑ (اصول پسند)، کتنے ستیہ وادی پُرش (صداقت پسند انسان) تھے۔ ان کی نیت پر کبھی کسی کو سندیہہ نہیں ہوا۔ جب انھوں نے اس آچار (روپے) کو گھرنت (نفرت کے قابل) نہیں سمجھا تو میری کیا گنتی ہے۔ کہیں یہ دھن ہاتھ آجائے تو کتنے سکھ سے جیون ویتیت (گزرے) ہو۔ شہر کے رئیسوں کو دکھا دوں کہ دھن کا سدُپیوگ (صحیح استعمال) کیوں کر ہونا چاہیے۔ بڑے بڑوں کا سر نیچا کردوں۔ کوئی آنکھیں نہ ملا سکے۔ ارادہ پکّا ہوگیا۔

شام ہوتے ہی وے گھر سے نکلے۔ وہی سمے تھا، وہی چوکنی آنکھیں تھیں اور وہی تیز کدالی تھی۔ ایسا گیات ہوتا تھا مانو ہری داس کی آتما (روح) اس نئے بھیس میں اپنا کام کر رہی ہے۔

چبوترے کا دھراتل پہلے ہی کُھد چکا تھا۔ اب سنگین تہ خانہ تھا، جوڑوں کو ہٹانا کٹھن تھا۔ پُرانے زمانے کا پکّا مسالہ تھا، کلہاڑی اچٹ اچٹ کر لوٹ آتی تھی۔ کئی دنوں میں اوپر کی درازیں کھلیں، لیکن چٹانیں ذرا بھی نہ ہلیں۔ وہ لوہے کی چھڑ سے کام لینے لگے، لیکن کئی دنوں تک زور لگانے پر بھی چٹانیں نہ کھسکیں۔ سب کچھ اپنے ہی ہاتھوں کرنا تھا۔ کسی سے سہایتا (مدد) نہ مل سکتی تھی۔ یہاں تک کہ پھر وہی اماوسیا کی رات آئی! پربھوداس کو زور لگاتے بارہ بج گئے اور چٹانیں بھاگیہ ریکھاؤں (قسمت کی لکیروں) کی بھانتی اٹل تھیں۔

پر، آج اس سمسیا (مسئلے) کو حل کرنا آوشیک تھا۔ کہیں تہ خانے پر کسی کی نگاہ پڑجائے تو میرے من کی لالسا (خواہش) من ہی میں رہ جائے۔

وہ چٹان پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ کیا کروں، بدّھی کچھ کام نہیں کرتی، سہسا (دفعتاً) انھیں ایک یُکتی (تدبیر) سوجھی، کیوں نا بارود سے کام لوں؟ اتنے ادھیر (بے چین) ہو رہے تھے کہ کل پر اس کام کو نہ چھوڑسکے۔ سیدھے بازار کی طرف چلے، دو میل تک کا راستہ ہوا کی طرح طے کیا۔ پر وہاں پہنچے تو دُکانیں بند ہوچکی تھیں۔ آتش باز حیلے کرنے لگے۔ بارود اس سمئے نہیں مل سکتی۔ سرکاری حکم نہیں ہے۔ تم کون ہو؟ اس وقت بارود لے کر کیاکروگے؟نابھیا! کوئی واردات ہوجائے تو مفت میں بندھا بندھا پھِروں، تمھیں کون پوچھے گا؟

پربھوداس کی شانتورتی (سنجیدگی) کبھی اتنی کٹھن پریکشا (امتحان) میں نہ پڑی تھی۔ وے انت تک انونئے ونئے (دعا و التجا) ہی کرتے رہے، یہاں تک کہ مُدراؤں (روپیوں) کی

سریلی جھنکار سے اسے وشی بھوت (فریفتہ) کرلیا۔ پربھو داس یہاں سے چلے تو دھرتی پر پاؤں نہ پڑتے تھے۔

رات کے دو بجے تھے۔ پربھو داس مندر کے پاس پہنچے۔ چٹانوں کی دارجوں میں بارود رکھ فلیتہ لگا دیا اور دور بھاگے۔ ایک چھن میں بڑے زور کا دھماکا ہوا۔ چٹان اُڑ گئی۔ اندھیرا غار سامنے تھا، مانو کوئی پشاچ (شیطان) انھیں نگل جانے کے لیے منہ کھولے ہوئے ہے۔

(۵)

پربھات (صبح) کا سمئے تھا۔ پربھوداس اپنے کمرے میں لیٹے تھے۔ سامنے لوہے کی صندوق میں دس ہزار پُرانی مہریں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کی ماتا سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھیں۔ پربھو داس جور کی جوالہ (آگ) سے جل رہے تھے۔ کروٹیں بدلتے تھے، کراہتے تھے، ہاتھ پاؤں پٹکتے تھے، پر آنکھیں لوہے کے صندوق کی اُور لگی ہوئی تھیں۔ اسی میں ان کے جیون کی آشائیں (امیدیں) بند تھیں۔

مگن سنگھ اب پڑاوے کا منشی تھا۔ اسی گھر میں رہتا تھا۔ آکر بولا۔ پڑاوے چلیے گا؟ گاڑی تیار کراؤں؟

پربھوداس نے اس کے مکھ کی اُور چھما یاچنا کی دِرشٹی (نظر) سے دیکھا اور بولے۔ نہیں، میں آج نہ چلوں گا، طبیعت اچھی نہیں ہے۔ تم بھی مت جاؤ۔ مگن سنگھ ان کی دَشا دیکھ کر ڈاکٹر کو بلانے چلا۔

دس بجتے بجتے پربھوداس کا مکھ (چہرہ) پیلا پڑگیا۔ آنکھیں لال ہوگئیں۔ ماتا نے ان کی اُور دیکھا تو شوک سے وِیوہل (بے قابو) ہوگئیں۔ بابو ہری داس کی انتم دَشا اس کی آنکھوں میں بھر گئی۔ جان پڑتا تھا یہ اسی شوک گھٹنا کی پُنرا ورتی (باز آوری) ہے! یہ دیوتاؤں کی منتیں منا رہی تھیں، کنتو پربھوداس کی آنکھیں اسی لوہے کے صندوق کی اُور لگی ہوئی تھیں، جس پر انھوں نے اپنی آتما ارپن (روح نچھاور) کردی تھی۔

ان کی استری آکر ان کے پیتانے بیٹھ گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔ پربھوداس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے، پر وے آنکھیں اسی لوہے کی صندوق کی اُور نراشا پورن بھاو (ناامیدی کے احساس) سے دیکھ رہی تھیں۔

ڈاکٹر نے آکر دیکھا، دوا دی اور چلا گیا، پر دوا کا اثر الٹا ہوا۔ پربھو داس کے ہاتھ

پاؤں سرد ہوگئے، مکھ نستیج ہوگیا، ہردے کی گتی (رفتار) مند پڑگئی، پر آنکھیں صندوق کی اور سے نہ ہٹیں۔

محلے کے لوگ جمع ہوگئے۔ پتا اور پُتر کے سوبھاو (عادت و اطوار) اور چرِتر (کردار) پر ٹپنّیاں (تبصرہ) ہونے لگیں۔ دونوں شیل اور ونے (عاجزی و انکساری) کے پتلے تھے۔ کسی کو بھول کر بھی کڑی بات نہ کہی۔ پربھوداس کا سمپورن شریر (پورا جسم) ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ پران (جان) تھا تو کیول (صرف) آنکھوں میں۔ وے اب بھی اسی لوہے کے صندوق کی اُور سترشنژ بھاو (تشنگی کے احساس) سے دیکھ رہی تھیں۔

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ دونوں مہیلائیں پچھاڑیں کھا کھا کر گرتی تھیں۔ محلے کی استریاں انھیں سمجھاتی تھیں۔ انیہ مترگنڑ (دوسرے دوست احباب) آنکھوں پر رومال جمائے ہوئے تھے۔ جوانی کی موت سنسار کا سب سے گرون، سب سے اسوبھاوِک (غیر فطری) اور بھینکر درشیہ ہے۔ یہ وَجرگھات (سب سے زیادہ مہلک) ہے، ودھاتا (خدا) کی نردئے لیلا (قہر آلود ظہور) ہے۔ پربھوداس کا سارا شریر پران ہین (بے جان) ہوگیا تھا، پر آنکھیں جیوت (زندہ) تھیں۔ وے اب بھی اسی صندوق کی اُور لگی ہوئی تھیں۔ جیون کے ترشنا (پیاس) کا روپ دھارن کرلیا تھا۔ سانس نکلتی ہے، پر آس نہیں نکلتی۔

اتنے میں مگن سنگھ آکر کھڑا ہوگیا۔ پربھوداس کی نگاہ اس پر پڑی۔ ایسا جان پڑا مانوں ان کے شریر میں پھر رکت (خون) کا سنچار (بہاؤ) ہوا۔ انگوں میں اسفورتی (ہلچل) کے چِنھ (علامات) دکھائی دیے۔ اشارے سے اپنے منہ کے نکٹ بلایا، اس کے کان میں کچھ کہا، ایک بار لوہے کے صندوق کی اُور اشارہ کیا اور آنکھیں اُلٹ گئیں۔ پران نکل گئے۔

یہ افسانہ ہندی میں گپت دھن کے عنوان سے 'شری شاردا' کے اگست 1922 کے شمارے میں شائع ہوا مان سرودور نمبر8 میں شامل ہے۔ اردو میں ادب لطیف سالنامہ 1939 میں دفینہ کے عنوان سے شائع ہوا۔ یہاں گپت دھن کو اردو رسم خط میں شائع کیا جا رہا ہے۔

حُسنِ ظن

بیچو دھوبی کو اپنے گھر اور گاؤں سے اتنی ہی الفت تھی جتنی ہر انسان کو ہوتی ہے۔ اُسے روکھی اور آدھے پیٹ کھا کر بھی اپنا وطن ساری دنیا سے پیارا تھا۔ اپنے گاؤں کے درخت اور میدان، تال اور تلیّے۔ اوسر اور کھیت، مندر اور کنوئیں۔ سبھی اس کے لیے زندہ جاندار ہستیاں تھیں۔ سبھی سے ایک تعلقِ خاطر تھا۔ کسی درخت کو پھلتے پھولتے دیکھ کر، تال تلیوں کو پانی سے لہراتے دیکھ کر، کھیتوں کو ہریالی سے آراستہ دیکھ کر، اُسے وہی مسرت ہوتی تھی جو ہمیں اپنے کسی عزیز کی فارغ البالی اور خوش حالی سے ہوتی ہے۔ اگر اُسے بوڑھی کسان عورتوں کی گالیاں اور جھڑکیاں کھانی پڑتی تھیں تو بہوئیں اُسے بیچو دادا کہہ کر بھی پکارتی تھیں۔ گھڑکیوں اور جھڑکیوں کو وہ ہنس کر ٹال دیتا تھا۔ خوشی اور غم کی ہر ایک چھوٹی بڑی تقریب میں اُس کا خیر مقدم ہوتا تھا۔ گاؤں والے اُس کی منّتیں کر کے لے جاتے تھے۔ بالخصوص شادیوں میں تو اُس کا وجود دولھے دولھن سے کم لازمی نہ تھا۔ بیوی گھر میں پُجتی تھی۔ دروازے پر بیچو کا نقارہ بجتا تھا۔ وہ پشواز پہنے کمر میں گھنٹیاں باندھے، سازندوں کو ساتھ لیے، ایک ہاتھ میں مردنگ اور دوسرا ہاتھ اپنے کان پر رکھ کر جب فی البدیہہ مدحیہ اور دعائیہ برہے گانے لگتا تو اُس وقت اُس کی آنکھوں میں غرور کا نشہ نظر آتا تھا۔ دہقانیوں کا مجمع حیرت آمیز نگاہوں سے اُس کے کمالوں کی داد دیتا جو تحسین کا معراج ہے۔ بیچو کے سمندِ فکر کو تازیانہ لگ جاتا۔ اُس کی بدیہہ گوئی اور بھی جولاں پذیر ہوجاتی۔ جب اس کا صلہ کسی ٹوٹے پھوٹے برتن۔ اُتارے کپڑے اور ایک چھبڑی اناج کی صورت میں ملتا۔ (پینے کے پیسے لازمی تھے) تو وہ نہال ہوجاتا۔ ہاں دھیلے پر کپڑے دھوکر، چبینا کھاکر، وہ اپنی حالت پر قانع تھا۔ اگر ان ہمنوائیوں میں کوئی بے سُر راگ تھا تو وہ زمیندار کے ملازموں کی آئے دن کی سختیاں اور بدسلوکیاں تھیں۔ گاؤں والوں کی جھڑکیوں اور گالیوں میں ایک اپناپا ہوتا تھا۔ اُن میں دلآزاری کا شائبہ بھی نہ ہوتا تھا۔ وہ کھٹ مٹھے بیروں کی طرح ترش بھی ہوتی تھیں اور شیریں بھی۔ ان ملازموں کی گالیوں اور سخت کلامیوں میں بے دردی،

بے حسی اور مغائرت کا پہلو غالب ہوتا تھا۔ یہی ایک سبب تھا جو کبھی کبھی بیچو کو گاؤں چھوڑ کر بھاگ جانے کی تحریک کرتا تھا۔ بعض اوقات تو وہ عاجز آکر ترکِ وطن کا مصمم ارادہ کر لیتا پر گاؤں کی محبت اور گاؤں والوں کے اصرار اس کے ارادے کو پورا نہ ہونے دیتے تھے۔ کارندہ صاحب کے علاوہ پانچ چھ چپراسی تھے۔ اُن کے حوالیوں اور طفیلیوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ بیچو کو اُن کے کپڑے مُفت میں دھونے پڑتے۔ اگر کچھ مزدوری ملتی تو گالیاں۔ اس کے پاس استری نہ تھی۔ گاؤں والوں کو استری کی ضرورت نہ تھی۔ مگر ان شرفا کے کپڑوں پر استری کرنی ضروری تھی۔ اس کے ۔لیے بیچو کو دوسرے دھوبیوں کی خوشامد کرنی پڑتی۔ کبھی کبھی شہر بھی جانا پڑتا۔ اگر کبھی مجبور ہوکر بلا استری کیے ہوئے اُن کے کپڑے لاتا تو اس کی شامت آجاتی تھی۔ گالیاں کھاتا، مار کھاتا۔ گھنٹوں دھوپ میں کھڑا رہنا پڑتا۔ یہ اذیتیں اس کے لیے نا قابلِ برداشت تھیں۔ خصوصاً اس لیے کہ اپنے گاؤں والوں کی نگاہ میں اس کی سُبکی ہوتی تھی۔ کسی دوسری جگہ شاید وہ اس سے بھی سخت برتاؤ برداشت کرلیتا۔ مگر اپنے ہی گاؤں میں جہاں اُس کا اتنا مان تھ یہ ذلت اور تحقیر نہ سہی جاتی تھی۔ اُس کی خود داری اس کی متحمل نہ ہوسکتی تھی۔

(۲)

جیٹھ کا مہینہ تھا۔ قرب و جوار کے تال تلیا سوکھ گئے تھے۔ اتنی شدت کی گرمی تھی کہ درخت سوکھتے جاتے تھے۔ بیچو کو پہر رات رہے دور کے ایک تال میں کپڑے دھونے جانا پڑتا۔ وہاں بھی پانی کم تھا۔ دھوبیوں کی باری بندھی ہوئی تھی۔ بیچو کی باری پانچویں دن پڑتی تھی۔ کئی گدھے لاد کر جاتا۔ مگر شدّت کی دھوپ اور آگ کی لپٹیں۔ نو بجے کے بعد کھڑا نہ رہا جاتا تھا۔ آدھی لادی بھی نہ ختم ہوسکتی۔ گاہکوں کو وعدے کرکے۔ کبھی اپنی معذوری جتا کے۔ خوش رکھتا تھا۔ مگر کارندہ صاحب مجبوریوں کے قائل نہ تھے۔ مزدوروں کو دھوپ، لُو، قُرب و بعد، کا کیا غم؟ انھیں تو خدا نے اسی لیے بنایا ہے۔ اُن کا ایک آدمی صبح و شام بیچو کے سر پر سوار ہوجاتا اور دس پانچ بے نقط سُنا کر چلا جاتا۔ بیچو منّت اور خوشامد کرکے ٹالتا رہتا۔ یہاں تک کہ ایک بار سات دن تک اُسے حیلے کرتے ہوگئے اور کپڑے تیار نہ ہوسکے۔ دُھل تو گئے تھے پر استری نہ ہوئی تھی۔ آخر مجبور ہوکر بیچو آٹھویں دن کپڑے لے کر چوپال پہنچا۔ کارندہ صاحب اُسے دیکھتے ہی غصہّ سے آگ ہوگئے۔ بولے۔

کیوں بے تجھے گاؤں میں رہنا ہے یا نہیں؟

بیچو نے کپڑوں کا بقچہ تخت پر رکھ دیا اور بولا "کیا کروں سرکار کہیں پانی تو ہے ہی نہیں۔"

کارندہ۔ "پانی تجھ میں نہیں ہے اور ساری دُنیا میں ہے۔ اب تیرا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ تجھے گاؤں سے نکال دوں۔ کم بخت دائی سے پیٹ چھپانے چلا ہے۔ کپڑے دوسروں کو بارات کرنے کے لیے دے دیتا ہے۔ اُس پر کہتا ہے کہیں پانی نہیں ہے۔"

بیچو۔ "ہجور گاؤں آپ کا ہے چاہے رہنے دیں یا نکال دیں۔ لیکن ماتھے پر یہ کلنک نہ لگائیں اتنی اُمر آپ ہی لوگوں کی کھدمت کرتے گجر گئی پر مجھ سے اور چاہے کتنی ہی بھول چوک ہوئی ہو کبھی نیت بد نہیں ہوئی۔ اگر کوئی کہہ دے کہ میں نے کبھی گاہکوں کے ساتھ ایسی دگا کی ہے تو اُس کی ٹانگ کی راہ نکل جاؤں۔"

ثروت کو صاف گوئی سے عناد ہے۔ کارندہ صاحب نے کچھ اور سخت سُست کہا۔ بیچو نے بھی کچھ اور قیل وقال کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریب کو ایک اٹھوارے تک ہلدی اور گڑ پینا پڑا، نویں دن اُس نے سب گاہکوں کے کپڑے جیسے تیسے دھو کر دیدیے۔ اپنا بوریا بدھنا سنبھالا اور ایک روز رات کو چپکے سے نکل کھڑا ہوا۔ اتنی ذلت کے بعد گاؤں میں رہنا مشکل تھا۔ گاہکوں سے بدا ہونا اُس کے امکان سے باہر تھا۔ وہ ان کی التجاؤں کو رد نہ کرسکتا تھا۔

(۳)

بیچو شہر میں آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ میرے لیے پہلے ہی سے جگہ خالی تھی۔ اُسے نہ دفتروں میں عرض و معروض کرنے کی زحمت اُٹھانی پڑی۔ نہ اخباروں میں اشتہار دینے کی۔ گاہک خود بخود آ پہنچے۔ ایک ہی مہینہ میں اُن کی تعداد اُس کی قوتِ شمار سے متجاوز ہوگئی۔ وہ دام کھرے کرلیتا تھا مگر وعدہ کا پکّا تھا۔ تقدیر چمک اُٹھی۔ خوش معاملگی نے دھاک بٹھا دی۔ کبھی کبھی اس کی روزانہ مزدوری دیہات کی سالانہ کمائی سے بڑھ جاتی تھی۔ وہ پہلے ناریل پیتا تھا۔ وہ ہی بزرگوں کی یادگار صالح تھا۔ اب ایک گُڑگُڑی لایا۔ برہنہ پاؤں میں جوتے پڑگئے۔ اور جو ہاضمہ مٹر اور کودوں ہضم کرسکتا تھا وہ اب چپاتیوں کا محتاج ہوگیا۔ پہلے کبھی کبھی تقریبوں میں شراب پی لیا کرتا تھا۔ اب روزانہ دور چلنے لگے۔ اس کے بغیر

کسل رفع نہ ہوتا تھا۔ بیوی کو بھی زیوروں کی چاٹ پڑی۔ سُنار کی دُکان کے چکّر لگانے لگی۔ لڑکے پہلے پیڑوں تلے جامن اور آم چُنتے پھرتے تھے درختوں پر چڑھ کر گولر اور رطبی کھاتے تھے۔ اب وہ خوانچوں کے عاشق ہوئے تھوڑے ہی دنوں میں مکان کا کرایہ بڑھا۔ کھلی اور بھوسا بھی گراں ہوگیا۔ مزدوری کا اضافہ عذابِ جان ہوگیا۔ لادی کے دونوں بیلوں کو کھلانے میں مزدوری کا ایک بڑا حصہ نکل جاتا روز کی کمائی روز اُڑ جاتی۔ بیوی کو پان کے لیے بھی پیسے نہ بچتے۔

کچھ دنوں تک یہی کیفیت رہی آخر جب بہت کوشش کرنے پر بھی دونوں مدوں میں اعتدال نہ قائم رہ سکا تو بیوی نے بیچو کی نظر بچا کر گاہکوں کو کپڑے پچھائی دینے شروع کیے۔ بیچو پر جب یہ حقیقت کھلی تو بگڑ کر بولا۔ ''اگر میں نے پھر یہ شکایت سُنی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا اسی الجام پر تو میں نے باپ دادوں کا مکان چھوڑ دیا۔ یہاں سے بھی نکلوانا چاہتی ہو کیا؟ بیوی نے غصہ جائز کے ساتھ کہا ''تمھیں تو دارو کے بنا ایک دن بھی نہیں رہا جاتا۔ میں کیا پیسے لے کر لُٹاتی ہوں جو گھر کا کھرچ پڑے وہ دیتے جاؤ تو میں کیوں جھمت سر پر لوں۔ ایک پان کھاتی ہوں آج سے وہ بھی چھوڑ دوں گی۔ پھر جو پان کھاتے دیکھنا جو چاہے کرنا۔''

مگر رفتہ رفتہ اخلاقی احساس نے ضروریات کے سامنے سر جُھکانا شروع کیا۔ ایک بار بیچو کو کئی دنوں تک بخار آیا پہلے تو تلسی کی پتیاں اور مرچ اور نیم کی چھال وغیرہ پیتا رہا۔ جب اس سے کوئی افاقہ نہ ہوا تو اُس کی بیوی ڈولی پر بٹھا کر اُسے حکیم کے یہاں لے گئی۔ حکیم صاحب نے نسخہ لکھ دیا گھر میں نسخہ بندھانے کے لیے پیسے نہ تھے۔ بیوی نے کہا کوئی عطار تو اپنا گاہک نہیں ہے نہیں تو اُس کے یہاں سے دوا لے آتی۔ دُھلائی میں دام کٹ جاتے۔

بیچو۔ ''کیا دو چار آنے پیسے بھی نہیں ہیں۔''

بیوی۔ ''پیسے ہوتے تو کس دن کے لیے رکھ چھوڑتی۔''

بیچو نے معذورانہ انداز سے کہا۔ ''دوا تو بنوانی ہی ہوگی۔''

بیوی۔ ''جو کہو وہ کروں۔ اکیلے جتنا کام ہوسکتا ہے کرتی ہوں مگر میرے تھامے گرہستی تھوڑے ہی تھم سکتی ہے۔ پہلے کچھ پیسے اوپر سے مل جاتے تھے۔ تم نے اُس کی

مناہی کردی۔ تو اب میرا کیا بس ہے۔ دو دن سے بیل بھوکے کھڑے ہیں۔ ایک روپیہ ہو تو ان کا پیٹ بھرے۔"

بیچو۔ "بھائی جو تیرے جی میں آئے کر۔ کسی طرح جان تو بچا۔ معلوم ہوتا ہے شہر میں اچھی نیت والے آدمی کا نباہ نہیں ہوسکتا۔

اُس دن سے بیچو نے بھی عام دھوبیوں کا وطیرہ اختیار کیا۔

(۴)

بیچو کے پڑوس میں ایک وکیل کے محرر منشی داتا رام رہتے تھے۔ بیچو کبھی کبھی فرصت کے وقت اُن کے پاس جا بیٹھتا۔ محرر صاحب کے کپڑے حقِ ہمسائگی میں دُھل جاتے تھے۔ اس لیے وہ بیچو کی خاطر کرتے۔ اپنی چلم اُتار کر اُسے پینے کو دے دیتے۔ گھر میں کوئی اچھی چیز بنتی تو بیچو کے بچوں کے لیے بھجوا دیتے۔ اور کبھی کبھی شیشہ و ساغر میں بھی اُسے شریک کر لیتے۔ ان دنوں شراب اتنی گراں نہ تھی۔ ہاں یہ خیال رکھتے تھے کہ ان مدارات کی قیمت دُھلائی کے پیسوں سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

گرمیوں کے دن تھے۔ خانہ آبادیوں کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ منشی داتا رام کو بھی ایک بارات میں شریک ہونا تھا۔ گڑگڑی کے لیے ایک پیچوان بنوایا۔ روغنی چلم لائے۔ سرپوش عاریتاً مل گیا۔ سلیم شاہی جوتے خریدے۔ اپنے وکیل صاحب کے یہاں سے قالین منگنی لائے۔ ایک دوست سے انگوٹھی اور سونے کے بٹن منگنی لیے۔ ان لوازم کے مہیا کرنے میں زیادہ تردد نہ ہوا۔ ایسی حالتوں میں عاریت مستحسن ہے۔ اگر یہ رواج عام نہ ہوتا تو سفید پوشوں کی آبرو کیوں کر قائم رہتی۔ کسی کا ان تکلفات سے آراستہ ہونا اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ چیزیں اپنی ہیں، کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس شخص میں ان لوازم کے مہیا کرنے کی مقدرت ہے۔ خیر۔ منشی جی نے ٹھاٹھ کے یہ سب سامان تو فراہم کر لیے۔ مگر کپڑے منگنی لینے میں شرم دامن گیر تھی۔ بارات کے قابل نئے کپڑے بنوانے کی گنجائش نہ تھی۔ ترکِ موالات نے وکیلوں کا بازار سرد کردیا تھا۔ تنزیب کے کُرتے۔ ریشمی اچکن۔ چھالٹی کے پاجامے بنوانے میں خاصی رقم لگتی تھی۔ اور ریشمی کنارے کی دھوتیاں بنارسی صافا اور ڈوپٹہ تو عملیات کے دائرہ سے خارج تھا۔ کئی دن تک بے چارے اسی فکر میں پریشان رہے۔ آخر بیچو کے سوا اور کوئی

مشکل کشا نہ نظر آیا۔ شام کو جب بیچو اُن کے پاس آیا تو اُس کی بڑی آؤ بھگت کی اور بولے "آج کل باراتوں کے مارے ناک میں دم ہے۔ معلوم ہوتا ہے شہر میں کوئی کنوارا آدمی بچے گا ہی نہیں۔ سرکار اگر شادیوں پر ٹیکس لگا دے تو خاصی آمدنی ہوجائے۔"

بیچو۔ "منشی جی، یہی تو سہالگ کے دن ہیں۔ جتنے سُنار۔ آتش باج، بھانڈ، گائن ہیں، وہ انھیں دنوں کی کمائی سال بھر تک کھاتے ہیں۔ نہیں تو ان کو کون پوچھتا۔ بھگوان نے اسی حیلہ سے اُن کی بھی روجی نکال دی ہے۔"

منشی جی۔ "کیا بتاؤں۔ مجھے بھی ایک بارات میں جانا ہے۔ سیکڑوں رئیسوں سے بیوہار ہے۔ کتنا ہی بچوں پھر کہیں نہ کہیں پھنسنا ہی پڑتا ہے۔ اور سب سامان تو میں نے جمع کر لیے ہیں مگر کپڑے بنوانے میں تردد ہے۔ روپیوں کی تو کوئی فکر نہیں۔ تمھاری عنایت سے اتنا سُبھیتا ہے۔ مگر جانتے ہو آج کل لگن کی تیزی ہے۔ درزیوں کو سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ہے۔ دونی مزدوری لیتے ہیں۔ اُس پر مہینوں دوڑاتے ہیں۔ اگر آج کپڑے دے دوں تو شاید بارات کی واپسی تک دوڑتے ہی لگیں۔ اگر تمھارے یہاں میرے لائق کوئی ریشمی اچکن اور بنارسی صافا ہو تو دو تین دن کے لیے مجھے دے دو۔ کسی طرح سر سے یہ بلا ٹلے۔ نوید دے دینا تو آسان ہے۔ بہت ہوا تو رنگین رقعے چھپوا لیے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے کہ باراتیوں کو کتنی تیاریاں کرنی پڑتی ہیں۔ کیا کیا دقتیں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ اگر یہ شرط ہوتی کہ جو شخص نوید دے وہ اس کے لیے سب سامان بھی مہیّا کر دے تو لوگ اتنی آزادی سے نوید نہ دیا کرتے۔ تو بولو۔ میری اتنی مدد کروگے؟"

بیچو۔ "آپ کے لیے کسی بات سے انکار تھوڑے ہی ہے۔ جان تک حاجر ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ آج کل سبھی لوگ اپنے اپنے کپڑوں کی جلدی مچا رہے ہیں۔ دن میں تین تین بار آدمی بھیجتے ہیں۔ اچکن۔ صافا۔ دوپٹہ سب موجود ہے اور ایسا بڑھیا کہ شہر میں کسی رئیس کے پاس بھی نہ ہوگا۔ لیکن ڈر یہی ہے کہ اِدھر آپ کو کپڑے دے دوں۔ اُدھر جس کے کپڑے ہیں وہ سر کھانے لگے تو کیا کروں گا۔"

داتا رام۔ "اجی تو دو تین دن کے لیے ٹالنا کون بڑا کام ہے۔ تم چاہو تو ہفتوں ٹال سکتے ہو۔ ابھی بھٹی نہیں چڑھی، ابھی استری نہیں ہوئی۔ گھاٹ بند ہے۔ تمھارے پاس

بہانوں کی کیا کمی ہے۔ پڑوس میں رہ کر اب کیا میری اتنی خاطر بھی نہ کروگے؟"

بیچو۔ "نہیں منشی جی۔ آپ کے لیے جان حاضر ہے۔ چلیے کپڑے پسند کر لیجیے تو میں اُن پر دوہری استری کر کے ٹھیک کردوں۔ یہی نہ ہوگا دو چار گھڑکیاں کھانی پڑیں گی۔"

(۵)

منشی داتا رام بارات پہنچے۔ باراتیوں کے ٹھاٹھ باٹ، کرّو فر کو دیکھ کر کچھ اندازہ ہوتا تھا کہ انسان کتنا نمائش پسند واقع ہوا ہے۔ چھوٹے بڑے سبھی مرصع و مقطع نظر آتے تھے۔ جدھر دیکھیے شوقیانہ وضع کی بہار تھی۔ سُرمہ و کنگھی، رنگینی اور سجاوٹ، جس سے عام موقعوں پر احتراز کیا جاتا ہے یہاں باعثِ تحسین تھے۔ یوں تو سبھی حضرات ساز و سامان سے لیس تھے پر منشی داتا رام کا رنگ نرالا تھا۔ اُن کے بنارسی صافے، ریشمی اچکن اور سِلک کی چادر نے وہ رنگ جمایا کہ اکثر لوگ سمجھنے لگے کہ یہ کوئی رئیس ہیں۔ بیچو بھی اُن کے ساتھ ہو لیا تھا۔ منشی جی اس کی بڑی خاطر کر رہے تھے۔ اُسے ایک بوتل شراب دِلا دی۔ دعوت میں گئے تو اُس کے لیے خاص طور پر ایک پتّل لیتے آئے۔ یہ ٹھاٹھ اُسی کی بدولت تو تھا۔

بیچو نے کہا۔ آپ کے سامنے سبھی باراتیوں کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔

داتا رام۔ "یہ تمھاری عنایت ہے۔ ورنہ میری کیا ہستی تھی۔ بڑے بڑے وکیل اور رئیس میری طرف رشک سے دیکھتے ہیں۔ دھوبیوں کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ چاہیں تو فقیر کو امیر بنا دیں۔"

دفعتاً ایک آدمی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر منشی جی نے بیچو کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ جب یہ آدمی قریب آگیا تو معلوم ہوا کہ وہ سازندوں میں سے ایک عطائی ہے۔ طبلے بجاتا تھا۔

منشی جی نے پوچھا۔ "کہو بھئی۔ بائی جی آرام فرما رہی ہیں۔ آج تم نے وہ ہاتھ دِکھائے کہ طبیعت خوش ہوگئی۔ کیسے چلے؟"

عطائی۔ "کچھ نہیں۔ آپ نے یہ اچکن اور صافہ کہاں پایا۔"

منشی جی نے اُس کی طرف خوف آمیز تجاہل سے دیکھ کر کہا۔ "اس کا کیا مطلب؟"

عطائی۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں میری ہیں۔"

منشی جی نے دل کو مضبوط کر کے کہا۔ "کیا تمھارے خیال میں ریشمی اچکن اور بنارسی صافا تمھارے سوائے اور کسی کے پاس ہو ہی نہیں سکتا؟"

عطائی۔ "ہو کیوں نہیں سکتا۔ اللہ نے جسے دیا ہے وہ پہنتا ہی ہے۔ پر یہ دونوں چیزیں میری ہیں۔ اگر ایسی اچکن شہر میں کسی دوسرے کے پاس نکل آئے تو جو جُرمانہ کہیے دوں۔ میں نے محض اس کی سلائی کے بیس روپے دیے ہیں۔ وہ کاریگر ہی اب نہیں رہا۔ میں نے برسوں اُس کے دروازے کی خاک چھانی۔ میرے ہنر پر کچھ ایسا خوش ہوگیا کہ یہ اچکن میرے لیے تیار کردی۔ صافے پر بھی میرا نشان بنا ہوا ہے۔ لائیے دِکھا دوں۔ میں صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ نے یہ چیزیں کہاں پائیں۔

منشی جی سمجھ گئے کہ اب زیادہ قیل و قال کی گنجائش نہیں ہے۔ قانونی تحریف کا موقع نہ تھا۔ سینہ زوری میں بات کے بڑھ جانے کا احتمال تھا۔ مصلحت سے کام لیے۔ ملائمت سے بولے، بھئی یہ نہ پوچھو۔ یہاں ان باتوں کے کہنے کا موقع نہیں ہے۔ ہماری اور تمھاری عزت ایک ہے، اتنا ہی سمجھ لو کہ اسی طرح دُنیا کا کام چلتا ہے۔ اگر ایسے کپڑے بنوانے بیٹھتا تو اس وقت سیکڑوں کے متھے جاتی پھر بھی یہ رنگ نہ جمتا۔ یہاں تو کسی طرح کام نکالنے سے مطلب تھا کہ بنا ہڑ اور پھٹکری کے رنگ چوکھا ہوجائے۔ اطمینان رکھو تمھارے کپڑے خراب نہ ہوں گے۔ اس کا ذمّہ میرا۔ میں ان کی احتیاط اپنے کپڑوں سے بھی زیادہ کرتا ہوں۔

عطائی۔ اس کی کوئی فکر نہیں۔ آپ شوق سے پہنیں۔ اور جتنی براتوں میں چاہیں جائیں۔ اپ کی دعا سے اللہ نے بہت کچھ دیا ہے۔ خدا ہمارے رئیسوں کا بھلا کرے ان کی بدولت پانچوں گھی میں رہتی ہیں۔ نہ میں آپ کو رُسوا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کی جوتیوں کا غلام ہوں۔ صرف اتنا جاننا چاہتا تھا کہ آپ کو یہ چیزیں کس سے ملیں؟ یہ کپڑے میں نے بیچو کو دھونے کے لیے دیے تھے۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ کوئی چور بیچو کے گھر سے اُٹھا لایا ہو۔ یا کسی دھوبی نے بیچو کے گھر سے چُرا کر آپ کو دے دیے ہوں۔ کیونکہ بیچو ایسے چھچھورے پن کا عادی نہیں، میں نے خود اُس سے کئی بار اس قسم کا معاملہ کرنے کی کوشش کی۔ ہاتھوں پر پیسے رکھے دیتا تھا۔ پر اُس نے کبھی پرواہ نہیں کی۔ اِدھر کا حال نہیں جانتا کیونکہ اب میں ایسے سوال کرنے کی جرأت

ہی نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ اب وہ اتنا بد دیانت ہوگیا ہوگا۔ اسی لیے آپ سے بار بار پوچھتا ہوں کہ آپ نے کپڑے کہاں پائے۔

داتا رام۔ بیچو کی نسبت تمھارا جو خیال ہے بالکل صحیح ہے۔ آج ایسا بے لوث آدمی شہر میں نہیں۔ ہے تو وہ ایک غریب پیشہ ور، پر معاملہ کا صاف۔ لیکن بھئی پڑوس کا بھی تو کچھ حق ہوتا ہے۔ میرے پڑوس میں رہتا ہے۔ آٹھوں پہر کا ساتھ ہے، میری ضرورت دیکھی، پسیج گیا بس اور کوئی بات نہیں۔

عطائی نے بیچو کی دیانت کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا تھا۔ کبھی بیچو کے ہاتھوں پر پیسے نہ رکھے تھے اور نہ اصرار کیا تھا۔ ہاں ایک بار کپڑے مانگے ضرور تھے۔ مگر اس کے مبالغہ کا اثر بیچو پر اُس سے کہیں زیادہ پڑا جتنا صرف حقیقتِ حال کے اظہار سے ہو سکتا تھا۔ وہ نیند سے نہ سویا تھا۔ عطائی کی باتیں پڑا پڑا سُن رہا تھا۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ میری روح غافل نیند سے بیدار ہو رہی ہے۔ دنیا مجھے کتنا سچّا، کتنا ایماندار سمجھتی ہے اور میں کتنا بے ایمان، کتنا دغا باز ہوں۔ جھوٹے الزام پر میں نے وہ گاؤں چھوڑا جہاں باپ دادے رہتے تھے مگر یہاں آکر تن پروری اور تکلف کے پیچھے تباہ ہوگیا۔ گہرے غار میں گر پڑا۔ کیسے آرام سے زندگی کٹتی تھی۔ موٹا کھاتا تھا۔ پھٹے پُرانے پہنتا تھا اور ٹانگیں پھیلا کر سوتا تھا۔ کارندہ کا بُرا ہو جس کی بدولت میری زندگی یوں غارت ہوگئی۔

بیچو یہاں سے لوٹا تو دوسرا ہی آدمی ہوگیا تھا۔ یا یوں کہیے کہ وہ پھر اپنے کھوئے ہوئے ضمیر کو پا گیا تھا۔

(۶)

چھ مہینے گزر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ بیچو کے بڑے لڑکے ملکھان کی شادی کی بات چیت کرنے کے لیے مہمان لوگ آئے ہوئے تھے۔ بیچو بیوی سے کچھ صلاح کرنے گھر میں آیا تو اُس نے کہا دارو کہاں سے آئے گی؟ تمھارے پاس کچھ ہے۔

دھوبیوں سے زیادہ پیکرِ ذات شاید اور کوئی نہیں ہوتی۔ اُن کی شادی میں شراب، پنچایت میں شراب، پوجا پاٹ میں شراب، غمی میں شراب، خوشی میں شراب کے دور چلتے ہیں۔ ان کی کمائی کا کم سے کم آدھا ہمیشہ شراب کی نذر ہوتا ہے۔ ایسا شاید ہی کوئی بدنصیب دھوبی، خصوصاً شہر کا رہنے والا ہوگا جو شام کے وقت میخانہ میں بیٹھا یا شراب کے

نشہ میں چور گاتا، لڑکھڑاتا سڑک پر نہ ملے۔ شراب اُن کی خمیر ہے ان کی سرشت ہے۔

بیچو نے کہا۔ میرے پاس کیا ہے۔ جو کچھ تھا وہ تمھیں پہلے ہی نہیں دے دیا تھا۔

بیوی۔ ''اس کے تو میں چاول، دال، گھی، لکڑی لائی۔ سات آدمیوں کا کھانا بنتا تھا۔ سب اُٹھ گئے۔''

بیچو۔ ''تو پھر میں کیا کروں؟''

بیوی۔ ''بنا دارو کے وہ لوگ کھابے سے اُٹھیں گے؟ کتنی بڑی بدنامی ہوگی؟''

بیچو۔ ''بدنامی ہو۔ چاہے نیک نامی ہو۔ میرے بس کی بات نہیں ہے۔''

بیوی۔ ''وہ دوشالہ نہیں دُھلنے کے لیے آیا ہے۔ اس وقت بنیے کے یہاں گرو رکھ کر چار پانچ روپے لاؤ۔ پھر چُھڑا لینا۔ مرجاد تو نبھانی چاہیے۔

بیچو۔ وہ دوشالہ میرا ہے؟

بیوی۔ ''کسی کا ہو۔ اس بکھت کام نکال لو۔ کوئی کسی سے کہنے جاتا ہے۔''

بیچو۔ نہیں یہ مجھ سے نہ ہوگا۔ مہمان کھانے اُٹھیں یا نہ اُٹھیں، شادی ہو یا نہ ہو، نیک نامی ہو یا بدنامی کوئی ہنسے یا نکّو بنائے۔ روٹھے یا مُنہ پھلائے۔ پر میں کسی دوسرے کی چیز گرو نہ رکھوں گا۔

یہ کہہ کر بیچو باہر چلا آیا۔ دوبارہ چلم بھرنے گھر میں گیا تو اس کی بیوی زمین کھود کر کچھ نکال رہی تھی۔ بیچو کو دیکھتے ہی اُس نے گڈھے کو آنچل سے چھپا لیا۔

یہ افسانہ ماہنامہ زمانہ کے اکتوبر 1922 کے شمارے میں شائع ہوا۔ ہندی میں 'لوک مت کا سمان' کے عنوان سے، مان سروور7 میں شامل ہے۔ اردو کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔

دعوتِ شیراز

اشخاص

دیا شنکر۔ دفتر کے ایک معمولی کلرک۔
آنند موہن۔ کالج کا ایک طالبِ علم۔ اور دیا شنکر کا دوست۔
جوتی سروپ۔ دیا شنکر کا ایک دُوری رشتہ دار
سیوتی۔ دیا شنکر کی بیوی۔

ہولی کا دن

(وقت نو بجے رات۔ آنند موہن اور دیا شنکر باتیں کرتے جا رہے ہیں)

آنند موہن۔ ہم لوگ کو دیر تو نہیں ہوئی۔ ابھی نو بجے ہوں گے۔

دیا شنکر۔ نہیں ابھی کیا دیر ہوگی۔

آنند۔ وہاں بہت انتظار نہ کرانا۔ ایک تو دن بھر کی کوچہ گردی کے بعد مجھ میں انتظار کی قوت نہیں رہی اور پھر گیارہ بجے بورڈنگ ہاؤس کا دروازہ بند ہوجاتا ہے۔

دیا شنکر۔ اجی چلتے چلتے تھالی سامنے آئے گی۔ میں نے سیوتی سے کہہ دیا تھا۔ نو بجے تک سب سامان تیار رکھنا۔

آنند موہن۔ تمھارا مکان دُور ہے یا میرے پیروں کی قوت سلب ہوگئی ہے باتیں کرتے چلیں۔ پردے کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔ بھابی جان میرے سامنے آئیں گی یا نہیں۔ ان کے رُخِ روشن کا دیدار کرسکوں گا؟

دیا شنکر۔ تمھارے اور میرے درمیان برادرانہ بے تکلفی ہے۔ سیوتی اگر بے حجاب آئے تو مضائقہ نہیں۔ لیکن عام طور پر میں پردے کی حمایت کرتا ہوں۔ ہماری سوسائٹی کے اطوار و آداب بھی اتنے پاکیزہ نہیں ہوئے ہیں کہ کوئی عورت اپنی شرم کے حسن کو صدمہ پہنچائے بغیر گھر سے باہر نکل سکے۔

تلوتما۔ ہاں مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے؟

ماں۔ کیوں، تمھیں ایسی شنکا کیوں ہوتی ہے؟

تلوتما۔ نہ جانے کیوں؟ کوئی مرے من میں بیٹھا ہوا کہہ رہا ہے کہ پھر انشٹھ (بُرا) ہوگا۔ میں پرایہ نتیہ سوپن دیکھا کرتی ہوں۔ رات کو مجھے ایسا جان پڑتا ہے کہ کوئی پرانی جس کی صورت سانپ سے بہت ملتی جلتی ہے۔ میری چارپائی کے چاروں اُور گھومتا ہے۔ میں بھئے کے مارے چپی سادھ لیتی ہوں۔ کسی سے کچھ کہتی نہیں۔

ماں نے سمجھا یہ سب بھرم ہے۔ وِواہ کی تتھی نیت ہوگئی۔ یہ کیول تلوتما کا پُنہ سنسکار نہ تھا، بلکہ سماج سدھار کا ایک کریاتمک اداہرن (عملی مثال) تھا۔ سماج سدھارکوں کے دَل دور سے بواہ میں سملت ہونے کے لیے آنے لگے بواہ ویدک ریتی سے ہوا۔ مہمانوں نے خوب ویاکھیان دیے۔ پتروں نے خوب آلوچنائیں کی۔ بابو جگدیش چندر کے عیتک (اخلاقی) ساہس (حوصلے) کی سراہنا ہونے لگی۔ تیسرے دن بہو وداع ہونے کا مہورت تھا۔

جنواسے میں یتھا سادھیہ رکھشا (حفاظت کے ممکنہ) کے سبھی سادھنوں (طریقوں) سے کام لیا گیا تھا۔ بجلی کی روشنی سے سارا جنواسا دن سا ہوگیا تھا۔ بھومی پر رینگتی ہوئی چیونٹی بھی دکھائی دیتی تھی۔ کیشوں میں نہ کہیں شکن تھی، نہ سلوٹ اور نہ جھول۔ شامیانے کے چاروں طرف قناطیں کھڑی کردی گئی تھیں۔ کسی طرف سے کیڑے مکوڑوں کے آنے کی سنبھاونا (امکان) نہ تھی۔ پربھاوی (اثر) پربل (طاقت ور) ہوتی ہے۔ پراتا کال کے چار بجے تھے۔ تارا گنوں (تاروں) کی بارات وداع ہو رہی تھی بہو کی وداعی کی تیاری ہو رہی تھی۔ ایک طرف شہنائیاں بج رہی تھیں۔ دوسری طرف سے ولاپ کی اترتیہ دھونی اُٹھ رہی تھی۔ پر تلوتما کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے، سمے نازک تھا۔ وہ کسی طرح گھر سے باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ اس کے سر پر تلوار لٹک رہی تھی۔ رونے اور سہیلیوں سے گلے ملنے میں کوئی آنند نہ تھا۔ جس پرانی کا پھوڑا چلک رہا ہو اسے جرّاح کا گھر باغ میں سیر کرنے سے زیادہ اچھا لگے، تو کیا آشچریہ ہے۔

وَر کو لوگوں نے جگایا۔ باجا بجنے لگا۔ وہ پالکی میں بیٹھنے کو چلا کہ بدھو کو بدا کرا لائے۔ پر جوتے میں پیر ڈالا ہی کہ چیخ مار کر پیر کھینچ لیا۔ معلوم ہوا کہ پاؤ چنگاریوں پر پڑگیا۔ دیکھا تو ایک کالا سانپ جوتے میں سے نکل کر رینگتا ہوا چلا جاتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے

غائب ہو گیا۔ وَر نے ایک سرد آہ بھری اور بیٹھ گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

ایک چھن میں سارے جنواسے میں خبر پھیل گئی، لوگ دوڑ پڑے۔ اُوشدھیاں پہلے ہی رکھ لی گئی تھیں۔ سانپ کا منتر جاننے والے کئی آدمی بلا لیے گئے تھے۔ سبھی نے دوائیاں دیں۔ جھاڑ پھونک شروع ہوئی اوشدھیاں بھی دی گئیں۔ پر کال کے سامنے کسی کا بس نہ چلا۔ شاید موت سانپ کا بھیس دھر کر آئی تھی۔ تلوتما نے سنا تو سر پیٹ لیا۔ وہ وکل (مضطرب) ہو کر جنواسے کی طرف دوڑی۔ چادر اوڑھنے کی بھی سدھ نہ رہی۔ وہ اپنی پتی کے چرنوں کو ماتھے سے لگا کر اپنا جنم سپھل کرنا چاہتی تھی۔ گھر کی استریوں نے روکا۔ ماتا بھی رو رو کر سمجھانے لگیں۔ لیکن بابو جگدیش چندر نے کہا کوئی ہرج نہیں، جانے دو پتی کا درشن کر لے۔ یہ ابھیلاشا کیوں رہ جائے۔ اسی شوکانوِت دِشا (غم زدہ حالت) میں تلوتما جنواسے میں پہنچی، پر وہاں اس کی تسکین کے لیے مرنے والے کی اُلٹی سانسیں تھیں۔ ان ادھ کھولے نیتروں میں اساہیہ آتم ویدنا (نا قابلِ برداشت تکلیف) اور دارُن نراشیہ (انتہائی نا امیدی)۔

(۴)

اس ادبھت گھٹنا کا سماچار دور دور تک پھیل گیا۔ جڑوادی گرن (دہریے) چکت (حیران) تھے، یہ کیا ماجرا ہے آتم واد (روحانیت پسندی) کے بھکت گیات بھاوسے سر ہلاتے تھے مانوں وے ترکالرشی (تینوں زمانوں کے عالم) ہیں۔ جگدیش چندر نے نصیب ٹھونک لیا۔ نشچت ہو گیا کہ کنیا کے بھاگیہ میں بدھوا رہنا ہی لکھا ہے۔ ناگ کی پوجا سال میں دوبارہ ہونے لگی۔ تلوتما کے چرتر میں بھی ایک وشیش انتر دِکھنے لگا۔ بھوگ اور وہار (عیش و عشرت) کے دن بھکتی اور دیو آرادھنا (پوجا) میں کٹنے لگے۔ نراش پرانیوں کا یہی اولمب ہے۔

تین سال بیتے تھے کہ ڈھاکا وِشو ودھیالہ کے ادھیاپک دَیا رام نے اس قصّے کو پھر تاجا کیا۔ وے پشو شاستر کے گیاتا تھے۔ انھوں نے سانپوں کے آچار وچار و بیوہار کا وِشیش (خاص) ریتی (طریقے) سے ادھین (مطالعہ) کیا۔ وے اس رہسیہ کو کھولنا چاہتے تھے۔ جگدیش چندر کو بواہ کا سندیش بھیجا۔ انھوں نے ٹال مٹول کیا۔ دیا رام نے اور بھی آگرہ کیا۔ لکھا میں نے ویگیانک انویشن (سائنسی تحقیق) کے لیے یہ نشچیہ کیا ہے میں اس وشدھر (زہریلے) ناگ سے لڑنا چاہتا ہوں۔ وہ اگر سو دانت لے کر آئے تو بھی مجھے کوئی ہانی

(نقصان) نہیں پہنچا سکتا، وہ مجھے کاٹ کر آپ ہی مر جائے گا۔ اگر وہ مجھے کاٹ بھی لے تو میرے پاس ایسے منتر اور اُوشیدھیاں (دوائیاں) ہیں کہ میں ایک چھن میں اس کے وِش کو اُتار سکتا ہوں۔ جگدیش چندر کو اب کوئی عذر نہ سوجھا۔ ہاں انھوں نے ایک ویشیش پریتن (خاص کوشش) کیا کہ ڈھاکہ میں ہی بواہ ہو۔ اَت ایو (اس لیے) وے اپنے کٹمبیوں کو ساتھ لے کر بواہ کے ایک سپتاہ (ہفتے) پہلے گئے۔ چلتے سمے اپنے صندوق، بستر آدی (وغیرہ) خوب دیکھ بھال کر رکھے کہ سانپ کہیں ان میں چھپ کر نہ بیٹھ جائے۔ شبھ لگن میں بواہ سنسکار ہوگیا۔ تلوتما وکل ہو رہی تھی۔ مکھ پر ایک رنگ آتا تھا، ایک رنگ جاتا تھا، پر سنسکار میں کوئی بگھن (خلل) بادھا (اڑچن) نہ پڑی۔ تلوتما رو دھوکر سسرال گئی۔ جگدیش چندر گھر لوٹ آئے پر ایسے چنتت (فکرمند) تھے جیسے کوئی آدمی سرائے میں کھلا ہوا صندوق چھوڑ کر بازار چلا جائے۔

تلوتما کے سوبھاؤ میں اب ایک وچتر روپانتر (تبدیلی) ہوا۔ وہ اوروں سے ہنستی بولتی آرام سے کھاتی پیتی سیر کرنے جاتی، تھیٹروں انیہ (دیگر) ساجک سمیلنوں (جلسوں) میں شریک ہوتی۔ ان اوسروں پر پروفیسر دیا رام سے بھی بڑے پریم کا ویوہار کرتی، ان کے آرام کا بہت دھیان رکھتی۔ کوئی کام ان کی اِچھا کے وِرودھ نہ کرتی۔ کوئی اجنبی آدمی اُسے دیکھ کر کہہ سکتا تھا گرہنی ہو تو ایسی ہو۔ دوسروں کی ورشٹی (نظر) میں اس دمپتی (شادی شدہ) کا جیون آدرش (مثالی) تھا۔ کنتو آنترک دشا (اندرونی حالت) کچھ اور ہی تھی۔ ان کے ساتھ شیناگار (کمرے) میں جاتے ہی اس کا مکھ وکرت (خوفناک) ہوجاتا، بھویں تن جاتیں، ماتھے پر بل پڑجاتے، شریر اگنی کی بھانتی جلنے لگتا، پلکیں کھلی رہ جاتیں، نیتروں سے جوالا سی نکلنے لگتی اور اس میں سے جھلستی ہوئی لپٹیں نکلتیں، مکھ پر کالیما چھا جاتی اور یدھپی سو روپ میں کوئی وشیش انتر (خاص فرق) نہ دکھائی دیتا، پر نہ جانے کیوں بھرم ہونے لگتا، یہ کوئی ناگن ہے۔ کبھی کبھی وہ پھنکارنے بھی لگتی۔ اس استھتی میں دیارام کو اس کے سمیپ جانے یا اس سے کچھ بولنے کی ہمت نہ پڑتی۔ وے اس کے روپ، لاونیہ (حسن) پر مگدھ (فریفتہ) تھے، کنتو اس اوستھا میں انھیں اس سے گھرنا (نفرت) ہوتی۔ اسے اس انماد (دیوانگی) کے آویگ (لہر) میں چھوڑ کر باہر نکل آتے۔ ڈاکٹروں سے صلاح لی، سویم اس وشے پر کتنی ہی کتابوں کا ادھین کیا، پر رہسیہ (راز) کچھ سمجھ میں نہ آیا، انھیں بھوتک

وِگیان (علم طبیعات) میں اپنی الپ گیاتا (کم علمی) سویکار (ماننا) کرنی پڑی۔

انھیں اب اپنا جیون اسہائے جان پڑتا۔ اپنے دوساہس (غلط حوصلے) پر پچھتاتے۔ ناحق اس وِپتی میں اپنی جان پھنسائی۔ انھیں شنکا ہونے لگی کہ اوشیہ کوئی پریت لیلا ہے۔ متھیا وادی (غیر حقیقت پسند) نہ تھے، پر جہاں بدھی اور ترک کا کچھ وش نہیں چلتا، وہاں مُنشیہ وِوَش (مجبور) ہوکر متھیا وادی ہوجاتا ہے۔

شنیہ شنیہ ان کی یہ حالت ہوگئی کہ سدیو تلوتما سے سشنک رہتے۔ اس کا اُنماد وکرت، مکھا کرتی ان کے دھیان سے نہ اُترتے۔ ڈر لگتا کہ کہیں یہ مجھے مار نہ ڈالے۔ نہ جانے کب انماد کا آویگ ہو۔ یہ چنتا ہردے کو ویتھت کیا کرتی۔ ہپناٹزم، ودھوت شکتی (برقی قوت) اور کئی نئے آروگیہ ودھانوں (طبی طریقوں) کی پریکشا کی گئی۔ انھیں ہپناٹزم پر بہت بھروسا تھا، لیکن جب یہ یوگ بھی نِشپھل (بے فائدہ) ہوگیا تو وے نراش ہوگئے۔

(۵)

ایک دن پروفیسر دیا رام کسی ویگیانک سمّیلن میں گئے ہوئے تھے۔ لوٹے تو بارہ بج گئے تھے۔ ورشا کے دن تھے۔ نوکر چاکر سو رہے تھے۔ وے تلوتما کے شین گرہ (سونے کے کمرہ) میں یہ پوچھنے گئے کہ میرا بھوجن کہاں رکھا ہے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ تلوتما کے سرہانے کی اُور انھیں ایک اتی بھیم کائے کالا سانپ بیٹھا ہوا دکھائی دیا۔ پروفیسر صاحب چپکے سے لوٹ آئے۔ اپنے کمرے میں جاکر کسی اَوشدھی کی خوراک پی اور پستول تھما (اور) سانگا لے کر پھر تلوتما کے کمرے میں پہنچے۔ وشواس ہوگیا کہ یہ وہی میرا پُرانا شترو ہے۔ اتنے دن میں ٹوہ لگاتا ہوا یہاں آپہنچا پر اسے تلوتما سے کیوں اتنا اسنیہ ہے۔ اس کے سرہانے یوں بیٹھا ہوا ہے مانو کوئی رسّی کا ٹکڑا ہے۔ یہ کیا رہسیہ ہے! انھوں نے سانپوں کے سلسلے میں بڑی ادبھوت کتھائیں پڑھی اور سنی تھیں، پر ایسی کوتوہل جنک (عجیب و غریب) گھٹنا کا اُلیکھ کہیں نہ دیکھا تھا۔ وے اس بھانتی سشتر (مسلح) ہوکر پھر کمرے میں پہنچے تو سانپ کا پتہ نہ تھا۔ ہاں تلوتما کے سر پر بھوت سوار ہوگیا تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی آگنیہ نیتروں سے دوار کی اور تاک رہی تھی۔ اس کے نینوں سے جوالا نکل رہی تھی، جس کی آنچ دو گز تک لگتی۔ اس سمئے اُنماد اتیشے پرچنڈ (بہت زیادہ تیز) تھا۔ دیا رام کو دیکھتے ہی بجلی کی طرح ان پر ٹوٹ پڑی اور ہاتھوں سے آگھات کرنے کے بدلے انھیں دانتوں سے کاٹنے کی چیشٹا کرنے لگی۔

اس کے ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھ اُن کی گردن میں ڈال دیے۔ دیارام نے بہوتیرا چاہا، ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا کہ اپنا گلا چھڑا لیں، لیکن تلوتما کا باہو باش پرتی چھنڑ (لگاتار) سانپ کی کیڑلی کی بھانتی کٹھور (سخت) اِوم (اور) سنکوچت (تنگ) ہوتا جاتا تھا۔ ادھر یہ سندیہہ تھا کہ اس نے مجھے کاٹا تو کداچت اسے جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ انھوں نے ابھی جو اَوشدھی پی تھی، وہ سرپ وِش (سانپ کے زہر) سے ادھک گھاتک (زیادہ مہلک) تھی۔ اس دَشا میں انھیں یہ شوک مئے وِچار اُتپن ہوا۔ یہ بھی کوئی چیز ہے کہ دمپتی کا اُتردائتو (ذمہ داری) تو سب سر پر سوار، پر اس کا سکھ نام کا نہیں اُلٹے رات دن جان کا کھٹکا۔ یہ کیا مایا ہے۔ وہ سانپ کوئی پریت تو نہیں ہے جو اس کے سر آکر یہ دَشا کردیا کرتا ہے۔ کہتے ہیں ایسی اَوستھا میں روگی پر جو چوٹ کی جاتی ہے وہ پریت پر ہی پڑتی ہے۔ نیچی جاتیوں میں اس کے اداہرن بھی دیکھے ہیں۔ وے اسی حیص بیص (رد و قبول) میں پڑے تھے کہ ان کا دم گھٹنے لگا۔ تلوتما کے ہاتھ رسّی کے پھندوں کے بھانتی ان کی گردن کو کس رہے تھے۔ وے دین اساہائے بھاؤ سے ادھر اُدھر تاکنے لگے۔ کیوں کر جان بچے، کوئی اُپائے نہ سوجھ پڑتا تھا۔ سانس لینا دوبھر ہوگیا، دیہہ (جسم) شتھل (ڈھیلا) پڑگئی، پیر تھر تھرانے لگے۔ سہسا تلوتما نے ان کی باہوں کی اُور منہ بڑھایا۔ دیا رام کانپ اُٹھے۔ بھرتیو آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ من میں کہا۔ یہ اس سمئے میری استری نہیں، وِشیلی بھینکر ناگن ہے۔ اس کے وِش سے جان بچانا مشکل ہے۔ اپنی اَوشدھی پر جو بھروسا تھا وہ جاتا رہا۔ چوہا اُنمت دَشا میں کاٹ لیتا ہے تو جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ بھگوان؟ کتنا وکرال سَوروپ ہے؟ پرتیکش ناگن معلوم ہورہی ہے۔ اب اُلٹی پڑے یا سیدھی اس دَشا کا انت کرنا ہی پڑے گا۔ انھیں ایسا جان پڑا کہ اب گرا ہی چاہتا ہوں۔ تلوتما بار بار سانپوں کی بھانتی پھنکار مار کر جیبھ نکالے ہوئے ان کی اُور جھپٹتی تھی، یکایک وہ بڑے کرکش سُور میں بولی۔ مورکھ؟ تیرا اتنا ساہس کہ تو اس سندری سے پریم لِنگن کرے۔ یہ کہہ کر وہ بڑے ویگ سے کاٹنے کو دوڑی۔ دیا رام کا دھریہ جاتا رہا۔ انھوں نے داہنا ہاتھ سیدھا کیا اور تلوتما کی چھاتی پر پستول چلا دیا۔ تلوتما پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کی باہیں اور بھی کڑی ہوگئیں۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ دیا رام نے دوسری گولی داغ دی۔ یہ چوٹ پوری پڑی۔ تلوتما کا باہو بندھن ڈھیلا پڑگیا۔ ایک چھن میں اس کے ہاتھ نیچے لٹک گئے، سر جھک گیا اور بھومی پر گر پڑی۔

تب وہ دِرشیہ دیکھنے میں آیا جس کا اداہرن کداچت الف لیلا اور چندر کانتا میں بھی نہ ملے۔ وہی پلنگ کے پاس، زمین پر ایک کالا، دِردھ کائے سَرپ پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کی چھاتی اور منہ سے خون کی دھارا بہہ رہی تھی۔

دیا رام کو اپنی آنکھوں پر وشواس نہ آتا تھا۔ یہ کیسی اَدبھُت پریت لیلا تھی! سمسیا کیا ہے کس سے پوچھوں؟ اس طلسم کو توڑنے کا پریتن کرنا میرے جیون کا ایک کرتبیہ ہوگیا۔ انھوں نے سانگے سے سانپ کی دیہہ میں ایک کوچا مارا اور پھر وہ اسے لٹکائے ہوئے آنگن میں لائے۔ بالکل بے دم ہوگیا تھا۔ انھوں نے اسے اپنے کمرے میں لاکر ایک خالی صندوق میں بند کردیا۔ اس میں بھونس بھروا کر برآمدے میں لٹکانا چاہتے تھے۔ اتنا بڑا گیہون سانپ کسی نے دیکھا نہ ہوگا۔

تب وے تلوتما کے پاس گئے۔ ڈر کے مارے کمرے میں قدم رکھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ہاں، اس وِچار سے کچھ تسکین ہوتی تھی کہ سرپ پریت مر گیا ہے تو اس کی جان بچ گئی ہوگی۔ اس آشا اور بھئے کی دَشا میں وہ اندر گئے تو تلوتما آئینے کے سامنے کھڑی ہوکر کیش سنوار رہی تھی۔

دیا رام کو مانو چاروں پدارتھ مل گئے۔ تلوتما کا مکھ ۔کمل کھلا ہوا تھا۔ انھوں نے کبھی اسے اتنا پرپُھللت (پُرجوش) نہ دیکھا تھا۔ انھیں دیکھتے ہی وہ ان کی اُور پریم سے چلی اور بولی۔ آج اتنی رات تک کہاں رہے؟

دیا رام پریمونمت ہوکر بولے۔ ایک جلسے میں چلا گیا تھا۔ تمھاری طبیعت کیسی ہے؟ کہیں درد نہیں ہے؟

تلوتما نے ان کو آشچریہ سے دیکھ کر پوچھا۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ میری چھاتی میں ایسا درد ہو رہا ہے، جیسے چِلک پڑگئی ہو۔

یہ افسانہ پہلی بار تہذیب نسواں کے اگست 1922 کے شمارے میں 'سانپ کی معشوقہ' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ہندی میں مان سرودر 7 میں ناگ پوجا کے عنوان سے شامل ہے یہاں ''ناگ پوجا'' کو رسم خط بدل کر اردو میں شائع کیا جارہا ہے۔

فکرِ دُنیا

جیک یوں دیکھنے میں بہت موٹا تازہ لحیم شحیم تھا۔ بھونکتا تو سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹ جاتے۔ ڈیل ڈول بھی ایسا تھا کہ اندھیری رات میں اس پر گدھے کا شُبہ ہوتا تھا۔ لیکن اس کی دلیری کسی معرکہ میں کبھی ظاہر نہ ہوئی تھی۔ دوچار بار جب بازار کے مربھوکے شہدوں نے اسے للکارا تو وہ ان کی جسارت کا مزہ چکھانے کے لیے میدان میں آیا اور دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ جب تک لڑا جیوٹ سے لڑا۔ پنجے اور دانتوں سے زیادہ کارہائے نمایاں اس کی دُم نے کیے۔ تحقیقی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ بالآخر میدان کس کے ہاتھ رہا لیکن جب فریقِ مخالف کو اپنی حمایت کے لیے اور کمک منگانی پڑی۔ تو اُصولِ حرب کے مطابق فتح کا سہرا جیک ہی کے سر رکھنا زیادہ قرینِ انصاف معلوم ہوتا ہے۔ جیک نے اس وقت مصلحت سے کام لیا اور صلح کرلی۔ لیکن تب سے اس نے ایسے نا اصول پرور اور بے راہ رقیبوں کو مُنہ نہ لگایا۔

اتنا صلح پسند اور فروتن اور متحمل مزاج ہونے پر بھی جیک کے رقیبوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ اس کے ہمسر تو اس لیے اس سے جلتے کہ یہ اتنا جسیم اور عظیم الجثہ ہوکر بھی اس قدر سلامت رو کیوں ہے۔ ان کے خیال میں سلامت روی اس کے شایانِ شان نہ تھی۔ بازاری غول اس سے محض اس لیے بدگمان رہتا تھا کہ جیک کے مارے گھوروں پر کی ہڈیاں اور تیل بھی نہ بچنے پاتے تھے وہ گھڑی رات رہے اُٹھتا اور حلوائیوں کی دُکانوں کے سامنے کے دونے اور نانبائیوں کی دُکانوں کے سامنے کی ہڈیاں ایک ایک کرکے اُڑا جاتا۔ وہ اپنے بقائے حیات کی دُھن میں بھول جاتا کہ یہ علاقہ دوسروں کا ہے اور میں بلا ان کی مرضی کے اس کے اندر قدم رکھنے کا مجاز نہیں ہوں تاوقتیکہ اپنے پنجہ و دنداں سے اپنا استحقاق ثابت کردوں۔ چنانچہ اتنے دشمنوں کی نگاہوں پر چڑھ کر جیک کی زندگی ناقابلِ برداشت ہوتی جاتی تھی۔ مہینوں گزرجاتے اور سیری نصیب نہ ہوتی۔ کئی بار اسے سیری کی ہوس نے مشکوک ذرائع سے کام لینے پر مجبور کیا مگر جب نتیجہ اُمید کے خلاف

ظہور میں آیا اور لقمہ ہائے لطیف اور پُر کے بدلے زیادہ ثقیل اور تحمل آزما چیزیں شکم پُری کو ملیں تو مجبور ہو کر پھر وہی روش سلامت روی اختیار کی۔

مگر اس نیرنگیٔ تقدیر اور سعی ناموفور نے اشتیاق کو فرو کرنے کے بدلے اور بھی مشتعل کر دیا۔ اس کے دل میں ایک بیتاب کن آرزو پیدا ہوئی۔ کسی ایسی جگہ جاؤں جہاں شکار بہ افراط ہو۔ ہرن اور خرگوش اور بھیڑوں کے گلے مرغزاروں میں چرتے ہوں۔ نہ ان کا کوئی مالک ہو نہ محافظ کسی رقیب کا اندیشہ تک نہ ہو۔ آرام کرنے کو گھنے درختوں کا سایہ ہو۔ پینے کو ندی کا صاف ستھرا پانی۔ من مانا شکار کھیلوں کھاؤں اور میٹھی نیند سوؤں۔ چاروں طرف میری دھاک جم جائے۔ ایسا رُعب قائم ہوجائے۔ دلوں میں میری اتنی ہیبت سما جائے کہ جدھر نکل جاؤں ہلچل پڑجائے سب جانور مجھی کو اپنا فرماں روا حتیٰ کہ اپنا راجا سمجھنے لگیں۔ ایسا سکہ بیٹھ جائے کہ کسی رقیب کو اِدھر نگاہ اُٹھانے کی ہمت تک نہ ہو۔

قضا را ایک دن وہ انھیں دل خوش کن خیالات کے سرور میں سر جھکائے سڑک چھوڑ کر گلیوں سے چلا جارہا تھا کہ دفعتاً ایک جوان ہمت حریف سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ جیک نے دبی ہوئی نگاہوں سے اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھے تو تھرا گیا۔ چاہتا تھا کہ بچ کر نکل جائے مگر حریف روسیاہ اتنا صلح پسند نہ تھا اس نے فوراً جھپٹ کر جیک کی گردن پکڑ لی۔ جیک نے بہت منت و سماجت کی، گڑگڑا کر کہا۔ خدا را مجھے چلا جانے دو۔ قسم لے لو جو پھر ادھر قدم رکھوں مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ علاقہ تمھارے ممالک محروسہ میں شامل ہے ورنہ مجھ سے ایسی حماقت ہرگز نہ سرزد ہوتی۔ تم شیر ہو۔ دلیر ہو۔ مردِ میدان ہو۔ میں فاقہ کش غریب خستہ حال بھلا تم سے آنکھیں ملانے کا دعوا کرسکتا ہوں۔ پر اس نشہ خودی کے متوالے شقی اور سیہ باطن وجود کا دل ذرا بھی نہ پسیجا بلکہ اس عجز و الحاح نے اسے اور بھی آمادۂ پُرخاش کردیا۔ ضرر کا اندیشہ نہ رہا۔ آخر بدرجہ مجبوری جیک نے نہایت بیکسانہ انداز سے نالۂ فریاد بلند کیا۔ یہ شور سُن کر علاقہ کے چند اور شریر حضرات جمع ہوگئے لیکن وہ بھی جوہر انسانیت سے عاری تھے۔ بجائے اِس کے کہ بیکس پر رحم کریں اور بے رحم حملہ آور کو نشانۂ ملامت و تحقیر بنائیں اُلٹے جیک ہی پر ٹوٹ پڑے۔ جیک نے راہِ فرار اختیار کی۔ پر ان بہائم نے بہت دُور تک اس کا تعاقب کیا یہاں تک کہ راستہ میں ایک دریا حائل ہوگیا اور جیک نے توکّل بخدا اس میں کود کر اپنی جان بچائی۔ ان ظالموں کو ندی میں

کودنے کی ہمت نہ پڑی۔

کہتے ہیں ایک کوڑے کے بھی دن پھرتے ہیں۔ جیک کے دن بھی ندی میں کودتے ہی پھر گئے۔ کودا تھا جان بچانے کے لیے۔ ہاتھ لگ گئے موتی۔ تیرتا ہوا اس پار پہنچا۔ تو وہاں اس کی دیرینہ تمناؤں کی کلیاں کھلی ہوئی تھیں۔

(۲)

یہ ایک نہایت وسیع خطہ تھا۔ جہاں تک نگاہ جاتی سبزہ کا زمردیں فرش بچھا ہوا نظر آتا۔ کہیں مترنم آبشار تھے۔ کہیں متبسم مرغزار۔ ایک دل فریب منظر تھا۔ فرحت و نزہت سے بھانت بھانت کے طیور و چوپائے نظر آئے بعض ایسے دراز قد کہ جیک انھیں دیکھ کر تھرا اُٹھا۔ بعض ایسے خونخوار کہ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ایسے ایسے مہیب اژدھے نظر آئے جو ایک کش میں اسے نگل جائیں۔ جیک سخت تشویش میں مبتلا ہوا۔ دل فریب منظر نے جو اُمیدیں بیدار کردی تھیں وہ غائب ہوگئیں۔ اس وادیٔ پُرخطر میں رات کیوں کر بسر ہوگی وہ اسی فکر میں غوطے کھا رہا تھا کہ شام ہوگئی اور تاریکی کے تسلط ہوتے ہی وہاں ایک شور قیامت برپا ہوگیا۔ درند و پرند قطاروں میں کھڑے ہوگئے اور پنجہ و ناخن منقار و دنداں سے ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے۔ ان کی گرج اور تڑپ چوٹ اور وار دیکھ کر جیک کے ہوش اُڑ گئے ایک گوشۂ محفوظ میں دُبکا ہوا یہ معرکۂ خونریز دیکھتا رہا۔ ساری رات میدانِ کارزار گرم رہا۔ خون کی ندی بہتی رہی۔ صبح کو وہاں اس نے جاکر دیکھا۔ تو معرکہ آراؤں کا نشان نہ تھا۔ مقتولوں کے انبار لگے تھے۔ کتنے ہی زخم خوردہ سورما ایڑیاں رگڑ رہے تھے اب کیا تھا۔ جیک کے پوبارہ ہوگئے۔ ایک زخمی ہرن پر ٹوٹ پڑا۔ اور چشم زدن میں اس کی تکا بوٹی کر ڈالی۔ آج مدّت دراز کے بعد شاید زندگی میں پہلی بار اسے سیری کا احساس ہوا۔

مگر یہ خونیں نظارے کسی علت یا سبب کے پابند نہ تھے۔ دن اپنے اپنے گوشے میں آرام کرنے کے بعد شام کو اس وادی کے سبھی باشندے نکل آتے اور معرکۂ کارزار شروع ہوجاتا اور پھر صبح کو جیک اپنے لیے اغذیہ لطیف کا دسترخوان بچھا ہوا پاتا یہ روز کا معمول تھا۔

تھوڑے ہی دنوں میں عیش بے خلل اور غذائے قوت بخش نے جیک پر جادو کا سا

اثر پیدا کیا۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ کیم، دراز قد اور خوفناک ہوگیا اپنے قویٰ میں اُسے حیرت انگیز توانائی اور چُستی کا احساس ہونے لگا۔ اس کی ہمت بھی کھل گئی۔ وہ اب پیٹ میں مُنہ دبائے سمیٹے کسی گوشہ میں نہ بیٹھتا بلکہ دلیرانہ انداز غرور سے سبزہ زار میں چھلانگیں بھرتا اور کسی چھوٹے موٹے جانور کا شکار بھی کرلیتا۔ اِدھر اس خطّہ کے دلیروں میں روزانہ خونریزی و معرکہ آرائی کے باعث ضعف و انحطاط کے آثار نظر آنے لگے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے اور اب اس وادیٔ پُرفضا میں جیک کا مدِّ مقابل نہ رہا۔

جیک کو اب اپنی شجاعت اور مردانگی کے اظہار کا موقع ملا۔ اس کی آواز میں شیروں کی سی گرج تھی۔ بشرہ سے رُعب اور ہیبت کی شعاعیں نکلتیں۔ جنگل کے جانور اسے بچہ شیر سمجھنے لگے۔ جیک بھی اپنی صید افگنی کے کمال دِکھا کر ان کے اس خیال کی تائید کرنے لگا۔ خدا نے مجھے تمھارے اوپر حکومت کرنے کے لیے بھیجا ہے یہ مشیت الٰہی ہے تم بے غل و غش اپنے اپنے گھروں میں پڑے رہو۔ میں تم سے کچھ نہ بولوں گا۔ اگر کوئی دشمن باہر سے آجائے گا۔ تو خود اس سے مقابلہ کروں گا۔ میری ذات سے تمھیں کوئی ضرر نہ پہنچے گا۔ میں تمھیں خوابِ غفلت سے بیدار نہ کروں گا۔ محض تمھاری خدمت کرنے کے صلہ میں کبھی کبھی تم میں سے کسی کا شکار کر لیا کروں گا اس ذرا سی تکلیف سے تم اپنے ملک کے تحفظ کے بار سے سبکدوش ہوجاؤگے۔ تمھیں انصاف کرو۔ میرا یہ مطالبہ انصاف سے بعید تو نہیں ہے کیونکہ گو میں آسمانی وجود ہوں پر مجھے بقائے حیات کے لیے خوراک کی ضرورت ہے۔

(۳)

لیکن تھوڑے ہی دنوں میں جیک کو ایک نئی فکر پیدا ہوئی۔ اس خطّہ میں کوئی میرا رقیب نہ آجائے، وہاں کے باشندوں سے اسے مدد کی کوئی اُمید نہ تھی۔ ملک داری کا سارا بار اپنے ہی قوتِ بازو پر تھا۔ اس کے لیل و نہار اب تشویش میں گزرنے لگے۔ جوں جوں دن گزرتے تھے۔ اس کا احتمال ضرور بڑھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ دو پتّے کے کھڑکنے پر چونک پڑتا اور اپنی صدائے مہیب سے سارے خطّے میں تلاطم برپا کردیتا۔ لقمۂ لطیف اور خواب شیریں کا مزہ جاتا رہا۔ کبھی کبھی مایوسی کے عالم میں جانوروں سے کہتا خدا کا شکر کرو کہ تم میرے منقاد ہو۔ ورنہ کسی دوسرے خونخوار فرمانروا کے مطیع ہوتے تو تمھاری زندگی

وبال ہوجاتی۔ میں تمھارا بہی خواہ ہوں۔ ہمیشہ تمھاری بہبود اور فلاح کی فکر میں سرگرم رہتا ہوں۔ کسی دوسرے علاقے کے جانور تمھاری حالت پر رشک کرتے۔ وادی کے جانور یہ سُن کر کہتے ہم جب تک زندہ رہیں گے۔ آپ کی اطاعت سے کبھی منحرف نہ ہوں گے۔

بالآخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ جیک کو ایک لمحہ کے لیے سکون نصیب نہ ہوتا۔ وہ ساری رات ندی کے کنارے اس حد سے اس حد تک چکر لگایا کرتا دوڑتے دوڑتے بے دم ہوجاتا۔ ہانپنے لگتا۔ مگر آرام لینے کی مہلت کہاں۔ اندیشہ ضرر بھوت کی طرح سر پر سوار رہتا تھا۔

مگر تعجب کی بات یہ تھی کہ یہ اضطراب اور انتشار اس کے نفس پر عنان کے بدلے مہمیز کا کام کرتا تھا۔ وہ اپنے ہم چشموں کو اپنے جاہ و حشم سے مرعوب کرنا چاہتا تھا چنانچہ جب کنوار کا مہینہ آیا تو شاہانِ سلف کی روش قدیم کے مطابق اس نے کوچہ عشق کو ہنگامۂ کارزار بنانے کا فیصلہ کیا شام کا وقت تھا وہ اپنے کس بل پر غرور سے اکڑتا ہوا دریا کے پار اُترا اور ایک حسینہ پر ڈورے ڈالنے لگا۔ مئے الفت سے سرشار ہوکر اپنے کو ایک لمحہ کے لیے بھول گیا اور اس حسینہ کے نقشِ قدم کو بوسے دیتا ہوا خود مصلحت سے آگے بڑھ گیا رات ہوگئی اور حسینہ اس کی طرف مخاطب نہ ہوئی۔ اس کی ترغیب اور تخویف ایک بھی کارگر نہ ہوئی۔

حسینہ اس کی دلآوری اور مردانگی کو کسوٹی پر کسے بغیر اسے مُنہ نہ لگانا چاہتی تھی۔ اس کے قد و قامت تن و توش پر اسے اعتبار نہ تھا۔ اسی ارادہ سے وہ اسے کوچوں اور گلیوں کی خاک چھنواتی بالآخر ایک قصاب کی دُکان پر پہنچی جہاں شب و روز حرص و حسد عشق و محبت کے معرکے ہوتے رہتے تھے۔ وہ اس علاقہ کے فرمانرواؤں کا جولانگاہ تھا اور روز پانچ نشۂ خودی کے متوالے ہر دم غِلّ و غش اینڈتے رہتے تھے۔ یہ جمگھٹ دیکھ کر ایک بار تقاضائے فطرت سے جیک کے پیروں میں لغزش آئی مگر اپنے شان و شکوہ اختیار و اقتدار کی یاد آتے ہی وہ سنبھل گیا۔ اس کے دل نے کہا میں ان استخواں ریزوں کے مقابلے میں قدم پیچھے ہٹا لوں! میں جو وادیٔ امن کا فرمانروا ہوں۔ سورماؤں نے بھی اس کا کس بل دیکھا۔ تھرا اُٹھے۔ وہ یکہ و تنہا ایک گروہ پر بھاری تھا۔ شیر کا سا سینہ چیتے کی سی آتشیں آنکھیں گینڈے کا سا گٹھا ہوا جسم کسی کی ہمت نہ پڑی کہ تنہا پیش قدمی کرسکے۔ مگر غیرت

بھی گوارا نہ کرتی تھی کہ ایک بیگانہ وجود اِتراتا ہوا ہمارے علاقہ میں گھس آئے اور یوں ہماری بے حرمتی کرکے زندہ و سلامت واپس جائے۔ سبھوں نے ایک دوسرے کی طرف نگاہِ تحریک سے دیکھا۔ اُٹھ بیٹھے غیظ و غضب کے چند الفاظ زبان سے نکالے اور تب یکبارگی جیک سے اُلجھ گئے۔ حسینہ نے بھی آئینِ محبت اور وفا کی پروا نہ کرکے حریفوں کا ساتھ دیا۔ جیک نے دل کو بہت مضبوط کیا مگر اس کا مُنہ خود بخود سکڑ گیا۔ دانت باہر نکل آئے اور دُم نیچے جھک گئی۔ وہ ایک قدم کے فاصلے پر کھڑا ہوگیا اور مدافعت کرنے لگا۔ ایک بار زور سے ڈپٹ کر اُن پر حملہ کرتا تو ساری جمعیت دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ غرض جیک نے اس معرکہ میں مردانگی کی خوب داد دی۔ اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر دیکھیں تو حسینہ کو اسے کم ہمت سمجھنے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ مگر جب شمع سوزاں پر صدہا پروانے گر پڑیں تو شمع کیوں کر روشن رہ سکتی ہے۔ جیک تنہا اتحادیوں کا مقابلہ نہ کرسکا۔ مگر وہاں سفید جھنڈی کی قدر کرنے والے رقیب نہ تھے۔ اُنھوں نے جیک پر اتنے وار کیے کہ محض اس کی سخت جانی اس کی ضامن ہوئی سارا جسم زخموں سے چھلنی ہوگیا جب بھی اس نے حریفوں کی آتشِ قہر کو فرو ہوتے نہ دیکھا تو توکل بخدا راہِ فرار اختیار کی اور پھر اسی ندی میں کود کر اپنی جان بچائی۔ پانی میں تیرتا تھا اور اپنی جسارت اور ہوس پر کفِ افسوس ملتا تھا۔ ہاں رہ رہ کر پیچھے کی طرف تاکتا جاتا تھا کہ کہیں دشمن تعاقب نہ کرتا آتا ہو۔

اس دن سے جیک کو اپنی قوت پر جو غرّہ تھا وہ غائب ہوگیا اسے معلوم ہوا کہ میں باوجود اس حشمت و ثروت کے بازاری غول کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ احتمال ضرر حد سے بڑھ گیا خواب و خور حرام ہوگیا۔ ہفتوں گزر جاتے اور طبیعت غذا کی جانب مائل نہ ہوتی۔ کبھی سوچتا انھیں جانوروں کو لڑنا سکھاؤں۔ مگر پھر خوف ہوتا کہیں یہ سب میری ہی تباہی پر آمادہ نہ ہوجائیں۔ اس نے ان سے مدد لینے کے مقابلے میں باہر کے دشمنوں کا مقابلہ زیادہ آسان سمجھا۔ ایک روز اسے ایسا وہم ہوا کہ وادی کے سب جانور کسی رقیب سے خط و کتابت کر رہے ہیں، اس نے عالمِ غیظ میں کئی گیدڑوں اور خرگوشوں کو کاٹ کھایا۔ مگر وہم نہ دُور ہوا۔ یہاں تک کہ اس کے کانوں میں حملہ آوروں کی یلغار کی آوازیں آنے لگیں وہ ندی کے کنارے آیا۔ اور اتنی دیر تک اور اتنے شور سے گرجا کہ اس کا گلا پھٹ گیا۔ شاید پھیپھڑے پر بھی کچھ صدمہ پہنچا۔ سارا دن چکر لگاتے گزر گیا۔ رات گزر گئی

پر یلغار کی صدا اس کے کانوں میں پیہم آتی رہی۔ دوسرے دن وادیٔ امن کے باشندے اس کے پاس گئے اور اس وہم کو دُور کرنے کی کوشش کی۔ آپ مطلق پریشان نہ ہوں بجز حضور کے ادھر صدیوں سے کوئی غنیم آنے کی جرأت نہ کرسکا۔ اب تو کوئی ادھر نگاہ بھی نہیں اُٹھاسکتا۔ کس کی مجال ہے جو حضور سے آمادۂ پُرخاش ہو اور پھر ایسا موقع آ بھی جائے تو ہم سب حضور کے قدموں پر نثار ہونے کو تیار ہیں مگر جیک کو ان باتوں سے تسکین نہ ہوئی۔ وہ لبِ دریا سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ہٹتا۔ اپنے دل میں خیال کیا۔ تمھارے نثار ہونے سے مجھے کیا فائدہ۔ میں کس کا شکار کروں گا۔ اس طرح ایک ہفتہ گزر گیا اور وہ غریب بے خواب و خور، بے آب و دانہ مجسّم فکر و ابتلا ندی کے کنارے گوئے چوگاں کی طرح اِدھر سے اُدھر دوڑتا رہا۔ پیر لڑکھڑانے لگے۔ آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔ آنتیں سکڑ گئیں۔ اعضا مفلوج سے ہوگئے۔ آٹھویں دن وہ نامراد کشتۂ ہوس فکر مند دل لیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ وادیٔ امن کے باشندے اس کی میت پر جمع ہوگئے۔ مگر رونے کے لیے نہیں۔ قیدِ اطاعت سے آزاد ہونے پر خوشی منانے کے لیے۔

یہ افسانہ پہلی بار 'مادھوری' کے اگست 1922 میں 'ادھیکار جنتا' کے عنوان سے شائع ہوا، ہندی میں 'مان سروور'6 اور اردو میں 'خاک پروانہ' میں شامل ہے۔

گپت دھن

بابو ہری داس کا اینٹوں کا پژاوا شہر سے ملا ہوا تھا۔ آس پاس کے دیہاتوں سے سینکڑوں استری پُرش لڑکے نتیہ (روز) آتے اور پژاوے سے اینٹیں سر پر اُٹھا کر اوپر قطاروں سے سجاتے۔ ایک آدمی پژاوے کے پاس ایک ٹوکری میں کوڑیاں لیے بیٹھا رہتا تھا۔ مزدوروں کو اینٹوں کی سنکھیا (تعداد) کے حساب میں کوڑیاں بانٹتا۔ اینٹیں جتنی ہی زیادہ ہوتیں اتنی ہی زیادہ کوڑیاں ملتیں۔ اس لوبھ سے بہت سے مزدور بوُتے کے باہر کام کرتے۔ وِردھوں(بوڑھوں) اور بالکوں کو اینٹوں کے بوجھ سے اکڑے ہوئے دیکھنا بہت کرونژاجنک (ترسناک) دِرشیہ تھا۔ کبھی کبھی بابو ہری داس سویم (خود) آکر کوڑی والے کے پاس بیٹھ جاتے اور اینٹ لاُدنے کو پروتساہت (حوصلہ افزائی) کرتے۔ یہ دِرشیہ تب اور بھی دارُون (خوف ناک) ہوجاتا تھا جب اینٹوں کی کوئی اسادھارن (غیر معمولی) آوشیکتا (ضرورت) آپڑتی۔ اسی میں مجوری دونی کر دی جاتی اور مجور لوگ اپنی سامرتھ سے دونی اینٹیں لے کر چلتے۔ ایک ایک پگ اُٹھانا کٹھن ہوجاتا۔ انھیں سر سے پیر تک پسینے میں ڈوبے پژاوے کی راکھ چڑھائے اینٹوں کا ایک پہاڑ سر پر رکھے بوجھ سے دبے دیکھ کر ایسا جان پڑتا تھا مانو لوبھ کا بھوت انھیں زمین پر پٹک کر ان کے سر پر سوار ہوگیا ہے۔ سب سے کرُون دَشا (ترسناک حالت) ایک چھوٹے لڑکے کی تھی جو سدَیو اپنی اوستھا (عمر) کے لڑکوں سے دُگنی اینٹ اُٹھاتا اور سارے دن اوشیرانت (مسلسل) پریشرم (محنت) اور دَھیریہ (حوصلے) کے ساتھ اپنے کام میں لگا رہتا۔ اس کے مکھ پر ایسی دینتا (غربت) چھائی رہتی تھی، اس کا شریر، اتنا کرش (دبلا پتلا) اور دُربل (کمزور) تھا کہ اسے دیکھ کر دَیا آجاتی تھی۔ اور لڑکے بیے کی دُکان سے گڑ لاکر کھاتے، کوئی سڑک پر جانے والے اکّوں اور ہوا گاڑیوں کی بہار دیکھتا اور کوئی ویکتیگت سنگرام (آپسی لڑائی) میں اپنی جیبھہ (زبان) اور باہو کے جوہر دکھاتا، لیکن اس غریب لڑکے کو اپنے کام سے کام تھا۔ اس میں لڑکپن کی نہ چنچلتا تھی نہ شرارت، نہ کھلاڑی پن، یہاں تک کہ اس کے ہونٹوں پر کبھی ہنسی بھی نہ آتی تھی۔ بابو ہری داس کو اس

کی دَشا (حالت) پر دَیا آتی۔ کبھی کبھی کوڑی والے کو اشارا کرتے کہ اسے حساب سے اُدِھک کوڑیاں دے دو۔ کبھی کبھی وہ اسے کچھ کھانے کو دے دیتے۔

ایک دن انھوں نے اس لڑکے کو بلاکر اپنے پاس بٹھایا اور اس کے سماچار (حال چال) پوچھنے لگے۔ گیات ہوا کہ اس کا گھر پاس ہی کے گاؤں میں ہے۔ گھر میں ایک وِردھا (بوڑھی) ماتا کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور وہ وِردھا بھی کسی پرانے روگ سے گرَست رہتی ہے۔ گھر کا سارا بھار اسی لڑکے کے سر تھا۔ کوئی اسے روٹیاں بنا کر دینے والا بھی نہ تھا۔ شام کو جاتا تو اپنے ہاتھوں سے روٹیاں بناتا اور اپنی ماں کو کھلاتا تھا۔ جاتی (ذات) کا ٹھاکر تھا۔ کسی سمئے اس کا کُل (خاندان) دھن دھانیہ سمپن (دھن دولت سے بھرا تلا) تھا۔ لین دین ہوتا تھا اور شکر کا کارخانہ چلتا تھا۔ کچھ زمین بھی تھی کنتو (لیکن) بھائیوں کی اَسپردھا (ہم سری) اور وِدّویش (حسد) نے اسے اتنی ہین اوستھا (بری حالت) کو پہنچا دیا کہ اب روٹیوں کے لالے تھے۔ لڑکے کا نام مگن سنگھ تھا۔

ہری داس نے پوچھا۔ گاؤں والے تمھاری کچھ مدد نہیں کرتے؟

مگن۔ واہ، ان کا بس چلے تو مجھے مار ڈالیں۔ سب سمجھتے ہیں کہ میرے گھر میں روپے گڑے ہیں۔

ہری داس نے اتسکتا (بے چینی) سے پوچھا۔ پُرانا گھرانا ہے، کچھ نہ کچھ تو ہوگا ہی۔ تمھاری ماں نے اس ویشے (سلسلے) میں تم سے کچھ نہیں کہا؟

مگن۔ بابو جی نہیں، ایک پیسہ بھی نہیں۔ روپے ہوتے تو اماں اتنی تکلیف کیوں اُٹھاتیں۔

(۲)

بابو ہری داس مگن سنگھ سے اتنے پرسنّ (خوش) ہوئے کہ مجوروں کی شرینی (درجے) سے اُٹھا کر اپنے نوکروں میں رکھ لیا۔ اسے کوڑیاں بانٹنے کا کام دیا اور پڑاوے میں منشی جی کو تاکید کردی کہ اسے کچھ پڑھنا لکھنا سکھائیے۔ اناتھ کے بھاگیہ جاگ اُٹھے۔

مگن سنگھ بڑا کرتویہ شیل (فرض شناس) اور چتر لڑکا تھا۔ اسے کبھی دیر نہ ہوتی، کبھی ناغہ نہ ہوتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس نے بابو صاحب کا وِشواس (اعتماد) پراپت کر لیا۔ لکھنے پڑھنے میں کُشل (ماہر) ہوگیا۔

برسات کے دن تھے۔ پڑاوے میں پانی بھرا ہوا تھا۔ کاروبار بند تھا۔ مگن سنگھ تین

دنوں سے غیر حاضر تھا۔ ہری داس کو چنتا ہوئی کیا بات ہے، کہیں بیمار تو نہیں ہوگیا، کوئی دُرگھٹنا تو نہیں ہوگئی؟ کئی آدمیوں سے پونچھ تاچھ کی، پر کچھ پتہ نہ چلا! چوتھے دن پوچھتے پوچھتے مگن سنگھ کے گھر پہنچے۔ گھر کیا تھا پُرانی سمر دھی (شان) کا دُھونس اَوشیش ماتر (باقی ماندہ کھنڈر کی طرح) تھا۔ ان کی آواز سنتے ہی مگن سنگھ باہر نکل آیا۔ ہری داس نے پوچھا۔ کئی دن سے آئے کیوں نہیں، ماتا کا کیا حال ہے؟

مگن سنگھ نے اَورُودھ کنٹھ (رودھی ہوئی آواز) سے اُتّر دیا۔ اماں آج کل بہت بیمار ہے، کہتی ہے کہ اب نہ بچوں گی۔ کئی بار آپ کو بلانے کے لیے مجھ سے کہہ چکی ہے، پر میں سنکوچ (جھجھک) کے مارے آپ کے پاس نہ آتا تھا۔ اب آپ سوبھاگیہ (قسمت) سے آگئے ہیں۔ تو ذرا چل کر اسے دیکھ لیجیے۔ اس کی لالسا (تمنا) بھی پوری ہوجائے۔

ہری داس بھیتر گئے۔ سارا گھر بھوتک نِسسارتا کا پریچایک (طبعی محرومیوں کا مظہر) تھا۔ سُرخی کنکڑ اینٹوں کے ڈھیر چاروں اُور پڑے تھے۔ وناش (تباہی) کا پرتیکش سَوروپ (واضح نمونہ) تھا۔ کیول دو کوٹھریاں گزر کرنے لائق تھیں۔ مگن سنگھ نے ایک کوٹھری کی اُور انھیں اشارے سے بتایا۔ ہری داس بھیتر گئے تو دیکھا کہ وردھا (بوڑھی) ایک سڑے ہوئے کاٹھ کے ٹکڑے پر پڑی کراہ رہی ہے۔

ان کی آہٹ پاتے ہی آنکھیں کھولیں اور انومان (قیاس) سے پہچان گئی، بولی۔ آپ آگئے، بڑی دَیا کی۔ آپ کے درشنوں (دیدار) کی بڑی ابھیلاشا (تمنا) تھی۔ میرے اناتھ بالک کے ناتھ (سرپرست) اب آپ ہی ہیں۔ جیسے آپ نے اب تک اس کی رَکشا (حفاظت) کی ہے وہ نگاہ اس پر سدَیو بنائے رکھیے گا۔ میری وِپتّی (مصیبت) کے دن پورے ہوگئے۔ اس مٹی کو پار لگا دیجیے گا۔ ایک دن گھر میں لکشمی کا واس (قیام) تھا۔ اِدِن (برے دن) آئے تو انھوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ پُرکھوں نے اسی دن کے لیے کچھ تھاتی (امانت) دھرتی ماتا کو سونپ دی تھی۔ اس کا بیجک بڑے یتن (کوشش) سے رکھا تھا، پر بہت دنوں سے اس کا کہیں پتہ نہ لگتا تھا۔ مگن کے پتا نے بہت کھوجا پر نہ پاسکے۔ نہیں تو ہماری دَشا اتنی ہین (بری) نہ ہوتی۔ آج تین دن ہوئے مجھے وہ بیجک آپ ہی آپ ردّی کاغذوں میں مل گیا۔ تب سے اسے چھپا کر رکھے ہوئے ہوں، مگن باہر ہے؟ میرے سرہانے جو صندوق رکھی ہے، اسی میں وہ بیجک ہے۔ اس میں سب باتیں لکھی ہیں۔ اسی سے ٹھکانے

ہے۔ آج ضلع کے سارے حاکم ان کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ آشچریہ (حیرت) نہیں کہ گورنر مہودے کو بھی اس کی سوچنا دی گئی ہو۔

پردھان۔ اور کچھ نہیں تو انھیں نیم کا پالن کرنے ہی کے لیے پرتگیا پتر پر ہستاکشر کردینا چاہیے تھا۔ کسی طرح انھیں یہاں بُلائیے اپنی بات تو رہ جائے۔

منتری۔ وہ بڑا آتما بھیمانی ہے۔ کبھی نہ آئے گا بلکہ ہم لوگوں کی اُور سے اتنا اَوِشواس دیکھ کر سمجھو ہے کہ پھر اس دَل میں ملنے کی چیشٹا کرنے لگے۔

پردھان۔ اچھی بات ہے، آپ کو ان پر اتنا وشواس ہوگیا ہے تو ان کی دوکان چھوڑ دیجیے۔ تب بھی میں یہی کہوں گا کہ آپ کو سویم ملنے کے بہانے سے اس پر نگاہ رکھنی ہوگی۔

منتری۔ آپ ناحق اتنا شک کرتے ہیں۔

نو بجے سیٹھ چندومل اپنی دوکان پر آئے تو وہاں ایک بھی والنٹیر نہ تھا۔ مکھ پر مسکراہٹ کی جھلک آئی۔ منیم سے بولے۔ کوڑی چت پڑی۔

منیم۔ معلوم تو ہوتا ہے۔ ایک مہاشے بھی نہیں آئے۔

چندومل۔ نہ آئے اور نہ آئیں گے۔ بازی اپنے ہاتھ رہی۔ کیسا داؤں کھیلا چاروں خانے چت۔

چندو۔ آپ بھی باتیں کرتے ہیں۔ انھیں دوست بناتے کتنی دیر لگتی ہے۔ کہیے، ابھی بلاکر جوتیاں سیدھی کرواؤں۔ ٹکے کے غلام ہیں، نہ کسی کے دوست نہ کسی کے دشمن۔ سچ کہیے کیسا چکما دیا ہے؟

منیم۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ چوم لیں۔ سانپ بھی مرا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔ مگر گانگریس والے بھی ٹوہ میں ہوں گے۔

چندومل۔ تو میں بھی تو موجود ہوں۔ وہ ڈال ڈال چلیں گے، تو میں پات پات چلوں گا۔ ولائتی کپڑے کی گانٹھ نکلوایے اور ویاپاریوں کو دینا شروع کیجیے۔ ایک اٹھوارے میں بیڑا پار ہے۔

یہ افسانہ ہندی ماہنامہ پربھا کے نومبر1922 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ مان سروور6میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

پورو سنسکار

سجّنوں کے حصّے میں بھوتِک (مادی) اُنتی (ترقی) کبھی بھول کر ہی آتی ہے۔ رام ٹہل ولاسی دُربوسنی چرترہین (بدکردار) آدمی تھے۔ پرسانسارک ویوہاروں (دنیاوی معاملات) میں چتُر، سود بیاج کے معاملے میں دَکش (مکمل) اور مقدمہ عدالت میں کُشل تھے۔ ان کا دھن بڑھتا تھا۔ سبھی ان کے اسامی تھے، اُدھر انھیں کے چھوٹے بھائی شیوٹہل سادھو بھکت دھرم پراین اور پروپکاری (نیک) جیو تھے ان کا دھن گھٹتا جاتا تھا۔ ان کے دوار پر دو چار اَتیتھی (مہمان) بنے رہتے تھے۔ بڑے بھائی کا سارے محلے پر دباؤ تھا۔ جتنے نیچ شیرنی (ذات) کے آدمی تھے، ان کا حکم پاتے ہی فوراً ان کا کام کرتے تھے۔ ان کے گھر کی مرمت بے گار میں ہوجاتی رِنی (قرضدار) کنجڑے ساگ، بھاجی بھینٹ میں دے جاتے ہیں۔ رِنی گوالا انھیں بازار بھاؤ سے ڈیوڑا دودھ دیتا۔ چھوٹے بھائی کا کسی پر رعب نہ تھا۔ سادھو سنت آتے اور اچھّا پورن (خواہش کے مطابق) بھوجن کرکے اپنی راہ لیتے۔ دوچار آدمیوں کو روپیہ ادھار دیئے بھی تو سود کے لالچ سے نہیں، بلکہ سنکٹ (مصیبت) سے چھُڑانے کے لیے کبھی زور دے کر تقاضہ نہ کرتے کہ کہیں انھیں دُکھ نہ ہو۔

اس طرح کئی سال گزر گئے یہاں تک کہ شیوٹہل کی ساری سمپتّی (جائداد) پَرمارتھ (اچھے کام) میں اُڑ گئی۔ روپیہ بھی بہت ڈوب گئے۔ اُدھر رام ٹہل نے نیا مکان بنوا لیا۔ سونے چاندی کی دُکان کھول لی۔ تھوڑی زمین بھی خرید لی اور کھیتی باڑی بھی کرنے لگے۔

شیوٹہل کو اب چنتا ہوئی۔ نرواہ کیسے ہوگا؟ دھن نہ تھا کہ کوئی روزگار کرتے۔ وہ بیوہارِک بدُھی بھی نہ تھی، جو بنا دھن کے بھی اپنی راہ نکال لیتی ہے۔ کسی سے رِن لینے کی ہمت نہ پڑتی تھی، روزگار میں گھاٹا ہوا تو دیں گے کہاں سے؟ کسی دوسرے آدمی کی نوکری بھی نہ کرسکتے تھے۔ کُل مریادہ بھنگ ہوتی تھی۔ دوچار مہینے تو جیوں تیوں کرکے کاٹے، اَنت (آخر) میں چاروں اُور سے نراش ہوکر بڑے بھائی کے پاس گئے اور کہا۔ بھیّا۔ میرے اور میرے پریوار کے پالن کا بھار آپ کے اوپر ہے۔ آپ کے سِوا اب کس کی شرن لوں۔

رام ٹہل نے کہا۔ اس کی کوئی چنتا نہیں۔ تم نے کوُکرم (بدکاموں) میں تو دھن اُڑایا نہیں۔ جو کچھ کیا، اس سے کُل کیرتی (شہرت) ہی پھیلی ہے۔ میں دھورت (مکار) ہوں، سنسار کو ٹھگنا جانتا ہوں۔ تم سیدھے سادھے آدمی ہو دوسروں نے تمھیں ٹھگ لیا۔ یہ تمھارا ہی گھر ہے۔ میں نے جو زمین لی ہے اس کی تحصیل وصول کرو، کھیتی باڑی کا کام سنبھالو۔ مہینے میں تمھیں جتنا خرچ پڑے مجھ سے لے جاؤ۔ ہاں ایک بات مجھ سے نہ ہوگی۔ میں سادھو سنتوں کا ست کار (خاطر) کرنے کو ایک پیسہ بھی نہ دوں گا، اور نہ تمھارے منہ سے اپنی نندا (برائی) سنوں گا۔

شیو ٹہل نے گدگد کنٹھ سے کہا۔ بھیّا مجھ سے اتنی بھول اوشئے (ضرور) ہوئی کہ میں سب سے آپ کی نندا کرتا رہا ہوں اُسے چھما کرو اب سے مجھے اپنی نندا کرتے سُنتا تو جو جی چاہے دنڈ دینا۔ ہاں آپ سے میری ایک وِنئے (التجا) ہے میں نے اب تک اچھا کیا یا بُرا، پر بھابی جی کو منع کر دینا کہ اس کے لیے میرا ترسکار (بے عزتی) نہ کریں۔
رام ٹہل۔ اگر وہ کبھی تمھیں طعنہ دیں گی تو میں ان کی جیبھ کھینچ لوں گا۔

(۲)

رام ٹہل کی زمین شہر سے دس بارہ کوس پر تھی۔ وہاں ایک کچّا مکان بھی تھا۔ بیل گاڑی کھیتی کی اَنیہ سامگریاں وہیں رہتی تھیں۔ شیو ٹہل نے اپنا گھر بھائی کو سونپا اور اپنے بال بچوں کو لے کر گاؤں چلے گئے۔ وہاں اُتساہ کے ساتھ کام کرنے لگے۔ نوکروں کے کام میں چوکسی کی۔ پریشرم کا پھل ملا پہلے ہی سال اپج ڈیوڑھی ہوگئی اور کھیتی کا خرچ آدھا رہ گیا۔

پر سُوبھاؤ کو کیسے بدلیں؟ پہلے کی طرح تو نہیں۔ پر اب بھی دو چار مورتیاں شیو ٹہل کی کیرتی (شہرت) سن کر آہی جاتی تھیں اور شیو ٹہل کو وِوَش (بے بس) ہو کر ان کی سیوا اور ستکار کرنا ہی پڑتا تھا۔ ہاں اپنے بھائی سے یہ بات چھپاتے تھے کہ کہیں وہ اُپرسَن (ناخوش) ہو کر جیوکا (روزی) کا یہ اَدھار (سہارا) بھی نہ چھین لیں۔ پھل یہ ہوتا کہ انھیں بھائی سے چھپا کر اناج، بھوسا، کھلی آدی کو بیچنا پڑتا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مزدوروں سے بھی کڑی محنت لیتے تھے اور خود بھی کڑی محنت کرتے۔ دھوپ ٹھنڈ، پانی بوندی کی بالکل پرواہ نہ کرتے تھے۔ مگر کبھی اتنا پریشرم تو کیا نہ تھا۔ شریر شکتی ہین (کمزور) ہونے لگا۔ بھوجن بھی روکھا سوکھا ملتا تھا۔ اس پر کوئی ٹھیک سمئے نہیں۔ کبھی دوپہر کو کھایا

کبھی تیسرے پہر کو۔ کبھی پیاس لگی تو تالاب کا پانی پی لیا۔ دُربلتا (کمزوری) روگ کا پُورَو (پہلا) روپ ہے۔ بیمار پڑ گئے۔ دیہات میں دوا دارو کا سمیدا نہ تھا۔ بھوجن میں بھی کُپتھیہ کرنا پڑتا تھا۔ روگ نے جڑ پکڑ لی۔ جور (بخار) نے پلیہا (تلی کی بیماری) کا روپ دھارن (اختیار) کیا۔ اور پلیہا نے چھ مہینے میں کام تمام کردیا۔

رام ٹہل نے یہ شوک سماچار سنا۔ تو انھیں بڑا دُکھ ہوا۔ ان تین ورشوں (سالوں) میں انھیں ایک پیسہ کا اناج نہیں لینا پڑا۔ گڑ، گھی، بھوسا، چارا، اپلے، اِیندھن سب گاؤں سے چلا آتا تھا۔ بہت روئے پچھتاوا ہوا کہ میں نے بھائی کی دوا درپن کی کوئی فکر نہیں کی، اپنے سوارتھ (غرض) کی چنتا میں اسے بھول گیا۔ لیکن میں کیا جانتا تھا کہ ملیریا کا جور پران گھاتک ہی ہوگا۔ نہیں تو یتھاشکتی (قوت کے مطابق) اَوشئے علاج کرتا۔ بھگوان کی یہی اِچھّا تھی پھر میرا کیا بس۔

(۳)

اب کوئی کھیتی کو سنبھالنے والا نہ تھا۔ ادھر رام ٹہل کو کھیتی کا مزہ مل گیا تھا۔ اُس پر ولاسِتا نے ان کا سواستھ (صحت) بھی نشٹ کر ڈالا تھا۔ اب وہ دیہات کی سوکش جل وایو (آب و ہوا) میں رہنا چاہتے تھے۔ نشچے کیا کہ خود ہی گاؤں میں جاکر کھیتی باڑی کروں۔ لڑکا جوان ہوگیا ہے۔ شہر کا لین دین اسے سونپا اور دیہات چلے آئے۔

یہاں ان کا سمئے اور چِت وشیش کر گایوں کی دیکھ بھال میں لگتا تھا۔ ان کے پاس ایک جمناپاری بڑی گائے تھی۔ اسے کئی سال ہوئے بڑے شوق سے خریدا تھا۔ دودھ خوب دیتی تھی اور سیدھی بھی اتنی کہ بچّہ بھی سینگ پکڑ لے، تو نہ بولتی۔ وہ ان دنوں گابھن تھی۔ اسے بہت پیار کرتے تھے، شام سویرے اس کی پیٹھ سہلاتے، اپنے ہاتھوں سے اَناج کھلاتے۔ کئی آدمی اس کے ڈیوڑھے دام دیتے تھے۔ پر رام ٹہل نے نہ بیچی۔ جب سمئے پر گئو نے بچّہ دیا، تو رام ٹہل نے دھوم دھام سے ان کا جنم اُتسو (پیدائش کی تقریب) منایا، کتنے ہی برہمنوں کو بھوجن کرایا۔ کئی دن تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ اس بچھڑے کا نام رکھا گیا "جواہر"۔ ایک جیوتشی سے اس کا جنم پتر بھی بنوایا گیا۔ اس کے اُنوسار بچھڑا بڑا ہونہار، بڑا بھاگیہ شالی، سوامی بھکت (مالک کا وفادار) نکلا۔ کیول چھٹے ورش اس پر ایک سنکٹ (پریشانی) کی شنکا تھی۔ اگر اسے ٹل گیا تو پھر جیون پرینت (زندگی بھر) سکھ سے رہے گا۔

بچھڑا شویت ورن (سفید نسل) تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک لال تلک تھا۔ آنکھیں کجری تھیں۔ سوروپ (شکل) کا اتینت (بہت) منوہر (دل نشیں) اور ہاتھ پاؤں کا سڈول تھا۔ دن بھر کلولے کیا کرتا تھا۔ رام ٹہل کا چت اسے چھلانگیں بھرتے دیکھ کر پرپھلت ہوجاتا تھا۔ وہ ان سے اتنا ہل مل گیا کہ ان کے پیچھے پیچھے کتّے کی بھانتی دوڑا کرتا تھا۔ جب وہ شام اور صبح کو اپنے کھاٹ پر بیٹھ کر اسامیوں سے بات چیت کرنے لگتے تو 'جواہر' ان کے پاس کھڑا ہوکر ان کے ہاتھ یا پاؤں کو چاٹتا تھا۔ وہ پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگتے۔ تو اس کی پونچھ کھڑی ہوجاتی اور آنکھیں ہردئے کے الّاس سے چمکنے لگتیں۔ رام ٹہل کو بھی اس سے اتنا اسنیہ (پیار) تھا کہ جب تک وہ ان کے سامنے چوکے میں نہ بیٹھا ہو بھوجن میں سواد (مزہ) نہ ملتا۔ وہ اسے بہُودھا (اکثر) گود میں چپٹا لیا کرتے۔ اس کے لیے چاندی کا ہار، ریشمی پھول، چاندی کی جھانجیں بنوائیں۔ ایک آدمی اسے نِتّ (روز) نہلاتا اور جھاڑتا پوچھتا رہتا تھا۔ جب کبھی وہ کسی کام سے دوسرے گاؤں میں چلے جاتے تو انھیں گھوڑے پر آتے دیکھ کر جواہر کلیلیں مارتا ہوا اس کے پاس پہنچ جاتا اور ان کے پیروں کو چاٹنے لگتا۔ پشو اور منُشیہ میں یہ پتا پُتر سا پریم دیکھ کر لوگ چکت ہوجاتے۔

(۴)

جواہر کی اوستھا (عمر) ڈھائی ورش کی ہوئی۔ رام ٹہل نے اُسے اپنی سواری کی بہلی کے لیے نکالنے کا نشچئے کیا۔ وہ اب بچھڑے سے بیل ہوگیا تھا۔ اس کا اونچا ڈیل، گٹھے ہوئے انگ، سُوڈِڑہ (سڈول) ماس پیشیاں، گردن کے اوپر اونچا ڈیل، چوڑی چھاتی اور مستانی چال تھی۔ ایسا درشنیئے بیل سارے علاقے میں نہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس کا باندھا ملا۔ ہر دیکھنے والے صاف کہتے تھے کہ جوڑ نہیں ملا۔ روپیہ صاحب نے بہت خرچ کیے ہیں پر کہاں 'جواہر' اور کہاں یہ۔ کہاں لیمپ اور کہاں دیپک۔

پر کوتوہل (عجیب) کی بات یہ تھی کہ جواہر کو کوئی گاڑی وان ہانکتا تو وہ آگے پیر نہ اُٹھاتا۔ گردن ہلا ہلا کر رہ جاتا۔ مگر جب رام ٹہل آپ پگہا ہاتھ میں لے لیتے اور ایک بار چمکار کر کہتے۔ چلو بیٹا، تو جواہر اُنمت ہوکر گاڑی کو لے اُڑتا۔ دو دو کوس تک بِنا رُکے ایک ہی سانس میں دوڑتا چلا جاتا، گھوڑے بھی اس کا مقابلہ نہ کرسکتے۔

ایک دن سندھیہ سمئے جب جواہر ناند میں کھلی اور بھوسا کھا رہا تھا اور رام ٹہل اس

کے پاس کھڑے اس کی مکھیاں اُڑا رہے تھے۔ ایک سادھو مہاتما آکر دوار پر کھڑے ہوگئے۔

رام ٹہل نے اَوِنئے پورن بھاؤ (بیزاری) سے کہا۔ یہاں کیا کھڑے ہو مہاراج، آگے آؤ۔

سادھو۔ کچھ نہیں بابا۔ اسی بیل کو دیکھ رہا ہوں۔ میں نے ایسا سندر بیل نہیں دیکھا۔

رام ٹہل۔ (دھیان دے کر) گھر ہی کا بچھڑا ہے۔

سادھو۔ ساکشات (حقیقتاً) یہ دیو روپ ہے۔

یہ کہہ کر مہاتما جی جواہر کے نکٹ (قریب) گئے اور اس کے کُھر چومنے لگے۔

رام ٹہل۔ آپ کا شبھاگمن (مبارک آمد) کہاں سے ہوا۔ آج یہیں وِشرام کیجیے تو بڑی دَیا ہوگی۔

سادھو۔ نہیں بابا چھما کرو۔ مجھے آوشیک کارِ (کام) سے ریل گاڑی پر سوار ہونا ہے۔ راتوں۔ رات چلا جاؤں گا۔ ٹھہرنے سے ولمب (تاخیر) ہوگا۔

رام ٹہل۔ تو پھر اور کبھی درشن ہوں گے؟

سادھو۔ ہاں تیرتھ یاترا سے تین ورش میں لوٹ کر ادھر سے پھر جانا ہوگا تب آپ کی اِچھّا ہوگی تو ٹھہر جاؤں گا۔ آپ بڑے بھاگیہ شالی پُروش ہیں کہ آپ کو ایسے دیوروپ نندی کی سیوا (خدمت) کا اوسر مل رہا ہے۔ انھیں پشو (جانور) نہ سمجھیے۔ یہ کوئی مہان آتما ہیں انھیں کشٹ (تکلیف) نہ دیجیے گا۔ انھیں کبھی پھول سے بھی نہ ماریے گا۔

یہ کہہ کر سادھو نے پھر 'جواہر' کے چرنوں پر سیس نوایا (قدموں پر سر جھکایا) اور چلے گئے۔

(۵)

اس دن سے جواہر کی اور بھی خاطر ہونے لگی۔ وہ پشو سے دیوتا ہوگیا۔ رام ٹہل اُسے پہلے رسوئی کے سب پدارتھ کھلا کر تب آپ بھوجن کرتے۔ پراتہ کال اُٹھ کر اس کے درشن کرتے۔ یہاں تک کہ وہ اُسے اپنی بہلی میں بھی نہ جوتنا چاہتے۔ لیکن اب ان کو کہیں جانا ہوتا اور بہلی باہر نکالی جاتی تو جواہر اس میں جُتنے کے لیے اتنا ادھیر اور اُتکنٹھت ہوجاتا، سر ہلا ہلا کر اس طرح اپنی اُتسکتا (بے تابی) پرکٹ کرتا کہ رام ٹہل کو وِوش ہوکر اُسے جوتنا پڑتا۔ دو ایک بار وہ دوسری جوڑی جوت کر چلے تو جواہر کو اتنا دُکھ ہوا کہ اس

نے دن بھر ناند میں منہ نہیں ڈالا۔ اس لیے وہ اب بنا کسی وشیش کارّیہ کے کہیں جاتے ہی نہ تھے۔

ان کی شردھا (عقیدت) دیکھ کر گاؤں کے انّیہ لوگوں نے بھی جواہر کو انّ (اناج) گراس دینا شروع کیا۔ صبح اس کے درشن کرنے تو پرایہ سبھی آجاتے تھے۔

اسی پرکار تین سال اور بیتے۔ جواہر کو چھٹا ورش لگا۔

رام ٹہل کو جیوتشی (نجومی) کی بات یاد تھی بھئے (ڈر) ہوا کہیں اس کی بھوشیہ وانی ستیہ نہ ہو۔ پشو چکتسا کی پستکیں منگا کر پڑھیں۔ پشو چکتسک (جانور کے ڈاکٹر) سے ملے اور کئی اوشدھیاں (دوائیں) لاکر رکھیں۔ جواہر کو ٹیکا لگوا دیا۔ کہیں نوکر اسے خراب چارہ یا گندہ پانی نہ کھلا پلا دیں۔ اس آشنکا سے وہ اپنے ہاتھوں سے اُسے کھولنے باندھنے لگے۔ پشو شالا کا فرش پکّا کرا دیا۔ جس میں کوئی کیڑا مکوڑا نہ چھپ سکے۔ اسے نِتہ (روز) پرتی خوب دھلواتے بھی تھے۔

سندھیا ہوگئی تھی رام ٹہل ناند کے پاس کھڑے جواہر کو کھلا رہے تھے کہ اتنے میں سہسا وہی سادھو مہاتما آنکلے۔ جنھوں نے آج سے تین ورش پہلے درشن دیے تھے رام ٹہل انھیں دیکھتے ہی پہچان گئے جاکر ڈنڈوت کی، کُشل سماچار پوچھے اور ان کے بھوجن کا پربندھ کرنے لگے۔ اتنے میں اکسمات (اچانک) جواہر نے زور سے ڈکار لی اور دھم سے بھومی پر گر پڑا۔ رام ٹہل دوڑے ہوئے اس کے پاس آئے۔ اس کی آنکھیں پتھرا رہی تھیں۔ پہلے ایک اسنیہ پورن (پیار بھری) درِشٹی (نظر) ان پر ڈالی اور چت ہوگیا۔

رام ٹہل گھبرائے ہوئے گھر سے دوائیں لانے دوڑے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کھڑے کھڑے اِسے ہو کیا گیا۔ جب وہ گھر میں سے دوائیاں لے کر نکلے تب جواہر کا اَنت ہوچکا تھا۔

رام ٹہل شاید اپنے چھوٹے بھائی کی مرتیو پر بھی اتنے شُوکاتُر نہ ہوئے تھے۔ وہ باربار لوگوں کے روکنے پر بھی دوڑ دوڑ کر جواہر کے شَو کے پاس جاتے اور اس سے لپٹ کر روتے۔

رات انھوں نے رو رو کر کاٹی۔ اس کی صورت آنکھوں سے نہ اُترتی تھی۔ رہ رہ کر ہردئے میں ایک ویدنا سی ہوتی اور شوک (غم) سے وَہول ہوجاتے۔

پراتہ کال نعش اُٹھائی گئی۔ کنتو رام ٹہل نے گاؤں کی پرتھا (رسم) کے انوسار اسے چماروں کے حوالے نہ کیا۔ یتھا وِدھی (طریقے کے مطابق) اس کی داہ کریا کی۔ سویم آگ دی۔ شاستر انوسار (شاستروں کے مطابق) سب سنسکار کیے۔ تیرہویں دن گاؤں کے برہمنوں کو بھوجن کرایا گیا۔ اُکت (مذکورہ) سادھو مہاتما کو انھوں نے اب تک نہیں جانے دیا تھا۔ ان کی شانتی دینے والی باتوں سے رام ٹہل کو بڑی سانتونا (تسلّی) ملتی تھی۔

(۲)

ایک دن رام ٹہل نے سادھو سے پوچھا۔ مہاتما جی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جواہر کو کون سا روگ ہوا تھا۔ جیوتشی جی نے اس کے جنم پتر میں لکھا تھا کہ اس کا چھٹا سال اچھا نہ ہوگا۔ لیکن میں نے اس طرح کسی جانور کو مرتے نہیں دیکھا۔ آپ تو یوگی ہیں یہ رہسیہ کچھ آپ کی سمجھ میں آتا ہے۔

سادھو۔ ہاں کچھ تھوڑا تھوڑا سمجھتا ہوں۔

رام ٹہل۔ کچھ مجھے بھی بتایئے چت کو دَھیریہ (صبر) نہیں آتا۔

سادھو۔ وہ اس جنم کا کوئی سچرتر، سادھو، بھکت، پروپکاری جیو تھا۔ اس نے آپ کی ساری سمپتّی (دولت) دھرم کاریوں (مذہبی کاموں) میں اُڑا دی تھی۔ آپ کے سمبندھیوں (رشتے داروں) میں ایسا کوئی سجّن تھا؟

رام ٹہل۔ ہاں مہاراج تھا۔

سادھو۔ اس نے تمھیں دھوکا دیا۔ تم سے وشواس گھات (بے اعتمادی) کیا۔ تم نے اسے اپنا کوئی کام سونپا تھا۔ وہ تمھاری آنکھ بچا کر تمھارے دھن سے سادھو جنوں کی سیوا ستکار کیا کرتا تھا۔

رام ٹہل۔ مجھے اس پر اتنا سندیہہ (شبہہ) نہیں ہوتا۔ وہ اتنا سرل پرکرتی (سلجھے مزاج) اتنا سُچرتر (اچھے کردار کا) منشیہ تھا کہ بے ایمانی کرنے کا کبھی دھیان بھی نہیں آسکتا تھا۔

سادھو۔ لیکن اس نے وشواس گھات (اعتبار کو توڑنا) اوشئے (ضرور) کیا۔ اپنے سوارتھ کے لیے نہیں۔ اَتیتھی ستکار (مہمان کی خاطر) کے لیے سہی پر تھا وہ وشواس گھاتی۔ (بددیانتی)؟

رام ٹہل۔ سمبھو (ممکن) ہے دُرتو ستھا (بُرے حالات) نے اُسے دھرم پتھ (مذہبی راستے) سے وچلت کردیا ہو۔

سادھو۔ ہاں یہی بات ہے اس پرانی کو سورگ میں استھان (جگہ) دینے کا نشچئے (فیصلہ) کیا گیا۔ پر اُسے وشواس گھات کا پرائشچت (کفارہ) کرنا اوشیک تھا۔ اس نے بے ایمانی سے تمھارا دھن ہر لیا تھا۔ اس کی پورتی کرنے کے لیے اُسے تمھارے یہاں پشو کا جنم دیا گیا۔ یہ نشچئے کر لیا گیا کہ چھ ورش میں پرائشچت پورا ہوجائے گا۔ اتنی اودھی (عرصہ) تک وہ تمھارے یہاں رہا اودھی پوری ہوگئی تیوں ہی (ویسے ہی) اس کی آتما نش پاپ اور نرلپت ہوکر نروان پد کو پراپت (حاصل) ہوگئی۔

مہاتما جی تو دوسرے دن وداع ہوگئے، لیکن رام ٹہل کے جیون میں اسی دن سے ایک بڑا پریورتن دیکھ پڑنے لگا۔ ان کی چت ورتی (قلب) بدل گئی۔ دَیا اور وویک (کرم) سے ہردئے پری پورن (لبریز) ہوگیا۔ وہ من میں سوچتے جب ایسے دھرماتما پرانی کو ذرا سے وشواس گھات کے لیے اتنا کٹھور دنڈ ملا تو مجھ جیسے کُکرمی (بدکاری) کی کیا دُرگتی ہوگی۔ یہ بات ان کے دھیان سے کبھی نہ اُترتی تھی۔

یہ افسانہ ہندی ماہنامہ مادھوری کے دسمبر 1922 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرو ور 8 میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

امتحان

نادر شاہ کی فوج نے دلی میں قتلِ عام کر رکھا ہے۔ راستوں میں خون کے دریا جاری ہیں۔ چاروں طرف قہر برپا ہے۔ بازار بند ہیں۔ اہلِ دلی مکانات کے دروازے بند کیے ہوئے زندگی کی خیریت منا رہے ہیں۔ کسی کی جان سلامت نہیں ہے۔ کہیں مکانوں میں آتش زدگی ہو رہی ہے۔ تو کہیں بازار لٹ رہا ہے۔ کوئی کسی کی فریاد نہیں سنتا۔ رئیسوں کی بیگمات محلوں سے نکالی جا رہی ہیں۔ اور اُن کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ ایرانی سپاہیوں کی تشنگیٔ خون کسی طرح نہیں بجھتی۔ انسانی نفس کی سنگ دلی، شقاوت اور بہیمیت اپنے غضب ناک ترین صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اِسی وقت نادر شاہ بادشاہی محل میں داخل ہوا۔

دِلی اُن دنوں عیش و عشرت کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ سجاوٹ اور تکلفات کے سامانوں سے رئیسوں کے محل پُر رہتے تھے۔ مستورات کو بناؤ سنگار کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔ مردوں کو عیش پروری کے سوا دوسری کوئی فکر نہ تھی۔ سیاست کی جگہ شعر و شاعری نے لے لی تھی۔ صوبجات سے دولت کھینچ کھینچ کر دلی آتی اور پانی کی طرح بہائی جاتی۔ حُسن فروشوں کی چاندی تھی۔ کہیں تیتروں کے جوڑ ہوتے تھے۔ کہیں بیٹروں اور بُلبلوں کی پالیاں ٹھنتی تھیں۔ تمام شہر خوابِ عشرت میں غرق تھا۔ نادر شاہ شاہی محل میں پہنچا تو وہاں کا سامان دیکھ کر اُس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُس کی پیدائش ایک غریب گھر میں ہوئی تھی۔ اُس کی تمام عمر میدانِ جنگ میں گزری تھی۔ نفس پروری کا اُسے چسکا نہ لگا تھا۔ کہاں میدانِ جنگ کی سختیاں اور کہاں مجلسِ نشاط! جدھر آنکھیں اُٹھتی تھیں اُدھر سے ہٹنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

شام ہوگئی تھی۔ نادر شاہ اپنے سرداروں کے ہمراہ محل کی سیر کرتا اور اپنی پسند کی چیزوں پر دست درازیاں کرتا، دیوانِ خاص میں آکر کارچوبی مسند پر بیٹھ گیا۔ سرداروں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اپنے سب ہتھیار کھول کر رکھ دیئے اور محل کے

داروغہ کو بُلا کر حکم دیا۔"میں شاہی بیگمات کا ناچ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم فوراً اُن کو نفیس پوشاک اور مرصع زیورات سے آراستہ و پیراستہ کر کے میرے سامنے لاؤ۔ خبردار ذرا بھی توقف نہ ہو۔ میں کوئی عذر یا انکار نہیں سُن سکتا۔"

(۲)

داروغہ نے یہ نادر شاہی حکم سُنا تو ہوش اُڑ گئے۔ وہ خواتین جن پر کبھی سورج تک کی نگاہ بھی نہ پڑی ہو، رقص تو درکنار کیوں کر اس محفل میں آئیں گی؟ شاہی بیگمات کی اس قدر بے حُرمتی کبھی نہ ہوئی تھی۔

اُف رے انسان بہ صورتِ شیطان! دِلّی کو خون سے رنگ کر بھی تجھے سیری نہ ہوئی۔ مگر نادرشاہ کے روبرو ایک لفظ مُنہ سے نکالنا گویا کہ موت کو بُلانا تھا۔ سر جُھکا کر آداب بجا لایا اور آکر محل سرا میں سب بیگمات کو نادرشاہی حکم سُنا دیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اطلاع بھی دے دی کہ ذرا بھی تامّل نہ ہو۔ نادر شاہ ذرا بھی عُذر یا حیلہ نہ سنے گا۔ شاہی خاندان پر ایسی مصیبت کبھی نہ پڑی تھی۔ مگر اس وقت فاتح بادشاہ کا حکم بسر و چشم بجا لانے کے سوا جانبری کی کوئی دوسری تدبیر نہ تھی۔

بیگمات نے جوں ہی یہ حکم سُنا اُن کی عقل زائل سی ہوگئی۔ محل سرا میں ماتم چھا گیا۔ ساری چہل پہل غائب ہوگئی۔ صدہا دلوں سے اُس ظالم کے لیے دعائے بد نکلنے لگی۔ کسی نے آسمان کی طرف نگاہِ التجا سے دیکھا۔ کسی نے خدا و رسول کو یاد کیا۔ مگر ایک بھی بیگم ایسی نہ تھی جس کی نگاہ کٹار یا تلوار کی طرف گئی ہو۔ اگرچہ ان میں سے متعدد بیگمات کی رگوں میں راجپوتنیوں کا خُون حرکت کر رہا تھا۔ مگر نفس پرستی نے "جوہار" کے پُرانے جوش کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ تن پروری خودداری کو تباہ کر دیتی ہے۔ آپس میں صلاح و مشورہ کر کے ننگ و ناموس کی حفاظت کے لیے کوئی طریقہ تجویز کرنے کی فرصت نہ تھی۔ ایک ایک لمحہ قسمت کا فیصلہ کر رہا تھا۔ نا اُمید ہو کر سبھی بیگمات نے اس ظالم کے سامنے جانے کا تہیہ کر لیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا جارہا تھا اور مصیبت زدہ دلوں پر خوشبو کی مالش کی جارہی تھی۔ کوئی بال گوندھواتی تھی۔ تو کوئی مانگوں میں موتی پروتی تھی۔ ایک بھی ایسے مصمم ارادہ کی بیوی نہ تھی۔ جو خدا پر یا اپنی ضد پر عدول حکمی کرنے کی ہمت کرتی۔

ایک گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ بیگمات پرے کے پرے زیورات سے جگمگاتی۔ اپنے مُنہ کی رونق سے بیلے اور گلاب کی کلیوں کو لجاتی ۔ خوشبو کی لپٹیں اُڑاتی۔ چھم چھم کرتی دیوانِ خاص میں آکر نادر شاہ کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

(۳)

نادر شاہ نے ایک بار کنکھیوں سے پریوں کے اس ہجوم کو دیکھا۔ اور تب مسند کے سہارے لیٹ گیا۔ اپنی تلوار اور کٹار سامنے رکھ دی۔ ایک آن میں اُس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اُس نے ایک انگڑائی لی۔ اور کروٹ بدلی ذرا دیر میں اُس کے خراٹوں کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ ایسا معلوم پڑنے لگا کہ گہری نیند سو گیا ہے۔ آدھ گھنٹہ تک وہ پڑا سوتا رہا۔ اور بیگمات جیوں کی تیوں سر جُھکائے دیوار کی تصویروں کی طرح کھڑی رہیں۔ ان میں دو ایک بیویاں جو ذرا بے خوف تھیں۔ اندرونِ نقاب سے نادر شاہ کو دیکھ بھی رہی تھیں۔ اور آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ کیسی غضب ناک صورت ہے۔ کتنی خونخوار آنکھیں ہیں! کتنا قوی ہیکل ہے! آدمی کیا ہے دیو ہے!

یکایک نادر شاہ کی آنکھیں کھلیں۔ پریوں کا ہجوم پیشتر کی طرح کھڑا تھا۔ اُسے جاگتے دیکھ کر بیگموں نے سر نیچے کر لیے اور بدن کو سمیٹ کر بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے سے مِل گئیں۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ اب یہ ظالم ناچنے گانے کو کہے گا۔ تب کیسے کیا ہوگا؟ خدا اس ظالم سے سمجھے! مگر ناچا تو نہ جائے گا۔ چاہے جان ہی کیوں نہ جائے۔ اب اس سے زیادہ ذلت برداشت نہ ہوسکے گی۔

دفعتاً نادرشاہ کرخت لہجہ میں بولا۔ اے خُدا کی بندیو! میں نے تمھارا امتحان لینے کے لیے بلایا تھا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمھاری نسبت میرا جو گمان تھا۔ وہ حرف بحرف سچ نکلا۔ جب کسی قوم کی عورتوں میں غیرت نہیں رہتی تو وہ قوم مُردہ ہوجاتی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم لوگوں میں ابھی کچھ غیرت باقی ہے یا نہیں۔ اسی لیے میں نے تمھیں یہاں بلایا تھا۔ میں تمھاری بے حُرمتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اتنا عیش کا بندہ نہیں ہوں ورنہ آج بھیڑوں کے گلتہ چَراتا ہوتا۔ نہ اس قدر ہوس پرست ہوں۔ ورنہ آج فارس میں سرود و ستار کی تانیں سنتا ہوتا۔ جس کا مزہ میں ہندوستانی گانے سے کہیں زیادہ اُٹھا سکتا ہوں۔ مجھے صرف تمھارا امتحان لینا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر سچا ملال ہو رہا ہے کہ تم میں

غیرت کا جوہر باقی نہیں رہا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم میرے حکم کو پیروں تلے کچل دیتیں؟ جب تم یہاں آگئیں تب بھی میں نے تمھیں ایک موقع اور دیا کہ میں نے نیند کا بہانہ کیا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم میں سے کوئی خدا کی بندی اس کٹار کو اُٹھا کر میرے جگر میں چُبھا دیتی؟ میں کلام پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی کو کٹار پر ہاتھ رکھتے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی۔ میں ان نازک ہاتھوں کے سامنے گردن جھکا دیتا۔ پر افسوس ہے کہ آج تیموری خاندان کی ایک بیٹی بھی یہاں ایسی نہ نکلی جو اپنی حرمت بگاڑنے والے پر ہاتھ اُٹھاتی! اب یہ سلطنت زندہ نہیں رہ سکتی! اس کی ہستی کے دن گنے ہوئے ہیں۔ اس کا نشان بہت جلد دنیا سے نیست و نابُود ہوجائے گا۔ تم لوگ جاؤ اور اگر ہوسکے تو اب بھی سلطنت کو بچاؤ۔ ورنہ اسی طرح ہوس کی غلامی کرتے ہوئے دُنیا سے رخصت ہوجاؤ۔

یہ افسانہ پہلی بار چاند کے جنوری 1923 کے شمارے میں شائع ہوا عنوان تھا پریکشا۔ اردو میں پریم چالیسی اور ہندی میں مان سرودر3 میں شامل ہے۔

وَیر کا اَنت

رامیشور رائے نے اپنے بڑے بھائی کے شو (میت) کو کھاٹ سے نیچے اُتارتے ہوئے بھائی سے بولے۔ تمھارے پاس کچھ روپے ہوں تو لاؤ، داہ کریا کی فکر کریں، میں بالکل خالی ہوں۔

چھوٹے بھائی کا نام وشویشور راؤ تھا۔ وہ ایک زمیندار کے کارندے تھے، آمدنی اچھی تھی۔ بولے، آدھے روپے مجھ سے لے لو آدھے تم نکالو۔

رامیشور۔ میرے پاس روپے نہیں ہیں۔

وشویشور۔ تو پھر ان کے حصّے کا کھیت رہن رکھ دو۔

رامیشور۔ تو جاؤ کوئی مہاجن ٹھیک کرو۔ دیر نہ لگے۔ وشویشور نے اپنے ایک متر سے کچھ روپے اُدھار لیے، اس وقت کا کام چلا۔ پیچھے پھر کچھ روپے لیے، کھیت کی لکھا پڑھی کردی۔ کُل پانچ بیگھے زمین تھی۔ ۳۰۰ روپے ملے۔ گاؤں کے لوگوں کا انومان ہے کہ کریا کرم میں مشکل سے ۱۰۰ روپے اُٹھے ہوں گے، پر وشویشور رائے نے شوڑشی (سولھویں) کے دن ۳۰۱ روپے کا لیکھا بھائی کے سامنے رکھ دیا۔ رامیشور رائے نے چکت ہوکر پوچھا۔ سب روپے اُٹھ گئے۔

وشویشور۔ کیا میں اتنا نیچ ہوں کہ کرنی کے روپے بھی کچھ اُٹھا رکھوں گا۔ کس کو یہ دھن پچے گا۔

رامیشور۔ نہیں، میں تمھیں بے ایمان نہیں بناتا، خالی پوچھتا تھا۔

وشویشور۔ کچھ شک ہو تو جس بنیے سے چیزیں لی گئی ہیں، اس سے پوچھ لو۔

(۲)

سال بھر بعد ایک دن وشویشور رائے نے بھائی سے کہا۔ روپے ہوں تو لاؤ، کھیت چھڑا لیں۔

رامیشور۔ میرے پاس روپے کہاں سے آئیں۔ گھر کا حال تم سے چھپا تھوڑے ہی ہے۔

وشویشور۔ تو میں سب روپے دے کر زمین چھڑائے لیتا ہوں۔ جب تمھارے پاس روپے ہوں، آدھے دے کر اپنی آدھی زمین مجھ سے لے لینا۔

رامیشور۔ اچھی بات ہے، چھڑا لو۔

۳۰ سال گزر گئے۔ وشویشور رائے زمین کو بھوگتے رہے، اسے کھاد، گوبر سے خوب سجایا۔ انھوں نے نشچے (فیصلہ) کر لیا تھا کہ یہ زمین نہ چھوڑوں گا۔ میرا تو اس پر موروثی حق ہو گیا۔ عدالت سے بھی کوئی نہیں لے سکتا۔ رامیشور رائے نے کئی بار یتن (کوشش) کیا کہ روپے دے کر اپنا حصہ لے لیں، پر ۳۰۰ روپے میں کبھی ۱۵۰ روپے جمع نہ کر سکے۔

مگر رامیشور رائے کا لڑکا جاگیشور کچھ سنبھل گیا۔ وہ گاڑی لادنے کا کام کرنے لگا تھا اور اس کام میں اُسے اچھا نفع بھی ہوتا تھا۔ اسے اپنے حصے کی رات دن چنتا رہتی تھی۔ انت میں اس نے رات دن شرم (محنت) کر کے یتھیشٹ دھن (خاطر خواہ پیسہ) بٹور لیا اور ایک دن چچا سے بولا۔ کاکا، اپنے روپے لے لیجیے۔ میں اپنا نام بڑھوا لوں۔

وشویشور۔ اپنے باپ کے تمھیں چتر بیٹے نہیں ہو۔ اتنے دنوں تک کان نہ ہوئے، جب میں نے سونا بنا لیا تب حصے بانٹے چلے ہو؟ تم سے مانگنے تو نہیں گیا تھا۔

وشویشور۔ تو اب زمین نہیں ملے گی۔

رامیشور۔ بھائی کا حق مار کر کوئی سکھی نہیں رہتا۔

وشویشور۔ زمین ہماری ہے۔ بھائی کی نہیں۔

جاگیشور۔ تو آپ سیدھے نہ دیجیے گا۔

وشویشور۔ نہ سیدھے دوں گا۔ نہ ٹیڑھے سے دوں گا۔ عدالت کرو۔

جاگیشور۔ عدالت کرنے کی مجھ میں سامرتھیہ (طاقت) نہیں ہے، پر اتنا کہے دیتا ہوں کہ زمین چاہے مجھے نہ ملے پر آپ کے پاس نہ رہے گی۔

وشویشور۔ یہ دھمکی جاکر کسی اور کو دو۔

جاگیشور۔ پھر یہ نہ کہیے گا کہ بھائی ہو کر بیری ہو گیا۔

وشویشور۔ ایک ہزار گانٹھ میں رکھ کر تب جو کچھ جی میں آئے کرنا۔

جاگیشور۔ میں غریب آدمی ہزار روپے کہاں سے لاؤں گا، پر کبھی کبھی بھگوان دینوں (غریبوں) پر دیالو (کرم فرما) ہوجاتے ہیں۔

وشویشور۔ میں اس ڈر سے بل نہیں کھود رہا ہوں۔

رامیشور رائے تو چپ ہی رہا جاگیشور اتنا چھما شیل نہ تھا۔ وکیل سے بات چیت کی۔ وہ اب آدھی پر نہیں، پوری زمین پر دانت لگائے ہوئے تھا۔

مرت (مرحوم) سدھیشوری رائے کے ایک لڑکی تاپیشوری تھی۔ اپنے جیون کال میں وہ اس کا وواہ کرچکے تھے۔ اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا کہ باپ نے کیا چھوڑا اور کس نے لیا۔ کریا کرم (آخری رسومات) اچھی طرح ہوگیا، وہ اسی میں خوش تھی۔ شوڑشی (سولہویں) میں آئی تھی۔ پھر سسرال چلی گئی۔ ۳۰ ورش ہوگئے، نہ کسی نے بلایا، نہ وہ میکے آئی۔ سسرال کی دشا بھی اچھی نہ تھی۔ پتی کا دیہانت ہوچکا تھا۔ لڑکے بھی الپ ویتن (کم تنخواہ) پر نوکر تھے۔ جاگیشور نے اپنی پھوپی کو اُبھارنا شروع کیا۔ وہ اسی کو مدعی بنانا چاہتا تھا۔

تاپیشوری نے کہا۔ بیٹا، مجھے بھگوان نے جو دیا ہے، اسی میں مگن ہوں۔ مجھے جگہ زمین نہیں چاہیے۔ میرے پاس عدالت کرنے کو دھن نہیں ہے۔

جاگیشور۔ روپے میں لاؤں گا تم خالی دعویٰ کردو۔

تاپیشوری۔ بھیا تمھیں کھڑا کر کسی کام کا نہ رکھیں گے۔

جاگیشور۔ یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ جائیداد لے کر مزے اڑاویں اور ہم منہ تاکنے۔ میں عدالت کا خرچ دے دوں گا۔ اس زمین کے پیچھے بک جاؤں گا پر ان کا گلا نہ چھوڑوں گا۔

تاپیشوری۔ اگر زمین مل بھی گئی تو تم اپنے روپیوں کے عوض میں لے لوگے، میرے ہاتھ کیا لگے گا؟ میں بھائی سے کیوں بُری بنوں؟

جاگیشور۔ زمین آپ لے لیجیے گا، میں کیول چچا صاحب کا گھمنڈ توڑنا چاہتا ہوں۔

تاپیشوری۔ اچھا جاؤ، میری طرف سے دعویٰ کردو۔

جاگیشور نے سوچا، جب چچا صاحب کی مٹھی سے زمین نکل جائے گی تب میں دس پانچ روپے سال پر ان سے لے لوں گا۔ انھیں ابھی کوڑی نہیں ملتی۔ جو کچھ ملے گا، اسی کو

بہت سمجھے گی۔ دوسرے دن دعویٰ کردیا۔ منصف کے اجلاس میں مقدمہ پیش ہوا۔ وشویشور رائے نے سِدھ (ثابت) کیا کہ تاپیشوری شدھیشور کی کنیا ہی نہیں ہے۔

گاؤں کے آدمیوں پر وشویشور کا دباؤ تھا۔ سب لوگ اس سے روپے پیسے ادھار لے جاتے تھے۔ معاملے مقدمے میں ان سے صلاح لیتے۔ سب نے عدالت میں بیان کیا کہ ہم لوگوں نے کبھی تپیشوری کو نہیں دیکھا سدھیشور کے کوئی لڑکی ہی نہ تھی۔ جاگیشور نے بڑے بڑے وکیلوں سے پیروی کرائی، بہت دھن خرچ کیا لیکن منصف نے اس کے وِرودھ فیصلہ سنایا۔ بے چارا ہتاش ہوگیا۔ وشویشور کی عدالت میں سب سے جان پہچان تھی۔ جاگیشور کو جس کام کے لیے مٹھیوں روپے خرچ کرنے پڑتے تھے، وہ وشویشور مروت میں کرا لیتا۔

جاگیشور نے اپیل کرنے کا نشچئے کیا۔ روپے نہ تھے، گاڑی بیل بیچے۔ اپیل ہوئی۔ مہینوں مقدمہ چلا۔ بے چارا صبح سے شام کچہری کے عملوں اور وکیلوں کی خوشامد کیا کرتا، روپے بھی اُٹھ گئے، مہاجنوں سے رِڑ (قرض) لیا بارے اب کی اس کی ڈگری ہوگئی۔ پانچ سو کا بوجھ سر پر ہوگیا تھا، پر اب جیت نے آنسو پونچھ دیے۔

وشویشور نے ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ جاگیشور کو اب کہیں سے روپے نہ ملے۔ وِوش (مجبور) ہوکر اپنے حصّے کی زمین رہن رکھی۔ پھر گھر بیچنے کی نوبت آئی۔ یہاں تک کہ استریوں کے گہنے بھی بک گئے۔ انت میں ہائی کورٹ سے بھی اس کی جیت ہوگئی۔ آنند اُتسو (جشن مسرت) سے بچی کھچی پونجی بھی نکل گئی۔ ایک ہزار پر پانی پھر گیا۔ ہاں سنتوش (اطمینان) یہی تھا کہ پانچوں بیگھے مل گئے۔ تاپیشوری کیا اتنی نردئی ہوجائے گی کہ تھالی میرے سامنے سے کھینچ لے گی۔

لیکن کھیتوں پر اپنا نام چڑھتے ہی تاپیشوری کی نیت بدلی۔ اس نے ایک دن گاؤں میں آکر پوچھ تانچھ کی تو معلوم ہوا کہ پانچوں بیگھے ۱۰۰ روپے میں اُٹھ سکتے ہیں۔ لگان کیول ۲۵ روپے تھا۔ ۷۵ روپے سال کا نفع تھا۔ اس رقم نے اسے وِچلت کردیا۔ اس نے آسامیوں کو بلاکر ان کے ساتھ بندوبست کردیا۔ جاگیشور رائے ہاتھ ملتا رہ گیا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ بولا۔ پھوپھی جی، آپ نے زمین تو دوسروں کو دے دی۔ اب میں کہاں جاؤں۔

تاپیشوری۔ بیٹا، پہلے اپنے گھر میں دیا جلا کر تب مسجد میں جلاتے ہیں۔ اتنی جگہ مل گئی، تو

موقع سے ناطہ ہوگیا نہیں تو کون پوچھتا۔

جاگیشور۔ میں جو اُجڑ گیا؟

تاپیشوری۔ جس لگان پر لوگ لے رہے ہیں، اس میں دو چار کم کرکے تم ہی کیوں نہیں لے لیتے؟

تاپیشوری دو چار دن میں وداع ہوگئی۔ رامیشور رائے پر وجرپات سا ہوگیا۔ بڑھاپے میں مزدوری کرنی پڑی مان مریادا سے ہاتھ دھویا۔ روٹیوں کے لالے پڑگئے۔ باپ بیٹے دونوں پراتا کال (صبح) سے سندھیا (شام) تک مزدوری کرتے، تب کہیں آگ جلتی۔ دونوں میں بہودھا (اکثر) تکرار ہوجاتی۔ رامیشور سارا اپرادھ (الزام) بیٹے کے سر رکھتا۔ جاگیشور کہتا آپ نے مجھے روکا ہوتا تو میں کیوں اس وپتی (مصیبت) میں پھنستا۔ ادھر وشویشور رائے نے مہاجنوں کو اُکسا دیا۔ سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ بے چارے نرآدھار (بے سہارا) ہوگئے۔ زمین نکل گئی، گھر نیلام ہوگیا، دس بیس پیڑ تھے، وے بھی نیلام ہوگئے۔ چوبے جی دوبے نہ بنے، دُردُر ہوگئے۔ اس پر وشویشور رائے کے طعنے اور بھی غضب ڈھاتے۔ یہ وپتی (مصیبت) کا سب سے نوک دار کانٹا تھا۔ آتنک (دہشت) کا سب سے نردے آگھات تھا۔

دو سال تک اس دکھی پریوار نے جتنی مصیبتیں جھیلیں، یہ انھیں کا دل جانتا ہے۔ کبھی پیٹ بھر بھوجن کھانا نہ ملا۔ ہاں، اتنی آن تھی کہ نیت نہیں بدلی۔ دِردرتا نے سب کچھ کیا، پر آتما کا پتن (تنزل) نہ کرسکتی کُل مریادا میں آتم رکھشا کی بڑی شکتی ہوتی ہے۔

ایک دن سندھیا سے دونوں آدمی بیٹھے آگ تاپ رہے تھے کہ سہسا (دفعتاً) ایک آدمی نے آکر کہا۔ ٹھاکر چلو، وشویشور رائے تمھیں بلاتے ہیں۔

رامیشور نے اداسین بھاؤ سے کہا۔ مجھے کیوں بلائیں گے؟ میں ان کا کون ہوتا ہوں؟ کیا کوئی اور اپدرو (فساد) کھڑا کرنا چاہتے ہیں؟

اتنے میں دوسرا آدمی دوڑا آکر بولا۔ ٹھاکر جلدی چلو، وشویشور رائے کی دشا اچھی نہیں ہے۔ وشویشور رائے کو ادھر کئی دنوں سے کھانسی بخار کی شکایت تھی، لیکن شتروں کے وِشئے میں ہمیں کسی انشٹھ (نقصان) کی شنکا (شک) نہیں ہوتی۔ رامیشور اور جاگیشور کبھی کشل سماچار پوچھنے بھی نہ گئے۔ کہتے، انھیں کیا ہوا ہے۔ امیروں کو دھن کا روگ ہوتا

ہے۔ جب آرام کرنے کو جی چاہا، پلنگ پر لیٹے رہے، دودھ میں سابودانہ اُبال کر مشری ملا کر کھایا اور پھر اُٹھ بیٹھے۔ وشویشور رائے کی دشا اچھی نہیں ہے۔ یہ سن کر بھی دونوں جگہ سے نہ ہلے۔ رامیشور نے کہا۔ دشا کو کیا ہوا ہے۔ آرام سے پڑے باتیں تو کر رہے ہیں۔

جاگیشور۔ کسی وید حکیم کو بُلانے بھیجنا چاہتے ہوں گے۔ شاید بخار تیز ہوگیا ہو۔

رامیشور۔ یہاں کسے اتنی فرصت ہے۔ سارا گاؤں تو ان کا ہیتو ہے، جسے چاہے بھیج دیں۔

جاگیشور۔ ہرج ہی کیا ہے۔ ذرا جاکر سن آؤں؟

رامیشور۔ جاکر تھوڑے اپلے بٹور لاؤ، چولہا جلے، پھر جانا۔ ٹھکر سوہاتی (خوشامد) کرنی آتی تو آج یہ دشا نہ ہوتی۔

جاگیشور نے ٹوکری اُٹھائی اور باہر کی طرف چلا کہ اتنے میں وشویشور رائے کے گھر سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس نے ٹوکری پھینک دی اور دوڑا ہوا چاچا کے گھر میں جا پہنچا۔ دیکھا تو انھیں لوگ چارپائی سے نیچے اُتار رہے تھے۔ جاگیشور کو ایسا جان پڑا، میرے منہ میں کالک لگی ہوئی ہے۔ وہ آنگن سے دالان میں چلا آیا اور دیوار سے منہ چھپا کر رونے لگا۔ یوا اوستھا (نوجوانی) آویش مے (پُرجوش) ہوتی ہے، کرودھ (غصّے) سے آگ ہوجاتی ہے تو کرونا (محبت) سے پانی بھی ہوجاتی ہے۔

(۳)

وشویشور رائے کے تین بیٹیاں تھیں۔ ان کے وِواہ (بیاہ) ہوچکے تھے۔ تین پُتر تھے، وے ابھی چھوٹے تھے۔ سب سے بڑے کی عمر دس ورش سے ادھک نہ تھی۔ ماتا جی جیوِت (زندہ) تھیں۔ کھانے والے تو چار تھے، کمانے والا کوئی نہ تھا۔ دیہات میں جس کے گھر میں دونوں جون چولہے جلے، وہ دھنی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے دھن کے انومان (اندازے) میں بھی اتیکتی (مبالغے) سے کام لیا جاتا ہے۔ لوگوں کا وچار تھا کہ وشویشور رائے نے ہزاروں روپے جمع کرلیے ہیں، پر وہاں واستو (حقیقت) میں کچھ نہ تھا۔ آمدنی پر سب کی نگاہ رہتی ہے خرچ کو کوئی نہیں دیکھتا۔ انھوں نے لڑکیوں کے وواہ خوب دل کھول کر کیے تھے۔ بھوجن وستر میں مہمانوں اور ناطے داروں کے آدرستکار (مہمان نوازی) میں ان کی ساری آمدنی غائب ہوجاتی تھی۔ اگر گاؤں میں اپنا رعب جمانے کے لیے دو چار سو روپے کا لین

دین کر لیا تھا، تو کئی مہاجنوں کا قرض بھی تھا، یہاں تک کہ سال بھر تک تو وِدھوا نے جیوں تیوں بچوں کا بھرن پوشن کیا۔ گہنے بیچ کر کام چلاتی رہی۔

پر جب وہ آدھار بھی نہ رہا تب کشٹ ہونے لگا۔ نشچئے کیا کہ تینوں لڑکوں کو تینوں کنیاؤں کے پاس بھیج دوں۔ رہی اپنی جان اس کی کیا چنتا۔ تیسرے دن بھی پاؤ بھر آٹا مل جائے گا تو وہ کٹ جائے گا لڑکیوں نے پہلے تو بھائیوں کو پریم سے رکھا، کنتو (لیکن) تین مہینے سے زیادہ کوئی نہ رکھ سکی۔ ان کے گھر والے چڑتے تھے اور اناتھوں کو مارتے تھے۔ لاچار ہو ماتا نے لڑکوں کو بلا لیا۔

چھوٹے چھوٹے لڑکے دن دن بھر بھوکے رہ جاتے۔ کسی کو کچھ کھاتے دیکھتے تو گھر میں جاکر ماں سے مانگتے۔ پھر ماں سے مانگنا چھوڑ دیا۔ کھانے والوں ہی کے سامنے جاکر کھڑے ہوجاتے اور چھودھت بتروں (بھوکی آنکھوں) سے دیکھتے۔ کوئی تو مٹھی بھر چینا نکال کر دے دیتا، پر پرایہ (عام طور سے) لوگ دُتکار دیتے تھے۔

جاڑوں کے دن تھے۔ کھیتوں میں مٹر کی پھلیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک دن تینوں لڑکے کھیت میں گھس کر مٹر اکھیڑنے لگے۔ کسان نے دیکھ لیا، دیاوان (رحم دل) آدمی تھا۔ خود ایک بوجھا مٹر اُکھاڑ کر وشویشور رائے کے گھر میں لایا اور ٹھکرائن سے بولا۔ کاکی لڑکوں کو ڈانٹ دو کسی کے کھیت میں نہ جایا کریں۔ جاگیشور رائے اسی سمے اپنے دوار پر بیٹھ کر چلم پی رہا تھا، کسان کو مٹر لاتے دیکھا۔ تینوں بالک پلّو کی طرح پیچھے پیچھے دوڑے چلے آتے تھے۔ اس کی آنکھیں سنجل (پُر آب) ہوگئیں۔ گھر میں جاکر پتا سے بولا۔ چاچی کے پاس اب کچھ نہیں رہا، لڑکے بھوکوں مر رہے ہیں۔

رامیشور۔ تم تریا چرتر نہیں جانتے۔ یہ سب دکھاوا ہے۔ جنم بھر کی کمائی کہاں اُڑ گئی؟

جاگیشور۔ اپنا قابو چلتے ہوئے کوئی لڑکوں کو بھوکوں نہیں مار سکتا۔

رامیشور۔ تم کیا جانو۔ بڑی چتر عورت ہے۔

جاگیشور۔ لوگ ہمیں لوگوں کو ہنستے ہوں گے۔

رامیشور۔ ہنسی کی لاج ہے تو جاکر چھانہہ (سرپرستی) کرلو، کھلاؤ پلاؤ۔ ہے دم!

جاگیشور۔ نہ بھر پیٹ کھائیں گے، آدھے ہی پیٹ سہی۔ بدنامی تو نہ ہوگی۔ چاچا سے لڑائی

تھی۔ لڑکوں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟

رامیشور۔ وہ چڑیل تو ابھی جیتی ہے نا؟

جاگیشور چلا آیا۔ اس کے من میں کئی بار یہ بات آئی تھی کہ چچی کی کچھ سہایتا دیا کروں، پر ان کی جلی کٹی باتوں سے ڈرتا تھا۔ آج سے اس نے ایک نیا ڈھنگ نکالا ہے۔ لڑکوں کو کھیلتے دیکھتا تو بلا لیتا، کچھ کھانے کو دے دیتا۔ مجوروں (مزدوروں) کو دوپہر چھٹی ملتی ہے۔ اب وہ اوکاش (چھٹی) کے سمے کام کرکے مجوری کے پیسے کچھ زیادہ پاجاتا۔ گھر چلتے سمے کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز لیتا آتا اور اپنی گھر والی کی آنکھ بچا کر ان اناتھوں کو دے دیتا۔ دھیرے دھیرے لڑکے اس سے ہل مل گئے کہ اسے دیکھتے ہی بھیا بھیا کہہ کر دوڑتے دن بھر اس کی راہ دیکھا کرتے۔ پہلے ماتا ڈرتی تھی کہ کہیں میرے لڑکوں کو بہلا کر یہ مہاشے پُرانی عداوت تو نہیں نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ لڑکوں کو جاگیشور کے پاس جانے اور اس سے کچھ لے کر کھانے سے روکتی، پر لڑکے شترو (دشمن) اور متر(دوست) کو بوڑھوں سے زیادہ پہنچانتے ہیں۔ لڑکے ماں کے منع کرنے کی پرواہ نہ کرتے یہاں تک شنیہ شنیہ ماتا کو بھی جاگیشور کی سہردیتا (نرم دلی) پر وشواس آگیا۔

ایک دن رامیشور نے بیٹے سے کہا۔ تمھارے پاس روپے بڑھ گئے ہیں، تو چار پیسے جمع کیوں نہیں کرتا۔ لٹاتے کیوں ہو؟

جاگیشور۔ میں تو ایک ایک کوڑی کی کفایت کرتا ہوں۔

رامیشور۔ جنھیں اپنا سمجھ رہے ہو وہ ایک دن تمھارے شترو ہوں گے۔

جاگیشور۔ آدمی کا دھرم بھی کوئی چیز ہے! پُرانے بیر پر ایک پریوار کو بھینٹ نہیں کرسکتا۔ میرا بگڑتا ہی کیا ہے، یہی نا روز گھنٹے دو گھنٹے اور محنت کرنا پڑتی ہے۔

رامیشور نے منہ پھیر لیا۔ جاگیشور گھر میں گیا تو اس کی استری نے کہا۔ اپنے من کی ہی کرتے ہو، چاہے کوئی کتنا ہی سمجھائے پہلے گھر میں آدمی دیا جلاتا ہے۔

جاگیشور۔ لیکن یہ تو اُچت (ٹھیک) نہیں کہ اپنے گھر میں دیے کہ جگہ موم بتیاں جلائے اور مسجد کو اندھیرا ہی چھوڑ دے۔

استری۔ میں تمھارے ساتھ کیا پڑی، مانو کنوئیں میں گر پڑی۔ کون سکھ دیتے ہو؟ گہنے اُتار

لیے، اب سانس بھی نہیں لیتے۔

جاگیشور۔ مجھے تمھارے گہنے سے بھائیوں کی جان زیادہ پیاری ہے۔

اِستری نے منہ پھیر لیا اور بولی۔ بیری کی سنتان کبھی اپنی نہیں ہوتی۔

جاگیشور نے باہر جاتے ہوئے اُتر دیا۔ بیر کا انت بیری کے جیون کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

یہ افسانہ ماہنامہ سرسوتی کے اپریل 1923 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرودر نمبر7 میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

بوڑم

مجھے دیوی پور گئے پانچ دن ہو چکے تھے، پر ایسا ایک دن بھی نہ ہوگا کہ بوڑم کی چرچا نہ ہوئی ہو۔ میرے پاس صبح سے شام تک گاؤں کے لوگ بیٹھے رہتے تھے۔ مجھے اپنی بہوگیتا (قابلیت) کے پردرشت کرنے کا نہ کبھی ایسا اوسر ہی ملا تھا نہ پرلوبھن (لالچ) ہی۔ میں بیٹھا بیٹھا اِدھر اُدھر کے گپّے ہی اُڑایا کرتا۔ بڑے لاٹ نے گاندھی بابا سے یہ کہا اور گاندھی بابا نے یہ جواب دیا، ابھی آپ لوگ کیا دیکھتے ہیں آگے دیکھیے گا کیا کیا گل کھلتے ہیں۔ پورے ۵۰ ہزار جوان جیل جانے کو تیار بیٹھے ہوئے ہیں۔ گاندھی جی نے آگیا دی ہے کہ ہندوؤں میں چھوت چھات کا بھید نہ رہے۔ نہیں تو دیش کو اور بھی اُدِن (بُرے دن) دیکھنے پڑیں گے۔ اَستو لوگ میری باتوں کو تمنے ہوکر سنتے۔ ان کے مکھ پھول کی طرح کھل جاتے۔ آتمابھیمانی (خود داری) کی آبھا (جھلک) مکھ پر دکھائی دیتی۔ گدگد کنٹھ (گلے) سے کہتے، اب تو مہاتما جی ہی کا بھروسا ہے۔ نہ ہوا بوڑم نہیں آپ کا گلا نہ چھوڑتا، آپ کو کھانا پینا کٹھن (مشکل) ہو جاتا، کوئی اس سے ایسی باتیں کیا کرے تو رات کی رات بیٹھا رہے۔ میں نے ایک دن پوچھا، آخر یہ بوڑم ہے کون؟ کوئی پاگل ہے کیا؟ ایک سجّن نے کہا مہاشیہ (جناب) پاگل کیا ہے؟ بس بوڑم ہے۔ گھر میں لاکھوں کی سمپتّی (جائداد) ہے، شکر کی ایک مِل سیوان میں ہے، دو کارخانے چھپرا میں ہیں، تین تین چار چار سو کے طلب والے آدمی نوکر ہیں۔ پر اُسے دیکھیے پھٹے حال گھوما کرتا ہے۔ گھر والوں نے سیوان بھیج دیا تھا کہ جاکر وہاں نگرانی کرے دو ہی مہینے میں منیجر سے لڑ بیٹھا اس نے یہاں لکھا میرا استعفا لیجیے آپ کا لڑکا مزدوروں کو سر چڑھائے رہتا ہے۔ وہ من سے کام نہیں کرتے۔ آخر گھر والوں نے بلا لیا۔ نوکر۔ چاکر لوٹتے۔ کھاتے ہیں اس کی ذرا بھی چنتا نہیں، پر جو سامنے آم کا باغ ہے اس کی رات دن رکھوالی کیا کرتا ہے ''کیا مجال کہ کوئی ایک پتھر بھی پھینک سکے'' ایک میاں جی بولے۔ ''بابو جی گھر میں طرح طرح کے کھانے پکتے ہیں مگر اس کی تقدیر میں وہی روٹی اور دال لکھی ہوئی ہے اور کچھ کھاتا ہی نہیں۔ باپ اچھے کپڑے خریدتے ہیں لیکن وہ ان کی

طرف نگاہ بھی نہیں اُٹھاتا۔ بس وہی موٹا کرتا گاڑھے کی تہہ بندھ باندھے مارا مارا پھرتا ہے۔ آپ سے اس کی صفت کہاں تک کہیں بس پورا بوڑم ہے۔"

(۲)

یہ باتیں سن کر مجھے بھی اس وِچتر (عجیب) وِیکتی سے ملنے کی اتکنٹھا ہوئی۔ سہسا ایک آدمی نے کہا۔"وہ دیکھیے بوڑم آرہا ہے۔" میں نے کوتوہل (تجسس) سے اس کی اُور دیکھا ایک ۲۰ ـ ۲۱ ورش کا ہشٹ پشٹ (صحت مند) یووک تھا ننگے سر ایک گاڑھے کا کرتہ پہنے، گاڑھے کا ڈھیلا پائجامہ پہنے چلا آتا تھا۔ پیروں میں جوتے تھے۔ پہلے میری ہی اُور آیا۔ میں نے کہا۔ "آیئے بیٹھیے" اس نے منڈلی کی اُور اوہیلنا (طنزیہ) کی دِرشٹی (نظر) سے دیکھا اور بولا۔ "ابھی نہیں پھر آؤں گا" یہ کہہ کر چلا گیا۔ جب سندھیا ہوگئی اور سبھا وِسرجت (برخاست) ہوئی تو وہ آم کے باغ کی اُور سے دھیرے دھیرے آکر میرے پاس بیٹھ گیا اور بولا۔ ان لوگوں نے تو میری خوب بُرائیاں کی ہوں گی۔ مجھے یہ بوڑم کا لقب ملا ہے۔

میں نے سکچاتے ہوئے کہا۔ ہاں آپ کی چرچا لوگ روز کرتے تھے۔ میری آپ سے ملنے کی بڑی اچھا تھی۔ آپ کا نام کیا ہے؟

بوڑم نے کہا۔ نام تو میرا محمد خلیل ہے پر آس پاس کے دس پانچ گاؤں میں مجھے لوگ عرف کے نام سے زیادہ جانتے ہیں میرا عرف بوڑم ہے۔

میں۔ آخر لوگ آپ کو بوڑم کیوں کہتے ہیں۔

خلیل۔ ان کی خوشی اور کیا کہوں؟ میں زندگی کو کچھ اور سمجھتا ہوں، پر مجھے اجازت نہیں ہے کہ پانچوں وقت کی نماز پڑھ سکوں۔ میرے والد ہیں چچا ہیں۔ دونوں صاحب پہر رات سے پہر رات تک کام میں مصروف رہتے ہیں۔ رات دن حساب کتاب نفع، نقصان، مندی، تیزی کے سوائے اور کوئی ذکر ہی نہیں ہوتا۔ گویا خدا کے بندے نہ ہوئے اس دولت کے بندے ہوئے۔ چچا صاحب ہیں وہ پہر رات تک شیرے کے پیپوں کے پاس کھڑے ہوکر انھیں گاڑی پر لدواتے ہیں۔ والد صاحب اکثر اپنے ہاتھوں سے شکر کا وزن کرتے ہیں۔ دوپہر کا کھانا شام کو اور شام کا کھانا آدھی رات کو کھاتے ہیں۔ کسی کو نماز پڑھنے کی فرصت نہیں۔ میں کہتا ہوں آپ لوگ اتنا سر مغز کیوں کرتے ہیں۔ بڑے کاروبار میں سارا کام اعتبار پر ہوتا ہے۔ مالک کو کچھ

نہ کچھ بل کھانا ہی پڑتا ہے۔ اپنے بل بوتے پر چھوٹے کاروبار ہی چل سکتے ہیں۔ میرا اصول کسی کو پسند نہیں، اس لیے میں بوڑم ہوں۔

میں۔ میرے خیال میں تو آپ کا اصول ٹھیک ہے۔

خلیل۔ ایسا بھول کر بھی نہ کہیے گا، ورنہ ایک ہی جگہ دو بوڑم ہوجائیں گے۔ لوگوں کو کاروبار کے سوا نہ دین سے غرض ہے نہ دنیا سے، نہ ملک سے نہ قوم سے۔ میں اخبار منگاتا ہوں۔ اسمرنا فنڈ میں کچھ روپے بھیجنا چاہتا ہوں۔ خلافت فنڈ کو مدد کرنا بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ سب سے بڑا ستم ہے کہ خلافت کا رضاکار بھی ہوں۔ کیوں صاحب جب قوم پر، ملک پر اور دین پر چاروں طرف سے دشمنوں کا حملہ ہو رہا ہے تو کیوں میرا فرض نہیں ہے کہ ذاتی فائدے کو قوم پر قربان کردوں؟ اسی لیے گھر اور باہر مجھے بوڑم، کو لقب دیا گیا ہے۔

میں۔ آپ تو وہ کر رہے ہیں جس کی اس وقت قوم کو ضرورت ہے۔

خلیل۔ مجھے خوف ہے کہ اس چوپٹ نگری سے آپ بدنام ہوکر جائیں گے۔ جب میرے ہزاروں بھائی جیل میں پڑے ہوئے ہیں، انھیں گجی کا گاڑھا تک پہننے کو میسر نہیں تو میری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ میں میٹھے لقمیں اُڑاؤں اور چکن کے کرتے پہنوں، جن کی کلائیوں اور مونڈھوں پر سوزن کاری کی گئی ہو۔

میں۔ آپ یہ بہت ہی مناسب کہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اور لوگ آپ کا سا تیاگ کرنے کے قابل نہیں۔

خلیل۔ میں اسے تیاگ نہیں سمجھتا، نہ دنیا کو دکھانے کے لیے یہ بھیس بناکے گھومتا ہوں۔ میرا جی ہی لذت اور شوق سے بھرگیا۔ تھوڑے دن ہوتے ہیں کہ والد نے مجھے سیوان کے مِل کی نگرانی کے لیے بھیجا میں نے وہاں جاکر دیکھا تو انجنیئر صاحب کے خانسامے، بیرے، مہتر، دھوبی، مالی، چوکیدار سبھی مزدوری کی ذیل میں لکھے ہوئے تھے۔ کام صاحب کا کرتے تھے مزدوری کارخانے سے پاتے تھے۔ صاحب بہادر خود تو بے اصول ہیں پر مزدوروں پر اتنی سختی تھی کہ اگر پانچ منٹ کی دیر ہوجائے تو ان کی آدھے دن کی مزدوری کٹ جاتی تھی۔ میں نے صاحب کی مزاج پُرسی کرنا چاہی۔ مزدوروں کے ساتھ رعایت کرنا شروع کی۔ پھر کیا تھا؟ صاحب بگڑ گئے

استعفیٰ کی دھمکی دی۔ گھر والوں کو ان کے سب حالات معلوم ہیں، پرلے درجے کا حرام خور آدمی ہے لیکن ان کی دھمکی پاتے ہی سب کے ہوش اُڑ گئے۔ میں تار سے واپس بلا لیا گیا۔ اور گھر پر میری خوب لے دے ہوئی۔ پہلے بوڑم ہونے میں کچھ کور، کسر تھی، وہ پوری ہوگئی۔ نہ جانے صاحب سے لوگ کیوں اتنا ڈرتے ہیں؟

میں۔ آپ نے وہی کیا جو اس حالت میں میں بھی کرتا۔ بلکہ میں تو پہلے صاحب پر غبن کا مقدمہ دائر کرتا، بدمعاشوں سے پٹواتا تب بات کرتا۔ ایسے حرام خوروں کی یہی سزائیں ہیں۔

خلیل۔ پھر تو ایک اور، دو ہوگئے۔ افسوس یہی ہے کہ آپ کا یہاں قیام نہ رہے گا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ چند روز آپ کے ساتھ رہوں۔ مدّت کے بعد آپ ایسے آدمی ملے ہیں، جس سے میں اپنے دل کی باتیں کہہ سکتا ہوں۔ ان گنواروں سے میں بولتا بھی نہیں۔ میرے چاچا صاحب کو جوانی میں ایک چمارن سے تعلق ہوگیا تھا۔ اس سے دو بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ چمارن لڑکی کو گود میں چھوڑ کر مرگئی۔ تب سے ان دونوں بچوں کی میرے یہاں وہی حالت تھی جو یتیموں کی ہوتی ہے۔ کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ ان کو کھانے پہننے کو بھی نہ ملتا بے چارے نوکروں کے ساتھ کھاتے اور باہر جھونپڑے میں پڑے رہتے تھے۔ جناب مجھ سے یہ نہ دیکھا گیا۔ میں نے انھیں اپنے دسترخوان پر کھلایا اور اب بھی کھلاتا ہوں۔ گھر میں کُہرام مچ گیا۔ جس کو دیکھیے مجھ پر تیوری بدل رہا ہے، مگر میں نے پرواہ نہ کی۔ آخر ہے وہ بھی تو ہمارا ہی خون۔ اس لیے میں بوڑم کہلاتا ہوں۔

میں۔ جو لوگ آپ کو بوڑم کہتے ہیں وہ خود بوڑم ہیں۔

خلیل۔ جناب، ان کے ساتھ رہنا عجیب ہے۔ شاہ کابل نے قربانی کی ممانعت کردی ہے۔ ہندوستان کے علماء نے بھی یہی فتویٰ دیا، پر یہاں خاص میرے گھر قربانی ہوئی۔ میں نے ہرچند واویلا مچایا۔ پر میری کون سنتا ہے؟ اس کا کفارہ (پرائشچت) میں نے یہ ادا کیا کہ اپنی سواری کا گھوڑا بیچ کر ۳۰۰ فقیروں کو کھانا کھلایا اور تب سے قصائیوں کو گائے لے جاتے دیکھتا ہوں تو قیمت دے کر خرید لیتا ہوں، اِس وقت تک دس گایوں کی جان بچا چکا ہوں۔ وہ سب یہاں ہندؤں کے گھروں میں ہیں۔ پر مزہ یہ

ہے کہ جنھیں میں نے گائیں دی ہیں وہ بھی مجھے بوڑم کہتے ہیں۔ میں بھی اس نام کا اتنا عادی ہوگیا ہوں کہ اب مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔

میں۔ آپ جیسے بوڑم کاش ملک میں اور زیادہ ہوتے۔

خلیل۔ لیجیے آپ نے بھی بنانا شروع کردیا۔ یہ دیکھیے آم کا باغ ہے۔ میں ان کی رکھوالی کرتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ جہاں ہزاروں کا نقصان ہو رہا ہے وہاں تو دیکھ بھال کرتا نہیں ذرا سی بغیہ کی رکھوالی میں اتنا مستعد۔ جناب یہاں لڑکوں کا یہ حال ہے کہ ایک آم تو کھاتے ہیں اور پچیس آم گراتے ہیں۔ کتنے ہی پیڑ چوٹ کھا جاتے ہیں اور پھر کسی کام کے نہیں رہتے۔ میں چاہتا ہوں کہ آم پک جائیں، ٹپکنے لگیں، تب جس کا جی چاہے چن لے جائے۔ کچے آم خراب کرنے سے کیا فائدہ؟ یہ بھی میرے بوڑم پن میں داخل ہے۔

(۳)

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ سہسا تین چار آدمی ایک بنیے کو پکڑے گھسیٹتے ہوئے آتے دکھائی دیے۔ پوچھا تو ان چاروں آدمیوں میں سے ایک نے جو صورت سے مولوی معلوم ہوتے تھے کہا۔ یہ بڑا بے ایمان ہے اس کے بانٹ کم ہیں۔ ابھی اس کے یہاں سے سیر بھر گھی لے گیا ہوں۔ گھر پر تولتا ہوں تو آدھا پاؤ غائب۔ اب جو لوٹانے آیا ہوں تو کہتا ہے کہ میں نے تو پورا تولا تھا۔ پوچھو اگر تونے پورا تولا تھا تو کیا میں راستے میں کھا گیا۔ اب لے چلتا ہوں تھانے پر، وہیں اس کی مرمت ہوگی۔

دوسرے مہاشیہ جو وہاں ڈاک خانے کے منشی تھے بولے۔ اس کی ہمیشہ کی یہی عادت ہے، کبھی پورا نہیں تولتا۔ آج ہی دو آنے کی شکر منگوائی۔ لڑکا گھر لے کر گیا تو مشکل سے ایک آنے کی تھی۔ لوٹانے آیا تو آنکھیں دکھانے لگا۔ اس کے بانٹوں کی آج جانچ کرانی چاہیے۔

تیسرا آدمی اہیر تھا۔ اپنے سر پر سے کھلی گٹھری اتار کر بولا۔ صاحب، یہ آٹھ آنا کی کھلی ہے ۶ سیر کے بھاؤ سے دی تھی۔ گھر پر تولا تو ۲ سیر ہوئی۔ لایا کہ لوٹا دوں گا پر یہ لیتا ہی نہیں اب اس کا نبٹارہ تھانے ہی میں ہوگا۔ اس پر کئی آدمیوں نے کہا۔ یہ سچ مچ بے ایمان آدمی ہے۔ بنیے نے کہا۔ اگر میرے بانٹ رتّی بھر بھی کم نکلے تو ہزار روپے ڈانڑ

دوں گا۔

مولوی صاحب نے کہا۔ تو کمبخت ٹانکی مارتا ہوگا۔

منشی جی بولے۔ ٹانکی مار دیتا ہے یہی بات ہے۔

اہیر نے کہا۔ دُہرے بانٹ رکھے ہیں۔ دکھانے کے اور بیچنے کے اور۔ اس کے گھر کی پولیس تلاشی لے۔

بنیے نے پھر پرتی واد (مباحثہ) کیا۔ پکڑنے والوں نے پھر آکرمن (حملہ) کیا، اسی طرح کوئی آدھا گھنٹے تک تکرار ہوتی رہی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کروں۔ بنیے کو چھڑانے کے لیے زور دوں یا جانے دوں۔ بنیے سے سبھی جلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ خلیل کو دیکھا تو غائب، نہ جانے کب اُٹھ کر چلا گیا؟ بنیا کسی طرح نہ دبتا تھا یہاں تک کہ تھانے جانے سے بھی نہ ڈرتا تھا۔

(۴)

یہ لوگ تھانے جانا ہی چاہتے تھے کہ بوڑم سامنے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ایک ٹوکرا تھا دوسرے ہاتھ میں ایک کٹوری اور پیچھے ایک ۷۔۸ برس کا لڑکا۔ اس نے آتے ہی مولوی صاحب سے کہا۔ یہ کٹورا آپ ہی کا ہے قاضی جی؟

مولوی۔ (چونک کر) ہاں ہے تو پھر؟ تم میرے گھر سے اسے کیوں لائے؟

بوڑم۔ اسی لیے کہ کٹورے میں وہی آدھا پاؤ گھی ہے جس کے وشئے (بارے) میں آپ کہتے ہیں کہ بنیے نے کم تولا۔ گھی وہی ہے۔ وزن وہی ہے بے ایمانی غریب بنیے کی نہیں ہے بلکہ قاضی حاجی مولوی ظہور احمد کی ہے۔

مولوی۔ تم اپنا بوڑم پنا یہاں نہ دکھانا۔ نہیں تو میں یہاں کسی سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ تم لکھپتی ہوگے تو اپنے گھر کے ہوگے۔ تمھیں کیا مجال تھا میرے گھر میں جانے کا۔

بوڑم۔ وہی جو آپ کو بنیے کو تھانے میں لے جانے کا ہے۔ اب یہ گھی بھی تھانے جائے گا۔

مولوی۔ (سٹپٹا کر) سب کے گھر میں تھوڑی بہت چیز رکھی ہی رہتی ہے۔ قسم قرآن شریف کی میں ابھی تمھارے والد کے پاس جاتا ہوں، آج تک گاؤں بھر میں کسی نے مجھ پر ایسا الزام نہیں لگایا تھا۔

بنیا۔ مولی صاحب آپ جاتے کہاں ہیں۔ چلیے ہمارا آپ کا فیصلہ تھانے میں ہوگا۔ میں ایک نہ مانوں گا۔ کہلانے کو مولوی، دیندار، ایسے بنتے ہیں کہ دیوتا ہی ہے۔ پر گھر میں چیز رکھ کر دوسروں کو بے ایمان بناتے ہیں۔ یہ لمبی داڑھی دھوکا دینے کے لیے بڑھائی ہے؟

مگر مولوی صاحب نہ رُکے، بنیے کو چھوڑ کر خلیل کے باپ کے پاس چلے گئے۔ جو اس وقت شرم سے بچنے کا سہج بہانہ تھا۔ تب خلیل نے اہیر سے کہا۔ کیوں بے تو بھی تھانے جا رہا ہے؟ چل میں بھی چلتا ہوں تیرے گھر سے یہ سیر بھر کھلی لیتا آیا ہوں۔

اہیر نے مولوی صاحب کی دُرگتی (بُری حالت) دیکھی تو چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بولا۔ بھیّا جوانی کی قسم ہے مجھے مولوی صاحب نے سکھا دیا تھا۔

خلیل۔ دوسرے کے سکھانے سے تم کسی کے گھر میں آگ لگا دوگے؟ خود تو بچّہ دودھ میں آدھا پانی ملا ملا کر بیچتے ہو مگر آج تم کو اتنی مُٹ مردی سوار ہوگئی کہ ایک بھلے آدمی کو تباہ کرنے پر آمادہ ہوگئے۔ کھلی اُٹھا کر گھر میں رکھ لی۔ اس پر بنیے سے کہتے ہو کم تولا۔

بنیا۔ بھیّا میری لاکھ روپے کی عزت بگڑ گئی۔ میں تھانے میں رپٹ کیے بنا نہ مانوں گا۔

اہیر۔ ساہو جی اب کہ معاف کرو نہیں تو کہیں کا نہ رہوں گا۔

تب خلیل نے منشی جی سے کہا۔ کہیے جناب آپ کی قلعی کھولوں یا چپکے سے گھر کی راہ لیجیے گا۔

منشی۔ تم بے چارے میر قلعی کیا کھولوگے مجھے بھی اہیر سمجھ لیا ہے کہ تمھاری بھبھکیوں میں میں آؤں گا۔

خلیل۔ (لڑکے سے) کیوں بیٹا تم شکر لے کر سیدھے گھر چلے گئے تھے؟

لڑکا۔ (منشی جی کو سشنک (شبہ آمیز) نیتروں سے دیکھ کر) بتاؤں گا۔

منشی۔ لڑکوں کو جیسا سکھا دوگے ویسا کہیں گے۔

خلیل۔ بیٹا۔ ابھی تم نے مجھ سے جو کہا تھا وہی پھر کہہ دو۔

لڑکا۔ دادا ماریں گے۔

منشی۔ کیا راستے میں تو نے شکر پھانک لی تھی۔ لڑکا رونے لگا۔

خلیل۔ اس نے مجھ سے خود کہا پر آپ نے اس سے تو پوچھا نہیں۔ بنیے کے سر ہوگئے۔ یہی شرافت ہے۔

منشی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس نے راستے میں یہ شرارت کی؟

خلیل۔ تو ایسے کمزور ثبوت پر آپ تھانے کیوں کر چلے تھے۔ آپ گنواروں کو منی آڈر کے روپے دیتے ہیں تو اس روپے پر دو آنے اپنی دستوری کاٹ لیتے ہیں۔ ٹکے کے پوسٹ کارڈ آنے میں بیچتے ہیں۔ جب کہیے تب ثابت کردوں اسے کیا آپ بے ایمانی نہیں سمجھتے ہیں؟

منشی جی نے بوڑم کو منہ لگنا مناسب نہ سمجھا۔ لڑکے کو مارتے ہوئے گھر لے گئے۔ بنیے نے بوڑم کو خوب آشیرواد دیا۔ درشک بھی دھیرے دھیرے چلے گئے۔ تب میں نے خلیل سے کہا۔ آپ نے اس بنیے کی جان بچا لی۔ نہیں تو بے چارہ بے گناہ پولیس کے پنجے میں پھنس جاتا ہے۔

خلیل۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کیا صلہ ملے گا۔ تھانے دار میرے دشمن ہوجائیں گے۔ کہیں گے یہ میرے شکاروں کو بھگا دیا کرتا ہے۔ والد صاحب پولیس سے تھر تھر کانپتے ہیں۔ مجھے آڑے ہاتھوں لیں گے کہ تو دوسروں کے بیچ میں کیوں دخل دیتا ہے؟ یہاں یہ بھی بوڑم پن داخل ہے۔ ایک بنیے کے پیچھے مجھے بھلے آدمیوں کی قلعی کھولنی مناسب نہ تھی۔ ایسی حرکت بوڑم لوگ کیا کرتے ہیں۔

میں شردھا پورن (آبرومندانہ) الفاظ میں کہا۔ اب میں آپ کو اس نام سے پکاروں گا۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ بوڑم دیوتاؤں کو کہا جاتا ہے جو سوارتھ (غرض) پر آتما کی بھینٹ کردیتا ہے وہ چتر ہے، بدھّی مان ہے، جو آتما کے سامنے، سچّے سددھانت کے سامنے ستیہ (سچ) کے سامنے سوارتھ کی نندا کی پرواہ نہیں کرتا وہ بوڑم ہے۔ نربدّھی ہے۔

یہ افسانہ ہندی ماہنامہ پربھا اپریل1923 کے شمارے میں شائع ہوا مان سرودر 8 میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

مجبوری

جب بابو ہردے ناتھ کی اکلوتی لڑکی کیلاش کماری تیرہ سال کی عمر میں بیوہ ہوگئی تو انھوں نے سوچا لڑکی کا دل بہلانے کی کوئی ترکیب کرنی چاہیے۔ اکیلی رہے گی تو بیٹھی بسورا کرے گی۔ تنہائی رنج کو اور بھی جان گُسل کردیتی ہے۔ اس لیے ایک گراموفون لائے۔ قصہ کہانی کی کتابیں جمع کیں۔ اور اپنی بیوی کو تاکید کردی کہ لڑکی کو سیر تماشے دِکھلاتی رہے۔ نہیں تو ذرا سی بچّی رو رو کر مرجائے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کیلاش کماری کو سیر و تفریح کا چسکا پڑگیا۔ ایک دن بھی تھیئٹر یا لبِ دریا کی سیر کرنے نہ جاتی تو اُسے وقت کاٹنا عذاب ہوجاتا۔ تفریح جدت کی غلام ہے اور جدت کو تقویم پارینہ سے نفرت۔ کیلاش کماری نئے مشاغلِ تفریح کی تلاش میں منہمک رہتی۔

زبانِ خلق بھلا ایسے موقعوں پر کیوں کر خاموش رہتی۔ وہ کسی کی رعایت نہیں کرتی۔ کسی نے ذرا ٹوپی ٹیڑھی رکھی۔ اور اُس نے آوازے کسے۔ کوئی ذرا اکڑ کر چلا۔ اور پڑوسیوں کی نظروں میں کھبا۔ بیوہ کے لیے پُوجا ہے۔ تیرتھ برت ہے۔ موٹا کھانا ہے، موٹا پہننا ہے۔ اُسے تفریح اور سیر کی کیا ضرورت۔ لڑکی پیاری سہی لیکن شرم اور حیا بھی تو ہے کوئی چیز۔ کچھ دنوں تک تو آپس میں کھچڑی پکتی رہی۔

آخر ایک دن کئی مستورات نے جاگیشری کے گھر قدم رنجہ کیا۔ اور کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد ایک صاحبہ بولیں۔

بہن تمھیں مزے میں ہو کہ ہنسی خوشی میں دن کاٹ دیتی ہو۔ ہمیں تو دن پہاڑ ہوجاتا ہے۔ نہ کوئی کام نہ دھندھا۔ کوئی کہاں تک باتیں کرے۔

دوسری خاتون نے فرمایا۔ ارے تو یہ تو بدے بدے کی بات ہے۔ سبھی کے دن ہنسی خوشی میں کٹیں تو روئے کون؟ یہاں تو صبح سے شام تک چولہے چکّی ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ کسی بچّے کو دست آرہے ہیں۔ تو کسی کو بخار چڑھا ہوا ہے۔ دن بھر ہائے ہائے کرتے بیت جاتی ہے۔ سارے دن کٹھ پتلی کی طرح ناچتی رہتی ہوں۔

تیسری صاحبہ بولیں۔ بدے کی بات نہیں ہے۔ ویسا دل چاہیے۔ تمھیں تو کوئی راج سنگھاسن پر بٹھا دے تب بھی تسکین نہ ہوگی۔ تب اور ہائے ہائے کروگی۔

اس پر ایک ضعیفہ بولیں۔ نوج ایسا دل! یہ بھی کوئی دل ہے۔ کہ گھر میں چاہے آگ لگ جائے۔ چاروں طرف کتنی ہی رُسوائی ہو رہی ہو۔ لیکن آدمی اپنے راگ رنگ میں مست رہے! وہ دل ہے کہ پتھر!؟

دوسری عورتوں نے ضعیفہ کی اس علانیہ چوٹ پر شرمندہ ہوکر سر جُھکا لیا۔ وہ سب جاگیشوری کی چٹکیاں لینا چاہتی تھیں۔ زخمی کو تڑپانا ہی اُن کی غرض تھی۔ اس کھلی ہوئی چوٹ نے اُن کی دلآزاری کے لیے کوئی گنجائش نہ رکھی۔ بات پلٹ گئی۔ تعلیمِ نسواں پر بحث ہونے لگی۔ مگر جاگیشوری کو سزا مل گئی۔ جب مستورات رخصت ہوگئیں تو اُس نے جاکر شوہر سے یہ سارا قصہ سنایا۔ ہردے ناتھ اُن بھلے آدمیوں میں نہ تھے جو ہر ایک موقع پر اپنی روحانی آزادی کا شور مچاتے ہیں۔ اور زبانِ خلق کی پروا نہیں کرتے۔ متفکر ہوکر بولے۔ تو اب؟

"تمھیں کوئی تدبیر سوچو۔"

"اُن لوگوں کا کہنا بے جا نہیں۔ کیلاشی کے مزاج میں مجھے بھی ایک تبدیلی نظر آرہی ہے۔ مجھے خود تجربہ ہورہا ہے۔ کہ اس کے من بہلاؤ کے لیے ہم نے جو تدبیر سوچی وہ مناسب نہیں ہے۔"

"کیلاشی تو شاید جان ہی دیدے۔"

"ہمیں اس کے مزاج کو تبدیل کرنا ہوگا۔"

"مشکل ہے۔"

(۲)

رفتہ رفتہ اصلاح ہونے لگی۔ بابو صاحب اب گراموفون بہت کم بجاتے۔ کوئی دھرم گرنتھ پڑھ کر سُناتے۔ ماں بیٹی مذہبی اور روحانی معاملات میں محو رہنے لگیں۔ کیلاشی کماری کو باقاعدہ دیکشا دے دی گئی۔

اب ماں بیٹی، کشتی کی سیر کرنے کے لیے گنگا جی نہ جاتیں، بلکہ اشنان کرنے کے لیے دونوں روزانہ مندر میں درشن کرنے جاتیں۔ اور ایکادشی کا برت رکھتیں۔ کئی مہینہ تک

تو کیلاشی کو یہ نئی دنیا نہایت تکلیف دہ اور خشک معلوم ہوئی۔ پر اعتقاد عورت کا وصف ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں اُسے ان معاملات سے دلچسپی ہوگئی۔

اب وہ سولھویں سال میں تھی۔ اپنی حالت سے بے خبر نہ تھی۔ تفریحات سے اُسے خود ہی نفرت ہونے لگی۔ بیوہ ہونا کسی بہت بڑے گناہ کی سزا ہے۔ یہ خیال اس کے دل میں راسخ ہونے لگا۔ میں نے پہلے جنم میں کوئی بڑا گناہ کیا ہوگا۔ اگر میرے شوہر زندہ ہوتے تو میں پھر مایا موہ میں پھنس جاتی اور اصلاح کا موقعہ ہی نہ ملتا۔ گروجی کا یہ کہنا سچ ہے کہ پرماتما نے تمھیں اصلاح کا یہ موقعہ دیا ہے۔ بیوگی کوئی سزا نہیں ہے۔ بلکہ اصلاح کا ذریعہ ہے۔ میری نجات اب تیاگ، بھگتی اور اُپاسنا سے ہی ہوگی۔

کچھ دنوں کے بعد زہد و تقویٰ کا اثر اتنا زیادہ ہوگیا کہ کیلاش کماری کو ہر ایک سے نفرت ہونے لگی۔ کسی کو نہ چھوتی۔ مہریوں سے دُور رہتی۔ سہیلیوں سے گلے تک نہ ملتی۔ نہ کسی کا بنایا ہوا یا چھُوا ہوا کھانا کھاتی۔ وہ دن میں دو تین بار اشنان کرتی۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی دھرم گرنتھ پڑھا کرتی۔ سادھو مہاتماؤں کی صحبت میں اُسے روحانی سرور حاصل ہوتا۔ جہاں کسی مہاتما کے آنے کی خبر پاتی اُن کے درشنوں کے لیے بیتاب ہوجاتی۔ یہاں تک کہ دنیا سے اُس کی طبیعت بیزار ہوگئی۔ محویت کی حالت پیدا ہوئی۔ گھنٹوں دھیان میں غرق رہتی۔ قیودِ تمدن سے نفرت ہونے لگی۔ تیسرا سال بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ اُس نے سنیاسی بن جانے کا فیصلہ کرلیا۔

ماں باپ نے سُنا تو ہوش اُڑ گئے۔ جاگیشوری نے بیٹی کو سمجھایا۔ بیٹا! ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے۔ کہ تم ایسی باتیں سوچتی ہو۔

کیلاش کماری۔ مایا موہ سے جتنی جلدی نجات ہوجائے اتنا ہی اچھا۔

ہردے ناتھ۔ کیا اپنے گھر میں رہ کر مایا موہ سے نجات نہیں ہو سکتی۔

جاگیشوری۔ کتنی بدنامی ہوگی۔

کیلاش کماری۔ اپنے کو بھگوان کے چرنوں پر قربان کرچکی تو مجھے بدنامی کی کیا پرواہ؟

جاگیشوری۔ تمھیں نہ ہو ہمیں تو ہے۔ ہمیں تو تمھارا ہی سہارا ہے۔ تم نے سنیاس لے لیا تو ہم کس کے سہارے جیئیں گے؟

کیلاش کماری۔ پرماتما ہی سب کا سہارا ہے۔ کسی دوسرے کا سہارا لینا بُھول ہے۔

دوسرے ہی دن یہ بات محلے والوں کے کانوں میں پہنچ گئی۔ رائے زنی شروع ہوگئی۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ نئی بات کیا ہوئی؟ لڑکیوں کو اس طرح آزاد نہیں کردیا جاتا۔ پُھولے نہ سماتے تھے کہ لڑکی نے خاندان کا نام روشن کردیا۔ اُپنشد اور ویدانت پڑھتی ہے۔ ایسی ایسی دلیلیں نکالتی ہے کہ بڑے بڑے علماء کی زبان بند ہوجاتی ہے۔ تو اب روتے کیوں ہیں؟

اپنے بچّے کو دوڑتے دوڑتے دھم سے گر پڑتے دیکھ کر ہم پہلے اُس کو جھڑکتے ہیں۔ پھر گود میں اُٹھا لیتے ہیں۔ ان حرف گیریوں کے بعد ہمدردیوں کا دَور آیا۔ کئی اصحاب ہردے ناتھ سے اس معاملہ میں مشورہ کرنے آئے۔ مسئلہ کا آغاز کیوں کر ہو۔

کئی منٹ بعد ایک صاحب بولے۔ سُنا ہے ڈاکٹر گوڑ کی اصلاح آج کثرتِ رائے سے منظور ہوگئی۔

دوسرے صاحب بولے۔ یہ لوگ ہندو دھرم کو ملیا میٹ کرکے چھوڑیں گے۔

تیسرے حضرت نے فرمایا۔ ملیامیٹ تو ہو ہی رہا ہے۔ اب اور کوئی کیا کرے گا۔ جب ہمارے سادھو، مہاتما جو ہندو دھرم کے ستون ہیں اتنے نفس پرست ہوگئے ہیں کہ بھولی بھالی عورتوں کو بہکا لے جانے میں بھی تامّل نہیں کرتے تو باقی ہی کیا رہ گیا۔

ہردے ناتھ۔ یہ مصیبت تو میرے سر بھی پڑا چاہتی ہے۔ آپ لوگوں کو تو معلوم ہوگا۔

پہلے۔ آپ ہی کے سر کیوں، ہم سبھی کے سر پڑی ہوئی ہے۔

دوسرے۔ ساری قوم کے سر کہیئے صاحب!

ہردے ناتھ۔ نجات کی کوئی تدبیر سوچیئے۔

پہلے۔ آپ نے سمجھایا نہیں؟

ہردے ناتھ۔ سمجھا کے ہار گیا۔ کچھ سُنتی ہی نہیں۔

تیسرے ۔ پہلے ہی غلطی ہوئی۔ اُسے اس راستہ پر ڈالنا ہی نہ چاہیے تھا۔

پہلے۔ اب پچھتانا بے سود ہے۔ آپ نے اخباروں میں دیکھا ہوگا۔ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ بیواؤں سے اُستانیوں کا کام لینا چاہیے۔ اگرچہ میں اس مسئلہ سے بھی متفق نہیں ہوں۔ پر سنیاسی ہونے سے تو یہ کہیں بہتر ہے۔ منشا تو صرف یہی ہے کہ لڑکی کا دل کسی کام میں لگا رہے۔ کسی سہارے کے بغیر آدمی کے بھٹک جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ جس گھر میں کوئی نہیں رہتا اس میں چمگادڑ بسیرا لیتے ہیں۔

دوسرے۔ تجویز تو معقول ہے۔ محلّہ کی دس پانچ لڑکیاں جمع کرلی جائیں۔ اور کام شروع کردیا جائے۔ لڑکیوں کو اگر کتابیں، کاغذ، گڑیاں وغیرہ ملتی رہیں تو شوق سے آئیں گی۔

ہردے ناتھ نے کیلاش کماری کے سامنے یہ تجویز پیش کی تو اُسے بے حد صدمہ ہوا۔ سنیاس کے اونچے رُتبہ سے اُستانی کا درجہ بدرجہا پست تھا۔ کہاں وہ مہاتماؤں کی صحبت، وہ کوہستانی مقامات کا عارفانہ شکوہ، قدرتی دلچسپیوں کی وہ روحانی کشش، یخ بستہ چوٹیوں کی وہ نورانی پاکیزگی۔ مان سروور اور کیلاش کے وہ وجدانی مناظر، اور کہاں لڑکیون کو پڑھانا اور سکھانا۔ جو کام دس دس روپے کے مدرس کرتے ہیں۔ مگر ہردے ناتھ مایوس نہ ہوئے۔ برابر خدمتِ خلق کی عظمت اُس کے دل نشیں کرتے رہے۔ اصلی سنیاس خدمت ہی ہے۔ سنیاسی محض اپنی نجات کا طالب ہوتا ہے۔ رفاہِ عام میں خود غرضی کا شائبہ بھی نہیں۔ خودغرضی چاہے روحانی ہو یا جسمانی۔ ہے ایک محدود شے۔ رفاہِ عام غیرمحدود ہے۔ دیکھو رشیوں میں دوھیچ کا جو رتبہ ہے۔ ہرلیش چندر کی جو عظمت ہے۔ وہ اور کسے حاصل ہے؟ اس دعویٰ کی تائید میں وہ اُپنشدوں اور ویدوں کی نظیریں پیش کرتے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ کیلاش کماری کے خیالات میں تغیر ہونے لگا۔

(۳)

کیلاش کماری کے جوشِ خدمت نے سیلابی صورت اختیار کی۔ سارے دن لڑکیوں کو لیے بیٹھی رہتی۔ کبھی پڑھاتی۔ کبھی ان کے ساتھ کھیلتی۔ کبھی سینا پرونا سکھاتی۔ پاٹ شالا اس کی دلچسپیوں کا مرکز بن گیا۔ کوئی لڑکی بیمار ہوجاتی۔ تو فوراً اُس کے گھر جاتی۔ اس کی تیمارداری کرتی۔ غریب لڑکیوں کے لیے خود کھانے کپڑے کا انتظام کرتی۔ اُن میں کسی کی شادی درپیش ہوتی تو چندہ کرکے روپیہ جمع کرتی۔

پاٹ شالا کو کُھلے ہوئے دو سال ہوگئے تھے۔ ایک لڑکی کو جسے وہ بہت پیار کرتی تھی چیچک نکل آئی۔ کیلاشی اُسے دیکھنے گئی۔ ماں باپ نے بہت روکا۔ پر وہ نہ مانی۔ کہا فوراً لوٹ آوں گی۔ لڑکی کی حالت خراب تھی۔ مگر کہاں تو روتے روتے تالو سوکھتا تھا۔ کہاں کیلاشی کو دیکھتے ہی ہنسنے لگی۔ کیلاشی وہاں ایک گھنٹہ رہی۔ لڑکی برابر اُس سے باتیں کرتی رہی۔ لیکن جب وہ جانے کو اُٹھی تو لڑکی پھر رونے لگی۔ کیلاشی مجبور ہوکر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ پھر اُٹھی تو پھر لڑکی کی وہی حالت ہوئی۔ وہ اُسے کسی طرح چھوڑتی ہی نہ تھی۔

سارا دن وہیں گزر گیا۔ رات کو بھی لڑکی نے نہ آنے دیا۔ ہردے ناتھ اُسے بُلانے کو بار بار آدمی بھیجتے پر وہ لڑکی کو چھوڑکر نہ جاسکتی۔ اُسے خوف ہو رہا تھا کہ میں یہاں سے چلی اور لڑکی ہاتھ سے گئی۔ اُس کی ماں سوتیلی تھی۔ اس لیے کیلاشی کو اُس کی جانب سے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ اس طرح وہ متواتر تین دن تک وہاں رہی۔ جب چوتھے دن لڑکی کی حالت سنبھل گئی۔ تو گھر آئی۔ مگر ابھی کپڑے اُتار ہی رہی تھی کہ لڑکی کے گھر سے آدمی پہنچا۔ جلدی چلیے۔ لڑکی رو رو کر جان دے رہی ہے۔

ہردے ناتھ نے کہا۔ کہہ دو شفا خانے سے کوئی نرس بُلوا لیں۔

کیلاشی۔ دادا آپ فضول بگڑ رہے ہیں۔ اُس غریب کی جان بچ جائے۔ میں تین دن نہیں۔ تین مہینے اُس کی خدمت کرنے کو تیار ہوں۔ آخر یہ جسم کس کام آئے گا۔

ہردے ناتھ۔ تو یہ لڑکیاں کیسے پڑھیں گی؟

کیلاشی۔ دو چار دن میں وہ اچھی ہوجائے گی۔ دانے مُرجھا چلے ہیں۔ تب تک آپ ان لڑکیوں کو دیکھ بھال کرتے رہیے گا۔

ہردے ناتھ۔ چھُوت کا بھی تو خوف ہے۔ یہ بیماری چھُوت سے پھیلتی ہے۔

کیلاشی۔ (ہنس کر) میں مرجاؤں گی تو آپ کے سر سے ایک بلا ٹل جائے گی۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے اُدھر کی راہ لی۔ ماں۔ ہاں! ہاں! .... کرتی رہ گئی۔

ہردے ناتھ نے جاگیشوری سے کہا۔ معلوم ہوتا ہے۔ بہت جلد یہ پاٹ شالا بھی بند کرنی پڑے گی۔ جس راستے پر چلتا ہوں وہی کچھ دنوں کے بعد دلدل بن جاتا ہے۔ اب پھر بدنامی کے سامان ہوتے نظر آرہے ہیں۔ لوگ کہیں گے لڑکی دوسروں کے گھر کئی کئی دن پڑی رہتی ہے۔ پاٹ شالا بند ہی کرنی پڑے گی۔

جاگیشوری۔ اس کے سوا اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔

کیلاش کماری دو دن کے بعد لوٹی تو ہردے ناتھ نے پاٹ شالا بند کر دینے کی تجویز پیش کی۔ کیلاشی نے گرم ہوکر کہا۔ اگر آپ کو بدنامی کا اتنا خوف ہے تو مجھے زہر دے دیجیے۔ اس کے سوا بدنامی سے بچنے کی اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔

ہردے ناتھ۔ بیٹی دنیا میں رہ کر دنیا ہی کا طرزِ زندگی اختیار کرنا پڑتا ہے۔

کیلاشی۔ تو کچھ معلوم بھی تو ہو کہ دنیا مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ مجھ میں عقل ہے۔ جان

ہے۔ ہوش ہے۔ جانور کیسے بن جاؤں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ اپنے کو ابھاگنی سمجھوں۔ اور ایک ٹکڑا روٹی کھا کر پڑی رہوں۔ ایسا کیوں کروں؟ سنسار مجھے جو چاہے سمجھے۔ میں اپنے کو ابھاگنی نہیں سمجھتی۔ میں اپنی حفاظت آپ کرسکتی ہوں۔ میں اسے اپنی ذلّت سمجھتی ہوں کہ قدم قدم پر مجھ پر شک کیا جائے۔ ہمیشہ چرواہوں کی طرح کوئی لاٹھی لیے میرے پیچھے گھومتا رہے کہ کسی کے کھیت میں نہ جا پڑوں۔ یہ حالت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔

پاٹ شالا دوسرے دن بند ہوگئی۔

(۴)

تیجے کا دن آیا۔ گھروں میں صفائی ہونے لگی۔ عورتیں اس تقریب کی تیاریاں کرنے لگیں۔ جاگیشوری نے بھی برت کا سامان کیا۔ نئی نئی ساڑیاں منگوائیں۔ کیلاشی کے سُسرال سے اس موقعہ پر کپڑے، مٹھائیاں اور کھلونے آیا کرتے تھے۔ اب کے بھی آئے۔ یہ سُہاگن عورتوں کا برت ہے۔ لیکن بیوائیں بھی رکھتی ہیں۔ کیونکہ شوہر سے اُن کا محض جسمانی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ دائمی اور روحانی تعلق ہے۔ کیلاش کماری اب تک یہ برت رکھتی آئی تھی۔ اب کی اُس نے فیصلہ کیا یہ برت نہ رکھوں گی۔ ماں نے سُنا تو ماتھا ٹھونک لیا۔ بولی۔ یہ برت رکھنا تمھارا دھرم ہے۔

کیلاشی۔ مرد بھی عورت کے نام پر کوئی برت رکھتے ہیں؟

جاگیشوری۔ مردوں میں یہ رسم نہیں ہے۔

کیلاشی۔ اسی لیے نہ کہ مردوں کو عورتوں کی جان اتنی پیاری نہیں ہوتی جتنی عورتوں کو مردوں کی؟

جاگیشوری۔ عورت مرد کی برابری کیسے کرسکتی ہے۔ اُس کا تو دھرم ہی ہے مرد کی خدمت کرنا۔

کیلاشی۔ میں اسے اپنا دھرم نہیں سمجھتی۔ میرے لیے اپنی اصلاحِ نفس کے سوا کوئی دوسرا دھرم نہیں ہے۔

جاگیشوری۔ بیٹی۔ غضب ہوجائے گا۔ دُنیا کیا کہے گی۔

کیلاشی۔ پھر وہی دنیا۔ مجھے دُنیا سے کوئی مطلب نہیں۔ جس دُنیا میں میرے لیے اینٹ اور

پتھر کے سوا اور کچھ نہیں، اُس دنیا سے میں نہیں ڈرتی۔

ہردے ناتھ نے جاگیشوری سے یہ باتیں سُنیں تو سناٹے میں آگئے۔ ان باتوں کا مطلب کیا ہے؟ یہ اصلاحِ نفس کا جذبہ ہے یا ٹوٹے ہوئے مجروح دل کی صدا؟ بے نوائی شرم کا احترام نہیں کرتی۔ یہ حرماں نصیب کا نالۂ درد ہے! عام حالتوں میں حزن و یاس بیکسی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ خوددار آدمیوں میں وہ بد دماغ ہوجاتا ہے۔ دل کے نازک جذبات کو فنا کر دیتا ہے۔ یہ مایوسی کا آخری درجہ ہے۔

جاگیشوری نے پوچھا۔ اب کیا کرنا ہوگا؟

"کیا بتاؤں؟"

"بس ایک ہی تدبیر ہے۔ پر اُسے زبان پر نہیں لا سکتا۔"

یہ افسانہ پہلی بار 'چاند' کے اپریل 1923 کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کا ہندی میں عنوان تھا 'نیراشیہ لیلا'۔ ہندی میں مان سرودور3 اردو میں 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔

گرہ داہ

ستیہ پرکاش کے جنم اُتسو میں لالہ دیو پرکاش نے بہت روپے خرچ کیے تھے۔ اس کا ودھیا آرمبھ سنسکار (تعلیمی آغاز کی رسم) بھی خوب دھوم دھام سے کیا گیا۔ اس کے ہَوا خانے کو ایک چھوٹی سی گاڑی تھی۔ شام کو نوکر اسے ٹہلانے لے جاتا تھا۔ ایک نوکر اسے پاٹھ شالا پہنچانے جاتا۔ دن بھر وہیں بیٹھا رہتا اور اسے ساتھ لے کر گھر آتا۔ کتنا سُشیل (نیک)، ہونہار بالک تھا! گورا مکھڑا، بڑی بڑی آنکھیں، اونچا مَستک پتلے پتلے لال ادھر (لب)، بھرے ہوئے پاؤں۔ اسے دیکھ کر سہسا (خود بخود) منہ سے نکل پڑتا تھا۔ بھگوان اسے جلادیں، پرتاپی (اقبال مند) منشیہ ہوگا۔ اس کی بل بُدھی (قوت فہم) کی پرکھرتا (تیزی) پر لوگوں کو آشچریہ (اچنبھا) ہوتا تھا۔ نتیہ (روزانہ) اس کے مکھ چندر پر ہنسی کھیلتی رہتی تھی۔ کسی نے اسے ہٹھ کرتے یا روتے نہیں دیکھا۔

ورشا کے دن تھے۔ دیوپرکاش پتنی کو لے کر گنگا اسنان کرنے گئے۔ ندی خوب چڑھی ہوئی تھی، مانو اناتھ کی آنکھیں ہوں۔ ان کی پتنی نرملا جل میں بیٹھ کر جل کریڑا (پانی سے کھیل) کرنے لگی۔ کبھی آگے جاتی، کبھی پیچھے جاتی کبھی ڈبکی مارتی، کبھی اَنجلیوں سے چھینٹیں اڑاتی۔ دیوپرکاش نے کہا۔ اچھا اب نکلو، سردی ہوجائے گی۔ نرملا نے کہا۔ کہو، میں چھاتی تک پانی میں چلی جاؤں؟

دیوپرکاش۔ اور جو کہیں پیر پھسل جائے؟

نرملا۔ پیر کیا پھسلے گا!

یہ کہہ کر وہ چھاتی تک پانی میں چلی گئی۔ پتی نے کہا۔ اچھا اب آگے پیر نہ رکھنا، کنتو (لیکن) نرملا کے سر پر موت کھیل رہی تھی۔ یہ جل کریڑا نہیں، مرتیو کریڑا تھی۔ اس نے ایک پگ اور آگے بڑھایا اور پھسل گئی۔ منہ سے ایک چیخ نکلی۔ دونوں ہاتھ سہارے کے لیے اوپر اُٹھے اور پھر جل مگن ہوگئے۔ ایک پل میں پیاسی ندی اسے پی گئی۔ دیوپرکاش کھڑے تولیہ سے دِہ پونچھ رہے تھے۔ ترنت (فوراً) پانی میں کودے، ساتھ کا کہار بھی کودا۔

دو ملاح بھی کود پڑے۔ سب نے ڈبکیاں ماریں، ٹٹولا، پر نرملا کا پتہ نہ چلا۔ تب ڈونگی منگوائی گئی۔ ملاح نے بار بار غوطے مارے پر لاش ہاتھ نہ آئی۔ دیوپرکاش شوک (غم) میں ڈوبے ہوئے گھر آئے۔ ستیہ پرکاش کسی اُپہار (تحفے) کی آشا (امید) سے دوڑا۔ پتا نے گود میں اُٹھا لیا اور بڑے یتن (کوشش) کرنے پر بھی اپنی سسک کو نہ روک سکے۔ ستیہ پرکاش نے پوچھا۔ امّاں کہاں ہیں؟

دیو۔ بیٹا، گنگا نے انھیں نیوتا کھانے کے لیے روک لیا ہے۔

ستیہ پرکاش نے ان کے مکھ کی اُور جگیاسا بھاو (سوالیہ انداز سے) سے دیکھا اور آشئے (مقصد) سمجھ گیا اما اما کہہ کر رونے لگا۔

(۲)

ماترہین بالک (بے ماں کا بچہ) سنسار کا سب سے کرونا جنک پرانی ہے۔ دین سے دین (غریب سے غریب) پرانیوں کو بھی ایشور کا آدھار ہوتا ہے، جو ان کے ہردئے کو سنبھالتا رہتا ہے۔ ماترہین بالک اس آدھار سے ونچت (محروم) ہوتا ہے۔ ماتا ہی اس کے جیون کا ایک ماتر آدھار (صرف سہارا) ہوتی ہے۔ ماتا بنا وہ پنکھ ہین (بے پروبال) پکشی (پرندہ) ہے۔

ستیہ پرکاش کا ایکانت سے پریم ہوگیا۔ اکیلا بیٹھا رہتا۔ برکھشوں میں اسے کچھ کچھ سہانبھوتی (ہمدردی) کا اگیات (نامعلوم) انوبھو ہوتا تھا، جو گھر کے پراڑیوں (لوگوں) سے اسے نہ ملتی تھی۔ ماتا کا پریم تھا، تو سبھی پریم کرتے تھے، ماتا کا پریم اُٹھ گیا، تو سبھی نشٹھُر (بے رحم) ہوگئے۔ پتا کی آنکھوں میں بھی وہ پریم جیوتی نہ رہی۔ دِردِڑ (مفلس) کو کون بھکشا دیتا ہے۔

چھ مہینے بیت گئے۔ سہسا ایک دن اسے معلوم ہوا، میری نئی ماتا آنے والی ہیں۔ دوڑا پتا کے پاس گیا اور پوچھا۔ کیا میری نئی ماتا آئیں گی۔

پتا نے کہا۔ ہاں بیٹا، وے آکر تمھیں پیار کریں گی۔

ستیہ۔ کیا میری ہی ماں سورگ سے آجائے گی؟

دیو۔ ہاں وہی ماتا آجائے گی۔

ستیہ۔ مجھے اسی طرح پیار کریں گی؟

دیوپرکاش اس کا کیا اتر دیتے؟ مگر ستیہ پرکاش اسی دن سے پرسنن من (خوش دل)

رہنے لگا۔ اماں آئے گی! مجھے گود لے کر پیار کرے گی! اب میں انھیں کبھی دق نہ کروں گا، کبھی ضد نہ کروں گا، انھیں اچھی کہانیاں سنایا کروں گا۔

وِواہ کے دن آئے۔ گھر میں تیاریاں ہونے لگیں۔ ستیہ پرکاش خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ میری نئی اماں آئیں۔ بارات میں وہ بھی گیا۔ نئے نئے کپڑے ملے۔ پالکی پر بیٹھا۔ نانی نے اندر بلایا اور اسے گود میں لے کر ایک اشرفی دی۔ وہیں اسے نئی ماتا کے درشن ہوئے۔ نانی نے نئی ماتا سے کہا۔ بیٹی، کیسا، سندر بالک ہے! اسے پیار کرنا۔

ستیہ پرکاش نے نئی ماتا کو دیکھا اور مگدھ ہوگیا۔ بچّے بھی روپ کے اُپاسک ہوتے ہیں۔ ایک لاونیہ مئی مورتی آبھوشن سے لدی سامنے کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اس کا آنچل پکڑ کر کہا۔ اماں۔

کتنا اروچی کر (غیر دلچسپ) شبد تھا، کتنا لجّاجنک (شرم آمیز)، کتنا اپریے (ناپسندیدہ)! وہ للنا جو دیو پریا نام سے سمبودھت (مخاطب) ہوتی تھی، یہ اُتردائتو (ذمہ داری)، تیاگ اور چھما کا سمبودھن (تخاطب) نہ سہہ سکی۔ ابھی وہ پریم اور ولاس کا سکھ سُوپن (خواب راحت) دیکھ رہی تھی۔ یوون کال (جوانی کے دنوں) کی مدمئے وایو ترنگوں (مستی بھری ہواؤں) میں آندولت (ڈول) ہو رہی تھی۔ اس شبد نے اس کے سُوپن کو بھنگ کردیا۔ کچھ رُشٹ (ناراض) ہوکر بولی۔ مجھے امّاں مت کہو۔

ستیہ پرکاش وِسمِت نیتروں (متعجب نظروں) سے دیکھا۔ اس کا بال سُوپن بھی بھنگ ہوگیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ نانی نے کہا۔ بیٹی، دیکھو، لڑکے کا دل چھوٹا ہوگیا۔ وہ کیا جانے، کیا کہنا چاہیے امّاں کہہ دیا تو تمھیں کون سی چوٹ لگ گئی؟

دیوپریا نے کہا۔ مجھے امّاں نہ کہے۔

(۳)

سوت کا پُتر وِماتا (دوسری ماں) کی آنکھوں میں کیوں اتنا کھٹکتا ہے؟ اس کا نرنے (فیصلہ) آج تک کسی منوبھاؤ کے پنڈت (نفسیات داں) نے نہیں کیا۔ ہم کس گنتی میں ہیں۔ دیوپریا جب تک گربھنی (حاملہ) نہ ہوئی، وہ ستیہ پرکاش سے کبھی کبھی باتیں کرتی، کہانیاں سُناتی، کنتو (لیکن) گربھنی ہوتے ہی اس کا بیوہار کٹھور ہوگیا۔ اور پرسوکال (پیدائش کا زمانہ) جیوں جیوں نکٹ آتا تھا، اس کی کٹھورتا بڑھتی ہی جاتی تھی۔ جس دن اس کی گود میں

ایک چاند سے بچّے کا آگمن (آمد) ہوا ستیہ پرکاش خوب اُچھلا کودا اور سُورگریہہ (جائے پیدائش) میں دوڑا ہوا بچّے کو دیکھنے لگا۔ بچّہ دیوپریا کی گود میں سو رہا تھا۔ ستیہ پرکاش نے بڑی اتسکتا (بے چینی) سے بچّے کو ماتا کی گود سے اُٹھانا چاہا کہ سہسا (اچانک) دیوپریا نے سروش سُور (ناگوار لہجے) میں کہا۔ خبردار، اسے مت چھونا، نہیں تو کان پکڑ کر اُکھاڑ لوں گی!

بالک اُلٹے پاؤں لوٹ آیا اور کوٹھے پر جاکر خوب رویا۔ کتنا سندر بچّہ ہے! میں اسے گود میں لے کر بیٹھتا، تو کیسا مزا آتا! میں اسے گراتا تھوڑے ہی، پھر انھوں نے کیوں مجھے جھڑک دیا؟ بھولا بالک کیا جانتا تھا کہ اس جھڑکی کا کارن ماتا کی ساودھانی نہیں، کچھ اور ہی ہے۔

ایک دن شِشو (بچّہ) سو رہا تھا۔ اس کا نام گیان پرکاش رکھا گیا تھا۔ دیوپریا اسنان گار (غسل خانے) میں تھی۔ ستیہ پرکاش چپکے سے آیا اور بچّے کا اوڑھنا ہٹاکر اسے انوراگ مئے نیتروں سے (محبت آمیز نظروں سے) دیکھنے لگا۔ اس کا جی کتنا چاہا کہ اسے گود میں لے کر پیار کروں، پر ڈر کے مارے اس نے اسے اُٹھایا نہیں، کیول اس کے کپولوں کو چومنے لگا۔ اتنے میں دیوپریا نکل آئی۔ ستیہ پرکاش کو بچّے کو چومتے دیکھ کر آگ ہوگئی۔ دور ہی سے ڈانٹا، ہٹ جا وہاں سے!

ستیہ پرکاش ماتا کو دین نیتروں (مایوس نظروں) سے دیکھتا ہوا باہر نکل آیا!

سندھیا سمئے اس کے پتا نے پوچھا۔ تم للاّ کو کیوں رُلایا کرتے ہو؟

ستیہ۔ میں تو اسے کبھی نہیں رُلاتا۔ اماں کھلانے کو نہیں دیتیں۔

دیو۔ جھوٹ بولتے ہو۔ آج تم نے بچّے کو چٹکی کاٹی۔

ستیہ۔ جی نہیں، میں تو اس کی مُچھیاں لے رہا تھا۔

دیو۔ جھوٹ بولتا ہے۔

ستیہ۔ میں جھوٹ نہیں بولتا۔

دیوپرکاش کو کرودھ آگیا۔ لڑکے کو دو تین طمانچے لگائے۔ پہلی بار یہ تاڑنا (سزا) ملی، اور نراپرادھ (بغیر جرم)! اس نے اس کے جیون کی کایا پلٹ کردی۔

اس دن سے ستیہ پرکاش کے سوبھاو میں ایک وچتر (غیر معمولی) پری ورتن (تبدیلی) دکھائی دینے لگا۔ وہ گھر میں بہت کم آتا۔ پتا آتے، تو ان سے منہ چھپاتا پھرتا۔ کوئی کھانا کھانے کو بلانے آتا، تو چوروں کی بھانتی دُبکا ہوا جاکر کھا لیتا، نہ کچھ مانگتا، نہ کچھ بولتا۔ پہلے اتینت (بہت زیادہ) کشاگرہ بدّھی (سریع الفہم) تھا۔ اس کی صفائی، سلیقے اور پھرتی پر لوگ مُگدھ (فریفتہ) ہوجاتے تھے۔ اب وہ پڑھنے سے جی چُراتا، میلے کچیلے کپڑے پہنے رہتا۔ گھر میں کوئی پریم کرنے والا نہ تھا۔ بازار کے لڑکوں کے ساتھ گلی گلی گھومتا، کنکوّے لوٹتا، گالیاں بکنا بھی سیکھ گیا۔ شریر بھی دُربل ہوگیا۔ چہرے کی کانتی (چمک) غائب ہوگئی۔ دیوپرکاش کو اب آئے دن اس کی شرارتوں کے اُلاہنے (شکایتیں) ملنے لگے اور ستیہ پرکاش نتیہ (روزانہ) گھڑکیاں اور طمانچے کھانے لگا، یہاں تک کہ اگر وہ گھر میں کسی کام سے چلا جاتا، تو سب لوگ دُر دُر کرکے دوڑاتے۔ گیان پرکاش کو پڑھانے کے لیے ماسٹر آتا تھا۔ دیوپرکاش اسے روز سیر کرانے ساتھ لے جاتے ہنس مکھ لڑکا تھا۔ دیو پریا اُسے ستیہ پرکاش کے سائے سے بھی بچاتی رہتی تھی۔ دونوں لڑکوں میں کتنا انتر تھا! ایک صاف ستھرا، سندر کپڑے پہنے، شیل (نیکی) اور وِنئے (خوش بختی) کا پُتلا، سچ بولنے والا۔ دیکھنے والوں کے منہ سے اناں یاس (خود بخود) ہی دُعا نکل آتی تھی۔ دوسرا میلا، نٹ کھٹ، چوروں کی طرح منہ چھپائے ہوئے، منہ پھٹ، بات بات پر گالیاں بکنے والا۔ ایک ہرا بھرا پودھا تھا، پریم سے پلوت (سرشار)، اسنیہ سے سنچت (شفقت سے مالا مال)، دوسرا سوکھا ہوا، ٹیڑھا، پلوہین (کونپلوں سے محروم) نو وِرکش (شجر نو) تھا جس کی جڑوں کو ایک مدت سے پانی نہیں نصیب ہوا۔ ایک کو دیکھ کر پتا کی چھاتی ٹھنڈی ہوتی تھی، دوسرے کو دیکھ کر دیہہ (بدن) میں آگ لگ جاتی تھی۔

آشچریہ (حیرت) یہ تھا کہ ستیہ پرکاش کو اپنے چھوٹے بھائی سے لیش ماتر (ذرا سی) بھی ایرشیا (جلن) نہ تھی۔ اگر اس کے ہردئے میں کوئی کومل بھاو شیش (باقی) رہ گیا تھا، تو وہ اپنے بھائی کے پرتی اسنیہہ (محبت) تھا اس مروبھومی (ریگستان) میں یہی ہریالی تھی۔ ایرشیا (جلن) سامیہ بھاو (برابری کے احساس) کی گھوتک (اظہار) ہے۔ ستیہ پرکاش اپنے بھائی کو اپنے سے کہیں اونچا کہیں بھاگیہ شالی سمجھتا تھا، اس میں ایرشیا کا بھاو ہی لوپ ہوگیا تھا۔

گھرنا سے نفرت اُتپن (پیدا) ہوتی ہے۔ پریم سے پریم۔ گیان پرکاش بھی بڑے بھائی کو چاہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا پکش (اُورا) لے کر اپنی ماں سے واد وواد کر کہتا، بھیّا کی اچکن پھٹ گئی ہے، آپ نئی اچکن کیوں نہیں بنوا دیتیں؟ ماں اُتر دیتیں۔ اس کے لیے وہ ہی اچکن اچھی ہے۔ ابھی کیا، کبھی تو وہ ننگا پھرے گا۔ گیان پرکاش بہت چاہتا تھا کہ اپنے جیب خرچ سے بچا کر کچھ اپنے بھائی کو دے، پر ستیہ پرکاش کبھی اسے سویکار نہ کرتا تھا، واستو (حقیقت) میں جتنی دیر وہ چھوٹے بھائی کے ساتھ رہتا، اتنی دیر اُسے ایک شانتی مئے آنند (سکوں آفریں لطف) کا انوبھو ہوتا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ سدبھاوں (نیک نیتی) کے سمراجیہ (مملکت) میں وچارنے لگتا۔ اس کے مکھ سے کوئی بھدی اور اپریے (ناپسندیدہ) بات نہ نکلتی۔ ایک چھن (پل) کے لیے اس کی سوئی ہوئی آتما جاگ اُٹھتی۔

ایک بار کئی دن تک ستیہ پرکاش مدرسے نہ گیا۔ پتا نے پوچھا۔ تم آج کل پڑھنے کیوں نہیں جاتے؟ کیا سوچ رکھا ہے کہ میں نے تمھاری زندگی بھر کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

ستیہ۔ میرے اوپر جرمانے اور فیس کے کئی روپے ہوگئے ہیں۔ جاتا ہوں تو درجے سے نکال دیا جاتا ہوں۔

دیو۔ فیس کیوں باقی ہے؟ تم تو مہینے مہینے لے لیا کرتے ہو نا؟

ستیہ۔ آئے دن چندے لگا کرتے ہیں، فیس کے روپے چندے میں دے دیے۔

دیو۔ اور جرمانہ کیوں ہوا؟

ستیہ۔ فیس نہ دینے کے کارن۔

دیو۔ تم نے چندہ کیوں دیا!

ستیہ۔ گیانو نے چندہ دیا تو میں نے بھی دیا۔

دیو۔ تم گیانو سے جلتے ہو؟

ستیہ۔ میں گیانو سے کیوں جلنے لگا۔ یہاں ہم اور وہ دو ہیں، باہر ہم اور وہ ایک سمجھے جاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ مرے پاس کچھ نہیں ہے۔

دیو۔ کیوں، یہ کہتے شرم آتی ہے؟

ستیہ۔ جی ہاں آپ کی بدنامی ہوگی۔

دیو۔ اچھا تو آپ میری مان رکشا (عزت بچایا) کرتے ہیں۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ پڑھنا اب

مجھے منظور نہیں ہے مرے پاس اتنا روپیہ نہیں کہ تمھیں ایک ایک کلاس میں تین تین سال پڑھاؤں اور اوپر سے تمھارے خرچ کے لیے بھی پرتی ماس (ہر مہینے) کچھ دوں۔ گیان بابو تم سے کتنا چھوٹا ہے، لیکن تم سے ایک ہی درجے نیچے ہے۔ تم اس سال ضرور ہی فیل ہوگے اور وہ ضرور ہی پاس ہوکر اگلے سال تمھارے ساتھ ہوجائے گا۔ تب تو تمھارے منہ میں کالک لگے گی؟

ستیہ۔ ودھا میرے بھاگ ہی میں نہیں ہے۔

دیو۔ تمھارے بھاگ میں کیا ہے۔

ستیہ۔ بھیکھ مانگنا۔

دیو۔ تو پھر بھیکھ مانگو۔ میرے گھر سے نکل جاؤ۔

دیوپریا بھی آگئی۔ بولی۔ شرماتا تو نہیں، اور باتوں کا جواب دیتا ہے!

ستیہ۔ جس کے بھاگیہ میں بھیکھ مانگنا ہوتا ہے، وہی بچپن میں اناتھ ہوجاتے ہیں۔

دیوپریا۔ یہ جلی کٹی باتیں اب مجھ سے نہ سہی جائیں گی۔ میں خون کا گھونٹ پی پی کر رہ جاتی ہوں۔

دیوپرکاش۔ بے حیا ہے۔ کل سے اس کا نام کٹوا دوں گا۔ بھیکھ مانگنی ہے تو بھیکھ ہی مانگے۔

(۵)

دوسرے دن ستیہ پرکاش نے گھر سے نکلنے کی تیاری کردی۔ اس کی عمر اب 16 سال کی ہوگئی تھی۔ اتنی باتیں سن کر اب اسے اس گھر میں رہنا اساہیہ (ناقابل برداشت) ہوگیا۔ جب ہاتھ پاؤں نہ تھے، کشور اوستھا (بچپنے) کی اسمرتھتا (مجبوری) تھی، تب تک اوہیلنا (مخالفت)، نرادر (بے عزتی)، نٹھرتا (ظلم)، بھرتسنا (ملامت)، سب کچھ سہہ کر گھر میں رہتا تھا۔ اب ہاتھ پاؤں ہوگئے تھے، اس بندھن میں کیوں رہتا۔ آتم ابھیمان (خود داری) آشا کی بھانتی (طرح) بہت چرجیوی ہوتا ہے۔

گرمی کے دن تھے۔ دوپہر کا سمئے۔ گھر کے سب پرانی (لوگ) سو رہے تھے۔ ستیہ پرکاش نے اپنی دھوتی بغل میں دبائی، چھوٹا سا بیگ ہاتھ میں لیا اور چاہتا تھا کہ چپکے سے بیٹھک سے نکل جائے کہ گیانو آگیا اور اسے کہیں جانے کو تیار دیکھ کر بولا۔ کہاں جاتے ہو بھیا؟

ستیہ۔ جاتا ہوں کہیں نوکری کروں گا۔

گیانو۔ میں جاکر اماں سے کہہ دیتا ہوں۔

ستیہ۔ تو پھر میں تم سے چھپ کر چلا جاؤں گا۔

گیانو۔ کیوں چلے جاؤ گے؟ تمھیں میری ذرا بھی محبت نہیں؟

ستیہ پرکاش نے بھائی کو گلے سے لگا کر کہا۔ تمھیں چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا، لیکن جہاں کوئی پوچھنے والا نہیں ہے، وہاں پڑے رہنا بے حیائی ہے۔ کہیں دس پانچ کی نوکری کرلوں گا اور پیٹ پالتا رہوں گا۔ اور کس لائق ہوں؟

گیانو۔ تم سے اماں کیوں اتنا چڑھتی ہیں؟ مجھے تم سے ملنے کو منع کیا کرتی ہیں؟

ستیہ۔ میرے نصیب کھوٹے ہیں، اور کیا۔

گیانو۔ تم لکھنے پڑھنے میں جی نہیں لگاتے؟

ستیہ۔ لگتا ہی نہیں کیسے لگاؤں؟ جب کوئی پرواہ نہیں کرتا تو میں بھی سوچتا ہوں۔ اونہہ، یہی نہ ہوگا، ٹھوکر کھاؤں گا۔ بلا سے!

گیانو۔ مجھے بھول تو نہ جاؤ گے؟ میں تمھارے پاس خط لکھا کروں گا، مجھے بھی ایک بار اپنے یہاں بلانا۔

ستیہ۔ تمھارے اسکول کے پتے سے چٹھی لکھوں گا۔

گیانو۔ (روتے روتے) مجھے نہ جانے کیوں تمھاری بڑی محبت لگتی ہے!

ستیہ۔ میں تمھیں سدیو یاد رکھوں گا۔

یہ کہہ کر اس نے پھر بھائی کو گلے سے لگا لیا اور گھر سے نکل پڑا۔ پاس ایک کوڑی بھی نہ تھی اور وہ کلکتے جا رہا تھا۔

(۶)

ستیہ پرکاش کلکتے کیوں کر پہنچا، اس کا ورتانت (تفصیل) لکھنا وِیَرتھ (بے کار) ہے۔ یووکوں (نوجوانوں) میں دُساہس (منفی حوصلے) کی ماترا (مقدار) ادھِک (زیادہ) ہوتی ہے۔ وے ہوا میں قلعے بنا سکتے ہیں، دھرتی پر ناؤ چلا سکتے ہیں۔ کٹھنائیوں کی انھیں کچھ پروا نہیں ہوتی۔ اپنے اوپر اسیم (حد سے زیادہ) وشواس (اعتماد) ہوتا ہے۔ کلکتے پہنچنا ایسا کشٹ سادھیہ (پریشان کن) نہ تھا۔ ستیہ پرکاش چتر یووک (چالاک نوجوان) تھا۔ پہلے ہی اس نے نشچئے

کرلیا تھا کہ کلکتے میں کیا کروں گا، کہاں رہوں گا۔ اس کے بیگ میں لکھنے کی سامگری (سامان) موجود تھی۔ بڑے شہر میں جیویکا (روزی) کا پرشن (سوال) کٹھن بھی ہے اور سرل بھی ہے۔ سرل ہے ان کے لیے، جو ہاتھ سے کام کرسکتے ہیں، کٹھن ہے ان کے لیے، جو قلم سے کام کرتے ہیں۔ ستیہ پرکاش مزدوری کرنا نیچ کام سمجھتا تھا۔ اس نے ایک دھرم شالہ میں اسباب رکھا۔ بعد میں شہر کے مکھ استھانوں (خاص جگہوں) کا نرکشن (معائینہ) کرکے ایک ڈاک گھر کے سامنے لکھنے کا سامان لے کر بیٹھ گیا اور اَن پڑھ مزدوروں کی چٹھیاں، منی آرڈر آدی (وغیرہ) لکھنے کا ویوسائے (کام) کرنے لگا۔ پہلے کئی دن تو اس کو اتنے پیسے بھی نہ ملے کہ بھر پیٹ بھوجن کرتا، لیکن دھیرے دھیرے آمدنی بڑھنے لگی۔ وہ مزدوروں سے اتنے وِنئے (ادب) کے ساتھ باتیں کرتا اور ان کے سماچار اتنے وستار (تفصیل) سے لکھتا کہ بس وِے پتر (خط) کو سن کر بہت پرسنن (خوش) ہوتے۔ آشکشت (اَن پڑھ) لوگ ایک سی بات کو دو دو تین تین بار لکھاتے ہیں۔ ان کی دشا ٹھیک ان روگیوں (بیماروں) کی سی ہوتی ہے، جو وید سے اپنی ویتھا (دکھ درد) اور ویدنا (محسوسات) کا وِرتانت (داستان) کہتے نہیں تھکتے۔ ستیہ پرکاش سوتر (نکتے) کو ویاکھیا (وضاحت) کا روپ دے کر مزدوروں کو مگدھ کردیتا تھا۔ ایک سنتشٹ (مطمئن) ہوکر جاتا، تو اپنے کئی اَنّے (دوسرے) بھائیوں کو کھوج لاتا۔ ایک ہی مہینے میں اسے ایک روپے روز ملنے لگا۔ اس نے دھرم شالہ سے نکل کر شہر سے باہر پانچ روپے مہینے پر ایک چھوٹی سی کوٹھری لے لی۔ ایک جون (وقت) کھاتا۔ برتن اپنے ہاتھوں سے دھوتا۔ زمین پر سوتا۔ اسے اپنے نرواسن پر ذرا بھی کھید اور دُکھ نہ تھا۔ گھر کے لوگوں کی کبھی یاد نہ آتی۔ وہ اپنی دشا پر سنتشٹ تھا۔ کیول گیان پرکاش کی پریم یکت (محبت آمیز) باتیں نہ بھولتیں۔ اندھکار میں یہی ایک پرکاش تھا بدائی کا انتم درشئے (آخری منظر) آنکھوں کے سامنے پھرا کرتا۔ جیویکا (روزی روٹی) سے نشچنت (مطمئن) ہوکر اس نے گیان پرکاش کو ایک پتر لکھا۔ اُتّر آیا تو اس کے آنند کی سیما (خوشی کا ٹھکانا) نہ رہی۔ گیانو مجھے یاد کرکے روتا ہے، میرے پاس آنا چاہتا ہے، سواستھیہ (صحت) بھی اچھا نہیں ہے۔ پیاسے کو پانی سے جو ترپتی (راحت) ہوتی ہے وہی ترپتی (راحت) اس پتر سے ستیہ پرکاش کو ہوئی۔ میں اکیلا نہیں ہوں، کوئی مجھے بھی چاہتا ہے۔ مجھے بھی یاد کرتا ہے۔

اسی دن سے ستیہ پرکاش کو یہ چنتا ہوئی کہ گیان کے لیے کوئی اُپہار بھیجوں۔ یووکوں (نوجوانوں) کو متر بہت جلد مل جاتے ہیں۔ ستیہ پرکاش کو بھی کئی یووکوں سے مترتا ہوگئی تھی۔ ان کے ساتھ کئی بار سینما دیکھنے گیا۔ کئی بار بوٹی، بھنگ، شراب کباب کی بھی ٹھہری۔ آئینہ، تیل، کنگھی کا شوق بھی پیدا ہوا، جو کچھ پاتا، اُڑا دیتا، بڑے ویگ (تیزی) سے نیتک پتن (اخلاقی گراوٹ) اور شاریرک وناش (خرابیِ صحت) کی اُور دوڑا چلا جاتا تھا۔ اس پریم پتر (محبت نامے) نے اس کے پیر پکڑ لیے اُپہار کے پریاس (کوشش) نے ان دُویرسنوں کو بروہت کرنا شروع کیا۔ سینما کا چسکا چھوٹا، متروں کو حیلے حوالے کرکے ٹالنے لگا۔ بھوجن بھی روکھا سوکھا کرنے لگا۔ دھن سنچیہ (پیسے جمع کرنے) کی چنتا نے ساری اِچھاؤں (خواہشوں) کو پراست (ہرا) کردیا۔ اس نے نشچیہ (ارادہ) کیا کہ اچھی سی گھڑی بھیجوں۔ اس کا دام کم سے کم چالیس روپے ہوگا۔ اگر تین مہینے تک ایک کوڑی کا بھی اَپ ویَے (فضول خرچ) نہ کروں، تو گھڑی مل سکتی ہے۔ گیانو گھڑی دیکھ کر کیسا خوش ہوگا! امّاں اور بابو جی بھی دیکھیں گے انھیں معلوم ہوجائے گا کہ میں بھوکوں نہیں مر رہا ہوں۔ کفایت کی دُھن میں وہ بہودھا (اکثر) دیا باتی بھی نہ کرتا بڑے سویرے کام کرنے چلا جاتا اور سارے دن دو چار پیسے کی مٹھائی کھاکر کام کرتا رہتا۔ اس کے گراہکوں کی سنکھیا دن دونی ہوتی جاتی تھی۔ چٹھی پتری کے اتیرکت (علاوہ) اب اس نے تار لکھنے کا بھی ابھیاس کرلیا تھا۔ دو ہی مہینے میں اس کے پاس پچاس روپے ایکتر (جمع) ہوگئے اور جب گھڑی کے ساتھ سنہری چین کا پارسل بنا کر گیانو کے نام بھیج دیا، تو اس کا چت اتنا اتساہت (پُرجوش) تھا مانو کسی نی سنتان (بے اولاد) پُروش کے بالک ہوا ہو۔

(۷)

گھر کتنی کومل، پوتر، منوہر اسمرتیوں (یادوں) کو جاگرت (روشن) کردیتا ہے! یہ پریم کا نواس استھان ہے۔ پریم نے بہت تپسیا کرکے یہ وردان پایا ہے۔

کشور اَوستھا (بچپن) میں گھر ماتا پتا، بھائی بہن، سکھی سہیلی کے پریم کی یاد دلاتا ہے۔ پروڑھ اَوستھا (بڑھاپے) میں گرہنی (گھروالی) اور بال بچوں کے پریم کی۔ یہی وہ لہر ہے، جو مانو جیون کو ماتر استھر (قائم) رکھتا ہے، اسے سمندر کی ویگ وتی (تیز رفتار) لہروں میں بہنے اور چٹانوں سے ٹکرانے سے بچاتا ہے۔ یہی وہ منڈپ ہے، جو جیون کو سمست (تمام) وِگھن

بادھاؤں (خلل انداز رکاوٹوں) سے سُر کشت (محفوظ) رکھتا ہے۔

ستیہ پرکاش کا گھر کہاں تھا؟ وہ کون سی شکتی تھی، جو کلکتے کے وراٹ پرلو بھنوں (گہری حرص و ہوس) سے اس کی رکشا (حفاظت) کرتی تھی؟ ماتا کا پریم، پتا کا اسنیہہ (شفقت)، بال بچوں کی چنتا؟ نہیں، اُن کا رکشک (محافظ)، اُدھارک (نجات دہندہ)، اس کا پریتوشک (اطمینان بخشنے والا) کیول گیان پرکاش کا اسنیہہ (محبت) تھا۔ اسی کے نِمِتّ (مقصد سے) وہ ایک ایک پیسے کی کفایت کرتا تھا، اسی کے لیے وہ کٹھن پریشرم (محنت) کرتا تھا اور دھنوپارجن (پیسہ کمانے) کے نئے نئے اُپائے (ترکیبیں) سوچتا تھا۔ اسے گیان پرکاش کے پتروں سے معلوم ہوا تھا کہ ان دنوں دیوپرکاش کی آرتھک استھیتی (معاشی حالت) اچھی نہیں ہے۔ وہ ایک گھر بنوا رہے ہیں، جس میں بیے (خرچ) انومان سے ادھک ہوجانے کے کارن رِن (قرض) لینا پڑا ہے، اس لیے اب گیان پرکاش کو پڑھانے کے لیے گھر پر ماسٹر نہیں آتا۔ تب سے ستیہ پرکاش پرتی ماہ گیانو کے پاس کچھ نہ کچھ اوشئے بھیج دیتا تھا۔ وہ اب کیول پتر لیکھک (خط کا محرر) نہ تھا، لکھنے کے سامان کی ایک چھوٹی سی دُکان بھی اس نے کھول لی تھی۔ اس سے اچھی آمدنی ہوجاتی تھی اس طرح پانچ ورش بیت گئے۔ راسک متروں نے جب دیکھا کہ اب یہ ہتھے نہیں چڑھتا، تو اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا۔

(۸)

سندھیا کا سمئے تھا۔ دیوپرکاش اپنے مکان میں بیٹھے دیو پریا سے گیان پرکاش کے وواہ کے سمبندھ (متعلق) میں باتیں کر رہے تھے۔ گیانو اب 17 ورش کا سندر یووک تھا۔ بال وِواہ (بچپنے کی شادی) کے ورودھی (مخالف) ہونے پر بھی دیو پرکاش اب اس شبھ مہورت (اچھی ساعت) کو نہ ٹال سکتے تھے۔ وِشیشتہ (خاص کر) جب کوئی مہاشئے (حضرت) پچاس ہزار روپے دہیز دینے کو پرستت (موجود) ہوں۔

دیوپرکاش۔ میں تو تیار ہوں، لیکن تمھارا لڑکا بھی تو تیار ہو!

دیوپریا۔ تم بات چیت پکّی کرلو، وہ تیار ہو ہی جائے گا۔ سبھی لڑکے پہلے نہیں نہیں کرتے ہیں۔

دیو۔ گیانو کا انکار کیول سنکوچ کا انکار نہیں ہے، وہ سدھانت (اصولوں پر مبنی) کا انکار ہے۔ وہ صاف صاف کہہ رہا ہے کہ جب تک بھیّا کا وِواہ نہ ہوگا، میں اپنا وواہ کرنے پر

راضی نہیں ہوں۔

دیوپریا۔ اس کی کون چلاوے، وہاں کوئی رکھیلی رکھ لی ہوگی، وواہ کیوں کرے گا؟ وہاں کوئی دیکھنے جاتا ہے؟

دیو۔ (جھنجھلا کر) رکھیلی رکھ لی ہوتی تو تمھارے لڑکے کو چالیس روپے مہینے نہ بھیجتا اور نہ وہ چیزیں ہی دیتا، جو پہلے مہینے سے اب تک برابر دیتا چلا آتا ہے۔ نہ جانے کیوں تمھارا من اس کی اُور (طرف) سے اتنا میلا ہوگیا ہے! چاہے وہ جان نکال کر بھی دے دے، لیکن تم نہ پسیجوگی۔ دیوپریا ناراض ہوکر چلی گئی۔ دیوپرکاش اس سے یہی کہلانا چاہتے تھے کہ پہلے ستیہ پرکاش کا وواہ کرنا اُچت (ٹھیک) ہے، کنتو (لیکن) وہ کبھی اس پرسنگ (موضوع) کو آنے ہی نہ دیتی تھی۔ سویم (خود) دیوپرکاش کی یہ ہاردک (دلی) اِچّھا (خواہش) تھی کہ پہلے بڑے لڑکے کا وواہ کرلے، پر انھوں نے بھی آج تک ستیہ پرکاش کو کوئی پتر نہیں لکھا تھا۔ دیوپریا کے چلے جانے کے بعد انھوں نے آج پہلی بار ستیہ پرکاش کو پتر لکھا پہلے اتنے دنوں تک چپ چاپ رہنے کے لیے چھما مانگی، تب سے ایک بار گھر آنے کا پریم آگرہ (محبت بھری التجا) کیا۔ لکھا، اب میں کچھ ہی دنوں کا مہمان ہوں۔ میری ابھیلاشا (تمنا) ہے کہ تمھارا اور تمھارے چھوٹے بھائی کا وواہ دیکھ لوں۔ مجھے بہت دُکھ ہوگا، یدی (اگر) تم میری وِنے (التماس) سویکار نہ کروگے۔ گیان پرکاش کے اسمنجس (تذبذب) کی بات بھی لکھی، انت میں اس بات پر زور دیا کہ کسی اور وچار سے نہیں، تو گیانو کے پریم کے ناطے ہی تمھیں اس بندھن میں پڑنا ہوگا۔

ستیہ پرکاش کو یہ پتر ملا، تو اسے بہت کھید ہوا۔ میرے بھراتہ اسنہہ (برادرانہ محبت) کا یہ پرینام (نتیجہ) ہوگا مجھے نہ معلوم تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ ایرشیا مئے آنند (جلن آمیز مسرت) ہوا کہ اماں اور دادا کو اب تو کچھ مانسک پیڑا (ذھنی اذیت) ہوگی۔ میری انھیں کیا چنتا تھی؟ میں تو مر بھی جاؤں تو بھی ان کی آنکھ میں آنسو نہ آئیں۔ سات ورش ہوگئے، کبھی بھول کر بھی پتر نہ لکھا کہ مرا ہے یا جیتا ہے۔ اب کچھ چیتاونی (تنبیہ) ملے گی۔ گیان پرکاش انت (آخر) میں وواہ کرنے پر راضی تو ہوجائے گا، لیکن سہج (آسانی) میں نہیں۔ کچھ نہ ہو تو مجھے ایک بار اپنے انکار کے کارن (وجوہات) لکھنے کا اوسر ملا۔ گیانو کو مجھ

سے پریم ہے، لیکن اس کے کارن میں پاریوارک انیایہ (گھریلو نا انصافی) کا دوشی نہ بنوں گا۔ ہمارا پاریوارک جیون (گھریلو زندگی) سمپوڑتا (پوری طرح) انیائے مئے (مبنی بر انصاف نہیں) ہے۔ یہ کُمتی اور وَیمنسیئے (دشمنی)، کُررتا (ظلم) اور نِرشتا (زیادتی) کا بیجا روپن (بیج بونا) کرتا ہے۔ اسی مایا میں پھنس کر منشیہ اپنی سنتان؟ کا شترو (دشمن) ہوجاتا ہے۔ نا میں آنکھوں دیکھ کر یہ مکھی نہ نگلوں گا۔ میں گیان کو سمجھاؤں گا اوشئے۔ میرے پاس جو کچھ جمع ہے وہ سب اس کے وِواہ کے نمت (کے لیے) ارپن (نیوچھاور) کردوں گا۔ بس، اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کرسکتا۔ اگر گیانو بھی اویواہت (غیرشادی شدہ) رہے تو سنسار کون سونا ہوجائے گا؟ ایسے پتا کا پُتر کیا ونش پرمپرا (خاندانی روایت) کا پالن (تکمیل) نہ کرے گا؟ کیا اس کے جیون میں پھر وہی ابھنے (ڈرامہ) نہ دُہرایا جائے گا، جس نے میرا سروناش (برباد) کردیا؟

دوسرے دن ستیہ پرکاش نے پانچ سو روپے پتا کے پاس بھیجے اور پتر کا اُتّر لکھا کہ میرا اہوبھاگیہ (خوش قسمتی) جو آپ نے مجھے یاد کیا۔ گیانو کا وواہ نشچت (طے) ہوگیا، اس کی بدھائی (مبارک باد)! ان روپیوں سے نوودھو (نئی دلہن) کے لیے کوئی آبھوشن (زیور) بنوا دیجیے گا۔ رہی میرے ِوواہ کی بات۔ میں نے اپنی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا ہے اور میرے سر پر جو کچھ بیتا ہے، اس پر دھیان دیتے ہوئے یدی میں کُٹمب پاش میں پھنسو تو مجھ سے بڑا الّو سنسار میں نہ ہوگا۔ مجھے آشا (امید) ہے، آپ مجھے چھما کریں گے۔ وواہ کی چرچا (بات) ہی سے میرے ہردئے کو آگھات (چوٹ) پہنچتا ہے۔

دوسرا پتر گیان پرکاش کو لکھا کہ ماتا پتا کی آگیا (حکم) کو شرودھاریہ (بجا لاؤ) کرو۔ میں اَن پڑھ مورکھ (بے وقوف)، بدھی ہین (بے عقل) آدمی ہوں۔ مجھے وِواہ کرنے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے۔ میں تمھارے وواہ کے شبھ اوسر (شادی کی باسعید تقریب) میں سمّلت (شریک) نہ ہوسکوں گا۔ لیکن میرے لیے اس سے بڑھ کر آنند (لطف) اور سنتوش کا وِشئے (موضوع) نہیں ہوسکتا۔

(۹)

دیو پرکاش یہ پڑھ کر اواک (لاجواب) رہ گئے۔ پھر آگرہ (درخواست) کرنے کا ساہس نہ ہوا۔ دیوپریا نے ناک سکوڑ کر کہا۔ یہ لونڈا دیکھنے کو سیدھا ہے، ہے زہر کا بجھایا ہوا! کیسا سو کوس سے بیٹھا ہوا برچھیوں سے چھید رہا ہے۔

کنتو گیان پرکاش نے یہ پتر پڑھا تو اسے مَرماگھات (پوشیدہ اذیت) پہنچا۔ دادا اور اماّں کے انیائے (نا انصافی) نے ہی انھیں یہ بھیشن ورت (سخت عہد) دھارن (لینے) کرنے پر بادھیہ (مجبور) کیا ہے۔ انہی نے انھیں نِرواسِت (جلا وطن) کیا ہے اور شاید سدا کے لیے۔ نہ جانے اماّں کو ان سے کیوں اتنی جلن ہوئی۔ مجھے تو اب یاد آتا ہے کہ کشور اوستھا (لڑکپن) ہی سے وے بڑے آگیا کاری (حکم بجا لانے والے)، وِنئے شیل (حلیم طبع) اور گمبھیر (سنجیدہ) تھے۔ اماں کی باتوں کا انھیں جواب دیتے نہیں سنا۔ میں اچھے سے اچھا کھاتا تھا، پھر بھی ان کے تیور میلے نہ ہوئے، حالانکہ انھیں جلنا چاہیے تھا۔ ایسی دشا میں اگر انھیں گرہستیہ جیون (گھریلو زندگی) سے گھِرنا (نفرت) ہوگئی، تو آشچریہ (حیرت) ہی کیا؟ پھر میں ہی کیوں اس وپتی (مصیبت) میں پھنسوں؟ کون جانے مجھے بھی ایسی ہی پرستھیتی (حالات) کا سامنا کرنا پڑے۔ بھیاّ نے بہت سوچ سمجھ کر یہ دھارنا (پختہ ارادہ) کی ہے۔

سندھیا سمئے جب اس کے ماتا پتا بیٹھے اسی سمسیا (مسئلے) پر غور و فکر کر رہے تھے۔

گیان پرکاش نے آکر کہا۔ میں کل بھیاّ سے ملنے جاؤں گا۔

دیوپریا۔ کیا کلکتے جاؤ گے؟

گیان۔ جی ہاں۔

دیوپریا۔ انہی کو کیوں نہیں بلاتے؟

گیان۔ انھیں کون منہ لے کر بلاؤں؟ آپ لوگوں نے پہلے ہی میرے منہ میں کالک لگا دی ہے۔ ایسا دیوپُرش آپ لوگوں کے کارن ودیش میں ٹھوکریں کھا رہا ہے اور میں اتنا نِرلج (بے شرم) ہو جاؤں کہ ......

دیو پریا۔ اچھا چپ رہ، نہیں بیاہ کرنا ہے، نہ کر، جلے پر نون مت چھڑک! ماتا پتا کا دھرم ہے، اس لیے کہتی ہوں، نہیں تو یہاں ٹھینگے کی پرواہ نہیں ہے۔ تو چاہے بیاہ کر، چاہے کنوارا رہ پر میری آنکھوں سے دور ہو جا۔

گیان۔ کیا میری صورت سے بھی گھِرنا ہوگئی؟

دیوپریا۔ جب تو ہمارے کہنے ہی میں نہیں، تو جہاں چاہے رہ۔ ہم بھی سمجھ لیں گے کہ بھگوان نے لڑکا ہی نہیں دیا۔

دیو۔ کیوں ویرتھ (بے کار) میں ایسے کٹو وچن (بری باتیں) بولتی ہو؟

گیان۔ اگر آپ لوگوں کی یہی اِچّھا (خواہش) ہے، تو یہی ہوگا۔ دیوپرکاش نے دیکھا کہ بات کا بتنگڑ ہوا چاہتا ہے، گیان پرکاش کو اشارے سے ٹال دیا اور پتنی کے کرودھ کو شانت کرنے کی چیشٹا (کوشش) کرنے لگے۔ مگر دیوپریا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور بار بار کہتی تھی، میں اس کی صورت نہیں دیکھوں گی۔ انت میں دیوپرکاش نے چڑ کر کہا۔ تو تمھیں نے کٹ وچن کہہ کر اسے اُتّیجت (مشتعل) کردیا۔

دیوپریا۔ یہ سب وش اسی چانڈال نے بویا ہے، جو یہاں سے سات سمندر پار بیٹھا مجھے مٹی میں ملانے کا اُپائے کر رہا ہے۔ میرے بیٹے کو مجھ سے چھیننے کے لیے اس نے یہ پریم کا سوانگ بھرا ہے میں اس کی نس نس پہچانتی ہوں۔ اس کا یہ منتر میری جان لے کر چھوڑے گا، نہیں تو میرا گیانو، جس نے کبھی میری بات کا جواب نہیں دیا، یوں مجھے نہ جلاتا!

دیو۔ ارے، تو کیا وہ وواہ ہی نہ کرے گا! ابھی غصّے میں اناپ شناپ بک گیا ہے۔ ذرا شانت ہوجائے گا تو میں سمجھا کر راضی کردوں گا۔

دیوپریا۔ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

دیوپریا کی آشنکا (شک) ستیہ (صحیح) نکلی۔ دیوپرکاش نے بیٹے کو بہت سمجھایا۔ کہا۔ تمھاری ماتا اس شوک سے مر جائے گی، کنتو کچھ اثر نہ ہوا۔ اس نے ایک بار "نہیں" کرکے "ہاں" نہ کی۔ نِدان پتا بھی نراش ہوکر بیٹھ رہے۔

تین سال تک پرتی ورش وِواہ کے دنوں میں یہ پرشن (سوال) اٹھتا رہا، پر گیان پرکاش اپنی پرتگیا (عہد) پر اٹل رہا۔ ماتا کا رونا دھونا نشپھل (بے فائدہ) رہا۔ ہاں اس نے ماتا کی ایک بات مان لی۔ وہ بھائی سے ملنے کلکتے نہ گیا۔

تین سال سے گھر میں بڑا پریورتن (تبدیلی) ہوگیا۔ دیوپریا کی تینوں کنیاؤں کا وِواہ ہوگیا۔ اب گھر میں اس کے سوا کوئی استری نہ تھی۔ سونا گھر اسے پھاڑے کھاتا تھا۔ جب نراشئے (ناامیدی) اور کرودھ سے پاگل ہوجاتی تو ستیہ پرکاش کو خوب جی بھر کر کوستی! مگر دونوں بھائیوں میں پریم پتر ویوہار (خط و کتابت) برابر ہوتا رہتا تھا۔

دیوپرکاش کے سوبھاؤ میں ایک وچتر (عجیب) اُداسینتا (مایوسی) پرکٹ (ظاہر) ہونے لگی۔ انھوں نے پنشن لے لی تھی اور پرایہ (عام طور) دھرم گرنتھوں کا ادھین (مطالعہ) کیا

کرتے تھے۔ گیان پرکاش نے بھی اچاریہ کی اُپادھی (سند) پراپت (حاصل) کرلی تھی۔ اور ایک ودھیالیہ میں ادھیاپک ہوگئے تھے۔ دیو پریا اب سنسار میں اکیلی تھی۔

دیوپریا اپنے پتر کو گرہستی (گھریلو زندگی) کی اُور کھینچنے کے لیے نتیہ (روزانہ) ٹونے ٹوٹکے کیا کرتی۔ برادری میں کون سی کنیا سندری ہے، گُن وتی (باصلاحیت) ہے، سشکشت (پڑھی لکھی) ہے۔ اس کا بکھان کیا کرتی، پر گیان پرکاش کو ان باتوں کے سننے کی بھی فرصت نہ تھی۔

محلّے کے اور گھروں میں نتیہ ہی وِواہ ہوتے رہتے تھے۔ بہوئیں آتی تھیں، ان کی گود میں بچّے کھیلنے لگتے تھے، گھر گلزار ہوجاتا تھا۔ کہیں بدائی ہوتی تھی، کہیں بدھائیاں (مبارک بادیاں) آتی تھیں، کہیں گانا بجانا ہوتا تھا، کہیں باجے بجتے تھے۔ یہ چہل پہل دیکھ کر دیو پریا کا چت چنچل ہوجاتا۔ اسے معلوم ہوتا، میں ہی سنسار میں سب سے ابھاگنی ہوں۔ میرے ہی بھاگیہ میں یہ سکھ بھوگنا نہیں بدا ہے۔ بھگوان ایسا بھی کوئی دن آئے گا کہ میں اپنی بہو کا مکھ چندر دیکھوں گی، اس کے بالکوں کو گود میں کھلاؤں گی۔ وہ بھی کوئی دن ہوگا کہ مرے گھر میں بھی آنند اُتسو (خوشیوں) کے مدُھر گان کی تانیں اٹھیں گی! رات دن یہ ہی باتیں سوچتے سوچتے دیو پریا کی دشا اُنمادنی (پاگل) کی سی ہوگئی۔ آپ ہی آپ ستیہ پرکاش کو کوسنے لگتی۔ وہی میرے پرانوں کا گھاتک ہے۔ تلِنتا (کھوجانا) اُنماد (پاگل پن) کا پردھان گُن (واضح خصوصیت) ہے۔ تلِنتا اتینت (بہت زیادہ) رچنا شیل (تخلیقی) ہوتی ہے۔ وہ آکاش میں دیوتاؤں کے وِمان (ہوائی جہاز) اُڑانے لگتی ہے۔ اگر بھوجن میں نمک تیز ہوگیا، تو یہ شترو نے کوئی روڑا رکھ دیا ہوگا۔ دیو پریا کو اب کبھی کبھی دھوکا ہوجاتا کہ ستیہ پرکاش گھر میں آگیا ہے، وہ مجھے مارنا چاہتا ہے، گیان پرکاش کو وش کھلائے دیتا ہے۔ ایک دن اس نے ستیہ پرکاش کے نام ایک پتر لکھا اور اسے جتنا کوستے بنا، اتنا کوسا۔ تو میرے پرانوں کا بیری ہے، میرے کل کا گھاتک ہے، ہتیارا ہے۔ وہ کون دن آئے گا کہ تیری مٹی اُٹھے گی۔ تونے میرے لڑکے پر وشی کرن منتر چلا دیا ہے۔ دوسرے دن پھر ایسا ہی ایک پتر لکھا۔ یہاں تک کہ یہ اس کا نتیہ کا کرم (روز کا کام) ہوگیا۔ جب تک ایک چٹھی میں ستیہ پرکاش کو گالیاں نہ دے لیتی، اسے چین ہی نہ آتا تھا۔ ان پتروں کو وہ کہارن کے ہاتھ ڈاک گھر بھیجوا دیا کرتی تھی۔

گیان پرکاش کا ادھیاپک ہونا ستیہ پرکاش کے لیے گھاتک ہوگیا۔ پردیس میں اسے یہی سنتوش تھا کہ میں سنسار میں نرادھار (بے سہارا) نہیں ہوں۔ اب یہ اولمب (سہارا) بھی جاتا رہا۔ گیان پرکاش نے زور دے کر لکھا، اب آپ میرے ہیتو (لیے) کوئی کشٹ نہ اُٹھائیں۔ مجھے اپنی گزر کرنے کے لیے کافی سے زیادہ ملنے لگا ہے۔

یدھپی (اگرچہ) ستیہ پرکاش کی دُکان خوب چلتی تھی، لیکن کلکتے جیسے شہر میں ایک چھوٹے دکاندار کا جیون بہت سکھی نہیں ہوتا۔ ساٹھ ستر روپے کی ماسک آمدنی ہوتی ہی کیا ہے؟ اب تک جو کچھ بچاتا تھا، وہ واستو (حقیقت) میں بچت نہ تھی، بلکہ تیاگ تھا۔ ایک وقت روکھا سوکھا کھاکر، ایک تنگ آردر کوٹھری (سیلی ہوئی کوٹھری) میں رہ کر پچیس تیس روپے بچے رہتے تھے۔ اب دونوں وقت بھوجن کرنے لگا۔ کپڑے بھی ذرا صاف پہننے لگا۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں اس کے خرچ میں اوشدھیوں (دوائیوں) کی ایک مد بڑھ گئی اور پھر وہی پہلے کی سی دشا ہوگئی۔ برسوں تک شدھ وایو (صاف ہوا)، پرکاش اور پشٹی کر بھوجن (پیٹ بھر خوراک) سے ونچت (محروم) رہ کر اچھے سے اچھا سواستھ (صحت) بھی نشٹ ہوسکتا ہے۔ ستیہ پرکاش کو بھی اروچی (بدمزگی)، منداگنی (آنتوں کی کمزوری) آدی (وغیرہ) روگوں نے آگھیرا۔ کبھی کبھی جوَر بھی آجاتا۔ یووا اوستھا میں آتم وشواس (خود اعتمادی) ہوتا ہے، کسی اولمب (سہارے) کی پروا نہیں ہوتی۔ ویو وردھی (بزرگی) دوسروں کا منہ تکتی ہے، آشرے (سہارے) ڈھونڈتی ہے۔ ستیہ پرکاش پہلے سوتا، تو ایک ہی کروٹ میں سویرا ہوجاتا۔ کبھی بازار سے پوریاں لے کر کھا لیتا، کبھی مٹھائیوں پر ٹال دیتا۔ پر اب رات کو اچھی طرح نیند نہ آتی، بازاری بھوجن سے گھرنا (نفرت) ہوتی، رات کو گھر آتا، تو تھک کر چور چور ہوجاتا تھا۔ اسی وقت چولہا جلانا، بھوجن پکانا بہت اکھرتا (بُرا لگتا) کبھی کبھی وہ اپنے اکیلے پن پر روتا۔ رات کو جب کسی طرح نیند نہ آتی، تو اس کا من کسی سے باتیں کرنے کو للائت (مچلنے) ہونے لگتا۔ پر وہاں نشاندھکار (رات کی سیاہی) کے سوا اور کون تھا؟ دیوالوں کے کان چاہے ہوں، منہ نہیں ہوتا۔ ادھر گیان پرکاش کے پتر بھی اب کم آتے تھے اور وے بھی روکھے۔ ان میں اب ہردے کے سرل ادگاروں کا لیش (دلی جذبات کی ذرہ برابر رمق) نہ ہوتا۔ ستیہ پرکاش اب بھی ویسا ہی بھاومئے پتر (جذبات سے بھرا خط) لکھتا

تھا، پر ایک ادھیاپک کے لیے بھاؤکتا (جذباتیت) کب شوبھا (سجتی) دیتی ہے۔ شنیہ شنیہ (آہستہ آہستہ) ستیہ پرکاش کو بھرم ہونے لگا کہ گیان پرکاش بھی مجھ سے نشٹھرتا کرنے لگا، نہیں تو کیا میرے پاس دوچار دن کے لیے آنا اسمبھو (ناممکن) تھا؟ میرے لیے تو گھر کا دوار (دروازہ) بند ہے، پر اسے کون سی بادھا ہے؟ اس غریب کو کیا معلوم کہ یہاں گیان پرکاش نے ماتا سے کلکتے نہ جانے کی قسم کھا لی ہے۔ اس بھرم نے اسے اور بھی ہتاش کردیا۔

شہروں میں منشیہ بہت ہوتے ہیں، پر منشیتا (انسانیت) برلے (کسی) ہی میں ہوتی ہے۔ ستیہ پرکاش اس بہوسنکھیک (بھیڑ بھری) استھان میں بھی اکیلا تھا۔ اس کے من میں اب ایک نئی آکانکشا (خواہش) انکرِت ہوئی (پھل پھولی)۔ کیوں نہ گھر لوٹ چلوں؟ کسی سنگنی کے پریم (ساتھی کی محبت) میں کیوں نہ شرن (آسرا) لوں؟ وہ سکھ اور شانتی (چین اور سکون) اور کہاں مل سکتی ہے۔ میرے جیون کی نراشاندھکار (مایوس کن اندھیرے) کو اور کون جیوتی آلوکت (روشن) کرسکتی ہے؟ وہ اس آویش (جوش) کو اپنی سمپورن وچار شکتی (پوری قوت فکر) سے روکتا، جس بھانتی (طرح) کسی بالک کو گھر میں رکھی ہوئی مٹھائیوں کی یاد بار بار کھیل سے گھر کھینچ لاتی ہے، اُسی طرح اس کا چت بھی باربار انہی مدُھر چنتاؤں میں مگن ہوجاتا تھا۔ وہ سوچتا۔ مجھے ودھاتا (خدا) نے سب سکھ سے ونچت (محروم) کردیا ہے، نہیں تو میری دشا ایسی ہین (حقیر) کیوں ہوتی؟ مجھے ایشور نے بدھی (عقل) نہ دی تھی کیا؟ کیا میں شرم (محنت) سے جی چُراتا تھا؟ اگر بالکپن ہی میں میرے اُتساہ (حوصلوں) اور ابھیروچی (دلچسپیوں) پر تشار (برف) نہ پڑگیا ہوتا، میری بدّھی شکتیوں (ذہنی قوت) کا گلا نہ گھونٹ دیا گیا ہوتا، تو میں آج آدمی ہوتا۔ پیٹ پالنے کے لیے اس بدیش میں نہ پڑا رہتا۔ نہیں، میں اپنے اوپر یہ اتیاچار (ظلم) نہ کروں گا۔

مہینوں تک ستیہ پرکاش کے من اور بدّھی میں یہ سنگرام ہوتا رہا۔ ایک دن وہ دُکان سے آکر چولہا جلانے جارہا تھا کہ ڈاکیے نے پکارا۔ گیان پرکاش کے سوا اس کے پاس اور کسی کے پتر نہ آتے تھے۔ آج ہی اس کا پتر آچکا تھا۔ یہ دوسرا پتر کیوں؟ کسی انشٹ کی آشنکا ہوئی۔ پتر لے کر پڑھنے لگا۔ ایک چھن (پل) میں پتر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور وہ سر تھام کر بیٹھ گیا کہ زمین پر نہ گر پڑے۔ یہ دیوپریا کی وش ئیکت لیکھنی (زہر

آلودہ قلم) سے نکلا ہوا زہر کا پیالہ تھا۔ جس نے ایک پل میں سنکیا ہین (بے نام و نشان) کردیا۔ اس کی ساری مرماتک ویتھا (درد دل)، کرودھ (غصہ)، نیراشئے (ناامیدی)، کرتکھنتا (احسان فراموشی)، گلانی (نفرت)۔ کیول ایک ٹھنڈی سانس میں سماپت (ختم) ہوگئی۔

وہ جاکر چارپائی پر لیٹ رہا۔ مانسک ویتھا (دل کی حالت) آگ سے پانی ہوگئی! سارا جیون نشٹ ہوگیا! میں گیان پرکاش کا شترو ہوں۔ میں اتنے دنوں کیوں اس کے جیون کو مٹی میں ملانے کے لیے ہی پریم کا سوانگ بھر رہا ہوں۔ بھگوان! اس کے تمھیں ساکشی (گواہ) ہو!

دوسرے دن پھر دیوپریا کا پتر پہنچا۔ ستیہ پرکاش نے اسے لے کر پھاڑ ڈالا، پڑھنے کی ہمت نہ پڑی ایک ہی دن پیچھے تیسرا پتر پہنچا۔ اس کا وہی انت ہوا۔ پھر وہ ایک نتیہ کا کرم (روز کا معمول) ہوگیا۔ پتر آتا اور پھاڑ دیا جاتا۔ کنتو (لیکن) دیوپریا کا ابھیپرائے (مقصد) بنا پڑھے ہی پورا ہوجاتا تھا۔ ستیہ پرکاش کے مرم استھان (اندرون) پر ایک چوٹ اور پڑ جاتی تھی۔

ایک مہینے کی بھیشن ہاردک ویدنا (گہرے دلی صدمے) کے بعد ستیہ پرکاش کو جیون سے گھرنا (نفرت) ہوگئی۔ اس نے دُکان بند کردی، باہر آنا جانا چھوڑ دیا۔ سارے دن کھاٹ پر پڑا رہتا۔ وے دن یاد آتے جب ماتا پچکار کر گود میں بٹھا لیتی اور کہتی بیٹا! پتا بھی سندھیا سمئے دفتر سے آکر گود میں اُٹھا لیتے اور کہتے بھیا! ماتا کی سجیؤ مورتی (زندہ شکل) اس کے سامنے آکر کھڑی ہوتی، ٹھیک ویسی ہی جب وہ گنگا اسنان کرنے گئی تھی اس کی پیار بھری باتیں کانوں میں آنے لگتیں۔ پھر وہ دِرشیہ سامنے آجاتا، جب اس نے نوودھو ماتا کو "اماں" کہہ کر پکارا تھا۔ تب اس کے کٹھور شبد (سخت الفاظ) یاد آجاتے، اس کے کرودھ سے بھرے ہوئے وکرال نیتر (غضبناک آنکھیں) آنکھوں کے سامنے آجاتے۔ اسے اب اپنا سسک سسک کر رونا یاد آجاتا۔ پھر سَور گریہہ کا دِرشیہ سامنے آتا۔ اس نے کتنے پریم سے بچّے کو گود میں لینا چاہا تھا! تب ماتا کے بجر (بجلی) کے سے شبد کانوں میں گونجنے لگتے۔ ہائے! اسی بجلی نے میرا سروناش (برباد) کردیا! پھر ایسی کتنی ہی گھٹنائیں (واقعات) یاد آتیں۔ اب بنا کسی اپرادھ کے ماں ڈانٹ بتاتی۔ پتا کا نردئے (بے رحمانہ)، نشٹھر (ظالمانہ) دیوہار (برتاؤ) یاد آنے لگتا۔ ان کا بات بات پر تیوریاں بدلنا، ماتا کے متھیا اپوادوں (جھوٹی تہمتوں)

پر وشواس کرنا۔ ہائے! میرا سارا جیون نشٹ (زندگی برباد) ہوگیا! تب وہ کروٹ بدلتا اور چلّا کر کہتا۔ اس جیون کا انت (زندگی کا خاتمہ) کیوں نہیں ہو جاتا۔

اس بھانتی پڑے پڑے اسے کئی دن ہوگئے۔ سندھیا ہوگئی تھی کہ سہسا (دفعتاً) اسے دوار پر کسی کے پکارنے کی آواز سنائی پڑی۔ اس نے کان لگا کر سنا اور چونک پڑا۔ کسی پریچت منشیہ (متعارف شخص) کی آواز تھی۔ دوڑا دوار پر آیا، تو دیکھا گیان پرکاش کھڑا ہے۔ کتنا روپ وان (وجیہہ شکل) پُرش تھا! وہ اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ گیان پرکاش نے اس کے پیروں کو اسپرش کیا۔ دونوں بھائی گھر میں آئے۔ اندھکار (اندھیرا) چھایا ہوا تھا۔ گھر کی یہ دشا دیکھ کر گیان پرکاش، جو اب تک اپنے کنٹھ کے آویگ (روندھے ہوئے گلے) کو روکے ہوئے تھا، رو پڑا۔ ستیہ پرکاش نے لالٹین جلائی۔ گھر کیا تھا، بھوت کا ڈیرا تھا۔ ستیہ پرکاش نے جلدی سے ایک کرتا گلے میں ڈال لیا۔ گیان پرکاش بھائی کا جرجر شریر (کمزور بدن)، پیلا مکھ، بجھی ہوئی آنکھ دیکھتا تھا اور روتا تھا۔

ستیہ پرکاش نے کہا۔ میں آج کل بیمار ہوں۔

گیان پرکاش۔ وہ تو دیکھ ہی رہا ہوں۔

ستیہ۔ تم نے آنے کی سوچنا (خبر) بھی نہ دی۔ مکان کا پتہ کیسے چلا؟

گیان۔ سوچنا (خبر) تو دی تھی، آپ کو پتر نہ ملا ہوگا۔

ستیہ۔ اچھا، ہاں دی ہوگی، پتر دکان میں ڈال گیا ہوگا۔ میں ادھر کئی دنوں سے دُکان نہیں گیا۔ گھر پر سب کُشل (خیریت) ہے؟

گیان۔ ماتا جی کا دیہانت (انتقال) ہوگیا۔

ستیہ۔ ارے! کیا بیمار تھیں؟

گیان۔ جی نہیں۔ معلوم نہیں کیا کھا لیا۔ ادھر انھیں اُنماد سا (پاگل پن) ہوگیا تھا، پتا جی نے کچھ کٹو وچن (بری بھلی باتیں) کہے تھے، شاید اسی پر کچھ کھا لیا۔

ستیہ۔ پتا جی تو کُشل (خیریت) سے ہیں؟

گیان۔ ہاں، ابھی مرے نہیں ہیں۔

ستیہ۔ ارے! کیا بہت بیمار ہیں؟

گیان۔ ماتا نے وش (زہر) کھا لیا، تو وے ان کا منہ کھول کر دوا پلا رہے تھے۔ ماتا جی نے

زور سے ان کی دو انگلیاں کاٹ لیں۔ وہیں وش ان کے شریر میں پہنچ گیا۔ تب سے سارا شریر سوج آیا ہے۔ اسپتال میں پڑے ہوئے ہیں کسی کو دیکھتے ہیں تو کاٹنے دوڑتے ہیں۔ بچنے کی آشا نہیں ہے۔

ستیہ۔ تب تو گھر ہی چوپٹ ہو گیا۔

گیان۔ ایسے گھر کو اب سے بہت پہلے چوپٹ ہو جانا چاہیے تھا۔

تیسرے دن دونوں بھائی پراتہ کال (صبح سویرے) کلکتے سے بدا ہو کر چل دیے۔

یہ افسانہ 'شری شاردا' کے جون1923 کے شمارے میں شائع ہوا مان سروور نمبر 6میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

شُدّھی

آخر جو ہونا تھا۔ وہی ہوا، لالہ پریم ناتھ کو اپنا سب کچھ کھو چکنے کے بعد آخرکار معلوم ہوا کہ بازارِ حُسن میں وفا کی جنس عنقا ہے۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے وہ احباب میں زاہدِ خشک مشہور تھے۔ مگر ایک دن دوستوں کے اصرار سے ایک محفل میں شریک ہوئے اور بی حسنہ کے حُسنِ زاہد فریب نے وہیں مجمع عام میں ان کا دل لُوٹ لیا۔ رنگین مزاجوں کے لیے حُسن اور ادا مشغلۂ تفریح ہے۔ زاہدوں کے لیے پیغامِ شہادت۔ ان پانچ برسوں میں پریم ناتھ نے دولت، عزت، دین، ایمان سب کچھ بی حسنہ کی نذر کردیا۔ اگر وہ چھپے چھپے حسنہ کی پرستش عمر بھر کیا کرتے۔ تو کوئی باز پُرس نہ ہوتی۔ لیکن علانیہ کُھلے بندوں۔ ڈنکے کی چوٹ رنگ رلیاں منانا سماج کو کب برداشت ہوسکتا تھا۔ لوگوں کی آمد و رفت بند ہوگئی۔ اعزا بے گانے ہوگئے، انھیں دیکھ کر کترا جاتے، ماں نے رو رو کر سمجھایا۔ بیوی نے منّتیں کیں۔ دانہ پانی چھوڑا۔ مگر پریم ناتھ کے دل پر حسنہ کے سوا اور کسی کے لیے اب جگہ نہ تھی یہاں تک آخر ماں مجبور ہوکر تیرتھ جاترا کرنے چلی گئی، اور گومتی نے میکے کی راہ لی۔ پریم ناتھ کا راستہ اور بھی صاف ہوگیا۔ عطائیوں اور میراثیوں کی صحبت رہنے لگی۔ مذہبی پابندیاں پہلے ہی شاخ پر جا بیٹھی تھیں اب ان کے پَر نکل آئے۔ اُڑ گئیں۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ ہوئے۔ بغیر لطفِ صحبت کہاں۔ خلوص میں امتیاز کہاں؟ الفت میں مغائرت کیسی؟ چھوت چھات کے مٹتے ہی ان کا ہندوپن بھی مٹ گیا۔ جب ہندو نہ رہے، تو مسلمان، عیسائی، جو چاہے کہو، جو چاہے سمجھو۔ ماں اور بیوی کی کنارہ کشی نے بغاوت کی۔ اور پھر بھی تحریک کی ایک دن جامع مسجد میں کلمہ پڑھ لیا۔ انھیں اسلام سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی۔ جذبات ہندو تھے۔ خیالات ہندو تھے۔ تعلقات ہندو تھے۔ ہمدردیاں ہندو تھیں۔ لیکن آداب ہندو نہ تھے۔ اس لیے وہ مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ اُٹھنا۔ بیٹھنا۔ کھانا۔ پینا۔ کیا ان کے مسلمان ہونے کی دلیل قاطع نہ تھی۔ پر اس سے فائدہ ہی کیا کہ نہ اِدھر میں نہ اُدھر۔ کلمہ پڑھتے ہی پریم ناتھ الفت حسین بن گئے۔

لیکن اس کوچہ میں کون صاحبِ زر آیا۔ جو چند دنوں میں دانوں کا محتاج نہ ہوگیا ہو۔ دنیا کے بازار میں نقد جنس کی صورت اختیار کرتی ہے نشاط کے باغ میں رندی اور فاقہ مستی کے سوا اور کیا ہے۔ شمع بُجھتے ہی پروانے منتشر ہوگئے۔ نخلِ بے ثمر پر طیور کیوں چہکیں۔ باوا آدم کے زمانے سے جو ہوتا ہے۔ وہی پھر ہوا۔ حسنہ نے نئے عاشق ڈھونڈ نکالے اور میاں الفت حسین بے یار و مددگار بے رفیق و غم گسار ایک پُرانی مسجد میں پناہ گزیں ہوئے۔ ساری دولت خرچ کرکے۔ رسوائی، ندامت، ذلت اور عسرت جیسی بے بہا چیزیں خرید لائے۔ بیماری گھاٹے میں ملی۔

(۲)

اب پریم ناتھ کی آنکھیں کھلیں۔ تین ہفتے سے مسجد کے گوشے میں پڑا کراہ رہا تھا۔ پر کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ پُرانے دوست اس کی آشفتہ سری سے مایوس ہوکر اس کے نام سے رو بیٹھے تھے۔ نئے دوستوں میں ہنسنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس ہیئت کذائی میں پریم ناتھ کو پیاری ماں اور مہربان بیوی کی یاد آئی۔ آہ کتنی قابلِ رشک زندگی تھی۔ کیا بے فکری کے دن تھے۔ وہ عصمت کی دیوی مجھے کتنا سمجھاتی رہی۔ پر میں ہوس کے نشہ میں بے خود ہو رہا تھا۔ کاش ایک بار پھر اس دیوی سے مل جاتا تو زندگی بھر اس کے قدموں سے جدا نہ ہوتا۔ مگر اب ایسے نصیب کہاں۔ اب مجھے کون پوچھے گا۔ گومتی کو تو میری صورت سے نفرت ہوگئی ہے۔

مسجد میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ طاہر علی نام تھا۔ بے لوث آدمی تھے، انھیں پریم ناتھ کی حالت پر رحم آتا تھا۔ اپنے کھانے میں انھیں شریک کر لیتے۔ ایک دن ان سے کہا۔ کیوں اپنے گھر نہیں چلے جاتے۔ یہاں کب تک پڑے رہوگے۔ آخر گھر تو نہیں گر گیا۔ میں دیکھتا ہوں یہاں تمھاری حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے۔

پریم ناتھ نے آہ سرد کھینچ کر کہا۔ کیوں جلے پر نمک چھڑکتے ہو۔ مولوی صاحب میرا اب گھر بار کہاں۔ گھر تو کب کا بک چکا ہے۔ اب تو قبر میں ہی عافیت نصیب ہوگی۔

طاہر۔ بھلا ایک بار اپنے گھر والوں کو بلاؤ تو دیکھو کیا جواب آتا ہے۔ بیوی کو تو نہیں کہتا۔ لیکن ماں بچے کی یہ حالت دیکھ کر اس کے سارے قصور معاف کردے گی اور چھاتی سے لگا لے گی۔

پریم ناتھ نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ اتنا جانتا ہوں مولوی صاحب۔ اماں کو خبر مل جائے تو وہ چاہے کہیں ہوں۔ دوڑی چلی آئیں گی۔ بیوی کی جانب سے بھی مجھے اس کا کامل یقین ہے۔ وہ وفا کی دیوی ہے۔ مولوی صاحب ایسی شرم و حیا تو میں نے کبھی دیکھی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئے گی۔ مگر کہوں کس مُنہ سے، جاؤں کیسے، اب انھیں یہ روئے سیاہ نہیں دِکھا سکتا۔ یہیں پڑے پڑے مرجانا قبول ہے۔ ان کے غم کو تازہ نہیں کرسکتا۔ آہ! میں ننگِ خاندان ہوں۔ مولوی صاحب میں نے بزرگوں کا نام ڈبو دیا۔ میرے پاس اتنا اثاثہ تھا کہ کئی پیڑھیوں تک فراغت سے گزران ہوتی۔ لیکن اب قلانچ ہوں۔ یہاں تک کہ ہمّت کی لکڑی بھی ہاتھ میں نہیں ہے اب تو ایشور سے یہی دُعا ہے کہ جتنی جلد ہوسکے۔ میری مصیبتوں کا خاتمہ کردیں۔

مولوی صاحب نے ترش ہوکر کہا۔ ایشور کیوں خدا کہو صاحب۔

پریم ناتھ، حقارت آمیز لہجہ میں بولے۔ آپ کے لیے خدا اور ایشور دو ہوں گے جناب میرے لیے ایک ہیں۔ دنیا ساجھے کی کھیتی نہیں۔ جسے ایشور۔ خدا۔ برمھ۔ لارڈ اور جھوا نے مل کر لگائی ہو۔

مولوی صاحب نے نادم ہوکر بولے۔ بات تو یہی ہے برادر۔ ہاں ایک معبود کا جو نام ہمیشہ سُنتے آئے ہیں اس کی بجائے کوئی دوسرا نام سنتے ہیں تو وہ ذرا کانوں کو غیرمانوس معلوم ہوتا ہے۔ خیر کہو تو تمھارے سُسرال ایک خط لکھ دوں۔

پریم ناتھ نے ہاتھ ہلا کر منع کرتے ہوئے کہا۔ ہرگز نہیں۔ مجھے یہیں مرنے دیجیے۔ میرے اعمال کی یہی سزا ہے۔ مرنے کے بعد گور و کفن کی فکر کوئی کر ہی دے گا۔ اُس وقت البتہ ایک خط ڈال دیجیے گا کہ بدنصیب پریم ناتھ ایڑیاں رگڑرگڑ کر مرگیا۔ اور اب جہنم کی اذیتیں جھیل رہا ہے۔ مرنے میں اب بہت دیر نہیں۔ طاہر علی زیادہ سے زیادہ دو دن۔ میری سُسرال لکھنؤ میں ہے۔ محلّہ نو بستہ۔ میرے سُسر کا نام بابو نہال چند ہے۔ مگر بھائی جان خدا کے لیے مرنے سے پہلے خط نہ لکھیے گا۔ آپ کو خدا کی قسم ہے۔ اس رو سیاہ کی اب کفن میں ہی پردہ پوشی ہوگی۔

(۳)

تیسرے دن کوئی پہر رات گئے۔ دو عورتیں مسجد کے سامنے آکر کھڑی ہوئیں ایک

مزدورنی تھی دوسری گومتی۔ دونوں مسجد کی طرف تاک رہی تھیں۔ کچھ پوچھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ گومتی آہستہ سے بولی۔ یہاں کوئی ہے کہ نہیں۔ پوچھ یہی رحیم خاں کی مسجد ہے۔

مزدورنی نے کہا۔ کس سے پوچھوں۔ کوئی دِکھائی بھی تو دے۔ (مولوی کو دیکھ کر) ارے میاں صاحب! یہی رحیم خاں کی مسجد ہے نہ۔

طاہر علی ان دونوں کو دیکھتے ہی لپک کر اندر آئے۔ اور پریم ناتھ سے بولے الفت حسین، الفت حسین، سو گئے کیا؟ تمھارے گھر کے لوگ آگئے۔

پریم ناتھ اُٹھ کر بیٹھا ہی نہیں کھڑا ہوگیا۔ اور اضطراب کے عالم میں دو قدم آگے بڑھ کر پھر رُک گیا اور تعجب سے بولا۔ میرے گھر کے لوگ! خواب دیکھا ہے کیا۔

طاہر۔ خواب نہیں ہے۔ جناب حقیقت ہے۔ ضرور تمھارے گھر والے ہیں۔ بُلا لاؤں؟ ایک بڑھیا نے مجھ سے پوچھا۔ یہی رحیم خاں کی مسجد ہے۔ میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ سوچا پہلے تمھیں خبر کردوں۔

پریم نے انداز ملائمت سے دیکھ کر پوچھا۔"تم نے خط تو نہیں لکھ دیا تھا؟"

طاہر علی نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔ ہاں بھئی لکھ تو دیا۔ مجھ سے تمھاری حالت دیکھ کر نہ رہا گیا۔

پریم ۔ میں نے تو تمھیں قسم دکھا دی تھی۔ پھر بھی تم نے نہ مانا۔ مجھے تم سے اس کمینہ پن کی امید نہ تھی۔ میں اسے صریح کمینہ پن اور دغا سمجھتا ہوں۔

گالیاں پھر دے لینا بھئی۔ اس وقت کیا کہتے ہو۔ بلا لاؤں نہ! ذرا بھلے آدمی کی طرح بیٹھ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ان لوگوں کو اُول جلول بکنے لگو۔

پریم۔ نہیں کسی کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہہ دو یہاں کوئی نہیں ہے۔

طاہر۔ ذرا سوچ لو۔

پریم۔ کون! اگر تم کسی کو یہاں لائے تو میں اس کنوئیں میں کود پڑوں گا۔ بڑے ذلیل آدمی ہو۔ بنتے ہو بڑے پارسا۔ مگر چھپے ہوئے گُرگے۔

بڑھیا مزدورنی نے مسجد کے دروازے پر آکر پوچھا۔ ارے میاں صاحب رحیم خاں کی مسجد یہی ہے۔ کب سے کھڑی بھونک رہی ہوں کوئی بولتا ہی نہیں۔

طاہر (پریم سے) بھئی اس وقت مجھ پر رحم کرو۔ اگر میں جانتا کہ تم اپنے جامہ سے باہر ہو جاؤ گے تو بھول کر بھی نہ لکھتا۔ (بڑھیا سے) ہاں۔ یہی ہے۔ رحیم خاں کی مسجد۔ تم کون ہو۔ اور کہاں سے آئی ہو؟

بڑھیا۔ لکھنؤ سے آئی ہوں۔ بابو پریم ناتھ کی سسرال سے۔ بہو جی آئی ہیں بابو صاحب کہاں ہیں؟

پریم (طاہر سے) طاہر علی تم نے میرے ساتھ بڑی دغا کی۔ سچ کہتا ہوں اس وقت میرے ہاتھ میں طاقت ہوتی تو تمھاری گردن ضرور توڑ دیتا۔ ظالم! ذرا تو سوچنا تھا کہ اس دیوی کے روبرو یہ کیسے جائے گا۔ کیسے کیا ہوگا۔

طاہر۔ بھائی جان معاف کرو۔ سخت غلطی ہوئی۔ حق تو یہ ہے کہ مجھے ان کے آنے کی اُمید نہ تھی۔

پریم۔ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ گومتی میری حالت کی خبر پاکر ضرور چلی آئے گی۔ خیر اب تو امتحان لے چکے۔ معلوم ہوگیا کہ ہندو عورت کتنی وفادار ہوتی ہے۔

اب آپ جاکر خدا کے لیے کہہ دیجیے۔ کہ پریم ناتھ یہاں نہیں ہیں۔ اور کچھ پوچھیں تو کہہ دینا کہ دوپہر تک یہاں تھے مگر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ مجھ سے کچھ نہیں کہا۔

طاہر علی نے بیکسانہ انداز سے کہا۔ بھائی جان مجھ پر رحم کرو ایک عفیفہ کے ساتھ دغا کرنے کے لیے مجھے مجبور نہ کرو۔ جو تم کہتے ہو۔ وہ میرے مُنہ سے نہیں نکل سکتا۔

پریم ناتھ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس مُلّا کے دل میں کتنا درد۔ کتنا خلوص۔ کتنی ہمدردی ہے۔ مولوی صاحب کی طرف احسان مندانہ نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ جایئے بُلا لایئے۔ کہہ دیجیے۔ بدنصیب پریم ناتھ یہیں ہے۔ طے تو کرچکا تھا کہ گھر والوں کو صورت نہ دِکھاؤں۔ ایسی جگہ مرنا چاہتا تھا جہاں کوئی آنسو بہانے والا بھی نہ ہو لیکن ایشور کو میری ایسی پُرسکون موت بھی منظور نہ تھی۔

(۴)

کتنا دردناک منظر تھا۔ گومتی کھڑی تھی۔ پریم ناتھ اس کے پیروں پر سر جُھکائے

ہوئے تھا۔ اور باوجود گومتی کی پُرزور مدافعت کے سر نہ اُٹھاتا تھا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری تھا۔ زبان دونوں کی بند۔ جذبات کے طوفان میں الفاظ ڈگمگائے ہوئے چلتے تھے۔ پر ناطقہ تک پہنچتے پہنچتے غرقاب ہوجاتے تھے۔

آخر گومتی نے سسکتے ہوئے کہا۔ تمھاری طبیعت اب کیسی ہے۔ مولوی صاحب خط نہ لکھتے تو مجھے خبر بھی نہ ہوتی۔ ہم ایسے غیر ہوگئے۔

پریم ناتھ نے سر اُٹھایا اور رقت انگیز لہجے میں کہا معاف کرو گومتی۔ میری خطا معاف کرو۔ اپنی نادانی کا خوب مزا چکھ چکا ارادہ تو یہی تھا کہ تمھیں خبر نہ ہو اور دُنیا سے رخصت ہوجاؤں۔ مگر تقدیر میں یہ ذلّت اور شرمندگی بدی تھی۔

گومتی بیٹھ گئی اور شوہر کی آنکھوں سے آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ ذلت اور شرمندگی کیسی کیا تم مجھے غیر سمجھتے ہو۔ میرا ایشور جانتا ہے کہ میں تمھیں پہلے جو سمجھتی تھی، وہی اب سمجھتی ہوں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ دولت کا کیا غم؟ تقدیر میں ہوگی۔ پھر مل رہے گی۔ میرے لیے تمھاری خدمت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ سہاگ عورت کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ تم نے مجھے چھوڑ دیا تھا لیکن میں تمھیں کیوں کر چھوڑ دیتی۔ میں تو ہمیشہ کے لیے تمھاری ہوں۔

پریم ناتھ نے مشتبہ انداز سے کہا۔ پر یہ کیسے ہوگا گومتی۔ ہمارے درمیان تو ایک آہنی دیوار کھڑی ہے۔ دنیا مجھے مسلمان کہتی ہے اور مسلمان سمجھتی ہے۔ حالانکہ میں سچّے دل سے کہتا ہوں۔ مجھے اسلام سے کبھی عقیدت نہ تھی۔ مجھے مرجانا قبول ہے پر تمھیں رسوا نہیں کرسکتا۔

اس خیال سے پریم ناتھ کے دل پر ٹھیس لگی۔ اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ ایک لمحہ کے بعد اس نے ضبط کرکے پوچھا۔ ایک بات پوچھوں۔ بتلاؤگی۔ گومتی سچ کہنا۔

گومتی۔ کیا بات ہے۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولتی۔

پریم۔ پوچھنے کی ہمّت نہیں پڑتی۔ تمھیں مجھ سے نفرت ضرور ہوگی۔

پریم ناتھ نے شرم سے سر جھکا لیا۔ یہ سوال بے موقع تھا۔ یہ بات اس سے چھپی نہ تھی۔ اس کا جواب گومتی کے لیے کتنی روحانی کوفت کا باعث ہوگا یہ بھی وہ جانتا تھا۔ تاہم وہ گومتی کے چہرے کی طرف جواب کے لیے منتظر نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

گومتی نے سر جھکائے ہوئے مگر دلیرانہ لہجے میں کہا۔ بہتر ہوتا کہ تم مجھ سے یہ سوال نہ کرتے۔ پیارے اگر میں کئی سال غائب رہنے کے بعد تمھارے پاس آتی تو تمھارے دل میں میری جانب سے جو کچھ خیال ہوتے۔ ان سے میرے دل کا اندازہ کرسکتے ہو۔ دل تمھاری طرف دوڑتا ہے۔ مگر جسم پیچھے ہٹتا ہے۔ میں تمھارے لیے اس وقت بھی جان قربان کرسکتی ہوں لیکن ....

گومتی خاموش ہوگئی۔ اپنے اظہارِ حال کے لیے اسے مناسب الفاظ نہ ملے۔ پریم ناتھ اس جھجک کا مطلب سمجھ کر جوش سے بولا۔ میں تمھارا مطلب سمجھ رہا ہوں گومتی! اور خوش ہوں کہ تم نے اسے ظاہر کردیا۔ آپس میں کسی طرح کا پردہ نہ چاہیے۔ میری شُدھی تو ہوسکتی ہے کیا تب بھی تمھیں مجھ سے احتراز ہوگا۔ میں شدھی کا حامی نہیں ہوں۔ گومتی۔ ہندو سماج میں اب بھی ایسے بے شمار آدمی پڑے ہوئے ہیں۔ جن کے ہاتھ کا پانی پینا مجھے گوارا نہ ہوگا۔ ہمارا سماج ایسے ہی آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن ان کے ساتھ ملنے کے لیے میں اپنی شدھی کرانی شرمناک سمجھتا ہوں۔ لیکن تمھاری خاطر مجھے یہ آزمائش بھی قبول ہے۔

گومتی نے احسان مندانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تو کب؟

پریم ناتھ بولے۔ جب تمھارا جی چاہے۔

یہ افسانہ پہلی بار جون 1923 میں شائع ہوا۔ اردو میں خواب و خیال اور ہندی میں اپراپیہ ساہتیہ میں شامل ہے۔

آپ بیتی

پرایہ ادھیکانش ساہتیہ سیویوں کے جیون میں ایک ایسا سمے آتا ہے جب پاٹھک گن (قارئین) ان کے پاس شردھا پورن (عقیدت مندانہ) پتر بھیجنے لگتے ہیں۔ کوئی ان کی رچنا شیلی (طرز تحریر) کی پرشنسا کرتا ہے، کوئی ان کے سد وچاروں پر مگدھ ہوجاتا ہے لیکھک کو بھی کچھ دنوں سے یہ سوبھاگیہ پراپت ہے۔ ایسے پتروں کو پڑھ کر اس کا ہردے کتنا گدگد ہوجاتا ہے اسے کسی ساہتیہ سیوی ہی سے پوچھنا چاہیے۔اپنے پھٹے کمبل پر بیٹھا ہوا وہ گروَ اور آتم گوروَ کی لہروں میں ڈوب جاتا ہے۔ بھول جاتا ہے کہ رات کو گیلی لکڑی سے بھوجن پکانے کے کارن سر میں کتنا درد ہو رہا تھا، کھٹملوں اور مچھروں نے رات بھر کیسے نیند حرام کردی تھی۔ ''میں بھی کچھ ہوں''، یہ اہنکار اُسے ایک چھن (لمحہ) کے لیے انمت بنا دیتا ہے۔ پچھلے سال ساون کے مہینے میں مجھے ایک ایسا ہی پتر ملا۔ اس میں میری چُھدر رچناؤں کی دل کھول کر داد دی گئی تھی۔

پتر پریشک (خط بھیجنے والا) مہودے سویم ایک اچھے کوی تھے۔ میں ان کی کویتائیں پتریکاؤں میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ یہ پتر پڑھ کر پھولا نہ سمایا۔ اسی وقت جواب لکھنے بیٹھا۔ اس ترنگ میں جو کچھ لکھ گیا۔ اِس سمئے یاد نہیں۔ اتنا ضرور یاد ہے کہ پتر آدی سے انت تک پریم کے اُدگاروں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کبھی کوِیتا نہیں کی اور نہ کوئی گدھ کاوے (نثر، نظم) ہی لکھا۔ پر بھاشا کو جتنا سنوار سکتا تھا اتنا سنوارا۔ یہاں تک کہ جب پتر سماپت کرکے دوبارہ پڑھا تو کوِیتا کا آنند آیا۔ سارا پتر بھاؤ لالتیہ سے پری پورن (بھرا) تھا۔ پانچویں دن کوی مہودے کا دوسرا پتر آپہنچا وہ پہلے پتر سے بھی کہیں ادھک مُرم اِسپرشی تھا۔ ''پیارے بھیا!'' کہہ کر مجھے سمبودِھت کیا گیا تھا، میری رچناؤں کی سوچی اور پرکاشکوں کے نام ٹھکانے پوچھے گئے تھے۔ انت میں یہ شُبھ سماچار ہے کہ میری پتنی جی کو آپ کے اوپر بڑی شردھا ہے۔ وہ بڑے پریم سے آپ کی رچناؤں کو پڑھتی ہیں۔ وہ پوچھ رہی ہیں کہ آپ کا وِواہ کہاں ہوا ہے۔ آپ کی سنتانیں کتنی ہیں تتھا آپ کا کوئی فوٹو بھی ہے؟ ہو تو کرپیا بھیج

دیجیے۔ میری جنم بھومی اور ونشاولی (شجرہ نسب) کا پتہ بھی پوچھا گیا تھا۔ اس پتر وشیشتہ (خاص طور سے) اس کے انتم ساچار نے مجھے پُلکت کردیا۔

یہ پہلا ہی اَوسر تھا کہ مجھے کسی مہیلا کے مکھ سے، چاہے وہ پَرتیید ھی دُوارہ ہی کیوں نہ ہو۔ اپنی پرشنسا سننے کا سوبھاگیہ پراپت ہوا۔ غرور کا نشہ چھا گیا، دھنیے ہے بھگوان! اب رمنیاں بھی میرے کرتہ کی سراہنا کرنے لگیں۔ میں نے ترنت اُتر لکھا جتنے کرن پریے شبد میری اِسمرتی کے کوش میں تھے سب خرچ کردیے۔ میتری اور بَندھتو سے سارا پتر بھرا ہوا تھا۔ اپنی ونشاولی کا ورنن کیا۔ کداچت میرے پُوروَجوں کا ایسا کیرتی گان کسی بھاٹ نے بھی نہ کیا ہوگا۔ میرے دادا ایک زمیندار کے کارندے تھے میں نے انھیں ایک بڑی ریاست کا منیجر بتلایا، اپنے پتا کو جو ایک دفتر میں کلرک تھے اس دفتر کا پردھان اَدھیکش بنا دیا اور کاشتکاری کو زمینداری بنا دینا تو سادھارن بات تھی۔ اپنی رچناؤں کی سنکھیا تو نہ بڑھا سکا پر ان کے مہتو، آدر اور پرچار کا اُلیکھ ایسے شبدوں میں کیا جو نمرتا کی اوٹ میں اپنے گروَ کو چھپاتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ بہودہ تُچھ کا اَرتھ اُس سے وپریت ہوتا ہے اور 'دین' کے معنی کچھ اور ہی سمجھے جاتے ہیں۔ اِسپشٹ سے اپنی بڑائی کرنا اُچ شِر نکھلتا ہے۔ مگر سانکیتک شبدوں (اشارتاً الفاظ) سے آپ اسی کام کو بڑی آسانی سے پورا کرسکتے ہیں۔ خیر میرا پتر سماپت ہوگیا اور تت شن (اسی لمحہ) لیٹربکس کے پیٹ میں پہنچ گیا۔

اس کے بعد دو سپتاہ تک کوئی پتر نہ آیا۔ میں نے اس پتر میں اپنی گرہنی (گھر والی) کی اُور سے بھی دوچار سَمایوچت باتیں لکھ دیں تھیں۔ آشا تھی گھنِشٹھتا (قربت) اور بھی گھنشٹھ (گہری) ہوگی۔ کہیں کویتا میں میری پرشنسا ہوجائے تو کیا پوچھنا۔ پھر تو ساہتیہ سنسار میں میں ہی نظر آوں گا۔ اس چپّی سے کچھ نراشا ہونے لگی۔ لیکن اس ڈر سے کہ کہیں کوی جی (شاعرجی) مجھے مطلبی اَتھوا سینٹی مینٹل (جذباتی) نہ سمجھ لیں۔ کوئی پتر نہ لکھ سکا۔

آشوِن کا مہینہ تھا اور تیسرا پہر رام لیلا کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ میں اپنے ایک مِتر کے گھر چلا گیا تھا۔ تاش کی بازی ہو رہی تھی سہسا (اچانک) ایک مہاشہ میرا نام پوچھتے ہوئے آئے اور میرے پاس کی کُرسی پر بیٹھ گئے۔ اور میرا ان سے کبھی کا پریچے (تعارف) نہ تھا۔ سوچ رہا تھا وہ کون آدمی ہے اور یہاں کیسے آیا؟ یار لوگ ان مہاشہ کی اُور دیکھ آپس میں اِشارے بازیاں کر رہے تھے۔ ان کے آکار پرکار میں کچھ نُوینتا اوشیہ تھی۔ شیام

ورن، ناٹا ڈیل، مکھ پر چیچک کے داغ ننگا سر، بال سنوارے ہوئے، صرف سادی قمیص، گلے میں پھولوں کی ایک مالا۔ پیر میں فُل بوٹ اور ہاتھ میں ایک موٹی سی پُستک۔

میں نے وِسمت ہوکر نام پوچھا۔

اُتّر ملا۔ مجھے اُماپتی نارائن کہتے ہیں۔

میں اُٹھ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ یہ وہی کوی مہودے تھے جن کے کئی پریم پتر مجھے مل چکے تھے کشل سماچار پوچھا، پان الائچیوں سے خاطر کی۔ پھر پوچھا آپ کا آنا کیسے ہوا؟

انھوں نے کہا۔ مکان پر چلیے تو سب ورتّانت کہوں گا۔ میں آپ کے گھر گیا تھا وہاں معلوم ہوا کہ آپ یہاں ہیں۔ پوچھتا ہوا چلا آیا۔

میں اُماپتی جی کے ساتھ گھر چلنے کو اُٹھ کھڑا ہوا جب وہ کمرے کے باہر نکل گئے تو میرے مِتر نے پوچھا۔ یہ کون صاحب ہیں؟

میں۔ میرے ایک نئے دوست ہیں۔

مِتر۔ ذرا ان سے ہوشیار رہیے گا۔ مجھے تو اُچکّے سے معلوم ہوتے ہیں۔

میں۔ آپ کا اَنومان (اندازہ) غلط ہے۔ آپ ہمیشہ آدمی کو اس کی سج دھج سے پرکھا کرتے ہیں۔ پر مَنُشیہ کپڑوں میں نہیں ہردئے میں رہتا ہے۔

مِتر۔ خیر یہ رہسیہ کی باتیں تو آپ جانیں۔ میں آپ کو آگاہ کیے دیتا ہوں۔

میں نے اِس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ اُماپتی جی کے ساتھ گھر پر آیا۔ بازار سے بھوجن منگوایا۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔ انھوں نے مجھے اپنی کئی کوِتائیں سنائیں۔ سُور (آواز) بہت سَرس (رس بھری) اور مَدُھر (میٹھا) تھا۔

کوِتائیں تو میری سمجھ میں خاک نہ آئیں پر میں نے تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ جھوم جھوم کر واہ واہ کرنے لگا۔ جیسے مجھ سے بڑھ کر کوئی کاوِیے رَسِک سنسار میں نہ ہوگا۔ سندھیہ کو ہم رام لیلا دیکھنے گئے لوٹ کر انھیں پھر بھوجن کرایا۔ اب انھوں نے اپنا وِرتّانت سنانا شروع کیا۔ اِس سمئے وہ اپنی پتنی کو لینے کانپور جارہے تھے اس کا مکان کانپور ہی میں ہے۔ ان کا وِچار ہے کہ ایک ماسک (ماہانہ) پتریکا نکالیں۔ ان کی کوِتاؤں کے لیے ایک پرکاشک ۱۰۰۰ روپیہ دیتا ہے۔ پر ان کی اِچّھا تو یہ ہے کہ انھیں پہلے پتریکا میں کرمشہ

(سلسلہ وار) نکال کر پھر اپنی ہی لاگت سے پستک آکار چھپوائیں۔ کانپور میں ان کی زمینداری بھی ہے پر وہ ساہتیک جیون (ادبی زندگی) وتیت کرنا چاہتے ہیں۔ زمینداری سے انھیں گھرنا (نفرت) ہے۔ ان کی اِستری کنیا وِدّیالیہ (اسکول) میں ایک پردھان ادِھیاپکا (پرنسپل) ہے۔ آدھی رات تک باتیں ہوتی رہیں۔ اب ان میں سے ادھیکانش (زیادہ تر) یاد نہیں ہیں ہاں! اتنا یاد ہے کہ ہم دونوں نے مل کر اپنے بھاوی جیون کا ایک کاریہ کرم (لائحہ عمل) تیار کرلیا تھا۔ میں اپنے بھاگیہ کو سراہتا تھا کہ بھگوان نے بیٹھے بٹھائے ایک ایسا سچّا مِتر بھیج دیا۔ آدھی رات بیت گئی، تو سوئے، انھیں دوسرے دن آٹھ بجے کی گاڑی سے جانا تھا۔ میں جب سوکر اُٹھا تب سات بج چکے تھے۔ اُماپتی جی ہاتھ منہ دھوئے تیار بیٹھے تھے۔ بولے۔ اب آگیہ دیجیے لوٹتے سمے ادھر ہی سے جاؤں گا۔ اس سمے آپ کو کچھ کشٹ (تکلیف) دے رہا ہوں۔ چھما کیجیے گا۔ میں کل چلا تو پراتہ کال (صبح) کے چار بجے تھے دو بجے رات سے پڑا جاگ رہا تھا کہ کہیں نیند نہ آجائے۔ بلکہ یوں سمجھیے کہ ساری رات جاگنا پڑا کیوں کہ چلنے کی چنتا لگی ہوئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھا تو جھپکیاں آنے لگیں، کوٹ اُتار کر رکھ دیا، اور لیٹ گیا۔ تُرنت نیند آگئی۔ مغل سرائے میں نیند کھلی۔ کوٹ غائب۔ نیچے اوپر چاروں طرف دیکھا کہیں پتا نہیں۔ سمجھ گیا کہ کسی مہاشے نے اُڑا دیا۔ سونے کی سزا مل گئی۔ کوٹ میں پچاس روپیہ خرچ کے لیے رکھے تھے وہ بھی اس کے ساتھ اُڑ گئے۔ آپ مجھے ۵۰ روپے دیں پتنی کو میکہ سے لانا ہے۔ کچھ کپڑے وغیرہ لے جانے پڑیں گے۔ پھر سسرال میں سینکڑوں طرح کے نیگ جوگ لگتے ہیں۔ قدم قدم پر روپیہ خرچ ہوتے ہیں۔ نہ خرچ کیجیے تو ہنسی ہو۔ میں ادھر سے لوٹوں گا تو دیتا جاؤں گا۔

میں بڑے سنکوچ (تذبذب) میں پڑگیا۔ ایک بار پہلے بھی دھوکا کھاچکا تھا۔ تُرنت بھرم ہوا کہ کہیں اب کہ پھر وہی دَشا نہ ہو۔ لیکن شیگھر (جلد) ہی من کے اس اَوِشواس پر لجّت (شرمندہ) ہوا۔ سنسار میں سبھی منشیہ ایک سے نہیں ہوتے۔ یہ بے چارے اتنے سجّن ہیں۔ اِس سمئے سنکٹ (پریشانی) میں پڑگئے ہیں اور میں مِتھیا سَندیہہ (شبہ) میں پڑا ہوا ہوں۔ گھر میں آکر پتنی سے کہا۔ تمھارے پاس کچھ روپیہ تو نہیں ہیں؟

اِستری۔ کیا کروگے۔

میں۔ میرے مِتر جی جو کل آئے ہیں۔ ان کے روپیہ کسی نے گاڑی میں چُرا لیے۔ انھیں

بیوی کو بدا کرانے سسرال جانا ہے۔ لوٹتی بار دیتے جائیں گے۔

پتنی نے وینگ (طنز) کر کے کہا۔ تمھارے یہاں جتنے متر آتے ہیں سب تمھیں ٹھگنے ہی آتے ہیں۔ سبھی سنکٹ میں پڑے رہتے ہیں۔ میرے پاس روپیہ نہیں ہیں۔

میں نے خوشامد کرتے ہوئے کہا۔ لاؤ دے دو بے چارے تیار کھڑے ہیں۔ گاڑی چھوٹ جائے گی۔

استری۔ کہہ دو اس سمئے گھر میں روپیہ نہیں ہیں۔

میں۔ یہ کہہ دینا آسان نہیں ہے۔ اس کا ارتھ تو یہ ہے کہ میں دَردِر (غریب) ہی نہیں مِتر ہین بھی ہوں۔ نہیں تو کیا میرے لیے ۵۰ روپیہ کا انتظام نہ ہو سکتا۔ اُماپتی کو کبھی وشواس نہ آئے گا کہ میرے پاس روپیہ نہیں ہیں۔ اس سے تو کہیں اچھا ہو کہ صاف صاف یہ کہہ دیا جائے کہ ہم کو آپ پر بھروسا نہیں ہے ہم آپ کو روپیہ نہیں دے سکتے۔ کم سے کم اپنا پردہ تو ڈھکا رہ جائے گا۔

شریمتی نے جھنجلاکر صندوق کی کنجی میرے آگے پھینک دی اور کہا تمھیں جتنا بحث کرنا آتا ہے اتنا کہیں آدمیوں کو پرکھنا آتا تو اب تک آدمی ہو گئے ہوتے۔ لے جاؤ دے دو۔ کسی طرح تمھاری مرجاد تو بنی رہے۔ لیکن اُدھار سمجھ کر مت دو، یہ سمجھ لو کہ پانی میں پھینکے دیتے ہیں۔

مجھے آم کھانے سے کام تھا، پیڑ گننے سے نہیں۔ چپکے سے روپیہ نکالے اور لاکر اُماپتی کو دے دیے۔ پھر لوٹتی بار آکر روپیہ دے جانے کا آشواسن (اقرار) دے کر وہ چل دیے۔

ساتویں دن شام کو وہ گھر سے لوٹ آئے۔ ان کی پتنی اور پُتری بھی ساتھ تھیں۔ میری پتنی نے شکر اور دہی کھلا کر ان کا سواگت کیا۔ منہ دکھائی کے ۲۰ روپیہ دیے۔ ان کی پُتری کو بھی مٹھائی کھانے کو ۲ روپیہ دیے۔ میں نے سمجھا تھا۔ اُماپتی آتے ہی آتے میرے روپیہ گننے لگیں گے۔ لیکن انھوں نے پہر رات گئے تک روپیوں کا نام بھی نہیں لیا۔ جب میں گھر میں سونے گیا تو بیوی سے کہا۔ انھوں نے تو روپیہ نہیں دیے جی۔

پتنی نے وینگ سے ہنس کر کہا۔ تو کیا سچ مچ تمھیں آشا تھی کہ وہ آتے ہی آتے تمھارے ہاتھ میں روپیہ رکھ دیں گے؟ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پھر پانے کی آشا سے روپیہ مت دو۔ یہی سمجھ لو کہ کسی مِتر کو سہائے تارتھ (مدد کی غرض) سے

دے دیئے۔ لیکن تم بھی وِچتر آدمی ہو۔

میں لجّت اور چپ ہو رہا۔ اُماپتی جی دو دن رہے۔ میری پتنی ان کا یتھوچت آدرستکار (خاطر تواضع) کرتی رہی۔ لیکن مجھے اتنا سنتوش (اطمینان) نہ تھا۔ میں سمجھتا تھا، انھوں نے مجھے دھوکا دیا۔

تیسرے دن پراتہ کال وہ چلنے کو تیار ہوئے۔ مجھے اب بھی آشا تھی کہ وہ روپیہ دے کر جائیں گے۔ لیکن جب ان کی رام کہانی سنی تو سناٹے میں آگیا۔ وہ اپنا بستر باندھتے ہوئے بولے۔ بڑا ہی کھید (افسوس) ہے کہ میں اب کی بار آپ کے روپیہ نہ دے سکا۔ بات یہ ہے کہ مکان پر پتا جی سے بھینٹ (ملاقات) ہی نہیں ہوئی۔ وہ تحصیل وصول کرنے گاؤں چلے گئے تھے اور مجھے اتنا اوکاش (موقع) نہ تھا کہ گاؤں تک جاتا۔ ریل کا راستہ نہیں ہے۔ بیل گاڑیوں پر جانا پڑتا ہے۔ اسی لیے میں ایک دن مکان پر رہ کر سسرال چلا گیا۔ وہاں سب روپیہ خرچ ہوگئے۔ بدائی کے روپے نہ مل جاتے تو یہاں تک آنا کٹھن تھا۔ اب میرے پاس ریل کا کرایہ تک نہیں ہے۔ آپ مجھے ۲۵ روپے اور دے دیں۔ میں وہاں جاتے ہی بھیج دوں گا۔ میرے پاس اِتنے تک کا کرایہ نہیں ہے۔

جی میں تو آیا کہ ٹکا سا جواب دے دوں۔ پر اتنی اُشِشٹتا (بدتہذیبی) نہ ہوسکی۔ پھر پتنی کے پاس گیا اور روپیہ مانگے۔ اب کہ انھوں نے بنا کچھ کہے سنے روپیہ نکال کر میرے حوالے کردیے میں نے اداسین بھاؤ (دُکھی جذبہ) سے روپیہ اُماپتی جی کو دیئے۔ جب ان کی پتری اور اردھانگنی (بیوی) زینہ سے اُتر گئیں۔ تو انھوں نے بستر اُٹھایا اور مجھے پرنام کیا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے سر ہلا کر جواب دیا۔ انھیں سڑک تک پہچانے بھی نہ گیا۔

ایک سپتاہ بعد اُماپتی جی نے لکھا۔ میں کاریہ وش (کام کی وجہ سے) برار جا رہا ہوں۔ لوٹ کر پیسے بھیجوں گا۔

۱۵ دن بعد ایک پتر لکھ کر کشل سماچار پوچھے۔ کوئی اُتر نہ آیا۔ ۱۵ دن بعد پھر روپیوں کا تقاضہ کیا۔ اس کا کچھ جواب نہ ملا۔ ایک مہینے کے بعد پھر تقاضہ کیا، اس کا بھی یہی حال۔ ایک رجسٹری پتر بھیجا۔ وہ پہنچ گیا۔ اس میں سندیہہ نہیں۔ لیکن جواب اس کا بھی نہ آیا۔ سمجھ گیا سمجھدار جورو نے جو کچھ کہا تھا وہ اکشرشہ ستیہ تھا۔ نراش ہوکر چپ ہو رہا۔

ان پتروں کی میں نے پتنی سے چرچا بھی نہیں کی اور نہ اسی نے کچھ اس بارے میں پوچھا۔

(۲)

اس کُپٹ ویوہار (بُرے سلوک) کا مجھ پر وہی اثر پڑا جو سادھارنتہہ (عام طور سے) سوبھاوک (فطری) روپ سے پڑنا چاہیے۔ کوئی اونچی اور پوِتر (پاک) آتما اس چھل پر بھی اٹل رہ سکتی تھی۔ اسے یہ سمجھ کر سنتوش ہوسکتا تھا کہ میں نے اپنے کرتویہ (فرض) کو پورا کردیا۔ یدی رِنی (قرضدار) کے رِن (قرض) نہیں چکایا تو میرا کیا اُپرادھ (قصور)۔ پر میں اتنا اُدار نہیں ہوں۔ یہاں تو مہینوں سر کھپاتا ہوں، قلم گھستا ہوں تب جاکر نغد نرائن کے درشن ہوتے ہیں۔

اسی مہینے کی بات ہے۔ میرے ینترالیہ میں ایک نیا کمپوزیٹر بہار پرانت سے آیا۔ کام میں چُتر جان پڑتا تھا میں نے اُسے ۱۵ روپے ماسک پر نوکر رکھ لیا۔ پہلے کسی انگریزی اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسہیوگ (مدد نہ ملنے) کے کارن پڑھنا جھوڑ بیٹھا تھا۔ گھر والوں نے کسی پرکار کی سہایتا دینے سے انکار کیا۔ وِوَش ہوکر اس نے جیوکا کے لیے یہ پیشہ اختیار کرلیا۔ کوئی ۱۷، ۱۸ ورش کی عمر تھی۔ سوبھاؤ میں گمبھیرتا (سنجیدگی) تھی بات چیت بہت سلیقے سے کرتا تھا۔ یہاں آنے کے تیسرے دن بخار آنے لگا۔ دو چار دن تو جیوں تیوں کرکے کاٹے لیکن جب بخار نہ چھوٹا، تو گھبرا گیا۔ گھر کی یاد آئی۔ اور کچھ نہ سہی گھر والے کیا دوا درپن بھی نہ کریں گے۔ میرے پاس آکر بولا۔ مہاشئے میں بیمار ہوگیا ہوں۔ آپ کچھ روپے دے دیں۔ تو گھر چلا جاؤں۔ وہاں جاتے ہی روپیوں کا پربندھ کرکے بھیج دوں گا۔ وہ واستو میں بیمار تھا۔ میں اس سے بھلی بھانتی پرپچت تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ یہاں رہ کر وہ کبھی سواستھیہ لابھ (صحت یاب) نہیں کرسکتا۔ اسے سچ مچ سہایتا کی ضرورت تھی۔ پر مجھے شنکا ہوئی کہ کہیں یہ بھی روپے ہضم نہ کرجائے۔ جب ایک وچارشیل سُیوگیہ وِدّوان پُروش (قابل، عالم، شخص) دھوکا دے سکتا ہے تو ایسے اردھ شِکشِت نُویووک سے کیسے یہ آشا کی جائے کہ وہ اپنے وچن کا پالن کرے گا؟

میں کئی منٹ تک گھور سنکٹ میں پڑا رہا۔ انت میں بولا۔ بھئی مجھے تمھاری دشا پر بہت دُکھ ہے۔ مگر میں اس سمئے کچھ نہ کرسکوں گا۔ بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ کھید ہے۔

یہ کورا جواب سن کر اس کی آنکھوں سے آنسوں گرنے لگے۔ وہ بولا آپ چاہیں تو کچھ نہ کچھ پربندھ اوشیہ کرسکتے ہیں۔ میں جاتے ہی آپ کے روپیہ بھیج دوں گا۔

میں نے دل میں کہا۔ یہاں تمھاری نیت صاف ہے۔ لیکن گھر پہنچ کر بھی یہی نیت رہے گی اس کا کیا پرمان (ثبوت) ہے؟ نیت صاف رہنے پر بھی میرے روپے دے سکوگے یا نہیں یہی کون جانے؟ کم سے کم تم سے وصول کرنے کا میرے پاس کوئی سادھن نہیں ہے۔ پرکٹ میں کہا۔ اس میں مجھے کوئی سندیہہ نہیں ہے۔ لیکن کھید ہے کہ مرے پاس روپیہ نہیں ہیں۔ ہاں تمھاری جتنی تنخواہ نکلتی ہو وہ لے سکتے ہو۔

اس نے کچھ جواب نہیں دیا۔ کرکرتویوموڈ کی طرح ایک بار آکاش کی اُور دیکھا اور چلا گیا۔ میرے ہردے (دل) میں کٹھن ویدنا (سخت تکلیف) ہوئی۔ اپنی سوارتھ پرتا پر گلانی ہوئی۔ پر اَنت کو جو میں نے نشچے کیا تھا اسی پر استھر رہا۔ اسی وچار سے من کو سنتوش ہوگیا کہ میں ایسا کہاں کا دھنی ہوں جو یوں روپے پانی میں پھینکتا پھروں۔

یہ ہے اس کپٹ کا پری نام (نتیجہ) جو میرے کوی متر نے میرے ساتھ کیا۔ معلوم نہیں آگے چل کر اس نربلتا کا کیا کُپھل (بُرا نتیجہ) نکلتا، پر سوبھاگیہ سے اس کی نوبت نہ آئی۔ ایشور کو مجھے اس اَپیش سے بچانا منظور تھا۔ جب وہ آنکھوں میں آنسوں بھرے میرے پاس سے چلا، تو کاریالیہ (دفتر) کے ایک کلرک پنڈت پرتھوی ناتھ سے اس کی بھینٹ ہوگئی۔ پنڈت جی نے اس سے حال پوچھا، پورا ورتانت (ماجرا) سن لینے کے بعد بنا کسی آگے پیچھے کے انھوں نے ۱۵ روپے نکال کر اُسے دے دیے۔ یہ روپیہ انھیں کاریالیہ کے منیم سے ادھار لینے پڑے۔ مجھے یہ حال معلوم ہوا تو ہردے کے اوپر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ اب وہ بے چارہ مزے سے اپنے گھر پہنچ جائے گا۔ یہ سنتوش مفت میں ہی پراپت ہوگیا۔ کچھ اپنی نیچتا پر لجہ بھی آئی۔ میں لمبے لمبے لیکھوں میں دَیا منشیتا (انسانیت) اور سد ویوہار (اچھا سلوک) کا اپدیش دیا کرتا تھا پر اوسر پڑنے پر صاف جان بچا کر نکل گیا۔ اور یہ بے چارہ کلرک جو میرے لیکھوں کا بھکت تھا اتنا اُدار (فیاض) اور دیاشیل (رحم دل) نکلا۔ گرو گڑ ہی رہے چیلا شکر ہوگئے۔ خیر اس میں بھی ایک وینگ پورن (طنز آمیز) سنتوش تھا کہ میرے اُپدیشوں (نصیحتوں) کا اثر مجھ پر نہ ہوا، نہ سہی دوسروں پر تو ہوا، چراغ کے تلے اندھیرا رہا تو کیا ہوا اس کا پرکاش تو پھیل رہا ہے۔ پر کہیں بچہ کو روپے نہ ملے (اور شاید ہی ملیں،

اس کی بہت کم آشا ہے) تو خوب چھکیں گے۔ حضرت کو آڑے ہاتھوں لوں گا۔ کنتو میری یہ ابھیلاشا (خواہش) نہ پوری ہوئی۔ پانچویں دن روپے آگئے۔ ایسی اور آنکھیں کھول دینے والی یاتنا مجھے اور کبھی نہیں ملی تھی۔ خیریت یہی تھی کہ میں نے اس گھٹنا کی چرچا استری سے نہیں کی تھی۔ نہیں تو مجھے گھر میں رہنا بھی مشکل ہوجاتا۔

(۳)

اُپریکت (مندرجہ بالا) ورتانت لکھ کر میں نے ایک پتریکا میں بھیج دیا۔ میرا اُدّیشیہ کیول یہ تھا کہ جنتا کے سامنے کپٹ ویوہار کے کُپری نام (بُرے نتیجے) کا ایک دِرشیہ رکھوں۔ مجھے سوپن (خواب) میں بھی آشا نہ تھی کوئی پرتیکش (براہِ راست) پھل نکلے گا۔ اسی سے جب چوتھے دن انایاس (اچانک) میرے پاس ۷۵ روپے کا منی آڈر پہنچا تو میرے آنند کی سیما نہ رہی۔ پریشک وہی مہاشے تھے۔ اُماپتی۔ کوپن پر کیول چھما لکھا ہوا تھا۔ میں روپے لے جاکر پتنی کے ہاتھوں میں رکھ دیے اور کوپن دکھلایا۔

اس نے اَن منے بھاؤ (بے دلی) سے کہا۔ انھیں لے جاکر یتن سے اپنے صندوق میں رکھو۔ تم ایسے لوبھی پُرکرتی (لالچی نیچر) کے منشیہ ہو۔ یہ مجھے آج گیات ہوا۔ تھوڑے سے روپیوں کے لیے کسی کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑجانا سجنتا (شرافت) نہیں ہے۔ جب کوئی شِکشت اور ونے شیل منشیہ اپنے وچن کا پالن نہ کرے تو یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ وِوش ہے۔ وِوش منشیہ کو باربار تقاضوں سے لجّت کرنا بھلمنسی نہیں ہے۔ کوئی منشیہ جس کا سروتھا عیتک پتن نہیں ہوگیا ہے۔ یتھا شکتی کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ ان روپیوں کو میں تب تک اپنے پاس نہیں رکھوں گی جب تک اُماپتی جی کا کوئی پتر نہیں آجائے گا کہ کیوں روپے بھیجنے میں اتنا ولمب (تاخیر) ہوا۔

پر اس سمئے میں ایسی اُدار باتیں سننے کو تیار نہ تھا۔ ڈوبا ہوا دھن مل گیا۔ اِس کی خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔

یہ افسانہ ماہنامہ مادھوری کے جولائی 1923 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرورر 6 میں شامل ہے۔
رسم خط بدل کر اردو میں شائع کیا جارہا ہے۔

چکمہ

پنڈت بالک رام شاستری کی بیوی مایا کو بہت دنوں سے ایک ہار کی تمنا تھی۔ اور وہ سینکڑوں ہی بار پنڈت جی سے اُس کا تقاضا کرچکی تھی۔ مگر پنڈت جی ہمیشہ حیلے حوالے کرتے رہتے تھے۔ یہ تو صاف صاف نہ کہتے میرے پاس روپے نہیں ہیں .... اس سے وقارِ شوہری پر حرف آتا تھا .... دلیلوں کی پناہ لیا کرتے تھے۔ زیور ایک روگ ہے۔ ایک تو دھات خالص نہیں ملتی۔ اُس پر سُنار روپے کے آٹھ آنے کر دیتا ہے۔ اور سب سے بڑی علت یہ ہے کہ گھر میں زیور رکھنا چوروں کو بیعانہ دینا ہے۔ لمحہ بھر کی آرائش کے لیے اتنا دردِسر خریدنا جاہلوں کا کام ہے۔ بے چاری مایا منطق نہ پڑھی ہوئی تھی۔ ان اعتراضوں کے سامنے لاجواب ہوجاتی۔ پڑوسنوں کے زیور دیکھ دیکھ کر اس کا جی للچایا کرتا تھا۔ مگر اپنا قصۂ غم کس سے کہے؟ اگر پنڈت جی ذرا جفاکش ہوتے تو یہ مشکل آسان ہوجاتی۔ پر وہ آلسی آدمی تھے۔ وقت کا بیشتر حصہ کھانے اور سونے میں صرف کرتے تھے۔ بیوی کے طعنے منظور تھے۔ اقربا سے آنکھیں چُرانی منظور تھیں۔ مگر نیند کی مقدار میں کمی غیر ممکن تھی۔

(۲)

ایک دن پنڈت جی پاٹھ شالا سے آئے تو دیکھا کہ مایا کے گلے میں ایک ہار براج رہا ہے۔ ہار کی چمک سے اس کے چہرہ پر ایک عجیب رونق آگئی تھی۔ پوچھا یہ ہار کس کا ہے؟

مایا بولی۔ پڑوس میں جو بابو جی رہتے ہیں۔ اُنھیں کی عورت کا ہے۔ آج اُن سے ملنے گئی تھی۔ یہ ہار دیکھا تو بہت پسند آیا۔ تمھیں دِکھانے کے لیے پہن کر چلی آئی۔ بس ایسا ہی ایک ہار مجھے بنوا دو۔

پنڈت۔ غیر کی چیز ناحق مانگ لائیں۔ کہیں گُم ہوجائے تو تاوان تو دینا ہی پڑے۔ بدنامی اوپر سے ہو۔

مایا۔ میں تو ایسا ہی ہار لوں گی۔ بیس تولے کا ہے۔

پنڈت ۔ پھر وہی ضد!

مایا۔ جب سبھی پہنتی ہیں تو میں ہی کیوں نہ پہنوں۔

پنڈت ۔ سب کنوئیں میں گر پڑیں تو تم بھی گر پڑوگی؟ اس ہار کے بنوانے میں ۶۰۰ روپے لگیں گے۔ اگر ایک روپیہ سیکڑہ بھی سُود رکھ لیا جائے۔ تو پانچ سال میں ۶۰۰ کے ایک ہزار ہوجائیں گے۔ لیکن پانچ برس میں ہار مشکل سے ۳۰۰ کا رہ جائے گا۔ اتنا بڑا نقصان اُٹھا کر ہار پہننے میں کیا مزہ ہے۔ یہ ہار واپس کردو۔ کھانا کھاؤ اور آرام سے لیٹو۔

یہ کہتے ہوئے پنڈت جی باہر چلے گئے۔

(۳)

رات کو یکایک مایاؔ نے شور مچاکر کہا ...... چور ! چور ! گھر میں چور۔ مجھے گھسیٹے لیے جاتا ہے۔

پنڈت جی ہک بکا کر اُٹھے اور بولے۔ کہاں؟ کہاں؟ دوڑو ...... ! دوڑو! چور...... چور......!

مایا۔ میری کوٹھری میں گیا ہے۔ میں نے اُس کی پرچھائیں دیکھی۔

پنڈت۔ لالٹین لاؤ۔ ذرا میری لکڑی بھی اُٹھاتی لانا۔

مایا۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے۔

کئی آدمی باہر سے بولے۔ کہاں ہے پنڈت جی؟ کوئی سیند پڑی ہے کیا؟

مایا۔ نہیں سیند نہیں پڑی۔ کھپریل پر سے اُترے ہیں۔ میری نیند کھلی تو کوئی میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ ہائے رام ! یہ تو ہار ہی لے گیا۔ پہنے پہنے سوگئی تھی۔ موئے نے گردن سے نکال لیا! ہائے رام !

پنڈت۔ تم نے ہار اُتار کیوں نہ دیا تھا؟

مایا۔ میں کیا جانتی تھی کہ آج ہی یہ غضب پڑے گا! ہائے رام ! اب کیسے مُنہ دِکھاؤں گی۔

پنڈت۔ اب ہائے ہائے کرنے سے کیا ہوگا؟ اپنی تقدیر کو روؤ۔ اسی لیے کہا کرتا تھا کہ سب دن برابر نہیں جاتے۔ نہ جانے کب کیا ہوجائے۔ اب آئی سمجھ میں میری بات؟ یا اب بھی شُبہ ہے۔ دیکھ لو، اور کچھ تو نہیں لے گیا؟

پڑوسی لالٹین لے کر آپہنچے۔ گھر کا کونا کونا دیکھا۔ کڑیاں دیکھیں۔ اگواڑا پچھواڑا دیکھا۔ جائے ضرور میں جھانکا۔ مگر کہیں چور کا پتا نہ تھا۔

ایک پڑوسی۔ کسی گھر کے بھیدیئے کا کام ہے!

دوسرا۔ بنا گھر کے بھیدیئے کے کبھی چوری ہوتی ہی نہیں۔ اور کچھ تو نہیں لے گیا؟

مایا۔ اور کچھ تو نہیں لے گیا۔ برتن سب پڑے ہوئے ہیں۔ صندوق بھی بند ہے۔ نگوڑے کو لے ہی جانا تھا تو میری چیز لے جاتا۔ پرائی چیز ٹھہری۔ اب کیا ہوگا بھگوان؟

پنڈت۔ گہنے کا مزہ مل گیا نہ؟

مایا۔ ہائے رام! یہ اپجس بدا تھا۔ اور تم جلے پر نمک چھڑکتے ہو۔ ابھاگے میرے گھر کا ایک ایک تنکا چُن لیتے تو مجھے رنج نہ ہوتا۔ ابھی بے چاری نے نیا ہار بنوایا تھا۔

پنڈت۔ خوب معلوم ہے بیس تولے کا تھا؟

مایا۔ بیس ہی تولے تو کہتی تھیں۔

پنڈت۔ بدھیا بیٹھ گئی اور کیا۔

مایا۔ کہہ دوں گی گھر میں چوری ہوگئی۔ کیا جان لیں گے؟ اب اُن کے لیے کوئی چوری کرنے تھوڑے ہی جائے گا۔

پنڈت۔ تمھارے گھر سے چیز گئی۔ تمھیں دینی پڑے گی۔ انھیں اس سے کیا مطلب کہ چور اُٹھا کر لے گئے یا تم نے رکھ لیا۔ پتیائیں گی ہی نہیں۔

مایا۔ تو اتنے روپے کہاں سے آئیں گے؟ ہانڈی بھر ہوتے ہوں گے۔

پنڈت۔ کہیں نہ کہیں سے تو آئیں گے ہی۔ نہیں تو لاج کیسے رہے گی۔ مگر تم نے کی بہت بڑی غلطی۔

مایا۔ بھگوان سے مانگے کی چیز بھی نہ دیکھی گئی۔ میرے سر شیطان سوار تھا۔ نہیں تو گھڑی بھر گلے میں ڈال لینے سے ایسا کون سا سکھ مل گیا۔ میں ہوں ہی ابھاگنی۔

پنڈت۔ اب پچھتانے اور اپنے کو کوسنے سے کیا فائدہ۔ چپ ہو کے بیٹھو۔ پڑوسن سے کہہ دینا گھبراؤ نہیں۔ تمھاری چیز جب تک لوٹا نہ دیں گے ہمیں چین نہ آئے گا۔

(۴)

پنڈت بالک رام کو اب شب و روز ہار کی فکر ستانے لگی۔ یوں اگر ٹاٹ اُلٹ دیتے

تو کوئی بات نہ تھی۔ پڑوسن کو صبر کرنے کے سوا اور چارہ ہی کیا ہوتا۔ برہمن سے تاوان کون لیتا۔ لیکن پنڈت جی برہمنی کی شان کو اتنے سستے داموں نہ بیچنا چاہتے تھے۔ اُن کی آرام طلبی غائب ہوگئی۔ اور فکرِ زر میں منہمک ہوگئے۔

چھ مہینے تک انھوں نے اپنے اوپر خواب و خور حرام کرلیا۔ پہلے پاٹھ شالے سے آکر آرام کرتے تھے۔ براہمنوں کے لیے آمدنی کے جو ایک سو ایک دروازے کُھلے ہوئے ہیں۔ اُن میں سے وہ کسی کی طرف رُخ نہ کرتے تھے۔ پر اب پاٹ شالے سے آکر ایک جگہ بھاگوت کی کتھا کہنے جاتے۔ وہاں سے لوٹ کر گیارہ بجے رات تک بیٹھے زائچے، برس پھل، وغیرہ بنایا کرتے، علی الصباح مندر میں دُرگا پاٹھ کرنے جاتے۔ مایا ان کی یہ مصروفیت دیکھ کر دل میں پچھتاتی کہ میں نے کہاں سے کہاں یہ چال چلی۔ کہیں بیمار پڑجائیں تو لینے کے دینے پڑیں۔ اُن کے جسم کو لاغر ہوتے دیکھ کر اُسے اب اُن کے صحت کی فکر ہونے لگی۔ اس طرح پانچ مہینے گزر گئے۔

ایک دن شام کو وہ چراغ بتی کرنے جا رہی تھی۔ کہ پنڈت جی آئے۔ جیب سے ایک کیس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اور بولے۔ لو آج تمھارے قرض سے سبکدوش ہوگیا۔

مایا نے کیس کھولا تو اس میں سونے کا ہار تھا۔ اُس کی چمک دمک، وضع قطع دیکھ کر اس کے دل میں گُدگُدی ہونے لگی۔ چہرہ پر مسرّت کی سُرخی دوڑ گئی۔ خائف نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ”خوش ہوکر دے رہے ہو یا ناراض ہوکر؟“

پنڈت۔ اس سے کیا مطلب۔ قرض تو چکانا ہی پڑے گا۔ خوشی سے ہو یا ناخوشی سے۔

مایا۔ یہ قرض نہیں ہے۔

”اور کیا ہے؟ بدلا سہی۔“

”بدلا بھی نہیں۔“

”پھر کیا ہے۔“

”تو کیا قرض ادا کرنے کے لیے دوسرا ہار بنوانا پڑے گا؟“

”نہیں۔ جی ! وہ ہار چوری نہیں گیا تھا۔ میں نے جھوٹ موٹ شور مچایا تھا۔“

”سچ !“

"ہاں .... سچ کہتی ہوں۔"

"میری قسم؟"

"تمھارے چرن چھوکر کہتی ہوں۔"

"تو تم نے مجھے چکمہ دیا؟"

"ہاں۔"

"خیر۔ کسی طرح تمھاری مراد تو بر آئی۔ مگر ایشور کے لیے پھر ایسا چکمہ نہ دینا۔"

یہ افسانہ ہندی ماہنامہ 'چاند' اگست 1923 میں 'کوشل' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اردو میں پریم چالیسی اور ہندی میں مان سرودر 3 میں شامل ہے۔

آبھوشن

آبھوشنوں کی نِندا کرنا ہمارا اُدّیشیہ نہیں ہے۔ ہم اُسہیوگ کا اُتپیڑن (استحصال) سہہ سکتے ہیں۔ پر للناؤں کے نردئے، گھاتک واکیہ بانوں کو نہیں اوڑھ سکتے۔ تو بھی اتنا اوشیہ کہیں گے کہ اس ترشنا (خواہش) کی پورتی کے لیے جتنا تیاگ کیا جاتا ہے۔ اس کا سداُپیوگ کرنے سے مہان پد (مقام) پراپت ہوسکتا ہے۔

یدّپی (حالانکہ) ہم نے کسی روپ ہین (بدصورت) مہیلا کو آبھوشنوں کی سجاوٹ سے روپ وتی ہوتے نہیں دیکھا۔ یدّپی ہم یہ بھی مان لیتے ہیں کہ روپ کے لیے آبھوشنوں کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی گھر کے لیے دیپک کی۔ کنتو شاریرک شوبھا کے لیے ہم تن کو کتنا مَلِن، چِتّ کو کتنا اَشانت اور آتما کو کتنا کلُشِت بنا لیتے ہیں (گناہ گار)؟ اس کا ہمیں کداچِت (ہرگز) گیان ہی نہیں ہوتا۔ اس دیپک کی جیوتی میں آنکھیں دھندھلی ہوجاتی ہیں۔ یہ چمک دمک کتنی ایرشا (نفرت) کتنے دُویش (جلن) کتنی پرتسپردھا، کتنی دُشچنتا، اور کتنی دُراشا کا کارن ہے۔ اس کی کیول کلپنا سے ہی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ انھیں بھوشن نہیں، دوشن کہنا ادھِک اُپیکت ہے۔ نہیں تو یہ کب ہوسکتا تھا کی کوئی نووَدھو (نئی دُلہن) پتی کے گھر آنے کے تیسرے دن اپنے پتی سے کہتی کہ "میرے پتا نے تمھارے پلّے باندھ کر مجھے تو کنویں میں ڈھکیل دیا"۔ شیلا آج اپنے گاؤں کے تعلقے دار کنور سُریش سنگھ کی نو وِواہتا وَدھو کو دیکھنے گئی تھی۔ اس کے سامنے ہی وہ منتر مُگدھ سی ہوگئی۔ بہو کے روپ لاونیہ (ناک نقشے) پر نہیں۔ اس کے آبھوشن کی جگمگاہٹ پر اس کی ٹکٹکی لگی رہی۔ اور جب سے لوٹ کر گھر آئی۔ اس کی چھاتی پر سانپ لوٹتا رہا۔ اَنت کو جیوں ہی اس کا پتی آیا۔ وہ اس پر برس پڑی اور دل میں بھرا ہوا غبار پورڈوکت شبدوں میں نکل پڑا۔ شیلا کے پتی کا نام وِمل سنگھ تھا۔ اس کے پُرکھے کسی زمانے میں علاقے دار تھے۔ اس گاؤں پر بھی انھیں کا سولہ آنے اِدھکار تھا۔ لیکن اب اس گھر کی دشا ہین ہوگئی ہے۔ سُریش سنگھ کے پتا زمین داری کے کام میں دکش (ماہر) تھے۔ وِمل سنگھ کا سب علاقہ کسی نہ کسی پرکار ان کے ہاتھ

میں آگیا۔ وِمل کے پاس سواری کا ٹٹو بھی نہ تھا۔ اسے دن میں دو بار بھوجن بھی مشکل سے ملتا تھا۔ ادھر سُریش کے پاس ہاتھی موٹر اور کئی گھوڑے تھے۔ دس پانچ باہر کے آدمی بِتیہ دوار پر پڑے رہتے تھے۔ پر اتنی وشمتا ہونے پر بھی دونوں میں بھائی چارا نبھایا جاتا تھا۔ شادی بیاہ میں، منڈن، چھیدن میں پَرسپر آنا جانا ہوتا رہتا تھا۔ سُریش وِدیا پریمی تھے۔ ہندوستان میں اونچی شکچھا سماپت کرکے وہ یوروپ چلے گئے اور سب لوگوں کی شنکاؤں کے وِپریت وہاں سے آریہ سمبھیتا کے پرم بھگت بن کر لوٹے۔ وہاں کے جڑواد کرتم بھوگ لِپتا (عیش پرستی) اور امانُشِک (غیر انسانی) مداندھتا (مدھوشی) نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ پہلے وہ گھر والوں کے بہت زور دینے پر بھی وِواہ کرنے کو راضی نہیں ہوئے تھے۔ لڑکی سے پورو پرِیچئے ہوئے بنا پرنے نہیں کرسکتے تھے۔ پر یوروپ سے لوٹنے پر ان کے وَیواہک وِچاروں میں بہت بڑا پریورتن ہوگیا۔ انھوں نے اسی پہلے کی کنیا سے بِنا اس کے اَچار وِچار جانے ہوئے وِواہ کرلیا۔ اب وہ وِواہ کو پریم کا بندھن نہیں، دھرم کا بندھن سمجھتے تھے۔ اسی سوبھاگیہ وتی وَدھو کو دیکھنے کے لیے آج شیتلا اپنی ساس کے ساتھ سُریش کے گھر گئی تھی۔ اسی کے آبھوشن کی چھٹا دیکھ کر وہ مَرماہت سی (دلی صدمہ) ہوگئی تھی۔ وِمل نے وَیتھت ہوکر کہا۔ تو ماتا پِتا سے کہا ہوتا۔ سُریش سے بیاہ کردیتے، وہ تمھیں گہنوں سے لاد سکتے تھے۔

شیتلا۔ تو گالی کیوں دیتے ہو۔

وِمل۔ گالی نہیں دیتا، بات کہتا ہوں، تم جیسی سندری کو انھوں نے ناحق میرے ساتھ بیاہا۔

شیتلا۔ لجاتے تو ہو نہیں، اُلٹے اور تانے دیتے ہو۔

وِمل۔ بھاگیہ میرے وَش (بس) میں نہیں ہے۔ اتنا پڑھا بھی نہیں ہوں کہ کوئی بڑی نوکری کرکے روپے کماؤں۔

شیتلا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ پریم ہی نہیں ہے۔ پریم ہو تو کنچن برسنے لگے۔

وِمل۔ تمھیں گہنوں سے بہت پریم ہے؟

شیتلا۔ سبھی کو ہوتا ہے۔ مجھے بھی ہے۔

وِمل۔ اپنے کو اَبھاگنی سمجھتی ہو؟

شیتلا۔ ہوں ہی، سمجھنا کیسا؟ نہیں تو کیا دوسروں کو دیکھ کر ترسنا پڑتا؟

وِمل۔ گہنے بنوا دوں تو اپنے کو بھاگیہ وتی سمجھنے لگو گی؟

شیتلا۔ (چڑھ کر) تم تو اس طرح پوچھ رہے ہو۔ جیسے سُنار دروازے پر بیٹھا ہو۔

وِمل۔ نہیں سچ کہتا ہوں، بنوا دوں گا۔ ہاں کچھ دن صبر کرنا پڑے گا۔

(۲)

سمرتھ پُروشوں کو بات لگ جاتی ہے تو پَران لے لیتے ہیں۔ سامرتھیہ ہین پُروش اپنی ہی جان پر کھیل جاتا ہے۔ وِمل سنگھ نے گھر سے نکل جانے کی ٹھانی۔ نشچئے کیا یا تو اسے گہنوں سے ہی لاد دوں گا یا ویدھوشوک (بیوگی) سے۔ یا تو آبھوشن ہی پہنے گی یا سیندور کو بھی ترسے گی۔

دن بھر وہ چنتا میں ڈوبا پڑا رہا۔ شیتلا کو اس نے پریم سے سنتشٹ کرنا چاہا تھا۔ آج انُبھو ہوا کہ ناری کا ہردئے پریم پاش سے نہیں بندھتا۔ کنچن کے پاس ہی سے بندھ سکتا ہے۔ پہر رات جاتے جاتے وہ گھر سے چل کھڑا ہوا۔ پیچھے پھرکر کبھی نہ دیکھا۔ گیان سے جاگے ہوئے وراگ میں چاہے موہ کا سنسکار ہو۔ پر نراشیہ سے جاگا ہوا وراگ اچل ہوتا ہے، پرکاش میں ادھر کی وستوؤں کو دیکھ من وِچلت ہوسکتا ہے، پر اندھکار میں کس کا ساہس ہے جو لیک سے جو بھر بھی ہٹ سکے۔

وِمل کے پاس وِدیا نہ تھی، کلا کوشل بھی نہ تھا۔ اسے کیول اپنے کٹھن پریشرم اور کٹھن آتم تیاگ ہی کا ادھار تھا۔ وہ پہلے کلکتے گیا۔ وہاں کچھ دن تک ایک سیٹھ کی اگوانی کرتا رہا۔ وہاں جو سُن پایا کہ رنگون میں مزدوری اچھی ملتی ہے، تو وہ رنگون جا پہنچا اور بندر پر مال چڑھانے اور اُتارنے کا کام کرنے لگا۔

کچھ تو کٹھن شرم (محنت) کچھ کھانے پینے کے اسّیم اور کچھ جل وایو (آب و ہوا) کی خرابی کے کارن وہ بیمار ہوگیا۔ شریر دُربل ہوگیا۔ مکھ کی کانتی جاتی رہی، پھر بھی اس سے زیادہ محنتی مزدور بندر پر دوسرا نہ تھا۔ اور مزدور تھے، پر یہ مزدور تپسّوی تھا۔ من جو کچھ ٹھان لیا تھا۔ اسے پورا کرنا اس کے جیون کا ایک ماتر اُدّیشیہ تھا۔

اس نے گھر کو اپنا کوئی سماچار نہ بھیجا۔ اپنے من سے ترک کیا۔ گھر میں میرا کون ہتّو ہے؟ گہنوں کے سامنے مجھے کون پوچھتا ہے؟ اس کی بدھی یہ رہسیہ سمجھنے میں اسمرتھ تھی۔ کہ آبھوشنوں کی لالسا رہنے پر بھی پرنے کا پالن کیا جاسکتا ہے۔ اور مزدور پراتہ کال سیروں

مٹھائی کھا کر جل پان کرتے تھے۔ دن بھر دم دم بھر پر گانجے چرس اور تماکو کے دم لگاتے تھے۔ اوکاش پاتے تو بازار کی سیر کرتے تھے۔ کتنوں ہی کو شراب کا بھی شوق تھا۔ پیسوں کے بدلے روپے کماتے تھے۔ تو پیسوں کی جگہ روپے خرچ بھی کر ڈالتے تھے۔ کسی کی دیہہ پر ثابوت کپڑے تک نہ تھے۔ پر وِمل ان گنتی کے دو چار مزدوروں میں تھا۔ جو سیّم سے رہتے تھے جن کے جیون کا اڈیشیہ کھا پی کر مرجانے کے سوا کچھ اور بھی تھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے پاس تھوڑی سی سمپتی ہوگئی۔ دھن کے ساتھ اور مزدوروں پر دباؤ بھی بڑھنے لگا۔ یہ پرایہ سبھی جانتے تھے کہ وِمل ذات کا گلین ٹھاکر ہے سب ٹھاکر کہہ کر اسے پکارتے تھے۔ سیّم اور آچارسمّان سِدھی کے منتر ہیں۔ وِمل مزدوروں کا نیتا اور مہاجن ہوگیا۔

وِمل کو رنگون میں کام کرتے ہوئے تین ورش ہوچکے تھے۔ سندھیا ہوگئی تھی۔ وہ کئی مزدوروں کے ساتھ سمندر کے کنارے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔

ایک مزدور نے کہا۔ یہاں کی سبھی استریاں نِٹھر ہوتی ہیں۔ بے چارا جھینگرُ دس برس سے اسی برمی استری کے ساتھ رہتا تھا۔ کوئی اپنی بیاہی جورو سے بھی اتنا پریم نہ کرتا ہوگا۔ اس پر اتنا وشواس کرتا تھا کہ جو کچھ کماتا سو اس کے ہاتھ میں رکھ دیتا تھا۔ تین لڑکے تھے۔ ابھی کل تک دونوں ساتھ ساتھ کھا کر لیٹے تھے۔ نہ کوئی لڑائی، نہ بات، نہ چیت۔ رات کو عورت نہ جانے کہاں چلی گئی۔ لڑکوں کو چھوڑ گئی۔ بے چارا جھینگرُ رو رہا ہے۔ سب سے بڑی مشکل تو چھوٹے بچّے کی ہے۔ ابھی کل چھ مہینے کا ہے کیسے جئے گا بھگوان جانیں۔

وِمل سنگھ نے گمبھیر بھاؤ سے کہا۔ گہنے بنواتا تھا کہ نہیں؟

مزدور۔ روپے پیسے تو عورت ہی کے ہاتھ میں تھے، گہنے بنواتی اس کا ہاتھ کون پکڑتا؟

دوسرے مزدور نے کہا۔ گہنوں سے تو لدی ہوئی تھی۔ جدھر سے نکل جاتی تھی چھم چھم کی آواز سے کان بھرجاتے تھے۔

وِمل۔ جب گہنے بنوانے پر بھی نٹھرائی کی تو یہی کہنا پڑے گا کہ یہ ذات ہی بے وفا ہوتی ہے۔

اتنے میں ایک آدمی آکر وِمل سنگھ سے بولا۔ چودھری، ابھی مجھے ایک سپاہی ملا تھا۔ وہ تمھارا نام، گاؤں اور باپ کا نام پوچھ رہا تھا۔ کوئی بابو سُریش سنگھ ہیں۔

وِمل نے سشنک (فکر مند) ہو کر کہا۔ ہاں ہیں تو۔ میرے علاقے کے علاقے دار اور برداری کے بھائی ہیں۔

آدمی۔ انھوں نے تھانے میں کوئی نوٹس چھپوایا ہے کہ جو وِمل سنگھ کا پتہ لگاوے گا اُسے ہزار روپے کا انعام ملے گا۔

وِمل۔ تو تم نے سپاہی کو سب ٹھیک ٹھیک بتا دیا؟

آدمی۔ چودھری، میں کوئی گنوار ہوں کیا؟ سمجھ گیا کچھ دال میں کالا ہے۔ نہیں تو کوئی اتنے روپے کیوں خرچ کرتا۔ میں نے کہہ دیا کہ ان کا نام وِمل سنگھ نہیں جسودا پانڈے ہے۔ باپ کا نام مکھو بتایا اور گھر ضلع جھانسی میں۔ پوچھنے لگا، یہاں کتنے دن سے رہتا ہے؟ میں نے کہا کوئی دس سال سے۔ تب کچھ سوچ کر چلا گیا۔ سُریش بابو سے تم سے کوئی عداوت ہے کیا چودھری؟

وِمل۔ عداوت تو نہیں تھی۔ مگر کون جانے، ان کی نیت بگڑ گئی ہو۔ مجھ پر کوئی اَپرادھ لگا کر میری جگہ زمین پر ہاتھ بڑھانا چاہتے ہوں۔ تم نے بڑا اچھا کیا کہ سپاہی کو اٹن جھانئی بتائی۔

آدمی۔ مجھ سے کہتا تھا کہ ٹھیک ٹھیک بتا دو، تو ۵۰ روپے تمھیں بھی دلا دوں۔ میں نے سوچا۔ آپ تو ہزار کی گٹھری مارے گا اور مجھے ۵۰ روپے دلانے کو کہتا ہے۔ پھٹکار بتا دی۔

ایک مزدور۔ مگر جو ۲۰۰ روپے دینے کو کہتا تو تم سب ٹھیک نام ٹھکانا بتا دیتے (کیوں؟ دھت تیرے لالچی کی)۔

آدمی۔ (لجّت ہوکر) ۲۰۰ روپے نہیں ۲۰۰۰ روپے بھی دیتا، تو نہ بتاتا۔ مجھے ایسا وشواس گھات کرنے والا مت سمجھو۔ جب جی چاہے پرکھ لو۔

مزدوروں میں یوں واد وِواد ہوتا ہی رہا۔ وِمل آکر اپنی کوٹھری میں لیٹ گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ اب کیا کروں؟ جب سُریش جیسے سجّن کی نیت بدل گئی تو اب کس کا بھروسہ کروں۔ نہیں اب بنا گھر گئے کام نہیں چلے گا۔ کچھ دن اور نہ گیا تو پھر کہیں کا نہ ہوں گا۔ دو سال اور رہ جاتا، تو پاس میں پورے ۵۰۰۰ روپے ہوجاتے۔ شیتلا کی اِچھا کچھ پوری ہوجاتی۔ ابھی تو سب ملا کر ۳۰۰۰ روپے ہی ہوں گے۔ اتنے میں اس کی ابھیلاشا (خواہش)

نہ پوری ہوگی۔ خیر ابھی چلوں، چھ مہینے میں پھر لوٹ آؤں گا۔ اپنی جائداد تو بچ جائے گی۔ نہیں چھ مہینے میں رہنے کا کیا ہے۔ جانے آنے میں ایک مہینہ لگ جائے گا۔ گھر میں ۱۵ دن سے زیادہ نہ رہوں گا۔ وہاں کون پوچھتا ہے۔ آؤں یا رہوں۔ مروں یا جیوں۔ وہاں تو گہنوں سے پریم ہے۔

اس طرح من میں نشچئے کر کے وہ دوسرے دن رنگون سے چل پڑا۔

سنسار کہتا ہے کہ گُن کے سامنے روپ کی کوئی ہستی نہیں۔ ہمارے نیتی شاستر کے آچاریوں کا بھی یہی کتھن ہے، پر واستو میں یہ کتنا بھرم مُولک ہے۔ کنور سُریش سنگھ کی نووَدھو منگلا کماری گریہہ کاریہ میں نپُن، پتی کے اشارے پر پران دینے والی۔ اتینت وِچار شیل، مدُھر بھاسا اور دھرم بھیرو استری تھی۔ پر سوندریہ وِہین ہونے کے کارن پتی کی آنکھوں میں کانٹے کے سمان کھٹکتی تھی۔ سُریش سنگھ بات بات پر اس پر جھنجھلاتے پر گھڑی بھر میں پشچاتاپ کے وشی بھوت ہوکر اس سے چھما مانگتے کنتُو دوسرے ہی دن وہی کُتسِت ویاپار شروع ہوجاتا۔ ودپتی یہ تھی کہ ان کے آچرن انیہ رئیسوں کی بھانتی بھرشٹ نہ تھے۔ وہ دمپتی جیون میں ہی آنند، سکھ، شانتی، وشواس، پرایہ سبھی ایہک (دنیاوی) اور پارمارتھِک (آخرت) اڈیشیہ پورا کرنا چاہتے تھے اور دامپتیہ سکھ سے ونچِت ہوکر انھیں اپنا سمست جیون نیرس، سواد ہین اور کُنٹھت جان پڑتا تھا۔ پھل یہ ہوا کہ منگلا کو اپنے اوپر وشواس نہ رہا۔ وہ اپنے من سے کوئی کام کرتے ہوئے ڈرتی کہ سوامی ناراض ہوں گے۔ سوامی کے خوش رکھنے کے لیے اپنی بھولوں کو چھپاتی بہانے کرتی، جھوٹ بولتی۔ نوکروں کو اَپرادھ لگا کر آتم رکچھا کرنا چاہتی۔ پتی کو پرسّن رکھنے کے لیے اس نے اپنے گُنوں کی اپنی آتما کی اوہیلنا کی، پر اُٹھنے کے بدلے وہ پتی کی نظروں سے گرتی گئی۔ نتیہ نئے شرنگار کرتی، پر لکچھ سے دور ہوتی جاتی تھی۔ پتی کی ایک مدھر مسکان کے لیے ان کے ادھروں کے ایک میٹھے شبد کے لیے اس کا پیاسا ہردے تڑپ تڑپ کر رہ جاتا تھا لاونیہ وہین استری وہ بھکشُک نہیں ہے۔ جو چنگل بھر آٹے سے سنتُشٹ ہوجائے۔ وہ بھی پتی کا سمپورن اکھنڈ پریم چاہتی ہے۔ اور کداچت سندریوں سے ادھِک، کیوں کہ وہ اس کے لیے اسادھارن پرَیتن اور انُشٹھان کرتی ہے۔ منگلا اس پرَیتن میں نِسپھل ہوکر اور بھی سنتپت ہوتی تھی۔

دھیرے دھیرے پتی پر سے اس کی شرڈھا اُٹھنے لگی۔ اس نے ترک کیا کہ ایسے

گرور، ہردئے شونیہ، کلپناہین مُنشیہ سے میں بھی اسی کا سا ویوہار کروں گی۔ جو پُروش روپ کا بھکت ہے وہ پریم بھکتی کے یوگیہ نہیں۔ اس پرتیاگھات نے سمسیا اور بھی جٹل کردی۔

مگر منگلا کی کیول اپنی روپ ہینتا ہی کا رونا نہ تھا۔ شیتلا کا انوپم روپ لالِتیہ بھی اس کی کامناؤں کا بادھک تھا۔ بلکہ یہ اس کی آشالتاؤں پر پڑنے والا تُشار (برف) تھا۔ منگلا سندری نہ سہی پر پتی پر جان دیتی تھی۔ جو اپنے کو چاہے اس سے ہم وِمکھ نہیں ہوسکتے۔ پریم کی شکتی اَپار ہے پر شیتلا کی مورتی سُریش کے ہردئے دوار پر بیٹھی ہوئی منگلا کو اندر نہ جانے دیتی تھی۔ چاہے وہ کتنا ہی وِیش بدل کر آوے سُریش اس مورتی کو ہٹانے کی چیشٹا کرتے تھے۔ اسے بلات نکال دینا چاہتے تھے۔ کنتو سوندریہ کا آدِھپتیہ دھن کے آدِھپتیہ سے کم دُرنوار نہیں ہوتا۔ جس دن شیتلا اس گھر میں منگلا کا مکھ دیکھنے آئی تھی اسی دن سُریش کی آنکھوں نے اس کی منوہر چھوی کی ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ ایک جھلک مانو ایک چھنِک کریا تھی۔ جس نے ایک ہی دھاوے میں سمست ہردئے راجیہ کو جیت لیا، اس پر اپنا آدِھپتیہ جما لیا۔

سُریش ایکانت میں بیٹھے ہوئے شیتلا کے چتر کو منگلا سے ملاتے یہ نش کرنے کے لیے کہ اس میں کیا انتر ہے؟ ایک کیوں مَن کو کھینچتی ہے، دوسری کیوں اسے ہٹاتی ہے؟ پر اس کے مَن کا یہ کھینچاؤ کیول ایک چترکار یا کوی کا رسا سوادن ماتر تھا۔ وہ پوتر اور واسناؤں سے رہِت تھا۔ وہ مورتی کیول اس کے منورنجن کی سامگری ماتر تھی۔ یہ اپنے مَن کو بہت سمجھاتے سنکلپ کرتے کی اب منگلا کو پرسّن رکھوں گا۔ یدی وہ سندر نہیں ہے تو اس کا کیا دوش؟ پر اُن کا یہ سب پریاس منگلا کے سمّکھ جاتے ہی وِپھل ہوجاتا تھا۔ وہ بڑی سوکشم درشٹ (باریک نگاہ) سے منگلا کے من کے بدلتے ہوئے بھاؤں کو دیکھتے تھے۔ پر ایک پکشاگھات پیڑت مُنشیہ کی بھانتی گھی کے گھڑے کو لڑھکتے دیکھ کر بھی روکنے کا کوئی اُپائے نہ کرسکتے تھے۔ پرینام کیا ہوگا یہ سوچنے کا انھیں ساہس ہی نہ ہوتا تھا۔ پر جب منگلا نے انت کو بات بات میں ان کی تیور آلوچنا کرنا شروع کردیا وہ ان سے اُچھنّر ڈ گلاتا کا ویوہار کرنے لگی۔ تو اس کے پرتی ان کا وہ اتنا سوہادر بھی وِلپت ہوگیا۔ گھر میں آنا جانا چھوڑ دیا۔

(۳)

ایک دن سندھیا کے سمئے بڑی گرمی تھی۔ پنکھا جھلنے سے آگ اور بھی دہکتی تھی۔

کوئی سیر کرنے باغیچوں میں بھی نہ جاتا تھا۔ پسینے کی بھانتی شریر سے ساری اسفورتی (چستی) بہہ گئی تھی۔ جو جہاں تھا وہیں مردہ سا پڑا تھا۔ آگ سے سینکے ہوئے مردنگ کی بھانتی لوگوں کے سور کرکش (کرخت) ہوگئے تھے۔ سادھارن بات چیت میں بھی لوگ اتیجت ہوجاتے تھے۔ جیسے سادھارن سنگھرشن سے بَن کی وِرکش جل اُٹھتے ہیں۔ سُریش سنگھ کبھی چار قدم ٹہلتے تھے پھر ہانپ کر بیٹھ جاتے تھے۔ نوکروں پر جھنجھلا رہے تھے کہ جلد جلد چھڑکاؤ کیوں نہیں کرتے۔ سہسا انھیں اندر سے گانے کی آواز سنائی دی چونکے، پھر کرودھ آیا۔ مدھر گان کانوں کو اپریہ جان پڑا۔ یہ کیا بے وقت کی شہنائی ہے۔ یہاں گرمی کے مارے دم نکل رہا ہے۔ اور ان سب کو گانے کی سوجھی ہے منگلا نے بلایا ہوگا اور کیا۔ لوگ ناہک کہتے ہیں کہ استریوں کا جیون کا آدھار پریم ہے ان کی جیون کا آدھار وہی بھوجن، ندرا، راگ رنگ، آمود پرمود ہے۔ جو سمست پرانیوں کا ہے گھنٹے بھر تو سن چکا۔ یہ گیت کبھی بند بھی ہوگا یا نہیں۔ سب ویرتھ میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہی ہیں۔

انت کو نہ رہا گیا۔ زنان خانے میں آکر بولے۔ یہ تم لوگوں نے کیا کاؤں کاؤں مچا رکھی ہے؟ یہ گانے بجانے کا کون سا سمئے ہے۔ باہر بیٹھنا مشکل ہوگیا۔

سناٹا چھا گیا جیسے شور غل مچانے والے بالکوں میں ماسٹر پہنچ جائے۔ سبھی نے سر جھکا لیے اور سمٹ گئے۔

منگلا ترنت اُٹھ کر سامنے والے کمرے میں چلی گئی۔ پتی کو بلایا اور آہستے سے بولی۔ کیوں اتنا بگڑ رہے ہو؟

"میں اس وقت گانا نہیں سننا چاہتا۔"

تمھیں سناتا ہی کون ہے؟ کیا میرے کانوں پر بھی تمھارا ادھیکار ہے۔

"فضول کی بم چکھ......"

تم سے مطلب؟

"میں اپنے گھر میں یہ کولاہل نہ مچنے دوں گا؟"

"تو میرا گھر کہیں اور ہے؟"

سُریش سنگھ اس کا اُتّر نہ دے کر بولے۔ ان سب سے کہہ دو پھر کسی وقت آئیں۔

منگلا۔ اس لیے کہ تمھیں ان کا آنا اچھا نہیں لگتا؟

"ہاں اسی لیے۔"

"تم کیا سدا وہی کرتے ہو، جو مجھے اچھا لگے؟ تمھارے یہاں متر آتے ہیں، ہنسی ٹھٹھے کی آواز اندر سنائی دیتی ہے۔ میں کبھی نہیں کہتی کہ ان لوگوں کا آنا بند کردو۔ تم میرے کاموں میں دست اندازی کیوں کرتے ہو۔"

سُریش نے تیز ہوکر کہا۔ اس لیے کہ میں گھر کا سوامی ہوں۔

منگلا۔ تم باہر کے سوامی ہو۔ یہاں میرا ادھیکار ہے۔

سُریش۔ کیوں ویرتھ کی بک بک کرتی ہو؟ مجھے چڑھانے سے کیا ملے گا؟

منگلا ذرا دیر چپ چاپ کھڑی رہی وہ پتی کے منوگت بھاؤں کی میمانسا (قیاس) کر رہی تھی، پھر بولی۔ اچھی بات ہے جب اس گھر میں میرا کوئی ادھکار نہیں تو نہ رہوں گی۔ اب تک بھرم میں تھی آج تم نے وہ بھرم مٹا دیا۔ میرا اس گھر پر ادھکار کبھی نہیں تھا۔ جس استری کا پتی کے ہردئے پر ادھیکار نہیں اس کا اس کی سمپتی پر بھی کوئی ادھیکار نہیں ہوسکتا۔

سُریش نے لجّت ہوکر کہا۔ بات کا بتنگڑ کیوں بناتی ہو۔ میرا یہ مطلب نہ تھا۔ کچھ کا کچھ سمجھ گئی۔

منگلا۔ من کی بات آدمی کے منہ سے انایاس ہی نکل جاتی ہے۔ ساودھان ہوکر ہم اپنے بھاوؤں کو چھپا لیتے ہیں۔

سُریش کو اپنی اسجّنتا پر دُکھ تو ہوا پر اس بھئے سے کہ میں اسے جتنا ہی مناؤں گا۔ اتنا ہی یہ اور جلی کٹی سنائے گی اسے وہیں چھوڑ کر باہر چلے آئے۔

پراتہ کال ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ سُریش خماری میں پڑے ہوئے سُوپن دیکھ رہے تھے کہ منگلا سامنے سے چلی جارہی ہے۔ چونک پڑے۔ دیکھا دوار پر سچ مچ منگلا کھڑی ہے۔ گھر کی نوکرانیاں آنچل سے آنکھیں پونچھ رہی ہیں۔ کئی نوکر آس پاس کھڑے ہیں۔ سبھی کی آنکھیں سجل اور مکھ اُداس ہیں۔ مانو بہو بدا ہو رہی ہے۔

سُریش سمجھ گئے کہ منگلا کو کل کی بات لگ گئی پر انھوں نے اُٹھ کر کچھ پوچھنے کی، منانے کی یا سمجھانے کی چیشٹا نہیں کی۔ یہ میرا اپمان کر رہی ہے۔ میرا سر نیچا کر رہی ہے۔ جہاں چاہے جائے۔ مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔ یوں بنا کچھ پوچھے گاچھے چلے جانے کا ارتھ

یہ ہے کہ میں اس کا کوئی نہیں۔ پھر میں اسے روکنے والا کون!

وہ یوں ہی جڑوت پڑے رہے اور منگلا چلی گئی۔ ان کی طرف منہ اُٹھا کر بھی نہ تاکا۔

(۴)

منگلا پاؤں پیدل چلی جا رہی تھی۔ ایک بڑے تعلقے دار کی عورت کے لیے یہ معمولی بات نہ تھی۔ ہر کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی کہ اسے کچھ کہے پُرش اس کی راہ چھوڑ کر کنارے کھڑے ہوجاتے تھے، ناریاں دوار پر کھڑی کرون کوتوہل (ہمدردی اور حسرت) سے دیکھتی تھیں اور آنکھوں سے کہتی تھی۔ ہاں نردئی پُرش! اتنا بھی نہ ہوسکا کہ ایک ڈولہ پر تو بیٹھا دیتا!

اس گاؤں سے نکل کر اس گاؤں میں پہنچی جہاں شیتلا رہتی تھی۔ شیتلا سنتے ہی دوار پر آکر کھڑی ہوگئی اور منگلا سے بولی۔ بہن! ذرا آکر دم لے لو۔

منگلا نے اندر جاکر دیکھا تو مکان جگہ جگہ سے گرا ہوا تھا۔ دالان میں ایک وردھا کھاٹ پر پڑی تھی۔ چاروں اُور دریِدرتا کے چِنہیہ دکھائی دیتے تھے۔

شیتلا نے پوچھا۔ یہ کیا ہوا؟

منگلا۔ جو بھاگیہ میں لکھا تھا۔

شیتلا۔ کنور جی نے کچھ کہا سنا تھا۔

منگلا۔ منہ سے کچھ نہ کہنے پر بھی تو من کی بات چھپی نہیں رہتی۔

شیتلا۔ ارے، تو کیا اب یہاں تک نوبت آگئی؟

دُکھ کی انتم دشا سنکوچ ہین ہوتی ہے۔ منگلا نے کہا۔ چاہتی تو اب بھی پڑی رہتی۔ اسی گھر میں جیون کٹ جاتا۔ پر جہاں پریم نہیں۔ پوچھ نہیں، مان نہیں، وہاں اب نہیں رہ سکتی۔

شیتلا۔ تمھارا میکا کہاں ہے؟

منگلا۔ میکے کون منہ لے کر جاؤں گی؟

شیتلا۔ تب کہاں جاؤگی؟

منگلا۔ ایشور کے دربار میں۔ پوچھوں گی کہ تم نے مجھے سندرتا کیوں نہیں دی؟ بدصورت

کیوں بنایا؟ بہن، استری کے لیے اس سے ادھک دُربھاگیہ کی بات نہیں کی وہ روپ ہین ہو۔ شاید پہلے جنم کی پشاچنیاں ہی بدصورت عورتیں ہوتی ہیں۔ روپ سے پریم ملتا ہے۔ اور پریم سے درلبھ کوئی وَستو نہیں ہے۔

یہ کہہ کر منگلا اُٹھ کھڑی ہوئی شیتلا نے اُسے روکا نہیں۔ سوچا اسے کیا کھلاؤں گی۔ آج تو چولہا جلنے کی بھی کوئی آشا نہیں۔

اس کے جانے کے بعد وہ دیر تک بیٹھی سوچتی رہی۔ میں کیسی ابھاگن ہوں۔ جس پریم کو نہ پاکر یہ بے چاری جیون کو تیاگ رہی ہے۔ اسی پریم کو میں نے پاؤں سے ٹھکرا دیا۔ اسے زیور کی کیا کمی تھی؟ کیا یہ سارے جڑاؤ زیور اسے سُکھی رکھ سکے؟ اس نے انھیں پاؤں سے ٹھکرا دیا۔ انھیں آبھوشنوں کے لیے میں نے اپنا سروسو کھو دیا۔ ہا! نہ جانے وہ (وِمل سنگھ) کہاں ہیں، کس دشا میں ہے۔

اپنی لالسا کو، ترشنا (خواہش) کو وہ کتنی ہی بار دھتکار چکی تھی۔ منگلا کی دشا دیکھ کر آج آبھوشنوں سے گھرنا ہوگئی۔

وِمل کو گھر چھوڑے دو سال ہوگئے تھے۔ شیتلا کو اب ان کے بارے میں بھانتی بھانتی کی شنکائیں ہونے لگی تھی۔ آٹھوں پہر اس کے چِتّ میں گلانی (شرمندگی) اور چھوبھ (ندامت) کی آگ سُلگا کرتی تھی۔

دیہات کے چھوٹے موٹے زمین داروں کے کام ڈانٹ ڈپٹ، چھین جھپٹ ہی سے چلا کرتا ہے۔ وِمل کی کھیتی بیگار میں ہوتی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سارے کھیت پرتی رہ گئے۔ کوئی جوتنے والا نہ ملا۔ اس خیال سے ساجھے پر بھی کسی نے نہ جوتا کہ بیچ میں کہیں وِمل سنگھ آگئے تو ساجھے دار کو انگھوٹھا دکھا دیں گے۔ اسامیوں نے لگان نہ دیا۔ شیتلا نے مہاجن سے روپے اُدھار لے کر کام چلایا۔ دوسرے ورش بھی یہی کیفیت رہی۔ اب کی مہاجن نے روپے نہیں دیے۔ شیتلا کے گہنوں کے سر گئی۔ دوسرا سال سماپت ہوتے ہوتے گھر کی سب لیئی پونجی نکل گئی۔ فاقے ہونے لگے۔ بوڑھی ساس، چھوٹا دیور، نند اور آپ۔ چار پرانیوں کا خرچ تھا۔ نات۔ ہِت بھی آتے ہی رہتے تھے۔ اس پر یہ اور مصیبت ہوئی کی میکے میں ایک فوج داری ہوگئی۔ پِتا اور بڑے بھائی اس میں پھنس گئے۔ دو چھوٹے بھائی۔ ایک بہن اور ماتا چار پَرانی اور سر پر آڈٹے۔ گاڑی پہلے مشکل سے چلتی تھی اب زمین میں

دھنس گئی۔

پراتہ کال سے کلہہ آرمبھ ہوجاتا۔ سمدِھن سمدھن سے۔ سالے بہنوئی سے گتھ جاتے۔ کبھی تو انّ کے اَبھاؤ سے بھوجن ہی نہ بنتا کبھی بھوجن بننے پر بھی گالی گلوج کے کارن کھانے کی نوبت نہ آتی۔ لڑکے دوسروں کے کھیتوں میں جاکر گنّے اور مٹر کھاتے بُڑھیا دوسروں کے گھر جاکر اپنا دُکھڑا روتی اور ٹھکرسوہاتی کہتی، پُرش کی انُوپستھتی میں استری کے میکے والوں کا پرادھانیہ ہوجاتا ہے۔ اس سنگرام میں پرایہ وِجے پتا کہ میکے والوں ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے۔ کسی بھانتی گھر اناج آجاتا۔ تو اسے پیسے کون؟ شیتلا کی ماں کہتی، چار دن کے لیے آئی ہوں تو کیا چکّی چلاؤں؟ ساس کہتی کھانے کی بیر تو بلّی کی طرح لپکیں گی۔ پیستے کیوں جان نکلتی ہے؟ وِوش ہوکر شیتلا کو اکیلے پیسنا پڑتا۔ بھوجن کے سمئے وہ مہا بھارت مچتا کہ پڑوس والے تنگ آجاتے۔ شیتلا کبھی ماں کے پیروں پڑتی، کبھی ساس کے چرن پکڑتی۔ لیکن دونوں ہی اسے جھڑک دیتیں۔ ماں کہتی، تو نے یہاں بلاکر ہمارا پانی اُتار لیا۔ ساس کہتی، میری چھاتی پر سوت لاکر بیٹھا دی اب باتیں بناتی ہے؟ اس گھور وِواد میں شیتلا اپنا وِرہ، شوک بھول گئی۔ ساری اُمنگل شنکائیں اس ورودھاگنی میں شانت ہوگئی۔ بس اب یہی چنتا تھی کہ اس دشا سے چھٹکارا کیسے ہو؟ ماں اور ساس، دونوں ہی کا یمراج کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ پر یمراج ان کا سواگت کرنے کے لیے بہت اُتسک نہیں جان پڑتے تھے۔ سیکڑوں اُپائے سوچتی پر اس پتھک کی بھانتی جو دن بھر چل کر بھی اپنے دوار پر کھڑا ہو اس کی سوچنے کی شکتی نشچل ہوگئی تھی۔ چاروں طرف نگاہیں دوڑاتی کہ کہیں کوئی شرن کا استھان ہے؟ پر کہیں نگاہ نہ جمتی۔

ایک دن وہ اسی نیراشیہ کی اوستھا میں دوار پر کھڑی تھی۔ مصیبت میں چت کی اُدّگنتا میں، انتظار میں دوار سے ہمیں پریم ہوجاتا ہے۔ ساہسا اس نے بابو سُریش سنگھ کو سامنے سے گھوڑے پر جاتے دیکھا۔ ان کی آنکھیں اس کی اُور پھریں۔ آنکھیں مل گئیں۔ وہ جھجھک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کواڑیں بند کرلیے۔ کنورصاحب آگے بڑھ گئے شیتلا کو کھید ہوا کہ انھوں نے مجھے دیکھ لیا۔ میرے سر پر ساڑی پھٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف اس میں پیوند لگے ہوئے تھے۔ وہ اپنے مَن میں نہ جانے کیا کہتے ہوں گے؟

کنور صاحب کو گاؤں والوں سے وِمل سنگھ کے پریوار کے کشٹوں کی خبر ملی تھی۔ وہ

گپت روپ سے ان کی کچھ سہایتا کرنا چاہتے تھے۔ پر شیتلا کو دیکھتے ہی سنکوچ نے انھیں ایسا دبایا کہ دوار پر ایک چھن بھی نہ رُک سکے۔ منگلا کے گرہ تیاگ کے تین مہینے پیچھے آج وہ پہلی بار گھر سے نکلے تھے۔ مارے شرم کے باہر بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔

اس میں سندیہہ نہیں کہ کنور صاحب من میں شیتلا کے روپ، رس کا آسوادن کرتے تھے۔ منگلا کے جانے کے باد ان کے ہردے میں ایک وِچتّر دُشکامنا جاگ اُٹھی۔ کیا کسی اُپائے سے یہ سندری میری نہیں ہوسکتی؟ وِمل کا مدت سے پتہ نہیں بہت سمبھو ہے کہ وہ اب سنسار میں نہ ہو۔ کنتو وہ اس دُش کلپنا کو وِچار سے دباتے رہتے تھے۔ شیتلا کی وپتی کی کتھا سن کر بھی وہ اس کی سہایتا کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ کون جانے، واسنا یہی ویش رکھ کر میرے وِچار اور وویک پر کُٹھارا گھات کرنا چاہتی ہو۔ انت کو لالسا کی کپٹ لیلا انھیں بھلاوا دے ہی گئی۔ وہ شیتلا کے گھر اس کا حال چال پوچھنے گئے۔ من میں ترک کیا۔ یہ کتنا گھور انیائے ہے کہ ایک ابلا ایسے سنکٹ میں ہو۔ اور میں اس کی بات بھی نہ پوچھوں؟ پر وہاں سے لوٹے، تو بدّھی اور وویک کی رسیاں ٹوٹ گئی تھیں اور نوکا موہ واسنا کے اَپار ساگر میں ڈبکیاں کھا رہی تھیں۔ آہ! یہ منوہر چھوی! یہ اَنوپم سَوندَریہ!

ایک چھن میں اُنمتوں کی بھانتی بکنے لگے۔ یہ پران اور یہ شریر تیری بھینٹ کرتا ہوں۔ سنسار ہنسے گا۔ ہنسے۔ مہاپاپ ہے ہو کوئی چنتا نہیں۔ اس سورگیہ آنند سے میں اپنے کو ونچت نہیں کرسکتا؟ وہ مجھ سے بھاگ نہیں سکتی۔ اس ہردئے کو چھاتی سے نکال کر اس کے پیروں پر رکھ دوں گا۔ وِمل مرگیا ۔ نہیں مرا، تو آپ مرے گا۔ پاپ کیا ہے؟ بات نہیں۔ کمل کتنا کومل، کتنا پرفل کتنا للت ہے؟ کیا اس کے ادھروں (لب) ......

اکسمات وہ ٹھٹھک گئے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آجائے۔ منُشیہ میں بدّھی کے انترگت ایک اگیات بدّھی ہوتی ہے۔ جسے رن چھیتر میں ہمت ہار کر بھاگنے والے سپاہیوں کو کسی گپت استھان سے آنے والی کمک سنبھال لیتی ہے۔ ویسے ہی اس اگیات بدھی نے سُریش کو سچیت کردیا۔ وہ سنبھل گئے۔ گلانی سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ کئی منٹ تک کسی دنڈت قیدی کی بھانتی چھبدھ کھڑے سوچتے رہے۔ پھر وجے دھونی سے کہہ اُٹھے۔ کتنا سرل ہے۔ اس وکار کے ہاتھی کو سینھ سے نہیں چیٹی سے ماروں گا۔ شیتلا کو ایک بار 'بہن' کہہ دینے سے ہی یہ سب وکار شانت ہوجائے گا۔ شیتلا! بہن! میں تیرا بھائی ہوں!

اسی چھن انھوں نے شیتلا کو پتر لکھا۔ بہن تم نے اتنے کشٹ جھیلے پر مجھے خبر تک نہ دی! میں کوئی غیر نہ تھا۔ مجھے اس کا دُکھ ہے۔ خیر اب ایشور نے چاہا، تو تمھیں کشٹ نہ ہوگا۔ اس پتر کے ساتھ انھوں نے اناج اور روپے بھیجے۔

شیتلا نے اُتر دیا۔ بھیا چھما کرو جب تک جیوں گی۔ تمھارا یش گاؤں گی۔ تم نے میری ڈوبتی ناؤ پار لگا دی۔

(۵)

کئی مہینے بیت گئے۔ سندھیا کا سمئے تھا، شیتلا اپنی مینا کو چارا چگا رہی تھی۔ اسے سُریش نیپال سے اُسی کے واسطے لائے تھے۔ اتنے میں سریش آکر آنگن میں بیٹھ گئے۔

شیتلا نے پوچھا۔ کہاں سے آتے ہو بھیا؟

سریش۔ گیا تھا ذرا تھانے کچھ پتہ نہیں چلا۔ رنگون میں پہلے کچھ پتہ ملا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ کوئی اور آدمی ہے۔ کیا کروں؟ انعام اور بڑھا دوں؟

شیتلا۔ تمھارے پاس روپے بڑھے ہیں۔ پھونکو۔ ان کی اِچھّا ہوگی آپ ہی آویں گے۔

سریش۔ ایک بات پوچھوں بتاؤ گی؟ کس بات پر تم سے روٹھے تھے؟

شیتلا۔ کچھ نہیں، میں نے یہی کہا کہ مجھے گہنے بنوا دو۔ کہنے لگے میرے پاس ہے کیا؟ میں نے کہا (لجا کر) تو بیاہ کیوں کیا؟ بس باتوں ہی باتوں میں تکرار ہوگئی۔

اتنے میں شیتلا کی ساس آگئی۔ سریش نے شیتلا کی ماں اور بھائیوں کو ان کے گھر پہنچا دیا تھا۔ اس لیے یہاں اب شانتی تھی۔ ساس نے بہو کی بات سن لی تھی۔ کرکش سُور میں بولی۔ بیٹا تم سے کیا پردہ ہے۔ یہ مہارانی دیکھنے ہی کو گلاب کی پھول ہے۔ اندر سب کانٹے ہیں۔ یہ اپنے بناؤ سنگار کے آگے وِمل کی بات ہی نہ پوچھتی تھی۔ بے چارا اس پر جان دیتا تھا پر اس کا منہ ہی نہ سیدھا ہوتا تھا۔ پریم تو اسے چھو نہیں گیا۔ انت کو اسے دیش سے نکال کر اس نے دم لیا۔

شیتلا نے روشٹ ہوکر کہا۔ کیا وہی انوکھے دھن کمانے گھر سے نکلے ہیں؟ دیش ودیش جانا مردوں کا کام ہی ہے۔

سریش۔ یوروپ میں تو دھن بھوگ کے سوا استری پُرش میں کوئی سمبندھ ہی نہیں ہوتا۔ بہن نے یوروپ میں جنم لیا ہوتا۔ تو ہیرے جواہر سے جگمگاتی ہوتی۔ شیتلا، اب تم

ایشور سے یہی کہنا کہ سندرتا دیتے ہو تو یوروپ میں جنم دو۔

شیتلا نے وَیوتھِت ہو کر کہا۔ جن کے بھاگیہ میں لکھا ہے۔ وے یہیں سونے سے لدی ہوئی ہیں۔ میری بھانتی سبھی کے کرم تھوڑے ہی پھوٹ گئے ہیں۔

سریش سنگھ کو ایسا جان پڑا کہ شیتلا کی مکھ کانتی مَلن ہوگئی ہے۔ پتی وِیوگ میں بھی گہنوں کے لیے اتنی لالائت ہے بولے۔ اچھا میں تمھیں گہنے بنوا دوں گا۔

یہ واکیہ کچھ اَپمان سوچک سُور میں کہا گیا تھا۔ پر شیتلا کی آنکھیں آنند سے سجل ہو آئیں۔ کنٹھ گدگد ہوگیا۔ اس کے ہردیے۔ نیتروں کے سامنے منگلا کے رتن جُٹت آبھوشنوں کا چتر کھنچ گیا۔ اس نے کرتگھیتا پورن درشٹی سے سریش کو دیکھا۔ منہ سے کچھ نہ بولی۔ پر اس کا پرتیک انگ کہہ رہا تھا۔ میں تمھاری ہوں۔

(۶)

کوئل آم کی ڈالیوں پر بیٹھ کر، مچھلی شیتل نرمل جل میں کریڑا کرکے اور مرگ شاوک وِسترت ہریالیوں میں چھلانگیں بھر کر اتنے پرسن نہیں ہوتے۔ جتنا منگلا کے آبھوشنوں کو پہن کر شیتلا پرسّن ہو رہی ہے۔ اس کے پیر زمین پر نہیں پڑتے۔ وہ دن بھر آئینے کے سامنے کھڑی رہتی ہے۔ کبھی کیشوں کو سنوارتی ہے، کبھی سرمہ لگاتی ہے۔ کہرا پھٹ گیا اور نرمل سَوچّھ چاندنی نکل آئی ہے وہ گھر کا ایک تنکا بھی نہیں اُٹھاتی۔ اس کے سوا بھاؤ میں ایک وچتر گروَ کا سنسار ہوگیا ہے۔

لیکن شرنگار کیا ہے؟ سوئی ہوئی کام واسنا کو جگانے کا گھورناد، اُدّیپن کا منتر۔ شیتلا جب نکھ، شکھ سے سج کر بیٹھتی ہے تو اسے پربل اِچّھا ہوتی ہے کہ مجھے کوئی دیکھے۔ وہ دوار پر آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ گاؤں کی استریوں کی پرشنسا سے اسے سنتوش (تشفی) نہیں ہوتا۔ گاؤں کے پُروشوں کو وہ شرنگار رس وِہین سمجھتی ہے۔ اس لیے سریش سنگھ کو بلاتی ہے۔ پہلے وہ دن میں ایک بار جاتے تھے۔ اب شیتلا کے بہت انونئے وِنئے کرنے پر بھی نہیں آتے۔ پہر رات گئی تھی۔ گھروں کے دیپک بجھ چکے تھے۔ شیتلا کے گھر میں دیپک جل رہا تھا۔ اس نے کنور صاحب کے باغیچے سے بیلے کے پھول منگوائے تھے۔ اور بیٹھی ہار گونتھ رہی تھی۔ اپنے لیے نہیں سریش کے لیے پریم کے سوا احسان کا بدلہ دینے کے لیے اس کے پاس اور تھا ہی کیا؟

ایکاایک کتّوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دی اور دم بھر میں وِمل سنگھ نے مکان کے اندر قدم رکھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں صندوق تھا دوسرے ہاتھ میں ایک گٹھری۔ شریر دُربل، کپڑے میلے۔ داڑھی کے بال بڑھے ہوئے۔ مکھ پیلا، جیسے کوئی قیدی جیل سے نکل کر آیا ہو۔ دیپک کا پرکاش دیکھ کر وہ شیتلا کے کمرے کی طرف چلے۔ مینا پنجرے میں پھڑپھڑانے لگی۔ شیتلا نے چونک کر سر اُٹھایا۔ گھبرا کر بولی "کون"؟ پھر پہچان گئی تُرنت پھولوں کو ایک کپڑے سے چھپا دیا۔ اٹھ کھڑی ہوئی اور سر جھکا کر پوچھا۔ اتنی جلدی سدھ لی؟

وِمل نے کچھ جواب نہ دیا۔ وِسمِت (حیرت زدہ) ہو ہوکر کبھی شیتلا کو دیکھتا اور کبھی گھر کو، مانو کسی نئے سنسار میں پہنچ گیا ہے۔ یہ وہ ادھ کھلا پھول نہ تھا، جس کی پنکھڑیاں انوکول جلوایو نہ پاکر سمٹ گئی تھیں۔ یہ پورن وِکست کُسُم تھا۔ اُوس کے جل کنوں سے جگمگاتا اور وایو کے جھونکوں سے لہراتا ہوا وِمل اس کی سندرتا پر پہلے بھی مگدھ (فدا) تھا۔ پر یہ جیوتی وہ اگنی جوالہ تھی، جس سے ہردے میں تاپ اور آنکھوں میں جلن ہوتی تھی۔ یہ آبھوشن، یہ وستر، یہ سجاوٹ! اس کے سر میں ایک چکر سا آگیا۔ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس سوریہ مکھی کے سامنے بیٹھتے ہوئے اسے لجا آتی تھی۔ شیتلا ابھی تک استمبھت کھڑی تھی۔ وہ پانی لانے نہیں دوڑی، اس نے پتی کے چرن نہیں دھوئے، اس کو پنکھا تک نہیں جھلا۔ ہت بُدّھی سی ہوگئی تھی۔ اس نے کلپناؤں کی کیسی سُرمیہ واٹکا لگائی تھی۔ اس پر نشار پڑ گیا۔ واستو میں اس مِلن بدن، اردھ نگن پُرش سے اسے گھرنا ہو رہی تھی۔ یہ گھر کا زمین دار وِمل نہ تھا۔ وہ مزدور ہوگیا تھا۔ موٹا کام مکھا کرِتی پر اثر ڈالے بنا نہیں رہتا۔ مزدور سندر وستروں میں بھی مزدور ہی رہتا ہے۔

سہسا وِمل کی ماں چونکی۔ شیتلا کے کمرے میں آئی۔ تو وِمل کو دیکھتے ہی۔ ماتری سنیہہ سے وِہّل ہوکر اُسے چھاتی سے لگا لیا۔ وِمل نے اس کے چرنوں پر سر رکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گرم گرم بوندیں نکل رہی تھی۔ ماں پُلکِت (مسرور) ہو رہی تھی۔ مکھ سے بات نہ نکلتی تھی۔

ایک چھن میں وِمل نے کہا۔ اماں

کنٹھ دھوَنی (روندھی آواز) نے اس کا آشئے پرکٹ کردیا۔

ماں نے پرشن سمجھ کر کہا۔ نہیں بیٹا۔ یہ بات نہیں ہے۔

وِمل۔ یہ دیکھتا کیا ہوں؟

ماں۔ سُوبھاؤ ہی ایسا ہے تو کوئی کیا کرے؟

وِمل۔ سریش نے میرا ہُلیا کیوں لکھایا تھا؟

ماں۔ تمھاری کھوج لینے کے لیے۔ انھوں نے دَیا نہ کی ہوتی تو آج گھر میں کسی کو جیتا نہ پاتے۔

وِمل۔ بہت اچھا ہوتا۔

شیتلا نے طعنے سے کہا۔ اپنی اُور سے تم نے سب کو مار ہی ڈالا تھا۔ پھولوں کی سیج نہیں بچھا گئے تھے۔

وِمل۔ اب تو پھولوں کی سیج ہی بچھی دیکھتا ہوں۔

شیتلا۔ تم کسی کے بھاگیہ کے ودھاتا ہو؟

وِمل سنگھ اُٹھ کر کرودھ سے کانپتا ہوا بولا۔ اماں، مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں اس پشاچنی کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ میری آنکھوں میں خون اُترتا چلا آتا ہے۔ میں نے اس کل کِلنکنی کے لیے تین سال تک جو کٹھن تپسیہ کی ہے۔ اس سے ایشور مل جاتا، پر اسے نہ پاسکا۔

یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل آیا اور ماں کے کمرے میں لیٹ رہا۔ ماں نے ترنت اس کا منہ اور ہاتھ پیر دُھلائے۔ وہ چولہا جلا کر پوریاں پکانے لگی۔ ساتھ ساتھ گھر کی وپتی کتھا بھی کہتی جاتی تھی۔ وِمل کے ہردے میں سریش کے پرتی جو وِرُودھ اگنی پرجولت ہو رہی تھی وہ شانت ہوگئی۔ لیکن ہردے داہ نے رکت داہ کا روپ دھارن کیا زور کا بخار چڑھ آیا۔ لمبی یاترا کی تکان اور کشٹ تو تھا ہی برسوں کے کٹھن شرم اور تپ کے بعد یہ مانسک سنتاپ اور بھی دُسہہ ہوگیا۔

ساری رات وہ اچیت پڑا رہا۔ ماں بیٹھی پنکھا جھلتی اور روتی تھی، دوسرے دن بھی وہ بے ہوش پڑا رہا۔ شیتلا اس کے پاس ایک چھن کے لیے بھی نہ آئی۔ انھوں نے مجھے کون سے سونے کے کور کھلا دیے ہیں۔ جو ان کی دھونس سہوں؟ یہاں تو، 'جسے کنتا گھر رہے' ویسے رہے وِدیش' کسی کی پھوٹی کوڑی بھی نہیں جانتی۔ بہت تاؤ دکھا کر تو گئے تھے؟ کیا لاد

لائے!

سندھیا کے سمئے سریش کو خبر ملی۔ تُرنت دوڑے ہوئے آئے۔ آج دو مہینے کے بعد انھوں نے اس گھر میں قدم رکھا۔ وِمل نے آنکھیں کھولیں پہچان گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سریش کے مُکھارونِد پر دَیا کی جیوتی چھلک رہی تھی۔ وِمل نے اس کے بارے میں جو کچھ انُچت سندیہہ کیا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنے کو دھکار رہا تھا۔

شیتلا نے جیوں ہی سنا کہ سریش سنگھ آئے ہیں۔ ترنت شیشے کے سامنے گئی۔ کیش چھٹکا لیے اور وِیِد کی مورتی بنی ہوئی وِمل کے کمرے میں آئی۔ کہاں تو وِمل کی آنکھیں بند تھیں۔ مورچھِت سا پڑا تھا۔ کہاں شیتلا کے آتے ہی آنکھیں کھل گئیں۔ اگنی مے نیتروں سے اس کی اُور دیکھ کر بولا۔ ابھی آئی ہے؟ آج کے تیسرے دن آنا کنور صاحب سے اُس دن پھر بھینٹ ہوجائے گی۔

شیتلا اُلٹے پاؤں چلی گئی۔ سریش پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ من میں سوچا کتنا روپ، لاونیہ ہے۔ پر کتنا وشکت (زہریلا) ہردئے کی جگہ کیول شرنگار لالسا!

آتنک بڑھتا گیا۔ سریش نے ڈاکٹر بلوائے، پر مرتیو دیو نے کسی کی نہ مانی۔ ان کا ہردے پاشان ہے۔ کسی بھانتی نہیں پسیجتا۔ کوئی اپنا ہردئے نکال کر رکھ دے، آنسوؤں کی ندی بہا دے پر انھیں دَیا نہیں آتی۔ بسے ہوئے گھر کو اُجاڑنا، لہراتی ہوئی کھیتی کو سکھانا ان کا کام ہے۔ اور ان کی نردیتا کتنی ونودمئے ہے! یہ نتیہ نئے روپ بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی دامنی (بجلی) بن جاتے ہیں۔ تو کبھی پُشپ، مالا۔ کبھی سِنہہ بن جاتے ہیں تو کبھی سیار۔ کبھی اگنی کے روپ میں دکھائی دیتے ہیں تو کبھی جل کے روپ میں۔

تیسرے دن، پچھلی رات کو، وِمل کی مانسک پیڑا اور ہردے تاپ کا انت ہوگیا۔ چور دن کو کبھی چوری نہیں کرتا۔ یم کے دوت پرایہ رات ہی کو سب کی نظر بچا کر آتے ہیں۔ اور پران رتن کو چُرا لیے جاتے ہیں۔ آکاش کے پھول مرجھائے ہوئے تھے۔ وِرکش سمُوہ استھر تھے۔ پر شُوک میں مگن سر جھکائے ہوئے۔ رات شوک کا باہ روپ ہے۔ رات مِرتیو کا کریڑا چھیتر ہے۔ اسی سمئے وِمل کے گھر سے آرتناد سنائی دیا۔ وہ ناد جسے سننے کے لیے مِرتیو دیو وکل رہتے ہیں۔

شیتلا چونک پڑی اور گھبرائی ہوئی مرن شیّہ کی اُور چلی اس نے مِرت دیہہ پر نگاہ ڈالی

اور بھیبھیت ہوکر ایک پگ پیچھے ہٹ گئی۔ اسے جان پڑا، وِمل سنگھ اس کی اُور اتینت تیور درشٹی سے دیکھ رہے ہیں۔ بجھے ہوئے دیپک میں اسے بھینکر جیوتی دکھائی پڑی۔ وہ مارے بھئے کے وہاں ٹھہر نہ سکی۔ دوار سے نکل ہی رہی تھی کہ سریش سنگھ سے بھینٹ ہوگئی۔ کاترسُور میں بولی۔ مجھے یہاں ڈر لگتا ہے۔ اس نے چاہا کہ روتی ہوئی ان کے پیروں پر گر پڑوں پر وہ الگ ہٹ گئے۔

(۷)

جب کسی پتھک (راہ گیر) کو چلتے چلتے گیات ہوتا ہے کہ میں راستہ بھول گیا ہوں۔ تو وہ سیدھے راستے پر آنے کے لیے بڑے ویگ سے چلتا ہے۔ جھنجھلاتا ہے کہ میں اتنا اساوُدھان کیوں ہوگیا؟ سریش بھی اس شانتی مارگ پر آنے کے لیے وِکل ہوگئے۔ منگلا کی سنیہہ مئے سیوائیں یاد آنے لگی۔ ہردئے میں واستوِک سوندریہ اپاسنا کا بھاؤ اُدئے ہوا۔ اس میں کتنا پریم، کتنا تیاگ کتنی چھما تھی۔ اس کی اٹل پتی بھکتی کو یاد کرکے کبھی کبھی وہ تڑپ جاتے۔ آہ! میں نے گھور اتیاچار کیا۔ ایسے اُجول رتن کا آدر نہ کیا۔ میں یوں ہی جڑوت پڑا رہا اور میرے سامنے ہی لکشمی گھر سے نکل گئی! منگلا نے چلتے چلتے شیتلا سے جو باتیں کہیں۔ وے انھیں معلوم تھیں پر ان باتوں پر وشواس نہ ہوتا تھا۔ منگلا شانت پراکرتی کی تھی۔ وہ اتنی اڈنڈتا نہیں کرسکتی۔ اس میں چھما تھی۔ وہ اتنا وِدّویش نہیں کرسکتی۔ ان کا من کہتا تھا کہ وہ جیتی ہے اور کشل سے ہے۔ اس کے میکے والوں کو کئی پتر لکھے پر وہاں وینگ اور کٹو واکیوں کے سوا اور کیا رکھا تھا؟ انت کو انھوں نے لکھا۔ اب اس رتن کی کھوج میں سویم جاتا ہوں۔ یا تو لے کر ہی آؤں گا۔ یا کہیں منہ میں کالکھ لگا کر ڈوب مروں گا۔

اس پتر کا اُتّر آیا۔ اچھی بات ہے پر یہاں سے ہوتے ہوئے جائیے گا۔ یہاں سے بھی کوئی آپ کے ساتھ چلا جائے گا۔

سریش سنگھ کو ان شبدوں میں آشا کی جھلک دکھائی دی۔ اسی دن پرستھان کردیا۔ کسی کو ساتھ نہیں لیا۔

سسرال میں کسی نے ان کا پریم مئے سواگت نہیں کیا۔ سبھی کے منہ پھولے ہوئے تھے۔ سسر جی نے تو انھیں پتی۔ دھرم پر ایک لمبا اپدیش دیا۔

رات کو جب وہ بھوجن کرکے لیٹے تو چھوٹی سالی آکر بیٹھ گئی اور مسکراکر بولی۔

جیجا جی، کوئی سندری اپنے روپ ہین پُروش کو چھوڑ دے، اس کا اپمان کرے، تو آپ اسے کیا کہیں گے؟

سریش۔ (گمبھیر سور میں) کُلٹا!

سالی۔ اور ایسے پُروش کو، جو اپنی روپ ہین استری کو تیاگ دے؟

سریش۔ پشو!

سالی۔ اور جو پُروش ودوان ہو؟

سریش۔ پشاچ۔

سالی۔ (ہنس کر) تو میں بھاگتی ہوں۔ مجھے آپ سے ڈر لگتا ہے۔

سریش۔ پشاچوں کا پرائشچت بھی تو سویکار ہو جاتا ہے۔

سالی۔ شرط یہ ہے کہ پرائشچت سچا ہو۔

سریش۔ یہ تو وہ انتریامی ہی جان سکتے ہیں۔

سالی۔ سچا ہوگا۔ تو اس کا پھل بھی اوشیہ ملے گا۔ مگر دیدی کو لے کر ادھر ہی سے لوٹیے گا۔

سریش کی آشا۔ نوکا پھر ڈگمگائی۔ گڑگڑا کر بولے۔ پربھا ایشور کے لیے مجھ پر دَیا کرو۔ میں بہت دُکھی ہوں۔ سال بھر سے ایسا کوئی دن نہیں گیا کہ میں رو کر نہ سویا ہوں۔

پربھا نے اُٹھ کر کہا۔ اپنے کیے کا کیا علاج؟ جاتی ہوں آرام کیجیے۔

ایک چھن میں منگلا کی ماتا آکر بیٹھ گئی اور بولی۔ بیٹا، تم نے تو بہت پڑھا لکھا ہے۔ دیش ودیش گھوم آئے ہو، سندر بننے کی کوئی دوا کہیں نہیں دیکھی؟

سریش نے ونئے پورؔوک کہا۔ ماتا جی، آپ ایشور کے لیے اور لِجّت نہ کیجیے۔

ماتا۔ تم نے تو میری پیاری بیٹی کے پران لے لیے۔ میں کیا تمھیں لجّت کرنے سے بھی گئی؟ جی میں تو تھا کہ ایسی ایسی سناؤں گی کہ تم بھی یاد کروگے۔ پر مہمان ہو، کیا جلاؤں؟ آرام کرو!

سریش آشا اور بھئے کی دشا میں پڑے کروٹیں بدل رہے تھے کہ یکایک دوار پر کسی نے دھیرے سے کہا۔ جاتی کیوں نہیں، جاگتے تو ہیں؟ کسی نے جواب دیا۔ لاج آتی ہے۔

سریش نے آواز پہچانی۔ پیاسے کو پانی مل گیا۔ ایک چھن میں منگلا ان کے سمّکھ آئی

اور سر جھکا کر کھڑی ہوگئی۔ سُریش کو اس کے مکھ پر ایک انوٹھی چھوی دکھائی دی۔ جیسے کوئی روگی سُواتھہ لابھ کرچکا ہو۔

روپ وہی تھا، پر آنکھیں اور تھیں۔

یہ افسانہ ماہنامہ مادھوری کے اگست 1923 کے شمارے میں شائع ہوا مان سروور 6میں شامل ہے۔

رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

انتقام

مایا اپنے سہ منزلے مکان کی چھت پر کھڑی سڑک کی طرف مضطرب اور شاق نظروں سے تاک رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی۔ وہ اب تک آئے کیوں نہیں؟ کہاں دیر لگائی؟ اسی گاڑی سے آنے کو لکھا تھا۔ گاڑی تو آگئی ہوگی۔ اسٹیشن سے مسافر چلے آرہے ہیں۔ اس وقت تو کوئی دوسری گاڑی نہیں آتی۔ شاید اسباب وغیرہ رکھنے میں دیر ہوئی۔ یار دوست اسٹیشن ہی پر مبارک باد دینے کے لیے پہنچ گئے ہوں۔ ان سے فرصت ملے گی۔ تب گھر کی سدھ آئے گی۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو سیدھے گھر آتی۔ دوستوں سے کہہ دیتی جناب اس وقت مجھے معاف رکھیے۔ گھر پر ملیئے گا۔ مگر دوستوں میں تو ان کی جان بستی ہے۔

مسٹر ویاس لکھنؤ کے جوان مگر نہایت ممتاز بیرسٹروں میں ہیں۔ تین مہینے سے وہ ایک سیاسی مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے سرکار کی جانب سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے مایا کو لکھا تھا۔ فتح ہوگئی۔ یکم تاریخ کو میں شام کے میل سے ضرور بالضرور پہنچوں گا۔ آج وہی شام ہے۔ مایا نے آج سارا دن تیاریوں میں صرف کیا۔ سارا مکان دھلوایا۔ کمروں کے آرائشی سامان صاف کرائے۔ موٹر دھلوائی۔ یہ تین مہینے اس نے تپسیا کرکے کاٹے تھے۔ مگر اب تک مسٹر ویاس نہیں آئے۔

اس کی چھوٹی بچّی تلوتما آکر اس کے پیروں سے چمٹ گئی اور بولی۔ اماں بابو جی کب آئیں گے؟ مایا نے اُسے گود میں اُٹھا لیا اور بوسہ لے کر بولی۔ آتے ہی ہوں گے بیٹی۔ گاڑی تو کب کی آگئی۔

تلوتما۔ میرے لیے اچھی گڑیاں لاتے ہوں گے۔ مایا نے کچھ جواب نہ دیا۔ انتظار اب غصہ کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ جس طرح مجھے حضرت دق کر رہے ہیں اسی طرح میں بھی دق کروں گی۔ گھنٹہ بھر تک بولوں گی ہی نہیں۔ آکے اسٹیشن پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جلانے میں انھیں مزہ آتا ہے۔ یہ اُن کی پُرانی

عادت ہے۔ دل کو کیا کروں۔ نہیں جی تو یہی چاہتا ہے۔ کہ جیسے وہ مجھ سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی ان کی بات نہ پوچھوں۔

یکایک ایک خدمت گار نے اوپر آکر کہا۔ بہو جی! لاہور سے یہ تار آیا ہے۔

مایا اندر ہی اندر جل اُٹھی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا شدّت کی حرارت ہوگئی ہو۔ معاً خیال آیا سوائے اس کے اور کیا لکھا ہوگا کہ اس گاڑی سے نہ آسکوں گا۔ تار دے دینا کون مشکل ہے۔ میں بھی کیوں نہ تار دے دوں کہ میں ایک مہینہ کے لیے میکے جا رہی ہوں۔ خدمت گار سے کہا۔ تار لے جاکر کمرے میں میز پر رکھ دو۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے لفافہ لے لیا اور کھولا ہی تھا کہ کاغذ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ لکھا تھا ''مسٹر ویاس کو آج دس بجے رات کو کسی بدمعاش نے قتل کردیا۔''

(۲)

کئی مہینے گزر گئے مگر قاتل کا اب تک پتہ نہیں چلا۔ خفیہ پولیس کے آزمودہ کار آدمی اس کا سُراغ لگانے کی فکر میں پریشان ہیں۔ قاتل کو گرفتار کرا دینے والے کو بیس ہزار روپے انعام دیے جانے کا اعلان کردیا گیا ہے۔ مگر لاحاصل، جس ہوٹل میں مسٹر ویاس مقیم تھے۔ اسی میں ایک مہینہ سے مایا ٹھہری ہوئی ہے۔ اس کمرہ سے اُسے عشق سا ہوگیا ہے۔ اس کی صورت اتنی مسخ ہوگئی ہے۔ کہ اب اُسے پہچاننا مشکل ہے۔ مگر اس کے چہرہ پر بیکسی یا درد کی زردی نہیں۔ وحشت کی حرارت نمایاں ہے۔ اس کی مخمور آنکھوں میں اب خون کی پیاس ہے اور انتقام کا شعلہ۔ اس کے جسم کا ایک ایک ذرہ انتقام کی آگ سے جلا رہا ہے۔ اب یہی اس کی زندگی کا ماحصل، یہی اس کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ اس کی محبت کی ساری کائنات، اب یہی انتقام کا جوش ہے۔ جس سیہ کار نے اس کی زندگی غارت کردی۔ اسے اپنے سامنے تڑپتے دیکھ کر ہی اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ خفیہ پولیس تخویف اور ترغیب۔ تحقیق اور تفتیش سے کام لے رہی ہے۔ مگر مایا نے منزل مقصود کے لیے ایک دوسرا ہی راستہ اختیار کیا ہے۔ مسٹر ویاس کو علم الارواح کا شوق تھا۔ ان کی صحبت میں مایا نے بھی کچھ ابتدائی مشق بہم پہنچائی تھی۔ اس وقت اس کے لیے یہ مشغلہ تفریح تھا مگر اب یہی اس کا مدارِ حیات تھا۔ وہ اس دن کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وہ اپنے شوہر کی روح کو حاضر کرکے اس سے قاتل کا سُراغ لگاسکے گی۔ وہ بڑے انہاک سے مرکزی توجہ

کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ رات کے دس بج گئے تھے۔ مایا نے کمرہ کو اندھیرا کردیا تھا۔ اور تلوتما پر عمل کر رہی تھی۔ یکایک اُسے ایسا معلوم ہوا کہ کمرہ میں کسی نوارانی وجود کا ظہور ہوا۔ بجھتی ہوئی شمع کی آخری جھلک کی طرح ایک روشنی نظر آئی۔

مایا نے پوچھا۔ ”آپ کون ہیں؟“

تلوتما نے ہنس کر کہا۔ ”تم مجھے نہیں پہچانتیں؟ میں ہی تو تمھارا من موہن ہوں۔ جو زمانہ میں مسٹر ویاس مشہور تھا۔“

”آپ خوب آئے۔ میں آپ سے قاتل کا نام پوچھنا چاہتی ہوں۔“

”اس کا نام ہے۔ ایشور داس۔“

”کہاں رہتا ہے۔“

”شاہجہاں پور۔“

مایا نے محلّہ کا نام، مکان کا نمبر، شکل و شباہت سب کچھ خوب تفصیل کے ساتھ پوچھا۔ اور ایک کاغذ پر نوٹ کرلیا۔ تلوتما ذرا دیر میں اُٹھ بیٹھی۔ جب کمرہ میں پھر روشنی ہوئی تو مایا کا زرد چہرہ فاتحانہ مسرت سے روشن ہوگیا تھا۔ اس کے جسم میں ایک تازہ جوش موجزن تھا۔ گویا پیاس سے جاں بہ لب مسافر کو پانی مل گیا ہو۔

اِسی رات کو مایا نے لاہور سے شاہجہاں پور کا عزمِ سفر کیا۔

(۳)

رات کا وقت، پنجاب میل بڑی تیزی سے فضائے تاریک کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ مایا ایک سیکنڈ کلاس کے کمرہ میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ شاہجہاں پور میں وہ کہاں مقیم ہوگی۔ کیسے ایشور داس کا مکان تلاش کرے گی؟ اور کیسے اس سے خون کا انتقام لے گی۔ اس کی بغل میں تلوتما بے خبر سو رہی تھی۔ سامنے اوپر کے برتھ پر ایک آدمی نیند میں غافل پڑا ہوا تھا۔

یکایک گاڑی کا کمرہ کھلا اور دو آدمی کوٹ پتلون پہنے کمرہ میں داخل ہوئے دونوں انگریز تھے۔ ایک مایا کی طرف بیٹھا اور دوسرا دوسری طرف۔ مایا سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ان آدمیوں کا یوں بیٹھنا اُسے بہت بُرا معلوم ہوا۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔ آپ لوگ دوسری طرف بیٹھیں مگر وہ عورت جو خون کا انتقام لینے جارہی تھی۔ سامنے یہ خطرہ دیکھ کر سہم اُٹھی۔ وہ

دونوں شیطان اسے سمٹتے دیکھ کر اور بھی قریب آگئے۔ مایا اب وہاں نہ بیٹھی رہ سکی۔ وہ اُٹھ کر دوسرے برتھ پر جانا چاہتی تھی کہ ان میں سے ایک نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مایا نے زور سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر کے کہا۔ تمھاری شامتیں تو نہیں آئی ہے۔ چھوڑ دو میرا ہاتھ۔ سؤر۔

اِس پر دوسرے آدمی نے اُٹھ کر مایا کو سینے سے لپٹا لیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ ویل ہم تم کو بہت سا روپیہ دے گا۔ مایا نے اسے ساری طاقت سے ڈھکیلنے کی کوشش کر کے کہا۔ ہٹ جا حرام زادے۔ ورنہ ابھی تیرا سر توڑ دوں گی۔

دوسرا آدمی بھی اُٹھ کھڑا ہوا اور دونوں مل کر مایا کو برتھ پر لٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ دفعتاً یہ کھٹ پٹ سُن کر اوپر کے برتھ پر سویا ہوا آدمی چونکا۔ اور ان حرام کاروں کی حرکت دیکھ کر اوپر سے کود پڑا۔ دونوں گورے اُسے دیکھ کر مایا کو چھوڑ کر اس کی طرف جھپٹے اور اُسے گھونسے مارنے لگے۔ دونوں اس پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ اور وہ ہاتھوں سے اپنے کو بچا رہا تھا۔ اُسے وار کرنے کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ دفعتاً اس نے اچک کر اپنے بستروں میں سے ایک چُھرا نکال لیا۔ اور آستینیں سمیٹ کر بولا۔ تم دونوں اگر ابھی باہر نہ چلے گئے تو ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑوں گا۔

دونوں گورے چُھرا دیکھ کر ذرا ڈرے۔ مگر وہ بھی نہتے نہ تھے۔ ایک نے جیب سے ریوالور نکال لیا۔ اور اس کی نلی اس آدمی کی طرف کر کے بولا۔ نکل جا۔ ریسکل۔

مایا تھر تھر کانپ رہی تھی کہ نہ جانے کیا آفت آنے والی ہے۔ مگر خطرہ ہماری چھپی ہوئی ہمتوں کی کنجی ہے۔ خطرہ میں پڑکر ہم بشریت کے حدود سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ کچھ کر گزرتے ہیں جس پر ہمیں خود حیرت ہوتی ہے۔ وہی مایا جو اب تک تھر تھر کانپ رہی تھی، بلّی کی طرح جست کر کے اس گورے کی طرف لپکی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر گاڑی کے نیچے پھینک دیا۔ گورے نے کھسیا کر مایا کو دانت کاٹنا چاہا۔ مگر مایا نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور خطرہ کی زنجیر کے پاس جاکر اسے زور سے کھینچا۔ دوسرا گورا اب تک کنارے کھڑا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اس لیے وہ چھری کے سامنے نہ آنا چاہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ مایا زنجیر کھینچ لی۔ تو بھیتر کا دروازہ کھول کر بھاگا۔ اس کا رفیق بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ چلتے چلتے چھری والے آدمی نے اسے اتنی زور سے دھکا

دیا کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔ پھر تو اس نے اتنی ٹھوکریں، اتنی لاتیں اور اتنے گھونسے جمائے کہ اس کے منہ سے خون نکل پڑا۔ اتنے میں گاڑی رُک گئی اور گارڈ لالٹین لیے آتا دِکھائی دیا۔

(۴)

مگر وہ دونوں شیطان گاڑی کو رُکتے دیکھ کر بے تحاشا نیچے کود پڑے اور اس تاریکی میں نہ جانے کہاں غائب ہوگئے۔ گارڈ نے بھی زیادہ جستجو نہ کی۔ اور کرتا بھی تو اس اندھیرے میں پتہ لگنا مشکل تھا۔ دونوں طرف نشیب تھا۔ شاید گاڑی کسی ندی کے قریب تھی۔ وہاں دو کیا دو سو آدمی اس وقت بڑی آسانی سے چھپ سکتے تھے۔ دس منٹ تک گاڑی کھڑی رہی۔ پھر چل پڑی۔

مایا نے فراغت کی سانس لے کر کہا۔ آپ آج نہ ہوتے تو ایشور ہی جانے میرا کیا حال ہوتا۔ آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟

اس آدمی نے چھرے کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ بالکل نہیں، میں ایسا غافل سویا ہوا تھا کہ ان بدمعاشوں کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ ورنہ میں انھیں اندر قدم ہی نہ رکھنے دیا ہوتا۔ اگلے اسٹیشن پر رپورٹ کروں گا۔

مایا۔ جی نہیں۔ خواہ مخواہ کی بدنامی اور پریشانی ہوگی۔ رپورٹ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایشور نے آج میری آبرو رکھ لی۔ میرا کلیجہ ابھی تک دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔ آپ کہاں تک چلیں گے؟

"مجھے شاہجہاں پور جانا ہے۔"

"وہیں تک تو مجھے بھی جانا ہے۔ شبھ نام کیا ہے۔ کم از کم اپنے محسن کے نام سے تو بے خبر نہ رہوں۔"

"مجھے تو ایشور داس کہتے ہیں۔"

مایا کا کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ ضرور یہ وہی قاتل ہے۔ اس کی شکل و شباہت وہی تھی جو اُسے بتلائی گئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ آپ کا مکان کس محلّہ میں ہے؟

"...................... میں رہتا ہوں۔"

مایا کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر ایک لمبی سانس لی۔ ہائے!

قاتل ملا بھی تو ایسی حالت میں جب وہ اس کے بارِ احسان سے دبی ہوئی ہے۔ کیا اس آدمی کو وہ خنجر کا نشانہ بنا سکتی ہے۔ جس نے بغیر کسی شناسائی کے محض ہمدردانہ جوش سے ایسے گاڑھے وقت میں اس کی مدد کی۔ جان پر کھیل گیا وہ ایک عجیب مخمصے میں پڑگئی۔ اس نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ شرافت جھلک رہی تھی۔ ایسا آدمی قتل کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ اس میں اسے شبہ تھا۔

ایشور داس نے پوچھا۔ آپ لاہور سے آرہی ہیں نہ؟ شاہجہاں پور میں کہاں جایئے گا؟

"ابھی تو کہیں دھرم شالہ میں ٹھہروں گی۔ مکان کا انتظام کرنا ہے۔"

ایشور داس نے تعجب سے پوچھا۔ تو وہاں آپ کسی عزیز یا رشتہ دار کے گھر نہیں جا رہی ہیں؟

"کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔"

"یوں آپ کا اصلی مکان کہاں ہے؟"

"اصلی مکان پہلے لکھنؤ تھا۔ اب کہیں نہیں ہے۔ میں بیوہ ہوں۔"

(۵)

ایشور داس نے شاہجہاں پور میں مایا کے لیے ایک اچھا مکان طے کردیا۔ ایک نوکر بھی رکھ دیا۔ دن میں کئی بار استفسارِ حال کے لیے آتا۔ مایا ہرچند چاہتی تھی کہ اس کے احسانات نہ لے۔ اس سے بے تکلفی نہ پیدا کرے مگر وہ اتنا خلیق، اتنا با مروت اور اتنا کسرنفس تھا کہ مایا مجبور ہوجاتی۔

ایک دن وہ کئی گملے اور فرنیچر لے کر آیا۔ کئی خوبصورت تصویریں بھی تھیں۔ مایا نے چیں بہ جبیں ہوکر کہا۔ مجھے ساز و سامان کی بالکل ضرورت نہیں آپ ناحق تکلف کرتے ہیں۔

ایشور داس نے خطاوارانہ ندامت سے کہا۔ میرے گھر میں یہ چیزیں بیکار پڑی تھیں۔ لاکر رکھ دیں۔

"میں ان تکلفات کا غلام نہیں بننا چاہتی۔"

ایشور داس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ اگر آپ کو ناگوار ہو تو اُٹھوا لے جاؤں؟

مایا نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں ہیں۔ مجبور ہو کر بولی۔ اب آپ لے آئے ہیں۔ تو رہنے دیجیے۔ مگر آئندہ سے کوئی ایسی چیز نہ لائیے گا۔

ایک دن مایا کا نوکر نہ آیا۔ مایا نے آٹھ نو بجے تک اس کا انتظار کیا۔ جب اب بھی وہ نہ آیا تو اس نے جھوٹے برتن مانجھنے شروع کیے۔ اُسے کبھی اپنے ہاتھ سے چوکا برتن کرنے کا اتفاق نہ پڑا تھا۔ بار بار اپنی حالت پر رونا آتا تھا۔ ایک دن وہ تھا کہ اس کے گھر میں نوکروں کی ایک پلٹن تھی۔ آج اُسے اپنے ہاتھوں برتن مانجھنے پڑ رہے ہیں۔ تلوتما دوڑ دوڑ کر بڑے جوش سے کام کر رہی تھی۔ اُسے کوئی فکر نہ تھی۔ اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کا۔ اپنے کو مفید ثابت کرنے کا ایسا اچھا موقعہ پاکر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اتنے میں ایشور داس آکر کھڑا ہو گیا۔ اور مایا کو برتن مانجھتے دیکھ کر بولا۔ یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ رہنے دیجیے میں ابھی ایک آدمی کو بلائے لاتا ہوں۔ آپ نے مجھے کیوں نہ خبر دی۔ رام رام۔ اُٹھ آیئے وہاں سے۔

مایا نے لاپرواہی سے کہا۔ کوئی ضرورت نہیں۔ آپ تکلیف نہ کیجیے۔ میں ابھی مانجھے لیتی ہوں۔

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔"

"نہیں، آپ کسی کو نہ لائیے میں اتنے برتن بڑی آسانی سے دھولوں گی۔"

"یہ کہہ کر اس نے ڈول اٹھا لیا۔ اور باہر سے پانی لینے دوڑا۔ پانی لاکر اس نے منجھے ہوئے برتنوں کو دھونا شروع کیا۔"

مایا نے اس کے ہاتھ سے برتن چھیننے کی کوشش کرکے کہا۔ "آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں رہنے دیجیے۔ میں ابھی صاف کیے ڈالتی ہوں۔"

آپ مجھے شرمندہ کرتی ہیں۔ یا میں آپ کو شرمندہ کر رہا ہوں۔ آپ یہاں مسافر ہیں۔ میں یہاں کا رہنے والا ہوں۔ میرا فرض ہے کہ آپ کی خدمت کروں۔ آپ نے ایک زیادتی تو یہ کی کہ مجھے مطلق خبر نہ دی۔ اب دوسری زیادتی یہ کر رہی ہیں۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا۔ ایشور داس نے ایک لمحہ میں سارے برتن صاف کرکے رکھ دیے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسے کاموں کا عادی ہے۔ برتن دھوکر اس نے سارے برتن پانی سے بھر دیئے۔ اور تب پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا بولا۔ بازار سے کوئی چیز لانی ہو تو بتلا

دیجیے۔ ابھی لا دوں۔

مایا۔ جی نہیں معاف کیجیے۔ آپ اپنے گھر کا راستہ لیجیے۔

ایشور داس۔ تلوتما۔ آؤ آج تمھیں سیر کرا لاؤں۔

مایا۔ جی نہیں رہنے دیجیے وہ اس وقت سیر کرنے نہیں جاتی۔

مایا نے یہ الفاظ اتنی رُکھائی، اتنی بے رُخی سے کہے کہ ایشور داس کا گہنہ گر گیا۔ اس نے دوبارہ کچھ نہ کہا۔ چپکے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مایا نے سوچا میں نے اس کے ساتھ کتنی بے مروتی کی۔ ریل گاڑی کے اس افسوس ناک واقعہ کے بعد سے اس کے دل میں متواتر انتقام اور انسانیت میں جنگ و جدل ہوتی رہتی تھی۔ اگر ایشور داس اس موقعہ پر فرشتہ غیب کی طرح نہ آجاتا۔ تو آج اس کی کیا حالت ہوتی۔ یہ خیال کرکے اس کے روئیں کھڑے ہوجاتے۔ اور ایشور داس کے لیے اس کے تہہ دل سے کلماتِ خیر نکل جاتے۔ کیا ایسے محسن کے خون سے وہ اپنے ہاتھ رنگے گی؟ لیکن اسی کے ہاتھوں اسے یہ روزِ سیاہ بھی تو دیکھنا پڑا۔ اسی کے کارن تو اس نے ریل کا وہ سفر کیا تھا۔ ورنہ وہ تنہا بے یار و مددگار سفر ہی کیوں کرتی؟ اسی کے کارن تو آج وہ بیوگی کی مصیبتیں جھیل رہی ہے۔ اور ساری عمر جھیلے گی۔ ان باتوں کا خیال کرکے اس کی آنکھیں سُرخ ہوجاتیں۔ منہ سے ایک آہِ شرر بار نکل جاتی اور جی چاہتا۔ اسی وقت خنجر لے کر چل اور اس کا کام تمام کردے۔

(۲)

آج مایا نے آخری فیصلہ کرلیا۔ اس نے ایشور داس کی دعوت کی تھی، یہی اس کی آخری دعوت ہوگی۔ ایشور داس نے اس پر احسان ضرور کیے ہیں۔ لیکن دنیا میں کوئی احسان، کوئی نیکی، اس صدمہ جانکاہ کے داغ کو مٹاسکتی ہے؟ رات کے نو بجے ایشور داس آیا تو مایا نے ایک محبت آمیز گرم جوشی سے کہا۔ بیٹھیے آپ کے لیے گرم گرم پوریاں نکالوں؟

ایشور داس۔ کیا ابھی تک آپ میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہیں، ناحق گرمی میں پریشان ہوئیں۔

مایا نے تھالی پروس کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ میں کھانا پکانا نہیں جانتی۔ اگر کوئی چیز اچھی نہ لگے تو معاف کیجیے گا۔ ایشور داس نے خوب تعریف کرکے ایک ایک چیز

کھائی۔ ایسی لذیذ چیز اس نے اپنی عمر میں کبھی نہیں کھائی تھیں۔

"آپ تو کہتی تھیں میں کھانا پکانا نہیں جانتی۔"

"تو کیا میں غلط کہتی تھی۔"

بالکل غلط، آپ نے خود اپنی غلطی ثابت کردی۔ ایسے خستے میں نے زندگی میں کبھی نہ کھائے تھے۔

آپ مجھے بناتے ہیں۔ اچھا صاحب بنا لیجیے۔

نہیں میں بناتا نہیں، بالکل سچ کہتا ہوں۔ کس کس چیز کی تعریف کروں۔ چاہتا ہوں کہ کوئی عیب نکالوں۔ لیکن سوجھتا ہی نہیں۔ اب کے میں اپنے دوستوں کی دعوت کروں گا تو آپ کو ایک دن تکلیف دوں گا۔

ہاں شوق سے کیجیے، میں حاضر ہوں۔

کھاتے کھاتے دس بج گئے۔ تلوتما سو گئی۔ گلی میں بھی سناٹا ہو گیا۔ ایشور داس چلنے کو تیار ہوا تو مایا بولی۔ کیا آپ چلے جائیں گے۔ کیوں نہ آج یہیں سو رہیئے۔ مجھے کچھ ڈر لگ رہا ہے۔ آپ باہر کے کمرے میں سو رہیئے گا۔ میں اندر آنگن میں سو رہوں گی۔ ایشور داس نے ایک لمحہ تک سوچ کر کہا۔ اچھی بات ہے۔ آپ نے پہلے کبھی نہ کہا کہ آپ کو اس مکان میں ڈر لگتا ہے۔ ورنہ میں کوئی معتبر سن رسیدہ عورت کو رات کو سونے کے لیے ٹھیک کر دیتا۔

ایشور داس نے تو کمرے میں آسن جمایا۔ مایا اندر کھانا کھانے گئی۔ لیکن آج اس کے حلق کے نیچے ایک لقمہ بھی نہ اُتر سکا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دل پر ایک موہوم دہشت کا غلبہ تھا۔ کہیں ایشور داس جاگ پڑا تو؟ اسے اس وقت کتنی شرمندگی ہوگی۔

مایا نے خنجر کو خوب تیز کر رکھا تھا۔ آج دن بھر اس نے اسے ہاتھ میں لے کر مشق کی تھی۔ وہ اس طرح وار کرے گی کہ وہ خالی ہی نہ جائے۔ اگر ایشور داس جاگ ہی پڑا تو زخم مہلک ہوگا۔

جب آدھی رات ہوگئی اور ایشور داس کے خراٹوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں تو مایا خنجر لے کر اُٹھی۔ پر اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ خوف اور عزم، کشش اور نفرت،

ایک ساتھ کبھی اسے ایک قدم آگے بڑھا دیتے۔ کبھی پیچھے ہٹا دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا سارا مکان، سارا آسمان چکر کھا رہا ہے۔ کمرہ کی ہر ایک چیز گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ مگر ایک لمحہ میں یہ شورش فرو ہوگئی۔ اور دل پر ہراس کا غلبہ ہوا۔ وہ دبے پاؤں ایشور داس کے کمرہ تک آئی۔ پھر اس کے قدم وہیں جم گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آہ! میں کتنی کمزور ہوں۔ جس شخص نے میرا ستیاناس مار دیا۔ میری ہری بھری کھیتی اُجاڑ دی۔ میرے لہلہاتے ہوئے گلزار کو ویران کردیا۔ مجھے ہمیشہ کے لیے آگ کے جلتے ہوئے کنڈوں میں ڈال دیا۔ اس سے میں خون کا انتقام نہیں لے سکتی۔ وہ میری ہی بہنیں تھیں جو تلوار اور بندوق لے کر میدان میں لڑی تھیں۔ دہکتی ہوئی چتا میں ہنستے ہنستے بیٹھ جاتی تھیں۔ اُسے اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ مسٹر ویاس سامنے کھڑے ہیں اور اُسے آگے بڑھنے کی تحریک کر رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں کیا تم میرے خون کا انتقام نہ لوگی۔ میری روح انتقام کے لیے تڑپ رہی ہے۔ کیا اسے ازل تک یونہی تڑپاتی رہوگی؟ کیا یہی شرطِ وفا تھی؟ ان خیالات نے مایا کے جذبات کو مشتعل کردیا۔ اس کی آنکھیں خون کی طرح سُرخ ہوگئیں۔ ہونٹ دانتوں کے نیچے دب گئے۔ اور خنجر کے قبضہ پر مٹھی بندھ گئی۔ سفاکانہ جنون کی کیفیت طاری ہوگئی۔ اس نے کمرہ کے اندر قدم رکھا۔ مگر ایشور داس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ کمرہ میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ مایا کی آہٹ پاکر وہ چونکا اور سر اُٹھا کر دیکھا تو خون سرد ہوگیا۔ مایا قہر کی مورت بنی ہاتھ میں برہنہ شمشیر لیے اس کی طرف چلی آرہی تھی۔

وہ چارپائی سے اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اور گھبرا کر بولا۔ "کیا ہے بہن؟ یہ تلوار کیوں لیے ہوئے ہو؟ مایا نے کہا کہ یہ تلوار تمھارے خون کی پیاسی ہے۔ کیونکہ تم نے میرے شوہر کو قتل کیا ہے۔"

ایشور داس کا چہرہ زرد ہوگیا۔ بولا میں نے!

"ہاں تم نے۔ تمھیں نے لاہور میں میرے شوہر کو قتل کیا۔ جب وہ ایک مقدمہ کی پیروی کرنے گئے تھے۔ کیا تم اس سے انکار کرسکتے ہو۔ میرے شوہر کی روح نے خود تمھارا پتا بتلایا ہے۔"

"تو تم مسٹر ویاس کی بیوی ہو۔"

"ہاں میں ان کی بدنصیب بیوی ہوں اور تم میرا سہاگ لوٹنے والے ہو۔ گو تم نے

میرے اوپر احسان کیے ہیں۔ لیکن احسانوں سے میرے دل کی آگ نہیں بجھ سکتی وہ تمھارے خون ہی سے بُجھے گی۔

ایشور داس نے مایا کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو لیجیے یہ حاضر ہے۔ اگر میرے خون سے آپ کے دل کی آگ بجھ جائے تو میں خود اُسے آپ کے قدموں پر گرا دوں گا۔ لیکن جس طرح آپ میرے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھانا اپنا فرض سمجھتی ہیں اسی طرح میں نے بھی مسٹر ویاس کو قتل کرنا اپنا فرض سمجھا۔ آپ کو معلوم ہے وہ ایک سیاسی مقدمے کی پیروی کرنے لاہور گئے تھے۔ لیکن مسٹرویاس نے جس طرح اپنی اعلیٰ قانونی لیاقت کا استعمال کیا۔ پولیس کو فرضی شہادتوں کے تیار کرنے میں جس طرح مدد دی۔ جس بے رحمی اور بے دردی سے بیکس اور زیادہ تر بے گناہ نوجوانوں کو تباہ کیا وہ میرے صبر کے لیے نا قابلِ برداشت تھا۔ ان دنوں عدالت میں تماشائیوں کا بے انتہا ہجوم رہتا تھا۔ سبھی عدالت سے مسٹر ویاس کو نفریں کرتے ہوئے جاتے تھے۔ میں تو مقدمہ کی حقیقت سے واقف تھا۔ اس لیے میرا ضمیر محض نفرت کے اظہار سے تسکین نہ حاصل کرسکتا تھا۔ میں آپ سے کیا عرض کروں۔ مسٹر ویاس نے دیدہ و دانستہ باطل کو حق ثابت کیا۔ اور کتنے ہی گھرانوں کو بے چراغ کردیا۔ آج کتنی ہی مائیں اپنے بیٹوں کے لیے خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ کتنی ہی عورتیں رنڈاپے کی آگ میں جل رہی ہیں۔ پولیس کتنی ہی زیادتیاں کرے۔ ہم پرواہ نہیں کرتے۔ اس کے سوا ہم پولیس سے اور کوئی امید ہی نہیں رکھتے۔ اس میں زیادہ تر جاہل شہدے لچے بھرے ہوئے ہیں۔ سرکار نے اس محکمہ کو قائم ہی اسی لیے کیا ہے کہ وہ رعایا کو تنگ کرے۔ مگر وکیلوں سے ہم انصاف کی امید رکھتے ہیں۔ ہم ان کی عزت کرتے ہیں وہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ بیدار مغز ہوتے ہیں جب ایسے آدمیوں کو ہم پولیس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا دیکھتے ہیں۔ تو ہمارے غصہ کی انتہا نہیں رہتی۔ میں مسٹر ویاس کا مداح تھا۔ مگر جب میں نے انھیں بے گناہ ملزموں سے جبراً جرم کا اقبال کراتے دیکھا تو مجھے اُن سے نفرت ہوگئی۔ غریب ملزم رات رات بھر اُلٹے لٹکائے جاتے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنا جرم جو انھوں نے کبھی نہیں کیا اقبال کرلیں۔ ان کی ناک میں لال مرچ کا دھواں ڈالا جاتا تھا۔ مسٹر ویاس یہ ساری بدعتیں محض انہی آنکھوں سے دیکھتے ہی نہیں تھے۔ بلکہ انھیں کے ایما سے یہ کی جاتی تھیں۔

مایا کے چہرہ کی تندی غائب ہوگئی۔ اس کی جگہ جائز غصّہ کی حرارت پیدا ہوئی۔ بولی اس کا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے۔ کہ انھوں نے ملزمین پر ایسی سختیاں کیں؟

"یہ ساری باتیں عام طور پر مشہور تھیں۔ لاہور کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ میں نے خود آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے سوا میں اور کیا ثبوت دے سکتا ہوں ان غریبوں کا محض اتنا قصور تھا کہ وہ ہندوستان کے سچے دوست تھے۔ اپنا سارا وقت رعایا کی تعلیم اور خدمت میں صرف کرتے تھے۔ خود فاقے کرتے تھے۔ رعایا پر پولیس اور حکّام کی سختیاں نہ ہونے دیتے تھے۔ یہی ان کا گناہ تھا اور اسی گناہ کی سزا دلانے میں مسٹر ویاس پولیس کے داہنے ہاتھ بنے ہوئے تھے۔"

مایا کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولی مجھے نہ معلوم تھا کہ وہ ایسی حرکتیں بھی کرسکتے ہیں۔

ایشور داس نے کہا یہ نہ سمجھیے کہ میں آپ کی تلوار سے ڈر کر وکیل صاحب پر جھوٹے الزام لگا رہا ہوں۔ میں نے کبھی زندگی کی پرواہ نہیں کی۔ میرے کون رونے والا بیٹھا ہوا ہے۔ جس کے لیے زندگی کی پرواہ کروں۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں نے خون ناحق کیا ہے۔ تو آپ اس تلوار کو اُٹھا کر اس زندگی کا خاتمہ کر دیجیے۔ میں ذرا بھی نہ جھجھکوں گا۔ اگر آپ تلوار نہ اُٹھا سکیں تو پولیس کو اطلاع دے دیجیے وہ بڑی آسانی سے مجھے دنیا سے رخصت کرسکتی ہے۔ ثبوت مل جانا مشکل نہ ہوگا۔ میں خود پولیس کے روبرو اپنے جرم کا اقبال کرلیتا۔ مگر میں اسے جرم نہیں سمجھتا۔ اگر ایک جان کے جانے سے سینکڑوں جانیں بچ جائیں تو وہ خون نہیں ہے۔ میں صرف اس لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں کہ شاید کسی ایسے ہی موقعہ پر پھر میری ضرورت پڑے۔

مایا نے رقت کے ساتھ کہا۔ اگر تمھارا بیان صحیح ہے تو میں اپنا خون معاف کرتی ہوں۔ تم نے جا کیا یا بے جا کیا۔ اس کا فیصلہ ایشور کریں گے۔ تم سے میری درخواست ہے کہ میرے شوہر کے ہاتھوں جو گھر تباہ ہوئے ہیں ان کا مجھے پتا بتلا دو۔ شاید میں ان کی خدمت کرسکوں۔

یہ افسانہ زمانہ کے اکتوبر1923 میں شائع ہوا۔ ہندی میں یہ 'پرتی شودھ' کے عنوان سے گپت دھن2 میں، اردو میں 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔

ستیاگرہ

ہزایکسلینی وائسرائے بنارس آرہے تھے۔ سرکاری اہلکار کیا چھوٹے بڑے سبھی ان کے خیرمقدم کی تیاری کر رہے تھے۔ اِدھر کانگریس نے شہر میں ہڑتال کرنے کی منادی کردی تھی۔ جس سے اہلکاروں میں بڑی ہل چل تھی۔ ایک طرف سڑکوں پر جھنڈیاں لگائی جارہی تھیں۔ صفائی ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی شاندار محرابیں بنائی جارہی تھیں۔ دفاتر کی آرائشیں ہورہی تھیں۔ پنڈال بن رہا تھا اور دوسری طرف فوج و پولیس کے سپاہی سنگینیں چڑھائے شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر قواعد کرتے پھرتے تھے۔ حکام کی سر توڑ کوشش تھی کہ ہڑتال نہ ہونے پائے مگر کانگریس والوں کی دُھن تھی کہ ہڑتال ہو اور ضرور ہو۔ اگر حکّام کو حیوانی طاقت پر ناز ہے تو ہمیں روحانی قوت کا بھروسہ ہے اس بار دونوں کی آزمائش ہوجائے کہ میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

مجسٹریٹ گھوڑے پر سوار ہوکر صبح سے شام تک دُکانداروں کو دھمکیاں دیتا پھرتا کہ ایک ایک کو جیل بھجوا دُوں گا۔ یہ کروں گا۔ اور وہ کروں گا۔ دُکاندار ہاتھ جوڑ کر کہتے کہ حضور بادشاہ ہیں جو چاہیں کرسکتے ہیں مگر ہم کیا کریں؟ کانگریس والے ہمیں جیتا نہ چھوڑیں گے۔ ہماری دُکانوں پر دھرنا دیں گے۔ ہمارے اور اُوپر بال بڑھا دیں گے۔ کنوئیں میں گریں گے۔ فاقے کریں گے۔ کون جانے دو چار جان ہی دے دیں تو ہمارے مُنہ پر ہمیشہ کے لیے کالک لگ جائے گی۔ حضور انھیں کانگریس والوں کو سمجھا دیں تو ہمارے اُوپر بڑا احسان ہو۔ ہڑتال نہ کرنے سے ہمارا کچھ نقصان تھوڑا ہی ہے۔ ملک کے بڑے بڑے آدمی آویں گے۔ ہماری دوکانیں کُھلی رہیں گی تو ایک کے دو ملیں گے۔ مہنگے سودے بیچیں گے۔ مگر کیا کریں ان شیطانوں سے کوئی بس نہیں چلتا۔

رائے ہرنندن سہائے۔ راجا لال چند اور خاں بہادر مولوی محمود علی تو حکّام سے بھی زیادہ بے چین تھے۔ مجسٹریٹ کے ساتھ اور تنہا بھی بڑی کوشش کرتے تھے۔ اپنے مکانوں پر بُلا کر دُکانداروں کو سمجھاتے۔ منت سماجت کرتے۔ آنکھیں دکھلاتے۔ یکّے بگھّی والوں کو

دھمکاتے مزدوروں کی خوشامد کرتے۔ مگر کانگریس کے مٹھی بھر آدمیوں کا کچھ ایسا رُعب چھایا ہوا تھا کہ انجمن نے بھی بے خوفی سے کہہ دیا کہ حضور چاہے مار ڈالو مگر دُکان تو نہ کھلے گی۔ ناک نہ کٹواؤں گی۔ سب سے بڑا اندیشہ یہ تھا کہ پنڈال بنانے والے مزدور، بڑھئی، لوہار وغیرہ کام نہ چھوڑ دیں ورنہ غضب ہی ہو جائے گا۔ رائے صاحب نے کہا۔ "حضور دوسرے شہروں سے دُکاندار بلوا دیں اور ایک بازار علاحدہ کھولیں۔"

خاں صاحب نے فرمایا۔ "وقت اتنا کم رہ گیا ہے کہ دوسرا بازار تیار نہیں ہوسکتا۔ حضور کانگریس والوں کو گرفتار کرلیں یا ان کی جائداد ضبط کرلیں پھر دیکھیے کیسے قابو میں نہیں آتے۔"

راجا صاحب بولے۔ "اس داروگیر سے تو لوگ اور جھلائیں گے۔ کانگریس والوں سے حضور کہیں کہ تم ہڑتال بند کردو۔ تو سب کو سرکاری ملازمت دے دی جائے گی۔ اُس میں زیادہ تر بے کار لوگ بھرے پڑے ہیں۔ لالچ دِکھانے سے خوش ہوجائیں گے۔" مگر مجسٹریٹ کو کوئی رائے پسند نہ آئی۔ یہاں تک کہ وائسرائے کے آنے میں تین روز رہ گئے۔

(۲)

آخر راجا صاحب کو ایک تدبیر سوجھی کہ کیوں نہ ہم لوگ بھی روحانی طاقت سے کام لیں؟ آخر کانگریس والے مذہب اور روحانی طاقت ہی کے نام پر تو یہ طومار باندھتے ہیں۔ ہم لوگ بھی انھیں کی تقلید کریں۔ شیر کو اس کی ماند میں پچھاڑیں۔ کوئی آدمی پیدا کرنا چاہیے جو فاقے کرے کہ دکانیں نہ کھلیں تو جان دیدوں گا۔ یہ ضروری ہے کہ وہ برہمن ہو اور ایسا ہوکہ جس کو شہر کے لوگ مانتے ہوں اور اُس کی عزت کرتے ہوں۔ یہ بات دیگر رفقاء کے بھی دل نشیں ہوگئی۔ وہ اُچھل پڑے۔ رائے صاحب نے کہا کہ بس اب میدان مار لیا۔ ایسا کون پنڈت ہے؟ پنڈت گدا دھر شرما؟

راجا۔ جی نہیں اسے کون مانتا ہے؟ صرف اخبارات میں لکھا کرتا ہے۔ شہر کے لوگ اسے کیا جانیں۔

رائے صاحب ۔ دمڑی اُوجھا تو ہے اسی ڈھنگ کا؟

راجا۔ جی نہیں کالج کے طلباء کے سوا اُسے اور کون جانتا ہے؟

رائے صاحب۔ پنڈت موٹے رام شاستری؟

راجا۔ بس بس آپ نے خوب سوچا۔ بے شک وہ اس ڈھنگ کا۔ اسی کو بُلانا چاہیے۔ عالم ہے۔ دھرم کرم سے رہتا ہے۔ ہوشیار بھی ہے۔ وہ اگر ہاتھ میں آجائے تو بازی ہماری ہے۔

رائے صاحب نے فوراً پنڈت موٹے رام کے گھر پر پیغام بھیجا۔ اس وقت شاستری جی پوجا کر رہے تھے۔ اُنھوں نے یہ پیغام پاتے ہی جلد پوجا ختم کی اور چل دیئے۔

”راجا صاحب نے بُلایا ہے دھنیہ بھاگ! اہلیہ سے بولے۔ آج چندرماں کچھ بلوان معلوم ہوتا ہے۔ کپڑے لاؤ دیکھوں کیوں بُلایا ہے۔“

اہلیہ نے کہا۔ کھانا تیار ہے۔ کھاتے جاؤ۔ نہ جانے کب لوٹنے کا موقعہ ملے۔

مگر شاستری جی نے آدمی کو اتنی دیر کھڑا رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ جاڑے کے دن تھے۔ سبز بانات کی اچکن پہنی جس پر سُرخ سنجاف تھی۔ گلے میں ایک زری کا دوپٹہ ڈالا۔ سر پر بنارسی صافہ باندھا۔ سُرخ چوڑے کنارے والی ریشمی دھوتی پہنی اور کھڑاؤں پر چلے اُن کے چہرے پر رونق برستی تھی۔ دُور سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی مہاتما آرہے ہیں۔ راستے میں جو ملتا سر جُھکاتا۔ کتنے ہی دُکانداروں نے کھڑے ہوکر پالاگن کیا۔ آج کاشی کا نام انھیں کی بدولت چل رہا ہے ورنہ اور کون ہے؟ کتنے منکسر مزاج ہیں؟ لڑکوں سے ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ اس ٹھاٹھ سے پنڈت جی راجا صاحب کے مکان پر پہنچے۔ تینوں دوستوں نے کھڑے ہوکر ان کی تعظیم کی۔ خاں صاحب بولے۔ ”کہیے پنڈت جی مزاج تو اچھے ہیں۔ واللہ آپ نمائش میں رکھنے کے قابل آدمی ہیں۔ آپ کا وزن تو دس من سے کم نہ ہوگا۔“

رائے صاحب۔ ایک من علم کے لیے دس من عقل چاہیے۔ اسی قاعدہ سے ایک من عقل کے لیے دس من کا جسم ضروری ہے ورنہ اس کا بوجھ کون اُٹھائے؟

راجا صاحب۔ ”آپ لوگ اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔ عقل ایک قسم کا نزلہ ہے۔ جب دماغ میں نہیں سماتی تو جسم میں آجاتی ہے۔“

خاں صاحب۔ میں نے بزرگوں کی زبانی سُنا ہے کہ موٹے آدمی عقل کے دشمن ہوتے ہیں۔

رائے صاحب۔ آپ کا حساب کمزور ہے۔ ورنہ آپ کی سمجھ میں اتنی بات ضرور آجاتی۔ کہ

جب عقل اور جسم میں ایک اور دس کی نسبت ہے تو جتنا ہی موٹا آدمی ہوگا اُتنا ہی اس کی عقل کا وزن بھی زیادہ ہوگا۔

راجا صاحب۔ اس سے ثابت ہوا کہ جتنا ہی موٹا آدمی اُتنی ہی موٹی اس کی عقل۔

موٹے رام۔ جب موٹی عقل کی بدولت راج دربار میں پوچھ ہوتی ہے تو مجھے پیشگی عقل لے کر کیا کرنا چاہیے؟

ہنسی مذاق کے بعد راجا صاحب نے پنڈت جی کے سامنے موجودہ مسئلہ پیش کیا۔ اور اس کے حل کی جو تدبیر سوچی تھی۔ وہ بھی ظاہر کی۔ بولے۔ "بس یہ سمجھ لیجیے کہ اس سال آپ کا مستقبل پورے طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ شاید کسی آدمی کو اپنی تقدیر کے فیصلہ کا ایسا اہم موقعہ نہ ملا ہوگا۔ ہڑتال نہ ہوئی تو اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ مگر عمر بھر کسی کے دروازے جانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ بس ایسا کوئی برت ٹھانیے کہ شہر والے تھرّا اُٹھیں۔ کانگریس والوں نے مذہب کی آڑ لے کر اتنی طاقت بڑھائی ہے۔ بس ایسی کوئی ترکیب نکالیے کہ عوام کے مذہبی جذبات کو ٹھیس لگے۔

موٹے رام نے متانت سے جواب دیا۔ یہ تو کوئی ایسا کٹھن کام نہیں ہے میں تو ایسے ایسے اُپائے کرسکتا ہوں کہ آسمان سے پانی برسا دوں۔ مری (ہیضہ) کو بھی دُور کردوں۔ اناج کا بھاؤ گھٹا بڑھا دوں۔ پھر کانگریس والوں کو ہرا دیا تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ انگریزی پڑھے لکھے لوگ سمجھتے ہیں کہ جو کام ہم کرسکتے ہیں۔ وہ کوئی نہیں کرسکتا۔ مگر گُپت (پوشیدہ) وِدیاؤں کا انھیں گیان (علم) ہی نہیں۔

خان صاحب۔ "تب تو جناب یہ کہنا چاہیے کہ آپ دوسرے خدا ہیں۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ آپ میں یہ قدرت ہے ورنہ اتنے دنوں تک کیوں پریشان ہوتے۔"

موٹے رام ۔صاحب میں چُھپے دھن کا پتا لگا سکتا ہو۔ پتروں (آباؤ اجداد) کو بُلا سکتا ہوں۔ صرف گُن کا گاہک چاہیے۔ سنسار میں گُنوانوں کی کمی نہیں ہے۔ گُن کے پارکھیوں کی کمی ہے۔ "گن ناہرا نوگن گاہک ہرانو ہے۔"

راجا۔ بھلا اس انوشٹھان کے لیے آپ کو کیا بھینٹ کرنا ہوگا۔

موٹے رام۔ جو آپ کی مرضی ہو۔

راجا۔ کچھ بتلا سکتے ہیں کہ یہ کون سا انوشٹھان ہوگا۔

موٹے رام۔ بلا بھوجن کے بَرت کے ساتھ منتروں کا جاپ ہوگا۔ سارے شہر میں ہلچل نہ مچا دوں تو موٹے رام نام نہیں۔

راجا۔ تو پھر کب سے۔

موٹے رام ۔آج ہی ہو سکتا ہے۔ ہاں پہلے دیوتاؤں کے "آواہن"(بلانے) کے لیے کچھ روپے دِلا دیجیے۔

روپیوں کی کمی ہی کیا تھی۔ پنڈت جی کو روپے مل گئے اور وہ خوش خوش گھر آئے۔ بیوی سے سارا حال کہا۔ اس نے متفکرانہ لہجے میں کہا تم نے ناحق یہ روگ اپنے سر لیا۔ بھوک نہ سہہ سکے تو؟ سارے شہر میں بدنامی ہو جائے گی۔ لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ روپے لوٹا دو۔

موٹے رام نے تشفی دیتے ہوئے کہا۔ بھوک کیسے نہ برداشت ہو گی؟ میں ایسا مُورکھ تھوڑا ہی ہوں کہ یوں ہی جا بیٹھوں گا۔ پہلے میرے کھانے کا بندو بست کرو۔ امرتیاں۔ لڈو۔ رس گلے منگاؤ۔ پیٹ بھر کھا لوں۔ پھر آدھ سیر ملائی کھاؤں گا۔ اس کے اوپر آدھ سیر بادام کی تہ جماؤں گا۔ بچی کھچی کسر ملائی والے دہی سے پوری کردوں گا۔ پھر دیکھوں گا کہ بھوک کیوں کر پاس پھٹکتی ہے۔ تین دن تک تو سانس ہی نہ لی جاوے گی۔ بھوک کو کون چلاوے۔ اتنے میں سارے شہر میں کھلبلی مچ جاوے گی۔ بھاگ کا سورج اُودے (طلوع) ہوا ہے۔ اس وقت آگا پیچھا کرنے سے پچھتانا پڑے گا۔ بازار نہ بند ہوا تو سمجھ لو کہ مالا مال ہو جاؤں گا۔ نہیں تو یہاں گانٹھ سے کیا جاتا ہے؟ سو روپے تو ہاتھ لگ گئے۔

ادھر تو کھانے کا بندو بست ہوا۔ اُدھر پنڈت موٹے رام نے منادی کرادی کہ شام کے وقت ٹاؤن ہال کے میدان میں موٹے رام ملک کے سیاسی مسئلہ پر لیکچر دیں گے۔ پس لوگ ضرور آویں۔ پنڈت جی ہمیشہ سیاسی امور سے علاحدہ رہتے تھے آج وہ انھیں اُمور کے متعلق کچھ کہیں گے۔ سُننا چاہیے۔ لوگوں کو شوق ہوا۔ پنڈت جی گھر سے بخوبی تیار ہو کر پہنچے۔ پیٹ اتنا بھرا ہوا تھا کہ چلنا مشکل تھا۔ جیوں ہی یہ وہاں پہنچے حاضرین نے کھڑے ہو کر انھیں مؤدبانہ ڈنڈوت پرنام کیا۔

موٹے رام بولے۔ شہر والوں۔ کاروباری لوگو۔ سیٹھو اور مہاجنو! میں نے سُنا ہے کہ تم لوگوں نے کانگریس والوں کے کہنے میں آکر بڑے لاٹ صاحب کے یہاں آنے کے

موقعہ پر ہڑتال کرنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ یہ کتنی بڑی نمک حرامی ہے۔ وہ چاہیں تو آج لوگوں کو توپ کے مُنہ پر اُڑا دیں۔ سارے شہر کو کھدوا ڈالیں۔ راجا ہیں۔ ہنسی ٹھٹھا نہیں۔ وہ طرح دیے جاتے ہیں تمھاری غریبی پر دَیا کرتے ہیں اور تم گئوؤں کی طرح ہتیا کے بل پر کھیت چرنے کو تیار ہو۔ لاٹ صاحب چاہیں تو آج ریل بند کردیں۔ ڈاک بند کردیں۔ مال کا آنا جانا بند کردیں۔ تب بتاؤ کیا کروگے؟ تم ان سے بھاگ کر کہاں جاسکتے ہو؟ ہے کہیں ٹھکانہ؟ اس لیے جب اِسی دیش میں اور انھیں کے ماتحت رہنا ہے تو اتنا جھگڑا کیوں مچاتے ہو؟ یاد رکھو تمھاری جان اُن کی مُٹھی میں ہے۔ طاعون کے کیڑے پھیلا دیں تو سارے شہر میں تہلکہ مچ جاوے۔ تم جھاڑو سے آندھی کو روکنے چلے ہو؟ خبردار کسی نے بازار بند کیا! نہیں تو کہے دیتا ہوں کہ میں دانہ پانی بِنا پران دے دوں گا۔

ایک آدمی نے سوال کیا۔ "مہاراج آپ کے پران نکلتے نکلتے مہینہ بھر سے کم نہ لگے گا۔ تیس دن میں کیا ہوگا؟"

موٹے رام نے گرج کہا۔ "پران بدن میں نہیں رہتا۔ برھمانڈ میں رہتا ہے۔ میں چاہوں تو یوگ کرکے ابھی پران چھوڑ سکتا ہوں۔ میں نے تمھیں چیتاؤنی دے دی۔ اب تم جانو تمھارا کام۔ میرا کہنا مانوگے تو تمھارا کلیان ہوگا۔ نہ مانوگے تو ہتیا لگے گی۔ دُنیا میں کبھی مُنہ نہ دِکھا سکو گے۔ بس یہ لو۔ میں آسن جماتا ہوں۔"

(۳)

شہر میں یہ خبر پھیلی تو لوگوں کے ہوش اُڑ گئے۔ حکّام کی اس نئی چال نے ان کو مبہوت سا کردیا۔ کارکنانِ کانگریس تو اب بھی کہتے تھے کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ سرکاری بہی خواہوں نے کچھ دے دِلا کر یہ سوانگ کھڑا کیا ہے۔ جب اور کوئی بس نہ چلا۔ فوج پولیس۔ قانون سبھی تدبیروں سے ہار گئے تو یہ نئی حکمت نکالی ہے۔ یہ اور کچھ نہیں۔ سیاست کا دیوالہ ہے۔ ورنہ پنڈت جی ایسے کہاں کے مُلکی خادم تھے جو ملک کی حالت سے غمگین ہوکر برت ٹھانتے۔ انھیں بھوکوں مرنے دو۔ دو دن میں بدل جائیں گے۔ اس نئی چال کی جڑ ابھی سے کاٹ دینی چاہیے۔ کہیں یہ چال چل گئی تو سمجھ لو کہ حکّام کے ہاتھ ایک نیا ہتھیار آجائے گا اور وہ ہمیشہ اس کا استعمال کریں گے۔ عام لوگ اتنے سمجھدار تو ہیں نہیں کہ ان چالوں کو سمجھیں۔ گیدڑ بھبکی میں آجائیں گے۔

لیکن شہر کے بنیے مہاجن جو مذہبی معاملات میں عموماً ڈرپوک ہوتے ہیں ایسے گھبرا گئے کہ ان پر ان باتوں کا کچھ اثر ہی نہ ہوتا تھا وہ کہتے تھے۔ صاحب! آپ لوگوں کے کہنے سے سرکار سے بُرے بنے۔ نقصان اُٹھانے کو تیار ہوئے۔ کار و بار ترک کیا۔ کتنوں کے دیوالے نکل گئے۔ افسروں کو مُنہ دِکھانے کے لائق نہیں رہے۔ پہلے جہاں جاتے تھے حکّام لوگ۔ "آیئے سیٹھ جی۔" کہہ کر عزّت بخشتے تھے اب ریل گاڑیوں میں دھکّے کھا لیتے ہیں مگر کوئی نہیں سُنتا۔ آمدنی چاہے کچھ ہو یا نہ ہو بہیّوں کا وزن دیکھ کر ٹیکس بڑھا جاتا ہے۔ یہ سب سہا اور سہیں گے۔ مگر دھرم کے معاملے میں ہم آپ لوگوں کا کہنا نہیں مان سکتے۔ جب ایک وِدوان کلیں اور دھرم کرم والا برہمن ہمارے اُوپر دانہ پانی چھوڑ رہا ہے تب ہم کیوں کر بھوجن کریں اور پَیر پھیلا کر سوئیں؟ کہیں مَر گیا تو بھگوان کے سامنے کیا جواب دیں گے؟

خلاصہ یہ کہ کانگریس والوں کی ایک نہ چلی۔ بیوپاریوں کا ایک وفد نو بجے رات کو پنڈت جی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پنڈت جی نے آج کھانا تو خوب ڈٹ کر کھایا تھا لیکن اس طرح کھانا ان کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مہینہ میں عموماً بیس روز وہ ضرور مدعو ہوتے تھے اور دعوت میں شکم سیر ہوکر کھانا بالکل قدرتی بات ہے۔ اپنے ساتھیوں کی دیکھا دیکھی لاگ ڈانٹ کے دُھن میں یا مالک کے انکسار آمیز اصرار سے اور سب سے زیادہ اشیائے خوردنی کی عمدگی کے سبب کھانا حد سے زیادہ ہو ہی جاتا ہے۔ پنڈت جی کی قوتِ ہاضمہ ایسے امتحانوں میں پاس ہوتی رہتی تھی۔ پس اس وقت کھانے کا وقت آجانے سے اُن کی نیّت کچھ ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ وہ بھوک سے بے قرار تھے۔ لیکن کھانے کا وقت آجانے سے اگر پیٹ خوب بھرا ہوا نہ ہو۔ بدہضمی نہ ہوگئی ہو۔ تو دل میں ایک طرح کی کھانے کی خواہش پیدا ہونے لگتی ہے۔ شاستری جی کی اس وقت یہی حالت ہو رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کسی خوانچہ والے کو بُلاکر کچھ لے لیتے مگر حکّام نے ان کی جسمانی حفاظت کے لیے وہاں کئی سپاہیوں کو تعینات کردیا تھا۔ وہ سب ہٹنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ پنڈت جی کی بڑی عقل اس وقت یہی مسئلہ حل کر رہی تھی کہ ان شیطانوں کو کیسے ٹالوں؟ خواہ مخواہ ان پاجیوں کو یہاں کھڑا کردیا۔ میں کوئی قیدی تو ہوں نہیں کہ بھاگ جاؤں گا۔

حکام نے شاید یہ انتظام اس لیے کر رکھا تھا کہ کانگریس والے جبراً پنڈت جی کو وہاں سے بھگانے کی کوشش نہ کر سکیں۔ کون جانے کیا چال چلیں؟ کہیں کسی کتے ہی کو اُن پر چھوڑ دیں یا دُور سے پتھر پھینکنے لگیں۔ ایسے نا مناسب اور ہتک آمیز سلوکوں سے پنڈت جی کی حفاظت کرنا حکام کا فرض تھا۔

وہ ابھی اسی فکر میں تھے کہ بیوپاریوں کا وفد آپہنچا۔ پنڈت جی کہنی کے بل لیٹے ہوئے تھے۔ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ پیشوانِ وفد نے ان کے قدم چُھوکر کہا۔ مہاراج ہمارے اُوپر آپ نے کیوں کوپ (غصہ) کیا ہے؟ آپ کا جو حکم ہو وہ ہمارے سر آنکھوں پر! آپ اُٹھیے کھانا پینا شروع کیجیے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ آپ سچ مچ یہ بُرت ٹھاننے والے ہیں۔ نہیں تو ہم پہلے ہی آپ سے بنتی (عرض) کرتے۔ اب کرپا کیجیے۔ دس بجے کا وقت ہے ہم آپ کی بات کبھی نہ ٹالیں گے۔

یہ کانگریس والے تمھیں ملیامیٹ کرکے چھوڑیں گے۔ آپ تو ڈوبتے ہی ہیں تمھیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے۔ بازار بند رہے گا تو اس سے تمھارا گھاٹا ہوگا۔ سرکار کو کیا؟ تم نوکری چھوڑ دوگے تو آپ بھوکوں مروگے سرکار کو کیا۔ نہ جانے ان سبھوں کو کیا سنک سوار ہوگئی ہے اپنی ناک کٹا کر دوسروں کا اسگن مناتے ہیں۔ تم ان بُرے لوگوں کے بہکانے میں نہ آؤ۔ کیوں دُکانیں کُھلی رکھو گے؟

سیٹھ۔ ”مہاراج جب تک شہر بھر کے آدمیوں کی پنچایت نہ ہوجائے تب تک ہم اس کا بیمہ کیسے لے سکتے ہیں؟ کانگریس والوں نے کہیں لوٹ مچا دی تو کون ہماری مدد کرے گا؟ آپ اُٹھیے بھوجن کیجیے۔ ہم کل پنچایت کرکے آپ کی خدمت میں جیسا کچھ ہوگا عرض کریں گے۔

موٹے رام ۔ ”تو پھر پنچایت کرکے آنا؟“

ڈیپوٹیشن جب مایوس ہوکر لوٹنے لگا۔ تو پنڈت جی نے کہا کسی کے پاس سنگھی تو نہیں ہے؟ ایک شخص نے ڈبیا نکال کر دی۔

(۴)

لوگوں کے چلے جانے پر موٹے رام نے پولیس والوں سے پوچھا۔ تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ سپاہیوں نے کہا۔ ”صاحب کا حکم ہے۔ ہم کیا کریں۔“

موٹے رام۔ "یہاں سے چلے جاؤ۔"

سپاہی۔ "آپ کے کہنے سے چلے جائیں؟ کل نوکری چھوٹ جائے گی تو آپ کھانے کو دیں گے؟"

موٹے رام۔ "ہم کہتے ہیں چلے جاؤ نہیں تو ہمیں یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہم کوئی قیدی نہیں ہیں جو تم گھیرے کھڑے ہو۔"

سپاہی۔ "چلے کہاں جایئے گا۔ مجال ہے؟"

موٹے رام۔"مجال کیوں نہیں ہے بے؟ کوئی جُرم کیا ہے؟"

سپاہی۔ "اچھا جاؤ تو دیکھیں۔"

پنڈت جی اپنے برہمنی رُعب میں آکر اُٹھے اور ایک سپاہی کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ کئی قدم پر جاگرا۔

دوسرے سپاہیوں کی ہمّت چُھوٹ گئی۔ پنڈت جی کو ان سبھوں نے محض موٹا سمجھ لیا تھا۔ ان کی طاقت دیکھی تو چُپکے سے چل دیے۔

موٹے رام اب لگے اِدھر اُدھر نگاہیں دوڑانے کہ کوئی خوانچہ والا نظر آجائے تو اس سے کچھ لیں مگر فوراً خیال آگیا کہ اس نے کسی سے کہہ دیا تو لوگ تالیاں بجانے لگیں گے۔ نہیں ایسی ہوشیاری سے کام کرنا چاہیے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ ایسے سنکٹھ (تکلیف) موقعوں ہی پر تو بدھی کے بَل کا پتا چلتا ہے۔ ایک لمحہ میں اُنھوں نے اس مسئلہ کو حل کر لیا۔

اتفاقاً اسی وقت ایک خوانچہ والا جاتا دِکھائی دیا۔ گیارہ بج چکے تھے۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ پنڈت جی نے آواز دی۔ خوانچے والے۔ او خوانچے والے؟

خوانچہ والا۔ "کہیے کیا دوں؟ بھوک لگ آئی نہ؟ دانہ پانی چھوڑنا سادھوؤں کا کام ہے۔ ہمارا آپ کا کام نہیں۔"

موٹے رام۔ ابے کیا بکتا ہے؟ یہاں کیا کسی سادھو سے کم ہیں؟ چاہیں تو مہینوں پڑے رہیں اور بھوک پیاس نہ لگے۔ تجھے تو صرف اِس لیے بلایا ہے کہ ذرا اپنی کُپّی (چراغ) مجھے دیدے۔ دیکھوں تو وہاں کیا رینگ رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں سانپ نہ ہو۔

خوانچہ والے نے چراغ اُتار کر دے دیا۔ پنڈت جی اسے لے کر اِدھر اُدھر زمین پر

کچھ کھوجنے لگے کہ اتنے میں چراغ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا اور بُجھ گیا۔ پنڈت جی نے اسے ایک ٹھوکر اور لگائی کہ بچا کھچا تیل بھی بہہ جائے۔

خوانچہ والا۔ (چراغ ہلا کر) مہاراج اس میں تو ذرا بھی تیل نہیں بچا۔ اب تک چار پیسے کا سَودا بیچتا۔ آپ نے یہ کھڑاگ بڑھا دیا۔

موٹے رام۔ ''بھیا۔ ہاتھ ہی تو ہے۔ چھوٹ پڑا تو اب کیا ہاتھ ہی کاٹ ڈالوں۔ یہ لو پیسے جاکر کہیں سے تیل بھرا لو۔''

خوانچہ والا۔ (پیسے لے کر) تو اب تیل بھرا کر یہاں تھوڑے آؤں گا۔

موٹے رام۔ خوانچہ رکھے جاؤ۔ لپک کر تھوڑا تیل لے لو۔ نہیں مجھے سانپ کاٹ لے گا تو تمھیں ہتیا لگے گی۔ کوئی جانور ہے ضرور۔ دیکھو وہ رینگتا ہے۔ غائب ہو گیا۔ دوڑو جاؤ پٹھے! تیل لیتے آؤ۔ میں تمھارا خوانچہ دیکھتا رہوں گا۔ ڈرتے ہو تو اپنے روپے پیسے لیتے جاؤ۔

خوانچہ والا بڑے شش و پنج میں پڑا۔ خوانچہ سے پیسے نکالتا ہے تو خوف ہے کہ پنڈت جی اپنے دل میں بُرا نہ مانیں۔ سوچیں کہ مجھے بے ایمان سمجھ رہا ہے چھوڑ کر جاتا ہوں تو کون جانے اُن کی نیّت کیا ہو۔ آخر اُس نے طے کیا کہ خوانچہ یہیں چھوڑ دوں جو کچھ تقدیر میں ہوگا وہی ہوگا۔ وہ اُدھر بازار کی طرف چلا اِدھر پنڈت جی نے خوانچہ پر نگاہ دوڑائی۔ مٹھائی بہت کم بچ رہی تھی۔ پانچ چھ چیزیں تھیں مگر کسی میں سے دو عدد سے زیادہ نکالنے کی گنجائش نہ تھی۔ بھانڈا پھوٹ جانے کا خدشہ تھا۔ پنڈت جی نے سوچا۔ گناہ اِتنے سے کیا ہوگا؟ صرف بھوک اور تیز ہوجائے گی؟ شیر کے مُنہ میں خون لگ جائے گا۔ گناہ بے لذّت ہے۔ اپنی جگہ پر آ بیٹھے لیکن دم بھر بعد پیاس نے پھر زور کیا۔ سوچے کہ کچھ تو ڈھارس ہو ہی جائے گی۔ کھانا کتنا ہی کم ہو پھر بھی کھانا ہی ہے اُٹھے اور مٹھائی نکالی مگر پہلا ہی لڈو مُنہ میں رکھا تھا کہ دیکھا خوانچہ والا کُپّی جلائے قدم بڑھاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ اس کے پہنچنے کے قبل مٹھائی کا ختم ہونا ضروری تھا ایک ساتھ دو چیزیں مُنہ میں رکھیں ابھی چبا ہی رہے تھے کہ وہ شیطان دس قدم اور آگے بڑھ آیا۔ ایک ساتھ چار چیزیں مُنہ میں ڈالیں اور ادھ کچلی ہی نِگل گئے ابھی چھ اور تھیں اور خوانچہ والا پھاٹک تک آچکا تھا۔ سب کی سب مٹھائی مُنہ میں ڈال لی۔ اب نہ نگلتے بنتا ہے نہ اُگلتے اور وہ شیطان موٹر کی طرح کُپّی

چمکاتا چلا ہی آتا ہے۔ جب وہ بالکل سامنے آگیا تو پنڈت جی نے جلدی سے ساری مٹھائی نگل لی۔ مگر آخر آدمی ہی تھے کوئی مگر گھڑیال تو تھے نہیں آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ گلا پھنس گیا۔ بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے زور سے کھانسنے لگے۔ خوانچہ والے نے تیل کی کپّی بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ لیجیے دیکھ لیجیے۔ چلے تو ہیں آپ اُپاس (فاقہ) کرنے مگر جان کا اتنا ڈر ہے۔ آپ کو کیا پرواہ ! جان بھی نکل جائے گی تو سرکار بال بچّوں کی پردستی (پرورش) کرے گی۔

پنڈت جی کو غصّہ تو ایسا آیا کہ اس پاجی کو کھوٹی کھری سُنا دیں۔ مگر گلے سے آواز نہ نکلی۔ کُپّی چپکے سے لے لی اور جھوٹ مُوٹ اِدھر اُدھر دیکھ کر لوٹا دی۔

خوانچہ والا۔ آپ کو کیا پڑی تھی جو چلے سرکار کا پچّھ (طرفداری) کرنے؟ کہیں کل دن بھر پنچایت ہوگی۔ تب رات تک جاکر کچھ طے ہوگا۔ تب تک تو آپ کی آنکھوں میں تتلیاں اُڑنے لگیں گی۔

یہ کہہ کہ وہ چلا گیا اور پنڈت جی تھوڑی دیر تک کھانسنے کے بعد سو رہے۔

(۵)

دوسرے دن سویرے ہی سے بیوپاریوں نے صلاح مشورہ شروع کیا۔ ادھر کانگریس والوں میں بھی ہلچل مچی۔ امن سبھا کے عہدیداروں نے بھی کان کھڑے کیے۔ یہ تو ان بھولے بھالے بنیوں کو دھمکانے کی اچھی ترکیب ہاتھ آئی۔ پنڈت سماج نے الگ ایک سبھا کی اور اس میں یہ طے کیا کہ پنڈت موٹے رام کو سیاسی معاملات میں پڑنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ ہمارا ان معاملات سے کیا تعلق؟ غرض سارا دن اسی بحث مباحثہ میں گزر گیا اور کسی نے پنڈت جی کی خبر نہ لی۔ لوگ اعلانیہ کہتے تھے کہ پنڈت جی نے ایک ہزار روپے سرکار سے لے کر یہ انوشٹھان کیا ہے۔ بے چارے پنڈت جی رات پوٹ کر کاٹی مگر اُٹھے تو بدن مُردہ سا معلوم ہوتا تھا۔ کھڑے ہوتے تھے تو آنکھیں تلملانے لگتی تھیں۔ سر میں چکرّ آجاتا تھا۔ پیٹ میں جیسے کوئی بیٹھا ہوا کُرید رہا ہو۔ سڑک کی طرف آنکھیں لگی ہوئی تھیں کہ لوگ منانے تو نہیں آرہے ہیں۔ پوجا پاٹ کا وقت اسی انتظار میں گزر گیا۔ اس وقت پوجا کے بعد ناشتہ کیا کرتے تھے۔ آج ابھی مُنہ میں پانی بھی نہ گیا تھا۔ نہ جانے وہ شبھ گھڑی

کب آوے گی۔ پھر پنڈتائن پر غصہ آنے لگا۔ آپ تو رات کو بھر پیٹ کھاکر سوئی ہوئی ہوگی۔ اس وقت بھی جل پان (ناشتہ) کرہی چکی ہوگی۔ مگر اِدھر بھُول کر بھی نہ جھانکا کہ مَرے یا جیے ہیں، کچھ بات کرنے ہی کے بہانے سے کیا تھوڑا سا موہن بھوگ بنا کر نہ لاسکتی تھی؟ مگر کسے اتنی فکر ہے؟ روپے لے کر رکھ لیا۔ پھر جو کچھ ملے گا اُسے بھی لے کر رکھ لے گی۔ مجھے اچھا اُلّو بنایا۔

قصہ کوتاہ پنڈت جی نے تمام دن انتظار کیا مگر کوئی منانے والا نظر نہ آیا۔ لوگوں کے دل میں جو شُبہ پیدا ہوا تھا کہ پنڈت جی نے کچھ لے دے کر یہ سوانگ بھرا ہے، محض اپنی خود غرضی کے سبب سے ڈھکوسلا کھڑا کیا ہے وہی اُن کو منانے میں عارض ہوتا تھا۔

(۲)

رات کے نو بج گئے تھے۔ سیٹھ بھوندو مل نے جو بیماری سماج کے پیشوا تھے۔ تیقن آمیز لہجہ میں کہا۔ مان لیا کہ پنڈت جی نے کسی لالچ ہی سے یہ برت کیا ہے مگر اس سے وہ تکلیف تو کم نہیں ہوسکتی جو دانہ پانی کے بغیر ہر جاندار کو ہوتی ہے۔ یہ دھرم کے خلاف ہے کہ ایک برہمن ہمارے اُوپر دانہ پانی چھوڑ دے۔ اور ہم پیٹ بھربھر کر چین کی نیند سوئیں۔ اگر انھوں نے دھرم کے خلاف کام کیا ہے۔ تو اس کا ڈنڈ انھیں بھوگنا پڑے گا۔ ہم کیوں اپنے فرض سے مُنہ موڑیں۔

کانگریس کے سکریٹری نے دبے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ”مجھے تو جو کچھ کہنا تھا وہ کہہ چکا۔ آپ لوگ سماج کے پیشوا ہیں۔ جو فیصلہ کریں منظور ہے۔ چلیے۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلا چلوں گا۔ دھرم کا کچھ حصہ مجھے بھی مل جائے گا۔ مگر ایک عرض سُن لیجیے آپ لوگ پہلے مجھے وہاں جانے دیجیے میں تنہائی میں ان سے دس منٹ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگ پھاٹک پر کھڑے رہیے گا، جب میں وہاں سےلوٹ آؤں تو پھر جائیے گا۔“

اس میں کسی کو کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ عرض قبول ہوئی۔

سکریٹری صاحب پولیس کے محکمہ میں بہت روز رہ چکے تھے۔ انسانی کمزوریوں سے واقف تھے۔ وہ سیدھے بازار گئے اور پانچ روپے کی مٹھائی خریدی اس میں اندازہ سے زیادہ خوشبو ڈالنے کا بندو بست کیا۔ نقرئی ورق لگوائے اور ایک دونے میں لیے ہوئے روئے برہمن دیوتا کی پوجا کرنے چلے۔ ایک مٹی کی صراحی میں ٹھنڈا پانی لیا اور اس میں عرق

کیوڑا ملایا دونوں چیزوں سے تیز خوشبو اُڑ رہی تھی۔ خوشبو میں کتنی محرک قوت ہے اسے کون نہیں جانتا۔ اس سے بلا بھوک کے بھوک لگتی ہے پھر بھوکے آدمی کی تو بات ہی کیا ہے؟

پنڈت جی اس وقت بدحواس زمین پر پڑے تھے رات کو کچھ نہیں ملا۔ دس پانچ چھوٹی چھوٹی مٹھائیوں کا کیا شمار؟ دوپہر کو کچھ نہیں ملا اور اس وقت بھی کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ بھوک میں اب اُمید کی بیتابی نہیں۔ مایوسی کا سکون تھا! سارے اعضا سُست پڑ گئے تھے۔ یہاں تک کہ آنکھیں بھی نہ کھلتی تھیں۔ انھیں کھولنے کی بار بار کوشش کرتے مگر وہ خود بخود بند ہوجاتیں۔ ہونٹ خشک ہوگئے تھے۔ زندگی کی کوئی علامت تھی تو بس ان کا آہستہ آہستہ کراہنا! ایسی سخت مصیبت ان پر کبھی نہ پڑی تھی۔ بدہضمی کی شکایت تو انھیں مہینے میں دو چار بار ہوجاتی تھی جسے وہ ہڑ وغیرہ کی پھنکیوں سے دُور کر لیا کرتے تھے۔ مگر بدہضمی میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ انھوں نے غذا ترک کردی ہو۔ اہالیانِ شہر کو۔ امن سبھا کو۔ سرکار کو۔ ایشور کو۔ کانگریس کو اور اپنی اہلیہ کو جی بھر کر کوس چکے تھے کسی سے کوئی اُمید نہ تھی اب اتنی سکت بھی نہ رہی تھی کہ خود کھڑے ہوکر بازار جاسکیں۔ یقین ہوگیا کہ آج رات کو جان ضرور نکل جائے گی۔ زندگی کا دھاگا کوئی رسّی تو ہے نہیں کہ چاہے جتنے جھٹکے دو۔ ٹوٹنے کا نام نہ لے۔

سکریٹری نے پکارا۔ "شاستری جی!"

موٹے رام نے پڑے پڑے آنکھیں کھول دیں اُن میں درد و غم بھرا ہوا تھا۔ جیسے کسی لڑکے کے ہاتھ سے کوا مٹھائی لے گیا ہو۔

سکریٹری نے دونے کی مٹھائی سامنے رکھ دی اور صراحی پر مٹی کا آبخورا رکھ دیا اس کام سے فارغ ہوکر بولے۔ "یہاں کب تک پڑے رہیے گا؟"

خوشبو نے پنڈت جی کے حواس پر امرت کا کام کیا۔ پنڈت جی اُٹھ بیٹھے اور بولے۔ "دیکھو کب تک فیصلہ ہوتا ہے۔"

سکریٹری۔ یہاں کچھ فیصلہ وغیرہ نہ ہوگا۔ آج دن بھر پنچایت ہوا کی۔ کچھ طے نہ ہوا۔ کل کہیں شام کو لاٹ صاحب آویں گے اس وقت تک تو نہ جانے آپ کی کیا حالت ہوگی۔ آپ کا چہرہ بالکل زرد پڑگیا ہے۔

موٹے رام۔ یہیں مرنا بدا ہوگا تو کون ٹال سکتا ہے؟ اس دونے میں قلاقند ہے کیا؟

سکریٹری۔ ہاں طرح طرح کی مٹھائیاں ہیں۔ ایک رشتہ دار کے یہاں باین بھیجنے کو خاص طور پر تیار کرائی ہیں۔

موٹے رام۔ ”جبھی ان میں اتنی خوشبو ہے۔ دونا کھولیے تو۔“

سکریٹری نے مسکراکر دونا کھول دیا تو پنڈت جی آنکھوں سے مٹھائیاں کھانے لگے اندھا آنکھیں پاکر بھی دنیا کو ایسی ہراس انگیز نگاہوں سے نہ دیکھے گا۔ مُنہ میں پانی بھر آیا۔ سکریٹری نے کہا۔”آپ کا برت نہ ہوتا تو دو چار مٹھائیاں آپ کو چکھاتا۔ پانچ روپے سیر کے دام دیے ہیں۔

موٹے رام۔ ”تب تو بہت ہی بڑھیا ہوں گی۔ میں نے بہت دن ہوئے قلاقند نہیں کھائی۔“

سکریٹری۔ ”آپ نے بھی تو بیٹھے بٹھائے جھنجھٹ مول لے لیا۔ جان ہی نہ رہے گی تو روپیہ کس کام آوے گا؟“

موٹے رام۔ ”کیا کروں؟ پھنس گیا۔ میں اتنی مٹھائیوں کا جل پان کرجاتا تھا (ہاتھ سے مٹھائیوں کو ٹٹول کر) بھولا کی دُکان کی ہوں گی؟“

سکریٹری۔ ”چکھیے دو چار۔“

موٹے رام۔ ”کیا چکھوں دھرم سنکٹ میں پڑا ہوں۔“

سکریٹری۔ اجی چکھیے بھی۔ اس وقت جو آنند ملے گا وہ لاکھ روپے میں بھی نہیں مل سکتا کوئی کسی سے کہنے جاتا ہے کیا؟

موٹے رام۔ ”مجھے ڈر کس کا ہے؟ میں یہاں دانہ پانی بنا مَر رہا ہوں اور کسی کو پرواہ ہی نہیں ہے تو پھر مجھے کیا ڈر؟ لاؤ ادھر دونا بڑھاؤ۔ جاؤ سب سے کہہ دینا کہ شاستری جی نے برت توڑ دیا۔ بھاڑ میں جائے بازار اور بیوپار! یہاں کسی کی پرواہ نہیں۔ جب کسی میں دھرم نہیں رہا تو میں نے ہی دھرم کا بیڑا تھوڑے ہی اُٹھایا ہے۔“

یہ کہہ کر پنڈت جی نے دونا اپنی طرف کھینچ لیا اور لگے بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارنے۔ یہاں تک کہ ایک لمحہ میں نصف دونا ختم ہوگیا۔ سیٹھ لوگ آکر پھاٹک پر کھڑے تھے۔ سکریٹری نے جاکر کہا۔ ذرا تماشا دیکھیے۔ آپ لوگوں کو نہ بازار کھولنا پڑے گا نہ خوشامد کرنی پڑے گی۔ میں نے ساری مشکلیں حل کردیں۔ یہ کانگریس کا اقبال ہے۔

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ لوگوں نے آکر دیکھا کہ پنڈت جی مٹھائی ٹھکانے لگانے میں ویسے ہی محو ہیں۔ جیسے کوئی مہاتما سمادھی میں محو ہو!

بھوندو مل نے کہا پنڈت جی کے چرن چُھوتا ہوں۔ ہم لوگ تو آہی رہے تھے آپ نے کیوں جلدی کی؟ ایسی ترکیب بتاتے کہ آپ کا برت بھی نہ ٹوٹتا اور کام بھی پورا ہو جاتا۔

موٹے رام۔ ”میرا کام پورا ہوگیا۔ یہ سُرگ کا آنند ہے جو دھن کے ڈھیروں سے نہیں مل سکتا .... اگر کچھ شردھا (اعتقاد) ہو تو اسی دُکان کی اتنی مٹھائی اور منگوا دو۔[1]

---

[1] ہم یہ کہنا بھول گئے کہ سکریٹری صاحب کو میدان میں آتے وقت پولیس کے سپاہی کو ۴ر پیسے دینے پڑے تھے۔ یہ خلافِ قاعدہ تھا۔ لیکن سکریٹری نے اس بات پر اڑنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

یہ افسانہ پہلی بار ماہنامہ 'مادھوری' میں دسمبر 1923 میں شائع ہوا۔ اردو میں یہ 'خاکِ پروانہ' اور ہندی میں مان سرو ور 3 میں شامل ہے۔

سیلانی بندر

جیون داس نام کا ایک غریب مداری اپنے بندر مٹو کو نچا کر اپنی جیوکا چلایا کرتا تھا۔ وہ اور اس کی استری بڑھیا دونوں ہی مٹو کو بہت پیار کرتے تھے۔ ان کے کوئی سنتان نہ تھی، مٹو ہی ان کے سنیہ (پیار) اور پریم کا پاتر تھا۔ دونوں اُسے اپنے ساتھ کھانا کھلاتے اور اپنے ساتھ سلاتے تھے۔ ان کی دِرشٹی میں مٹو سے اَدِھک پریے کوئی وَستو نہ تھی۔ جیون داس اس کے لیے ایک گیند لایا تھا۔ مٹو آنگن میں گیند کھیلا کرتا تھا۔ اس کے بھوجن کرنے کو ایک مٹی کا پیالہ تھا، اوڑھنے کو کمبل کا ایک ٹکڑا، سونے کو ایک بوریا، اور اُچکنے کے لیے چھپّر میں ایک رسّی۔ مٹو ان وَستوؤں پر جان دیتا تھا۔ جب تک اس کے پیالے میں کوئی چیز نہ رکھ دی جائے وہ بھوجن نہ کرتا تھا۔ اپنا ٹاٹ اور کمبل کا ٹکڑا اُسے شال اور گدّے سے بھی پیارا تھا۔ اس کے دن بڑے سکھ سے بیتے تھے۔ وہ پراتہ کال (صبح) روٹیاں کھاکر مداری کے ساتھ تماشا کرنے جاتا تھا۔ وہ نقلیں کرنے میں اتنا نِپُن (درست) تھا کہ درشک ورند (ناظرین) تماشا دیکھ کر مگدھ (خوش) ہوجاتے تھے۔ لکڑی ہاتھ میں لے کر وردھوں (بوڑھوں) کی بھانتی چلتا۔ آسن مار کر پوجا کرتا، تلک، مدُرا لگاتا، پھر پوتھی بغل میں دبا کر پاٹھ کرنے چلتا۔ ڈھول بجاکر گانے کی نقل اتنی منوہر تھی کہ درشک لوگ لوٹ پوٹ ہوجاتے تھے۔ تماشا ختم ہوجانے پر وہ سب کو سلام کرتا تھا۔ لوگوں کے پیر پکڑ کر پیسے وصول کرتا تھا۔ مٹو کا کٹورا پیسوں سے بھرجاتا تھا۔ اس کے اُپرانت (بعد) کوئی مٹو کو ایک امرود کھلا دیتا، کوئی اس کے سامنے مٹھائی پھینک دیتا۔ لڑکوں کا تو اسے دیکھنے سے جی ہی نہ بھرتا تھا۔ وہ اپنے اپنے گھر سے دوڑ دوڑ کر روٹیاں لاتے اور اُسے کھلاتے تھے۔ محلّے کے لوگوں کے لیے بھی مٹو منورنجن (تفریح) کی ایک سامگری (چیز) تھا۔ جب وہ گھر پر رہتا تو ایک نہ ایک آدمی آکر اس سے کھیلتا رہتا۔ خونچے والے پھیری کرتے ہوئے اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ جو بِنا دیے نکل جانے کی چیشٹا کرتا اُس سے بھی مٹو پیر پکڑ کر وصول کرلیا کرتا تھا، کیونکہ گھر پر وہ کھلا رہتا تھا۔ مٹو کو اگر چڑ تھی تو کتّوں سے۔ اس کے مارے ادھر

سے کوئی کتا نہ نکلنے پاتا تھا اور یدی کوئی آجاتا تو مٹّو اُوشئے ہی دوچار کنٹھیاں اور جھانپڑ لگاتا تھا۔ اس کے سروپریئے (ہردلعزیز) ہونے کا یہ ایک اور کارن تھا۔ دن کو کبھی کبھی بڑھیا دھوپ میں لیٹ جاتی، تو مٹّو اس کے سر کی جوئیں نکالتا اور وہ اسے گانا سناتی۔ وہ جہاں کہیں جاتی تھی وہاں مٹو اس کے پیچھے پیچھے جاتا تھا۔ ماتا اور پتروں میں بھی اس سے ادھک پریم نہ ہوسکتا تھا۔

(۲)

ایک دن مٹّو کے جی میں آیا کہ چل کر کہیں پھل کھانا چاہیے۔ پھل کھانے کو ملتے تو تھے پر ورکشوں پر چڑھ کر ڈالیوں پر اُچکنے، کچھ کھانے اور کچھ گرانے میں کچھ اور ہی مزہ تھا۔ بندر ونود شیل (مزاحیہ) ہوتے ہی ہیں اور مٹو میں اس کی ماترا (مقدار) کچھ اُدِھک تھی بھی۔ کبھی پکڑ دھکڑ اور مارپیٹ کی نوبت نہ آئی تھی۔ پیڑوں پر چڑھ کر پھل کھانا اُس کو سوبھاوِک (فطری) جان پڑتا تھا۔ یہ نہ جانتا تھا کہ وہاں پراکرتک وستوؤں پر بھی کسی نہ کسی کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ جل وایو اور پرکاش پر بھی لوگوں نے ادھیکار جمارکھا ہے۔ پھر باغ بغیچے کا تو کہنا ہی کیا۔ دوپہر کو جب جیون داس تماشا دکھا کر لوٹا تو مٹو لمبا ہوا۔ وہ یوں بھی محلے میں چلا جایا کرتا تھا، اس لیے کسی کو سندیہہ (شبہ) نہ ہوا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ ادھر وہ گھومتا گھامتا کھپریلوں پر اچھلتا کودتا ایک بغیچے میں جا پہنچا۔ دیکھا تو پھلوں سے پیڑ لدے ہوئے ہیں۔ آونلے، کٹھل، لیچی، آم، پپیتے وغیرہ لٹکتے دیکھ کر اس کا چت پرسن ہوگیا۔ مانو وہ ورکش اسے اپنی اُور بلا رہے تھے کہ کھاؤ۔ جہاں تک کھایا جائے، یہاں کسی کی روک ٹوک نہیں ہے، تُرنت ایک چھلانگ مار کر وہ چہاردیواری پر چڑھ گیا۔ دوسری چھلانگ میں پیڑوں پر جا پہنچا، کچھ آم کھائے کچھ لیچیاں کھائیں۔ خوش ہو ہوکر گٹھلیاں ادھر اُدھر پھینکنا شروع کیا۔ پھر سب سے اونچی ڈال پر جا پہنچا اور ڈالیوں کو ہلانے لگا۔ پکے آم زمین پر بچھ گئے۔ کھڑکھڑاہٹ ہوئی تو مالی دوپہر کی نیند سے چونکا اور مٹّو کو دیکھتے ہی اسے پتھروں سے مارنے لگا۔ پر یا تو پتھر اس کے پاس تک پہنچتے ہی نہ تھے یا وہ سر اور شریر ہلاکر پتھروں کو بچا جاتا تھا۔ بیچ بیچ میں باغبان کو دانت نکال کر ڈراتا بھی تھا۔ کبھی منہ بنا کر اُسے کاٹنے کی دھمکی بھی دیتا تھا۔ مالی بندر۔ گھڑکیوں سے ڈر کر بھاگتا تھا اور پھر پتھر لے کر آجاتا تھا۔ یہ کوتک دیکھ کر محلے کے بالک جمع ہوگئے اور شور مچانے لگے۔

او بندروا لولیائے، بال اکھاڑوں ٹوئے ٹائے

او بندر تیرا منہ ہے لال، پچکے چپکے تیرے گال

مرگئی نانی بندر کی

ٹوٹی ٹانگ مچھندر کی

منّو کو اس شور غل میں بڑا آنند آرہا تھا۔ وہ آدھے پھل کھاکھا کر نیچے گراتا تھا اور لڑکے لپک لپک کر چن لیتے اور تالیاں بجا بجا کر کہتے تھے۔

بندر ماموں اور

کہاں تمھارا ٹھور

مالی نے جب دیکھا کہ یہ وِپلو شانت (ختم) ہونے نہیں آتا تو جاکر اپنے سوامی کو خبر دی۔ وہ حضرت پولیس وبھاگ کے کرمچاری تھے۔ سنتے ہی جامے سے باہر ہوگئے۔ بندر کی اتنی مجال کہ میرے بغیچہ میں آکر اودھم مچاوے۔ بنگلے کا کرایہ میں دیتا ہوں، کچھ بندر نہیں دیتا۔ یہاں کتنے ہی اسہیوگیوں کو لدوا دیا، اخبار والے میرے نام سے کانپتے ہیں، بندر کی کیا ہستی ہے! ترنت بندوق اُٹھائی اور بغیچہ میں آپہنچے۔ دیکھا منّو ایک پیڑ کو زور زور سے ہلا رہا ہے۔ لال ہوگئے اور اس کی طرف بندوق تانی۔ بندوق دیکھتے ہی منو کے ہوش اُڑ گئے۔ اس پر آج تک کسی نے بندوق نہیں تانی تھی۔ پر اس نے بندوق کی آواز سنی تھی، چڑیا کو مارے جاتے دیکھا تھا اور نہ دیکھا ہوتا تو بھی بندوق سے اسے سوبھاوِک بھے ہوتا۔ پشو بدھی اپنے شترؤں سے سُوتہ (خود) سشنک (مشتبہ) ہوجاتی ہے۔ منّو کے پانوں مانو سُن ہوگئے۔ وہ اچھل کر کسی دوسرے ورکش پر بھی نہ جاسکا۔ اسی ڈال پر دُبک کر بیٹھ گیا۔ صاحب کو اس کی یہ کلا پسند آئی، دیا آگئی۔ مالی کو بھیجا، جاکر بندر کو پکڑ لا۔ مالی دل میں تو ڈرا، پر صاحب کے غصّے کو جانتا تھا چپکے سے ورکش پر چڑھ گیا اور حضرت بندر کو ایک رسّی میں باندھ لایا۔ منو صاحب کے برآمدے میں ایک کھمبے سے باندھ دیا گیا۔ اس کی سوچھند تا (خودمختاری) کا انت ہوگیا۔ سندھیہ تک وہی پڑا کرون (دردبھری) سُور میں کوں کوں کرتا رہا۔ سانجھ ہوگئی تو ایک نوکر اس کے سامنے ایک مٹھی چنے ڈال گیا۔ اب منّو کو اپنی استھیتی (حالت) کے پرورتن (تبدیلی) کا گیان (علم) ہوا۔ نہ کمبل، نہ ٹاٹ زمین پر پڑا سو رہا تھا۔ چنے اس نے چھوئے بھی نہیں پچھتا رہا تھا کہ کہاں سے کہاں پھل کھانے نکلا۔ مداری کا

پریم یاد آیا، بے چارہ مجھے کھوجتا پھرتا ہوگا۔ مدارن پیالے میں روٹی اور دودھ لیے مجھے مَنو مَنو پکار رہی ہوگی، ہا ...... وپتی (مصیبت) تونے مجھے کہاں لاکر چھوڑا۔ رات بھر وہ جاگتا اور بار بار کھمبے کے چکر لگاتا رہا۔ صاحب کا کتا ٹامی بار بار ڈراتا اور بھونکتا تھا۔ مَنو کو اس پر ایسا کرودھ آتا تھا کہ پاؤں تو مارے چتو کے چوندھیا دوں پر کتا نکٹ نہ آتا دور ہی سے گرج کر رہ جاتا۔

رات گزری تو صاحب نے آکر مَنو کو دو تین ٹھوکریں جمائیں، سُور رات بھر چلا چلا کر نیند حرام کردی۔ آنکھ تک نہ لگی بچہ آج بھی تم نے غل مچایا تو گولی ماردوں گا۔ یہ کہہ کر وہ تو چلے گئے۔ اب نٹ کھٹ لڑکوں کی باری آئی۔ کچھ گھر کے اور کچھ باہر کے لڑکے جمع ہوگئے۔ کوئی مَنو کو منہ چڑاتا، کوئی اس پر پتھر پھینکتا اور کوئی اس کو مٹھائی دکھا کر للچاتا تھا۔ کوئی اس کا رکشک (محافظ) نہ تھا، کسی کو اس پر دیا نہ آتی تھی۔ آتم رکشا (جان کے تحفظ) کی جتنی کریائیں (ترکیبیں) اسے معلوم تھیں، سب کرکے ہار گیا۔ پرنام کیا، پوجا پاٹھ کیا لیکن اس کا اُپہار (تحفہ) یہی ملا کہ لڑکوں نے اسے اور بھی دق کرنا شروع کیا۔ آج کسی نے بھی اس کے سامنے چنے بھی نہ ڈالے۔ اور یدی ڈالے بھی ہوتے تو وہ کھا نہ سکتا۔ شوک نے بھوجن کی اِچھا نہ رکھی تھی۔

سندھیا سمے مداری پتہ لگاتا صاحب کے گھر پہنچا مَنو اُسے دیکھتے ہی ایسا اُدھیر (بے قابو) ہوا مانو زنجیر توڑ ڈالے گا کھمبے کو گرا دے گا۔ مداری نے جاکر مَنو کو گلے سے لگا لیا اور صاحب سے بولا۔ حضور بھول چوک تو آدمی سے ہوجاتی ہے یہ تو پشو ہے۔ مجھے چاہے جو سزا دیجیے پر اسے چھوڑ دیجیے۔ سرکار یہی میری روٹیوں کا سہارا ہے۔ اس کے بنا ہم دو پرانی (آدمی) بھوکھو مرجائیں گے۔ اِسے ہم نے لڑکے کی طرح پالا ہے۔ جب سے یہ بھاگا ہے مدارن نے دانہ پانی چھوڑ دیا ہے۔ اتنی دَیا کیجیے سرکار آپ کا اقبال سدا روشن رہے، اس سے بھی بڑا عہدہ ملے، قلم چاک ہو، مدعی بے باک ہو۔ آپ ہیں سپوت، سدا رہیں مضبوط۔ آپ کے بیری کو دابے بھوت۔ مگر صاحب نے دیا کا پاٹھ نہ پڑھا۔ گھڑک کر بولے، چپ رہ پاجی، ٹیں ٹیں کرکے دماغ چاٹ گیا بچہ، بندر چھوڑ کر باغ کا ستیا ناس کرا ڈالا۔ اب خوش آمد کرتے چلے ہو۔ جاکر دیکھ تو اِس نے کتنے پھل خراب کردیے۔ اگر اُسے لے جانا چاہتا ہے تو دس روپیہ لاکر میری نذر کر، نہیں تو چپکے سے اپنی راہ پکڑ۔ یہ یا تو

یہی بندھے بندھے مر جائے گا یا کوئی اتنے دام دے کر اسے لے جائے گا۔

مداری نراش (ناامید) ہو کر چلا گیا، دس روپیہ کہاں سے لاتا؟ بڑھیا سے جاکر حال کہا۔ بڑھیا کو اپنی ترس پیدا کرنے کی شکتی پر زیادہ بھروسا تھا۔ بولی۔ بس دیکھ لی تمھاری کرتوت، جاکر لاٹھی سی ماری ہوگی۔ حاکموں سے بڑے داؤں پیچ کی باتیں کی جاتی ہیں تب کہیں جاکر وہ پسیجتے ہیں۔ چلو میرے ساتھ، دیکھو چھڑا لاتی ہوں کہ نہیں۔ یہ کہہ کر اس نے مُنّو کا سب سامان ایک گٹھری میں باندھا اور مداری کے ساتھ صاحب کے پاس آئی۔ مُنّو اب کے اتنے زور سے اُچھلا کہ کھمبا ہل اُٹھا۔ بدھیا نے کہا۔ "سرکار ہم آپ کے دوار پر بھیک مانگنے آئے ہیں یہ بندر ہم کو دان دے دیجیے۔

صاحب۔ ہمیں دان دینا پاپ سمجھتے ہیں۔

مدارن۔ ہم دیس دیس گھومتے ہیں۔ آپ کا جس۔ گاویں گے۔

صاحب۔ ہم جس کی چاہ یا پرواہ نہیں ہے۔

مدارن۔ بھگوان آپ کو اس کا پھل دیں گے۔

صاحب۔ میں نہیں جانتا بھگوان کون بلا ہے۔

مدارن۔ مہاراج چھما (معافی) کی بڑی مہما ہے۔

صاحب۔ ہمارے یہاں سب سے بڑی مہا ڈنڈ (سزا) کی ہے۔

مدارن۔ حضور آپ حاکم ہیں۔ حاکموں کا کام ہے نیائے (انصاف) کرنا۔ پھلوں کے پیچھے دو آدمیوں کی جان نہ لیجیے۔ نیائے ہی سے حاکم کی بڑائی ہوتی ہے۔

صاحب۔ ہماری بڑائی چھما اور نیائے سے نہیں ہے اور نہ نیائے کرنا ہمارا کام ہے، ہمارا کام ہے موج کرنا۔

بدھیا کی ایک بھی ٹکتی اس اہنکار مورتی (گھمنڈی مجسمے) کے سامنے نہ چلی۔ انت کو نراش ہو کر وہ بولی۔ حضور اتنا حکم تو دیدیں کہ یہ چیزیں بندر کے پاس رکھ دوں۔ ان پر یہ جان دیتا ہے۔

صاحب۔ میرے یہاں یہ کوڑا کرکٹ رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ آخر بدھیا ہتاش (ناامید) ہو کر چلی گئی۔

(۳)

ٹامی نے دیکھا کہ منّو کچھ بولتا نہیں تو شیر ہوگیا۔ بھونکتا بھونکتا منو کے پاس چلا آیا۔ منو نے لپک کر اس کے دونوں کان پکڑ لیے اور اتنے تماچے لگائے کہ اُسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ اس کی چلاّہٹ سن کر صاحب کمرے سے باہر نکل آئے اور منوّ کو کئی ٹھوکریں لگائیں۔ نوکر کو آگیا (حکم) دی کہ اس بدمعاش کو تین دن تک کچھ کھانے کو مت دو۔

سنیوگ سے اسی دن ایک سرکس کمپنی کا منیجر صاحب سے تماشا کرنے کی آگیا لینے آیا۔ اس نے منّو کو بندھے، رونی صورت بنائے بیٹھے دیکھا، تو پاس آکر اُسے پچکارا۔ منوّ اچھل کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا، اور اسے سلام کرنے لگا۔ منیجر سمجھ گیا کہ یہ پالتو جانور ہے۔ اُسے اپنے تماشے کے لیے ایک بندر کی ضرورت تھی۔ صاحب سے بات چیت کی۔ اس کا اُچت (مناسب) مولیہ دیا، اور اپنے ساتھ لے گیا۔ کنتو منو کو شیگھر (جلد) ہی وِدِت (جان گیا) ہوگیا کہ یہاں میں اور بھی بُرا پھنسا۔ منیجر نے اسے بندروں کے رکھوالے کو سونپ دیا۔ رکھوالا بڑا نِشٹھُر (بے رحم) اور کرور پرکرتی (بری عادت) کا پرانی تھا۔ اس کے ادھین (پاس) اور بھی کئی بندر تھے۔ سبھی اس کے ہاتھوں کشٹ بھوگ رہے تھے۔ وہ ان کے بھوجن کی سامگری (چیزیں) خود کھا جاتا تھا۔ انیہ (دوسرے) بندروں نے منّو کا سہرش (خوشی سے) سواگت نہیں کیا۔ اس کے آنے سے ان میں بڑا کولاہل مچا۔ اگر رکھوالے نے اسے الگ نہ کردیا ہوتا تو وہ سب اسے نوچ کر کھا جاتے۔ منّو کو اب نئی وِدِھیا (طور طریقے) سیکھنی پڑی۔ پیرگاڑی پر چڑھنا۔ دوڑتے گھوڑے کی پیٹھ پر دو ٹانگوں سے کھڑے ہوکر جانا، پتلی رسّی پر چلنا اِتیادی (وغیرہ) بڑی ہی کشٹ پرد (دُکھ بھری) سادھنائیں (تپسیا) تھیں۔ منوّ کو یہ سب کوشل (کرتب) سیکھنے میں بہت مار کھانی پڑتی۔ ذرا بھی چونکتا تو پیٹھ پر ڈنڈا پڑجاتا۔ اس سے ادھک کشٹ کی بات یہ تھی کہ اُسے دن بھر ایک کٹھ گھرے میں بند رکھا جاتا تھا۔ جس میں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ مداری کے یہاں بھی اسے تماشا ہی دکھانا پڑتا تھا کنتو اُس تماشے اور اِس تماشے میں بڑا انتر تھا۔ کہاں وہ مداری کی میٹھی میٹھی باتیں، اس کا دُلار اور پیار اور کہاں یہ کاراواس اور ڈنڈوں کی مار۔ یہ کام سیکھنے میں اسے اس لیے اور بھی دیر لگتی تھی کہ وہ ابھی تک جیون داس کے پاس بھاگ جانے کے وچار کو بھولا نہ تھا۔ نِتہ (روز) اسی تاک میں رہتا کہ موقع پاؤں اور نکل جاؤں۔ لیکن وہاں جانوروں پر بڑی کڑی

نگاہ رکھی جاتی تھی۔ باہر کی ہوا تک نہ ملتی تھی، بھاگنے کی تو بات ہی کیا! کام لینے والے تو سب تھے، مگر بھوجن کی خبر لینے والا کوئی بھی نہ تھا۔ صاحب کی قید سے تو منو جلد ہی چھوٹ گیا تھا۔ لیکن اس قید میں تین مہینے بیت گئے۔ شریر گھل گیا۔ نِتہ چِنتا گھیرے رہتی تھی پر بھاگنے کا کوئی ٹھیک ٹھکانا نہ تھا۔ جی چاہے یا نہ چاہے، اُسے کام اَوشئے کرنا پڑتا تھا۔ سوامی کو پیسوں سے کام تھا۔ وہ جیے چاہے مرے۔

سنیوگ وش (اتفاقاً) ایک دن سرکس کے پنڈال میں آگ لگ گئی۔ سرکس کے نوکر چاکر سب جواری تھے۔ دن بھر جوا کھیلتے، شراب پیتے اور لڑائی جھگڑا کرتے تھے۔ انھیں جھنجھٹوں میں ایکا ایک گیس کی نلی پھٹ گئی۔ ہاہاکار مچ گیا۔ درشک وِرند (ناظرین) جان لے کر بھاگے کمپنی کے کرمچاری اپنی چیزیں نکالنے لگے۔ پشوؤں کی کسی کو خبر نہ رہی۔ سرکس میں بڑے بڑے بھینکر جیو جنتو (جانور) تماشا کرتے تھے۔ دو شیر کئی چیتے، ایک ہاتھی، ایک ریچھ تھا۔ کتّوں، گھوڑوں اور بندروں کی سنکھیا (تعداد) تو اس سے کہیں ادھک تھی۔ کمپنی دھن کمانے کے لیے اپنے نوکروں کی جان کو کوئی چیز نہیں سمجھتی تھی۔ یہ سب کے سب جیو اس سمئے تماشے کے لیے کھولے گئے تھے۔ آگ لگتے ہی وہ چلا چلا کر بھاگے۔ منو بھی بھاگ کھڑا ہوا۔ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا کہ پنڈال جلا یا بچا۔

منّو کودتا، پھاندتا سیدھے اسی گھر پہنچا، جہاں جیون داس رہتا تھا۔ لیکن دوار بند تھا۔ کھپریل پر چڑھ کر وہ گھر میں گھس گیا۔ مگر کسی آدمی کا چِنہ (نشان) نہیں ملا۔ وہ استھان جہاں وہ سوتا تھا اور جسے بدھیا گوبر سے لیپ کر صاف رکھا کرتی تھی اب گھاس پاس سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ لکڑی جس پر چڑھ کر وہ کودا کرتا تھا دیمکوں نے کھا لی تھی۔ محلے والے اسے دیکھتے ہی پہچان گئے۔ شور مچ گیا منّو آیا، منّو آیا۔

منّو اس دن سے روز سندھیا کے سمئے اسی گھر میں آجاتا اور اپنے پُرانے استھان پر لیٹ رہتا۔ وہ دن بھر محلے میں گھوما کرتا تھا، کوئی کچھ دے دیتا تو کھا لیتا تھا مگر کسی کی کوئی چیز نہیں چھوتا تھا۔ اسے اب بھی آشا تھی کہ میرا سوامی یہاں مجھے اوشئے ملے گا۔ رات کو اس کے کراہنے کی کرون دھونی (پُردرد آواز) سنائی دیتی تھی۔ اس کی دینتا (بُری حالت) پر دیکھنے والوں کی آنکھوں سے آنسوں نکل پڑتے تھے۔

اس پرکار کئی مہینے بیت گئے۔ ایک دن منّو گلی میں بیٹھا ہوا تھا اتنے میں لڑکوں کا شور

سنائی دیا۔ اس نے دیکھا ایک بڑھیا ننگے سر، ننگے بدن۔ ایک چیتھڑا کمر میں لپیٹے، سر کے بال چھٹکائے بھتنیوں کی طرح چلی آرہی ہے اور کئی لڑکے اس کے پیچھے پتھر پھینکتے پگلی نانی، پگلی نانی، کی ہانک لگاتے، تالیاں بجاتے چلے آرہے ہیں۔ وہ رہ رہ کر رُک جاتی ہے اور لڑکوں سے کہتی ہے "میں پگلی نہیں ہوں مجھے پگلی کیوں کہتے ہو؟" آخر بُڑھیا زمین پر بیٹھ گئی اور بولی بتاؤ مجھے پگلی کیوں کہتے ہو؟ اسے لڑکوں پر لش ماتر بھی کرودھ (غصہ) نہ آتا تھا۔ وہ نہ روتی تھی نہ ہنستی تھی۔ پتھر لگ بھی جاتے تو چپ ہوجاتی تھی۔

ایک لڑکے نے کہا۔ تو کپڑے کیوں نہیں پہنتی؟ تو پاگل نہیں تو اور کیا ہے؟

بڑھیا۔ کپڑے جاڑوں میں سردی سے بچنے کے لیے پہنے جاتے ہیں۔ آجکل تو گرمی ہے۔

لڑکا۔ تجھے شرم نہیں آتی؟

بڑھیا۔ شرم کسے کہتے ہیں بیٹا، اتنے سادھو سنیاسی ننگے رہتے ہیں، ان کو پتھر سے کیوں نہیں مارتے۔

لڑکا۔ وہ تو مرد ہیں۔

بڑھیا۔ کیا شرم عورتوں ہی کے لیے ہے مردوں کو شرم نہیں آنی چاہے؟

لڑکا۔ تجھے جو کوئی جو کچھ دیتا ہے اسے تو کھالیتی ہے۔ تو پاگل نہیں تو اور کیا ہے؟

بڑھیا۔ اس میں پاگل پن کی کیا بات ہے بیٹا؟ بھوک لگتی ہے پیٹ بھر لیتی ہوں۔

لڑکا۔ تجھے کچھ وچار نہیں کسی کے ہاتھ کی چیز کھاتے گھن نہیں آتی؟

بڑھیا۔ گھن کسے کہتے ہیں بیٹا۔ میں بھول گئی۔

لڑکا۔ سبھی کو گھن آتی ہے، کیا بتا دوں گھن کسے کہتے ہیں۔

دوسرا لڑکا۔ تو پیسے کیوں ہاتھ سے پھینک دیتی ہے؟ کوئی کپڑا دیتا ہے تو کیوں چھوڑ کر چل دیتی ہے؟ پگلی نہیں تو اور کیا ہے؟

بڑھیا۔ پیسے کپڑے لے کر کیا کروں بیٹا؟

لڑکا۔ اور لوگ کیا کرتے ہیں؟ پیسے روپے کا لالچ سبھی کو ہوتا ہے۔

بڑھیا۔ لالچ کسے کہتے ہیں بیٹا، میں بھول گئی؟

لڑکا۔ اسی سے تو تجھے پگلی نانی کہتے ہیں۔ تجھے نہ لوبھ ہے، نہ گھن ہے نہ وچار ہے، نہ لاج ہے۔ ایسوں ہی کو پاگل کہتے ہیں۔

بڑھیا۔ تو یہی کہو میں پگلی ہوں۔

لڑکا۔ تجھے کرودھ کیوں نہیں آتا؟

بڑھیا۔ کیا جانے بیٹا۔ مجھے تو کرودھ نہیں آتا۔ کیا کسی کو کرودھ بھی آتا ہے؟ میں تو بھول گئی۔

کئی لڑکوں نے اس پر پگلی پگلی کا شور مچایا اور بڑھیا اسی طرح شانت بھاؤ سے آگے چلی۔ جب وہ نِکٹ آئی تو مُنو اسے پہچان گیا۔ یہ تو میری بدھیا ہے۔ وہ دوڑ کر اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔ بڑھیا نے چونک کر مُنو کو دیکھا، پہچان گئی۔ اس نے اسے چھاتی سے لگا لیا۔

(۴)

مُنّو کو گود میں لیتے ہی بڑھیا کو انو بھو (احساس) ہوا کہ میں نگن (ننگی) ہوں۔ مارے شرم کے وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ بیٹھ کر ایک لڑکے سے بولی۔ "بیٹا مجھے کچھ پہننے کو دوگے؟"

لڑکا۔ تجھے لاج ہی نہیں آتی نہ۔

بڑھیا۔ نہیں بیٹا اب تو آرہی ہے مجھے نہ جانے کیا ہوگیا تھا۔

لڑکوں نے پھر پگلی پگلی کا شور مچایا۔ تو اس نے پتھر پھینک کر لڑکوں کو مارنا شروع کیا۔ ان کے پیچھے دوڑی۔

ایک لڑکے نے پوچھا۔ ابھی تو تجھے کرودھ نہیں آتا تھا۔ اب کیوں آرہا ہے؟

بڑھیا۔ کیا جانے کیوں اب کرودھ آرہا ہے۔ پھر کسی نے پگلی کہا تو بندر سے کٹوا دوں گی۔

ایک لڑکا دوڑ کر ایک پھٹا ہوا کپڑا لے آیا۔ بدھیا نے وہ کپڑا پہن لیا۔ بال سمیٹ لیے۔ اس کے مکھ پر جو ایک امانُشی آبھا (حیوانیت کی جھلک) تھی اس کی جگہ چنتا کا پیلا پن دکھائی دینے لگا۔ وہ رو رو کر مُنو سے کہنے لگی۔ بیٹا تم کہاں چلے گئے تھے۔ اتنے دن ہوگئے ہماری سدھ نہ لی۔ تمھارا مداری تمھارے ہی ویوگ (جدائی) میں پرلوک سدھارا۔ میں بھکشا مانگ کر اپنا پیٹ پالنے لگی۔ گھر دوار تہس نہس ہوگیا۔ تم تھے تو کھانے کی پہننے کی، گہنے کی، گھر کی اِچھّا (خواہش) تھی تمھارے جاتے ہی سب اِچھائیں لُپت (ختم) ہوگئیں۔ اکیلی بھوک تو ستاتی تھی پر سنسار میں اور کسی بات کی چنتا نہ تھی۔ تمھارا مداری مرا پر میری آنکھوں میں آنسوں نہ آئے۔ وہ کھاٹ پر پڑا کراہتا تھا اور میرا کلیجہ ایسا پتھر ہوگیا تھا کہ اس کی دوا

دارو کی کون کہے، اس کے پاس کھڑی تک نہ ہوتی تھی۔ سوچتی تھی۔ یہ میرا کون ہے۔ اب آج وہ سب باتیں اور اپنی وہ دشا یاد آتی ہے۔ تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں سچ مچ پگلی ہو گئی تھی، اور لڑکوں کا مجھے پگلی نانی کہہ کر چڑھانا ٹھیک ہی تھا۔

یہ کہہ کر بدھیا منّو کو لیے ہوئے شہر کے باہر ایک باغ میں گئی جہاں وہ ایک پیڑ کے نیچے رہتی تھی۔ وہاں تھوڑی سی پوال بچھی ہوئی تھی۔ اِس کے علاوہ مُنشیہ کے بسیرے کا اور کوئی چِنہہ نہ تھا۔

آج سے منّو بدھیا کے پاس رہنے لگا۔ وہ سویرے گھر سے نکل جاتا اور نقلیں کر کے بھیک مانگ کر بدھیا کے کھانے بھر کو اناج یا روٹیاں لے آتا تھا۔ پُتر بھی اگر ہوتا تو وہ بھی اتنے پریم سے ماتا کی سیوا نہ کرتا۔ اس کی نقلوں سے خوش ہو کر لوگ اسے پیسے بھی دیتے تھے۔ ان پیسوں سے بدھیا کھانے کی چیزیں بازار سے لاتی تھی۔

لوگ بدھیا کے پرتی بندر کا یہ پریم دیکھ کر چکت ہو جاتے اور کہتے تھے کہ یہ بندر نہیں کوئی دیوتا ہے۔

یہ افسانہ ماہنامہ مادھوری کے جنوری 1924 کے شمارے میں شائع ہوا گپت دھن 2 میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

نبیؐ کا نیتی نِرواہ

حضرت محمدؐ کو الہام ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے، دس پانچ پڑوسیوں اور نِکٹ سمبندھیوں کے سوا ابھی اور کوئی ان کے دین پر ایمان نہ لایا تھا۔ یہاں تک کہ ان کی لڑکی زینب اور داماد ابوالعاص بھی جن کا وِواہ (شادی) الہام کے پہلے ہی ہوچکا تھا، ابھی تک نئے دھرم میں دیکشت نہ ہوئے تھے۔ زینب کئی بار اپنے میکہ گئی تھی اور اپنے پِتا کے گیان اُپدیش سنے تھے۔ وہ دل سے اسلام پر شردھا (عقیدت) رکھتی تھی، لیکن ابوالعاص کے کارن سے دیکشا لینے کا ساہس نہ کرسکتی تھی۔ ابوالعاص وِچار سواتنتریہ کا (آزادیٔ خیال) سامرتھک تھا۔ وہ کُشل ویاپاری تھا۔ مکہ سے کھجور، میوے آدی لے کر بندرگاہوں کو چالان کیا کرتا تھا۔ بہت ہی ایماندار لین دین کا کھرا، شرم شیل منشیہ (آدمی) تھا جسے اِہلوک (دنیا) سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ پرلوک کی چِنتا کرے۔ زینب کے سامنے کٹھن سمسیا تھی آتما دھرم کی اُور تھی، ہردے پتی کی اُور، نہ دھرم کو چھوڑسکتی تھی نہ پتی کو۔ گھر کے انیہ (دوسرے) پرانی (اشخاص) مورتی پوجک تھے اور اس نئے سمپردائے (فرقہ) کے شترو۔ زینب اپنی لگن کو چھپاتی رہتی، یہاں تک کہ پتی سے بھی اپنی ویتھا (دکھ) نہ کہہ سکتی تھی وہ دھارمک (مذہبی) سہشنتا (حلم) کے دن نہ تھے۔ بات بات پر خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ خاندان کے خاندان مٹ جاتے تھے۔ عرب کی الوکک (معجزاتی) ویرتا پارسپرک (آپسی) کلہوں میں ویکت (ظاہر) ہوتی تھی۔ راجنیتک سنگھٹن کا نام نہ تھا۔ خون کا بدلا خون۔ دھن ہانی کا بدلہ خون۔ اپمان کا بدلا خون۔ مانو رکت ہی سے سبھی جھگڑوں کا نبٹارہ ہوتا تھا۔ ایسی اوستھا (حالت) میں اپنے دھرمانوراگ کو پرکٹ کرنا ابو العاص کے شکتی شالی پریوار کو محمدؐ اور اس کے گنے گنائے انویائیوں (پیروکار) سے ٹکرانا تھا۔ اُدھر پریم کا بندھن پیروں کو جکڑے ہوئے تھا۔ نئے دھرم میں پروِشٹ (داخل) ہونا اپنے پران۔ پریہ پتی سے سدا کے لیے بچھڑ جانا تھا۔ قریش جاتی میں لوگ ایسے مشرت (ملے جلے) وواہوں کو پریوار کے لیے کلنک سمجھتے تھے۔ مایا اور دھرم کی دوِدھا میں پڑی ہوئی زینب کڑھتی رہتی تھی۔

(۳)

دوسرے دن زینب کو جامع مسجد میں یتھا وِدھی (حسبِ طریقہ) کلمہ پڑھایا گیا۔ قریشیوں نے جب یہ خبر پائی تب وہ جل اُٹھے۔ غضب خدا کا۔ اسلام نے تو بڑے بڑے گھروں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ اگر یہی حال رہا تو دھیرے دھیرے اس کی شکتی اتنی بڑھ جائے گی کہ اس کا سامنا کرنا کٹھن ہو جائے گا۔ لوگ ابوالعاص کے گھر پر جمع ہوئے۔ ابوسفیان نے جو اسلام کے شترؤں میں سب سے پر تشٹھت (مشہور) ویکتی تھا (اور جو بعد کو اسلام پر ایمان لایا) ابوالعاص سے کہا تمھیں اپنی بیوی کو طلاق دینا پڑے گی۔

ابوالعاص۔ ہرگز نہیں۔

اُبوسفیان۔ تو کیا تم بھی مسلمان ہو جاؤ گے؟

ابوالعاص۔ ہرگز نہیں۔

اُبوسفیان۔ تو اسے محمدؐ ہی کے گھر رہنا پڑے گا۔

ابوالعاص۔ ہرگز نہیں۔ آپ مجھے آگیا دیجیے کہ اُسے اپنے گھر لاؤں۔

اُبوسفیان۔ ہرگز نہیں۔

ابوالعاص۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ میرے گھر میں رہ کر وہ اپنے متانوسار (مرضی کے مطابق) خدا کی بندگی کرے؟

اُبوسفیان۔ ہرگز نہیں۔

ابوالعاص۔ میری قوم میرے ساتھ اتنی بھی سہانبھوتی (ہمدردی) نہ کرے گی؟

اُبوسفیان۔ ہرگز نہیں۔

ابوالعاص۔ تو پھر آپ لوگ مجھے اپنے سماج سے پتت کردیجیے۔ مجھے پتت ہونا منظور ہے۔ آپ لوگ چاہیں جو سزا دیں وہ سب منظور ہے۔ پر میں اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا۔ میں کسی کی دھارمک سوادھینتا (آزادی) کا اپہرن نہیں کرنا چاہتا۔ وہ بھی اپنی بیوی کی۔

اُبوسفیان۔ قریش میں کیا اور لڑکیاں نہیں ہیں؟

ابوالعاص۔ زینب کی سی کوئی نہیں۔

اُبوسفیان۔ ہم ایسی لڑکیاں بتا سکتے ہیں جو چاند کو لجّت کردیں۔

ابوالعاص۔ میں سوندرّیہ (خوبصورتی) کا اُپاسک (مداح) نہیں۔

اُبوسفیان۔ ایسی لڑکیاں دے سکتا ہوں جو گریہہ پربندھ میں نِپُن ہوں۔ باتیں ایسی کریں جو منہ سے پھول جھڑیں۔ بھوجن ایسا بنائیں جو بیمار کو بھی روچی ہو۔ اور سینے پرونے میں اتنی کُشل کہ پُرانے کپڑے کو نیا کردیں۔

ابوالعاص۔ میں ان گُنوں (خوبیوں) میں سے کسی کا بھی اُپاسک نہیں۔ میں پریم اور کیول پریم کا بھکت ہوں اور مجھے وِشواس ہے کہ زینب کا سا پریم مجھے ساری دنیا میں نہیں مل سکتا۔

اُبوسفیان۔ پریم ہوتا تو تمھیں چھوڑ کر دغا نہ کرتی۔

ابوالعاص۔ میں نہیں چاہتا کہ پریم کے لیے کوئی اپنے آتم سوانتریہ (ذاتی آزادی) کا تیاگ کرے۔

اُبوسفیان۔ اس کا آشئے یہ ہے کہ تم سماج میں سماج کے ورودھی بن کر رہنا چاہتے ہو۔ اپنی آنکھوں کی قسم، سماج اپنے اوپر یہ اتیاچار نہ ہونے دے گا۔ میں سمجھائے جاتا ہوں۔ نہ مانوگے تو روؤگے۔

(۴)

اُبوسفیان اور ان کی ٹولی کے لوگ تو دھمکیاں دے کر اُدھر گئے۔ اِدھر ابوالعاص نے لکڑی سنبھالی اور سسرال جا پہنچے۔ شام ہوگئی تھی۔ حضرتؐ اپنے مریدوں کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوالعاص نے انھیں سلام کیا اور جب تک نماز ہوتی رہی، غور سے دیکھتے رہے۔ آدمیوں کی قطاروں کا ایک ساتھ اُٹھنا بیٹھنا اور سجدے کرنا دیکھ کر ان کے دل پر گہرا پربھاؤ پڑ رہا تھا۔ وہ اگیات بھاؤ (نامعلوم جذبے) سے سنگت (مجمع) کے ساتھ بیٹھتے جھکتے اور کھڑے ہوجاتے تھے۔ وہاں ایک ایک پرمانوں اس سمے (وقت) ایشورمے (محوِ خدا) ہو رہا تھا۔ ایک چھن (لمحہ) کے لیے ابوالعاص بھی اسی بھکتی پرواہ میں آگئے۔

جب نماز ختم ہوگئی تو ابوالعاص نے حضرتؐ سے کہا۔ میں زینب کو وداع کرانے آیا ہوں۔

حضرتؐ نے وِسمِت (حیران) ہوکر کہا۔ تمھیں معلوم نہیں کہ وہ خدا اور رسول پر ایمان لاچکی ہے؟

(۳)

دوسرے دن زینب کو جامع مسجد میں یتھا وِدھی (حسبِ طریقہ) کلمہ پڑھایا گیا۔ قریشیوں نے جب یہ خبر پائی تب وہ جل اُٹھے۔ غضب خدا کا۔ اسلام نے تو بڑے بڑے گھروں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ اگر یہی حال رہا تو دھیرے دھیرے اس کی شکتی اتنی بڑھ جائے گی کہ اس کا سامنا کرنا کٹھن ہو جائے گا۔ لوگ ابوالعاص کے گھر پر جمع ہوئے۔ ابوسفیان نے جو اسلام کے شترؤں میں سب سے پر تشٹھت (مشہور) ویکتی تھا (اور جو بعد کو اسلام پر ایمان لایا) ابوالعاص سے کہا تمھیں اپنی بیوی کو طلاق دینا پڑے گی۔

ابوالعاص۔ ہرگز نہیں۔

اُبوسفیان۔ تو کیا تم بھی مسلمان ہو جاؤ گے؟

ابوالعاص۔ ہرگز نہیں۔

اُبوسفیان۔ تو اسے محمدؐ ہی کے گھر رہنا پڑے گا۔

ابوالعاص۔ ہرگز نہیں۔ آپ مجھے آگیا دیجیے کہ اُسے اپنے گھر لاؤں۔

اُبوسفیان۔ ہرگز نہیں۔

ابوالعاص۔ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ میرے گھر میں رہ کر وہ اپنے متانوسار (مرضی کے مطابق) خدا کی بندگی کرے؟

اُبوسفیان۔ ہرگز نہیں۔

ابوالعاص۔ میری قوم میرے ساتھ اتنی بھی سہانبھوتی (ہمدردی) نہ کرے گی؟

اُبوسفیان۔ ہرگز نہیں۔

ابوالعاص۔ تو پھر آپ لوگ مجھے اپنے سماج سے پتت کردیجیے۔ مجھے پتت ہونا منظور ہے۔ آپ لوگ چاہیں جو سزا دیں وہ سب منظور ہے۔ پر میں اپنی بیوی کو طلاق نہیں دے سکتا۔ میں کسی کی دھارمک سوادھینتا (آزادی) کا اپہرن نہیں کرنا چاہتا۔ وہ بھی اپنی بیوی کی۔

اُبوسفیان۔ قریش میں کیا اور لڑکیاں نہیں ہیں؟

ابوالعاص۔ زینب کی سی کوئی نہیں۔

اُبوسفیان۔ ہم ایسی لڑکیاں بتا سکتے ہیں جو چاند کو لجّت کردیں۔

ابوالعاص۔ میں سوندریہ (خوبصورتی) کا اُپاسک (مداح) نہیں۔

اُبوسفیان۔ ایسی لڑکیاں دے سکتا ہوں جو گریہہ پربندھ میں نپُن ہوں۔ باتیں ایسی کریں جو منہ سے پھول جھڑیں۔ بھوجن ایسا بنائیں جو بیمار کو بھی روچی ہو۔ اور سینے پرونے میں اتنی کُشل کہ پُرانے کپڑے کو نیا کردیں۔

ابوالعاص۔ میں ان گنوں (خوبیوں) میں سے کسی کا بھی اُپاسک نہیں۔ میں پریم اور کیول پریم کا بھکت ہوں اور مجھے وِشواس ہے کہ زینب کا سا پریم مجھے ساری دنیا میں نہیں مل سکتا۔

اُبوسفیان۔ پریم ہوتا تو تمھیں چھوڑ کر دغا نہ کرتی۔

ابوالعاص۔ میں نہیں چاہتا کہ پریم کے لیے کوئی اپنے آتم سوانتریہ (ذاتی آزادی) کا تیاگ کرے۔

اُبوسفیان۔ اس کا آشئے یہ ہے کہ تم سماج میں سماج کے وِرودھی بن کر رہنا چاہتے ہو۔ اپنی آنکھوں کی قسم، سماج اپنے اوپر یہ اتیاچار نہ ہونے دے گا۔ میں سمجھائے جاتا ہوں۔ نہ مانوگے تو روؤگے۔

(۴)

اُبوسفیان اور ان کی ٹولی کے لوگ تو دھمکیاں دے کر اُدھر گئے۔ اِدھر ابوالعاص نے لکڑی سنبھالی اور سسرال جا پہنچے۔ شام ہوگئی تھی۔ حضرتؐ اپنے مریدوں کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ ابوالعاص نے انھیں سلام کیا اور جب تک نماز ہوتی رہی، غور سے دیکھتے رہے۔ آدمیوں کی قطاروں کا ایک ساتھ اُٹھنا بیٹھنا اور سجدے کرنا دیکھ کر ان کے دل پر گہرا پربھاؤ پڑ رہا تھا۔ وہ اگیات بھاؤ (نامعلوم جذبے) سے سنگت (مجمع) کے ساتھ بیٹھتے جھکتے اور کھڑے ہوجاتے تھے۔ وہاں ایک ایک پرمانوں اس سمے (وقت) ایشورمے (محوِ خدا) ہو رہا تھا۔ ایک چھن (لمحہ) کے لیے ابوالعاص بھی اسی بھکتی پرواہ میں آگئے۔

جب نماز ختم ہوگئی تو ابوالعاص نے حضرتؐ سے کہا۔ میں زینب کو وداع کرانے آیا ہوں۔

حضرتؐ نے وِسمِت (حیران) ہوکر کہا۔ تمھیں معلوم نہیں کہ وہ خدا اور رسول پر ایمان لاچکی ہے؟

ابوالعاص۔ جی ہاں معلوم ہے۔

حضرتؑ۔ اسلام ایسے سمبندھوں کا نشیدھ (مناہی) کرتا ہے۔

ابوالعاص۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ زینب نے مجھے طلاق دے دیا۔

حضرتؑ۔ اگر یہی مطلب ہو تو؟

ابوالعاص۔ تو کچھ نہیں، زینب کو خدا اور رسول کی بندگی مبارک ہو۔ میں ایک بار اس سے مل کر گھر چلا جاؤں گا، اور پھر کبھی آپ کو اپنی صورت نہ دکھاؤں گا۔ لیکن اُس دشا میں اگر قریش جاتی آپ سے لڑنے کے لیے تیار ہوجائے تو اس کا الزام مجھ پر نہ ہوگا۔ ہاں اگر زینب میرے ساتھ جائے گی تو قریش کے کرودھ کا بھاجن (ذمہ دار) میں ہوں گا۔ آپ اور آپ کے مریدوں پر کوئی آفت نہ آئے گی۔

حضرتؑ۔ تم دباؤ میں آکر زینب کو خدا کی طرف سے پھیرنے کا تو یتن (کوشش) نہ کروگے۔

ابوالعاص۔ میں کسی کے دھرم میں وِگھن (اڑچن) ڈالنا لجا جنک (باعثِ شرم) سمجھتا ہوں۔

حضرتؑ۔ تمھیں لوگ زینب کو طلاق دینے پر مجبور نہ کریں گے؟

ابوالعاص۔ میں زینب کو طلاق دینے سے پہلے زندگی کو طلاق دے دوں گا۔

حضرتؑ کو ابوالعاص کی باتوں سے اطمینان ہوگیا۔ عاص کو حرم میں زینب سے ملنے کا اَوسر ملا عاص نے پوچھا۔ زینب میں تمھیں ساتھ لے چلنے آیا ہوں۔ دھرم کے بدلنے سے کہیں تمھارا مَت تو نہیں بدل گیا؟

زینب روتی ہوئی پتی کے پیروں پر گر پڑی اور بولی۔ سوامی دھرم بار بار ملتا ہے، ہردئے کیول ایک بار۔ میں آپ کی ہوں چاہے یہاں رہوں چاہے وہاں۔ لیکن سماج مجھے آپ کی سیوا میں رہنے دے گا؟

ابوالعاص۔ یدی سماج نہ رہنے دے گا تو میں سماج ہی سے نکل جاؤں گا۔ دنیا میں رہنے کے لیے بہت استھان ہے۔ رہا میں، تم خوب جانتی ہو کہ کسی کے دھرم میں وِگھن ڈالنا میرے سدھانت (اصول) کے پرتی کول (خلاف) ہے۔

زینب چلی تو خدیجہ نے اسے بدخشاں کے لعلوں کا ایک بہومولیہ ہار بدائی میں دیا۔

(۵)

اسلام پر ودھرمیوں (غیر مذہبیوں) کے اتیاچار دن بدن بڑھنے لگے۔ اوہیلنا (مذمت) کی دشا سے نکل کر اس نے بھئے کے چھیتر میں پرویش کیا۔ شتروُں نے اُسے سمول ناش کرنے کی آیوجنا کرنا شروع کی۔ دور دور کے قبیلوں سے مدد مانگی گئی اسلام میں اتنی شکتی نہ تھی کہ شستر بل (مسلح طاقت) سے شتروُں کو دباسکے۔ حضرت محمدؐ نے انت کو (آخرکار) مکّہ چھوڑ کر مدینہ کی راہ لی۔ ان کے کتنے ہی بھکتوں نے ان کے ساتھ ہجرت کی۔ مدینہ میں پہنچ کر مسلمانوں میں ایک نئی شکتی، ایک نئی اِسپھورتی (طاقت) کا اُدئے (ظہور) ہوا۔ وہ بھیہ شنک ہوکر دھرم کا پالن کرنے لگے۔ اب پڑوسیوں سے دبنے اور چھپنے کی ضرورت نہ تھی۔ آتم وِشواس (خود اعتمادی) بڑھا۔ ادھر بھی ودھرمیوں کا سامنا کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔

ایک دن ابوالعاص نے آکر اِستری سے کہا۔ زینب ہمارے نیتاؤں نے اسلام پر جہاد کرنے کی گھوشنا (اعلان) کردی۔

زینب نے گھبرا کر کہا۔ اب تو وہ لوگ یہاں سے چلے گئے۔ پھر جہاد کی کیا ضرورت؟

ابوالعاص۔ مکّہ سے تو چلے گئے۔ عرب سے تو نہیں چلے گئے۔ ان کی زیادتیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ جہاد کے سوا اور کوئی اُپائے نہیں۔ میرا اس جہاد میں شریک ہونا بہت ضروری ہے۔

زینب۔ اگر تمھارا دل تمھیں مجبور کر رہا ہے تو شوق سے جاؤ لیکن مجھے بھی ساتھ لیتے چلو۔

ابوالعاص۔ اپنے ساتھ؟

زینب۔ ہاں، میں وہاں آہت (زخمی) مسلمانوں کی سیوا شُوشُروشا (دل و جان سے خدمت) کروں گی۔

ابوالعاص۔ شوق سے چلو۔

(۶)

گھور سنگرام ہوا۔ دونوں دلوں نے خوب دل کے ارمان نکالے۔ بھائی بھائی سے،

متر متر سے باپ بیٹے سے لڑا۔ سِدّھ ہوگیا کہ دھرم کا بندھن رَکت (خون) اور وِریہ کے بندھن سے سُدردھ ہے۔

دونوں دَل والے ویر تھے۔ انتر یہ تھا کہ مسلمانوں میں نیا دھرم انوراگ تھا۔ مرتیو (موت) کے پشچات (بعد) سُورگ کی آشا تھی۔ دلوں میں وہ آتم وشواس تھا جو نُوجات (نئے پیدا شدہ) سمپردایوں (فرقوں) کا لکشن (علامت) تھا۔ وِدھرمیوں میں بلیدان کا یہ بھاؤ لُپت (پوشیدہ) تھا۔

کئی دن تک لڑائی ہوتی رہی مسلمانوں کی سنکھیا بہت کم تھی۔ پر انت میں ان کے دھرمُوتساہ (مذہبی جوش) نے میدان مار لیا۔ وِدھرمیوں میں اَدِھیکانش کام آئے کچھ گھایل ہوئے اور کچھ قید کر لیے گئے۔ ابوالعاص بھی انھیں قیدیوں میں تھے۔

زینب کو جیوں ہی معلوم ہوا اس نے حضرت محمدؐ کی سیوا میں ابوالعاص کا فدیہ (مُکتی دھن) بھیجا۔ یہ وہی بہو مُولیہ ہار تھا جو خدیجہ نے اسے دیا تھا۔ وہ اپنے پِتا کو اس دھرم سنکٹ میں نہ ڈالنا چاہتی تھی جو مُکتی دھن کے آبھاؤ (نہ ہونے) کی دَشا میں ان پر پڑتا۔ حضرتؐ نے یہ ہار دیکھا تو خدیجہ کی یاد تازہ ہوگئی۔ مدُھر اِسمرتیوں (یادوں) سے چت چنچل ہو اُٹھا۔ اگر خدیجہ جیوِت ہوتی تو اس کی سفارش کا اثر ان پر اس سے زیادہ نہ ہوتا جتنا اس ہار سے ہوا۔ مانو سُویم خدیجہ اس ہار کے روپ میں آئی تھی۔ ابوالعاص کے پَرتی ہردئے کومل ہوگیا۔ اسے سزا دی گئی۔ یہ ہار لے لیا گیا تو خدیجہ کی آتما کو کتنا دُکھ ہوگا۔ انھوں نے قیدیوں کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک پنچایت نِیُکت (طے) کردی تھی۔ یدیپی (اگرچہ) پنچوں میں سبھی حضرتؐ کے اِشٹ متر تھے۔ پر اسلام کے شِکشا ان کے دلوں سے پرانی عادتیں، پرانی چیشٹائیں نہ مٹا سکی تھی ان میں اَدھیکانش (زیادہ تر) ایسے تھے جن کو ابو العاص سے پاری وارک (خاندانی) دِویش تھا۔ جو ان سے کسی پُرانے خون کا بدلا لینا چاہتے تھے۔ اسلام نے ان میں چھما (معافی) اور اہنسا کے بھاوں (جذبات) کو اَنکورِت نہ کیا ہو پر سامیہ واد (اشتراکیت) کو ان کے رَوم رَوم میں پرِوِشٹ کردیا تھا۔ وہ دھرم کے وِشئے میں کسی کے ساتھ رعایت نہ کرسکتے تھے۔ چاہے وہ حضرتؐ کا نِکٹ سمبندھی (قریبی رشتہ دار) ہی کیوں نہ ہو۔ ابوالعاص سر جھکائے پنچوں کے سامنے کھڑے تھے اور قیدی پیش ہوتے تھے۔ ان کے مُکتی دھن (فدیہ) کا ملاحظہ ہوتا تھا اور وہ چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ ابو العاص کو

کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ یدھپی وہ ہار ایک تشتری میں پنچوں کے سمکھ (سامنے) رکھا ہوا تھا۔ حضرتؐ کے من میں بار بار پربل اِچھّا ہوتی تھی کہ صحابیوں سے کہیں یہ ہار کتنا بہومولیہ ہے۔ پر دھرم کا بندھن، جسے انہوں نے سُویم پر تشٹھت کیا تھا منہ سے ایک شبد بھی نہ نکلنے دیتا تھا۔ یہاں تک کہ سَمَست بندی جن (بندھی) مُکت ہوگئے ابو العاص اکیلا سر جھکائے کھڑا رہا۔ حضرت محمدؐ کے داماد کے اتنا لحاظ بھی نہ کیا گیا کہ بیٹھنے کی آگیا تو دے دی جاتی سہسا زید نے ابو العاص کی اُور کٹاکش کر کے کہا۔ دیکھا خدا اسلام کی کتنی حمایت کرتا ہے۔ تمھارے پاس ہم سے پانچ گُنا سینا (فوج) تھی پر خدا نے تمھارا منہ کالا کیا۔ دیکھا یا اب بھی آنکھیں نہیں کھلیں۔

ابوالعاص نے وِرَکت بھاؤ (روکھے پن) سے اُتّر دیا۔ جب آپ لوگ یہ مانتے ہیں کہ خدا سب کا مالک ہے۔ تب وہ اپنے ایک بندے کو دوسرے کی گردن کاٹنے میں مدد نہ دے گا۔ مسلمانوں نے اس لیے وِجے (جیت) پائی کہ غلط یا صحیح انھیں اٹل وِشواس ہے کہ مرتیو کے بعد ہم سُورگ میں جائیں گے۔ خدا کو آپ ناحق بدنام کرتے ہیں۔

زید۔ تمھارا مُکتی دھن کافی نہیں ہے۔

ابوالعاص۔ میں اس ہار کو اپنی جان سے زیادہ قیمتی سمجھتا ہوں۔ میرے گھر میں اس سے بہومولیہ اور کوئی وستو (چیز) نہیں ہے۔

تمھارے گھر میں زینب ہے جن پر ایسے سینکڑوں ہار قربان کیے جاسکتے ہیں۔

ابوالعاص۔ تو آپ کی منشا ہے میری بیوی میری فدیہ ہو۔ اِس سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ میں قتل کردیا جاتا۔ اچھا اگر میں وہ فدیہ نہ دوں تو؟

زید۔ تو تمھیں اَجیون (پوری زندگی) یہاں غلاموں کی طرح رہنا پڑے گا۔ تم ہمارے رسول کے داماد ہو۔ اس رشتے میں ہم تمھارا لحاظ کریں گے۔ پر تم غلام ہی سمجھے جاؤگے۔

حضرت محمدؐ نکٹ بیٹھے یہ باتیں سن رہے تھے وہ جانتے تھے کہ زینب اور عاص ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں۔ ان کا بیوگ دونوں ہی کے لیے گھاتک ہوگا۔ دونوں گھُل گھُل کر مرجائیں گے۔ صحابیوں کو ایک بار پنچ چُن لینے کے بعد ان کے فیصلے میں دخل دینا نیتی (اصول) کے وِرُدھ (خلاف) تھا۔ اس سے اسلام کی مریادہ بھنگ ہوتی تھی۔ کٹھن آتم ویدنا (دلی تکلیف) ہوئی۔ یہاں بیٹھے نہ رہ سکے۔ اُٹھ کر اندر چلے گئے۔ انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا

کہ زینب کی گردن پر تلوار پھیری جا رہی ہے۔ زینب کی دِین، کرونا پورن (پُردرد) مورتی آنکھوں کے سامنے کھڑی معلوم ہوتی تھی۔ پر مریادا، نردیہ، نشٹھر (سنگ دل) مریادا۔ یہ بلیدان مانگ رہی تھی۔

ابوالعاص کے سامنے بھی وشم سمسیا تھی۔ ادھر غلامی کا اَپمان تھا ادھر بیوگ (جدائی) کا دارُن (دکھی) ویدنا۔

اَنت میں انھوں نے نشچئے کیا، یہ ویدنا سہوں گا۔ اَپمان نہ سہوں گا۔ پریم کو گورَو پر سَمرپت کردوں گا۔ بولے۔ مجھے آپ کا فیصلہ منظور ہے۔ زینب میرا فدیہ ہوگی۔

(۷)

نشچئے کیا گیا کہ زید ابوالعاص کے ساتھ جائیں اور آبادی سے باہر ٹھہریں۔ عاص گھر جاکر تُرنت زینب کو وہاں بھیج دیں۔ عاص پر اتنا وِشواس تھا کہ وہ اپنا وچن پورا کریں گے۔ عاص گھر پہنچے تو زینب ان سے گلے ملنے دوڑی۔ عاص ہٹ گئے اور کاتر سور میں بولے نہیں زینب میں تم سے گلے نہ ملوں گا۔ میں تمھیں اپنے فدیہ کے روپ میں دے آیا۔ اب میرا تم سے کوئی سمبندھ نہیں ہے۔ یہ تمھارا ہار ہے لے لو اور فوراً یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ زید تمھیں لینے کو آئے ہیں۔

زینب پر وَجر (بجلی) سا گر پڑا۔ پیر بندھ گئے۔ وہیں چتر کی بھانتی کھڑی رہ گئی وَجر نے رکت کو جلا دیا، آنسوؤں کو سکھا دیا چیتنا ہی نہ رہی، روتی اور بلکھتی کیا ایک شن کے بعد اس نے ایک بار ماتھا ٹھونکا۔ نردئے (بے رحم) تقدیر کے سامنے سر جھکا دیا۔ چلنے کو تیار ہوگئی۔ گھور نراشئے (مایوسی) اتنا دُکھ دائی نہیں ہوتا جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ اس میں ایک رس ہین شانتی ہوتی ہے جہاں سکھ کی آشا نہیں وہاں دُکھ کا کشٹ کہاں۔

مدینہ میں رسولؐ کی بیٹی کی جتنی عزت ہونی چاہیے اتنی ہوتی تھی۔ وہ پتاگرہ (والد کے گھر) کی سوامنی (مالکن) تھی۔ دھن تھا، مان (عزت) تھا، گورو تھا، دھرم تھا، پریم نہ تھا۔ آنکھوں میں سب کچھ تھا کیول پتلی نہ تھی۔ پتی کے ویوگ میں رویا کرتی تھی۔ زندہ تھی مگر زندہ درگور۔ تین سال تین یُگوں (صدیوں) کی بھانتی بیتے۔ گھنٹے، دن اور ورش سادھارن ویوہاروں کے لیے ہیں۔ پریم کے یہاں سمئے کا ماپ کچھ اور ہی ہے۔

اُدھر ابوالعاص دوگُن اُتساہ کے ساتھ دھن اُپارجن (دولت کمانا) میں لین (مصروف)

ہوا۔ مہینوں گھر نہ آتا۔ ہسنا بولنا سب بھول گیا۔ دھن ہی اس کے جیون کا ایک ماتر آدھار تھا۔ اس کے پُرنئے وَنچت ہردئے (پیار سے محروم دل) کو کسی وِسمرتی کارک (یادگار) وَستو کی چاہ تھی۔ نیراشئے (مایوسی) اور چِنتا بہودھا شراب سے شانت ہوتی ہے۔ پریم اُنماد سے۔ ابوالعاص کو دَھنونماد (اُنس) ہوگیا۔ دھن کے آورن میں چھپا ہوا ویوگ دکھ تھا۔ مایا (دولت) کے پردے میں چھپا ہوا پریم ویراگیہ۔

جاڑوں کے دن تھے ناڑیوں (نسوں) میں رُدِھر (خون) جما جاتا تھا۔ ابوالعاص مکہ سے مال لاد کر ایک قافلے کے ساتھ چلا۔ رکفوں کا ایک دَل بھی ساتھ تھا۔ قریشیوں نے مسلمانوں کے کئی قافلے لوٹ لیے تھے۔ ابوالعاص کو سَنشئے (شبہ) تھا کہ مسلمانوں کا آکرمن (حملہ) ہوگا اسی لیے انھوں نے مدینہ کی راہ چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کیا۔ پر دُردَیو مسلمانوں کو ٹوہ مل ہی گئی۔ زید نے ستّر چنے ہوئے آدمیوں کے ساتھ قافلے پر دھاوا کر دیا۔ دھن کے بھکت، دھرم کے سیوکوں سے کیا بازی لے جاتے۔ ستّر نے سات سو کو مار بھگایا۔ کچھ مرے، ادھیکانش بھاگے، کچھ قید ہوگئے، مسلمانوں کو اَتُل دھن ہاتھ لگا۔ قیدی گھاتے میں ملے۔ ابوالعاص پھر قید ہوگیا۔

قیدیوں کے بھاگیہ رنرنے (قسمت کے فیصلے) کے لیے نیتی کے انوسار (مطابق) پنچایت چُنی گئی۔

زینب کو یہ خبر ملی تو آشائیں جاگ اٹھیں۔ آشا مرتی نہیں کیول سوجاتی ہے۔ پنجرے میں بند پکشی (پرندے) کی بھانتی پھڑپھڑانے لگی پر کیا کرے کِس سے کہے اب کے تو فدیہ کا بھی کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ یا خدا کیا ہوگا۔

پنچوں نے اب کے حضرت محمدؐ ہی کو اپنا پردھان بنایا۔ حضرتؐ نے انکار کیا پر اَنت میں ان کے آگرہ (اصرار) سے وِوَش (مجبور) ہوگئے۔

ابوالعاص سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرتؐ نے ایک بار ان پر کرونا سُوچک درشٹی ڈالی۔ پھر سر جھکا لیا۔

پنچایت شروع ہوئی۔ اَنیہ قیدیوں کے گھروں سے مکتی دھن (فدیہ) آگیا تھا۔ وہ مُکت (رِہا) کیے گئے۔ ابوالعاص کے گھر سے مکتی دھن نہ آیا تھا۔ حضرت نے حکم دیا ان کا

سارا مال اور اسباب ضبط کر لیا جائے اور یہ اس وقت تک بندی رہیں جب تک انھیں کوئی چھڑانے نہ آئے۔ ان کے انتم شبد یہ تھے ابوالعاص اسلام کی رن نیتی کے انوسار تم غلام ہو۔ تمھیں بازار میں بیچ کر روپیہ مسلمانوں میں تقسیم ہونا چاہیے تھا۔ پر تم ایماندار آدمی ہو اس لیے تمھارے ساتھ اتنی رعایت کی گئی۔

زینب دروازے کے پاس آڑ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ حضرتؐ کا یہ فیصلہ سُن کر رو پڑی۔ تب گھر سے باہر نکل آئی اور ابوالعاص کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ اگر میرا شوہر غلام ہے تو میں اس کی لونڈی ہوں۔ ہم دونوں ساتھ بکیں گے یا ساتھ قید ہوں گے۔

حضرتؐ۔ زینب مجھے لجّت (شرمندہ) مت کرو۔ میں وہی کر رہا ہوں جو میرا کرتویہ (فرض) ہے۔ نیائے پر بیٹھنے والے منُش کو پریم اور دُویش دونوں ہی سے مکت ہونا چاہیے۔ یدھپی اس نیتی کا سنسکار میں نے ہی کیا ہے پر اب میں اس کا سوامی نہیں داس ہوں۔ ابوالعاص سے مجھے جتنا پریم ہے یہ خدا کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ حکم دیتے ہوئے مجھے جتنا مانسک (ذہنی) اور آتمک (روحانی) کشٹ ہو رہا ہے اس کا انومان (اندازہ) ہر ایک پتا کر سکتا ہے۔ پر خدا کا رسول نیائے اور نیتی کو اپنے وِیکتیکت بھاوں (ذاتی جذبات) سے کلنکِت نہیں کرتا۔

صحابیوں نے حضرتؐ کے نیائے ویاکھیا (بیان) سنی تو مگدھ ہوگئے ابو ظفر نے عرض کیا حضرتؐ آپ نے اپنا فیصلہ سنا دیا، لیکن ہم سب اس وِشے میں سہمت ہیں کہ ابوالعاص جیسے پرتشٹھت ویکتی کے لیے یہ دنڈ نیایوچت ہوتے ہوئے بھی اَتی کٹھور (بہت سخت) ہے اور ہم سَروسمّتی (متفقہ رائے) سے اسے مکت کرتے ہیں اور اس کا لوٹا ہوا دھن لوٹا دینے کی آگیا مانگتے ہیں۔

ابوالعاص حضرت محمدؐ کی نیائے پرایتا پر چکت (حیران) ہوگئے۔ نیائے کا اتنا اونچا آدرش! مریادا کا اتنا مہتو (اہمیت)! آہ نیتی پر اپنا سنتان پریم تک نیوچھاور کردیا۔ مہاتما تم دَھنیہ ہو۔ ایسے ہی ممتا ہین سد پرشوں سے سنسار کا کلیان ہوتا ہے۔ ایسے ہی نیتی پالکوں (با اصول لوگوں) کے ہاتھوں جاتیاں بنتی ہیں۔ سبھیتائیں (تہذیبیں) پرشکرت ہوتی ہیں۔

مکّے آکر ابوالعاص نے اپنا حساب کتاب صاف کیا۔ لوگوں کے مال لوٹائے۔ رِن (قرض) چکائے اور گھر بار تیاگ کر حضرت محمدؐ کی سیوا (خدمت) میں پہنچ گئے۔ زینب کی مراد پوری ہوگئی۔

یہ افسانہ ماہنامہ سرسوتی مارچ1924 کے شمارے میں شائع ہوا۔ گپت دھن 2 میں اسی عنوان سے اور مان سروور 2 میں نیائے کے عنوان سے شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پیش کیا جا رہا ہے۔

نزول برحق

دہلی کی گلیاں باشندگانِ شہر کے خون سے تر ہو رہی ہیں نادرشاہ کی فوج نے سارے شہر میں آفت برپا کر رکھی ہے۔ جو کوئی سامنے آجاتا ہے، تلوار کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ نادرشاہ کا آتشیں غصہ کسی طرح فرو نہیں ہوتا۔ خون کی بارش بھی اس کے غصہ کی آگ کو ٹھنڈا نہیں کرسکتی۔

نادرشاہ دربارِ عام میں تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے ہیں۔ دہلی والوں کی اتنی ہمت کہ اس کے سپاہیوں کی بے عزتی کریں۔ ان بزدلوں کی یہ مجال! یہی کافر تو اس کی فوج کے ایک نعرہ پر میدانِ جنگ سے نکل بھاگے تھے۔ شہر کے باشندوں کی گریہ وزاری سن سن کے خود فوج کا دل کانپا جاتا تھا، مگر نادرشاہ کا غصہ فرو نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کا سپہ سالار بھی اس کے سامنے جانے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ بہادر لوگ رحیم ہوتے ہیں۔ بیکسوں پر، عورتوں پر، کمزوروں پر انھیں غصہ نہیں آتا۔ ان پر غصہ کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں مگر بے درد نادرشاہ کے غصہ میں رحم کا شائبہ نہ تھا۔

دہلی کا بادشاہ سرجھکائے نادرشاہ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ حرم سرا میں عیش و عشرت کرنے والا بادشاہ نادرشاہ کی گستاخانہ باتیں سن رہا تھا۔ مگر مجال نہ تھی کہ زبان کھول سکے۔ اس کو اپنی ہی جان کے لالے پڑے تھے رعایا کی حفاظت کون کرے؟ سوچتا تھا کہ میری زبان سے کچھ نکلے اور یہ مجھی کو ڈانٹ بیٹھے تو؟

آخر جب فوج کی مجنونانہ بے رحمی حد کو پہنچ گئی تو محمد شاہ کے وزیر سے نہ رہا گیا، وہ سخن فہم تھا، خود بھی شاعر تھا، جان پر کھیل کر نادرشاہ کے سامنے پہنچا اور اس نے یہ شعر پڑھا۔

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

شعر نے دل پر چوٹ کی۔ پتھر میں بھی سوراخ ہوتے ہیں، پہاڑوں میں بھی منبری ہوتی ہے، سنگ دلوں میں بھی نرمی ہوتی ہے۔ اس شعر نے پتھر کو پگھلا دیا۔ نادرشاہ نے سپہ سالار کو بلاکر قتلِ عام کے بند ہونے کا حکم دیا۔ تلواریں ایک دم نیام میں چلی گئیں۔ قاتلوں کے اُٹھے ہوئے ہاتھ اُٹھے ہی رہ گئے۔ جو سپاہی جہاں تھا وہیں بت بن کر رہ گیا۔

شام ہوگئی تھی، نادرشاہ باغ میں سیر کر رہا تھا، بار بار یہی شعر پڑھتا اور وجد کرتا تھا۔

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

(۲)

دہلی کا خزانہ لٹ رہا ہے۔ شاہی محل پر پہرہ ہے۔ کوئی اندر سے باہر یا باہر سے اندر آجا نہیں سکتا بیگمات بھی اپنے محلوں سے باہر باغ میں جانے کی جرأت نہیں کرسکتیں محض خزانہ ہی پر آفت نہیں آئی ہوئی ہے۔ سونے چاندی کے برتنوں، بیش قیمت تصویروں اور آرائش کے دیگر سامانوں پر بھی ہاتھ صاف کیا جا رہا ہے۔ نادرشاہ تخت پر بیٹھا ہوا، ہیرے اور جواہرات کے ڈھیروں کو غور سے دیکھ رہا ہے، مگر وہ چیز نظر نہیں آتی جس کے لیے اس کا دل ایک مدت سے بیقرار ہو رہا تھا۔ اس نے مغل اعظم نامی ہیرے کی تعریف اس کی کراماتوں کی داستان سنی تھی۔ اسے پاس رکھنے والا انسان معمر ہوتا ہے، کوئی مرض اس کے پاس نہیں پھٹکتا اس ہیرے میں اولاد بخشی کی قوت ہے وغیرہ وغیرہ۔ دہلی پر حملہ کرنے کے جہاں اور متعدد اسباب تھے۔ وہاں اس ہیرے کا حاصل کرنا بھی ایک خاص سبب تھا۔ سونے چاندی کے ڈھیروں اور بیش بہا جواہرات کی چمک دمک سے خواہ اس کی آنکھیں خیرہ ہوجائیں مگر اس کا دل خوش نہ ہوتا تھا۔ اسے تو مغل اعظم کی دھن تھی اور مغل اعظم کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہ غصہ سے دیوانہ ہوکر شاہی وزراء کی طرف دیکھتا اور افسروں کو جھڑکیاں دیتا تھا، مگر اپنا مطلب صاف نہ کہہ سکتا تھا کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ اتنا بیقرار کیوں ہو رہا ہے۔ یہ تو خوشی سے پھولا نہ سمانے کا موقع ہے۔ بے شمار دولت آگے پڑی ہوئی ہے گنتی میں یہ طاقت نہیں کہ اسے گن سکے۔ دنیا کا کوئی بھی بادشاہ اس معتد بہ دولت کا ایک جزو بھی پاکر اپنے کو خوش نصیب سمجھتا، مگر یہ شخص جس نے اس کا سواں حصہ بھی پہلے کبھی آنکھوں سے نہ دیکھا ہوگا جس کی عمر بھیڑیں چرانے ہی میں گزریں،

کیوں اتنا بے پرواہ ہے، آخر جب رات ہوئی اور بادشاہ کا خزانہ خالی ہوگیا اور پھر بھی وہ ہیرا نہ دکھائی دیا تو نادرشاہ کے غصہ کی آگ پھر بھڑک اُٹھی اس نے بادشاہ کے وزیر کو، اس وزیر کو، جس کی سخن سنجی نے رعایا کی جان بچائی تھی، تنہائی میں بلایا اور اس سے کہا۔"میرا غصہ تم دیکھ چکے ہو۔ اگر پھر اس کو نہیں دیکھنا چاہتے ہو تو لازم ہے کہ میرے ساتھ کامل صفائی کا برتاؤ کرو ورنہ اگر یہ شعلہ دوبارہ بھڑکا تو دہلی کی خیریت نہیں۔"

وزیر۔ جہاں پناہ! غلاموں سے تو کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی، خزانہ کی سب کنجیاں آپ کے سپہ سالار کے حوالہ کردی گئی۔

نادر۔ تم نے میرے ساتھ دغا کی ہے۔

وزیر (تیوری چڑھا کر) آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے اور ہم کمزور ہیں۔ آپ جو چاہے فرمائیں، مگر اس الزام کے تسلیم کرنے میں مجھے عذر ہے۔

نادر۔ کیا اس کے ثبوت کی ضرورت ہے؟

وزیر۔ جی ہاں، کیونکہ دغا کی سزا قتل ہے اور کوئی بلا سبب اپنے قتل پر رضامند نہ ہوگا۔

نادر۔ اس کا ثبوت میرے پاس ہے حالانکہ نادر نے کبھی کسی کو ثبوت نہیں دیا۔ وہ اپنی مرضی کا بادشاہ ہے اور کسی کو ثبوت دینا اپنی کسر شان سمجھتا ہے۔ مگر یہاں پر ذاتی معاملہ ہے۔ تم نے مغل اعظم ہیرا کیوں چھپا دیا؟

وزیر کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔ یہ ہیرا بادشاہ کو جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ وہ اُسے ایک لمحے کے لیے بھی اپنے پاس سے جدا نہیں کرتے۔ اُن سے کیوں کر کہوں؟ اُنھیں کتنا صدمہ ہوگا۔ ملک گیا، خزانہ گیا، عزت گئی۔ بادشاہی کی یہی ایک نشانی اُن کے پاس باقی رہ گئی ہے۔ اُن سے کیسے کہوں؟ ممکن ہے کہ وہ غصہ میں آکر اُسے کہیں پھینک دیں یا توڑ ڈالیں۔ انسان کی عادت ہے کہ وہ دشمن کو دینے کی بہ نسبت اپنی چیز کو تلف کردینا کہیں بہتر سمجھتا ہے بادشاہ بادشاہ ہے۔ ملک نہ سہی، اقتدار نہ سہی، فوج نہ سہی، مگر تمام عمر کی خودمختاری ایک روز میں نہیں مٹ سکتی۔ اگر نادر کو ہیرا نہ ملا تو وہ نہ جانے دہلی پر کیا ستم ڈھائے۔ اس کے خیال ہی سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، خدا نہ کرے، دلّی کو پھر وہ دن دیکھنا پڑے۔

دفعتاً نادر نے پوچھا۔ میں تمھارے جواب کا منتظر ہوں۔ کیا یہ تمھاری دغا کا کافی

ثبوت نہیں ہے؟

وزیر۔ جہاں پناہ! وہ ہیرا بادشاہ کو جان سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ اُسے ہمیشہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔

نادر۔ جھوٹ مت بولو۔ ہیرا بادشاہ کے لیے ہے۔ بادشاہ ہیرے کے لیے نہیں۔ بادشاہ کو ہیرا جان سے زیادہ عزیز ہے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ وہ بادشاہ کو بہت عزیز ہے اور یہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ میں اُسی ہیرے کو اُن سے نہ لوں۔ اگر بادشاہ یوں نہ دیں گے تو میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ تم جاکر اس معاملہ میں ایسی نازک فہمی سے کام لو جو تم نے کل دکھلائی تھی۔ آہ! کتنا لاجواب شعر ہے۔

کسے نہ ماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کُنی خلق را و باز کشی

(۳)

وزیر سوچتا ہوا چلا کہ یہ مسئلہ کیوں کر حل کروں؟ بادشاہ کے دیوان خانہ میں پہنچا تو بادشاہ اُسی ہیرے کو ہاتھ میں لیے فکر میں محو بیٹھے ہوئے ہیں۔

بادشاہ کو اس وقت اسی ہیرے کی فکر تھی لٹے ہوئے راہ گیر کی طرح وہ اپنی پگڑی ہاتھ سے نہ دینا چاہتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ نادر کو اس ہیرے کی خبر ہے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ خزانہ میں نہ پاکر نادر کے غصہ کی حد نہ رہے گی۔ لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی وہ اس ہیرے کو ہاتھوں سے نہ جانے دینا چاہتے تھے۔ آخر کو اُنھوں نے تہیّہ کرلیا کہ میں اسے نہ دوں گا۔ خواہ میری جان ہی پر کیوں نہ بن جاوے مریض کی اس آخری سانس کو نہ نکلنے دوں گا۔ ہائے کہاں چھپاؤں! اتنا بڑا محل ہے کہ اس میں ایک شہر سما سکتا ہے، مگر اس چھوٹی سی چیز کے لیے کہیں جگہ نہیں، جیسے کسی بدنصیب کو اتنی بڑی دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملتی! کسی محفوظ جگہ میں نہ رکھ کر کیوں نہ اس کو کسی ایسی جگہ میں رکھ دوں جہاں کسی کا خیال ہی نہ پہنچے۔ کون قیاس کرسکتا ہے کہ میں نے ہیرے کو اپنی صراحی میں رکھا ہوگا؟ اچھا حقّہ کی فرشی میں کیوں نہ ڈال دوں؟ فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوگی۔

یہ سوچ کر انھوں نے ہیرے کو فرشی میں ڈال دیا۔ مگر فوراً انھیں اندیشہ ہوا ایسے بیش بہا جواہر کو ایسے مقام میں رکھنا مناسب نہیں کون جانے، ظالم کو میرا حقّہ ہی پسند

آجائے انھوں نے فوراً حقہ کا پانی طشتری میں انڈیل دیا اور ہیرے کو نکال لیا۔ پانی کی بدبو اُڑی مگر اتنی ہمت نہ پڑتی تھی کہ نوکر کو بلا کر پانی کو پھنکوا دیں۔ خوف ہوتا تھا کہ کہیں وہ تاڑ نہ جائے۔

بادشاہ اسی دُبدھے میں پڑا ہوا تھا کہ وزیر آکر آداب بجا لایا بادشاہ کو اس پر اعتماد کامل تھا۔ مگر اس کو اپنی خفیف الحرکاتی پر اتنی شرم آئی کہ وہ اس راز کو اس پر بھی ظاہر نہ کرسکا۔ ایک سکتہ کے عالم میں اس کی طرف تاکنے لگا۔

وزیر نے بات شروع کی۔ آج خزانہ میں ہیرا نہ ملا تو نادر تو بہت جھلّایا۔ کہنے لگا۔ "کہ تم نے میرے ساتھ دغا کی ہے۔ میں شہر بھر لٹوا لوں گا، قتل عام کردوں گا، دہلی کو خاک سیاہ کر ڈالوں گا۔" میں نے کہا۔ جناب کو اختیار ہے۔ جو چاہیں کریں۔ "مگر ہم نے تو خزانہ کی کل تالیاں آپ کے سپہ سالار کو دے دی ہیں۔" وہ کچھ صاف صاف تو کہتا نہ تھا بس اشاروں میں باتیں کرتا تھا۔ اور بھوکے گیدڑ کی طرح ادھر ادھر بوکھلایا ہوا پھرتا تھا کہ کیسے پاوے اور نوچ کھائے۔

محمد شاہ۔ مجھے تو اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے ایسا خوف معلوم ہوتا ہے گویا کسی شیر کی قربت ہو۔ ظالم کی آنکھیں کتنی تند اور غضبناک ہیں! آدمی کیا ہے شیطان ہے؟ خیر، میں بھی اُسی ادھیڑبن میں پڑا ہوں کہ اسے کیوں کر چھپاؤں۔ سلطنت جائے غم نہیں، مگر اس ہیرے کو میں اُس وقت تک نہ دوں گا، جب تک کوئی میری گردن پر سوار ہوکر اُسے نہ چھین لے۔

وزیر۔ خدا نہ کرے کہ حضور کے دشمنوں کو یہ ذلت اُٹھانی پڑے میں ایک ترکیب بتلاؤں۔ حضور اسے اپنے عمامہ میں رکھ لیں۔ وہاں تک اس کے فرشتوں کا بھی خیال نہ پہنچے گا۔

محمد شاہ (اچھل کر) واللہ۔ تم نے خوب سوچا۔ واقعی تمھیں خوب سوجھی! حضرت ادھر اُدھر ٹٹولنے کے بعد اپنا سا منہ لے کر چلے جائیں گے میرے عمامے کو کون دیکھے گا؟ اسی سے تو میں نے تمھیں لقمان کا لقب دیا ہے۔ بس یہی طے رہا۔ کہیں تم ذرا دیر قبل آجاتے تو مجھے اتنی دردِ سری نہ اُٹھانی پڑتی۔

(۴)

دوسرے ہی روز دونوں بادشاہوں میں صلح ہوگئی وزیر نادر شاہ کے قدموں پر گر پڑا اور عرض کی۔ اب اس ڈوبتی ہوئی کشتی کو آپ ہی پار لگاسکتے ہیں۔ ورنہ اس کا خدا ہی مالک ہے۔ ہندوؤں نے سر اُٹھانا شروع کردیا ہے۔ مرہٹے، راج پوت، سکھ، سبھی اپنی اپنی طاقتوں کو مکمل کر رہے ہیں۔ جس روز ان سے مقابلہ ہوا اُسی روز یہ کشتی بھنور میں پڑجائے گی۔ اور دو چار چکر کھاکر ہمیشہ کے لیے غرقاب ہوجائے گی۔ نادرشاہ کو ایران چھوڑے عرصہ ہوگیا تھا۔ وہاں سے روزانہ باغیوں کی بغاوت کی خبریں آرہی تھیں۔ نادرشاہ جلد ہی وہاں لوٹ جانا چاہتا تھا۔ اس وقت اسے دہلی میں اپنی سلطنت قائم کرنے کی فرصت نہ تھی۔ صلح پر راضی ہوگیا۔ دونوں بادشاہوں نے صلح نامہ پر دستخط کردیے۔

دونوں بادشاہوں نے ایک ہی ساتھ نماز پڑھی، ایک ہی دسترخوان پر کھانا کھایا، ایک ہی حقّہ پیا اور ایک دوسرے سے گلے مل کر اپنی اپنی فرودگاہ کو چلے۔

محمد شاہ خوش تھا، راج بچ جانے کی اتنی خوشی نہ تھی جتنی ہیرے کے بچ جانے کی۔

مگر نادرشاہ ہیرا نہ پاکر بھی مغموم نہ تھا۔ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا تھا گویا رحم و انکسار کا مجسّمہ ہے۔

(۵)

صبح کا وقت ہے، دہلی میں نوبت بج رہی ہے۔ خوشی کی محفلیں آراستہ ہو رہی ہیں۔ تین روز قبل یہاں خون کی ندی بہی تھی۔ آج خوشی کی لہریں اُٹھ رہی ہیں۔ آج نادرشاہ دہلی سے رخصت ہو رہا ہے۔

اشرفیوں سے لدی ہوئی اونٹوں کے قطار شاہی محل کے سامنے روانہ ہونے کے لیے تیار کھڑی ہے، بیش قیمت چیزیں گاڑیوں میں لدی ہوئی ہیں۔ دونوں طرف کی فوجیں گلے مل رہی ہیں۔ ابھی کل دونوں فریق ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، آج بھائی بھائی بنے ہوئے ہیں۔

نادرشاہ تخت پر بیٹھا ہوا ہے، محمدشاہ بھی اُسی تخت پر اُس کی بغل میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی باہمی محبت کا نظارہ ہے۔ نادرشاہ نے مُسکراکر کہا۔ خدا کرے کہ یہ صلح ہمیشہ قائم و برقرار رہے۔ اور لوگوں کے دلوں سے ان خونی دنوں کی یاد محو ہوجاوے۔

محمد شاہ۔ میری طرف سے ایسی کوئی بات نہ ہوگی جو صلح کو خطرے میں ڈالے۔ میں خدا سے یہ دوستی قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ دست بہ دعا رہوں گا۔

نادرشاہ۔ صلح کی جتنی شرائط تھیں، سب ہو چکیں۔ صرف ایک بات باقی ہے۔ میرے یہاں دستور ہے کہ صلح کے وقت عمامے تبدیل کر لیے جاتے ہیں۔ اس رسم کے بغیر صلح کی کارروائی مکمل نہیں سمجھی جاتی آیئے ہم لوگ بھی اپنے اپنے عمامے بدل لیں۔ لیجیے، یہ میرا عمامہ حاضر ہے۔

یہ کہہ کر نادرشاہ نے اپنا عمامہ اُتار کر محمد شاہ کی طرف بڑھایا بادشاہ کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ سمجھ گیا کہ مجھ سے دغا کی گئی۔ دونوں طرف کے سپہ سالار سامنے کھڑے تھے۔ نہ کچھ کہتے بنتا تھا، نہ سنتے۔ بچنے کی کوئی سبیل نہ تھی اور نہ کسی سبیل کے سوچنے کی مہلت۔ کوئی جواب نہ سوجھا۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ چپکے سے عمامہ سر سے اُتار اور نادرشاہ کی طرف بڑھا دیا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے، آنکھوں میں غم و غصہ کے آنسو بھرے ہوئے تھے۔ چہرہ پر ہلکا سا تبسم نمودار تھا، وہ تبسم جو اشکباری سے بھی کہیں زیادہ دردناک اور غم آفریں ہوتا ہے۔ شاید اپنی جان نکال کر دینے میں بھی اس کو اس سے زیادہ تکلیف نہ ہوتی۔

نادرشاہ پہاڑوں اور دریاؤں کو پار کرتا ہوا ایران چلا جا رہا تھا ستر اونٹوں اور اتنی ہی بیل گاڑیوں کی قطار دیکھ دیکھ کر اُس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ وہ باربار خدا کا شکریہ ادا کرتا تھا جس کی نوازش بیکراں نے آج اس کی شہرت کو چمکا دیا تھا۔ اب وہ صرف ایران ہی کا بادشاہ نہیں بلکہ ہندوستان جیسے وسیع ملک کا بھی مالک تھا۔ مگر سب سے زیادہ خوشی اُسے مغل اعظم نامی ہیرا پانے کی تھی۔ جس کو بار بار دیکھ کر بھی اُس کی آنکھیں آسودہ نہ ہوتی تھیں۔ سوچتا تھا کہ جس وقت دربار میں یہ ہیرا پہن کر جاؤں گا اُس وقت حاضرین کی آنکھیں خیرہ ہوجائیں گی لوگ ایک دم متحیر ہوجائیں گے۔

اس کی فوج کو کھانے پینے کی نہایت تکلیف تھی۔ سرحد کی باغی فوجیں اس کو عقب سے تنگ کر رہی تھیں، روزانہ، دس بیس آدمی مارے جاتے تھے مگر نادرشاہ کو ٹھہرنے کی فرصت نہ تھی۔ وہ رواں دواں چلا جا رہا تھا۔

ایران کی حالت نہایت نازک تھی۔ شاہزادہ خود بغاوت فرو کرنے کے لیے گیا ہوا

تھا۔ مگر بغاوت روز بروز زیادہ خوفناک صورت اختیار کرتی جاتی تھی، بادشاہ ہی فوج کئی لڑائیوں میں ہار چکی تھی ہر وقت یہی اندیشہ تھا کہ کہیں وہ خود ہی دشمنوں سے محصور نہ ہو جائے۔

مگر واہ رے اقبال۔ دشمنوں نے جیوں ہی سُنا کہ نادر شاہ ایران آپہنچا وہیں اُن کے حوصلے پست ہوگئے۔ اس کے مہیب آواز سنتے ہی اُن کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ادھر نادرشاہ نے طہران میں قدم رکھا، اُدھر دشمنوں نے شہزادہ سے صلح کی التجا کی اس کی پناہ لی۔ نادرشاہ نے یہ خوشخبری سُنی تو اُسے یقین ہوگیا کہ یہ سب اُسی ہیرے کی برکت ہے۔ یہ اُسی کی کرامات ہے جس نے دشمنوں کو زیر کرکے ہاری ہوئی بازی کو جتایا۔

شہزادہ فتح پاکر لوٹا تو رعایا نے نہایت دھوم دھام سے اُس کا استقبال و خیر مقدم کیا۔ سارا طہران چراغوں کی روشنی سے جگمگا اُٹھا۔ خوشی کے نغموں سے شہر کا کوچہ کوچہ گونج اُٹھا۔

دربار منعقد ہوا، شعرا نے قصیدہ خوانی کی۔ نادرشاہ نے غرور سے اُٹھ کر شہزادہ کے تاج کو مغل اعظم ہیرے سے مزّین کردیا۔ چاروں طرف مرحبا، مرحبا کی صدائیں بلند ہوئیں۔ شہزادے کے چہرے کی رونق ہیرے کی چمک سے دوگنی ہوگئی۔ پدرانہ محبت سے نادرشاہ کا دل معمور ہوگیا، نادر وہ نادر جس نے دہلی میں خون کی ندی بہائی تھی اُس محبت سے پھولا نہ سماتا تھا، اُس کی آنکھوں سے غرور اور مسرت کے آنسو بہہ رہے تھے۔

(٦)

دفعتاً بندوق کی آواز ہوئی، دھائیں! دھائیں! دربار ہل اُٹھا۔ لوگوں کے کلیجے دہل اُٹھے۔ ہائے بجلی گر پڑی! ہائے رے بد نصیبی! بندوق کی آوازیں کان میں گونج رہی تھیں کہ شاہزادہ کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر گر پڑا۔ ساتھ ہی اُس کا ہیرا لگا ہوا تاج بھی نادرشاہ کے قدموں کے پاس آگرا۔

نادرشاہ نے مجنونانہ انداز سے ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ ”قاتلوں کو پکڑو۔“ اور فوراً غم سے بیتاب ہوکر شاہزادے کے مردہ جسم پر گر پڑا۔ زندگی کی ساری تمناؤں کا خاتمہ ہوگیا!

لوگ قاتلوں کی طرف دوڑے۔ پھر دھائیں، دھائیں، کی آواز ہوئی اور دونوں قاتل گر پڑے۔ انھوں نے خودکشی کرلی۔ وہ دونوں باغیوں کے سرغنہ تھے۔

ہائے رے انسانی خواہش! تیری بنیاد کتنی ناپائدار ہے۔ ریت پر کی دیوار تو برسات میں گراتی ہے مگر تیری دیوار بلا بارش ہی کے زمین دوز ہوجاتی ہے۔ آندھی میں چراغ کا کچھ بھروسہ کیا جاسکتا ہے مگر تیرا نہیں، تیری ناپائیداری کے سامنے لڑکوں کا گھروندا نہ ہلنے والا پہاڑ ہے اور بازاری عورت کی محبت ستی کے عہد کے اٹل۔

نادرشاہ کو لوگوں نے نعش پر سے اُٹھایا۔ اس کے رونے کی آواز دلوں کو ہلائے دیتی تھی۔ سبھی کے آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ شدنی کتنی زبردست، کتنی سخت اور کتنی بے رحم ہے!

نادرشاہ نے ہیرے کو زمین سے اُٹھا لیا۔ ایک بار اُسے دُکھ بھری نظروں سے دیکھا، پھر تاج کو شاہزادے کے سر پر رکھ دیا اور وزیر سے کہا کہ یہ ہیرا اسی لاش کے ساتھ دفن ہوگا۔

رات کا وقت تھا۔ طہران میں ماتم چھایا ہوا تھا۔ کہیں چراغ یا آگ کا اُجالا نہ تھا۔ نہ کسی نے چراغ جلایا اور نہ کھانا پکایا۔ افیونیوں کی چلمیں بھی آج ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔ مگر قبرستان میں مشعلیں، روشن تھیں۔ شاہزادے کی تجہیز و تکفین ہو رہی تھی۔

جب فاتحہ ختم ہوا، نادرشاہ نے اپنے ہاتھوں سے تاج کو لاش کے ساتھ قبر میں رکھ دیا۔ معمار اور سنگتراش حاضر تھے، اسی وقت قبر پر اینٹ پتھر اور چونا، کا مزار تعمیر ہونے لگا۔

نادرشاہ ایک ماہ تک لحہ بھر کے لیے بھی وہاں سے نہ ہٹا، وہیں سوتا تھا اور وہیں سلطنت کا کاروبار کرتا تھا۔ اُس کے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ میری مصیبت کا سبب یہی ہیرا ہے، یہی میری تباہی و بربادی کا موجب ہے۔

یہ افسانہ پہلی بار لکھنؤ کے ہندی ماہنامہ 'مادھوری' کے مارچ 1924 کے شمارے میں شائع ہوا عنوان تھا وَجرپات۔ہندی میں مان سرودور 3 میں اور اردو میں یہ 'فردوس' خیال میں شامل ہے۔

راہِ نجات

سپاہی کو اپنی سرخ پگڑی پر، حسینہ کو اپنے زیور پر، اور طبیب کو اپنے پاس بیٹھے ہوئے مریضوں پر جو غرور ہوتا ہے وہی کسان کو اپنے کھیتوں کو لہراتے ہوئے دیکھ کر ہوتا ہے۔ جھینگر اپنے ایکھ کے کھیتوں کو دیکھتا تو اس پر نشہ طاری ہوجاتا۔ تین بیگھے ایک تھی۔ اس کے چھ سو تو آپ ہی مل جائیں گے اور جو کہیں بھگوان نے ڈانڈی تیز کردی (مراد نرخ سے) تو پھر کیا پوچھنا۔ دونوں بیل بوڑھے ہوگئے۔ اب کوئی نئی گوئیں بٹیسر کے میلہ سے لے آوے گا، کہیں دو بیگھے کھیت اور مل گئے تو لکھا لے گا۔ روپیوں کی کیا فکر ہے، بنیئے ابھی سے خوشامد کرنے لگے تھے۔ ایسا کوئی نہ تھا جس سے اس نے گاؤں میں لڑائی نہ کی ہو۔ وہ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہ تھا۔

ایک روز شام کے وقت وہ اپنے بیٹے کو گود میں لیے مٹر کی پھلیاں توڑ رہا تھا۔ اتنے میں اس کو بھیڑوں کا ایک جھنڈ اپنی طرف آتا دِکھائی دیا وہ اپنے دل میں کہنے لگا، اُدھر سے بھیڑوں کے نکلنے کا راستہ نہ تھا۔ کیا کھیت کی مینڈ پر سے بھیڑوں کا جھنڈ نہیں جا سکتا تھا؟ بھیڑوں کو اِدھر سے لانے کی کیا ضرورت؟ یہ کھیت کو کچلیں گی؟ چریں گی۔ اس کا دام کون دے گا۔ معلوم ہوتا ہے بدھو گڈریا ہے۔ بچّہ کو گھمنڈ ہوگیا ہے جبھی تو کھیتوں کے بیچ میں سے بھیڑیں لیے جا رہا ہے۔ ذرا اس کی ڈھٹائی تو دیکھو۔ دیکھ رہا ہے کہ میں کھڑا ہوں اور پھر بھی بھیڑوں کو لوٹاتا نہیں۔ کون میرے ساتھ کبھی سلوک کیا ہے کہ میں اس کی مروت کروں۔ ابھی ایک بھیڑا مول مانگوں تو پانچ روپے سُنا دے گا۔ ساری دنیا میں چار روپے کے کمبل بکتے ہیں پر یہ پانچ روپے سے کم بات نہیں کرتا۔

اتنے میں بھیڑیں کھیت کے پاس آگئیں۔ جھینگر نے للکار کر کہا۔ ارے یہ بھیڑیں کہاں لیے آتے ہو؟ کچھ سوجھتا ہے کہ نہیں؟

بدھو۔ انکسار سے بولا۔ مہتو! ڈانڈ پر سے نکل جائیں گی، گھوم کر جاؤں گا تو کوس بھر کا چکر پڑے گا۔

جھینگر۔ تو تمھارا چکر بچانے کے لیے میں اپنا کھیت کیوں کچلاؤں ڈانڈ ہی پر سے لے جانا ہے تو اور کھیتوں کے ڈانڈے سے کیوں نہیں لے گئے؟ کیا مجھے کوئی چمار بھنگی سمجھ لیا ہے یا روپے کا گھمنڈ ہو گیا ہے؟ لوٹاؤ ان کو۔

بدھو۔ مہتو آج نکل جانے دو۔ پھر کبھی ادھر سے آؤں تو جو ڈنڈ (سزا) چاہے دینا۔

جھینگر۔ کہہ دیا کہ لوٹاؤ انھیں۔ اگر ایک بھیڑ بھی مینڈ پر چڑھ آئی تمھاری کسل نہیں۔

بدھو۔ مہتو، اگر تمھاری ایک بیل بھی کسی بھیڑ کے پیروں کے نیچے آجائے تو مجھے بیٹھا کر سو گالیاں دینا۔

بدھو باتیں تو بڑی لجاجت سے کر رہا تھا۔ مگر لوٹنے میں اپنی کسر شان سمجھتا تھا۔ اس نے دل میں سوچا کہ اسی طرح ذرا ذرا سی دھمکیوں پر بھیڑوں کو لوٹانے لگا تو پھر میں بھیڑیں چرا چکا، آج لوٹ جاؤں گا تو کل کو کہیں نکلنے کا راستہ ہی نہ ملے گا، سبھی رُعب جمانے لگیں گے۔

بدھو بھی گھر کا مضبوط آدمی تھا۔ بارہ کوڑی بھیڑیں تھیں۔ انھیں کھیتوں میں بٹھانے کے لیے فی شب ۸رکوڑی مزدوری ملتی تھی۔ اس کے علاوہ دودھ بھی فروخت کرتا تھا۔ اون کے کمبل بناتا تھا۔ سوچنے لگا۔ ”اتنے گرم ہو رہے ہیں، میرا کر ہی کیا لیں گے؟ کچھ ان کا دبیل تو ہوں نہیں۔“ بھیڑوں نے جو ہری ہری پتیاں دیکھیں تو بے کل ہو گئیں۔ کھیت میں گُھس پڑیں۔ بدھو انھیں ڈنڈوں سے مار مار کر کھیت کے کنارے سے ہٹاتا تھا اور وہ ادھر ادھر سے نکل کر کھیت میں جا گھستی تھیں، جھینگر نے گرم ہو کر کہا۔ تم مجھے ہینکڑی جتانے چلے ہو تو تمھاری ہینکڑی بھلا دوں گا۔

بدھو۔ تمھیں دیکھ کر بھڑکتی ہیں، تم ہٹ جاؤ تو میں سب نکال لے جاؤں۔

جھینگر نے لڑکے کو گودی سے اُتار دیا اور اپنا ڈنڈا سنبھال کر بھیڑوں کے سر پڑ گیا۔ دھوبی بھی اتنی بے دردی سے اپنے گدھوں کو نہ مارتا ہوگا کسی بھیڑ کی ٹانگ ٹوٹی، کسی کی کمر ٹوٹی۔ سب نے زور سے ممیانا شروع کیا۔ بدھو خاموش کھڑا ہوا پنی فوج کی تباہی، اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا وہ نہ بھیڑوں کو ہانکتا تھا، اور نہ جھینگر سے کچھ کہتا تھا، بس کھڑا ہوا تماشا دیکھتا رہا۔ دو منٹ میں جھینگر نے اس فوج کو اپنی حیوانی طاقت سے مار بھگایا۔ بھیڑوں کی فوج کو تباہ کرکے فاتحانہ غرور سے بولا۔ اب سیدھے چلے جاؤ۔ پھر ادھر سے آنے کا نام

نہ لینا۔

بدھو نے چوٹ کھائی ہوئی بھیڑوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جھینگر، تم نے یہ اچھا کام نہیں کیا۔ پچھتاؤ گے۔

(۲)

کیلے کا کاٹنا بھی اتنا آسان نہیں، جتنا کسان سے بدلا لینا، اس کی ساری کمائی کھیتوں میں رہتی ہے یا کھلیانوں میں۔ کتنی ارضی و سماوی آفات کے بعد اناج گھر میں آتا ہے۔ اور جو کہیں آفات کے ساتھ عداوت نے میل کر لیا تو بے چارہ کسان کہیں کا نہیں رہتا۔ جھینگر! تم نے بڑا بُرا کیا۔ جان کر انجان بنتے ہو۔ بدھو کو جانتے نہیں کہ کتنا جھگڑالو آدمی ہے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا، جاکر اسے منا لو نہیں تو تمھارے ساتھ گاؤں پر آفت آجائے گی۔ جھینگر کے سمجھ میں بات آئی۔ پچھتانے لگا کہ میں نے کہاں سے کہاں اسے روکا، اگر بھیڑیں تھوڑا بہت چر ہی جاتیں تو کون میں اُجڑا جاتا تھا۔ اصل میں ہم کسانوں کا بھلا دب کر رہنے ہی میں ہے، بھگوان کو بھی ہمارا سر اُٹھا کر چلنا اچھا نہیں لگتا۔ جی تو بدھو کے یہاں جانے کو نہ چاہتا تھا، مگر دوسروں کے اصرار سے مجبور ہوکر چلا۔ اگہن کا مہینہ تھا۔ کُہرا پڑ رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ گاؤں سے باہر نکلا ہی تھا کہ یکایک اپنے اکھ کے کھیت کی طرف آگ کے شعلے دیکھ کر چونک پڑا دل دھڑکنے لگا۔ کھیت میں آگ لگی ہوئی تھی۔ بے تحاشا دوڑا۔ مناتا جاتا تھا کہ میرے کھیت میں نہ ہو۔ مگر جیوں جیوں قریب پہنچتا تھا یہ پُر امید وہم دور ہوتا جاتا تھا۔ وہ غضب ہو ہی گیا جسے روکنے کے لیے وہ گھر سے چلا تھا۔ ہتیارے نے آگ لگا دی اور میرے پیچھے سارے گاؤں کو چوپٹ کر دیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھیت آج بہت قریب آگیا ہے گویا درمیان کے پرتی کھیتوں کا وجود ہی نہیں رہا۔ آخر جب وہ کھیت پر پہنچا تو آگ خوب بھڑک چکی تھی۔ جھینگر نے ہائے ہائے کرنا شروع کیا۔ گاؤں کے لوگ دوڑ پڑے اور کھیتوں سے ارہر کے پودے اُکھاڑ اُکھاڑ کر آگ کو پیٹنے لگے۔ انسان و آتش کی باہمی جنگ کا منظر پیشِ نظر ہوگیا۔ ایک پہر تک کُہرام برپا رہا۔ کبھی ایک فریق غالب آتا، کبھی دوسرا۔ آتشی جانباز مرمر کر جی اُٹھتے تھے اور دوگنی طاقت سے لڑائی میں مستعد ہوکر ہتھیار چلانے لگتے تھے۔ انسانی فوج میں جس سپاہی کی مستعدی سے زیادہ روشن تھی، وہ بدھو تھا۔ بدھو کمر تک دھوتی چڑھائے اور جان کو

ہتھیلی پر رکھے آگ کے شعلوں میں کود پڑتا تھا، اور دشمنوں کو شکست دیتے ہوئے بال بال بچ کر نکل آتا تھا۔ بالآخر انسانی فوج فتحیاب ہوئی مگر ایسی فتح جس پر شکست بھی خندہ زن تھی۔ گاؤں بھر کی ایکھ جل کر راکھ ہوگئی اور ایکھ کے ساتھ ساری تمنائیں بھی جل بُھن گئیں۔

(۳)

آگ کس نے لگائی، یہ کھلا ہوا راز تھا، مگر کسی کو کہنے کی ہمت نہ تھی کوئی ثبوت نہیں اور بلا ثبوت کے بحث کی وقعت ہی کیا؟ جھینگر کو گھر سے نکلنا محال ہوگیا۔ جدھر جاتا طعن و تشنیع کی بوچھار ہوتی۔ لوگ علانیہ کہتے کہ یہ آگ تم نے لگوائی۔ تمھیں نے ہمارا ستیاناس کیا۔ تمھیں مارے گھمنڈ کے دھرتی پر پاؤں نہ رکھتے تھے، آپ کے آپ گئے اور اپنے ساتھ گاؤں بھر کو بھی لے ڈوبے۔ بدھو کو نہ چھیڑتے تو آج کیوں یہ دن دیکھنا پڑتا؟ جھینگر کو اپنی بربادی کا اتنا رنج نہ تھا، جتنا ان جلی کٹی باتوں کا۔ تمام دن گھر میں بیٹھا رہتا۔ پوس کا مہینہ آیا۔ جہاں ساری رات کولھو چلا کرتے تھے وہاں سناٹا تھا۔ جاڑوں کے سبب لوگ شام ہی سے کواڑ بند کرکے پڑ رہتے اور جھینگر کو کوستے تھے۔ ماگھ اور بھی تکلیف دہ تھا۔ ایکھ صرف دولت دینے والی نہیں بلکہ کسانوں کے لیے زندگی بخش بھی ہے اسی کے سہارے کسانوں کا جاڑا پار ہوتا ہے۔ گرم رس پیتے ہیں، ایکھ کی پتیاں تاپتے ہیں اور اس کے اگوڑے جانوروں کو کھلاتے ہیں۔ گاؤں کے سارے کتّے جو رات کو بھٹیوں کی راکھ میں سویا کرتے تھے، سردی سے مَر گئے۔ کتنے ہی جانور چارہ کی قلّت سے ختم ہوگئے۔ سردی کی زیادتی ہوئی اور کُل گاؤں کھانسی بخار میں مبتلا ہوگیا اور یہ ساری مصیبت جھینگر کی کرنی تھی۔ ابھاگے ہتیارے جھینگر کی۔ جھینگر نے سوچتے سوچتے قصد کرلیا کہ بدھو کی حالت بھی اپنی ہی سی بناؤں گا۔ اس کے کارن میرا ستیاناس ہوگیا اور وہ چین کی بانسری بجا رہا ہے! میں بھی اس کا ستیاناس کردوں گا۔

جس روز اس مہلک عناد کی ابتدا ہوئی اسی روز سے بدھو نے اس طرف آنا ترک کر دیا تھا۔ جھینگر نے اس سے ربط ضبط بڑھانا شروع کیا۔ وہ بدھو کو دِکھلانا چاہتا تھا کہ تم پر مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہے۔ ایک روز کمبل لینے کے بہانے گیا، پھر دودھ لینے کے بہانے جانے لگا۔ بدھو اس کی خوب آؤ بھگت کرتا۔ چلم تو آدمی دشمن کو بھی پلا دیتا ہے، وہ اسے

بلا دودھ اور شربت پلائے نہ جانے دیتا۔ جھینگر آج کل ایک سَن لپیٹنے والی مشین میں مزدوری کرنے جایا کرتا تھا۔ اکثر کئی روز کی اُجرت یکجائی ملتی تھی۔ بدھو ہی کی مدد سے جھینگر کا روزانہ خرچ چلتا تھا۔ پس جھینگر نے خوب میل جول پیدا کرلیا۔ ایک روز بدھو نے پوچھا۔ کیوں جھینگر، اگر اپنی ایکھ جلانے والے کو پا جاؤ تو کیا کرو؟ سچ کہنا۔

جھینگر نے متانت سے کہا۔ میں اس سے کہوں کہ بھیا، تم نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا۔ میرا گھمنڈ توڑ دیا مجھے آدمی بنا دیا۔

بدھو۔ میں جو تمھاری جگہ ہوتا تو اس کا گھر جلائے بِنا (بغیر) نہ مانتا۔

جھینگر۔ چار دن کی جندگانی میں بیر بڑھانے سے کون فائدہ؟ میں تو برباد ہی ہوا، اب اسے برباد کرکے کیا پاوں گا؟

بدھو۔ بس یہی تو آدمی کا دھرم ہے۔ مگر بھائی کرودھ (غصّہ) کے بس میں ہوکر بدھی اُلٹی ہوجاتی ہے۔

(۴)

پھاگن کا مہینہ تھا۔ کسان ایکھ بونے کے لیے کھیتوں کو تیار کر رہے تھے، بدھو کا بازار گرم تھا، بھیڑوں کی لوٹ مچی ہوئی تھی۔ دو چار آدمی روزانہ دروازہ پر کھڑے خوشامد کیا کرتے۔ بدھو کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتا۔ بھیڑ بٹھانے کی اجرت دوگنی کردی تھی۔ اگر کوئی اعتراض کرتا تو بے لاگ کہتا۔ ''بھیا، بھیڑیں تمھارے گلے تو نہیں لگاتا ہوں۔ جی نہ چاہے تو نہ بٹھلاؤ، لیکن میں نے جو کہہ دیا ہے اس سے ایک کوڑی بھی کم نہیں ہوسکتی۔'' غرض تھی لوگ اس کی بے مروتی پر بھی اسے گھیرے ہی رہتے تھے، جیسے پنڈے کسی جاتری کے پیچھے پڑے ہوں۔

لکشمی کا جسم تو بہت بڑا نہیں اور وہ بھی وقت کے مطابق چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ کبھی وہ اپنے قد و قامت کو سمیٹ کر چند کاغذی الفاظ ہی میں چھپا لیتی ہے۔ کبھی کبھی تو انسان کی زبان پر جا بیٹھتی ہے، جسم غائب ہوجاتا ہے۔ مگر ان کے رہنے کے لیے وسیع جگہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ آئیں اور گھر بڑھنے لگا۔ چھوٹے چھوٹے مکان میں ان سے نہیں رہا جاتا۔ بدھو کا گھر بھی بڑھنے لگا، دروازہ پر برآمدہ کی تعمیر ہوئی، دو کی جگہ چھ کوٹھریاں بنوائی گئیں۔ یوں کہیے کہ مکان از سر نو بننے لگا۔ کسی کسان سے لکڑی مانگی۔ کسی

سے کھپریل کا پڑایہ لگانے کے لیے اوپلے۔ کسی سے بانس اور کسی سے سرکنڈے۔ دیوار بنانے کے اُجرت دینی پڑی۔ وہ بھی نقد نہیں، بھیڑ کے بچّوں کی شکل میں لکشمی کا یہ اقبال ہے، سارا کام بیگار میں ہوگیا مفت میں اچھا خاصا مکان تیار ہوگیا۔ داخلہ کے جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔

اُدھر جھینگر دن بھر مزدوری کرتا تو کہیں آدھا پیٹ اناج ملتا۔ بدھو کے گھر میں کنچن برس رہا تھا۔ جھینگر جلتا تھا تو کیا بُرا کرتا تھا؟ یہ انیائے کس سے سہا جائے گا۔

ایک روز وہ ٹہلتا ہوا چماروں کے ٹولے کی طرف چلا گیا۔ ہری ہر کو پکارا ہری ہر نے آکر رام رام کی اور چلم بھری، دونوں پینے لگے۔ یہ چماروں کا مکھیا بڑا بدمعاش آدمی تھا۔ سب کسان اس سے تھر تھر کانپتے تھے۔

جھینگر نے چلم پیتے پیتے کہا۔ آج کل پھاگ واگ نہیں ہوتا کیا؟ سنائی نہیں دیتا۔

ہری ہر۔ پھاگ کیا ہو، پیٹ کے دھندے سے چھٹی ہی نہیں ملتی، کہو، تمھاری آج کل کیسی کٹتی ہے؟

جھینگر۔ کیا کٹتی ہے۔ نکٹا جیا بُرے حوال! دن بھر کارخانے میں مجوری کرتے ہیں تو چولھا جلتا ہے۔ چاندی تو آج کل بدھو کی ہے۔ رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ نیا گھر بنا۔ بھیڑیں اور لی ہے۔ اب گرہ پرویش (داخلہ مکان) کی دھوم ہے۔ ساتوں گاؤں میں نیوتے کی سپاری جائے گی۔

ہری ہر۔ لچھمی میا آتی ہیں تو آدمی کی آنکھوں میں سیل (مروت) آجاتی ہے مگر اس کو دیکھو دھرتی پر پاؤں نہیں دھرتا۔ بولتا ہے تو اینٹھ کر بولتا ہے۔

جھینگر۔ کیوں نہ اینٹھے؟ اس گاؤں میں کون ہے اس کے ٹکر کا؟ پر یار، یہ انیائے تو نہیں دیکھا جاتا۔ جب بھگوان دیں تو سر جھکا کر چلنا چاہیے یہ نہیں کہ اپنے برابر کسی کو سمجھے ہی نہیں۔ اس کی ڈینگ سنتا ہوں تو بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ کل کا بانی آج کا سیٹھ۔ چلا ہے ہمیں سے اکڑنے۔ ابھی کل لنگوٹی لگائے کھیتوں میں کوے ہانکا کرتا تھا، آج ان کا آسمان میں دِیا جلتا۔

ہری ہر۔ کہو تو کچھ جوگ جاگ کروں۔

جھینگر۔ کیا کروگے؟ اسی ڈر سے تو وہ گائے بھینس نہیں پالتا۔

ہری ہر۔ بھیڑیں تو ہیں۔
جھینگر۔ کیا بگلا مارے پکھنا ہاتھ۔
ہری ہر۔ پھر تمھیں سوچو۔
جھینگر۔ ایسی جگت نکالو کہ پھر پنپنے نہ پائے۔

اس کے بعد دونوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ نیکی میں جتنی نفرت ہوتی ہے، بدی میں اتنی ہی رقبت۔ عالم عالم کو دیکھ کر، سادھو سادھو کو دیکھ کر، شاعر شاعر کو دیکھ کر جلتا ہے۔ ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا۔ مگر جواری جواری کو دیکھ کر، شرابی شرابی کو دیکھ کر، چور چور کو دیکھ کر ہمدردی جتاتا ہے، مدد کرتا ہے۔ ایک پنڈت جی اگر اندھیرے میں ٹھوکر کھاکر گر پڑیں تو دوسرے پنڈت جی انھیں اُٹھانے کے بجائے دو ٹھوکریں اور لگائے کہ وہ پھر اُٹھ نہ سکیں، مگر ایک چور پر آفت آتے دیکھ کر دوسرا چور اس کی آڑ کرلیتا ہے۔ بدی سے سب نفرت کرتے ہیں اس لیے بدوں میں باہمی محبت ہوتی ہے۔ نیکی کی ساری دنیا تعریف کرتی ہے، اس لیے نیکوں میں مخالفت ہوتی ہے۔ چور کو مار کر چور کیا پائے گا؟ نفرت۔ عالم کی توہین کر کے عالم کیا پائے گا؟ نیک نامی۔

جھینگر اور ہری ہر نے صلاح کر لی۔ سازش کی تدبیر سوچی گئی اس کا نقشہ، وقت اور طریقہ طے کیا گیا۔ جھینگر چلا تو اکڑا جاتا تھا۔ مار لیا دشمن کو، اب کہاں جاتا ہے!

(۵)

دوسرے روز جھینگر کام پر جانے لگا تو پہلے بدھو کے گھر پہنچا۔ بدھو نے پوچھا کیوں آج نہیں گئے کیا؟

جھینگر۔ جا تو رہا ہوں، تم سے یہی کہنے آیا تھا کہ میری بچھیا کو اپنی بھیڑوں کے ساتھ کیوں نہیں چرا دیا کرتے؟ بے چاری کھونٹے پر بندھی مری جاتی ہے۔ نہ گھاس، نہ چارا، کیا کھلاویں؟

بدھو۔ بھیا۔ میں گائے بھینس نہیں رکھتا۔ چماروں کو جانتے ہو! یہ ایک ہی ہتیارے ہوتے ہیں۔ اسی ہری ہر نے میری دو گائیں مار ڈالیں، نہ جانے کیا کھلا دیتا ہے۔ تب سے کان پکڑے کہ اب گائے بھینس نہ پالوں گا۔ لیکن تمھاری ایک ہی بچھیا ہے، اس کا کوئی کیا کرے گا؟ جب چاہو پہنچا دو۔

یہ کہہ کر بدھو اپنے مکان والی دعوت کا سامان اسے دکھانے لگا۔ گھی، شکر، میدہ، ترکاری، سب منگا کر رکھا تھا۔ صرف ست نرائن کی کتھا کی دیر تھی۔ جھینگر کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایسی تیاری نہ اس نے خود کبھی کی تھی اور نہ کسی کو کرتے دیکھی تھی۔ مزدوری کر گھر کو لوٹا تو سب سے پہلا کام جو اس نے کیا وہ اپنی بچھیا کو بدھو کے گھر پہنچانا تھا۔ اسی رات کو بدھو کے یہاں ست نرائن کی کتھا ہوئی ''برمھ بھوج'' بھی کیا گیا، جانے کا موقع ہی نہ ملا۔ علی الصباح کھانا کھا کر اُٹھا ہی تھا (کیوں کہ رات کا کھانا صبح ملا) کہ ایک آدمی نے آکر خبر دی۔ بدھو تم یہاں بیٹھے ہو۔ ادھر بھیڑوں میں بچھیا مری پڑی ہے۔ بھلے آدمی، اس کی پگھیا بھی نہیں کھولی تھی۔

بدھو نے سنا اور گویا ٹھوکر لگ گئی۔ جھینگر بھی کھانا کھاکر وہیں بیٹھا تھا۔ بولا۔ ہائے میری بچھیا! چلو ذرا دیکھوں تو، میں نے تو پگھیا نہیں لگائی تھی۔ اسے بھیڑوں میں پہنچاکر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ تم نے یہ پگھیا کب لگا دی؟

بدھو۔ بھگوان جانے جو میں نے اس کی پگھیا دیکھی ہو، میں تو تب سے بھیڑوں میں گیا ہی نہیں۔

جھینگر۔ جاتے نہ تو پگھیا کون لگا دیتا؟ گئے ہوگے، یاد نہ آتی ہوگی۔

ایک برہمن۔ مری تو بھیڑوں ہی میں نا؟ دنیا تو یہی کہے گی کہ بدھو کی غفلت سے اس کی موت ہوئی چاہے پگھیا کسی کی ہو۔

ہری ہر۔ میں نے کل سانجھ کو انھیں بھیڑوں میں بچھیا کو باندھتے دیکھا تھا۔

بدھو۔ مجھے؟

ہری ہر۔ تم نہیں لاٹھی کندھے پر رکھے، بچھیا کو باندھ رہے تھے؟

بدھو۔ بڑا سچا ہے تو، تو نے مجھے بچھیا کو باندھتے دیکھا تھا؟

ہری ہر۔ تو مجھ پر کاہے کو بگڑتے ہو بھائی؟ تم نے نہیں باندھی تو نہیں سہی۔

برہمن۔ اس کا نشچے کرنا ہوگا گو ہتھیا کا پرائشچت کرنا پڑے گا، کچھ ہنسی ٹھٹھا ہے!

جھینگر۔ مہاراج، کچھ جان بوجھ کر تو باندھی نہیں۔

برہمن۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟ ہتھیا اسی طرح لگتی ہے۔ کوئی گئو کو مارنے نہیں جاتا۔

جھینگر۔ ہاں۔ گئوؤں کو کھولنا باندھنا ہے تو جوکھم کا کام۔

برہمن۔ شاستروں میں اسے مہا پاپ کہا ہے۔ گئو کی ہتیا برہمن کی ہتیا سے کم نہیں۔
جھینگر۔ ہاں، پھر گئو تو ٹھہری ہی۔ اسی سے نہ ان کا مان (آدر) ہے۔ جو ماتا سو گئو۔ لیکن مہاراج۔ چوک ہوگئی۔ کچھ ایسا کیجیے کہ بے چارہ تھوڑے میں نپٹ جائے۔

بدھو کھڑا سن رہا تھا کہ خواہ مخواہ میرے سر گو ہتیا کا الزام تھوپا جا رہا ہے۔ جھینگر کی چالاکی بھی سمجھ رہا تھا، میں لاکھ کہوں کہ میں نے بچھیا نہیں باندھی پر مانے گا کون؟ لوگ یہی کہیں گے کہ پرائشچت سے بچنے کے لیے ایسا کہہ رہا ہے۔

برہمن۔ دیوتا کا بھی اس کے پرائشچت کرانے میں فائدہ تھا۔ بھلا ایسے موقع پر کب چوکنے والے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بدھو کو ہتیا لگ گئی۔ برہمن جی اس سے جل رہے تھے۔ کسر نکالنے کا موقع ملا۔ تین ماہ تک بھیک مانگنے کی سزا دی گئی۔ پھر سات تیرتھوں کی جاترا، اس پر پانچ سو برہمنوں کا کھلانا اور پانچ گایوں کا دان۔ بدھو نے سُنا تو ہوش اُڑ گئے۔ رونے پیٹنے لگا، تو سزا گھٹا کر دو ماہ کردی گئی۔ اس کے سوا کوئی رعایت نہ ہو سکی۔ نہ کہیں اپیل، نہ کہیں فریاد۔ بے چارے کو یہ سزا قبول کرنی پڑی۔

بدھو نے بھیڑیں۔ ایشور کو سونپیں۔ لڑکے چھوٹے تھے، عورت اکیلی کیا کرتی؟ غریب جاکر دروازوں پر کھڑا ہوتا اور منہ چھپاتے ہوئے کہتا ”گائے کی باچھی دیو بن باس“ بھیک تو مل جاتی مگر بھیک کے ساتھ دو چار سخت اور توہین آمیز فقرے بھی سننے پڑتے۔ دن کو جو کچھ پاتا اسی کو شام کے وقت کسی درخت کے نیچے پکا کر کھا لیتا اور وہیں پر رہتا۔ تکلیف کی تو اس کو پرواہ نہ تھی، بھیڑوں کے ساتھ تمام دن چلتا ہی تھا، مگر شرم تھی بھیک مانگنے کی۔ خصوصاً جب کوئی بدمزاج عورت یہ طعنے دیتی کہ روٹی کمانے کا اچھا ڈھنگ نکالا ہے، تو اسے دلی قلق ہوتا تھا۔ مگر کرے کیا۔

دو ماہ بعد وہ گھر واپس آیا۔ بال بڑھے ہوئے تھے، کمزور اس قدر کہ گویا ساٹھ سال کا بوڑھا ہو۔ تیرتھ جانے کے لیے روپیوں کا بندو بست کرنا تھا۔ گڈریوں کو کون مہاجن قرض دے۔ بھیڑوں کا بھروسہ کیا؟ کبھی کبھی وبا پھیلتی ہے تو رات بھر میں گلہ کا گلہ صاف ہوجاتا ہے۔ اس پر جیٹھ کا مہینہ، جب بھیڑوں سے کوئی آمدنی ہونے کی امید نہیں، ایک تیلی راضی بھی ہوا تو ۲/ فی روپیہ سود پر۔ آٹھ ماہ میں سود اصل کے برابر ہوجائے گا۔ یہاں قرض لینے کی ہمت نہ پڑی۔ ادھر دو مہینوں میں کتنی ہی بھیڑیں چوری چلی گئیں۔

لڑکے چرانے لے جاتے تھے دوسرے گاؤں والے چپکے سے دو ایک بھیڑیں کسی کھیت یا گھر میں چھپا دیتے اور بعدہ، مار کر کھا جاتے۔ لڑکے بے چارے ایک تو نہ پکڑ سکتے اور جو دیکھ بھی لیتے تو لڑیں کیسے؟ سارا گاؤں ایک ہوجاتا تھا۔ ایک ماہ میں بھیڑیں آدھی بھی نہ رہ جاویں گی۔ بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ مجبوراً بدھو نے ایک قصاب کو بلایا اور سب بھیڑیں اس کے ہاتھ فروخت کر ڈالیں۔ پانچ سو روپے ملے ان میں سے دو سو لے کر وہ تیرتھ جاترا کرنے گیا۔ بقیہ روپے برمھ بھوج وغیرہ کے لیے چھوڑ گیا۔

بدھو کے جانے پر اس کے مکان میں دو بار نقب ہوئی مگر یہ خیریت ہوئی کہ جاگ پڑنے کی وجہ سے روپے بچ گئے۔

(۷)

ساون کا مہینہ تھا۔ چاروں طرف ہریالی پھیلی ہوئی تھی۔ جھینگر کے بیل نہ تھے، کھیت بٹائی پر دے دیے تھے۔ بدھو پرائشچت سے فارغ ہوگیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی مایا کے پھندے سے بھی آزاد ہوگیا تھا۔ نہ جھینگر کے پاس کچھ تھا، نہ بدھو کے پاس۔ کون کس سے جلتا اور کس لیے جلتا؟

سن کی کل بند ہوجانے کے سبب جھینگر اب بیلداری کا کام کرتا تھا۔ شہر میں ایک بڑا دھرم شالہ بن رہا تھا۔ ہزاروں مزدور کام کرتے تھے جھینگر بھی انھیں میں تھا، ساتویں روز مزدوری کے پیسے لے کر گھر آتا تھا اور رات بھر رہ کر سویرے پھر چلا جاتا تھا۔

بدھو بھی مزدوری کی تلاش میں یہیں پہنچا۔ جمعدار نے دیکھا کہ کمزور آدمی ہے، سخت کام تو اس سے ہو نہ سکے گا۔ کاریگروں کا گارا پہنچانے کے لیے رکھ لیا، بدھو سر پر طاش رکھے گارا لینے گیا، تو جھینگر کو دیکھا۔ رام رام ہوئی۔ جھینگر نے گارا بھر دیا۔ بدھو نے اُٹھا لیا۔ دن بھر دونوں اپنا کام کرتے رہے۔

شام کو جھینگر نے پوچھا۔ کچھ بناؤ گے نا؟

بدھو۔ نہیں تو کھاوں گا کیا؟

جھینگر۔ میں تو ایک جون چبینا کر لیتا ہوں۔ اس جون ستو کھاتا ہوں۔ کون جھنجھٹ کرے؟

بدھو۔ ادھر اُدھر لکڑیاں پڑی ہوئی ہیں، بٹور لاؤ۔ آٹا گھر سے لیتا آیا ہوں گھر ہی میں پسوا لیا تھا۔ یہاں تو بڑا مہنگا ملتا ہے۔ اسی پتھر والی چٹان پر آٹا گوندھے لیتا ہوں۔ تم تو

میرا بتایا کھاؤ گے نہیں۔ اس لیے تم روٹیاں سینکو میں روٹیاں بناتا جاؤں گا۔
جھینگر۔ تَوا بھی تو نہیں ہے۔
بدھو۔ تَوے بہت ہیں، یہی گارے کا تسلا مانجے لیتا ہوں۔

آگ جلی، آٹا گوندھا گیا، جھینگر نے کچی پکّی روٹیاں تیار کیں۔ بدھو پانی لایا۔ دونوں نے نمک مرچے کے ساتھ روٹیاں کھائیں۔ پھر چلم بھری گئی دونوں پتھر کے سلوں پر لیٹے اور چلم پینے لگے۔

بدھو نے کہا۔ تمھاری اوکھ میں آگ میں نے لگائی تھی۔

جھینگر نے مذاق آمیز لہجے میں کہا۔ جانتا ہوں۔

ذرا دیر بعد جھینگر بولا۔ بچھیا میں نے ہی باندھی تھی۔ اور ہری ہر نے اسے کچھ کھلا دیا تھا۔ بدھو نے بھی اسی لہجے میں کہا جانتا ہوں۔

پھر دونوں سوگئے۔

یہ افسانہ پہلی بار اپریل 1924 میں ہندی کے ماہنامہ 'وشال بھارت' میں 'مکتی مارگ' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ہندی میں مان سروور 3 اور اردو میں 'فردوس خیال' میں شامل ہے۔

مُکتی دھن

بھارت ورش میں جتنے بیوسائے ہیں، ان سب میں لین دین کا بیوسائے سب سے لابھ دایک ہے۔ عام طور پر سود کی در ۲۵ روپے سیکڑا سالانہ ہے۔ پُر چور (وافر) استھاور یا جنگم (منقولہ) سمپتی پر ۱۲ روپے سیکڑے سالانہ سود لیا جاتا ہے۔ اس سے کم بیاج پر روپیہ ملنا پرایہ (اکثر) اسمبھو (ناممکن) ہے۔ بہت کم ایسے ویوسائے ہیں جس میں ۱۵ روپے سیکڑے سے ادھک لابھ ہو اور وہ بھی بنا کسی جھنجھٹ کے۔ اس پر نذرانے کی رقم الگ، لکھائی، دلّالی الگ، عدالت کا خرچہ الگ۔ یہ سب رقمیں بھی کسی نہ کسی طرح مہاجن ہی کی جیب میں جاتی ہیں۔ یہی کارن ہے کہ یہاں لین دین کا دھندا اتنا ترقی پر ہے۔ وکیل، ڈاکٹر، سرکاری کرمچاری، زمیندار کوئی بھی جس کے پاس کچھ فالتو دھن ہو۔ یہ بیوسائے کرسکتا ہے۔ اپنی پونجی کے سداپیوگ (اچھے استعمال) کا یہ سروتّم سادھن (سب سے اچھا ذریعہ) ہے۔ لالہ داؤ دیال بھی اسی شریٖنی (درجہ) کے مہاجن تھے۔ وہ کچہری میں مختار گیری کرتے تھے۔ اور جو کچھ بچت ہوتی تھی اسے ۲۵ ۔ ۳۰ روپے سیکڑا وارشک بیاج پر اُٹھا دیتے تھے۔ ان کا بیوہار اَدِھک تر نمن شرینی کے مُنشیوں سے ہی رہتا تھا۔ اُچّ ورن (اعلیٰ ذات) والوں سے وہ چوکنّے رہتے تھے۔ انھیں اپنے یہاں پھٹکنے ہی نہ دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا اور پرتیک (ہر ایک) بیوسائی پُروش اس کا سمرتھن کرتا ہے کہ برہمن چھتری یا کائیست کو روپے دینے سے یہ کہیں اچھا ہے کہ روپیہ کنویں میں ڈال دیا جائے۔ ان کے پاس روپیہ لیتے سمے تو اُتُل سمپتّی (بیش بہا جائداد) ہوتی ہے لیکن روپے ہاتھ میں آتے ہی وہ ساری سمپتّی غائب ہوجاتی ہے کہ اس پر پتنی پُتر یا بھائی کا ادھیکار ہوجاتا ہے۔ اَتھوا یہ پرکٹ ہوتا ہے کہ اس سمپتّی کا اَستِتو (وجود) ہی نہ تھا۔ ان کی قانونی ویوستھاؤں کے سامنے بڑے بڑے نیتی شاستر کے وِدوان بھی منہ کی کھاجاتے ہیں۔

لالہ داؤ دیال ایک دن کچہری سے گھر آرہے تھے۔ راستے میں انھوں نے ایک وچتر (عجیب غریب) گھٹنا دیکھی۔ ایک مسلمان کھڑا اپنی گئو بیچ رہا تھا۔ اور کئی آدمی اسے گھیرے

کھڑے تھے۔ کوئی اس کے ہاتھ میں روپے رکھے دیتا تھا۔ کوئی اس کے ہاتھ سے گئو کی پگہیہ چھیننے کی چیشٹا (کوشش) کرتا تھا۔ کِنتو وہ غریب مسلمان ایک بار اُن گراہکوں کے منہ کی اُور دیکھتا تھا اور کچھ سوچ کر پگہیہ کو اور بھی مضبوط پکڑ لیتا تھا۔ گئو موہنی روپ تھی۔ چھوٹی سی گردن، بھاری پٹھے اور دودھ سے بھرے ہوئے تھن تھے۔ پاس ہی ایک سندر بلشٹھ (طاقت ور) بچھڑا گئو کی گردن سے لگا ہوا کھڑا تھا۔ مسلمان بہت کُھبد (بیزار) اور دُکھی معلوم ہوتا تھا۔ وہ کرون نیتروں سے گئو کی اُور دیکھتا اور دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ داؤ دیال گئو کو دیکھ کر ریجھ گئے۔ پوچھا کیوں جی، یہ گئو بیچتے ہو؟ کیا نام ہے تمھارا؟

مسلمان نے داؤ دیال کو دیکھا تو پرسَن مکھ ان کے سمیپ جاکر بولا ہاں حضور بیچتا ہوں۔

داؤ دیال۔ کہاں سے لائے ہو؟ تمھارا نام کیا ہے۔

مسلمان۔ نام تو رحمٰن، پچولی میں رہتا ہوں۔

داؤ دیال۔ دودھ دیتی ہے؟

مسلمان۔ ہاں حضور، ایک بیلا میں تین سیر دوہ لیجیے۔ ابھی دوسرا ہی تو بیت ہے اتنی سیدھی ہے کہ بچّہ بھی دوہ لے۔ بچّے پیر کے پاس کھیلتے رہتے ہیں، پر کیا مجال کہ سر بھی ہلاوے۔

داؤ دیال۔ کوئی تمھیں یہاں پہچانتا ہے۔

مختار صاحب کو شبہ ہوا کہ کہیں چوری کا مال نہ ہو۔

مسلمان۔ نہیں حضور! غریب آدمی ہوں۔ میری کسی سے جان پہچان نہیں ہے۔

داؤ دیال۔ کیا دام مانگتے ہو؟

رحمٰن نے ۵۰ روپے بتلائے۔ مختار صاحب کو ۳۰ روپے کا مال جچا۔ کچھ دیر تک دونوں اُور سے مول بھاؤ ہوتا رہا۔ ایک کو روپیوں کی غرض تھی اور دوسرے کو گئو کی چاہ۔ سودا پٹنے میں کوئی کٹھنائی نہ ہوئی ۳۵ روپے پر سودا طے ہوگیا۔

رحمٰن نے سودا تو چکا لیا پر اب بھی وہ موہ کے بندھن میں پڑا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبا کھڑا رہا پھر گئو کو لیے مند گتی (ہلکی چال) سے داؤ دیال کے پیچھے پیچھے چلا تب ایک آدمی نے کہا اَبے ہم ۳۶ روپے دیتے ہیں ہمارے ساتھ چل۔

رحمٰن۔ نہیں دیتے تمھیں۔ کیا کچھ زبردستی ہے۔

دوسرے آدمی نے کہا۔ ہم سے ۴۰ روپے لے لے، اب تو خوش ہوا؟

یہ کہہ کر اس نے رحمٰن کے ہاتھ سے گائے کو لے لینا چاہا۔ مگر رحمٰن نے حامی نہ بھری آخر ان سب نے نراش ہوکر اپنی راہ لی۔

رحمٰن جب ذرا دور نکل آیا تو داؤدیال سے بولا۔ حضور آپ ہندو ہیں۔ اسے لے کر آپ پالیں گے، اس کی سیوا کریں گے۔ یہ سب قصائی ہیں ان کے ہاتھ میں ۵۰ روپے کو بھی کبھی نہ بیچتا۔ آپ بڑے موقع سے آگئے نہیں تو یہ سب زبردستی سے گئو کو چھین لے جاتے۔ بڑی وپت (مصیبت) میں پڑگیا ہوں سرکار، تب یہ گائے بیچنے نکلا ہوں۔ نہیں تو اس گھر کی لکشمی کو کبھی نہ بیچتا۔ اسے اپنے ہاتھوں سے پالا پوسا ہے۔ قصائیوں کے ہاتھ کیسے بیچ دیتا؟ سرکار، اسے جتنی ہی کھلی دیں گے۔ اتنا ہی یہ دودھ دے گی۔ بھینس کا دودھ اتنا میٹھا اور گاڑھا نہیں ہوتا، حضور سے ایک عرض اور ہے اپنے چرواہے کو دانٹ دیجیے گا کہ اِسے مارے پیٹے نہیں۔

داؤدیال نے چکت ہوکر رحمٰن کی اُور دیکھا۔ بھگوان! اس شرینی (درجہ) کے منشیہ میں بھی اتنا سوجنیہ اتنی سہردیتۃ(نرم دلی) ہے۔ یہاں تو بڑے بڑے تلک ترپُنڈ دھاری مہاتما قصائیوں کے ہاتھوں گوئیں بیچ جاتے ہیں۔ ایک پیسے کا گھاٹا بھی نہیں اُٹھانا چاہتے۔ اور یہ غریب ۵ روپے کا گھاٹا سہہ کر اس لیے میرے ہاتھ گئو بیچ رہا ہے کہ یہ کسی قصائی کے ہاتھ نہ پڑجائے۔ غریبوں میں بھی اتنی سمجھ ہوسکتی ہے۔

انھوں نے گھر آکر رحمٰن کو روپے دیے۔ رحمٰن نے روپیہ گانٹھ میں باندھے ایک بار پھر گئو کو پریم بھری آنکھوں سے دیکھا اور داؤدیال کو سلام کرکے چلا گیا۔

رحمٰن ایک غریب کسان تھا اور غریب کے سبھی دشمن ہوتے ہیں۔ زمیندار نے اضافہ لگان کا دعویٰ دائر کیا تھا۔ اسی کی جواب دہی کرنے کے لیے روپیوں کی ضرورت تھی۔ گھر میں بیلوں کے سوا اور کوئی سمپتی نہ تھی۔ وہ اس گئو کو پرانوں سے بھی پریے سمجھتا تھا۔ پر روپیوں کی کوئی تدبیر نہ ہوسکی تو وِوش ہوکر گائے بیچنی پڑی۔

(۲)

پچولی میں مسلمانوں کے کئی گھر تھے۔ اب کہ کئی سال کے بعد حج کا راستہ کھلا تھا۔

پاشچاتیہ مہاسمر (مغربی بڑی لڑائی) کے دنوں میں راہ بند تھی۔ گاؤں کے کتنے ہی اِستری پروش حج کرنے چلے گئے۔ رحمٰن کی بوڑھی ماتا بھی حج کے لیے تیار ہوئی۔ رحمٰن سے بولی۔ بیٹا اتنا ثواب کرو۔ بس میرے دل میں یہی ایک ارمان باقی ہے اس ارمان کو لیے ہوئے کیوں دنیا سے جاؤں خدا تم کو اس نیکی کی جزا (پھل) دے گا۔ ماتر بھکتی گرامینوں کا وششٹ گُن ہے۔ رحمٰن کے پاس اتنے روپیہ کہاں تھے کہ حج کے لیے کافی ہوتے۔ پر ماتا کی آگیہ کیسے ٹالتا؟ سوچنے لگا کسی سے اُدھار لے لوں۔ کچھ اب کہ اوکھ پیر کر دے دوں گا۔ کچھ اگلے سال چکا دوں گا۔ اللہ کے فضل سے اوکھ ایسی ہوئی ہے کہ کبھی نہ ہوئی تھی۔ یہ ماں کی دعا ہی کا پھل ہے۔ مگر کس سے لوں؟ کم سے کم ۲۰۰ روپے ہوں تو کام چلے۔ کسی مہاجن سے جان پہچان بھی تو نہیں ہے۔ یہاں جو دو ایک بنیے لین دین کرتے ہیں۔ وہ تو اسامیوں کی گردن ہی ریتتے ہیں۔ چلوں، لالہ داؤ دیال کے پاس ان سب سے تو وہی اچھے ہیں۔ سنا ہے وعدہ پر روپے لیتے ہیں۔ کسی طرح نہیں چھوڑتے لونی چاہے دیوار کو چھوڑ دے، دیمک چاہے لکڑی کو چھوڑ دے پر وعدہ پر روپے نہ ملیں تو اسامیوں کو نہیں چھوڑتے۔ بات پیچھے کرتے ہیں نالش پہلے۔ ہاں اتنا ہے کہ اسامیوں کی آنکھ میں دھول نہیں جھونکتے۔ حساب کتاب صاف رکھتے ہیں۔ کئی دن وہ اسی سوچ وچار میں پڑا رہا، کہ ان کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں اگر کہیں وعدہ پر روپے نہ پہنچے تو؟ بِنا نالش کیے نہ مانیں گے۔ گھربار، بیل بدھیا سب نیلام کرا دیں گے۔ لیکن جب کوئی وش نہ چلا، تو ہار کر داؤ دیال کے ہی پاس گیا اور روپے قرض مانگے۔

داؤ دیال۔ تم ہی نے تو میرے ہاتھ گنّو بیچی تھی نہ؟

رحمٰن۔ ہاں حضور۔

داؤ دیال۔ روپے تو تمھیں دے دوں گا۔ لیکن میں وعدہ پر روپے لیتا ہوں۔ اگر وعدہ پورا نہ کیا تو تم جانو۔ پھر میں ذرا بھی رعایت نہ کروں گا۔ بتاؤ کب دوگے؟

رحمٰن نے من میں حساب لگا کر کہا۔ سرکار دو سال کی میعاد رکھ لیں۔

داؤد دیال۔ اگر دو سال میں نہ دوگے تو بیاج کی در ۳۲ روپے سیکڑے ہوجائے گی۔ تمھارے ساتھ اتنی مروّت کروں گا کہ نالش نہ کروں گا۔

رحمٰن۔ جو چاہے کیجیے گا۔ حضور کے ہاتھ میں ہی تو ہوں۔

رحمٰن کو ۲۰۰ روپے کے ۱۷۰ روپے ملے۔ کچھ لکھائی کٹ گئی، کچھ نذرانہ نکل گیا۔ کچھ دلالی میں آگیا۔ گھر آیا تھوڑا تھا گڑ رکھا ہوا تھا۔ اُسے بیچا اور اِستری کو سمجھا بجھا کر ماتا کے ساتھ حج کو چلا۔

(۳)

معیاد گزرجانے پر لالہ داؤ دیال نے تقاضہ کیا۔ ایک آدمی رحمٰن کے گھر بھیج کر اُسے بُلایا اور کٹھور سور (سخت آواز) میں بولے۔ کیا ابھی دو سال نہیں پورے ہوئے، لاؤ پیسے کہاں ہیں؟

رحمٰن نے بڑے دین بھاؤ (عجز و انکساری) سے کہا۔ حضور بڑی گردش میں ہوں۔ امّاں جب سے حج کرکے آئی ہیں تب ہی سے بیمار پڑی ہوئی ہیں۔ رات دن انہی کی دوا داروں میں دوڑتے گزرتا ہے۔ جب تک جیتی ہیں حضور کچھ سیوا کرلو، پیٹ کا دھندا تو زندگی بھر لگا رہے گا۔ اب کہ کچھ فصل نہیں ہوئی حضور۔ اوکھ پانی بِنا سوکھ گئی۔ سن کھیت میں پڑے پڑے سوکھ گیا۔ دھونے کی مہلت نہ ملی۔ ربیع کے لیے کھیت جوت نہ سکا۔ پَرتی پڑے ہوئے ہیں۔ اللہ ہی جانتا ہے کس مصیبت سے دن کٹ رہے ہیں۔ حضور کے روپے کوڑی کوڑی ادا کروں گا۔ سال بھر کی اور مہلت دیجیے۔ امّاں اچھی ہوئیں اور میرے سر سے بلا ٹلی۔

داؤ دیال نے کہا۔ ۳۲ روپے سیکڑے بیاج ہوجائے گا۔

رحمٰن نے جواب دیا۔ جیسے حضور کی مرضی۔

رحمٰن یہ وعدہ کرکے گھر آیا تو دیکھا ماں کا انتم سمے آپہنچا ہے۔ پران پیڑا ہو رہی ہے۔ درشن بدے تھے۔ سو ہوگئے۔ ماں بیٹے کو ایک بار واتسلیہ درشٹی سے دیکھا آشیرواد دیا اور پرلوک سدھاری۔ رحمٰن اب تک گردن تک پانی میں تھا۔ اب پانی سر پر آگیا۔

اس وقت پڑوسیوں سے کچھ اُدھار لے کر دفن، کفن کا پربندھ کیا کِنتو مرت آتما کی شانتی اور پری توش (سکون) کے لیے زکوٰۃ اور فاتحہ کی ضرورت تھی۔ قبر بنوانی ضروری تھی، برادری کا کھانا غریبوں کو خیرات، قرآن کی تلاوت اور ایسے کتنے ہی سنسکار کرنے پرم آوشیک (بہت ضروری) تھے۔

ماتری سیوا (ماں کی خدمت) کا اس کے سوا اب اور کون سا اوسر ہاتھ آسکتا تھا۔ ماتا

کے پرتی (لیے) سمست سانسارک اور دھارمک کرتویوں (مذہبی فرائض) کا انت ہو رہا تھا۔ پھر تو ماتا کی اسمرتی ماتر (محض یاد) رہ جائے گی۔ سنکٹ کے سمئے سنانے کے لیے؟ مجھے خدا نے سامرتھہ دی ہوتی۔ تو اس وقت کیا کچھ نہ کرتا۔ لیکن اب کیا اپنے پڑوسیوں سے بھی گیا گزرا ہوں۔

اس نے سوچنا شروع کیا، روپے لاؤں کہاں سے؟ اب تو لالہ داؤ دیال بھی نہ دیں گے۔ ایک بار ان کے پاس جاکر دیکھوں تو سہی کون جانے میری وپتی کا حال سن کر انھیں دیا آجائے۔ بڑے آدمی ہیں کرپا درشٹی (مہربانی کی نظر) ہوگئی تو سو دو سو ان کے لیے کون بڑی بات ہے۔

اس بھانتی (طرح) من میں سوچ وچار کرتا ہوا وہ لالہ داؤ دیال کے پاس چلا۔ راستے میں ایک ایک قدم مشکل سے اُٹھتا تھا۔ کون منہ لے کر جاؤں؟ ابھی تین ہی دن ہوئے ہیں سال بھر میں پچھلے روپے ادا کرنے کا وعدہ کرکے آیا ہوں۔ اب ۲۰۰ روپے اور مانگوں گا۔ تو وہ کیا کہیں گے۔ میں ہی ان کی جگہ پر ہوتا تو کبھی نہ دیتا۔ انھیں ضرور سندیہہ ہوگا کہ یہ آدمی نیت کا بُرا ہے۔ کہیں دُتکار دیا، گھرکیاں دیں تو؟ پوچھیں تیرے پاس ایسی کون سی بڑی جائداد ہے، جس پر روپے کی تھیلی دے دوں، تو کیا جواب دوں گا؟ جو کچھ جائداد ہے، وہ یہی دونوں ہاتھ ہیں۔ اس کے سوا یہاں کیا ہے؟ گھر کو کوئی سینت بھی نہ پوچھے گا کھیت ہیں تو زمیندار کے۔ ان پر اپنا کوئی قابو ہی نہیں۔ بیکار جا رہا ہوں وہاں دھکّے کھاکر نکلنا پڑے گا۔ رہی سہی آبرو بھی مٹی میں مل جائے گی۔

پرنتو ان نراش جنک (ناامید) شنکاؤں (شبہات) کے ہونے پر بھی وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھا چلا جاتا تھا۔ جیسے کوئی اناتھ ودھوا تھانے فریاد کرنے جا رہی ہو۔

لالہ داؤ دیال کچہری سے آکر اپنے سوبھاؤ کے انوسار (مطابق) نوکروں پر بگڑ رہے تھے۔ دوار پر پانی کیوں نہیں چھڑکا۔ برآمدے میں کرسیاں کیوں نہیں نکال رکھیں؟ اتنے میں رحمٰن سامنے جاکر کھڑا ہوگیا۔

لالہ صاحب جھلّائے تو بیٹھے تھے رُشٹ ہوکر بولے تم کیا کرنے آئے ہو جی؟ کیوں میرے پیچھے پڑے ہو۔ مجھے اس وقت بات چیت کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

رحمٰن کچھ نہ بول سکا۔ یہ ڈانٹ سن کر اتنا ہتاش ہوا کہ اُلٹے پیروں لوٹ پڑا۔ ہوئی

نہ وہی بات۔ یہی سننے تو میں آیا تھا؟ میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔

داؤ دیال کو کچھ دیا آگئی۔ جب رحمٰن برآمدے کے نیچے اُتر گیا تو بُلایا۔ ذرا نرم ہو کر بولے۔ کیسے آئے تھے جی۔ کیا کچھ کام تھا؟

رحمٰن۔ نہیں سرکار، یوں ہی سلام کرنے چلا آیا تھا۔

داؤ دیال۔ ایک کہاوت ہے۔ سلام روستائی بے غرض نیست۔ کسان بنا مطلب کے سلام نہیں کرتا۔ کیا مطلب ہے کہو۔

رحمٰن پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ داؤ دیال نے اٹکل سے سمجھ لیا اس کی ماں مر گئی۔ پوچھا۔ کیوں رحمٰن تمھاری ماں سدھار تو نہیں گئیں؟

رحمٰن۔ ہاں حضور آج تیسرا دن ہے۔

داؤ دیال۔ رو نہ رونے سے کیا فائدہ؟ صبر کرو، ایشور کو جو منظور تھا، وہ ہوا ایسی موت پر غم نہ کرنا چاہیے۔ تمھارے ہاتھوں ان کی مٹی ٹھکانے لگ گئی۔ اب اور کیا چاہیے۔

رحمٰن۔ حضور کچھ عرض کرنے آیا ہوں مگر ہمت نہیں پڑتی۔ ابھی پچھلا ہی پڑا ہوا ہے اور اب کس منہ سے مانگوں؟ لیکن اللہ جانتا ہے کہیں سے ایک پیسا ملنے کی امید نہیں اور کام ایسا آپڑا ہے اگر نہ کروں تو زندگی بھر پچھتاوا رہے گا۔ آپ سے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آگے آپ مالک ہیں۔ یہ سمجھ کر دیجیے کہ کنوئیں میں ڈال رہا ہوں۔ زندہ رہوں گا تو ایک ایک کوڑی مع سود کے ادا کردوں گا۔ مگر اس گھڑی نہیں نہ کیجیے گا۔

داؤ دیال۔ تین سو تو ہوگئے۔ دو سو پھر مانگتے ہو دو سال میں کوئی سات سو روپے ہوجائیں گے۔ اس کی خبر ہے یا نہیں؟

رحمٰن۔ غریب پرور۔ اللہ دے تو دو بیگہ اوکھ میں پانچ سو آسکتے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو میاد کے اندر آپ کی کوڑی کوڑی ادا کردوں گا۔

داؤ دیال نے دو سو روپے پھر دے دیے۔ جو لوگ ان کے ویوہار (سلوک) سے پرچت (آشنا) تھے انھیں ان کی اس رعایت پر بڑا آسچریہ (حیرت) ہوتا تھا۔

(۴)

کھیتی کی حالت اناتھ بالک کی سی ہے۔ جل اور وایو انوکول ہوئے تو اناج کے ڈھیر

لگ گئے۔ ان کی کرپا نہ ہوئی، تو لہلہاتے ہوئے کھیت کپٹی متر کی بھانتی دغا دے گئے۔ اولہ اور پال، سوکھا اور باڑھ، ٹڈی اور لاہی، دیپک اور آندھی سے پران بچے تو فصل کھلیہان میں آئی، اور کھلیان سے آگ اور بجلی دونوں ہی کا بیر ہے۔ اتنے دشمنوں سے بچی تو فصل، نہیں تو فیصلہ۔ رحمٰن نے کلیجہ توڑ کر محنت کی، دن کو دن اور رات کو رات نہ سمجھا۔ بیوی بچّے دل و جان سے لپٹ گئے ایسی اوکھ لگی کہ ہاتھی گھُسے، تو سما جائے سارا گاؤں دانتوں تلے انگلی دباتا تھا۔ لوگ رحمٰن سے کہتے۔ یار اب کہ تمھاری پَو بارہ ہے۔ ہارے درجے سات سو کہیں نہیں گئے۔ اب کہ بیڑا پار ہے۔ رحمٰن سوچا کرتا اب کہ جیوں ہی گڑ کے روپے ہاتھ آئیں۔ سب کے سب لے جاکر لالہ داؤ دیال کے قدموں پہ رکھ دوں گا۔ اگر وہ اس میں سے خود دو چار روپے نکال کر دیں گے تو لے لوں گا۔ نہیں تو اب کی سال اور پھُونی، چوکر کھاکر کاٹ دوں گا۔

مگر بھاگیہ کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ اگھن کا مہینہ تھا۔ رحمٰن کھیت کی مینڈ پر بیٹھا رکھوالی کر رہا تھا۔ اوڑھنے کو کیول ایک پُرانے گاڑھے کی چادر تھی۔ اس لیے اوکھ کے پتّے جلا دیے تھے۔ سہسا ہوا کا ایک ایسا جھونکا آیا کہ جلتے ہوئے پتّے اڑکر کھیت میں جا پہنچے۔ آگ لگ گئی۔ گاؤں کے لوگ آگ بجھانے دوڑے مگر آگ کی لپٹیں ٹوٹتے تاروں کی بھانتی ایک حصّے سے اُڑکر دوسرے سِرے پر جا پہنچتی تھی۔ سارے اُپائے ویرتھ ہوئے پورا کھیت جل کر راکھ کا ڈھیر ہوگیا۔ اور کھیت کے ساتھ رحمٰن کی ساری ابھیلاشائیں (خواہشیں) نشٹ بھرشٹ (نسیت و نابود) ہوگئیں۔ غریب کی کمر ٹوٹ گئی۔ دل بیٹھ گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہوگئے۔ پروسی ہوئی تھالی سامنے سے چھِن گئی۔ گھر آیا تو داؤ دیال کے روپیوں کی فکر سر پر سوار ہوئی۔ اپنی کچھ فکر نہ تھی۔ بال بچّوں کی بھی فکر نہ تھی۔ بھوکوں مرنا اور ننگے رہنا تو کسان کا کام ہی ہے۔ فکر تھی قرض کی۔ دوسرا سال بیت رہا ہے۔ دو چاردن میں لالہ داؤدیال کا آدمی آتا ہوگا۔ اُسے کون منہ دکھاؤں گا؟ چل کر انھیں سے چرِوری کروں کہ سال بھر کی مہلت اور دیجیے۔ لیکن سال بھر میں تو سات سو کے نو سو ہوجائیں گے۔ کہیں نالش کردی تو ہزار ہی سمجھو۔ سال بھر میں ایسی کیا ہُن برس جائے گی۔ بے چارے کتنے بھلے آدمی ہیں۔ دو سو روپے اُٹھا کر دے دیا۔ کھیت بھی تو ایسے نہیں کہ بیعہ رہن کرکے آبرو بچاؤں۔ بیل بھی ایسے کون سے تیار ہیں کہ دو چار سو مل جائیں۔ آدھے بھی تو نہیں

رہے۔ اب عزت خدا کے ہاتھ ہے۔ میں تو اپنی سی کرکے دیکھ چکا۔

صبح کا وقت تھا وہ اپنے کھیت کی مینڈ پر کھڑا اپنی تباہی کا دِرشئے دیکھ رہا تھا۔ دیکھا داؤ دیال کا چپراسی کندھے پر لٹھ رکھے چلا آرہا ہے۔ پران سوکھ گئے۔ خدا اب تو ہی اس مشکل کو آسان کر۔ کہیں آتے ہی آتے گالیاں نہ دینے لگے۔ یا اللہ کہاں چھپ جاؤں؟

چپراسی نے سمیپ (قریب) آکر کہا۔ روپے لے کر دینا نہیں چاہتے؟ میاد کل گزر گئی۔ جانتے ہونا سرکار کی؟ ایک دن کی بھی دیر ہوئی اور انھوں نے (نالش) ٹھوکی۔ بے بھاؤ کی پڑیں گی۔

رحمٰن کانپ اُٹھا۔ بولا۔ یہاں کا حال تو دیکھ رہے ہو نہ؟

چپراسی۔ یہاں حال حوال سننے کا کام نہیں۔ یہ چکمے کسی اور کو دینا۔ سات سو روپے لے چلو اور چپکے سے گِن کر چلے آؤ۔

رحمٰن۔ جمعدار ساری اوکھ جل گئی۔ اللہ جانتا ہے اب کہ کوڑی کوڑی بے باک کردیتا۔

چپراسی۔ میں یہ کچھ نہیں جانتا۔ تمھاری اوکھ کا کسی نے ٹھیکہ نہیں لیا۔ ابھی چلو سرکار بلا رہے ہیں۔

یہ کہہ کر چپراسی اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا چلا۔ غریب کو گھر میں جاکر پگڑی باندھنے کا موقع نہ دیا۔

(۵)

پانچ کوس کا راستہ کٹ گیا۔ اور رحمٰن نے ایک بار بھی سر نہ اُٹھایا۔ بس رہ رہ کر "یا علی مشکل کُشا"۔ اس کے منہ سے نکل جاتا تھا۔ اُسے اب اس نام کا بھروسا تھا۔ یہی جپ ہمّت کو سنبھالے ہوئے تھا۔ نہیں تو شاید وہ وہیں پر گر پڑتا۔ وہ نیراشئے (نا امیدی) کی اس دَشا کو پہنچ گیا تھا جب منشیہ کی چیتنا نہیں اُپچیتنا شاسن کرتی ہے۔

داؤ دیال دوار پر ٹہل رہے تھے۔ رحمٰن جاکر ان کے قدموں پر گر پڑا اور بولا۔ خداوند بڑی وپت (مصیبت) پڑی ہوئی ہے۔ اللہ جانتا ہے کہیں کا نہیں رہا۔

داؤ دیال۔ کیا سب اوکھ جل گئی؟

رحمٰن۔ حضور سن چکے ہیں کیا؟ سرکار جیسے کسی نے کھیت میں جھاڑو لگا دی ہو۔ گاؤں کے اوپر اوکھ لگی ہوئی تھی غریب پرور، یہ دَیوی آفت نہ پڑی ہوتی، تو اور تو نہیں کہہ

سکتا۔ حضور سے اُرِن ہو جاتا۔
داؤ دیال۔ اب کیا صلاح ہے؟ دیتے ہو یا نالش کردوں؟
رحمٰن۔ حضور مالک ہیں جو چاہیں کریں میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ حضور کے روپے سر پر ہیں اور مجھے کوڑی کوڑی دینی ہے۔ اپنی سوچی نہیں ہوتی۔ دوبار وعدہ کیے دونوں بار جھوٹا پڑا۔ اب وعدہ نہ کروں گا۔ جب جو کچھ ملے گا لاکر حضور کے قدموں پر رکھ دوں گا۔ محنت مزدوری سے پیٹ اور تن کاٹ کر جس طرح ہوسکے گا آپ کے روپے بھروں گا۔
داؤ دیال نے مسکرا کر کہا۔ تمھارے من میں اس وقت سب سے بڑی کون سی آرزو ہے؟
رحمٰن۔ یہی حضور کہ آپ کے روپے ادا ہوجائیں۔ سچ کہتا ہوں حضور اللہ جانتا ہے۔
داؤ دیال۔ اچھا تو سمجھ لو کہ میرے روپے ادا ہوگئے۔
رحمٰن۔ ارے حضور یہ کیسے سمجھ لوں۔ یہاں نہ دوں گا تو وہاں تو دینے پڑیں گے۔
داؤ دیال۔ نہیں رحمٰن اب اس کی فکر مت کرو میں تمھیں آزماتا تھا۔
رحمٰن۔ سرکار ایسا نہ کہیں۔ اتنا بوجھ سر پر لے کر نہ مروں گا۔
داؤ دیال۔ کیسا بوجھ جی۔ میرا تمھارے اوپر کچھ آتا ہی نہیں۔ اگر کچھ آتا بھی ہو تو میں نے معاف کردیا۔ یہاں بھی، وہاں بھی۔ اب تم میرے ایک پیسے کے بھی دین دار نہیں ہو۔ اصل میں میں نے تم سے جو قرض لیا تھا وہی ادا کر رہا ہوں۔ میں تمھارا قرض دار ہوں۔ تم میرے قرض دار نہیں ہو۔ تمھاری گئو اب تک میرے پاس ہے اس نے مجھے کم سے کم آٹھ سو روپے کا دودھ دیا ہے۔ دو بچھڑے نفع میں الگ۔ اگر تم نے یہ گئو قصائی کو دے دی ہوتی تو مجھے اتنا فائدہ کیوں کر ہوتا؟ تم نے اس وقت پانچ روپے کا نقصان اُٹھاکر گئو میرے ہاتھ بیچی تھی۔ وہ شرافت مجھے یاد ہے۔ اس احسان کا بدلہ چکانا میری طاقت سے باہر ہے۔ جب تم اتنے غریب اور نادان ہوکر ایک گئو کی جان کے لیے پانچ روپے کا نقصان اُٹھا سکتے ہو تو میں تمھاری سوگنی حیثیت رکھ کر اگر چار پانچ سو روپے معاف کردیتا ہوں تو کوئی بڑا کام نہیں کر رہا ہوں۔ تم نے بھلے ہی جان کر میرے اوپر کوئی احسان نہ کیا ہو، پر اصل میں

وہ میرے دھرم پر احسان تھا۔ میں نے بھی تو تمھیں دھرم کے کام ہی کے لیے روپے دیے تھے۔ بس ہم تم دونوں برابر ہوگئے۔ تمھارے دونوں بچھڑے میرے یہاں ہیں۔ جی چاہے تو لیتے جاؤ۔ تمھاری کھیتی میں کام آئیں گے۔ تم سچے مسلمان ہو۔

یہ افسانہ ماہنامہ مادھوری کے مئی 1924 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرو ور 2 میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔

عفو

مسلمانوں کو اسپین پر حکومت کرتے کئی صدیاں گزر چکی تھیں۔ کلیساؤں کی جگہ مسجدیں بنتی جاتی تھیں۔ گھنٹوں کی خوش آیند مگر بے جان صداؤں کی جگہ موذن کی کرخت پر روحانی صدائیں سُنائی دیتی تھیں۔ غرناطہ اور الحمرہ میں زمانے کی کج رفتاری پر ہنسنے والے محلات بن چکے تھے جن کے کھنڈر اب تک تماشائیوں کو اپنی شانِ ماضیہ کی جھلک دکھاتے ہیں۔ معزز عیسائی مرد و عورت حضرت مسیح کا دامن چھوڑ کر اسلامی اخوت کے سایہ میں کھنچے چلے آتے تھے اور مورخوں کے لیے آج تک یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ عیسائی کا نام و نشان وہاں کیوں کر باقی رہ گیا۔ اُن عیسائی سرداروں میں جنھوں نے اب تک اسلام کی دعوت نہ قبول کی تھی اور اسلامی جبروت کا لوہا نہ مانا تھا، جو اب بھی اپنے ملک میں سوراجیہ قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ایک سوداگر داؤد بھی تھا۔ داؤد عالم اور دلیر تھا، بلا کا خوددار، وہ اپنے علاقے میں اسلام کو قدم نہ جمانے دیتا تھا۔ اس کا گھر مصیبت زدہ عیسائی فدائیوں کے لیے واحد جائے امن تھا۔ اُس کا سب کچھ اُن پر نثار تھا۔ مسلمان لوگ داؤد سے خائف رہتے تھے اور مذہبی قوت سے اس پر فتح نہ پاکر اُسے زورِ شمشیر سے مغلوب کرنا چاہتے تھے۔ مگر داؤد موقع و محل سمجھتا تھا کھلے میدان میں کبھی اُن کا مقابلہ نہ کرتا۔ ہاں جہاں کہیں عیسائیوں کو اسلام کے آگے سر جھکاتے دیکھتا بے خوف و خطر جا پہنچتا اور بحث یا التجا سے اُنھیں اپنے مذہب پر ثابت قدم رہنے کی ترغیب دیتا۔

بالآخر مسلمانوں نے چاروں طرف سے گھیر کر اُس کو گرفتار کرنے کا ارادہ کیا۔ اسلامی فوجوں نے اُس کے علاقے کو محصور کرلیا۔ اور اس کا سامانِ رسد بند کردیا۔ داؤد کچھ دنوں تک تو اپنے مضبوط قلعہ میں بند رہا جب قلعہ میں پانی بھی نہ رہا تو اُسے مجبوراً جانبری کے لیے اپنے متعلقین کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ ایک دن موقع پاکر وہ رات کو قلعہ سے نکلا اور اسلامی دارالخلافہ غرناطہ میں آکر روپوش ہوگیا۔ اُس کی جانبازیوں نے نومسلم عیسائیوں میں بھی اس کے معتقد پیدا کردیے تھے۔ دنیا پروری آن پر چاہے قائم نہ رہ سکے۔

حمیت سے بے بہرہ نہیں ہوتی۔ ایسے ہی ہمدردوں کے درمیان داؤد بھلے دنوں کے انتظار میں زندگی بسر کرنے لگا۔ مسلمانوں کے مخبر اُس کا سُراغ لگانے کے لیے بہت سر مارتے تھے اُس کی گرفتاری کے لیے انعامات کثیر مشتہر کیے جاتے تھے، مگر داؤد کا پتہ نہ چلتا تھا۔

(۲)

ایک روز تنہائی سے اُکتا کر داؤد غرناطہ کے ایک باغ میں سیر کرنے چلا گیا۔ شام ہوگئی تھی، مسلمان لمبی عبائیں پہنے، بڑے بڑے عمامے سر پر باندھے، کمر میں تلوار لٹکائے، روشوں پر ٹہل رہے تھے۔ عورتیں سفید برقع ڈالے۔ زری کی جوتیاں پہنے بنچوں اور کرسیوں پر متمکن تھیں۔ داؤد سب سے الگ ہری بھری گھاس پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ مبارک دن کب آئے گا جب ہمارا وطن ان ظالموں کے پنجے سے چھٹکارا پاجاوے گا۔ گزرے ہوئے زمانے کا خیال کر رہا تھا جب عیسائی عورت مرد ان روشوں پر ٹہلتے ہوں گے، جب یہ مقام عیسائیوں کے شیریں نغموں سے گونجتا ہوگا۔

دفعتاً ایک مسلمان نوجوان آکر داؤد کے پاس بیٹھ گیا اور اس کو سر سے پیر تک حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ کیا ابھی تک تمھارا دل اسلامی نور سے منور نہیں ہوا؟ داؤد نے متانت سے کہا اسلام کا نور پہاڑ کی چوٹیوں کو منور کرسکتا ہے۔ تاریک گھاٹیوں میں اس کا گزر نہیں ہوسکتا۔

اس مسلمان عربی کا نام جمالؔ تھا۔ یہ بات سُن کر تیز لہجے میں بولا۔ اس سے تمھارا کیا مطلب ہے؟

داؤد۔ اس سے میرا مطلب یہی ہے کہ عیسائیوں میں اونچے طبقہ کے لوگ جاگیر اور اقتدار کے لالچ اور سزا کے خوف سے اسلام کی پناہ لے سکتے ہیں مگر کمزور اور غریب عیسائیوں کے لیے اسلام میں وہ آسمان کی بادشاہت کہاں ہے جو اُنھیں حضرتِ مسیح کے دامن میں نصیب ہوگی۔ اسلام کی اشاعت تلوار کے زور سے ہوئی ہے، خدمت خلق کے سہارے نہیں۔

جمال اپنے مذہب کی توہین سُن کر تلملا اُٹھا۔ گرم ہوکر بولا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اسلام کی طاقت اس کی اندرونی اخوت اور مساوات ہے تلوار نہیں۔

داؤد۔ اسلام نے مذہب کے نام پر جتنا خون بہایا ہے اُس میں اُس کی ساری مسجدیں غرق

ہو جائیں گی۔

جمال۔ تلوار نے ہمیشہ سچائی کی حفاظت کی ہے۔

داؤد نے اُسی استقلال کے لہجے میں کہا۔ جس کو تلوار کا سہارا لینا پڑے وہ سچائی ہی نہیں۔

جمال قومی غرور سے دیوانہ ہوکر بولا۔ جب تک جھوٹ کے ماننے والے رہیں گے۔ اس وقت تک تلوار کی ضرورت بھی رہے گی۔

داؤد۔ تلوار کا منہ تاکنے والی سچائی ہی جھوٹی ہے۔

عرب نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ خدا کی قسم اگر تم بلا ہتھیار کے نہ ہوتے تو تمھیں اسلام کی توہین کرنے کا مزہ چکھا دیتا۔ داؤد نے اپنے سینے میں چھپی ہوئی کٹار نکال کر کہا۔ میں غیر مسلح نہیں ہوں۔ مسلمانوں کا جس روز اتنا اعتبار کروں گا اُس روز عیسائی نہ رہوں گا۔ تم اپنے دل کے حوصلے نکال لو۔ دونوں نے تلواریں کھینچ لیں۔ ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑا۔ عرب کی بھاری تلوار عیسائی کی ہلکی کٹار کے سامنے سُست پڑگئی۔ ایک سانپ کی طرح پھن سے چوٹ کرتی تھی تو دوسری ناگن کی طرح اُڑتی تھی۔ ایک لہروں کی طرح لپکتی تھی دوسری پانی کی مچھلیوں کی طرح چمکتی تھی۔ دونوں بہادروں میں کچھ دیر تک وار ہوتے رہے۔ دفعتاً ایک بار ناگن اوچھل کر عرب کے کلیجے میں جا پہنچی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

(۳)

جمال کے گرتے ہی لوگ چاروں طرف سے ڈوڑے اور داؤد کو گھیرنے کی کوشش کرنے لگے۔ داؤد نے دیکھا کہ لوگ تلواریں لیے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ جان لے کر بھاگا۔ مگر جدھر جاتا تھا سامنے باغ کی دیوار راستہ میں حائل ہوجاتی تھی۔ دیوار بلند تھی۔ اُسے پھاندنا مشکل تھا یہ زندگی اور موت کی لڑائی تھی۔ کہیں پناہ کی اُمید نہیں۔ کہیں چھپنے کی جگہ نہیں۔ اِدھر عربوں کی خون کی پیاس لحہ بہ لحہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ یہ صرف ایک مجرم کو سزا دینے کی کوشش نہ تھی۔ قومی ہتک کا انتقام مقصود تھا۔ ایک مفتوح عیسائی کی یہ ہمت کہ عرب پر ہاتھ اُٹھائے۔ ایسا اندھیر!

جس طرح تعاقب کرنے والے کتوں کے سامنے گلہری اِدھر اُدھر دوڑتی ہے۔ کسی

درخت پر چڑھنے کی بار بار کوشش کرتی ہے۔ مگر ہاتھ پیر پھول جانے کے سبب بار بار گر پڑتی ہے وہی حالت داؤد کی بھی تھی۔

دوڑتے دوڑتے اس کا دم پھول گیا۔ پیر مَن مَن بھر کے ہوگئے۔ کئی بار دل میں آیا کہ ان سب پر ٹوٹ پڑے اور جان جتنی مہنگی فروخت ہوسکے اتنی مہنگی فروخت کرلے۔ مگر دشمنوں کی تعداد دیکھ کر حوصلہ پست ہوجاتا تھا۔

لینا ! دوڑنا ! پکڑنا ! کا شور برپا تھا۔ کبھی کبھی پیچھا کرنے والے اتنے قریب آجاتے تھے۔ کہ معلوم ہوتا تھا، اب لڑائی کا خاتمہ ہوا۔ وہ تلوار پڑی۔ مگر پیروں کی ایک حرکت، ایک ہی گردش اُسے خون کی پیاسی تلواروں سے بال بال بچا لیتی تھی۔

داؤد کو اب اس لڑائی میں کھلاڑیوں کا سا لطف آنے لگا۔ یہ یقینی تھا کہ اس کی جان نہیں بچ سکتی۔ مسلمان رحم کرنا نہیں جانتے۔ اس لیے اُس کو اپنے داؤں پیچوں میں مزہ آرہا تھا۔ کسی وار سے بچ کر اب اُسے یہ خوشی نہ ہوتی تھی کہ اس کی جان بچ گئی بلکہ یہ خیال مسرت بخش تھا کہ اُس نے قاتل کو کیسا زچ کیا۔

دفعتاً اس کو اپنے داہنی جانب باغ کی دیوار کچھ نیچی نظر آئی۔ اس کے پیروں میں ایک نئی طاقت عود کر آئی، رگوں میں نیا خون دوڑنے لگا۔ وہ ہرن کی طرح اُس طرف دوڑا اور ایک جست میں باغ کے اس پار پہنچ گیا۔ زندگی اور موت میں صرف ایک قدم کا فاصلہ تھا، پیچھے موت تھی اور آگے زندگی کی وسیع فضا، جہاں تک نظر جاتی تھی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ زمین پتھریلی تھی، کہیں اونچی، کہیں نیچی، جگہ جگہ پتھر کی سلیں پڑی ہوئی تھیں۔ داؤد ایک سِل کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا۔

دم بھر میں تعاقب کرنے والے بھی وہاں آپہنچے اور ادھر اُدھر جھاڑیوں میں، گڈھوں میں، سلوں کے نیچے، تلاش کرنے لگے۔ ایک عرب اُسی چٹان پر آکر کھڑا ہو گیا جس کے نیچے داؤد چھپا ہوا تھا۔ داؤد کا دل دھڑک رہا تھا کہ اب جان گئی، عرب نے ذرا نیچے کو جھانکا اور زندگی کا خاتمہ ہوا۔ اتفاق، صرف اتفاق پر اس کی زندگی کا انحصار تھا! داؤد نے سانس روک لی۔ بالکل ساکت ہوگیا۔ ایک نگاہ پر اس کی زندگی کا فیصلہ تھا۔ زندگی اور موت میں کتنی قربت ہے۔

مگر عربوں کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ہوشیاری سے سِلوں کے نیچے دیکھتے۔ وہاں

تو قاتل کے پکڑنے کی عجلت تھی۔ داؤد کے سر سے آئی بلا ٹل گئی۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ بھال کر آگے بڑھ گئے۔

(۴)

اندھیرا ہو گیا۔ آسمان پر ستارے نکل آئے اور ستاروں کے ساتھ داؤد بھی چٹان کے نیچے سے نکلا۔ لیکن دیکھا تو اُس وقت بھی چاروں طرف ہل چل مچی ہوئی ہے۔ دشمنوں کی جماعت مشعلیں لیے جھاڑیوں میں گھوم رہی ہے۔ ناکہ ناکہ پر پہرا ہے۔ کہیں سے نکل بھاگنے کا راستہ نہیں، داؤد ایک درخت کے نیچے کھڑا ہو کر سوچنے لگا اب کیوں کر جان بچے۔ اُسے اپنی جان کی ایسی پرواہ نہ تھی۔ وہ زندگی کے دُکھ سکھ سب اُٹھا چکا تھا۔ اگر اُسے زندگی کی تمنا تھی تو صرف یہ دیکھنے کے لیے کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا، میرے ہم وطن پست ہمّت ہو جائیں گے یا مستقل ارادہ کے ساتھ میدانِ جنگ میں اڑے رہیں گے۔

جب رات زیادہ گزر گئی اور دشمنوں کی کوشش انتقام میں کچھ کمی نہ نظر آئی تو داؤد خدا کا نام لے کر جھاڑیوں سے نکلا۔ اور دبے پاؤں درختوں کی آڑ میں، آدمیوں کی نظر بچاتا ہوا، ایک طرف کو روانہ ہوا۔ وہ ان جھاڑیوں سے نکل کر آبادی میں پہنچ جانا چاہتا تھا۔ ویرانی کسی کی آڑ نہیں کر سکتی۔ بستی کی گھنی آبادی خود ہی ایک آڑ ہے۔

کچھ دور تک تو داؤد کے راستے میں کوئی رُکاوٹ نہ پیدا ہوئی۔ جنگلی درختوں نے اس کی حفاظت کی۔ مگر جب وہ ناہموار زمین سے نکل کر ہموار زمین پر آیا تو ایک عرب کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اس نے للکارا۔ داؤد بھاگا۔ قاتل بھاگا جاتا ہے۔!! یہ آواز ہوا میں ایک ہی بار گونجی اور ایک لمحہ میں عربوں نے چاروں طرف سے اس کا تعاقب کیا۔ سامنے بہت دور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ بہت فاصلے پر ایک دھندلا سا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں! وہ اس چراغ کی طرف اتنی تیزی سے دوڑ رہا تھا کہ گویا وہاں پہنچتے ہی امان پا جائے گا۔ اُمید اُسے اُڑائے لیے جاتی تھی۔ عربوں کا گروہ پیچھے رہ گیا۔ مشعلوں کی روشنی ماند پڑ گئی۔ صرف ستارے اس کے ساتھ دوڑے چلے آتے تھے۔ بالآخر وہ پُر امید چراغ سامنے آگیا۔ ایک چھوٹا سا پھوس کا جھونپڑا تھا۔ ایک بوڑھا عرب زمین پر بیٹھا ہوا۔ رحل پر قرآن رکھے اسی چراغ کی دھندلی روشنی میں پڑھ رہا تھا۔ داؤد آگے نہ جاسکا۔ اس کی ہمّت نے جواب دے دیا۔ وہ وہیں بے دم ہو کر گر پڑا۔ راستے کی تکان گھر پہنچنے پر محسوس ہوتی ہے۔

عرب نے اُٹھ کر پوچھا تو کون ہے؟

داؤد۔ ایک غریب عیسائی۔ مصیبت میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ اب آپ ہی پناہ دیں تو میری جان بچ سکتی ہے۔

عرب۔ خدائے پاک تیری مدد کرے گا۔ تجھ پر کیا مصیبت پڑی ہے؟

داؤد۔ خوف ہے کہ کہہ دوں تو کہیں آپ بھی میرے خون کے پیاسے نہ ہو جائیں۔

عرب۔ جب تو نے میری پناہ لی تو تجھ کو مجھ سے خوف زدہ نہ ہونا چاہیے۔ ہم مسلمان ہیں جسے ایک بار اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں اس کی تمام عمر حفاظت کرتے ہیں۔

داؤد۔ میں نے ایک مسلمان نوجوان کا خون کر ڈالا ہے۔

بوڑھے عرب کا چہرہ غصّے سے تمتما اُٹھا۔ بولا اس کا نام؟

داؤد۔ اس کا نام جمال تھا۔

عرب سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔ گردن کی رگیں تن گئیں۔ چہرہ پر سفاکانہ سُرخی کی جھلک نظر آئی۔ نتھنے پھڑکنے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں سخت جدوجہد ہو رہی ہے اور وہ ارادے کی انتہائی قوت سے کام لے کر اپنے جذبات کو دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ دو تین منٹ تک وہ اسی اضطراب کی حالت میں بیٹھا ہوا زمین کی طرف تاکتا رہا۔ آخر اس کے اوندھے ہوئے حلق سے یہ الفاظ نکلے۔ ”نہیں نہیں! پناہ لینے والے کی حفاظت کرنی ہی پڑے گی۔ آہ ظالم ! تو جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟ میں اُسی نوجوان کا بدنصیب باپ ہوں۔ جسے آج تو نے اپنی شمشیر سے قتل کیا ہے۔ تو جانتا ہے تو نے مجھ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ تو نے میرے خاندان کا نشان مٹا دیا۔ میرا چراغ گل کردیا آہ ! جمال میرا اکلوتا بیٹا تھا۔ میری ساری تمناؤں کا مدار میری آنکھوں کا نور مجھ اندھے کی لاٹھی۔ میری زندگی کا سہارا، میرے نحیف جسم کی جان تھا۔ ابھی ابھی اسے قبر کی گود میں لٹا کر آیا ہوں۔ آہ! میرا شیر آج خاک کے نیچے سو رہا ہے۔ ایسا دلیر، ایسا دیندار، ایسا خوش رو نوجوان، میری قوم میں دوسرا نہ تھا۔ ظالم تجھے اُس پر تلوار چلاتے ذرا بھی رحم نہ آیا۔ تیرا پتھر کا دل ذرا بھی نہ پسیجا، تو جانتا ہے، کہ مجھے اس وقت تجھ پر کتنا غصہ آرہا ہے؟ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں سے تیری گردن پکڑ کر اس طرح دباؤں، کہ تیری زبان باہر نکل پڑے، تیری آنکھیں کوڑیوں کی طرح نکل کر گر پڑیں،

مگر نہیں تو نے میری پناہ لی ہے۔ فرض میرے ہاتھوں کو باندھے ہوئے ہے کیونکہ ہمارے رسول پاک نے ہدایت کی ہے کہ جو اپنی پناہ میں آوے اس پر ہاتھ نہ اُٹھانا۔ میں نہیں چاہتا کہ نبی کے حکم کے خلاف چل کر دنیا کے ساتھ اپنی عاقبت بھی بگاڑوں، دنیا تو نے بگاڑی، دین اپنے ہاتھوں بگاڑوں، نہیں ضبط مشکل ہے مگر ضبط کروں گا، تاکہ نبی کے سامنے آنکھیں نہ نیچی کرنی پڑیں۔ آ۔ گھر میں آ۔ تیرا پیچھا کرنے والے وہ دوڑے آ رہے ہیں تجھے دیکھ لیں گے تو پھر میری ساری منت و سماجت تیری جان نہ بچا سکے گی۔ تو نہیں جانتا کہ عرب لوگ خون کبھی معاف نہیں کرتے۔"

یہ کہہ کر عرب نے داؤد کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھر میں لے جاکر ایک کوٹھری میں چھپا دیا۔ وہ گھر سے باہر نکلا ہی تھا کہ عربوں کی ایک جماعت اس کے دروازہ پر آ پہنچی، ایک شخص نے پوچھا۔ کیوں شیخ حسن تم نے اِدھر سے کسی کو بھاگتے دیکھا ہے؟

"ہاں دیکھا ہے۔"

"اُسے پکڑ کیوں نہ لیا وہی تو جمال کا قاتل ہے۔"

"یہ جان کر بھی میں نے اس کو چھوڑ دیا۔"

"ایں! غضب خدا کا یہ تم نے کیا کیا؟ جمال حشر کے روز ہمارا دامن پکڑے گا تو ہم کیا جواب دیں گے۔"

"تم کہہ دینا کہ تیرے باپ نے تیرے قاتل کو معاف کردیا۔"

"عرب نے کبھی قاتل کو معاف نہیں کیا۔"

"یہ تمھاری ذمہ داری ہے۔ میں اسے اپنے سر کیوں لوں؟"

عربوں نے شیخ حسن سے زیادہ حجت نہ کی وہ قاتل کی تلاش میں دوڑے۔ شیخ حسن پھر چٹائی پر بیٹھ کر قرآن پڑھنے لگا۔ لیکن اس کا دل پڑھنے میں نہ لگتا تھا۔ دشمن سے بدلہ لینے کی خواہش عربوں کی جبلّی خاصیت تھی۔ خون کا بدلہ خون تھا۔ اس کے لیے خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں، قبیلے کے قبیلے کٹ جاتے تھے، شہر کے شہر ویران ہوجاتے تھے۔ اُس بدلہ کی خواہش پر فتح پانا شیخ حسن کے لیے ناممکن سا معلوم ہوتا تھا۔ بار بار پیارے بیٹے کی صورت اس کی آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ بار بار اس کے دل میں زبردست تحریک ہوتی تھی کہ داؤد کے خون سے غصہّ کی آگ ٹھنڈا کروں، عرب بہادر ہوتے تھے۔ کٹنا مرنا اُن

کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ مرنے والے کے لیے وہ آنسوؤں کے چند قطرے بہا کر پھر اپنے کام میں مصروف ہوجاتے تھے وہ مرنے والے کی یاد کو صرف اُسی حالت میں تازہ رکھتے تھے جب اُس کے خون کا بدلہ لینا ہوتا تھا۔ آخر شیخ حسن بے قرار ہوکر اُٹھا۔ اسے اندیشہ ہوا کہ اب میں اپنے اوپر قابو نہیں رکھ سکتا۔ اس نے تلوار نیام سے باہر کر لی اور دبے پاؤں اس کوٹھری کے دروازہ پر جاکر کھڑا ہوگیا جس میں داؤد چھپا ہوا تھا۔ تلوار کو دامن میں چھپا کر اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ داؤد ٹہل رہا تھا، بوڑھے عرب کا غضبناک چہرہ دیکھ کر داؤد اس کے ارادہ کو تاڑ گیا۔ اُسے بوڑھے سے ہمدردی ہوگئی۔ اس نے سوچا یہ مذہب کا قصور نہیں، قوم کا قصور نہیں۔ میرے لڑکے کو کسی نے قتل کردیا ہوتا تو شاید میں بھی اس کے خون کا پیاسا ہوجاتا۔ یہی انسانی خاصّہ ہے۔

عرب نے کہا۔ داؤد تمھیں معلوم ہے کہ بیٹے کی موت کا کتنا غم ہوتا ہے؟

داؤد۔ اس کا تجربہ تو نہیں ہے۔ مگر اندازہ کرسکتا ہوں۔ اگر میری جان سے آپ کو اُس غم کا ایک حصّہ بھی کم ہوسکے تو لیجیے یہ سر حاضر ہے۔ میں اسے شوق سے آپ کی نذر کرتا ہوں۔ آپ نے داؤد کا نام سُنا ہوگا؟

عرب۔ کیا پیٹر کا بیٹا؟

داؤد۔ جی ہاں۔ میں وہی بدنصیب داؤد ہوں میں صرف آپ کے بیٹے کا قاتل نہیں بلکہ اسلام کا دشمن ہوں۔ مجھے قتل کرکے آپ جمال کے خون کا انتقام ہی نہ لیں گے بلکہ قوم و مذہب کی سچّی خدمت بھی انجام دیں گے۔

شیخ حسن ایک لمحہ تک سکوت میں کھڑا رہا۔ پھر بولا۔ داؤد میں نے تمھیں معاف کیا۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھ عیسائیوں کو کافی اذیتیں پہنچی ہیں، مسلمانوں نے ان پر بڑے بڑے مظالم کیے ہیں۔ اُن کی آزادی چھین لی ہے۔ لیکن یہ اسلام کا نہیں بلکہ مسلمانوں کا قصور ہے۔ فتح کے غرور نے مسلمانوں کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ ہمارے پاک نبی نے وہ تعلیم نہیں دی تھی جس پر ہم آج عمل کر رہے ہیں۔ وہ خود عفو و رحم کے بلند ترین معیار تھے۔ میں اسلام کے نام کو بٹہ نہ لگاؤں گا۔ میری اونٹنی لے لو اور راتوں رات جہاں تک بھاگ سکو، بھاگ جاؤ، کہیں ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ٹھہرنا۔ عربوں کو تمھاری بو بھی مِل گئی تو تمھاری خیریت نہیں ہے۔ جاؤ تمھیں خدائے پاک بخیر و عافیت گھر پہنچا دے۔

بوڑھے شیخ حسن اور اس کے بیٹے جمال کے لیے خدا سے دعا کیا کرتا۔

داؤد بخیریت گھر پہنچ گیا۔ مگر اب وہ داؤد نہ تھا۔ جو اسلام کی بیخ کنی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے خیالات میں گونہ تغیر ہوگیا تھا۔ اب وہ مسلمانوں کی قدر کرتا اور اسلام کا نام عزّت سے لیتا تھا۔

یہ افسانہ 'زمانے' کانپور کے جون 1924 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ ہندی میں یہ مان سرووَر 3 اور اردو میں پریم پالیسی میں شامل ہے۔

نیک بختی کے تازیانے

لڑکے کیا امیر کے ہوں کیا غریب کے، سبھی چلبلی طبیعت کے ہوا کرتے ہیں۔ ان کی فطری شوخی بیشتر ان کی حالت اور حیثیت کی پروا نہیں کرتی۔ نتھوا کے ماں، باپ دونوں مر چکے تھے، یتیموں کی طرح وہ رائے بھولا ناتھ کے دروازے پر پڑا رہتا تھا۔ رائے صاحب کے مزاج میں رحم تھا، کبھی کبھی اسے ایک آدھ پیسے دے دیتے۔ کھانے کو بھی گھر میں اتنا جوٹھا بچتا تھا کہ ایسے کئی یتیم شکم سیر ہوکر کھا سکتے تھے۔ پہننے کو بھی ان کے لڑکوں کے اترے ہوئے کپڑے مل جاتے تھے۔ اس لیے نتھوا اَناتھ ہونے پر بھی دُکھی نہیں تھا۔ رائے صاحب نے اس کو ایک عیسائی کے پنجہ سے چھڑایا تھا۔ انھیں اس کا خیال نہ ہوا کہ مشن میں اس کی تعلیم و تربیت ہوگی، وہاں آرام سے رہے گا، انھیں یہ منظور تھا کہ یہ ہندو ہوکر رہے۔ اپنے گھر کے جوٹھے کھانے کو وہ مشن کی خوراک سے کہیں زیادہ پاک و صاف سمجھتے تھے۔ ان کے کمروں کی صفائی مشن اسکول کی تعلیم سے بہتر تھی۔ ہندو رہے خواہ کسی حالت میں رہے۔ عیسائی ہوا تو پھر ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل گیا۔

نتھوا کو بس رائے صاحب کے بنگلہ میں جھاڑو لگا دینے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ کھانا کھا کر کھیلتا پھرتا تھا۔ کام کے موافق اس کی ذات بھی قائم ہوگئی۔ گھر کے نوکر چاکر اسے بھنگی کہتے تھے اور نتھوا کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا۔ نام کا حیثیت پر کیا اثر پڑسکتا ہے، اس کی اس غریب کو کچھ خبر نہ تھی۔ اسے جھاڑو لگاتے وقت کبھی پیسے پڑے مل جاتے کبھی اور کوئی چیز۔ اس سے وہ سگریٹ خریدا کرتا تھا۔ نوکروں کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے اسے بچپن ہی میں تمباکو، سگریٹ، پان وغیرہ کا چسکا پڑگیا تھا۔

رائے صاحب کے گھر میں یوں تو لڑکے لڑکیوں کی کمی نہ تھی، درجنوں بھانجے بھتیجے بھرے پڑے رہتے تھے مگر ان کی خاص اولاد ایک لڑکی تھی، جس کا نام رتنا تھا۔ رتنا کو پڑھانے کے لیے دو ماسٹر تھے۔ ایک میم صاحب انگریزی پڑھانے آیا کرتی تھیں۔ رائے صاحب کی یہ دلی خواہش تھی کہ رتنا بہمہ صفت موصوف ہو اور جس گھر میں جاوے

اس کی لکشمی بنے۔ وہ اسے دوسرے لڑکوں کے ساتھ نہ رہنے دیتے تھے۔ اس کے لیے اپنے بنگلے میں دو کمرے علاحدہ کر دیے تھے، ایک پڑھنے اور دوسرا سونے کے لیے۔ لوگ کہتے ہیں لاڈ پیار سے بچے ضدّی اور شریر ہو جاتے ہیں۔ رتنا اتنے لاڈ پیار پر بھی بڑی نیک مزاج لڑکی تھی کسی نوکر کو "رے" کہہ کر نہ پکارتی، کسی بھکاری تک کو نہ دُتکارتی۔ نتھوا کو وہ پیسے اور مٹھائیاں دے دیا کرتی تھی، اس سے وہ لونڈا اس کے منہ لگ گیا تھا۔

ایک روز نتھوا رتنا کے سونے کے کمرہ میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ رتنا دوسرے کمرے میں میم صاحب سے انگریزی پڑھ رہی تھی۔ نتھوا کی شامت جو آئی تو جھاڑو لگاتے لگاتے اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ رتنا کے پلنگ پر سوؤں۔ کیسی اجلی چادر بچھی ہوئی، گدا کتنا نرم اور موٹا ہے، کیسا بڑھیا دوشالہ ہے۔ رتنا اسی گدّے پر کتنے آرام سے سوتی ہے جیسے چڑیا کے بچے گھونسلے میں۔ جبھی تو رتنا کے ہاتھ اتنے گورے اور ملائم ہیں کہ جان پڑتا ہے، بدن میں روئی بھری ہوئی ہے۔ یہاں کون دیکھتا ہے۔ یہ سوچ کر اس نے فرش پر پیر پونچھے اور فوراً پلنگ پر جاکر لیٹ گیا، پھر دوشالہ اوڑھ لیا۔ غرور اور خوشی سے اس کا دل پھول اُٹھا وہ فرطِ مسرّت سے دو تین بار پلنگ پر اُچھل پڑا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گویا میں روئی میں پڑا ہوا ہوں۔ جدھر کروٹ لیتا تھا، بدن ایک انگل نیچے سما جاتا تھا۔ یہ سُورگ کا سکھ مجھے کہاں نصیب؟ مجھے بھگوان نے رائے صاحب کا بیٹا کیوں نہ بنایا۔ راحت کا احساس ہوتے ہی اُسے اپنی واقعی حالت کا احساس ہوا اور دل بے قرار ہوگیا، یکایک رائے صاحب کسی ضرورت سے رتنا کے کمرہ میں آئے تو نتھوا کو رتنا کے پلنگ پر پڑا دیکھا۔ غصہ سے جل اُٹھے، بولے۔ کیوں بے سُور! تو یہ کیا کرہا ہے؟

نتھوا ایسا گھبرایا گویا نیند میں پیر پھسل پڑے ہوں۔ چارپائی سے کود کر الگ کھڑا ہوگیا اور پھر جھاڑو کو ہاتھ میں لے لیا۔

رائے صاحب نے پھر پوچھا۔ یہ کیا کر رہا تھا۔

نتھوا۔ کچھ تو نہیں سرکار۔

رائے صاحب۔ اب تیری اتنی ہمت ہوگئی ہے کہ رتنا کے پلنگ پر لیٹے۔ نمک حرام کہیں کا! لانا میرا ہنٹر۔

رائے صاحب نے ہنٹر منگوا کر نتھوا کو خوب پیٹا۔ بے چارہ ہاتھ جوڑتا تھا پیروں پڑتا

تھا، مگر رائے صاحب کا غصہ گھٹنے کا نام نہ لیتا تھا۔ سب نوکر جمع ہوگئے اور نتھوا کے جلے پر نمک چھڑکنے لگے۔ رائے صاحب کا غصہ اور بھی بڑھا۔ ہنٹر ہاتھ سے پھینک کر ٹھوکروں سے مارنے لگے۔ رتنا نے رونے کی آواز سنی تو دوڑی آئی اور سب حال سُن کر بولی۔ دادا جی! بے چارہ مرجائے گا، اب اس پر رحم کیجیے۔

رائے صاحب۔ مرجائے گا تو اُٹھوا کر پھنکوا دوں گا۔ اس بدمعاشی کا مزہ تو پا جائے گا۔

رتنا۔ میری ہی چارپائی تو تھی نا؟ میں اسے معاف کرتی ہوں۔

رائے صاحب۔ ذرا دیکھو تو اپنی چارپائی کی گت پاجی کے بدن کا میل بھر گیا ہوگا؟ بھلا اسے سوجھی کیا؟ کیوں بے تجھے سوجھی کیا؟

یہ کہہ کر رائے صاحب پھر لپکے مگر نتھوا جاکر رتنا کے پیچھے چھپ گیا اس کے سوا اور کہیں امن نہ تھا۔

رتنا نے رو کر کہا۔ دادا جی، میرے کہنے سے اب اس کا قصور معاف کیجیے۔

رائے صاحب۔ کیا کہتی ہو رتنا، ایسے قصور وار کہیں معاف کیے جاتے ہیں۔ خیر تمھارے کہنے سے چھوڑے دیتا ہوں۔ ورنہ آج جان ہی لے کر چھوڑتا۔ سنا بے نتھوا، اپنا بھلا چاہتا ہے تو پھر یہاں نہ آنا۔ اسی دم نکل جا، سُوَر، نالایق!

نتھوا جان لے کر بھاگا۔ پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔ مگر وہ سڑک پر پہنچ کر کھڑا ہوگیا۔ یہاں رائے صاحب اس کا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ یہاں سب لوگ ان کی منہ دیکھی باتیں تو نہ کہیں گے۔ کوئی تو کہے گا لڑکا تھا۔ بھول ہی تو ہوگئی۔ اس پر کیا جان لے لوگے۔ یہاں ماریں تو دیکھوں، گالی دے کر بھاگوں گا، پھر کون مجھے پاسکتا ہے۔ اس خیال سے اس کی ہمت بندھی۔ بنگلہ کی طرف منہ کرکے زور سے بولا۔ یہاں آؤ تو دیکھیں اور پھر بھاگا کہ رائے صاحب نے سُن نہ لیا ہو۔

(۲)

نتھوا تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ رتنا کی میم صاحب اپنی ٹم ٹم پر آتی ہوئی دِکھائی دیں۔ اس نے سمجھا شاید مجھے پکڑنے آ رہی ہیں پھر بھاگا مگر جب پیروں میں دوڑنے کی طاقت نہ رہی تو کھڑا ہوگیا، اس کے دل نے کہا کہ وہ میرا کیا کر لیں گی، میں نے ان کا کچھ بگاڑا ہے۔ ایک لمحہ میں میم صاحب آ پہنچیں ٹم ٹم روک کر بولیں۔ نتھوا، کہاں جا رہے ہو؟

نھوا۔ کہیں نہیں۔

میم۔ رائے صاحب کے یہاں پھر جائے گا تو وہ اور ماریں گے، کیوں نہیں۔ میرے پاس چلتا؟ مشن میں آرام سے رہ ،آدمی ہوجائے گا۔

نھوا۔ کرسٹان تو نہ بناؤ گی؟

میم۔ کرسٹان کیا بھنگی سے بُرا ہے، پاگل؟

نھوا۔ نا بھیّا، کرسٹان نہ بنوں گا۔

میم۔ تیرا نہ جی چاہے، نہ بننا، کوئی زبردستی سے تھوڑا ہی بنا دے گا۔

نھوا تھوڑی دیر تک ٹمٹم کے ساتھ چلا، مگر اس کے دل میں شک موجود تھا۔ دفعتاً وہ رُک گیا میم صاحب نے پوچھا۔ کیوں، چلتا کیوں نہیں۔

نھوا۔ میں نے سنا ہے کہ مشن میں جو کوئی جاتا ہے وہ کرسٹان ہوجاتا ہے۔ میں نہ جاؤں گا، آپ جھانسا دیتی ہیں۔

میم۔ ارے پاگل، وہاں تجھے پڑھایا جائے گا۔ کسی کی چاکری نہ کرنی پڑے گی۔ شام کو کھیل کی چھٹی ملے گی، کوٹ پتلون پہننے کو ملے گا۔ چل کر دو چار دن تو دیکھ لے۔

نھوا نے اس ترغیب کا جواب نہ دیا۔ ایک گلی سے ہوکر بھاگا، جب ٹمٹم دور نکل گئی تو بے فکر ہوکر سوچنے لگا، کہاں جاؤں؟ کہیں کوئی سپاہی پکڑ کر تھانہ میں نہ لے جائے۔ میری برادری کے لوگ تو وہاں رہتے ہیں۔ کیا وہ مجھے اپنے گھر میں نہ رکھیں گے۔ کون بیٹھا بیٹھا کھاؤں گا، کام بھی تو کروں گا۔ بس کسی کو پیٹھ پر رہنا چاہیے، آج کوئی میری پیٹھ پر ہوتا تو مجال تھی کہ رائے صاحب مجھے اس طرح مارتے۔ ساری برادری جمع ہوجاتی۔ گھیر لیتی۔ گھر کی صفائی بند ہوجاتی۔ کوئی دروازے پر جھاڑو تک نہ لگاتا۔ ساری رائے صاحبی نکل جاتی۔ یہ تجویز کرکے گھومتا ہوا بھنگیوں کے محلے میں جا پہنچا۔ شام ہوگئی تھی، کئی بھنگی ایک درخت کے نیچے چٹائیوں پر بیٹھے شہنائی اور طبلہ بجا رہے تھے۔ وہ روزانہ اس کی مشق کرتے تھے یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ علمِ موسیقی کی جتنی یہاں دُرگت ہوئی ہے اتنی اور کہیں نہ ہوئی ہوگی۔ نھوا جاکر وہاں کھڑا ہوگیا۔ اسے بہت دھیان سے سنتے دیکھ کر ایک بھنگی نے پوچھا۔ کچھ گاتا ہے؟

نھوا۔ ابھی تو نہیں گاتا۔ پر سکھا دوگے تو گانے لگوں گا۔

بھنگی۔ بہانا مت کرو، بیٹھ کچھ گا کر سُنا۔ جان تو پڑے کہ تیرے کچھ گلا بھی ہے یا نہیں، گلا ہی نہ ہوگا تو کوئی سکھاوے گا۔

نتھوا۔ معمولی بازاری لڑکوں کی طرح کچھ نہ کچھ گانا جانتا ہی تھا۔ راستہ چلتے کچھ نہ کچھ گانے ہی لگتا تھا۔ فوراً گانے لگا، استاد نے سنا۔ جوہری تھا، سمجھ گیا، یہ کانچ کا ٹکڑا نہیں۔ بولا کہاں رہتا ہے؟

نتھوا نے اپنی سرگزشت سنائی۔ شناسائی ہوگئی۔ اسے سہارا مِل گیا اور ترقی کا وہ موقع بھی جس نے اسے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔

(۳)

تین سال گزر گئے۔ نتھوا کے گانے کی سارے شہر میں دھوم مچ گئی اس میں صرف ایک صفت نہیں بلکہ کئی صفات تھیں۔ گانا، شہنائی بجانا، پکھاوج، سارنگی، تمبورا، ستار، یہ سبھی باجے بجانا جانتا تھا۔ استادوں کو اس کی معجزہ خیز دانائی پر تعجب ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس نے اپنی تعلیم سابقہ کا آموختہ کرلیا ہے۔ لوگ دس دس سالوں تک ستار بجانا سیکھتے رہتے ہیں اور نہیں سیکھ پاتے، نتھوا کو صرف ایک ماہ میں اس کے تاروں سے واقفیت ہوگئی تھی۔ ایسے کتنے ہی جواہر پڑے ہوئے ہیں جو کسی جوہری کے پاس نہ پہنچنے کے سبب مٹی میں مل جاتے ہیں۔

حسنِ اتفاق سے اُسی سال گوالیار میں ایک موسیقی کا کانفرنس ہوئی۔ ملک ملک سے اس فن کے استاد مدعو کیے گئے۔ استاد گھورے کو بھی شرکت کی دعوت ملی۔ نتھوا انھیں کا شاگرد تھا۔ استاد گوالیار گئے تو نتھوا کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ ایک ہفتہ تک گوالیار میں بڑی دھوم دھام رہی۔ ناتھو رام نے وہاں خوب نام پیدا کیا۔ اسے سونے کا تمغہ انعام میں ملا۔ گوالیار کے موسیقی کانفرنس کے صدر نے استاد گھورے سے اصرار کیا کہ ناتھو رام کو موسیقی مدرسے میں داخل کرا دو۔ یہاں گانے کے ساتھ اس کی تعلیم مکمل ہوجائے گی۔ گھورے کو ماننا پڑا ناتھو رام بھی راضی ہوگیا۔

ناتھو رام نے پانچ برسوں میں اسکول کی سب سے اونچی سند حاصل کر لی۔ اور اس کے ساتھ زبان، ریاضی اور طبیعات میں بھی اس کی عقل نے اپنی رسائی کا ثبوت دیا۔ اب وہ سوسائٹی کا زیور تھا۔ کوئی اس سے نہ پوچھتا تھا کہ کون ذات ہو۔ اس کا سارا

طرزِ معاشرت اب گوئیوں کا سا نہیں بلکہ تعلیم یافتہ جماعت کا سا تھا۔ اپنی وضع داری قائم رکھنے کے لیے اس نے اونچی ذات والوں کا سا چال چلن اختیار کر رکھا تھا۔ شراب گوشت کا استعمال ترک کردیا، باقاعدہ طریقہ پر پوجا پاٹ وغیرہ کرنے لگا۔ کوئی عالی نسب برہمن بھی اتنی پاکیزہ زندگی نہ بسر کرتا ہوگا۔ ناتھو رام تو پہلے ہی اس کا نام ہوچکا تھا، اب کچھ اور بھی بہتر سنسکار ہوا۔ وہ ناتھو رام استاد مشہور ہوگیا۔ معمولاً لوگ اس کو استاد ہی کہا کرتے تھے۔ شاہی دربار سے اس کو معقول مشاہرہ ملنے لگا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اتنی شہرت کسی خاص ہنر مندی کو نصیب ہوتی ہے لیکن شہرت بھی وہ پیاس ہے جو کبھی نہیں بجھتی۔ وہ اگستؔ رشی کی طرح سمندر کو پی کر بھی آسودہ نہیں ہوتی۔ استاد جی نے یورپ کا سفر کیا وہ مغربی فنِ موسیقی کے بھی استاد بنا چاہتے تھے۔ جرمنی کے سب سے بڑے موسیقار کالج میں داخل ہوگئے اور پانچ سال کی لگاتار سعی و محنت سے استادی کی سند لے کر اٹلی کی سیاحت کرتے ہوئے گوالیار واپس آئے۔ پھر اس کے ایک ہی ہفتہ بعد ''سیڈن کمپنی'' نے انھیں تین ہزار روپے مشاہرہ پر اپنے سبھی محکمہ جات کا نگراں مقرر کیا۔ وہ یورپ جانے کے قبل ہی ہزاروں روپے جمع کرچکے تھے۔ یورپ میں بھی ناٹکوں اور اوپراؤں میں ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی تھی۔ کبھی کبھی ایک روز میں اس قدر آمدنی ہوجاتی تھی، جتنی یہاں بڑے سے بڑے گوئیوں کو برسوں میں بھی نہیں ہوتی۔ لکھنؤ سے خاص محبت ہونے کے سبب انھوں نے وہیں قیام کرنے کا تہیہ کیا۔

(۴)

استاد ناتھو رام لکھنؤ پہنچے تو ان کا دل بھر آیا۔ یہیں ان کا بچپن گزرا تھا۔ یہیں ایک روز وہ یتیم تھے۔ یہیں گلیوں میں کنکوے لوٹتے پھرتے تھے، یہیں بازاروں میں پیسے مانگتے پھرتے تھے۔ آہ یہیں ان ہنٹروں کی مار پڑی تھی جس کے نشان جسم پر ہنوز موجود تھے۔ یہ اب وہ داغ انھیں نیک بختی کی لکیروں سے بھی زیادہ اچھے معلوم ہوتے تھے۔ واقعی وہ کوڑوں کی مار ان کے لیے شیو جی کا بردان تھی۔ رائے صاحب کے متعلق ان کے دل میں غصہ یا انتقام کا ذرا بھی خیال نہ تھا ان کی برائیاں بھول گئی تھیں۔ صرف بھلائیاں یاد رہ گئی تھیں اور رتنا تو انھیں رحم و محبت کا مجسمہ بن کر یاد آتی۔ مصیبت زخمہائے کہنہ کو بڑھاتی ہے، دولت انھیں پُر کردیتی ہے گاڑی سے اُترے تو ان کا دل دھڑک رہا تھا۔ دس برس کا

لڑکا تیس سال کا مہذب اور تعلیم یافتہ جوان ہوگیا تھا۔ اس کی ماں بھی اسے دیکھ کر نہ کہہ سکتی کہ میرا نتھوا یہی ہے۔ لیکن ان کی کایا پلٹ کی بہ نسبت شہر کی کایا پلٹ اور بھی تعجب خیز تھی۔ یہ لکھنؤ نہیں کوئی دوسرا ہی شہر تھا۔

اسٹیشن سے باہر آتے ہی انھوں نے دیکھا کہ شہر کے کتنے ہی چھوٹے بڑے آدمی ان کا خیر مقدم کرنے کو کھڑے ہیں۔ ان میں ایک نوجوان حسینہ بھی تھی جو رتنا سے بہت مشابہ تھی۔ لوگوں نے ان سے ہاتھ ملایا اور رتنا نے ان کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈال دیا۔ یہ غیر ممالک میں بھارت کا نام روشن کرنے کا انعام تھا۔ استاد کے پیر ڈگمگانے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب کھڑے نہیں رہ سکتے۔ یہ وہی رتنا ہے۔ بھولی بھالی لڑکی نے حسن، شرم، غرور اور انکسار کی دیوی کی صورت اختیار کر لی ہے اس کی جرأت نہ ہوئی کہ رتنا کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھے۔

لوگوں سے ہاتھ ملانے کے بعد وہ اس بنگلہ میں گئے جو ان کے لیے پیشتر ہی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ چونک پڑے یہ وہی تھا جہاں رتنا کے ساتھ وہ کھیلتے تھے۔ سامان بھی وہی تھا۔ تصویریں بھی وہی، کرسیاں اور میزیں وہی۔ شیشہ کے آلات وہی حتیٰ کہ فرش بھی وہی تھا۔ اس کے اندر قدم رکھتے ہوئے استاد صاحب کے دل میں کچھ انھیں جذبات کا اُبھار ہوا جو کسی دیوتا کے مندر میں پہنچ کر کسی دھرماتما ہندو کے دل میں ہوتا ہے۔ وہ رتنا کے خواب گاہ میں گئے تو ان کے دل میں ایسی محسوس ہوئی کہ آنسو بہنے لگے۔ یہ وہی پلنگ ہے، وہی بستر اور وہی فرش! انھوں نے بے قرار ہوکر پوچھا۔ یہ کس کا بنگلہ ہے؟

کمپنی کا منیجر ساتھ تھا۔ بولا۔ ایک رائے بھولا ناتھ ہیں، انھیں کا ہے۔

استاد۔ رائے صاحب کہاں گئے۔

منیجر خدا جانے کہاں گئے۔ یہ بنگلہ تو قرض کے علت میں نیلام ہو رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے تھیٹر کے قریب ہے۔ عمال سے خط کتابت کی اور اس کو کمپنی کے نام سے خرید لیا۔ چالیس ہزار میں بنگلہ مع ساز و سامان مل گیا۔

استاد۔ مفت مل گیا، تمھیں رائے صاحب کی کچھ خبر نہیں؟

منیجر۔ سنا تھا کہ کہیں تیرتھ کرنے گئے تھے۔ خدا جانے لوٹے یا نہیں۔

استاد صاحب جب شام کو بہ فراغت بیٹھے تو انھوں نے ایک شخص سے پوچھا کیوں جی، استاد گھورے کا بھی کچھ حال جانتے ہو؟ ان کا نام بہت سنا ہے۔

اس شخص نے درد بھرے لہجے میں کہا۔ خداوند ان کا حال کچھ نہ پوچھیے۔ شراب پی کر گھر آرہے تھے کہ راستے میں بے ہوش ہوکر سڑک پر گر پڑے اُدھر سے ایک موٹر لاری آرہی تھی ڈرائیور نے دیکھا نہیں ،لاری اُن کے اوپر سے نکل گئی۔ صبح کو لاش ملی۔ خداوند! وہ اپنے فن میں یکتا تھا۔ اب اس کی موت سے لکھنؤ ویران ہوگیا۔ اب ایسا کوئی نہیں رہا جس پر لکھنؤ کو ناز ہو سکے۔ نتھوا نامی ایک لڑکے کو سکھلایا تھا اور اس سے ہم لوگوں کو امید تھی کہ استاد کا نام زندہ رکھے گا مگر وہ یہاں سے گوالیار چلا گیا تھا۔ پھر پتا نہیں کہ کہاں گیا۔

استاد کی روح فنا ہو رہی تھی کہ بھید اب کھلا اور اب کھلا۔ دم رُکا ہوا تھا جیسے کوئی تلوار لیے ہوئے سر پر کھڑا ہو۔ آخر خیریت ہوئی گھڑا چوٹ کھاکر بھی بچ گیا۔

(۵)

استاد صاحب اس مکان میں رہتے تھے، مگر اسی طرح جیسے کوئی نئی دلہن اپنی سُسرال میں رہے۔ ان کے دل سے پُرانے سنسکار نہ مٹتے تھے ان کا دل اس بات کو قبول نہ کرتا تھا کہ یہ میرا مکان ہے۔ وہ زور سے ہنستے تو دفعتاً چونک پڑتے۔ احباب آکر شور مچاتے تو بھی انھیں ایک نا معلوم خوف ہوتا تھا۔ لکھنے پڑھنے کے کمرہ میں شاید وہ سوتے تو انھیں رات بھر نیند ہی نہ آتی۔ یہ خیال دل میں جما ہوا تھا کہ یہ نوشت و خواند کا کمرہ ہے۔ بڑی خواہش ہونے پر بھی وہ پُرانے سامان کو بدل نہ سکتے تھے اور رتنا کی خواب گاہ کو تو انھوں نے پھر کبھی نہیں کھولا۔ وہ جیوں کا تیوں بند پڑا رہتا تھا اس کے اندر جاتے ہوئے ان کے پیر کانپنے لگتے تھے۔ اس پلنگ پر سونے کا خیال بھی انھیں نہیں ہوا۔

لکھنؤ میں کئی بار انھوں نے یونیورسٹی میں اپنے فن کا کمال دکھلایا۔ کسی راجا یا رئیس کے گھر پر اب وہ نہ جاتے تھے، خواہ کوئی انھیں لاکھوں ہی کیوں نہ دے، یہ ان کا عہد تھا۔ لوگ ان کا غیر معمولی گانا سُن کر غیر معمولی حظ اُٹھاتے تھے۔

ایک روز علی الصباح استاد سندھیا سے اُٹھے تھے کہ رائے بھولا ناتھ ان سے ملنے آئے۔ رتنا بھی ان کے ساتھ تھی، استاد پر رُعب غالب آگیا۔ بڑے بڑے یورپ والے

ٹھیٹروں میں بھی ان کا دل اس قدر خوف زدہ نہ ہوا تھا۔ انھوں نے زمیں بوس ہوکر رائے صاحب کو سلام کیا۔ بھولا ناتھ ان کی منکسر مزاجی پر کچھ متعجب سے ہوگئے۔ بہت دن ہوئے جب لوگ انھیں سلام کیا کرتے تھے۔ اب تو جہاں جاتے ہیں مضحکہ اُڑایا جاتا ہے۔ رتنا بھی نادم ہوگئی۔ رائے صاحب نے خوف کی نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ آپ کو یہ جگہ تو پسند آئی ہوگی؟

استاد۔ جی ہاں، اس سے بڑھیا جگہ کا تو میں خیال ہی نہیں کرسکتا تھا۔

بھولا ناتھ۔ یہ میرا ہی بنگلہ ہے۔ خود میں نے اسے بنوایا اور خود میں نے اسے بگاڑ دیا۔

رتنا نے خجالت سے کہا۔ دادا جی، ان باتوں سے کیا فائدہ؟

بھولا۔ فائدہ نہیں ہے تو بیٹی نقصان بھی نہیں ہے۔ شرفاء سے اپنی مصیبت کا حال کہہ کر دل کو تسکین ہوتی ہے۔ تو ہاں صاحب۔ یہ میرا ہی بنگلہ ہے یا یوں کہیے کہ تھا۔ پچاس ہزار سالانہ علاقہ سے ملتے تھے مگر کچھ لوگوں کو صحبت میں مجھے سٹہ بازاری کا چسکا پڑگیا۔ دو تین بار متواتر بازی ہاتھ رہی۔ ہمت کھُل گئی، لاکھوں کے وارے نیارے ہونے لگے۔ مگر ایک ہی گھاٹے میں ساری کسر نکل گئی۔ بدھیا بیٹھ گئی۔ ساری جائداد کھو بیٹھا۔ سوچیے پچیس لاکھ کا سودا تھا۔ کوڑی چت پڑتی تو آج اس بنگلہ کا کچھ اور ہی ٹھاٹھ ہوتا ورنہ اب اگلے دنوں کی یاد کرکے کفِ افسوس ملتا ہوں۔ یہ میری رتنا کو آپ کا گانا بہت پسند ہے۔ جب دیکھو آپ ہی کا تذکرہ کیا کرتی ہے۔ اسے میں بی، اے تک پڑھایا۔

رتنا کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا۔ بولی۔ دادا جی! استاد میرا سب جانتے ہیں انھیں میرے تعرف کی احتیاج نہیں۔ استاد صاحب معاف کیجیے گا۔ والد صاحب اس گھاٹے کے سبب کچھ شکستہ خاطر ہوگئے ہیں۔ وہ آپ سے التجا کرنے آئے ہیں کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو وہ کبھی کبھی اس بنگلہ کو دیکھنے آیا کریں، اس سے ان کے آنسو پونچھ جائیں گے۔ انھیں اس خیال سے تسکین ہوگی کہ میرا کوئی دوست اس کا مالک ہے۔ بس یہی کہنے کے لیے وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔

استاد نے منکسرانہ لہجے میں کہا۔ اس کے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گھر آپ کا ہے، جس وقت جی چاہے شوق سے تشریف لائیں بلکہ آپ کی خواہش ہو تو آپ

اس میں قیام کرسکتے ہیں۔ میں اپنے لیے کوئی مکان تلاش کرلوں گا۔

رائے صاحب نے شکریہ ادا کیا اور چلے گئے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے روز یہاں ضرور آتے اور گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ رتنا بھی ان کے ساتھ ضرور آتی۔ پھر وہ ایک روزانہ آنے لگے۔

ایک روز انھوں نے استاد کو تنہائی میں لے جاکر پوچھا معاف فرمایئے گا آپ اپنے بال بچّوں کو کیوں نہیں بُلا لیتے؟ تنہائی میں آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔

استاد۔ میری تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔ اور نہ کرنا چاہتا ہوں یہ کہتے ہی استاد نے آنکھیں نیچی کرلی۔

بھولا ناتھ۔ یہ کیوں؟ شادی سے آپ کو کیوں نفرت ہے؟

استاد۔ کوئی خاص سبب تو نہیں بتا سکتا، طبیعت ہی تو ہے۔

بھولا۔ آپ برہمن ہیں؟

استاد کا چہرہ فق ہوگیا۔ کچھ جھجکتے ہوئے بولے۔ یورپ کے سفر کے بعد ذات پات نہیں باقی رہتی۔ پیدائش سے خواہ کچھ ہوں اعمال سے تو شودر ہی ہوں۔

بھولا ناتھ۔ آپ کی منکسر مزاجی کو آفرین ہے۔ دنیا میں ایسے نیک نفس آدمی بھی موجود ہیں۔ میں بھی اعمال ہی سے ذات کا قائل ہوں۔ مروت، انکسار، اخلاق، ایمان، علم دوستی، یہی سب برہمنوں کے اوصاف ہیں اور میں آپ کو برہمن ہی سمجھتا ہوں، جس میں یہ باتیں نہ ہوں وہ برہمن نہیں، ہرگز نہیں۔ رتنا کو آپ سے بہت اُنس ہے۔ آج تک کوئی مرد اس کے مرغوب نظر نہیں ہوا، مگر آپ نے اس کے دل کو مسخر کر لیا۔ اس گستاخی کے لیے معاف کیجیے گا۔ آپ کے والدین؟

استاد۔ میرے والدین تو آپ ہی ہیں۔ مجھے کس نے پیدا کیا یہ میں خود نہیں جانتا میں بہت چھوٹا تھا۔ جبھی ان کا انتقال ہوگیا تھا۔

رائے صاحب۔ آہ! آج وہ زندہ ہوتے تو آپ کو دیکھ کر آج ان کی گز بھر کی چھاتی ہوتی۔ ایسے سپوت کہاں ہوتے ہیں۔

اتنے میں رتنا ایک کاغذ لیے ہوئے آئی اور رائے صاحب سے بولی۔ دادا جی، استاد صاحب شعر بھی کہتے ہیں۔ میں ان کی میز پر سے یہ اُٹھا لائی ہوں۔ سروجنی نائڈو کے سوا

میں نے ایسی نظم او کہیں نہیں دیکھی۔

استاد نے نیچی نگاہوں سے ایک بار رتنا کی طرف دیکھا اور شرماتے ہوئے بولے۔ یوں ہی کچھ لکھ لیا تھا، میں شعر کہنا کیا جانوں۔

(۶)

محبت سے دونوں بے قرار ہو رہے تھے۔ رتنا اوصاف پر فریفتہ تھی، استاد اس کی محبت سے مغلوب تھے۔ اگر رتنا اس کے راستے میں نہ آتی تو شاید وہ اس سے واقف بھی نہ ہوتے مگر محبت کے پھیلے ہوئے ہاتھوں کی کشش کسی پر اثر انداز نہ ہوگی؟ ایسا دل کہاں ہے جس کو محبت جیت نہ سکے۔

استاد بڑے شش و پنج میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کا دل کہتا تھا کہ جس وقت رتنا کو میری اصلیت معلوم ہوجائے گی اسی وقت وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے منہ پھیر لے گی۔ وہ کتنی ہی فراخ دل ہو، ذات کی قیود کو کتنا ہی تکلیف دہ سمجھتی ہو، مگر اس نفرت سے نہیں بچ سکتی جو قدرتاً اس کو مجھ سے ہوگی۔ مگر یہ جانتے ہوئے بھی ان کی ہمت نہ پڑتی کہ اصلیت کا انکشاف کردیں۔ آہ۔ اگر نفرت ہی تک ہوتی تو کوئی بات نہ تھی مگر اسے رنج ہوگا۔ تکلیف ہوگی؟ اس کا نازک دل شق ہوجائے گا، اس حالت میں نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ اسے اس ناواقفیت کی حالت میں رکھ کر رشتہ محبت کو مضبوط کرنا انھیں پرلے سرے کا کمینہ پن معلوم ہوتا تھا۔ یہ دغا ہے۔ فریب ہے۔ مکاری ہے جو آئین محبت کے خلاف ہیں۔ اس تذبذب میں ہوتے ہوئے وہ کچھ طے نہ کرسکتے تھے کہ کیا کرنا چاہیے۔ ادھر رائے صاحب کی آمد و رفت روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ ان کا دلی ارادہ ایک ایک لفظ سے ظاہر ہوتا تھا۔ رتنا کی آمد و رفت بند ہوتی جاتی تھی جس سے ان کا منشاء اور بھی صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ اس طرح تین چار ماہ گزر گئے استاد اپنے دل میں سوچتے کہ وہی رائے صاحب ہیں جنھوں نے صرف رتنا کے پلنگ پر ذرا دیر لیٹ رہنے کے پاداش میں مجھے گھر سے نکال دیا تھا، جب انھیں معلوم ہوگا کہ میں وہی یتیم، اچھوت، بیکس لڑکا ہوں۔ تو انھیں کتنا رنج، کتنی خجالت، کتنی مایوسی، کتنا پچھتاوا ہوگا۔

ایک روز رائے صاحب نے کہا۔ شادی کی ساعت تجویز کر لینی چاہیے۔ اس ساعت میں میں اس فرض سے سبکدوش ہوجانا چاہتا ہوں۔ استاد نے بات کا مطلب بھی سمجھ کر یہ

سوال کیا کیسی ساعت؟

رائے صاحب۔ یہی رتنا کے بیاہ کی۔ میں زائچہ کا تو قائل نہیں، مگر بیاہ تو مبارک ساعت ہی میں ہوگا۔ استاد زمین کی طرف تاکتے رہے، کچھ نہ بولے۔

رائے صاحب۔ میری حالت تو آپ پر روشن ہی ہے۔ کش اور کنیا کے سوا اور کسی قابل نہیں ہوں، رتنا کے سوا اور کون ہے جس کے لیے اُٹھا رکھتا؟

استاد اپنے خیالات میں محو تھے۔

رائے صاحب۔ رتنا کو آپ خود جانتے ہیں، وہ اچھی ہو یا بُری مگر آپ کو اسے قبول کرنا ہوگا۔

استاد کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

رائے صاحب۔ مجھے یقینِ کامل ہے کہ ایشور نے آپ اس کے لیے بھیجا ہے۔ میری ایشور سے یہی دعا ہے کہ تم دونوں کی زندگی آرام سے بسر ہو۔ میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہوسکتی۔ اس سے فارغ ہوجانے پر ارادہ ہے کہ کچھ دن بھگوت بھجن کروں۔ غالبًا آپ ہی اس ریاضت کے ثمرہ کے بھی مستحق ہوں گے۔

استاد نے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ صاحب، آپ میرے والد کی جگہ پر ہیں، مگر میں اس لائق ہرگز نہیں ہوں۔

رائے صاحب نے انھیں گلے لگاتے ہوئے کہا۔ بیٹا، تم ہمہ صفت موصوف ہو۔ تم سوسائٹی کے زینت ہو۔ میرے لیے یہ واقعی فخر کی بات ہے کہ تم جیسا داماد ملے۔ میں آج ہی تاریخ، ساعت، وغیرہ ٹھیک کرکے کل آپ کو مطلع کروں گا۔

یہ کہہ کر رائے صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے، استاد کچھ کہنا ہی چاہتے تھے مگر موقع نہ ملا، یا یوں کہو کہ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ اتنی روحانی قوت نہ تھی، نفرت برداشت کرنے کی اتنی طاقت نہ تھی۔

(۷)

شادی ہوئے ایک مہینہ ہوگیا۔ رتنا کے آنے سے شوہر کا گھر روشن ہوگیا ہے اور شوہر کے پاک دل کے تالاب میں کنول کھل گیا۔ رات کا وقت تھا۔ استاد کھانا کھا کر لیٹے

ہوئے تھے، اسی پلنگ پر جس نے کسی روز انھیں اس مکان سے نکلوایا تھا۔ جس نے ان کی قسمت کو پلٹ دیا تھا۔

ایک ماہ سے وہ موقع کی تلاش میں تھے کہ یہ بھید رتنا سے بتلا دوں۔ ان کا سنسکاروں سے متاثر دل یہ نہیں مانتا کہ میری خوش قسمتی میرے اوصاف ہی کی رہینِ منت ہے۔ وہ اپنے روپے کو بھٹی میں پگھلاکر اس کی قیمت جاننے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر موقع نہیں ملتا۔ رتنا جیوں ہی سامنے آجاتی ہے ان پر جادو سا ہوجاتا ہے۔ باغ میں رونے کون جاتا ہے، رونے کے لیے تو اندھیری کوٹھری ہی چاہیے۔

اتنے میں رتنا مسکراتی ہوئی کمرہ میں آئی۔ چراغ کی روشنی دھیمی پڑ گئی!

استاد نے مسکرا کہا۔ اب چراغ گل کر دوں نا؟

رتنا بولی۔ کیوں؟ کیا مجھ سے شرم آتی ہے؟

استاد۔ ہاں، در حقیقت شرم آتی ہے۔

رتنا۔ اس لیے کہ میں تمھیں جیت لیا۔

استاد۔ نہیں، اس لیے کہ میں نے تمھیں دھوکا دیا۔

رتنا۔ تم میں دھوکا دینے کی طاقت نہیں ہے۔

استاد۔ تم نہیں جانتیں، میں نے تم کو بہت بڑا دھوکا دیا ہے۔

رتنا۔ سب جانتی ہوں۔

استاد۔ جانتی ہو کہ میں کون ہوں؟

رتنا۔ خوب جانتی ہوں۔ بہت دنوں سے جانتی ہوں۔ جب ہم تم دونوں اسی باغیچہ میں کھیلا کرتے تھے۔ میں تم کو مارتی تھی اور تم روتے تھے۔ میں تم کو اپنی جھوٹی مٹھائیاں دیتی تھی اور تم دوڑ کر لیتے تھے۔ جب بھی مجھے تم سے محبت تھی۔ ہاں وہ رحم کی شکل میں نمودار ہوتی تھی۔

استاد نے حیرت سے پوچھا۔ رتنا یہ جان کر بھی تم نے ....

رتنا۔ ہاں جان کر ہی ،نہ جانتی تو شاید نہ کرتی۔

استاد۔ یہ وہی پلنگ ہے۔

رتنا۔ اور میں گھات میں۔

استاد نے اسے گلے لگا کر کہا۔ تم چھما کی دیوی ہو!

رتنا نے جواب دیا، میں تمھاری لونڈی ہوں۔

استاد۔ رائے صاحب بھی جانتے ہیں۔

رتنا۔ نہیں، وہ نہیں جانتے۔ ان سے بھول کر بھی نہ کہنا ورنہ وہ خودکشی کر لیں گے۔

استاد۔ وہ تازیانے ابھی تک یاد ہیں۔

رتنا۔ اب پتا جی کے پاس اس کے کفارہ کے لیے کچھ بھی نہیں رہ گیا۔ کیا اب بھی تمھیں صبر نہیں ہوا۔

یہ افسانہ پہلی بار جون 1924 کے ماہنامہ 'پربھا' میں 'شوبھاگیہ کے کوڑے' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اردو میں 'فردوسِ خیال' اور ہندی میں مان سروور 3 میں شامل ہے۔

ابھاگن

پرشرام۔ وہیں وہیں، وہیں دالان میں ٹھہرو۔

مریادا۔ کیوں کیوں، مجھ میں کچھ چھوت لگ گیا؟

پرشرام۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اتنے دنوں کہاں رہیں؟ کس کے ساتھ رہیں؟ کس طرح رہیں؟ اور پھر یہاں کس کے ساتھ آئیں؟ تب .... سوچوں گا۔

مریادا۔ کیا ان باتوں کے پوچھنے کا یہی وقت ہے؟ پھر موقع نہ ملے گا؟

''ہاں یہی بات ہے۔ تم اشنان کرکے ندی سے تو میرے ساتھ ہی نکلی تھیں۔ میرے پیچھے پیچھے کچھ دور تک آئیں بھی۔ میں پھر پھر کر تمھیں دیکھتا جاتا تھا۔ پھر یکایک تم کہاں غائب ہوگئیں؟''

''تم نے دیکھا نہیں۔ ناگے سادھوؤں کی ایک ٹولی سامنے سے آگئی۔ سب لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ میں بھی ریلے میں پڑ کر جانے کدھر چلی گئی۔ جب ذرا بھیڑ کم ہوئی تو تمھیں ڈھونڈھنے لگی۔ پر تم کہیں نظر نہ آئے۔''

''اچھا تب؟''

''تب میں ایک کنارے بیٹھ کر رونے لگی۔ کچھ سُوجھ نہ پڑتا تھا، کہاں جاؤں، کس سے کہوں۔ شام تک وہیں بیٹھی روتی رہی۔''

''اتنا طول کیوں دیتی ہو؟ وہاں سے پھر کہاں گئیں؟''

''شام کو ایک آدمی نے آکر پوچھا تمھارے گھر کے لوگ کھو تو نہیں گئے ہیں؟ میں نے کہا ہاں۔ تب اُس نے تمھارا نام، پتا، ٹھکانا پوچھا۔ اس نے سب ایک کتاب پر لکھ لیا اور مجھ سے بولا میرے ساتھ آؤ۔ میں تمھیں تمھارے گھر پہنچادوں گا۔''

''وہ کون آدمی تھا؟''

''وہاں کی سیوا سمتی کا کوئی والنٹیر تھا۔''

''تو تم اس کے ساتھ ہولیں؟''

"اور کیا کرتی۔ وہ مجھے سیوا سمتی کے دفتر میں لے گیا۔ وہاں ایک شامیانے میں لمبی ڈاڑھی والا آدمی بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ ان والنٹیروں کا سردار تھا۔ اور بھی کتنے ہی خدام وہاں کھڑے تھے۔ اُس نے میرا پتا ٹھکانا ایک رجسٹر میں لکھ کر مجھے ایک علاحدہ شامیانہ میں بھیج دیا۔ جہاں اور بھی کئی کھوئی ہوئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"تم نے سردار سے اُسی وقت کیوں نہ کہا کہ مجھے گھر پہنچا دو۔"

میں نے ایک بار نہیں سیکڑوں بار کہا۔ مگر وہ یہی کہتے رہے کہ جب تک میلہ ختم نہ ہوجائے اور سب کھوئی ہوئی عورتیں جمع نہ ہوجائیں۔ میں تمھیں بھیجنے کا انتظام نہیں کرسکتا۔ میرے پاس نہ اتنے آدمی ہیں نہ اتنے روپے۔"

"روپے کی تمھیں کیا کمی تھی۔ کوئی ایک سونے کی چیز بیچ دیتیں تو کافی روپے مل جاتے۔"

"آدمی تو نہیں تھے۔"

"تم نے یہ کہا تھا کہ خرچ کا تردد نہ کیجیے۔ میں اپنے زیور فروخت کرکے دے دوں گی۔"

"نہیں۔ یہ تو میں نہیں کہا۔"

"تمھیں اس وقت بھی زیور اتنے عزیز تھے؟"

"اور سب عورتیں کہنے لگیں، گھبرائی کیوں جاتی ہو؟ یہاں کسی بات کا ڈر نہیں ہے۔ ہم سبھی جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتے ہیں۔ مگر کیا کریں مجبوری ہے۔ میں بھی خاموش ہو رہی۔"

"اور سب عورتیں کنوئیں میں گر پڑتیں؟"

"جانتی تو تھی کہ یہ لوگ دھرم کے ناتے میری حفاظت کر رہے ہیں۔ کچھ میرے غلام نہیں ہیں۔ پھر ضد کس منہ سے کرتی؟ یہ بات بھی ہے کہ بہت سی عورتوں کو وہاں دیکھ کر میری دل جمعی ہوگئی۔"

"ہاں اس سے بڑھ کر دل جمعی کی اور کیا بات ہوسکتی تھی۔ اچھا وہاں کتنے دن اس دل جمعی اور اطمینان کا لُطف اُٹھاتی رہیں۔ میلہ تو دوسرے ہی دن اُٹھ گیا ہوگا۔"

"رات بھر میں عورتوں کے ساتھ اسی شامیانے میں رہی۔"

"اچھا تم نے مجھے تار کیوں نہ دلوا دیا۔"

"میں نے سمجھا جب یہ لوگ خود پہنچانے کے لیے کہتے ہیں۔ تو تار کیوں دوں؟

"خیر رات بھر تم وہیں رہیں۔ نوجوان والنٹیر بار بار اندر آتے جاتے ہوں گے؟"

"صرف ایک بار ایک آدمی کھانے کے لیے پوچھنے آیا تھا۔ جب ہم سبھوں نے کھانے سے انکار کر دیا تو وہ چلا گیا۔ اور پھر رات بھر کوئی نہ آیا۔ میں تو برابر جاگتی رہی۔"

"یہ میں کبھی نہ مانوں گا کہ وہاں اتنے نوجوان تھے۔ اور کوئی اندر نہ گیا۔ سمتی کے لوگ آسمان کے فرشتے نہیں ہوتے۔ خیر۔ وہ ڈڑھیل تو ضرور ہی دیکھ بھال کرنے آیا ہوگا؟"

"ہاں وہ آتے تھے۔ مگر دروازہ ہی پر سے پوچھ کر لوٹ جاتے تھے۔ ہاں جب ایک عورت کے پیٹ میں درد ہونے لگا تو دو تین بار دوا پلانے آئے تھے۔"

"نکلی نہ وہی بات، میں ان بدمعاشوں کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔ خاص کر تلک اور مالا والے ڈڑھیلوں کی حرفتوں سے تو میں خوب واقف ہوں۔ تو یہ حضرت کئی بار دوائیں دینے گئے۔ کیوں تمھارے پیٹ میں تو درد نہیں ہونے لگا تھا۔"

"تم ایک بزرگ اور نیک آدمی سے خواہ مخواہ بدظن ہو رہے ہو۔ وہ بے چارے ایک تو میرے باپ کے برابر تھے۔ دوسرے برابر آنکھیں نیچی کیے رہتے تھے۔"

"ہاں! وہاں سب دیوتا ہی دیوتا جمع تھے۔ خیر! تم رات بھر وہاں رہیں، دوسرے دن کیا ہوا؟"

"دوسرے دن بھی وہیں رہی۔ ایک والنٹیر سب عورتوں کو ساتھ لے کر خاص خاص متبرک مقامات کی سیر کرانے لے گیا۔ دوپہر کو لوٹ کر ہم سب نے کھانا کھایا۔"

"تو وہاں تم نے سیر سپاٹا بھی خوب کیا۔ کوئی تکلیف نہ ہونے پائی۔ دعوت کے بعد گانا بجانا ہوا ہوگا؟"

"گانا بجانا تو نہیں ہوا، ہاں سب اپنا اپنا دُکھڑا روتی رہیں۔ شام تک میلہ اُٹھ گیا تو دو سیوک ہم لوگوں کو لے کر اسٹیشن آئے۔"

"مگر تم تو آج ساتویں دن آ رہی ہو اور وہ بھی اکیلی؟"

"اسٹیشن پر ایک حادثہ ہوگیا۔"

"ہاں وہ تو میں سمجھ ہی رہا تھا۔ کیا حادثہ ہوا؟"

"جب ہمارے ساتھ کارسیوک ٹکٹ لینے جا رہا تھا۔ تو ایک آدمی نے آکر اُس سے کہا۔ یہاں گوپی ناتھ کی دھرم شالا میں ایک بابو جی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اُن کی عورت کھو گئی ہے۔ اُن کا بھلا سا نام ہے۔ یاد نہیں آتا۔ گورے گورے لمبے سے خوبصورت آدمی ہیں۔ لکھنؤ جھوائی ٹولے میں مکان ہے۔ تمھارا حلیہ اس نے ایسا ٹھیک بیان کیا کہ مجھے اُس پر یقین آگیا۔ میں سامنے آکر بولی۔ تم بابو کو جانتے ہو۔ وہ ہنس کر بولا۔ جانتا نہیں ہوں تو تمھیں تلاش کیوں کرتا پھرتا ہوں۔ تمھارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے۔ سب عورتیں کہنے لگیں۔ چلی جاؤ۔ تمھارے شوہر گھبرا رہے ہوں گے۔ والنٹیر نے اُس سے دو چار باتیں پوچھ کر مجھے اُس کے ساتھ کر دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کسی شیطان کے پنجہ میں پھنسی جا رہی ہوں۔ دل میں خوش تھی کہ اب بائو کو دیکھوں گی۔ تمھارے درشن پاؤں گی۔ شاید اسی اشتیاق نے مجھے گمراہ کر دیا۔"

"تو تم اس آدمی کے ساتھ چل دیں، وہ کون تھا؟"

"کیا بتلاؤں کون تھا۔ کوئی دلال تھا۔"

"تمھیں یہ بھی نہ سوجھی کہ کہتیں جاکر بابو جی کو بھیج دو۔"

"مصیبت آتی ہے تو عقل پر پردہ پڑجاتا ہے۔"

"دیکھو کوئی آرہا ہے؟"

"میں غسل خانہ میں چُھپی جاتی ہوں۔"

"آؤ بھابی۔ کیا ابھی سوئیں نہیں۔ دس تو بجے ہوں گے؟"

"باسدیو کو دیکھنے کو جی چاہتا تھا بھیا۔ کیا سو گیا؟"

"ہاں ابھی روتے روتے سوگیا ہے۔"

"کچھ مریادا کی خبر بھی ملی۔ اب ملے بھی تو تمھارے کس کام کی۔ گھر سے نکلی ہوئی عورت تھان سے بھاگی ہوئی گھوڑی ہے، جس کا کچھ بھروسہ نہیں۔"

"کہاں سے کہاں میں اُسے نے کر نہانے گیا۔"

"ہونہار ہے بھیا ہونہار! اچھا تو میں جاتی ہوں۔"

مریادا باہر آکر بولی۔ "ہونہار نہیں تمھاری چال ہے۔ باسدیو کو پیار کرنے کے بہانے

تم اس گھر پر سکہ جمانا چاہتی ہو۔ تمھیں خوب سمجھتی ہوں۔"

پرشرام۔ بکو مت۔ وہ دلال تمھیں کہاں لے گیا؟

مریادا۔ میرے مالک! مجھ سے یہ نہ پوچھیے۔ مجھے کہتے شرم آتی ہے۔

"یہاں آتے تو اور بھی شرم آنی چاہیے تھی۔"

"میں ایشور کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ میں نے کسی کو اپنا جسم چھونے بھی نہیں دیا۔"

"دلال کا حلیہ بیان کر سکتی ہو؟"

"سانولا سا ٹھنگھنا آدمی تھا۔ نیچا کرتہ پہنے ہوئے تھا۔"

"گلے میں تعویذ بھی تھی؟"

"ہاں ہاں تھی۔"

"وہ دھرم شالا کا مہتر تھا۔ میں نے اُس سے تمھارے گم ہوجانے کا ذکر کیا تھا۔ اُس بدمعاش نے یہ سوانگ رچا۔"

"مجھے تو وہ کوئی برہمن معلوم ہوتا تھا۔"

"نہیں وہ مہتر تھا۔ تو وہ تمھیں اپنے گھر لے گیا؟"

"ہاں! اُس نے مجھے تانگے پر بٹھایا اور ایک تنگ گلی میں ایک چھوٹے سے مکان کے اندر لے جاکر بولا۔ تم یہیں بیٹھو۔ تمھارے بابو جی یہیں آئیں گے۔ اب مجھے پتہ چلا کہ مجھے دھوکا دیا گیا۔ رونے لگی۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کے بعد چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ایک بڑھیا آئی۔ اور مجھے پُھسلانے لگی۔ میں نے اُسے بہت پھٹکارا اور رات بھر روتی رہی۔ دوسرے دن پھر دونوں مجھے بہکانے لگے کہنے لگے رو رو کر مر بھی جاؤ گی، مگر یہاں کوئی تمھاری مدد کو نہ آئے گا۔ تمھارا ایک گھر چھوٹ گیا۔ ہم تمھیں اُس سے کہیں اچھا گھر دیں گے۔ جہاں تم سونے کے کور کھاؤ گی۔ اور ہیروں سے لد جاؤ گی۔ جب میں نے دیکھا یہاں سے کسی طرح نہیں نکل سکتی تو میں نے ایک چال چلی۔"

"خیر سُن چکا۔ میں تمھارا ہی کہنا مانے لیتا ہوں کہ تم نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ پر مجھے اب تم سے نفرت ہو رہی ہے۔ تم میرے لیے اب وہ ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ جو پہلے تھیں۔ اس گھر میں تمھارے لیے جگہ نہیں ہے۔"

مریادا نے رو کر کہا۔ ’’سوامی جی! یہ ستم نہ ڈھایئے۔ یوُں کُند چھری سے میرا گلا نہ ریتیے۔ میں آپ کی وہ لونڈی ہوں جو پہلے تھی۔ سوچیے میری کیا حالت ہو گی۔‘‘

میں یہ سب سوچ چکا اور فیصلہ کرچکا۔ آج ایک ہفتہ سے یہی سوچ رہا ہوں۔ تم جانتی ہو۔ میں برادری کی پروا نہیں کرتا۔ چھوت چھات کو میں پہلے ہی خیرباد کہہ چکا ہوں۔ دیوی دیوتاؤں پر، مذہب کے رسوم پر مجھے ذرا بھی اعتقاد نہیں۔ پر جس عورت پر دوسروں کی نگاہیں پڑ چکیں۔ جو ایک ہفتہ تک نہ جانے کہاں اور کس حالت میں رہی۔ اُسے قبول کرنا میرے لیے غیر ممکن ہے۔ اگر یہ ظلم ہے، ستم ہے۔ تو ایشور کی جانب سے ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔

’’میری بے کسی پر آپ کو ذرا بھی رحم نہیں آتا۔‘‘

’’جہاں نفرت ہے۔ وہاں رحم کہاں؟ میں تمھاری پرورش کا بار اُٹھانے کو تیار ہوں۔ جب تک زندہ رہوں گا۔ تمھیں نان نفقہ کی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ پر اب تم میری بیوی، نہیں ہوسکتیں۔‘‘

’’میں اپنے بیٹے کا منہ نہ دیکھوں اگر کسی نے میرے جسم کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔‘‘

’’تمھارا کسی غیر مرد کے ساتھ ایک لمحہ بھی تخلیہ میں رہنا تمھاری عصمت میں داغ لگانے کو کافی ہے۔ یہ عجیب وغریب رشتہ ہے۔ رہے تو ابد تک رہے، ٹوٹے تو ایک پل میں ٹوٹ جائے۔ تمھیں بتاؤ کسی مسلمان نے مجھے زبردستی اپنا جھوٹا کھلا دیا ہوتا تو تم مجھے قبول کرتیں؟‘‘

’’وہ .... وہ .... تو دوسری بات ہے۔ .... یعنی ....‘‘

’’نہیں وہ بھی یہی بات ہے۔ جہاں جذبات کا تعلق ہے۔ وہاں بحث اور دلیل سے کام نہیں چلتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی کہہ دے کہ تمھارے گھڑے کو مہتر نے چھو لیا ہے۔ تو تم وہ پانی ہرگز نہ پیو گی۔ اپنے دل سے سوچو میں تمھارے ساتھ انصاف کر رہا ہوں، یا ظلم؟‘‘

’’میں تمھاری چھوئی ہوئی چیزیں نہ کھاتی۔ تم سے الگ رہتی۔ پر تمھیں گھر سے تو نہ نکال سکتی تھی۔ مجھے اسی لیے دُتکار رہے ہو نہ کہ تم گھر کے مالک ہو اور سمجھتے ہو میں اس کی پرورش کرتا ہوں۔‘‘

"یہ بات نہیں ہے۔ میں اتنا کمینہ نہیں ہوں۔"

"تو یہ تمھارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں! آخری۔"

"جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"جانتا بھی ہوں، اور نہیں بھی جانتا۔"

"مجھے باسدیو کو لے جانے دوگے؟"

"باسدیو میرا بیٹا ہے۔"

"اسے ایک بار پیار کر لینے دوگے؟"

"خوشی سے نہیں۔ ہاں تمھارا جی چاہے تو دُور سے دیکھ سکتی ہو۔"

مریادا دو تین منٹ تک سکتہ کے عالم میں کھڑی رہی۔ جیسے اپنی عمر بھر کی کمائی اپنی ساری بساط، ساری کائنات سینہ کے اندر سے ٹٹول کر نکال رہی ہو۔ جیسے اُسے شبہ ہو رہا ہو کہ یہ وہی میرا گھر ہے۔ یہ وہی میرا شوہر ہے۔ یہ وہی میرا لڑکا ہے۔ یا کوئی خواب ہے۔ کوئی طلسم، کوئی سُراب!!

دفعتاً اس نے آپ ہی آپ کہا۔"تو جانے دو .... بچّے کو بھی نہ دیکھوں گی۔ سمجھ لوں گی کہ میں بیوہ بھی ہوں، اور بانجھ بھی .... تقدیر! لے چل، جہاں تیرا جی چاہے۔!!

یہ افسانہ پہلی بار ہندی کے ماہنامہ 'چاند' کے جون 1924 میں 'نرواش' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اردو میں پریم چالیسی اور ہندی میں مان سروور 3 میں شامل ہے۔

نے راشیہ

بعض آدمی اپنی استری سے اس لیے ناراض رہتے ہیں کہ اس کے لڑکیاں ہی کیوں ہوتی ہیں، لڑکے کیوں نہیں ہوتے۔ جانتے ہیں کہ اس میں استری کا دوش نہیں ہے یا ہے تو اُتنا ہی جتنا میرا، پھر بھی جب دیکھیے اِستری سے روٹھے رہتے ہیں۔ اُسے اَبھاگنی کہتے ہیں اور سدیو اس کا دل دُکھایا کرتے ہیں ۔نروپما انھیں اَبھاگنی اِستریوں میں تھی اور گھمنڈی لال ترپاٹھی انھیں اتیاچاری پروشوں میں۔ نروپما کی تین بیٹیاں لگاتار ہوئی تھیں اور وہ سارے گھر کی نگاہوں سے گر گئی تھی۔ ساس سُسر کی اَپرسنتا کی تو اسے وشیش چنتا نہ تھی۔ وہ پُرانے زمانے کے لوگ تھے، جب لڑکیاں گردن کا بوجھ اور پورو جنموں کا پاپ سمجھی جاتی تھیں۔ ہاں اسے دُکھ اپنے پتی دیو کی اَپرسنتا کا تھا جو پڑھے لکھے آدمی ہوکر بھی اسے جلی کٹی سناتے رہتے تھے۔ پیار کرنا تو دور رہا نروپما سے سیدھے منہ بات نہ کرتے تھے کئی کئی دنوں تک گھر ہی میں نہ آتے اور آتے بھی تو کچھ اس طرح کھنچے تنے ہوئے رہتے کہ نروپما تھر تھر کانپتی رہتی تھی، کہیں گرج نہ اُٹھیں۔ گھر میں دھن کا ابھاؤ (کمی) نہ تھا پر نروپما کو کبھی یہ ساہس نہ ہوتا تھا کہ کسی سامانیہ وستو (عام چیز) کی اِچھا (خواہش) بھی پرکٹ (ظاہر) کرسکے۔ وہ سمجھتی تھی میں یتھارتھ (حقیقت) میں اَبھاگن ہوں۔ نہیں تو کیا بھگوان میری کوکھ میں لڑکیاں ہی رچتے۔ پتی کی ایک مِردو (پیاری) مُسکان کے لیے، ایک میٹھی بات کے لیے اس کا ہردئے تڑپ کر رہ جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی لڑکیوں کو پیار کرتے ہوئے سکوچاتی تھی کہ لوگ کہیں گے کہ پیتل کی نتھ پر اتنا گمان کرتی ہے۔ جب ترپاٹھی جی کے گھر میں آنے کا سمئے ہوتا تو کسی نہ کسی بہانے سے وہ لڑکیوں کو ان کی آنکھوں سے دور کردیتی تھی۔ سب سے بڑی وپتّی (مصیبت) یہ تھی کہ ترپاٹھی جی نے دھمکی دی تھی کہ اب کی کنیا ہوئی تو گھر چھوڑ کر نکل جاؤں گا۔ اس نرک میں شن (لمحہ) بھر بھی نہ ٹھہروں گا۔ نروپما کو وہ چنتا اور بھی کھائے جائی تھی۔

وہ منگل کا ورت رکھتی تھی، رَوی وار نِرجلا اَیکادشی اور نہ جانے کتنے ورت کرتی

تھی۔ اسنان پوجا تو نتیہ کا نیم (اصول) تھا۔ پر کسی انوشٹھان (مذہبی تقریب) سے منوکامنا نہ پوری ہوتی تھی۔ نتیہ اوہیلنا، ترسکار (بے عزتی)، اوپیکشا (نظرانداز کرنا)، اَپمان سہتے سہتے اس کا چت سنسار سے وِرکت ہوجاتا تھا۔ جہاں کان ایک میٹھی بات کے لیے، آنکھیں ایک پریم درشٹی کے لیے، ہردے ایک آلِنگن کے لیے ترس کر رہ جائے۔ گھر میں اپنی کوئی بات نہ پوچھے، وہاں جیون سے کیوں نہ اَروچی ہوجائے؟

ایک دن گھور نراشا کی دَشا میں اس نے اپنی بڑی بھاوج کو ایک پتر لکھا۔ ایک ایک اکشر (حرف) سے اسیم (بے شمار) وَیدنا (دکھ) ٹپک رہی تھی۔ بھاوج نے اتر دیا تمھارے بھیّا جلد تمھیں وداع کرانے جائیں گے۔ یہاں آج کل ایک سچّے مہاتما آئے ہوئے ہیں جن کا آشیرواد کبھی نشپھل نہیں جاتا۔ یہاں کئی سنتان ہین اِستریاں ان کے آشیرواد سے پُتروتی (بیٹے والی) ہوگئیں۔ پورن آشا ہے کہ تمھیں بھی ان کا آشرواد کلیان کاری ہوگا۔

نروپما نے یہ پتر پتی کو دکھایا۔ ترپاٹھی جی اداسین بھاؤ سے بولے۔ سرشٹی رچنا مہاتماؤں کے ہاتھ کا کام نہیں، ایشور کا کام ہے۔

نروپما۔ ہاں۔ لیکن مہاتماؤں میں بھی تو کچھ سِدھی ہوتی ہے۔

گھمنڈی لال۔ ہاں ہوتی ہے۔ پر ایسے مہاتماؤں کے درشن دُرلبھ ہیں۔

نروپما۔ میں تو اس مہاتما کے درشن کروں گی۔

گھمنڈی لال۔ چلی جانا۔

نروپما۔ جب بانجھوں کے لڑکے ہوئے تو میں کیا ان سے بھی گئی گزری ہوں۔

گھمنڈی لال۔ کہہ تو دیا بھائی چلی جانا۔ یہ کرکے بھی دیکھ لو مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، پُتر کا مکھ دیکھنا ہمارے بھاگیہ میں نہیں ہے۔

(۲)

کئی دن بعد نروپما اپنے بھائی کے ساتھ مائکہ گئی۔ تینوں پُتریاں بھی ساتھ تھیں۔ بھابی نے انھیں پریم سے گلے لگاکر کہا۔ تمھارے گھر کے آدمی بڑے نردئی ہیں۔ ایسی گلاب کے پھولوں کی سی لڑکیاں پاکر بھی تقدیر کو روتے ہیں۔ یہ تمھیں بھاری ہوں تو مجھے دے دو۔ جب نند اور بھاوج بھوجن کرکے لیٹیں تو نروپما نے پوچھا۔ وہ مہاتما کہاں رہتے ہیں؟

بھاوج۔ ایسی جلدی کیا ہے۔ بتا دوں گی۔

نروپما۔ ہے نکیچ ہی نہ؟
بھاوج۔ بہت نکیچ۔ جب کہوگی انھیں بلا دوں گی۔
نروپما۔ تو کیا تم لوگوں پر بہت پرسن ہیں کیا؟
بھاوج۔ دونوں وقت یہیں بھوجن کرتے ہیں یہیں رہتے ہیں۔
نروپما۔ جب گھر ہی میں ویدھ تو مریے کیوں؟ آج مجھے ان کے درشن کرا دینا۔
بھاوج۔ بھینٹ کیا دوگی؟
نروپما۔ میں کس لایق ہوں؟
بھاوج۔ اپنی سب سے چھوٹی لڑکی دے دینا۔
نروپما۔ چلو، گالی دیتی ہو۔
بھاوج۔ اچھا یہ نہ سہی، ایک بار انھیں پریما لنگن کرنے دینا۔
نروپما۔ بھابی مجھ سے ایسی ہنسی کروگی تو میں چلی جاؤں گی۔
بھاوج۔ وہ مہاتما بڑے رسیا ہیں۔
نروپما۔ تو چولہے میں جائے کوئی دُشٹ ہوگا۔
بھاوج۔ ان کا آشرواد تو اسی شرط پر ملے گا۔ وہ اور کوئی بھینٹ سُویکار ہی نہیں کرتے۔
نروپما۔ تم تو یوں باتیں کر رہی ہو مانو ان کی پرتی ندھی (نمائندہ) ہو۔
بھاوج۔ ہاں، وہ یہ سب وشے (معاملے) میرے ہی دوارا (ذریعہ) طے کیا کرتے ہیں۔ میں بھینٹ لیتی ہوں۔ میں ہی آشرواد دیتی ہوں میں ہی ان کے ہتارتھ بھوجن کرلیتی ہوں۔
نروپما۔ تو یہ کہو کہ تم نے مجھے بلانے کے لیے یہ حیلہ نکالا ہے۔
بھاوج۔ نہیں، ان کے ساتھ ہی تمھیں کچھ ایسے گُر بتا دوں گی جس سے تم اپنے گھر آرام سے رہو۔

اس کے بعد دونوں سکھیوں میں کانا پھوسی ہونے لگی۔ جب بھاوج چپ ہوئی تو نروپما بولی۔ اور جو کہیں پھر کنیا ہی ہوئی تو؟
بھاوج۔ تو کیا؟ کچھ دن تو شانتی اور سکھ سے جیون کٹے گا۔ یہ دن تو کوئی لوٹا نہ لے گا۔ پُتر ہوا تو کہنا ہی کیا، پُتری ہوئی تو پھر کوئی نئی یکتی نکالی جائے گی۔ تمھارے گھر

کے جیسے عقل کے دشمنوں کے ساتھ ایسی ہی چالیں چلنے میں گزارا ہے۔

نروپما۔ مجھے تو سنکوچ معلوم ہوتا ہے۔

ترپاٹھی جی کو دو چار دن میں پتر لکھ دینا کہ مہاتما جی کے درشن ہوئے اور انھوں مجھے وَردان دیا ہے۔ ایشور نے چاہا تو اسی دن سے تمھاری مان پرتشٹھا ہونے لگے گی۔ گھمنڈی دوڑے ہوئے آئیں گے۔ اور تمھارے اوپر پران نچھاور کریں گے۔ کم سے کم سال بھر تو چین کی بنسی بجانا۔ اس کے بعد دیکھی جائے گی۔

نروپما۔ پتی سے کپٹ کروں تو پاپ نہ لگے گا۔

بھاوج۔ ایسے سوارتھیوں (خودغرضوں) سے کپٹ کرنا پُنیہ ہے۔

(۳)

تین چار مہینے کے بعد نروپما اپنے گھر آئی۔ گھمنڈی لال اسے بدا کرانے گئے تھے۔ سرہج نے مہاتما جی کا رنگ اور بھی چونکھا کر دیا۔ بولی۔ ایسی تو کیسی کو دیکھا نہیں کہ ان مہاتما جی نے وردان دیا ہو اور وہ پورا نہ ہوگیا ہو۔ ہاں جس کا بھاگیہ ہی پھوٹ جائے اسے کوئی کیا کرسکتا ہے۔

گھمنڈی لال پرتیکش تو وَردان اور آشیرواد کی اوپیکشا (امید) ہی کرتے رہے۔ ان باتوں پر وشواس کرنا آج کل سنکوچ جنک (تذبذب آمیز) معلوم ہوتا ہے، پر اُن کے دل پر اثر ضرور ہوا۔

نروپما کی خاطرداریاں ہونی شروع ہوئیں۔ جب وہ گربھوتی ہوئی تو سب کے دلوں میں نئی نئی آشائیں ہلورے لینے لگیں۔ ساس جو اُٹھتے گالی اور بیٹھتے وینگ (طنز) سے باتیں کرتی تھی اب اسے پان کی طرح پھیرتی۔ بیٹی تم رہنے دو میں ہی رسوئی بنا لوں گی، تمھارا سر دُکھنے لگے گا۔ کبھی نروپما کلسے کا پانی یا کوئی چارپائی اُٹھانے لگتی تو ساس دوڑتی۔ بہو رہنے دو میں آتی ہوں۔ تم کوئی بھاری چیز مت اُٹھایا کرو۔ لڑکیوں کی بات اور ہوتی ہے۔ ان پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا۔ لڑکے تو گربھ میں ہی مان کرنے لگتے ہیں۔ اب نروپما کے لیے دودھ کا اُٹھونا کیا گیا، جس سے بالک پشٹ اور گورا ہو۔ گھمنڈی لال وستر بھوشنوں پر اتارو ہوگئے۔ ہر مہینے ایک نہ ایک نئی چیز لاتے۔ نروپما کا جیون اتنا سکھ مئے کبھی نہ تھا۔ اس سمئے بھی نہیں جب نویلی ودھو (دلہن) تھی۔

مہینے گزرنے لگے، نروپما کو انوبھوت لکشوں (علامتوں) سے وِدت (ظاہر) ہونے لگا کہ یہ کنیا ہی ہے۔ پر وہ اس بھید کو گُپت (پوشیدہ) رکھتی تھی۔ سوچتی کہ ساون کی دھوپ ہے اس کا کیا بھروسا جتنی چیز دھوپ میں سکھانی ہو سکھا لو، پھر تو گھٹا چھائے گی ہی۔ بات بات پر بگڑتی۔ وہ کبھی اتنی مان شیلا نہ تھی۔ پر گھر میں کوئی چوں تک نہ کرتا کہ کہیں بہو کا دل نہ دُکھے، نہیں بالک کو کشٹ ہوگا۔ کبھی کبھی نروپما کیول گھر والوں کو جلانے کے لیے انوشٹھان کرتی۔ اُسے انھیں جلانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ سوچتی تم سوارتھیوں کو جتنا جلاؤں اتنا اچھا۔ تم میرا آدر اس لیے کرتے ہو نہ کہ میں بچّہ جنوں گی تو تمھارے کُل کا نام چلائے گا۔ میں کچھ نہیں ہوں بالک ہی سب کچھ ہے، میرا اپنا کوئی مہتو نہیں، جو کچھ ہے وہ بالک کے ناطے۔ یہ میرے پتی ہیں۔ پہلے انھیں مجھ سے کتنا پریم تھا، تب اتنے سنسار۔ لولُپ نہ ہوئے تھے۔ اب ان کا پریم کیوں سوارتھ کا سوانگ ہے۔ میں بھی پشو ہوں جسے دودھ کے لیے چارہ پانی دیا جاتا ہے۔ خیر یہی سہی، اس وقت تو تم میرے قابو میں آئے ہو جتنے گہنے بن سکیں بنوا لوں انھیں تو چھین نہ لوگے۔

اس طرح دس مہینے پورے ہوگئے۔ نروپما کی دونوں نندیں سسرال سے بلائی گئیں۔ بچّے کے لیے پہلے ہی سے سونے کے گہنے بنوا لیے گئے۔ دودھ کے لیے ایک سُندر گائے مول لے لی گئی۔ گھمنڈی لال اسے ہوا کھلانے کو ایک چھوٹی سی سیج گاڑی لائے۔ جس دن نروپما کو پرسو ویدنا ہونے لگی دُوار پر پنڈت جی مہورت دیکھنے کے لیے بلائے گئے۔ ایک میر شکار بندوق چھوڑنے کو بلایا گیا۔ گائنے منگل گان کے لیے بٹور لی گئیں گھر سے تِل تِل پر خبر منگائی جاتی تھی کیا ہوا؟ لیڈی ڈاکٹر بھی بلائی گئی۔ باجے والے حکم کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ پامر بھی اپنی سارنگی لیے 'جچہ مان کرے نندلال سو' کی تان سنانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ ساری تیاریاں، ساری آشائیں، سارا اتساہ، سارا سمارو وہ ایک ہی شبد پر اَولمبت تھا جیو جیو دیر ہوتی تھی لوگوں میں اُتسکتا بڑھتی جاتی تھی۔ گھمنڈی لال اپنے منوبھاؤ (دلی جذبات) کو چھپانے کے لیے ایک سماچار پتر دیکھ رہے تھے، مانو انھیں لڑکا یا لڑکی دونوں ہی برابر ہیں۔ مگر ان کے بوڑھے پتا جی اتنے ساودھان (چوکنے) نہ تھے۔ ان کی باچھیں کھلی جاتی تھیں ہنس ہنس کر سب سے بات کر رہے تھے اور پیسوں کی ایک تھیلی کو بار بار اُچھالتے تھے۔

میر شکار نے کہا۔ مالک سے اب کی پگڑی دوپٹہ لوں گا۔

پتا جی نے کھل کر کہا۔ اَبے کتنی پگڑیاں لے گا۔ اتنی بے بھاؤ کی دوں گا کہ سر کے بال گنجے ہوجائیں گے۔

پامر بولا۔ سرکار سے اب کی کچھ جیوکا لوں گا۔

پتا جی کھِل کر بولے۔ اَبے کتنی کھائے گا کھلا کھلا کر پیٹ پھاڑ دوں گا۔

سہسا (اچانک) مہری گھر میں سے نکلی۔ کچھ گھبرائی سی تھی۔ وہ ابھی کچھ بولنے بھی نہیں پائی تھی کہ میرشکار نے بندوق فیر کرہی تو دی۔ بندوق چھوٹنی تھی کہ روشن چوکی کی تان بھی چھڑ گئی۔ پامر بھی کمر کس کر ناچنے کو کھڑا ہوگیا۔

مہری۔ ارے تم سب کے سب بھنگ کھا گئے ہو کیا؟

میرشکار۔ کیا ہوا کیا!

مہری۔ ہوا کیا۔ لڑکی ہی تو پھر ہوئی ہے۔

پتا جی۔ لڑکی ہوئی ہے؟

یہ کہتے کہتے وہ کمر تھام کر بیٹھ گئے۔ مانو وَجر (آسمان) گر پڑا۔ گھمنڈی لال کمرے سے نکل آئے اور بولے جاکر لیڈی ڈاکٹر سے تو پوچھ۔ اچھی طرح دیکھ لے۔ دیکھا نہ سنا چل کھڑی ہوئی۔

مہری۔ بابو جی، میں نے تو آنکھوں دیکھا ہے۔

گھمنڈی لال۔ کنیا ہی ہے۔

پتا۔ ہماری تقدیر ہی ایسی ہے بیٹا۔ جاؤ رے سب کے سب، تم سبھی کے بھاگیہ میں کچھ پانا نہ لکھا تھا تو کہاں سے پاتے۔ بھاگ جاؤ۔ سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ ساری تیاری مٹی میں مل گئی۔

گھمنڈی لال۔ اس مہاتما سے پوچھنا چاہیے میں آج ڈاک سے ذرا بچّہ کی خبر لیتا ہوں۔

پتا۔ دھورت ہے دھورت۔

گھمنڈی لال۔ میں ان کی ساری دھورتتا نکال دوں گا۔ مارے ڈنڈوں کے کھوپڑی نہ توڑ دوں تو کہیے گا۔ چنڈال کہیں کا، اس کے کارن میرے سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ یہ سیج گاڑی، یہ گائے، یہ پالنا، یہ سونے کے گہنے کس کے سر پٹکوں۔ ایسے ہی اس نے

کتنے ہی کو ٹھگا ہوگا۔ ایک دفعہ بچّہ کی مرمت ہوجاتی تو ٹھیک ہوجاتے۔

پتاجی۔ بیٹا ان کا دوش نہیں ہے، اپنے بھاگیہ کا دوش ہے۔

گھمنڈی لال۔ اس نے کیوں کہا ایسا نہیں ہوگا۔ عورتوں سے اس پاکھنڈ کے لیے کتنے ہی روپے اینٹھے ہوں گے۔ وہ سب انھیں اُگلنا پڑے گا۔ نہیں تو پولیس میں رپٹ کردوں گا۔ قانون میں پاکھنڈ کا بھی تو دنڈ ہے۔ میں پہلے ہی چونکا تھا کہ ہو نہ ہو پاکھنڈی ہے۔ لیکن میری سرہج نے دھوکا دیا۔ نہیں تو میں ایسے پاجیوں کے پنجے میں کب آنے والا تھا۔ ایک ہی سور ہے۔

پتا جی۔ بیٹا صبر کرو۔ ایشور کو جو کچھ منظور تھا۔ وہ ہوا، لڑکا لڑکی دونوں ہی ایشور کی دین ہیں۔ جہاں تین ہیں وہاں ایک اور سہی۔

پتا اور پُتر میں تو یہ باتیں ہوتی رہیں۔ پامر، میرشکار آدمی نے اپنے اپنے ڈنڈے سنبھالے اور اپنی راہ چلے۔ گھر میں ماتم سا چھا گیا۔ لیڈی ڈاکٹر بھی بدا کردی گئی، سَور میں جچہ اور دائی کے سوا کوئی نہ رہا۔ وردھا (بوڑھی) ماتا تو اتنی ہتاش (مایوس) ہوئی کہ اسی وقت اٹواس کھٹواس لے کر پڑ رہی۔

جب بچّے کی برہی ہوگئی تو گھمنڈی لال اِستری کے پاس گئے اور سروش بھاؤ سے بولے۔ پھر لڑکی ہوگئی۔

نروپما۔ کیا کروگی میرا کیا بس؟

گھمنڈی لال۔ اس پاپی دھورت نے بڑا چکما دیا۔

نروپما۔ اب کیا کہوں، میرے بھاگیہ ہی میں نہ ہوگا۔ نہیں تو وہاں کتنی ہی عورتیں بابا جی کو رات دن گھیرے رہتی تھیں۔ وہ کسی سے کچھ لیتے تو کہتی کہ دھورت ہے۔ قسم لے لو جو میں نے ایک کوڑی بھی انھیں دی ہو۔

گھمنڈی لال۔ اس نے لیا نہ لیا یہاں تو دیوالا نکل گیا۔ معلوم ہوگیا تقدیر میں پُتر نہیں لکھا ہے۔ کُل کا نام ڈوبنا ہی ہے۔ تو کیا آج ڈوبا، کیا دس سال بعد ڈوبا۔ اب کہیں چلا جاؤں گا۔ گرہستی (گھرداری) میں کون سا سُکھ رکھا ہے۔

وہ بہت دیر تک کھڑے کھڑے اپنے بھاگیہ کو روتے رہے، پر نروپما نے سر تک نہ اُٹھایا۔

نروپما کے سر پھر وہی وپتی (مصیبت) آپڑی۔ پھر وہی طعنے، وہی اپمان، وہی اَنادر (بے عزتی) وہی چھچھا لیدر کسی کو چنتا نہیں رہتی کہ کھاتی پیتی ہے یا نہیں، اچھی ہے یا بیمار، دُکھی ہے یا سکھی۔ گھمنڈی لال یدھپی کہیں نہ گئے پر نروپما کو یہ دھمکی پرایہ (اکثر) نِتیہ ہی ملتی رہتی تھی۔ کئی مہینے یوں گزر گئے تو نروپما نے پھر بھاوج کو لکھا کہ تم نے اور بھی مجھے وِپتی میں ڈال دیا۔ اس سے تو پہلے ہی بھلے تھی۔ اب تو کوئی بات بھی نہیں پوچھتا کہ مرتی ہے یا جیتی ہے۔ اگر یہی دشا رہی تو سوامی جی چاہے سنیاس لیں یا نہ لیں، لیکن میں سنسار کو آوَشیہ تیاگ دوں گی۔

بھابی یہ پتر پاکر پرستھتی سمجھ گئی۔ اب کی اس نے نروپما کو بلایا نہیں۔ جانتی تھی کہ لوگ بدا ہی نہ کریں گے۔ پتی کو لے کر سویم (خود) آپہنچی۔ اس کا نام سکیشی تھا۔ بڑی ملنسار، چتر ونود شیل اِستری تھی۔ آتے ہی آتے نروپما کی گود میں کنیا دیکھی تو بولی۔ ارے یہ کیا؟

ساس۔ بھاگیہ ہے اور کیا؟

سکیشی۔ بھاگیہ کیسا۔ اس نے مہاتما جی کی باتیں بھلا دی ہوں گی۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ منہ سے جو کچھ کہہ دیں وہ نہ ہو، کیوں جی تم نے منگل کا ورت رکھا؟

نروپما۔ برابر ایک ورت بھی نہ چھوڑا۔

سکیشی۔ پانچ براہمنوں کو منگل کے دن بھوجن کراتی رہی۔

نروپما۔ یہ تو انھوں نے نہیں کہا تھا۔

سکیشی۔ تمھارا سر، مجھے خوب یاد ہے میرے سامنے انھوں نے بہت زور دے کر کہا تھا۔ تم نے سوچا ہوگا برہمنوں کو بھوجن کرانے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ نہ سمجھا کہ کوئی اَنشٹھان سفل (کامیاب) نہیں ہوتا جب تک ودھی وَت اس کا پالن نہ کیا جائے۔

ساس۔ اس نے کبھی اس کی چرچا ہی نہیں کی۔ نہیں پانچ کیا دس برہمنوں کو جما دیتی۔ تمھارے دھرم سے کچھ کمی نہیں ہے۔

سکیشی۔ کچھ نہیں بھول ہوگئی اور کیا۔ رانی بیٹی کا منہ یوں دیکھنا نصیب نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے جب۔تپ کرنے پڑتے ہیں۔ تم منگل کے ایک ورت ہی سے گھبرا گئیں۔

ساس۔ اَبھاگنی ہے اور کیا؟

گھمنڈی لال۔ایسی کون سی، بڑی باتیں تھیں، جو یاد نہ رہیں؟ وہ خودہم لوگوں کو جلانا

چاہتی ہے۔

ساس۔ وہی تو کہوں کہ مہاتما کی باتیں کیسی نِشپھل (ضائع) ہوئی۔ یہاں سات برسوں تک، تُلسی مائی کو دیا چڑھایا، جب جاکے بچّے کا جنم ہوا۔

گھمنڈی لال۔ انھوں نے سمجھاتھا دال بھات کا کور (نوالہ) ہے۔

سنکیشی۔ خیر اب جو ہوا سو ہوا۔ کل منگل ہے پھر ورت رکھو اور اب کہ سات برہمنوں کو جماؤ۔ دیکھیں کیسے مہاتما جی کی بات نہیں پوری ہوتی۔

گھمنڈی لال۔ ویَرتھ (بیکار) ہے ان کے کیے کچھ نہ ہوگا۔

سنکیشی۔ آپ وِدوان سمجھدار ہوکر اتنا دل چھوٹا کرتے ہیں۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے، کتنے پُتر لیجیے گا؟ ناکو دم نہ ہوجائے تو کہیے گا۔

ساس۔ بیٹی، دودھ۔ پوت سے بھی کسی کا من بھرا ہے۔

سنکیشی۔ ایشور نے چاہا تو آپ لوگوں کا من بھر جائے گا میرا تو بھر گیا۔

گھمنڈی لال۔ سنتی ہو مہارانی، اب کی کوئی گول مال مت کرنا۔ اپنی بھابی سے سب بیورا اچھی طرح پوچھ لینا۔

سنکیشی۔ اب نِشچنت (بے فکر) رہیں۔ میں یاد کرا دوں گی۔ کیا بھوجن کرنا ہوگا کیسے رہنا ہوگا کیسے اسنان کرنا ہوگا، یہ سب لکھا دوں گی اور اماں جی آج کے اٹھارہ ماس بعد آپ سے کوئی بھاری انعام لوں گی۔

سنکیشی ایک سپتاہ یہاں رہی اور نروپما کو خوب سکھا پڑھا کر چلی گئی۔

(۴)

نروپما کا اقبال پھر چمکا، گھمنڈی لال اب کہ اتنے آشوانِت (پُرامید) ہوئے کہ بھوِشئے نے بھوت (مستقبل نے ماضی) کو بھلا دیا۔ نروپما پھر باندی سے رانی ہوئی، ساس پھر اُسے پان کی بھانتی پھیرنے لگی، لوگ اس کا منہ جوہنے لگے۔

دن گزرنے لگے۔ نروپما کبھی کہتی اماں جی آج میں نے سوپن (خواب) دیکھا کہ ایک وردھا اِستری نے آکر مجھے پکارا اور ایک ناریل دے کر بولی۔ یہ تمھیں دیے جاتی ہوں، کبھی کہتی اماں جی اب کہ نہ جانے کیوں میرے دل میں بڑی بڑی امنگیں پیدا ہو رہی ہیں، جی چاہتا ہے خوب گانا سنوں، ندی میں خوب اسنان کروں، ہردم نشا سا چھایا رہتا ہے۔ ساس سن کر مسکراتی اور کہتی، بہو یہ شُبھ لکشن (آثار) ہیں۔

نروپما چپکے چپکے معجون منگوا کر کھاتی اور اپنے اصل نیتروں سے تاکتے ہوئے گھمنڈی لال سے پوچھتی۔ میری آنکھیں لال ہیں کیا؟

گھمنڈی لال خوش ہو کر کہتے، معلوم ہوتا ہے نشا چڑھا ہوا ہے یہ شبھ لکشن ہیں۔

نروپما کو سگندھوں (خوشبوؤں) سے کبھی اتنا پریم نہ تھا، پھولوں کے گجروں پر اب وہ جان دیتی تھی۔

گھمنڈی لال اب نتیہ سوتے سمئے اُسے مہابھارت کی ویر کتھائیں پڑھ کر سناتے۔ کبھی گروگوند سنگھ کی کیرتی (شہرت) کا ورنن کرتے۔ ابھیمنو کی کتھا سے نروپما کو بڑا پریم تھا۔ پتا اپنے آنے والے پُتر کو ویرسنسکاروں سے پری پورت کر دینا چاہتا تھا۔

ایک دن نروپما نے پتی سے کہا۔ نام کیا رکھو گے۔

گھمنڈی لال ۔ یہ تو تم نے خوب سوچا مجھے تو اس کا دھیان ہی نہ رہا تھا۔ ایسے نام ہونا چاہیے جس سے شورّیہ اور تیج ٹپکے۔ سوچا کوئی نام۔

دونوں پرانی (لوگ) نام کی ویاکھیا کرنے لگے۔ جوراور لال سے لے کر ہرش چندر تک سبھی نام گنائے گئے۔ پر اس اُسامانیہ (مخصوص) بالک کے لیے کوئی نام نہ ملا۔ انت میں پتی نے کہا تیغ بہادر کیسا نام ہے۔

نروپما۔ بس بس یہی نام مجھے پسند ہے؟

گھمنڈی لال۔ نام تو بڑھیا ہے تیغ بہادر کی کیرتی سن ہی چکی ہو۔ نام کا آدمی پر بڑا اثر پڑتا ہے۔

نروپما۔ نام ہی تو سب کچھ ہے، دمڑی، چھکوڑی، گھرہو، کتوارو، جس کے نام دیکھے اسے بھی یتھا نام تتھا گن ہی پایا۔ ہمارے بچّے کا نام ہوگا تیغ بہادر۔

(۵)

پرسوکال آپہنچا۔ نروپما کو معلوم تھا کہ کیا ہونے والی ہے لیکن باہر منگلا چرن کا پورا سامان تھا اب کہ کسی کو لیش ماتر بھی سندیہہ (شبہ) نہ تھا۔ ناچ گانے کا پربندھ بھی کیا گیا تھا۔ ایک شامیانہ کھڑا کیا گیا تھا اور متر گنڑ (دوستوں کا گروہ) اس میں بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ حلوائی کڑھائی سے پوریاں اور مٹھائیاں نکال رہا تھا۔ کئی بورے اناج کے رکھے ہوئے تھے کہ شُبھ سماچار پاتے ہی بھکشکوں کو بانٹیں جائیں۔ ایک ش کا بھی ولمب (دیر) نہ

ہو۔ اس لیے بوروں کے منہ کھول دیے گئے تھے۔

لیکن نروپما کا دل پرتی شن (ہر لمحہ) بیٹھا جاتا تھا۔ اب کیا ہوگا؟ تین سال کسی طرح کوشل سے کٹ گئے اور مزے میں کٹ گئے، لیکن اب وپتی سر پر منڈرا رہی ہے۔ ہائے، کتنی پکشتا ہے نرپرادھ (بے قصور) ہونے پر بھی یہ دنڈ۔ اگر بھگوان کی اچھا ہے کہ میرے گربھ سے کوئی پُتر نہ جنم لے تو میرا کیا دوش لیکن کون سنتا ہے۔ میں ہی ابھاگنی ہوں میں ہی تیاجیّ ہوں۔ میں ہی کلُمّھی ہوں۔ اس لیے نہ کہ پَروَس ہوں۔ کیا ہوگا؟ ابھی ایک شن میں یہ سارا آنند اُتسو شوک میں ڈوب جائے گا۔ مجھ پر بوچھاریں پڑنے لگیں گی۔ بھیتر سے باہر تک مجھ ہی کو کوسیں گے۔ ساس۔ سُسر کا بھئے نہیں، لیکن سوامی جی شاید پھر میرا منہ نہ دیکھیں، شاید نراش ہوکر گھر بار تیاگ دیں۔ چاروں طرف امنگل ہی امنگل ہے۔ میں اپنے گھر کی، اپنی سنتان کی دُردشا دیکھنے کے لیے کیوں جیوت ہوں۔ کوشل بہت ہوچکا، اب اس سے کوئی آشا نہیں۔ میرے دل میں کیسے کیسے ارمان تھے۔ اپنی پیاری بچیوں کا لالن پالن کرتی۔ انھیں بیاہتی، ان کے بچوں کو دیکھ کر سُکھی ہوتی۔ پر آہ! یہ سب ارمان خاک میں مل جاتے ہیں۔ بھگوان، تمھیں اب ان کے پتا ہو۔ تمھیں ان کے رکشک (محافظ) ہو۔ میں تو اب جاتی ہوں۔

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ویل پھر لڑکی ہے۔

بھیتر باہر کُہرام مچ گیا پٹّس پڑگئی۔ گھمنڈی لال نے کہا۔ جہنم میں جائے ایسی زندگی موت بھی نہیں آجاتی۔

ان کے پتا بھی بولے۔ اَبھاگنی ہے وَجر اَبھاگنی ہے۔

بھکشکوں نے کہا۔ رووٗں اپنی تقدیر کو۔ ہم کوئی دوسرا دُوار دیکھتے ہیں۔

ابھی یہ شوکوڈگار شانت نہ ہونے پایا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر نے کہا ماں کا حال اچھا نہیں ہے۔ وہ اب نہیں بچ سکتی۔ اس کا دل بند ہوگیا ہے۔

یہ افسانہ ماہنامہ چاند کے جولائی 1924 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سروور 3میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

بھُوت

مراد آباد کے پنڈت سیتا ناتھ چوبے گزشتہ تیس سالوں سے مقامی وکلاء کے لیڈر ہیں۔ اُن کے والد اُنھیں بچپن ہی میں چھوڑ کر راہی ملکِ بقا ہوئے تھے۔ گھر میں کوئی پونجی نہ تھی۔ ماں نے بڑی بڑی مصیبتیں اُٹھاکر اُن کی پرورش کی اور انھیں پڑھایا، سب سے پہلے وہ کچہری میں پندرہ روپے مشاہرہ پر ملازم ہوئے۔ پھر وکالت کا امتحان دیا۔ پاس ہوگئے آدمی ذہین تھے، وکالت دو ہی چار برسوں میں چمک اُٹھی۔ جب ماں کا انتقال ہوا تو لائق بیٹے کا شمار ضلع کے ممتاز لوگوں میں ہوگیا تھا۔ اُن کی آمدنی ایک ہزار روپے ماہوار سے کم نہ تھی۔ ایک عالیشان مکان بنوا لیا تھا، کچھ زمینداری بھی خرید لی تھی، کچھ روپے بینک میں جمع کردیے تھے اور کچھ داد و ستد میں لگا دیے تھے۔ اس ترقی پر چار لڑکوں کے وجود نے انھیں اور بھی زیادہ خوش نصیب بنا دیا تھا۔ چاروں لڑکے مختلف درجوں میں تعلیم پاتے تھے۔ مگر یہ کہنا کہ یہ ساری پونجی چوبے جی کے لگاتار محنت کا نتیجہ تھی۔ اُن کی اہلیہ منگلا دیوی کے ساتھ ناانصافی کرنا ہے۔ منگلا بہت سادہ مزاج، امور خانہ داری سے واقف، اور پیسے کا کام دھیلے میں چلانے والی عورت تھی۔ جب تک اپنا مکان نہ بن گیا، اُس نے تین روپے ماہوار سے زیادہ کا مکان کرایہ پر نہیں لیا۔ اور رسوئی کے لیے مہرانی تو اُس نے اب تک نہ رکھی تھی۔ اُسے اگر کوئی شوق تھا تو زیور کا اور چوبے جی کو بھی اگر شوق تھا تو بیوی کو زیور پہنانے کا۔ وہ نہایت باوفا شوہر تھے۔ عموماً محفلوں میں رنڈیوں سے ہنسی مذاق کر لینا اتنا بُرا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مگر پنڈت اپنی زندگی بھر کبھی کسی رقص و سرود کی محفل میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ پانچ بجے صبح سے لے کر بارہ بجے رات تک ان کا شوق ان کی تفریح، اُن کا پڑھنا لکھنا جو کچھ تھا وہ صرف قانون تھا، نہ انھیں سیاسی کاموں سے رغبت تھی، نہ قومی خدمت سے، یہ سبھی کام انھیں فضول سے معلوم ہوتے تھے، ان کے خیال میں اگر کوئی کام کرنے کے لائق تھا تو بس کچہری جانا، بحث کرنا، روپیہ جمع کرنا، اور کھاپی کر سو رہنا۔ جیسے ویدانتی کو برمھ کے سوا سنسار جھوٹا معلوم ہوتا ہے ویسے ہی چوبے جی کو

قانون کے سوا ساری دنیا ہیچ معلوم ہوتی تھی۔ سب جھوٹ تھا۔ صرف قانون سچ تھا۔

(۲)

پنڈت جی کی دلی راحت میں صرف ایک کسر تھی۔ ان کے کوئی لڑکی نہ تھی۔ پہلی لڑکی کے بعد پھر کوئی لڑکی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ اور نہ اب پیدا ہونے کی امید تھی۔ وہ اور اُن کی بیوی دونوں اس لڑکی کو یاد کر کے رویا کرتے تھے۔ لڑکیاں بچپن میں لڑکوں سے زیادہ ناز نخرے کیا کرتی ہیں۔ اُن باتوں کے لیے دونوں بے قرار رہتے۔ ماں سوچتی کہ لڑکی ہوتی تو اُس کے لیے گہنے بنواتی۔ اُس کے بال گوندھتی۔ لڑکی گھونگھرو پہن کر ٹھمک ٹھمک کر آنگن میں چلتی تو کتنا مزہ آتا۔ چوبے سوچتے کہ کنیاں دان کے بغیر موکش (نجات) کیسے ملے گی؟ کنیادان مہا دان ہے۔ جس نے یہ دان نہ دیا اس کا جنم ہی اکارتھ گیا۔

آخر یہ خواہش اتنی بڑھی کہ منگلا نے اپنی چھوٹی بہن کو بلاکر لڑکی کی طرح پرورش کرنے کا تہیہ کرلیا۔ اس کے ماں باپ غریب تھے راضی ہوگئے۔ یہ منگلا کی سوتیلی ماں کی لڑکی تھی، بڑی خوبصورت اور بڑی شوخ۔ نام تھا بنّی۔ چوبے جی کا گھر اُس کے آنے سے کھِل اُٹھا۔ دو ہی چار روز میں لڑکی اپنے والدین کو بھول گئی۔ اس کی عمر تو صرف چار سال کی تھی مگر اُسے کھیلنے کی بہ نسبت کچھ کام کرنا زیادہ بھلا معلوم ہوتا تھا۔ منگلا کھانا پکانے جاتی تو بنّی بھی اُس کے پیچھے پیچھے جاتی۔ اُس سے آٹا گوندھنے کے لیے جھگڑا کرتی۔ ترکاری کاٹنا اُسے بہت اچھا لگتا۔ جب تک وکیل صاحب گھر پر رہتے، وہ اُن کے ساتھ دیوان خانے میں بیٹھی رہتی۔ کبھی کتابیں اُلٹتی، کبھی دوات قلم سے کھیلتی چوبے جی مسکرا کر کہتے، بیٹی، مار کھاؤ گی۔ بنّی کہتی، تم مار کھاؤ گے۔ میں تمھارا کان کاٹ لوں گی۔ جوجو کو بلاکر پکڑا دوں گی، اس پر دیوان خانے میں خوب قہقہے اُڑتے۔ وکیل صاحب بچّوں کے ساتھ کبھی اتنا میل جول نہ کرتے تھے۔ اب باہر سے آتے تو بنّی بیٹی! چلو۔ بنّی دوڑتی ہوئی آکر اُن کی گود میں بیٹھ جاتی۔

منگلا ایک روز بنّی کو لیے بیٹھی تھی۔ اتنے میں پنڈت جی آگئے۔ بنّی دوڑ کر اُن کی گود میں جا بیٹھی۔ پنڈت جی نے پوچھا، تو کس کی بیٹی ہے؟

بنّی۔ نہ بتاؤں گی۔

منگلا۔ کہہ دے بیٹا، جی جی کی بیٹی ہوں؟

پنڈت۔ تو میری بیٹی ہے بنّو! کہ ان کی؟
بنّی۔ نہ بتاؤں گی۔
پنڈت۔ اچھا ہم لوگ آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں۔ بنّی جس کی بیٹی ہو گی اُس کی گود میں بیٹھے گی۔
پنڈت۔ میری بیٹی ہے، میری بیٹی ہے (بیوی سے) اب نہ کہنا کہ میری بیٹی ہے۔
منگلا۔ اچھا جاؤ بنّی اب میں تمھیں مٹھائی نہ دوں گی۔ گڑیا بھی نہ منگاؤں گی۔
بنّی۔ بھیا جی منگوا دیں گے۔ تمھیں نہ دوں گی۔

وکیل صاحب نے ہنس کر بنّی کو سینہ سے لگا لیا۔ اور گودی میں لیے ہوئے باہر چلے گئے۔ وہ اپنے خاص دوستوں کو بھی ان طفلانہ حرکتوں سے لطف اندوز کرنا چاہتے تھے۔ آج سے جو کوئی بنّی سے پوچھتا کہ تو کس کی بیٹی ہے تو بنّی فوراً کہہ دیتی، ''بھیا'' کی۔

ایک مرتبہ بنّی کا باپ آکر اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ بنّی نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ ادھر چوبے جی کو دن کاٹنا دوبھر ہو گیا۔ ایک مہینہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ وہ پھر سسُرال گئے اور بنّی کو لوا لائے۔ بنّی اپنے ماں باپ کو بھول گئی۔ وہ چوبے جی کو اپنا باپ اور منگلا کو اپنی ماں سمجھنے لگی۔ جنھوں نے اس کو جنم دیا تھا وہ اب غیر ہو گئے۔

کئی سال گزر گئے۔ وکیل صاحب کے بیٹوں کی شادیاں ہو گئیں۔ اُن میں دو اپنے بال بچّوں کو لے کر دیگر اضلاع میں وکالت کرنے چلے گئے۔ وہ کالج میں پڑھتے تھے۔ بنّی بھی کلی سے پھول ہوئی۔ ایسی شکل، ایسے مزاج اور ایسے اوصاف والی لڑکی برادری میں اور نہ تھی۔ پڑھنے لکھنے میں ہوشیار، گرہستی کے کاموں سے واقف، کاڑھنے سینے پرونے میں مشاق، کھانا پکانے میں پختہ کار، شیریں کلام، حیادار اور حُسنِ بے نظیر کی مالکہ۔ اندھیرے گھر میں اس کے نورِ حُسن سے اُجالا ہوتا تھا۔ افق کی سُرخی میں، چاندنی کی دلکش ضیا میں، کھلے ہوئے گلاب کے پُھول پر، آفتاب کی شعاعوں سے مجلّا شبنمی قطروں میں بھی وہ زینت اور وہ رونق نہ تھی۔ برف کا سفید تاج پہنے ہوئے پہاڑوں میں بھی وہ روح افزا ٹھنڈک نہ تھی جو بنّی یعنی بندھیشوری کی بڑی بڑی آنکھوں میں تھی۔

چوبے جی نے بنّی کے لیے کسی قابل لڑکے کی تلاش شروع کی۔ لڑکوں کی شادیوں میں دل کے حوصلے نکال چکے تھے۔ اب لڑکی کی شادی میں اُن حوصلوں کی تکمیل کرنا چاہتے

تھے۔ دولت لُٹا کر شہرت حاصل کر چکے تھے۔ اب جہیز دے کر نام کمانے کی خواہش تھی۔ بیٹے کا بیاہ کرلینا آسان ہے مگر بیٹی کے بیاہ میں آبرو نبھا لے جانا مشکل ہے۔ کشتی پر سبھی پار اُترتے ہیں۔ جو تیر کر دریا کو عبور کرے وہی تعریف کا مستحق ہے۔

روپے کی کمی نہ تھی۔ اچھا گھر اور اچھا لڑکا مل گیا۔ زائچے بھی موافق ہوگئے۔ برچھا اور تلک کی رسمیں بھی ادا کردی گئیں۔ مگر ہائے بدنصیبی! کہاں تو بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں، دروازے پر درزی، سُنار، حلوائی سب اپنا اپنا کام کر رہے تھے، کہاں ظالم آسمان نے کچھ اور ہی نقشہ جما دیا۔ شادی کے ایک ہفتہ قبل منگلا اچانک بیمار پڑی اور تین ہی روز میں اپنے سارے ارمانوں کو لیے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔

شام ہوگئی تھی۔ منگلا چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ بیٹے، بہوئیں، پوتے، پوتیاں۔ سب پلنگ کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ بنّی پائتے بیٹھی ہوئی پیر دبا رہی تھی، نزع کی حالت کا خوفناک سا سکوت طاری تھا۔ کوئی کسی سے نہ بولتا تھا، دل میں سب سمجھ رہے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ صرف چوبے جی وہاں نہ تھے۔

دفعتاً منگلا نے اِدھر اُدھر آرزومند نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ذرا اُنھیں بلا دو۔ کہاں ہیں؟

پنڈت جی اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے رُو رہے تھے۔ خبر پاتے ہی آنسو پونچھتے ہوئے مکان میں آئے۔ اور بڑے صبر و استقلال کے ساتھ منگلا کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ اندیشہ تھا کہ میری آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی گرا تو گھر میں کہرام مچ جاوے گا۔

منگلا نے کہا۔ ایک بات پوچھتی ہوں، بُرا نہ ماننا۔ بنّی تمھاری کون ہے؟

پنڈت۔ بنّی کون ہے۔ میری بیٹی ہے اور کون؟

منگلا۔ ہاں میں تمھارے منہ سے یہ ہی سُننا چاہتی تھی۔ اُسے سدا اپنی بیٹی سمجھتے رہنا۔ اس کے بیاہ کے لیے میں جو جو تیاریاں کی تھیں اُن میں کچھ کمی نہ کرنا۔

پنڈت۔ اس کی کچھ فکر نہ کرو۔ ایشور نے چاہا تو اس سے کچھ زیادہ دھوم دھام کے ساتھ بیاہ ہوگا۔

منگلا۔ اُسے ہمیشہ بلاتے رہنا۔ تیج تہوار میں کبھی مت بھولنا۔

پنڈت۔ ان باتوں کی مجھے یاد دِلانے کی ضرورت نہیں۔

منگلا نے کچھ سوچ کر پھر کہا۔ اسی سال بیاہ کر دینا۔

پنڈت۔ اس سال کیسے ہوگا؟

منگلا۔ یہ پھاگن کا مہینہ ہے۔ جیٹھ تک لگن ہے۔

پنڈت۔ ہوسکے گا تو اسی سال کردوں گا۔

منگلا۔ ہوسکنے کی بات نہیں، ضرور کر دینا۔

پنڈت۔ کردوں گا۔

اُس کے بعد گودان کی تیاری ہونے لگی۔

(۴)

بڑھاپے میں بیوی کا مرنا، برسات میں گھر کا گرنا پھر اُس کے بننے کی امید نہیں ہوتی۔

منگلا کی موت سے پنڈت کی زندگی بے قاعدہ اور بے سلسلہ ہوگئی۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک ہوا۔ کئی کئی روز کچہری نہ جاتے، جاتے بھی تو بڑے اصرار سے۔ کھانا اچھا نہ لگتا۔ بندھیشوری ان کی حالت دیکھ دیکھ کر دل میں کُڑھتی۔ اور حتی الامکان ان کا دل بہلانے کی کوشش کرتی رہتی۔ وہ انھیں پُرانوں کی داستان پڑھ کر سُناتی۔ اُن کے لیے انواع و اقسام کے کھانے تیار کرتی اور انھیں ضد کرکے کھلاتی۔ جب تک وہ نہ کھاتے آپ کچھ نہ کھاتی۔ گرمی کے دن تھے ہی رات کو بڑی دیر تک ان کے پائینتے بیٹھی پنکھا جھلا کرتی اور جب تک وہ سو نہ جاتے آپ بھی سونے نہ جاتی۔ وہ ذرا بھی دردِ سر کی شکایت کرتے تو فوراً اُن کے سر میں تیل لگاتی۔ یہاں تک کہ رات کو جب انھیں پیاس معلوم ہوتی تو خود دوڑ کر آتی اور انھیں پانی پلاتی۔ رفتہ رفتہ پنڈت جی کے دل میں منگلا صرف ایک راحت ماضیہ کی یادگار رہ گئی۔

ایک روز چوبے جی نے بنّی کو منگلا کے کل گہنے دے دیے۔ منگلا کی یہ آخری تمنا تھی۔ بنّی پھولی نہ سمائی اُس نے اِس روز خوب بناؤ سنگار کیا۔ جب شام کے وقت پنڈت جی کچہری سے تشریف لائے تو وہ زیوروں سے لدی ہوئی اُن کے سامنے کچھ لجاتی اور کچھ مسکراتی ہوئی جا کھڑی ہوگئی۔

پنڈت جی نے پُرشوق نگاہوں سے دیکھا۔ بندھیشوری کے متعلق اب ان کے دل میں

ایک نیا خیال پیدا ہو رہا تھا۔ منگلا جب تک زندہ تھی وہ ان کے پدرانہ جذبات کو متحرک اور مضبوط کرتی رہتی تھی۔ اب منگلا نہ تھی۔ پس وہ جذبہ روز بروز کمزور ہوتا جاتا تھا۔ منگلا کے سامنے بنّی محض بچّہ تھی، منگلا کی عدم موجودگی میں وہ ایک خوبصورت اور جوان عورت تھی۔ لیکن سادہ مزاج بنّی کو اس کی ذرا بھی خبر نہ تھی کہ "بھیّا" کے خیالات میں کیا تغیر ہو رہا ہے۔ اُس کے لیے وہ وہی باپ کے درجے والے بھیّا تھے۔ وہ مردوں کے مزاج سے ناواقف تھی۔ عورتوں میں عمر کے ساتھ مادرانہ جذبہ پختہ ہوتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب عورت کی نظروں میں کل نوجوان اشخاص بیٹوں کی طرح جچنے لگتے ہیں۔ اس کے دل میں نفسانی خواہشوں کا نام و نشان بھی نہیں رہ جاتا۔ مگر مردوں میں یہ حالت کبھی نہیں ہوتی۔ خواہ اُن کے اعضاء نکمّے ہی کیوں نہ ہوجائیں امکاناً نفسانی خواہشات میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ مرد کو نفس پرستیوں سے کبھی نجات ہی نہیں ملتی۔ بلکہ جیوں جیوں عمر زیادہ ہوتی ہے۔ گرمی کی شام کی طرح اُس کی نفسانی حرارت بھی زیادہ تیز ہوتی جاتی ہے۔ وہ آسودگی کی غرض سے ذلت آمیز ذرائع کا سہارا لینے پر بھی آمادہ ہوجاتا ہے۔ جوانی میں انسان اتنا نہیں گرتا اُس کے اطوار میں غرور کا شائبہ زیادہ ہوتا ہے۔ جس کو ایسے ذرائع سے نفرت ہوتی ہے۔ وہ کسی کے مکان میں جبراً داخل ہوسکتا ہے۔ مگر موری کے راستے سے وہاں نہیں جاسکتا۔

پنڈت جی نے بنّی کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور پھر اپنی اس شرارت پر نادم ہوکر آنکھیں نیچی کرلیں۔ بنّی اس کا کچھ مطلب نہ سمجھ سکی۔

پنڈت جی بولے۔ تمھیں دیکھ کر مجھے منگلا کے اُس وقت کی یاد آرہی ہے جب وہ بیاہ کے دن یہاں آئی تھی۔ بالکل ایسی ہی شکل میں تھی یہی گورا رنگ، یہی بشاش چہرہ، یہی نازک جسم، یہی شرمیلی آنکھیں! وہ تصویر ابھی تک میرے دل کے پردہ پر کھنچی ہوئی ہے۔ کبھی نہیں مٹ سکتی، ایشور نے تمھاری شکل میں میری منگلا مجھے پھر دے دی۔

بنّی۔ آپ کے لیے کیا جل پان لاؤں؟

پنڈت۔ لے آنا۔ ابھی بیٹھو۔ میں بہت دُکھی ہوں۔ تم نے میرے دُکھ کو بھلا دیا ہے۔ واقعی تم نے مجھے جِلا دیا۔ ورنہ مجھے اُمید نہ تھی کہ منگلا کے بعد زندہ رہوں گا، تم نے مجھے زندگی دی۔ نہیں معلوم تمھارے چلے جانے پر میری کیا حالت ہوگی۔

بنّی۔ کہاں چلے جانے پر؟ میں تو کہیں نہیں جا رہی ہوں۔

پنڈت۔ کیوں، تمھارے بیاہ کی ساعت آ رہی ہے۔ چلی ہی جاؤ گی؟

بنّی۔ (شرماتی ہوئی) ایسی جلدی کیا ہے؟

پنڈت۔ جلدی کیوں نہیں ہے؟ دنیا ہنسے گی۔

بنّی۔ ہنسنے دیجیے۔ میں یہیں آپ کی سیوا کرتی رہوں گی؟

پنڈت۔ نہیں بنّی! میرے لیے تم کیوں ہلکان ہوگی۔ میں اَبھاگا ہوں، جب تک زندگی ہے جیوں گا، خواہ رو کر جیوں، خواہ ہنس کر، ہنسی میرے بھاگ سے روٹھ گئی، تم نے اتنے دنوں تک سنبھال لیا یہی کیا کم احسان کیا۔ میں یہ جانتا ہوں کہ تمھارے جانے کے بعد کوئی میری خبر لینے والا نہیں رہے گا، یہ گھر اُجڑ جائے گا، اور مجھے گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ مگر کیا کیا جاوے، مجبوری ہے۔ تمھارے بغیر اب میں یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رہ سکتا۔ منگلا کی خالی جگہ تو تم نے پوری کی۔ اب تمھاری جگہ کون پوری کرے گا؟

کیا اس سال رُک نہیں سکتا؟ میں اس حالت میں آپ کو چھوڑ کر نہ جاؤں گی؟

پنڈت۔ اپنے بس کی بات تو نہیں، وہ لوگ جلدی کریں گے تو مجبور ہو کر کرنا ہی پڑے گا؟

بنّی۔ بہت جلدی مچاویں تو آپ کہہ دیجیے گا کہ اب ہم نہیں کریں گے، اُن لوگوں کے جو جی میں آوے وہ کریں۔ کیا یہاں کوئی ان کا وکیل بیٹھا ہوا ہے؟

پنڈت۔ وہ لوگ تو ابھی سے اصرار کر رہے ہیں۔

بنّی۔ آپ پھٹکار کیوں نہیں دیتے؟

پنڈت۔ کرنا تو ہے ہی، پھر دیر کیوں کروں؟ یہ دکھ اور جدائی تو ایک دن ہونی ہی ہے، اپنی مصیبت کا بوجھ تمھارے سر کیوں رکھوں؟

بنّی۔ دُکھ سُکھ میں کام نہ آؤں گی تو اور کِس دن کام آؤں گی؟

(۵)

پنڈت جی کے دل میں کئی روز تک ایسا ہنگامہ برپا رہا۔ وہ اب بنّی کو پدرانہ نگاہوں سے نہ دیکھ سکتے تھے۔ بنّی اب منگلا کی بہن اور اُن کی سالی تھی۔ دنیا ہنسے گی تو ہنسے، زندگی تو آرام سے کٹے گی، ان کے خیالات کبھی اس قدر سرور افزا نہ تھے۔ انھیں اپنے اعضاء میں

پھر شباب کی حرارت کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ سوچتے کہ بنّی کو میں اپنی لڑکی سمجھتا تھا مگر وہ میری لڑکی ہے تو نہیں۔ اس طرح سمجھنے سے کیا ہوتا ہے؟ کون جانے، ایشور کو یہی منظور ہو ورنہ بنّی یہاں آتی ہی کیوں؟ اس نے اس حیلے سے یہی ملاپ تجویز کر دیا ہوگا، اس کی لیلا کوئی کیا جانے۔

پنڈت جی نے نوشہ کے باپ کو اطلاع دے دی کہ چند خاص وجوحات سے امسال شادی نہیں ہوسکتی۔

بندھیشوری کو ابھی تک کچھ خبر نہ تھی کہ میرے لیے کیا کیا سازشیں ہورہی ہیں۔ وہ خوش تھی کہ میں بھیا جی کی خدمت کر رہی ہوں اور بھیا جی مجھ سے خوش ہیں۔ بہن کا انھیں بڑا رنج ہے۔ میں نہ رہوں گی تو یہ کہیں چلے جائیں گے۔ کون جانے سادھو سنیاسی ہوجائیں؟ گھر میں کیسے جی لگے گا؟

وہ پنڈت کے دل بہلاؤ کی ہمیشہ کوشش کرتی رہتی تھی، انھیں کبھی اُداس نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ پنڈت جی کا دل اب کچہری میں نہ لگتا تھا۔ گھنٹے دو گھنٹے بیٹھ کر چلے آتے تھے۔ نوجوانوں کی محبت میں اضطراب ہوتا ہے۔ اور بوڑھوں کی محبت میں اعتقاد۔ وہ اپنے شباب کی کمی کو خوشامد سے، شیریں کلامی سے اور حاضری سے پوری کرنا چاہتے ہیں۔

منگلا کو مرے ابھی تین مہینے گزرے تھے کہ چوبے جی سُسرال پہنچے۔ ساس نے منہ مانگی مُراد پائی۔ اس کے دو لڑکے تھے۔ گھر میں کچھ سرمایہ نہ تھا۔ اُن کی پرورش و تعلیم کے لیے کوئی سہارا نظر نہ آتا تھا۔ منگلا مر ہی چکی تھی، لڑکی کا جیوں ہی بیاہ ہوجائے گا وہ اپنے گھر کی ہو رہے گی۔ پھر چوبے سے ناتا ہی ٹوٹ جائے گا۔ وہ اسی کاوش میں مبتلا تھی کہ چوبے جی پہنچے گویا دیوتا خود ہی بردان دینے آئے ہوں۔

جب چوبے جی کھانا کھاکر لیٹے تو ساس نے کہا، بھیا، ابھی کہیں بات چیت ہوئی کہ نہیں؟

پنڈت۔ اماں، اب میرے بیاہ کی بات چیت کیا ہوگی؟

ساس۔ کیوں بھیا، ابھی تمھاری عمر ہی کیا ہے؟

پنڈت۔ کرنا بھی چاہوں تو بدنامی کے ڈر سے نہیں کرسکتا پھر مجھے پوچھتا ہی کون ہے؟

ساس۔ پوچھنے کو ہزاروں ہیں۔ دور کیوں جاؤ۔ اپنے گھر ہی میں لڑکی بیٹھی ہوئی ہے۔ سُنا ہے

کہ تم نے منگلا کے سب گہنے بنّی کو دے دیے ہیں۔ کہیں اور بیاہ ہوا تو یہ کئی ہزار کی چیزیں تمھارے ہاتھوں سے نکل جائیں گی۔ تم سا اچھا لڑکا میں اور کہاں پاؤں گی؟ تم اُسے قبول کرلو تو میں تر جاؤں گی؟

(۶)

بنّی اپنے گاؤں کے کچے مکان میں اپنی ماں کے پاس بیٹھی ہوئی ہے۔ اب کے چوبے جی نے اس کی خدمت کے لیے ایک خادمہ بھی ساتھ کردی ہے۔ بندھیشوری کے دونوں بھائی متعجب ہو ہوکر اس کے گہنوں کو دیکھ رہے ہیں۔ گاؤں کی اور کئی عورتیں اسے دیکھنے کے لیے آئی ہوئی ہیں۔ اور اُس کے حُسن کی افزونی دیکھ کر متحیر ہو رہی ہیں۔ یہ وہی بنّی ہے جو یہاں موٹی پھریا پہنے کھیلا کرتی تھی۔ رنگ روپ کیسا نکھر آیا ہے۔ سُکھ کی دیہہ (بدن) ہے نا۔

جب مجمع کم ہوا تو ماں نے پوچھا۔ تیرے بھیّا جی تو اچھی طرح ہیں نہ بیٹی؟ یہاں آئے تھے تو بہت دُکھی تھے، منگلا کا سوچ انھیں کھائے جاتا ہے۔ دنیا میں ایسے مرد بھی ہیں جو بیوی کے لیے جان دیتے ہیں نہیں تو یہاں استری مری اور چٹ پٹ دوسرا بیاہ ہوا۔ گویا مناتے رہتے ہیں کہ یہ مرے تو نئی نویلی بہو گھر لاویں۔

بندھیشوری۔ اُنھیں یاد کرکے رُویا کرتے ہیں۔ چلی آئی ہوں نہ جانے کیسے ہوں گے؟

ماں۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ تیرا بیاہ ہوجانے پر کہیں وہ گھبرا کر سادھو فقیر نہ ہوجائیں۔

بندھیشوری۔ مجھے بھی تو یہی ڈر لگتا ہے۔ اسی سے تو میں نے کہہ دیا کہ ابھی جلدی کیا ہے۔

ماں۔ جتنے ہی دن اُن کی سیوا کروگی اتنی ہی ان کی محبت بڑھے گی۔ اور تمھارے جانے سے انھیں اتنا ہی دُکھ بھی ہوگا، بیٹی، سچ تو یہ ہے کہ وہ تمھیں کو دیکھ کر جیتے ہیں۔ اِدھر تمھاری ڈولی اُٹھی اور اُدھر اُن کا گھر ستیاناس ہوا۔ میں تمھاری جگہ ہوتی تو انھیں سے بیاہ کرلیتی۔

بدھیشوری۔ اے ہٹو اماں! گالی دیتی ہو۔ انھوں نے مجھے بیٹی کہہ کے پالا ہے۔ میں بھی انہیں اپنا باپ ....

ماں۔ چُپ رہ پگلی، کہنے سے کیا ہوتا ہے؟

بندھیشوری۔ ارے سوچو تو اماں، کتنی بے ڈھنگی بات ہے؟
ماں۔ مجھے تو اس میں کوئی بے ڈھنگاپن نہیں دِکھائی دیتا؟
بندھیشوری۔ کیا کہتی ہو اماں؟ اُن سے میرا۔ میں تو لاج کے مارے مرجاؤں، اُن کے سامنے نہ تاک سکوں۔ وہ بھی کبھی نہ مانیں گے، ماننے کی بات بھی ہو کوئی۔
ماں۔ ان کا ذمہ میں لیتی ہوں، میں اُنھیں راضی کر لوں گی، تو راضی ہوجا۔ یاد رکھ کہ یہ کوئی ہنسی خوشی کا بیاہ نہیں ہے۔ اُس آدمی کی جان بچانے کی بات ہے۔ جس کے سوائے دنیا میں اور ہمارا کوئی نہیں ہے۔ پھر ان کی ابھی کچھ ایسی عمر بھی تو نہیں ہے۔ پچاس سے دو ہی چار برس اوپر ہوں گے۔ اُنھوں نے ایک جیوتشی سے پوچھا بھی تھا۔ اُس نے اُن کی کنڈلی دیکھ کر بتایا ہے کہ آپ کی عمر کم سے کم ستر برس کی ہے، دیکھنے سننے میں بھی وہ سو دو سو میں ایک ہیں۔

بات چیت میں چالاک ماں نے ایسا جال رچا کہ سیدھی سادی لڑکی اُس میں سے نہ نکل سکی۔ ماں جانتی تھی کہ لالچ کا جادو اُس پر نہ چڑھے گا۔ روپے کا، زیور کا، خاندانی عزت کا، امیرانہ زندگی کا اُس نے ذکر تک نہ کیا۔ اُس نے صرف چوبے جی کی قابلِ رحم حالت پر زور دیا۔ آخر بندھیشوری نے کہا۔ اماں، میں جانتی ہوں کہ میرے نہ رہنے سے اُن کو بڑا رنج ہوگا یہ بھی جانتی ہوں کہ مجھے سکھ نہیں بدا ہے۔ اچھا اُن کی بھلائی کے لیے میں اپنی زندگی نچھاور کردوں گی۔ ایشور کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔

(۷)

چوبے جی کے گھر میں شگون کے گیت گائے جارہے تھے۔ بندھیشوری آج بہو بن کر گھر میں آئی ہے۔ کئی سال قبل وہ چوبے جی کی بیٹی بن کر آئی تھی، اُس نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ میں ایک روز اس گھر کی مالک بنوں گی۔

چوبے جی کے سج دھج آج دیکھنے کے لائق ہے۔ تنزیب کا رنگین کرتا، کتری اور سنواری ہوئی مونچھیں، خضاب کے چمکتے ہوئے بال، ہنستا ہوا چہرہ، چڑھی ہوئی آنکھیں، شباب کا پورا سوانگ تھا۔

رات زیادہ جا چکی تھی۔ بندھیشوری گہنوں سے لدی ہوئی بھاری جوڑا پہنے، فرش پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ اُسے کوئی حوصلہ، کوئی شوق نہ تھا، کوئی خوف نہ تھا۔ صرف یہ خیال

تھا کہ میں اُن کے سامنے منہ کھولوں گی؟ اُن کی گودی میں کھیلی ہوں، ان کے کندھوں پر بیٹھی ہوں، اُن کی پیٹھ پر چڑھی ہوں۔ اُنھیں کیسے منہ دِکھاؤں گی؟ مگر وہ پچھلی باتیں کیوں سوچوں؟ ایشور انھیں خوش رکھے۔ جس کے لیے میں نے بیٹی سے بیوی بننا منظور کیا وہ آرزو پوری ہو۔ اُن کی زندگی آرام سے بسر ہو۔

اتنے میں چوبے جی آئے۔ بندھیشوری اُٹھ کھڑی ہوئی اُسے اتنی شرم آئی کہ جی چاہتا تھا، کہیں بھاگ جاوے کھڑکی سے نیچے کود پڑے۔

چوبے جی نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے۔ بنّی! مجھ سے ڈرتی ہو؟

بنّی کچھ نہ بولی۔ بت کی طرح وہیں کھڑی رہی۔ ایک لمحہ میں چوبے جی نے اُسے بٹھا دیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اس کا گلا بھر بھر آتا تھا۔ تقدیر کا یہ بے رحمانہ کھیل، یہ وحشت خیز تماشہ اس کے لیے نا قابلِ برداشت ہو رہا تھا۔

پنڈت جی نے پھر پوچھا۔ بنّی! بولتی کیوں نہیں؟ کیا مجھ سے ناراض ہو؟

بندھیشوری نے اپنے کان بند کر لیے۔ یہی پہچانی ہوئی آواز وہ کتنے دنوں سے سنتی چلی آئی تھی۔ آج طنز سے بھی زیادہ دل دوز، اور مضحکہ سے بھی زیادہ سمع خراش معلوم ہوتی تھی؟

دفعتاً پنڈت جی چونک پڑے اور اُن کے دونوں ہاتھ مینڈھک کے پیروں کی طرح سکڑ گئے۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ کھڑکی سے منگلا اندر جھانک رہی تھی! منگلا تھی، سایہ نہیں، منگلا تھی، مجسم اور زندہ! اس کی آنکھیں غصہّ اور حقارت سے معمور تھیں؟

چوبے جی کانپتی ہوئی، ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولے۔ بنّی! دیکھو وہ کیا ہے؟

بنّی نے بھی گھبرا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں کچھ نہ تھا۔ بولی۔ کیا ہے؟ مجھے تو کچھ نہیں دِکھائی دیتا۔

چوبے جی۔ اب غائب ہوگئی۔ لیکن ایشور جانتا ہے، منگلا تھی۔

بنّی۔ بہن؟

چوبے۔ ہاں ہاں، وہی۔ کھڑکی سے اندر جھانک رہی تھی۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

بندھیشوری کانپتی ہوئی بولی۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔

چوبے۔ نہیں نہیں بنّی، کوئی ڈر نہیں ہے۔ مجھے دھوکا ہوا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ وہ اسی گھر

میں رہتی تھی۔ یہیں سوتی تھی، اسی سے شاید میرے خیال نے اُس کی مورت لاکر کھڑی کردی۔ کوئی بات نہیں ہے۔ آج کا دن کتنا مبارک ہے کہ میری بنّی واقعی میری ہی ہوگئی ....۔

یہ کہتے کہتے چوبے جی پھر چونک پڑے۔ پھر وہی مورت کھڑکی سے جھانک رہی تھی۔ مورت نہیں، سرتاپا مجسّم اور زندہ منگلا! اب کے اس کی آنکھوں میں غصّہ نہ تھا، حقارت نہ تھی، اُن میں ہنسی بھری ہوئی تھی۔ گویا وہ اس نظارہ پر ہنس رہی ہے۔ گویا اُس کے سامنے کوئی تماشا ہو رہا تھا۔

چوبے جی نے کانپتے ہوئے کہا۔ بنّی! پھر وہی بات ہوئی۔ وہ دیکھو منگلا کھڑی ہے۔

بندھیشوری چیخ کر اُن کے گلے سے لپٹ گئی۔

چوبے نے مہابیر جی کا نام جپتے ہوئے کہا۔ میں کواڑ بند کیے دیتا ہوں۔

بنّی۔ میں اس مکان میں نہ رہوں گی (رو کر) بھیّا جی تم نے بہن کی آخری بات نہیں مانی اسی سے اُن کا دل دُکھی ہو رہا ہے۔ مجھے تو کسی بدی کا اندیشہ ہو رہا ہے۔

چوبے جی نے اُٹھ کر کھڑکی کے کواڑ بند کر دیئے اور کہا۔ میں کل دُرگا پاٹھ کراؤں گا۔ آج تک کبھی ایسا گمان نہ ہوا تھا۔ تم سے کیا کہوں؟ معلوم ہوتا ہے .... ہوگا، اس بات کو جانے دو۔ یہاں بڑی گرمی پڑ رہی ہے۔ ابھی بارش کو دو ماہ سے کم نہیں ہیں ہم لوگ منصوری کیوں نہ چلیں؟

بندھیشوری۔ میرا تو کہیں جانے کو جی نہیں چاہتا ہے۔ کل سے دُرگا پاٹھ کرانا۔ مجھے اب اس کمرہ میں نیند نہ آوے گی۔

پنڈت۔ کتابوں میں تو یہی دیکھا ہے کہ مرنے کے بعد صرف سوکشم شریر (جسم لطیف) رہ جاتا ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ صورت کیوں کر دِکھائی پڑ رہی ہے۔ کچھ نہیں یہ میرے خیال کا قصور ہے۔ کبھی کبھی ایسا وہم ہوجاتا ہے۔ میں سچ کہتا ہوں۔ بنّی کہ اگر تم نے مجھ پر دَیا نہ کی ہوتی تو میں کہیں کا نہ رہتا۔ شاید اس وقت میں بدری ناتھ کے پہاڑوں میں سر ٹکراتا ہوتا یا کون جانے کچھ کھاکر مرچکا ہوتا۔

بندھیشوری۔ منصوری میں کسی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑے گا؟

پنڈت۔ نہیں، مکان بھی ملتے ہیں۔ میں اپنے ایک دوست کو لکھ دیتا ہوں وہ کہیں مکان

طے کر رکھیں گے۔ وہاں .... ۔

بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ جانے کہاں سے (جیسے پردۂ غیب سے) آواز آئی۔ بنّی تمھاری لڑکی ہے؟

چوبے جی نے دونوں کان بند کر لیے۔ خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے بولے۔ بنّی یہاں سے چلو۔ نہ جانے کہاں سے آوازیں آرہی ہیں۔

''بنّی تمھاری لڑکی ہے۔'' یہ آواز ہزاروں کانوں سے پنڈت جی کو سُنائی پڑنے لگی۔ گویا اس کمرہ کی ایک ایک چیز سے یہ صدا آ رہی تھی!

بنّی نے روکر پوچھا۔ کیسی آوازیں تھی؟

پنڈت۔ کیا بتاؤں؟ کہتے شرم آتی ہے۔

بنّی۔ ضرور بہن جی کی آتما (روح) ہے۔ بہن ! مجھ پر دَیا کر، میں بالکل بے قصور ہوں۔

پنڈت۔ پھر وہی آواز آرہی ہے۔ ہائے ایشور کہاں جاؤں؟ میرے تو روئیں ، روئیں میں وہی آواز گونج رہی ہے۔ بنّی، میں نے بُرا کیا۔ منگلا ستی تھی، اس کی عدولِ حکمی کرکے میں نے اپنے حق میں زہر بویا۔ کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟

یہ کہہ کر پنڈت جی نے کمرے کے کواڑ کھول دیے اور بے تحاشا بھاگے۔ اپنے مردانہ کمرے میں پہنچ کر وہ گر پڑے۔ بنّی بھی دوڑی مگر چوکھٹ سے باہر نکلتے ہی گر پڑی۔

یہ افسانہ پہلی بار ماہنامہ 'مادھوری' کے اگست 1924میں شائع ہوا۔ ہندی میں مان سرور 4 اور اردو میں فردوس خیال میں شامل ہے۔

ایک آنچ کی کسر

سارے نگر میں مہاشے جشودانند کا بکھان ہو رہا تھا۔ نگر ہی میں نہیں، سمست پرانت میں ان کی کیرتی (شہرت) گائی جاتی تھی۔ سماچار پتروں میں ٹپّڑیاں ہو رہی تھیں۔ متروں سے پرشنسا پورن پتروں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ سماج سیوا اس کو کہتے ہیں۔ اُنّت وِچار کے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ مہاشے جی نے شکشت سمودایہ کا مُکھ اُجوّل کر دیا۔ اب کون یہ کہنے کا ساہس کرسکتا ہے کہ ہمارے نیتا کیول بات کے دھنی ہیں، کام کے دھنی نہیں۔ مہاشے جی چاہتے تو اپنے پُتر کے لیے انھیں کم سے کم ۲۰ ہزار روپے دہیز میں ملتے، اس پر خوشامد گھاتے میں۔ مگر لالہ صاحب نے سدھانت کے سامنے دھن کی رتّی برابر پروا نہ کی اور اپنے پُتر کا وِواہ بِنا ایک پائی دہیز لیے سویکار کیا۔ واہ! ہمّت ہو تو ایسی ہو، سدھانت پریم ہو تو ایسا ہو، آدرش پالن ہو تو ایسا ہو! واہ رے سچّے ویر، اپنی ماتا کے سچّے سپوت تونے وہ کر دکھایا جو کبھی کسی نے نہ کیا تھا۔ ہم بڑے گروَ سے تیرے سامنے مستک نواتے ہیں۔

مہاشے جشودانند کے دو پُتر تھے۔ بڑا لڑکا پڑھ لکھ کر فاضل ہوچکا تھا۔ اسی کا وِواہ ہو رہا تھا اور جیسا ہم دیکھ چکے ہیں، بِنا کچھ دہیز لیے۔

آج وَر کا تِلک تھا۔ شاہجہاں پور کے مہاشے سوامی دیال تِلک لے کر آنے والے تھے۔ شہر کے گن مانیہ سجّنوں کو نیمنترن دے دیے گئے تھے۔ وے لوگ جمع ہوگئے تھے۔ محفل سجی ہوئی تھی۔ ایک پروین ستاریا اپنا کوشل دِکھا کر لوگوں کو مُگدھ کر رہا تھا۔ دعوت کا سامان بھی تیار تھا متر گن یشودانند کو بدھائیاں دے رہے تھے۔

ایک مہاشے بولے۔ تم نے یار کمال کر دیا۔

دوسرے۔ کمال! یہ کہیے کہ جھنڈے گاڑ دیے۔ اب تک جسے دیکھا منچ پر ویاکھان جھاڑتے ہی دیکھا۔ جب کام کرنے کا اوسر آتا تھا تو لوگ دُم دبا لیتے تھے۔

تیسرے۔ کیسے کیسے بہانے گڑھے جاتے ہیں۔ صاحب ہمیں تو دہیز سے سخت نفرت ہے۔ یہ میرے سدھانت کے وِرودھ ہے، پر کروں کیا، بچّے کی امّی جان نہیں مانتیں! کوئی

اپنے باپ پر پھینکتا ہے، کوئی اور کسی خرانٹ پر۔

چوتھے۔ اجی، کتنے تو ایسے بے حیا ہیں جو صاف صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے لڑکے کی شکشا دِکشا میں جتنا خرچ کیا ہے، وہ ہمیں ملنا چاہیے۔ مانو اُنھیں نے یہ روپے کسی بینک میں جمع کیے تھے۔

پانچویں۔ خوب سمجھ رہا ہوں، آپ لوگ مجھ پر چھینٹے اُڑا رہے ہیں۔ اس میں لڑکے والوں کا ہی سارا دوش ہے یا لڑکی والوں کا بھی کچھ ہے؟

پہلے۔ لڑکی والے کا کیا دوش ہے سِوا اس کے کہ وہ لڑکی کا باپ ہے۔

دوسرے۔ سارا دوش ایشور کا جس نے لڑکیاں پیدا کیں۔ کیوں؟

پانچویں۔ میں یہ نہیں کہتا۔ نہ سارا دوش لڑکی والے کا ہے، نہ سارا دوش لڑکے والوں کا۔ دونوں ہی دوشی ہیں۔ اگر لڑکی والا کچھ نہ دے تو اُسے یہ شکایت کرنے کا تو کوئی ادھِکار نہیں ہے کہ ڈال کیوں نہیں لائے، سُندر جوڑے کیوں نہیں لائے، باجے گاجے اور دھوم دھام کے ساتھ کیوں نہیں آئے؟ بتائیے!

چوتھے۔ ہاں، آپ کا یہ پرشن غور کرنے کے لائق ہے۔ میری سمجھ میں تو ایسی دشا میں لڑکے کے پتا سے یہ شکایت نہ ہونی چاہیے۔

پانچویں۔ تو یوں کہیے کہ دہیز کی پرتھا کے ساتھ ہی ڈال، اور جوڑوں کی پرتھا بھی تیاجیہ ہے۔ کیول دہیز کو مٹانے کا پریتن کرنا ویرتھ ہے۔

یشودانند۔ یہ بھی Lame excuse ہے۔ میں نے دہیز نہیں لیا ہے، لیکن کیا ڈال گہنے نہ لے جاؤں گا۔

پہلے۔ مہاشے، آپ کی بات نرالی ہے۔ آپ اپنی گنتی ہم دنیا والوں کے ساتھ کیوں کرتے ہیں؟ آپ کا استھان تو دیوتاؤں کے ساتھ ہے۔

دوسرے۔ ۲۰ ہزار کی رقم چھوڑ دی؟ کیا بات ہے۔

یشودانند۔ میرا تو یہ نشچے ہے کہ ہمیں سدیو پرنسپلس پر استھر رہنا چاہیے۔ پرنسپل کے سامنے منی کی کوئی ویلو نہیں ہے۔ دہیز کی کُپرتھا پر میں نے خود کوئی ویکھیان نہیں دیا، شاید کوئی نوٹ تک نہیں لکھا۔ ہاں کانفرنس میں اس پرستاو کو سیکنڈ کرچکا ہوں اور اس لیے میں اپنے کو اُس پرستاو سے بندھا ہوا پاتا ہوں۔ میں اُسے توڑنا بھی چاہوں تو آتما نہ توڑنے

دے گی۔ میں ستیہ کہتا ہوں، یہ روپے لے لوں تو مجھے اتنی مانسِک ویدنا ہوگی کہ شاید میں اس اگھات سے بچ ہی نہ سکوں۔

پانچویں۔ اب کی کانفرنس آپ کو سبھاپتی نہ بنائے تو اُس کا گھور انیائے ہے۔

جشودانند۔ میں نے اپنی ڈیوٹی کر دی، اُس کا recognition (قدر) ہو یا نہ ہو، مجھے اس کی پروا نہیں۔

اتنے میں خبر ہوئی کہ مہاشے سوامی دیال آ پہنچے۔ لوگ اُن کا ابھیوادن کرنے کو تیار ہوئے، اُنھیں مسند پر لا بیٹھایا اور تِلک کا سنسکار آرمبھ ہوگیا۔ سوامی دیال نے ایک ڈھاک کے پتے پر ناریل، سُپاری، چاول، پان آدی وستوئیں وَر کے سامنے رکھیں۔ براہمنوں نے منتر پڑھے۔ ہون ہوا اور وَر کے ماتھے پر تِلک لگایا دیا گیا۔ تُرنت گھر کی استریوں نے منگلا چرن گانا شروع کیا۔ یہاں محفل میں مہاشے یشودانند نے ایک چوکی پر کھڑے ہوکر دہیز کی کُپرتھا پر ویکھیان دینا شروع کیا۔ ویکھیان پہلے سے لکھ کر تیار کر لیا گیا تھا۔ انھوں نے دہیز کی اتہاسِک ویاکھیا کی تھی۔ پوروَ کال میں دہیز کا نام بھی نہ تھا۔ مہاشے! کوئی جانتا ہی نہ تھا کہ دہیز یا ٹھہرانی کس چڑیا کا نام ہے۔ ستیہ مانیے، کوئی جانتا ہی نہ تھا کہ ٹھہرانی ہے کیا چیز، پشو یا پکشی۔ آسمان میں یا زمین میں، کھانے میں یا پینے میں۔ بادشاہی زمانے میں اس پرتھا کی بنیاد پڑی۔ ہمارے یووک سیناؤں میں سمِلت ہونے لگے، وہ ویر لوگ تھے، سیناؤں میں جانا گروَ کی بات سمجھتے تھے۔ ماتائیں اپنے دُلاروں کو اپنے ہاتھ سے شستروں سے سجا کر رن چھیتر میں بھیجتی تھیں۔ اس بھانتی یووکوں کی سنکھیا کم ہونے لگی اور لڑکوں کا مول تول شروع ہوا۔ آج یہ نوبت آ گئی ہے کہ میری اس تُچھ مہا تُچھ سیوا پر پتروں میں ٹِپّیاں ہو رہی ہیں مانا میں نے کوئی اسادھارن کام کیا ہے۔ میں کہتا ہوں، اگر آپ سنسار میں جیوت رہنا چاہتے ہیں تو اس پرتھا کا تُرنت انت کیجیے۔

ایک مہاشے نے شنکا کی۔ کیا اس کا انت کیے بِنا ہم سب مر جائیں گے؟

جشودانند۔ اگر ایسا ہوتا تو کیوں پوچھنا تھا، لوگوں کو دنڈ مل جاتا اور واستو میں ایسا ہونا چاہیے۔ یہ اِیشور کا اتیاچار ہے کہ ایسے لوبھی، دھن پر گرنے والے، بُردا فروش، اپنی سنتان کا وِکریہ کرنے والے نرادھام جیوت ہیں اور سوکھی ہیں۔ سماج اُن کا ترسکار نہیں کرتا۔ مگر وہ سب بُردا فروش ہیں۔ اتیادی۔

ویکھیان بہت لمبا اور ہاسیہ سے بھرا ہوا تھا۔ لوگوں نے خوب واہ واہ کی۔ اپنا وکتویہ سماپت کرنے کے بعد انھوں نے اپنے ایک چھوٹے لڑکے پرمانند کو، جس کی اوستھا کوئی ۷ برس کی تھی، منچ پر کھڑا کیا۔ اُسے انھوں نے ایک چھوٹا سا ویکھیان لکھ کر دے رکھا تھا۔ دِکھانا چاہتے تھے کہ اس کُل کے چھوٹے بالک بھی کتنے کُشاگربدُھی ہیں۔ سبھا سماجوں میں بالکوں سے ویکھیان دِلانے کی پرتھا ہے ہی، کسی کو کُتوہل نہ ہوا۔ بالک بڑا سندر، ہونہار، ہنس مکھ تھا۔ مسکراتا ہوا منچ پر آیا اور جیب سے ایک کاغذ نکال کر بڑے گروَ کے ساتھ اُچّ سور میں پڑھنے لگا۔

پریہ بندھور،

نمسکار!

آپ کے پُتر سے وِدِت ہوتا ہے کہ آپ کو مجھ پر وشواس نہیں ہے۔ میں ایشور کو ساکشی کرکے نیویدن کرتا ہوں کہ نردِشٹھ دھن آپ کی سوا میں اتنی گپت ریتی سے پہنچے گا کہ کسی کو لیش ماتر بھی سندیہ نہ ہوگا۔ ہاں، کیول ایک جگیاسا کرنے کی دِھرشٹتا کرتا ہوں۔ اس ویاپار کو گپت رکھنے سے آپ کو جو سمّان اور پرتشٹھا لابھ ہوگا اور میرے نِکٹ ورتی میں میری جو نِندا کی جائے گی، اس کے اُپلکشیہ میں میرے ساتھ کیا رعایت ہوگی؟ میرا وِنیت انرودھ ہے کہ ۲۵ میں سے ۵ نکال کر میرے ساتھ نیائے کیا جائے ......

مہاشے جشودانند گھر میں مہمانوں کے لیے بھوجن پروسنے کا آدیش کرنے گئے تھے۔ نکلے تو یہ واکیہ ان کے کان میں پڑا۔ ۲۵ میں سے ۵ نکال کر میرے ساتھ نیائے کیجیے۔ چہرہ فق ہوگیا، جھپٹ کر لڑکے کے پاس گئے، کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بولے۔ نالایق، یہ کیا پڑھ رہا ہے، یہ تو کسی موکل کا خط ہے جو اس نے مقدمے کے بارے میں لکھا تھا۔ یہ تو کہاں سے اُٹھا لایا، شیطان، جا کر وہ کاغذ لا، جو تجھے لکھ کر دیا گیا تھا۔

ایک مہاشے۔ پڑھنے دیجیے، اس تحریر میں جو لطف ہے، وہ کسی دوسری تقریر میں نہ ہوگا۔

دوسرے۔ جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے۔

تیسرے۔ اب جلسہ برخاست کیجیے۔ میں تو چلا۔

چوتھے۔ یہاں بھی چلتو ہوئے۔

یشودانند۔ بیٹھے بیٹھے، پتّل لگائے جا رہے ہیں۔

پہلے۔ بیٹا پرمانند، ذرا یہاں تو آنا، تم نے یہ کاغذ کہاں پایا؟

پرمانند۔ بابو جی ہی نے تو لکھ کر اپنی میز کے اندر رکھ دیا تھا۔ مجھ سے کہا تھا کہ اِسے پڑھنا۔ اب ناحق مجھ سے خفا ہو رہے ہیں۔

یشودانند۔ وہ یہ کاغذ تھا سور! میں نے تو میز کے اوپر ہی رکھ دیا تھا۔ تو نے ڈرارور میں سے کیوں یہ کاغذ نکالا؟

پرمانند۔ مجھے میز پر نہیں ملا۔

یشودانند۔ تو مجھ سے کیوں نہیں کہا، ڈرارور کیوں کھولا؟ دیکھو، آج ایسی خبر لیتا ہوں کہ تم بھی یاد کروگے۔

پہلے۔ یہ آکاش بانی ہے۔

دوسرے۔ اس کو لیڈری کہتے ہیں کہ اپنا اُلّو بھی سیدھا کرو اور نیک نام بھی بنو۔

تیسرے۔ شرم آنی چاہیے۔ یہ تیاگ سے ملتا ہے، دھوکا دھڑی سے نہیں۔

چوتھے۔ مِل تو گیا تھا پر ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔

پانچوے۔ ایشور پاکھنڈیوں کو یوں ہی دنڈ دیتا ہے۔

یہ کہتے ہوئے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جشودانند سمجھ گئے کہ بھنڈا پھوٹ گیا، اب رنگ نہ جمے گا، بار بار پرمانند کو کُپت نیتروں سے دیکھتے تھے اور ڈنڈا تول کر رہ جاتے تھے۔ اس شیطان نے آج جیتی جیتائی بازی کھو دی، منہ میں کالِکھ لگ گئی، سر نیچا ہوگیا۔ گولی مار دینے کا کام کیا ہے۔

اُدھر راستے میں مِتر ورگ یوں ٹِپّیاں کرتے جا رہے تھے۔

ایک۔ ایشور نے منہ میں کیسی کالِما لگائی کہ حیادار ہوگا تو اب صورت نہ دکھائے گا۔

دوسرا۔ ایسے ایسے دھنی مانی، وِدّوان لوگ ایسے پتت ہو سکتے ہیں۔ مجھے تو یہی آشچریہ ہے۔ لینا ہے تو کھلے خزانے لو، کون تمھارا ہاتھ پکڑتا ہے۔ یہ کیا کہ مال بھی چپکے چپکے اُڑاؤ اور جَس بھی کماؤ۔

تیسرا۔ مکّار کا منہ کالا۔

چوتھا۔ یشودانند پر دیا آ رہی ہے۔ بے چارے نے اتنی دُھرتا کی، اُس پر بھی قلعی کھل ہی گئی۔ بس ایک آنچ کی کسر رہ گئی۔

یہ افسانہ پہلی بار ماہنامہ چاند کے اگست 1925 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سرودر 3 میں شامل ہے اردو میں شائع نہیں ہوا۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

توبہ

جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو گیند کھیلتا تھا اور ماسٹروں کی دھمکیاں سہتا تھا، یعنی جب میرا بچپن کا زمانہ تھا، نہ عقل کا ظہور ہوا تھا نہ دانائی کی نشو و نما اس وقت میں ٹمپرنس سوسائٹی کا منچلا ممبر تھا۔ روزانہ اس کے جلسوں میں شریک ہوتا تھا اور اس کے لیے چندہ وصول کرتا۔ اتنا ہی نہیں، میں عہد بھی کرچکا تھا اور اپنے عہد پر مصمم قصد بھی۔ میرے مرید ہوتے وقت جب پریسیڈنٹ صاحب نے پوچھا۔ ''تمھیں یقین ہے کہ تم عمر بھر اپنے عہد پر قائم رہوگے؟'' تو میں نے بے دھڑک جواب دیا کہ ہاں مجھے پورا یقین ہے، پریسیڈنٹ صاحب نے مسکراتے ہوئے عہدنامہ کو میرے سامنے رکھ دیا۔ اس دن مجھے کتنی مسرت ہوئی، فخر سے سر اُٹھائے گھومتا پھرتا تھا، کئی بار باپ سے بھی بے ادبی کر بیٹھا کیونکہ وہ شام کو رفعِ تکان کی غرض سے ایک گلاس پی لیا کرتے تھے۔ میں اسے برداشت نہ کرسکتا تھا، کہوں گا ایمان ہی کی۔ والد صاحب عیب کرتے تھے مگر ہنر کے ساتھ۔ جیوں ہی کچھ سرور ہوجاتا، آنکھوں میں کچھ سرخی جھلکنے لگتی کہ رات کا کھانا کھانے کے لیے بیٹھ جاتے۔ بہت کم کھاتے تھے اور پھر تمام رات کے لیے سارے دینوی علائق سے نجات پاجاتے تھے۔

میں انھیں نصیحت کرتا تھا۔ ان سے بحث کرنے پر آمادہ ہوجاتا تھا۔ ایک بار تو میں نے غضب ہی کر ڈالا۔ ان کی بوتل اور گلاس کو پتھر پر اتنی زور سے پٹک دیا کہ کرشن جی نے کنس کو بھی اتنی زور سے نہ پٹکا ہوگا۔ گھر میں شیشہ کے ٹکڑے بکھر گئے اور کئی روز تک ننگے پیر چلنے والی عورت کے پیروں سے خون بہا کیا۔ مگر میرا جوش تو دیکھیے۔ میں نے باپ کے تیز نگاہی کی پروا نہ کی۔ انھوں نے آکر اپنی روح افزا بوتل کی یہ غمناک خبر سُنی تو سیدھے بازار گئے اور ایک لمحہ میں طاق کی خالی جگہ پھر بھر گئی۔ میں اس پاک جھگڑے کے لیے کمر بستہ تیار تھا مگر والد صاحب کے چہرہ پر ذرا بھی کدورت کے آثار نہ تھے۔ انھوں نے میری جانب حوصلہ بھری نگاہوں سے دیکھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ

نگاہیں، دلی مسرت، پاکیزہ بہی خواہی اور روحانی خوشی سے لبریز تھیں۔ وہ مسکرا دیے۔ اسی طرح مسکرائے جیسے کئی ماہ قبل پریسیڈنٹ صاحب مسکرائے تھے۔ اب ان کے مسکرانے کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔ اس وقت نہ سمجھ سکا تھا۔ بس عقل میں اسی قدر اضافہ ہوا ہے۔ اس مسکراہٹ میں کتنا طنز تھا، میرے طفلانہ عہد کا کتنا مذاق، میری سادہ لوحی پر کتنا رحم! اب اس مسکراہٹ کا مطلب سمجھ رہا ہوں۔

میں کالج میں اپنے عہد پر قائم رہا۔ میرے کتنے ہی دوست اس قدر مستقل مزاج نہ تھے۔ میرا چال چلن نہایت اعلیٰ سمجھا جاتا تھا۔ کالج میں اس تنگ دلی کا گزر کہاں۔ کوئی بدھ بناتا، کوئی ملاّ کا لقب دیتا، کوئی ناصح کہہ کر مضحکہ اُڑاتا، احبا طنزاً کہتے ”ہائے افسوس تونے پی ہی نہیں۔“ خلاصہ یہ کہ یہاں مجھے فراخ دل بننا پڑا۔ دوستوں کو کمرہ میں چسکیاں لیتے دیکھتا اور بیٹھ رہتا۔ بھنگ گھوٹی جاتی اور میں دیکھا کرتا۔ لوگ اصرار سے کہتے ”اجی، ذرا لو بھی“ میں انکسار سے جواب دیتا ”معاف فرمایئے، یہ میری صحت کو سوٹ نہیں کرتی۔“ اصول کے بجائے اب مجھے جسمانی کمزوری کا حیلہ کرنا پڑا۔ وہ ستیاگرہ کا جوش۔ جس نے باپ کی بوتل پر ہاتھ صاف کیا تھا، غائب ہوچکا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار کالج کے چوتھے سال میں میرے یہاں لڑکا پیدا ہونے کی خبر ملی تو میری دریا دلی کی حد ہوگئی میں نے دوستوں کے تقاضے سے مجبور ہوکر ان کی دعوت کی اور اپنے ہاتھوں سے اُنڈیل اُنڈیل کر انھیں شراب پلائی۔ اس روز ساقی بننے میں مجھے دلی مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ فیاضی دراصل اصول سے منحرف ہونے، معیار سے گرجانے کا دوسرا نام ہے۔ اپنے دل کو سمجھانے کے لیے دلائل کی کمی نہیں ہوتی۔ دنیا میں آسان ترین کام خود کو دھوکہ دینا ہے۔ میں نے تو خود نہیں پی، بلکہ پلا دی، اس میں کیا مضائقہ؟ احبا کی دل شکنی تو نہیں کی۔ لطف تو جبھی ہے کہ دوسروں کو پلائے اور خود نہ پیے۔

خیر، کالج سے میں بے داغ نکل آیا۔ اپنے شہر میں وکالت شروع کی۔ صبح سے نصف شب تک چکّی میں جتے رہنا پڑتا۔ وہ کالج کی سیر و تفریح ،ہنسی و خوشی، سب خواب ہوگئی۔ دوستوں کی آمد و رفت بند ہوگئی۔ حتیٰ کہ تعطیل میں بھی دم مارنے کی مہلت نہ ملتی۔ زندگی کی لڑائی (کارزارِ حیات) کتنی زبردست ہے، اس کا احساس ہوا۔ اسے لڑائی کہنا ہی وہم ہے۔ لڑائی کی امنگ، جوش افزا بہادری اور اس کے فتح کے نعرے یہاں کہاں؟ یہ لڑائی

نہیں کشمکش اور جد و جہد ہے۔ یہاں تو چاہیے "دھکے کھائیں تماشا گھس کر دیکھیں" والی حالت ہے۔ معشوق کا وصال کہاں؟ اس کی چوکھٹ چومنا دربان کی گالیاں کھانا اور اپنا سا منہ لے چلے آنا۔ دن بھر بیٹھے بیٹھے بدمزگی پیدا ہوجاتی مشکل سے دو چپاتیاں کھانا اور دل میں کہنا کہ کیا انھیں دو چپاتیوں کے لیے یہ سر مغزن اور دیدہ ریزی ہے؟ مرو، کھپو، اور بے فائدہ! ساتھ ہی یہ ارمان بھی تھا کہ اپنی موٹر ہو، بڑا محل ہو، کچھ زمینداری ہو، کچھ روپے بینک میں ہوں مگر یہ سب ہوا بھی تو مجھے کیا؟ اولاد اس سے مستفیض ہوگی، میں تو مفت ہی مرا! میں مارِ خزانہ ہی رہا! نہیں نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ میں صرف دوسروں ہی کے لیے جان نہ کھپاؤں گا۔ اپنی محنت کا ثمرہ خود بھی چکھوں گا۔ کیا کروں؟ کہیں سیر کرنے چلوں؟ نہیں سب موکل تتر بتر ہوجائیں گے۔ ایسا نامور وکیل تو ہوں نہیں کہ میرے بغیر کام ہی نہ چلے اور کتنے لیڈروں کی طرح عدمِ تعاون کا عہد کرنے پر بھی کوئی بڑا شکار دیکھوں تو جھپٹ پڑوں۔ یہ تو یدی، بٹیر، ہارل انھیں سب پر نشانہ لگانا ہے! پھر کیا روزانہ تھیٹر جایا کروں، فضول ہے۔ کہیں دو بجے رات کو سونا نصیب ہوگا، بے موت مرجاؤں گا۔ آخر میرے ہم پیشہ اور بھی تو ہیں۔ وہ کیا کرتے ہیں جو انھیں برابر خوش و خرم دیکھتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ خود غرضی انگریزی تعلیم کی روح رواں ہے۔ مشرق اولاد کے لیے، ناموری کے لیے، مذہب کے لیے، مرتا ہے۔ اور مغرب اپنے لیے مشرق میں گھر کا آقا سب کا غلام ہوتا ہے۔ وہ سب سے زیادہ کام کرتا ہے۔ دوسروں کو کھلاکر کھانا، دوسروں کو پہنا کر پہننا ہے۔ مغرب میں وہ سب سے اچھا کھانا، سب سے اچھا پہننا، اپنا حق سمجھتا ہے۔ یہاں کنبہ مقدم ترین ہے اور وہاں شخصیت۔ ہم ظاہراً مشرقی اور باطن میں مغربی ہیں۔ ہمارے معیارانہ طور طریقے روز بروز غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچنا شروع کیا۔ اتنے دنوں کی ریاضت سے مجھے کیا حاصل ہوا؟ دن بھر محنت شاقہ کرتا ہوں، آدھی رات کو منہ ڈھانپ کر سو رہتا ہوں۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ کوئی حظ نہیں، دل بہلاؤ کا کوئی سامان نہیں۔ دن بھر کام کرنے کے بعد ٹینس کیا خاک کھیلوں گا؟ ہوا خوری کے لیے بھی تو پیروں میں طاقت چاہیے۔ ایسی زندگی کو بامزہ بنانے کے لیے صرف ایک ہی تدبیر ہے، خود فراموشی، جو ایک لمحہ کے لیے مجھے دنیاوی تفکرات سے چھٹکارا دے، میں اپنے گرد و پیش کے حالات کو بھول جاؤں، اپنے کو بھول

جاؤں۔ ذرا ہنسوں، ذرا قہقہے لگاؤں۔ ذرا دل میں تازگی پیدا ہو۔ صرف ایک ہی بوٹی ہے جس میں یہ خواص ہیں اور اُسے میں جانتا ہوں۔ کہاں کا عہد، کہاں کا ایفاء؟ وہ بچپن کی باتیں تھیں۔ اس وقت کیا معلوم تھا کہ میری یہ حالت ہوگی۔ اس وقت جوش میں زیادتی تھی، پیروں میں طاقت تھی، گھوڑے پر سوار ہونے کی کیا ضرورت تھی؟ تب جوانی کا نشہ تھا، اب وہ بات کہاں؟ یہ خیالات میرے قدیم خود دارانہ طرزِ عمل کی بیخ کنی کرنے لگے۔ روز نئے نئے دلائل سے مسلح ہوکر آتے تھے۔ کیوں، کیا تمھیں سب سے زیادہ عقلمند ہو؟ سب پیتے ہیں۔ ججوں کو دیکھو، اجلاس چھوڑ کر جاتے اور پی آتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں ایسے عہد کا ایفا ہوجاتا تھا۔ حب معاش کا حاصل کرنا ایسا جان لیوا کام نہ تھا۔ لوگ ہنسنا ہی تو شروع کریں گے کہ بڑے عہد کرنے والے کی دم بنے تھے، آخر آگئے نہ چکر میں۔ ہنسنے دو۔ میں ناحق عہد کیا۔ اسی عہد کے سبب اتنے دنوں تپسیا کرنی پڑی، نہیں پی تو کون سا بڑا آدمی ہوگیا، کون سی عزت پاگیا؟ پہلے کتابوں، میں پڑھا کرتا تھا کہ یہ نقصان ہوتا ہے، وہ نقصان ہوتا ہے، مگر کہیں تو نقصان ہوتے نہیں دیکھا۔ ہاں، بدمست، مے نوش ہوجانے کی بات اور ہے۔ ویسے تو اچھی سے اچھی چیز کا بُرا استعمال بھی نقصان رساں ہوتا ہے۔ عقل بھی جب حد سے متجاوز ہوجاتی ہے تو دہریت کے احاطہ میں داخل ہوجاتی ہے۔ پینا چاہیے تنہائی میں، جذبہ کو بیدار کرنے کے لیے۔ سلانے کے لیے نہیں بس پہلے دن ذرا ذرا جھجک ہوگی، پھر کس کا ڈر ہے۔ ایسی بندش کرنی چاہیے۔ کہ لوگ مجھے جبراً پلا دیں کہ اپنی شان قائم رہے۔ جب ایک روز عہد شکست ہوگیا تو پھر مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہ رہے گی۔ گھر والوں کے آگے بھی آنکھیں نیچی نہ کرنی پڑیں گی۔

(۲)

میں نے تہیہ کر لیا کہ یہ تماشا ہولی کے روز ہو۔ اس قسم کی مُریدی کے لیے اس سے زیادہ مستحسن دن کون ہوگا۔ ہولی پینے پلانے کا دن ہے اس روز پیکرِ مست ہوجانا، قابلِ عفو ہے۔ پاک ہولی اگر ہوسکتی ہے تو پاک چوری، پاک رشوت ستانی بھی ہوسکتی ہے۔

ہولی آئی۔ اب کے انتظارِ بسیار کے بعد آئی۔ کئی مے نوش کو مدعو کیا۔ کلنر کی دُکان سے وھسکی اور شامپین منگوائی۔ لیمینڈ، سوڈا، برف گزک، خمیرہ تمباکو وغیرہ سب سامان منگوا کر مہیا کردیا۔ کمرہ بہت وسیع نہ تھا۔ قانونی کتب کی الماریاں ہٹوا دیں۔ فرش بچھوا دیا۔

اور شام کو دوستوں کی راہ دیکھنے لگا، جیسے چڑیا پر پھیلائے ہوئے سہیلیوں کو بلا رہی ہو۔

احباب ایک ایک کرکے آنے لگے۔ نو بجتے بجتے سب کے سب موجود ہوئے۔ ان میں کئی تو ایسے تھے جو چلّو میں الّو ہوجاتے تھے۔ مگر کتنے ہی مئے نوش بھی تھے، بوتل کی بوتل غٹ کرجائیں اور آنکھوں میں سرخی بھی نمودار نہ ہو۔ میں نے بوتل، گلاس اور گزک کی طشتریاں سامنے لاکر رکھ دیں۔

ایک صاحب بولے۔ یار، برف اور سوڈے کے بغیر لطف نہ آوے گا۔

میں نے جواب دیا۔ منگوا رکھے ہیں، بھول گیا تھا۔

ایک۔ تو پھر بسم اللہ ہو۔

دوسرا۔ ساقی کون ہوگا؟

میں۔ یہ خدمت میرے سپرد کیجیے۔

میں پیالیاں بھربھرکر دینی شروع کیں اور یار لوگ پینے لگے۔ ہو حق کا بازار گرم ہوگیا۔ فحش اور گندہ مذاق کی آندھی چلنے لگی، مگر مجھے کوئی نہ پوچھتا تھا خوب! اچھا احمق بنا۔ شاید مجھے کہنے میں تامل کرتے ہیں۔ کوئی ہنسی میں بھی نہیں کہتا، گویا میں وِشنوں ہوں۔ انھیں کیسے اشارہ کروں۔ آخر سوچ کر بولا۔ ”میں نے تو کبھی پی ہی نہیں۔“

ایک دوست۔ ”کیوں نہیں پی؟ ایشور کے یہاں آپ کو اس کا جواب دینا ہوگا؟“

دوسرا۔ فرمائیے، جناب فرمائیے، کیا جواب دیجیے گا؟ میں ہی اس کی جانب سے پوچھتا ہوں، کیوں نہیں پیتے؟

میں۔ اپنی طبیعت، نہیں جی چاہتا۔

دوسرا۔ یہ تو کوئی جواب نہیں ہے۔ کودوں دے کر وکالت پاس کی تھی کیا؟

تیسرا۔ جواب دیجیے، جواب دیجیے، دیجیے آپ نے سمجھا کیا ہے؟ ایشور کو آپ نے ایسا ویسا سمجھ لیا ہے کیا؟

دوسرا۔ کیا آپ کو کوئی مذہبی اعتراض ہے؟

میں نے کہا۔ ہوسکتا ہے۔

تیسرا۔ واہ رے مذہب دار! کیوں نہ ہو آپ بڑے مذہب پرست ہیں۔ ذرا آپ کی دم دیکھوں۔

میں۔ کیا مذہب پرستوں کی دم ہوتی ہے؟

چوتھا۔ اور کیا، کسی کے ایک ہاتھ کی، کسی کے دو ہاتھ کی آپ کس چکر میں؟ دم داروں کے سوا آج مذہب دار ہے کون؟ ہم سب گناہ گار ہیں۔

تیسرا۔ مذہب دار وکیل، اوہو! مذہب دار رنڈی، اوہو؟

میں۔ بھائی، مجھے سوٹ نہیں کرتی۔

تیسرا۔ اب مار لیا موذی کو مار لیا، آپ کو سوٹ نہیں کرتی؟ میں سوٹ کرا دوں؟

دوسرا۔ کیا کسی ڈاکٹر نے منع کیا ہے؟

میں۔ نہیں۔

تیسرا۔ واہ واہ! آپ خود ہی ڈاکٹر بن گئے امرت آپ کو سوٹ نہیں کرتا، ارے دھرماتما جی، ایک بار پی کر دیکھیے۔

دوسرا۔ مجھے آپ کی زبان سے یہ سن کر تعجب ہوا۔ بھائی جان، یہ دوا ہے، بڑھیا دوا ہے، یہی سوم رس ہے! کہیں آپ نے ٹمپرنس کی حلف تو نہیں لے لی ہے؟

میں۔ فرض کیجیے کہ لے لی ہو تو؟

تیسرا۔ تو آپ بدھو ہیں، سیدھے سادھے کورے بدھو!

چوتھا۔ جام چلنے کو ہے سب اہلِ نظر بیٹھے ہیں
آنکھ ساقی نہ چُراتا ہم اِدھر بیٹھے ہیں

دوسرا۔ ہم بھی ٹمپرنس کی حلف لیے ہوئے ہیں، مگر جب وہ ہم ہی نہیں رہے تو وہ حلف کہاں رہی، ہمارے نام وہی ہیں، پر ہم وہ نہیں ہیں۔ جہاں بچپن کی اور باتیں گئیں وہاں وہ حلف بھی گئی۔

میں۔ آخر اس سے فائدہ کیا ہے؟

دوسرا۔ یہ تو پینے ہی سے معلوم ہوسکتا ہے۔ ایک پیالی پیجیے، فائدہ نہ معلوم ہو تو پھر نہ پیجیے گا۔

تیسرا۔ مارا، مارا موذی کو، اب پلا کر چھوڑیں گے۔

چوتھا۔ ایسے مے خوار ہیں دن رات پیا کرتے ہیں
ہم تو سوتے میں ترا نام لیا کرتے ہیں

پہلا۔ تم لوگوں سے۔ بنے گا، میں پلانا جانتا ہوں۔ یہ صاحب موٹے تازے آدمی تھے، میرا گلا دبایا اور پیالی منہ سے لگا دی۔ میرا عہد شکست ہوگیا، مُرید بن گیا، مراد پوری ہوگئی۔ مگر مصنوعی غصہ سے بولا۔ آپ لوگ اپنے ساتھ مجھے بھی لے ڈوبے!

دوسرا۔ مبارک ہو، مبارک؟

تیسرا۔ مبارک، مبارک، صد بار مبارک!

(۳)

نومذہب شخص نہایت دیندار ہوتا ہے۔ میں شام کے وقت دن بھر کے جھنجھٹوں سے چھٹکارا پاکر جب تنہا یا دو چار احباب کے ساتھ پیالے پر پیالے چڑھاتا تو دل محظوظ ہوجاتا تھا۔ رات میں نیند خوب آتی تھی مگر صبح عضو عضو میں درد ہوتا، انگڑائیاں آتیں۔ دماغ سُست ہوجاتا، یہی جی چاہتا کہ آرام سے پلنگ پر پڑا رہوں، دوستوں نے صلاح دی کہ خمار رفع کرنے کے لیے صبح بھی ایک پگ پی لیا جاوے تو بہت مناسب ہے۔ یہ بات میرے دل نشیں ہوگئی۔ پہلے منہ ہاتھ دھوکر سندھیا کیا کرتا تھا۔ اب منہ ہاتھ دھوکر فوراً اپنے کمرہ کی تنہائی میں بوتل لے کر بیٹھ جاتا۔ میں اتنا جانتا تھا کہ نشہ والی اشیاء کا چسکا بُرا ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ آدمی ان کا غلام ہوجاتا ہے حتیٰ کہ وہ ان کے بغیر کچھ کام ہی نہیں کرسکتا۔ مگر یہ باتیں جانتے ہوئے بھی میں ان کا مطیع ہوجاتا تھا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ بلا نشہ کے میں کوئی کام ہی نہیں کرسکتا تھا۔ جسے دل بہلاؤ کے لیے منہ لگایا تھا، وہ سال ہی بھر میں میرے لیے پانی اور ہوا کی طرح نہایت ضروری ہوگئی۔ اگر کبھی کسی مقدمے میں بحث کرتے کرتے دیر ہوجاتی تو ایسا تکان محسوس ہوتا تھا کہ گویا منزلیں طے کی ہیں۔ اس حالت میں مکان آتا تو خواہ مخواہ بات بات پر جھنجلاتا۔ کہیں نوکر کو ڈانٹتا، کہیں بچّوں کو پیٹتا اور کبھی بیوی پر غصہ کرتا، یہ سب کچھ تھا، مگر میں اور شرابیوں کی طرح نشہ ہوتے ہی دون کی نہ لیتا تھا، بے ہودہ باتیں نہ بکتا تھا، شور نہ مچاتا تھا، نہ میری صحت ہی پر مے نوشی کا کوئی بُرا اثر نظر آتا تھا۔

برسات کے دن تھے، ندی نالے بڑھے ہوئے تھے، حکّام بھی برسات میں دَورے کرتے ہیں۔ انھیں اپنے بھتے سے مطلب، رعایا کو کتنی تکلیف ہوتی ہے، اس سے انھیں کچھ سروکار نہیں، میں ایک مقدمے کے دَورے پر گیا، قیاس تھا کہ شام تک واپس آجاؤں گا۔

مگر ندیوں کے چڑھاؤ اُتار کے سبب دس بجے دن کو پہنچنے کے بجائے شام کو پہنچا۔ جنٹ صاحب میرا انتظار کر رہے تھے۔ مقدمے پیش ہوا۔ لیکن بحث ختم ہوتے ہوتے رات کے نو بج گئے۔ میں اپنی حالت کیا بیان کروں۔ جی چاہتا تھا کہ جنٹ صاحب کو نوچ کھاؤں کبھی اپنے مقابل وکیل کی داڑھی نوچنے کو جی چاہتا تھا جس نے خواہ مخواہ بحث کو اتنا طول دیا۔ کبھی جی چاہتا تھا کہ اپنا ہی منہ نوچ لوں۔ مجھے سوچ لینا چاہیے تھا کہ آج رات کو دیر ہوگئی تو جنٹ میرا غلام تو ہے نہیں کہ جو میری مرضی ہو وہی کرے۔ نہ کھڑے رہا جاتا تھا، نہ بیٹھے۔ معمولی مے نوش میری پریشان حالی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔

خیر، نو بجتے بجتے مقدمہ ختم ہوا مگر اب جاؤں کہاں؟ برسات کی رات کوسوں تک آبادی کا پتا نہیں۔ گھر لوٹنا دشوار ہی نہیں بلکہ غیر ممکن۔ قرب و جوار میں بھی کوئی ایسا گاؤں نہیں۔ جہاں وہ آبِ حیات مل سکے۔ گاؤں ہو بھی تو وہاں جائے کون؟ وکیل کوئی تھانے دار نہیں کہ کسی کو بیگار میں بھیج دے۔ بڑی پریشانی میں مبتلا تھا۔ موکل چلے گئے۔ تماشائی چلے گئے، بیگاری چلے گئے۔ میرا مخالف وکیل مسلمان چپراسی کے دسترخوان میں شریک ہوکر ڈاک بنگلے کے برآمدے میں لیٹ رہا۔ مگر میں کیا کروں؟ یہاں تو جان سی نکل رہی تھی۔ وہیں برآمدہ میں ٹاٹ پر بیٹھا ہوا اپنی قسمت کو رو رہا تھا۔ نہ نیند ہی آتی کہ اس تکلف سے نجات پاؤں، اپنے کو اسی کی گود میں سونپ دوں۔ البتہ غصہ ضرور تھا کہ وہ دوسرا وکیل کتنی میٹھی نیند سور رہا ہے، گویا سسرال میں پُر تکلف بستر پر آرام کر رہا ہو۔

اِدھر تو میرا یہ بُرا حال تھا، اُدھر ڈاک بنگلے میں صاحب بہادر جام پر جام لنڈھا رہے تھے۔ شراب کے ڈھالنے کی خوش کن آواز میرے کانوں میں آکر دِل کو اور بھی بے چین کیے دیتی تھی۔ مجھ سے بیٹھے نہ رہا گیا۔ رفتہ رفتہ چک کے پاس گیا، اور اندر جھانکنے لگا۔ آہ! کیسا روح افزا منظر تھا! سفید بلور کے گلاس میں، برف اور سوڈے سے مزین۔ گل رو حسینہ رونق افروز تھی، منہ میں پانی بھر آیا، اس وقت کوئی میری تصویر لیتا تو طمع کا مجمع نقش کرنے میں بازی لے جاتا۔ صاحب کی آنکھوں میں سرخی تھی، منہ پر سرخی تھی، تنہائی میں پیتا اور دماغی سرور کی ترنگ میں ایک انگریزی گیت گاتا جاتا تھا، کہاں وہ بہشت کی راحت اور کہاں یہ میری دوزخی تکلیف۔ کئی بار زبردست خواہش ہوئی کہ صاحب سے چل کر ایک گلاس مانگوں مگر خوف ہوتا تھا کہ کہیں شراب کے بجائے ٹھوکر ملنے لگے

تو یہاں کوئی فریاد کا سننے والا نہیں ہے۔

میں وہاں اس وقت تک کھڑا رہا جب تک صاحب کھا پی کر فراغت نہ پا چکے۔ حسبِ خواہش کھا لینے اور شراب پی چکنے کے بعد اس نے خانساماں کو میز صاف کرنے کے لیے بلایا۔ خانساماں وہیں میز کے نیچے بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ اُٹھا اور پلیٹ لے کر باہر نکلا تو مجھے دیکھ کر چونک پڑا۔ میں نے جلد ہی اسے تسکین دی، ڈرو نہیں ڈرو نہیں میں ہوں۔

خانساماں نے حیرت سے کہا، آپ ہیں وکیل صاحب، کیا حضور یہاں کھڑے تھے؟

میں۔ ہاں، ذرا دیکھتا تھا کہ یہ سب کیسے کھاتے پیتے ہیں۔ بہت شراب پیتا ہے۔

خانساماں۔ اجی، کچھ نہ پوچھیے، دو بوتل دن رات میں صاف کر ڈالتا ہے، بیس روپے روز کی شراب پی جاتا ہے، دورہ پر چلتا ہے تو چار درجن بوتلوں سے کم ساتھ نہیں رکھتا۔

میں۔ مجھے بھی کچھ عادت ہے مگر آج نہ ملی۔

خانساماں۔ تب تو آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہوگی؟

میں۔ کیا کروں، یہاں تو کوئی دُکان بھی نہیں ہے۔ سمجھتا تھا، جلدی سے مقدمہ ہوجائے گا تو پھر گھر واپس جاؤں گا۔ اسی لیے کوئی سامان ساتھ نہ لایا۔

خانساماں۔ مجھے تو افیون کی عادت ہے۔ ایک روز نہ ملے تو دیوانہ ہوجاتا ہوں۔ نشہ والے کو چاہیے کچھ نہ ملے نشہ مل جائے تو اُسے کوئی فکر نہیں، کھانا چاہے تین دن میں ملے۔

میں۔ وہی حال ہے بھائی، بھگت رہا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم میں جان ہی نہیں ہے۔

خانساماں۔ حضور کو کم سے کم ایک بوتل ساتھ رکھ لینی چاہیے تھی جیب میں ڈال لیتے۔

میں۔ اتنی ہی تو بھول ہوئی ، بھائی! ورنہ رونا کاہے کا تھا۔

خانساماں۔ نیند بھی نہیں آتی ہوگی؟

میں۔ کیسی نیند؟ دم لبوں پر ہے۔ نہ جانے رات کیسے گزرے گی۔

میں چاہتا تھا کہ خانساماں اپنی ہی طرف سے میری آگ کو ٹھنڈا کرنے کی تجویز پیش کرے کہ مجھے خفت نہ اُٹھانی پڑے۔ مگر خانساماں بھی چالاک تھا۔ بولا۔ اللہ کا نام لے کر سو جایئے نیند کب تک نہ آوے گی۔

میں۔ نیند نہ آوے گی۔ ہاں مر بھلے ہی جاؤں گا۔ کیا صاحب بوتلیں گن کر رکھتے ہیں؟ گنتے تو کیا ہوں گے۔

خانساماں۔ ارے حضور، ایک ہی موذی ہے۔ بوتل پوری نہیں ہوتی تو اس پر نشان لگا دیتا ہے۔ کیا مجال کہ ایک بوند بھی کم ہوجائے۔

میں۔ بڑی مصیبت ہے۔ مجھے تو ایک گلاس چاہیے بس اتنی ہی چاہتا ہوں کہ نیند آجاوے۔ جو انعام کہو وہ دوں۔

خانساماں۔ انعام تو حضور دیں گے ہی لیکن خوف یہی ہے کہ کہیں بھانپ گیا تو پھر مجھے زندہ نہ چھوڑے گا۔

میں۔ یار لاؤ۔ اب زیادہ صبر کی تاب نہیں۔

خانساماں۔ آپ کے لیے جان حاضر ہے مگر ایک بوتل دس روپیہ میں آتی ہے۔ میں کل کسی بیگار سے منگا کر تعداد پوری کردوں گا۔

میں۔ میں ایک بوتل تھوڑا ہی پی جاؤں گا۔

خانساماں۔ ساتھ لیتے جایئے گا حضور، آدھی بوتل خالی میرے پاس رہے گی تو اسے فوراً شبہ ہوجائے گا بڑا شکی آدمی ہے۔ میرا منہ سونگھا کرتا ہے کہ اس نے پی نہ لی ہو۔

مجھے بیس روپیہ محنتانہ ملا تھا۔ دن بھر کی کمائی کا نصف دیتے ہوئے قلق تو ہوا مگر دوسری تدبیر ہی کیا تھی۔ چپکے سے دس روپے نکال کر خانساماں کے حوالے کیے۔ اس نے ایک بوتل انگریزی شراب مجھے لاکر دے دی، برف اور سوڈا بھی لیتا آیا۔ میں وہیں اندھیرے میں بوتل کھول کر اپنے جلتے ہوئے دل کو آبِ حیات سے ٹھنڈا کرنے لگا۔

کیا معلوم تھا کہ کارکنانِ قضا و قدر میرے لیے کوئی دوسری ہی سازش کر رہے ہیں، مجھے زہر پلانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

(۴)

نشہ کی نیند کا پوچھنا ہی کیا، اس پر وھسکی کی نصف بوتل چڑھا گیا تھا۔ دِن چڑھے تک سوتا رہا۔ تقریباً آٹھ بجے جھاڑو لگانے والے مہتر نے جگایا تو نیند ٹوٹی۔ شراب کی بوتل اور گلاس سرہانے رکھ کر چھاتا سے چُھپا دیا تھا، اوپر سے اپنا گون ڈال دیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی سرہانے نگاہ گئی تو بوتل اور گلاس کا پتا نہ تھا۔ کلیجہ دھک سے ہوگیا۔ خانساماں کو تلاش

کرنے لگا کہ دریافت کروں، اس نے تو نہیں اُٹھا کر رکھ دیا، اس خیال سے اُٹھا اور ٹہلتا ہوا ڈاک بنگلہ کے پیچھے کی جانب گیا، جہاں نوکروں کے لیے علاحدہ کمرے بنے ہوئے تھے، مگر وہاں کا خوفناک منظر دیکھ کر آگے قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔

صاحب خانساماں کا کان پکڑے ہوئے کھڑے تھے شراب کی بوتلیں الگ الگ رکھی ہوئی تھیں۔ صاحب ایک دو تین کہہ کر گنتے تھے اور خانساماں سے پوچھتے تھے کہ ایک بوتل اور کہاں گیا۔ خانساماں کہتا تھا۔ حضور خدا میرا منہ کالا کرے جو میں نے کچھ گڑبڑ کی ہو۔

صاحب۔ کیا ہم جھوٹ بولتا ہے؟ انتیس بوتل نہیں تھا؟

خانساماں۔ حضور، خدا کی قسم، مجھے نہیں معلوم کہ کتنی بوتلیں تھیں۔

اس پر صاحب نے خانساماں کے کئی طمانچے لگائے۔ پھر کہا، تم گنے، تم نہ بتاوے گا تو ہم تم کو جان سے مار ڈالے گا، ہمارا کچھ نہیں ہوسکتا ہم حاکم ہے اور حاکم لوگ ہمارا دوست ہے۔ ہم تم کو ابھی ابھی مار ڈالے گا نہیں تو بتلا دے کہ ایک بوتل کہاں گیا۔

میری روح فنا ہوگئی۔ بہت دنوں کے بعد ایشور کی یاد آئی۔ دل ہی دل میں کہنے لگا۔ اب لاج تمھارے ہاتھ ہے بھگوان! تمھیں بچاؤ تو کشتی پار ہوسکتی ہے، ورنہ منجدھار میں ڈوبی جاتی ہے۔ انگریز ہے۔ نہ جانے کیا مصیبت ڈھا دے۔ بھگوان خانساماں کا مند بند کردو، اس کی گویائی کی قوت کو سلب کردو، تم نے بڑے بڑے دُشٹوں اور بدکاروں کی رکچھا کی ہے۔ میں بھی ویسا ہی ہوں بلکہ اس سے بھی زیادہ، میرا دکھ دور کرو۔ اب کی جان بچے تو شراب کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھاؤں گا۔

مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے۔ مجھے ہر وقت یہی اندیشہ ہوتا تھا کہ کہیں یہی مصل صادق نہ آجائے، کہیں خانساماں راز فاش نہ کردے۔ پھر میری خیر نہیں۔ مند ضبط ہوجانے کا، چوری کا مقدمہ چل جانے کا یا جج کے ہاتھوں ہتک ہونے کا اتنا خوف نہ تھا جتنا صاحب کے پیروں کی ٹھوکروں کا نشانہ بننے کا۔ ظالم ہنٹر لے کر دوڑ نہ پڑے۔ یوں میں اس قدر کمزور نہیں ہوں۔ موٹا تازہ اور ہمتی آدمی ہوں۔ کالج میں کھیل کود کے لیے انعام پاچکا ہوں۔ اب بھی برسات میں دو مہینے مگدر پھیر لیتا ہوں۔ لیکن اس وقت ڈر کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ میری اخلاقی قوت پہلے ہی زائل ہوچکی تھی، چور میں قوت کہاں؟ میری عزت، میرا مستقبل، میری زندگی، خانساماں کے صرف ایک لفظ پر دارو مدار تھا۔

ہاں صرف ایک لفظ پر، کس کا رشتۂ حیات اس قدر باریک کمزور اور فرسودہ ہوگا؟

میں دل ہی دل میں عہد کر رہا تھا، مے خواروں کی توبہ والا عہد نہیں بلکہ عہدِ مستحکم کہ اس مصیبت سے نجات ملے تو پھر شراب نہ پیوں گا۔ میں نے اپنے دل کو چاروں طرف سے باندھ رکھنے کے لیے، اس کے دلائل کا دروازہ بند کر دینے کے لیے ایک بھاری قسم کھائی۔

مگر ہائے رے بد قسمتی کسی نے مدد نہ دی۔ نہ بھگوان نے اور نہ اس کے کسی اوتار کرشن یا نرسِنگا جی نے۔ یہ تو سب ست جگ (عہد زریں) میں تشریف فرما ہوا کرتے تھے۔ نہ عہد سے کچھ کام چلا اور نہ قسم کا کوئی اثر ہوا۔ میری قسمت میں جو بدا تھا وہ ہوکر رہا! ایشور نے میرے عہد کو استوار بنانے کے لیے میری قسم کو کافی نہ سمجھا۔

خانساماں بے چارہ اپنی بات کا دھنی تھا۔ طمانچے کھائے۔ ٹھوکریں سہی، ڈاڑھی نوچائی، مگر ذرا بھی نہ کھلا۔ بڑا سچا اور جواں مرد آدمی تھا۔ میں شاید ایسی حالت میں اتنا اٹل نہ رہ سکتا۔ شاید پہلے ہی تھپڑ میں سب کچھ اُگل دیتا۔ اس کی طرف سے جو مجھے سخت اندیشہ ہو رہا تھا وہ بے بنیاد ثابت ہوا۔ جب تک زندہ رہوں گا، اس جوانمرد کا ثنا خواں رہوں گا۔

مگر مجھ پر دوسری ہی طرف سے مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا۔

(۵)

خانساماں پر جب مار پیٹ کا کوئی اثر نہ ہوا تو صاحب اس کا کان پکڑے ہوئے ڈاک بنگلے کی طرف چلے۔ میں ان کو آتے دیکھ کر فوراً سامنے کے برآمدہ میں آ بیٹھا، اور ایسا منہ بنا لیا گویا کچھ جانتا ہی نہیں صاحب نے خانساماں کو لاکر میرے سامنے کھڑا کردیا، میں بھی اُٹھ کھڑا ہوگیا۔ اس وقت اگر کوئی میرے دل کو چیرتا تو خون کا ایک قطرہ بھی نہ نکلتا۔

صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ”بول وکیل صاحب، تم شراب پیتا ہے؟“

میں انکار نہ کرسکا۔

”تم نے رات کو شراب پی تھی؟“

میں انکار نہ کرسکا۔

”تم نے میرے اس خانساماں سے شراب لی تھی؟“

میں انکار نہ کرسکا۔

"تم نے رات میں شراب پی کر بوتل اور گلاس کو اپنے سر کے نیچے چھپا رکھا تھا؟"
میں انکار نہ کرسکا۔ مجھے خوف تھا کہ خانساماں کہیں کھل نہ پڑے۔ پر اُلٹا میں ہی کھل پڑا۔

"تم جانتا ہے، یہ چوری ہے؟"

میں انکار نہ کرسکا۔

"ہم تم کو معطل کرسکتا ہے۔ تمھارا سند چھین سکتا ہے۔ تم کو جیل بھیج سکتا ہے۔"

ٹھیک ہی تھا۔

"ہم تم کو ٹھوکروں سے مار مار کر گرا سکتا ہے، ہمارا کچھ نہیں ہوسکتا۔"

ٹھیک ہی تھا۔

"تم کالا آدمی، وکیل بنتا ہے، ہمارے خانساماں سے چوری کا شراب لیتا ہے، تم سور! لیکن ہم تم کو وہی سزا دے گا، جو تم پسند کرے۔ تم کیا چاہتا ہے؟"

میں نے کانپتے ہوئے کہا۔ حضور، معافی چاہتا ہوں۔

"نہیں ہم سزا پوچھتا ہے۔"

"جو حضور مناسب سمجھیں۔"

"اچھا یہی ہوگا۔"

یہ کہہ کر اس بے درد نابکار نے دو سپاہیوں کو بلایا اور ان سے میرے دونوں ہاتھ پکڑوا دیے۔ میں خاموش اس طرح سر جھکائے کھڑا رہا جیسے کوئی لڑکا مدرس کے سامنے بید کھانے کو کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے مجھے کیا سزا دینے کی تجویز کی ہے؟ کہیں میری مشکیں تو نہ بندھوائے گا؟ یا کان پکڑ کر اُٹھائے بیٹھائے گا تو نہیں؟ دیوتاؤں سے مدد ملنے کی کوئی امید تو نہ تھی مگر ان کی مدد مانگنے کے علاوہ اور چارہ کار ہی کیا تھا؟

مجھے سپاہیوں کے ہاتھوں میں چھوڑ کر صاحب دفتر میں گئے اور وہاں سے مہر چھاپنے کی سیاہی اور برش لیے ہوئے نکلے۔ اب میرے آنکھوں سے آنسو گرنے لگے، یہ سخت توہین، اور تھوڑی سی شراب کے لیے! وہ بھی دوگنی قیمت ادا کرنے پر۔

صاحب برش سے میرے چہرہ پر سیاہی لگا رہے تھے، وہ سیاہی جسے دھونے کے لیے سیروں صابون کی ضرورت تھی، اور میں بھیگی بلّی کی طرح کھڑا تھا۔ ان دونوں شیطانوں کو

بھی مجھ پر رحم نہ آتا تھا۔ دونوں ہندوستانی تھے مگر انھیں کے ہاتھوں میری یہ درگت ہو رہی تھی۔ اِس ملک کو سوراج مل چکا!

صاحب سیاہی پھیرتے اور ہنستے جاتے تھے، یہاں تک کہ آنکھوں کے سوا تِل بھر بھی جگہ باقی نہ رہی۔ تھوڑی سی شراب کے لیے آدمی سے بن مانس بنایا جارہا تھا۔ دل میں سوچ رہا تھا، یہاں سے جاتے ہی بچہ پر اواز حیثیت عرفی کی نالش کروں گا، یا کسی بدمعاش سے کہہ دوں گا کہ سر اجلاس ہی بچّہ کو جوتوں سے خبر لے۔

مجھے بن مانس بناکر صاحب نے میرے ہاتھ چھڑا دیے اور تالیاں بجاتا ہوا میرے پیچھے دوڑا۔ نو بجے کا وقت تھا۔ اہلکار موکل، چپراسی سبھی آگئے تھے۔ سینکڑوں آدمی جمع تھے۔ مجھے نہ جانے کیا شامت سوجھی کہ وہاں سے بھاگا۔ یہ اس مضحکہ کا سب سے زیادہ دردناک منظر تھا آگے آگے میں دوڑا جاتا تھا، پیچھے پیچھے صاحب، اور دیگر متعدد اشخاص تالیاں بجاتے "لینا لینا جانے نہ پاوے" کا شور مچاتے ہوئے دوڑے آتے تھے۔ گویا کسی بندر کو بھگا رہے ہوں۔

تقریباً ایک میل تک یہ دوڑ رہی۔ وہ تو کہو کہ میں کسرتی آدمی ہوں بچ کر نکل آیا، ورنہ میری نہ جانے اور کیا دُرگت ہوتی، شاید مجھے گدھے پر سوار کرکے گشت کرانا چاہتے تھے۔ جب سب پیچھے رہ گئے تو میں ایک نالے کے کنارے پر بے دم ہوکر بیٹھ گیا اب مجھے سوجھی کہ یہاں کوئی آیا تو پتھروں سے خبر لیے بغیر نہ چھوڑوں گا، خواہ اُلٹی پڑے یا سیدھی۔ مگر میں نے نالے میں منہ دھونے کی کوشش نہیں کی۔ جانتا تھا کہ پانی سے یہ سیاہی نہ چھوٹے گی، یہی سوچتا رہا کہ اس انگریز پر کیسے مقدمہ چلاؤں۔ یہ تو چھپانا ہی پڑے گا کہ میں نے اس کے خانساماں سے چوری کی شراب لی اگر یہ بات ثابت ہوگئی تو اُلٹا میں ہی ماخوذ ہوجاؤں گا۔ کیا ہرج ہے، اتنا چھپا دوں گا۔ دشمنی کا سبب کچھ اور ہی ظاہر کروں گا مگر مقدمہ ضرور دائر کرنا چاہیے۔

جاؤں کہاں؟ یہ سیاہی لگا ہوا منہ کسے دکھاؤں، ہائے بدمعاش کو سیاہی لگانی ہی تھی تو کیا توے میں سیاہی نہ تھی؟ لیمپ میں کاجل نہ تھا؟ کم از کم دھل تو جاتا۔ جتنی ہتک ہوئی ہے وہیں تک رہتی۔ اب تو میں گویا اپنی بد اعمالی کا خود ہی ڈھنڈھورا پیٹ رہا ہوں۔ دوسرا ہوتا تو اتنی درگت پر ڈوب مرتا۔

غنیمت یہی تھا کہ ابھی تک راستے میں کسی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ اس کے اس سیاہی کے متعلق سوالوں کا کیا جواب دیتا۔ جب ذرا تھکاوٹ کم ہوئی تو میں نے سوچا، یہاں کب تک بیٹھا رہوں گا؟ لاؤ، ایک بار کوشش کرکے دیکھو تو، شاید سیاہی چھوٹ جاوے۔ میں نے ریت سے منہ رگڑنا شروع کیا تو دیکھا کہ سیاہی چھوٹ رہی تھی اس وقت مجھے جتنی خوشی ہوئی اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے؟ پھر تو میرا حوصلہ بڑھا۔ میں نے منہ کو اتنا رگڑا کہ کئی جگہ کی جلد تک اُدھڑ گئی مگر وہ سیاہی چھڑانے کے لیے مجھے اس وقت شدید سے شدید درد بھی خفیف ہی معلوم ہوتا تھا۔ اگرچہ میں برہنہ سر تھا، کُرتا اور دھوتی پہنے ہوئے تھا مگر یہ کوئی ہتک آمیز بات نہ تھی، گاؤن، اچکن، صافہ ڈاک بنگلے ہی میں رہ گئے، اس کی مجھے پروا نہ تھی۔ کالکھ تو چھوٹ گئی۔

لیکن کالِکھ تو چھوٹ جاتی ہے مگر اس کا داغ دل سے کبھی نہیں مٹتا۔ اس واقعہ کو آج بہت دن ہوگئے ہیں۔ پورے پانچ سال ہوئے کہ میں نے شراب کا نام بھی نہیں لیا۔ پینے کو کون کہے۔ شاید مجھے راہِ راست پر لانے کے لیے وہ خدائی حکمت تھی۔ کوئی حجت، کوئی دلیل، کوئی چنگی، مجھ پر اتنا مستقل اثر نہ ڈال سکتی تھی۔ نتیجہ کو دیکھتے ہوئے تو میں یہی کہوں گا کہ جو کچھ ہوا بہت خوب ہوا۔ وہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ مگر اس وقت دل پر جو گزری تھی اسے یاد کرکے آج بھی نیند اُچٹ جاتی ہے۔

اب مصیبت کی داستان کو طول کیوں دوں؟ ناظرین خود ہی اندازہ کرسکتے ہیں، خبر تو پھیل ہی گئی تھی مگر میں نے نادم و شرمندہ ہونے کے بجائے بے حیائی سے کام لینا زیادہ مناسب خیال کیا۔ اپنی بے وقوفی پر خوب ہنستا تھا اور اپنی ذلت کی داستان کہہ سناتا تھا۔ البتہ چالاکی یہ کی کہ کچھ تھوڑا سا اپنی طرف سے جوڑ دیا، یعنی رات کو جب مجھے نشہ چڑھا تو میں بوتل گلاس لیے صاحب کے کمرہ میں گھس گیا تھا اور اسے کرسی سے ٹیک کر خوب مارا تھا۔ اس اضافہ سے میری معتوب، اہانت زدہ اور دُکھ بھری آتما کو تھوڑی سی تسکین ہوجاتی تھی۔ دل پر تو جو کچھ بیتی وہ دل جانتا ہے۔

سب سے بڑا خوف مجھے یہ تھا کہ یہ بات میری اہلیہ کے کانوں تک نہ پہنچے ورنہ اس کو سخت رنج ہوگا۔ معلوم نہیں کہ اس نے سنا یا نہیں مگر مجھ سے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

یہ افسانہ مادھوری کے ستمبر 1924 کے شمارہ میں 'دیکھشا' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اردو میں 'فردوس خیال' اور ہندی میں مان سروور 3 میں شامل ہے۔

اُدّھار

ہندو سماج کی ویواہک پرتھا (رسمِ شادی) اتنی دُوشِت (پلید) اتنی چنتاجنک (فکر انگیز) اتنی بھینکر ہوگئی ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا، اس کا سدھار کیوں کر ہو۔ برلے (مشکل سے) ہی ایسے ماتا پیتا ہوں گے جن کے سات پُتروں کے بعد بھی ایک کنیا اُتپن ہوجائے تو وہ سَہرش (دل سے) اس کا سواگت (خیر مقدم) کریں۔ کنیا کا جنم (پیدائش) ہوتے ہی اس کے وواہ (شادی) کی چنتا سر پر سوار ہوجاتی ہے اور آدمی اسی میں ڈبکیاں کھانے لگتا ہے۔ اَوستھا (حالت) اتنی نِراشامئے اور بھیانک ہوگئی ہے کہ ایسے ماتا پتاؤں کی کمی نہیں ہے جو کنیا کی مرتیو پر ہردئے سے پرسن ہوتے ہیں۔ مانو سر سے بادھا ٹلی۔ اس کا کارن کیول یہی ہے کہ دہیز کی در (قیمت) دن دونی، رات چوگنی پاوس کال (برسات) کے جل ویگ (تیز رفتار پانی) کے سمان بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ جہاں دہیز کی سینکڑوں میں باتیں ہوتی تھیں وہ اب ہزاروں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ ابھی بہت دن نہیں گزرے کہ ایک یا دو ہزار روپے دہیز کیول بڑے گھروں کی بات تھی۔ چھوٹی چھوٹی شادیاں پانچ سو سے ایک ہزار تک طے ہوجاتی تھیں۔ پر اب معمولی سے معمولی وِواہ بھی تین چار ہزار کے نیچے نہیں طئے ہوتے۔ خرچ کا تو یہ حال ہے اور شِکشِت (پڑھا لکھا) سماج کی نردھنتا غریبی اور دَرِدرتا (مفلسی) دِنوں دن بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا اَنت (خاتمہ) کیا ہوگا ایشور ہی جانے۔ بیٹے ایک درجن بھی ہوں تو ماتا پتا کو چنتا نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اوپر ان کے وِواہ بھار (شادی کا بوجھ) کو اَنی واریہ نہیں سمجھتا۔ یہ اس کے لیے کمپلسری وشئے (موضوع) نہیں آپشنل وِشے ہے۔ ہوگا تو کردیں گے، نہیں کہہ دیں گے۔ بیٹا کھاؤ، کماؤ، سائی ہو تو وِواہ کرلینا۔ بیٹوں کی کوچرِترتا (بدکرداری) کلنک کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ لیکن کنیا کا وِواہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس سے بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ اگر وِواہ میں وِلمب (دیر) ہوا اور کنیا کے پاؤں کہیں اونچے نیچے پڑ گئے تو پھر کُٹمب (کنبہ) کی ناک کٹ گئی۔ وہ پتت (بدچلن) ہوگیا۔ ٹاٹ باہر کر دیا گیا۔ اگر وہ اس دُرگھٹنا کو سپھلتا (کامیابی) کے ساتھ گپت رکھ سکا تب تو کوئی بات نہیں۔ اس کو کلنکت

(داغدار) کرنے کا کسی کو ساہس (ہمّت) نہیں۔ لیکن ابھاگیہ وش (بدقسمتی سے) یدی وہ اسے چھپا نہ سکا بھنڈا پھوڑ ہوگیا تو پھر ماتا پتا کے لیے بھائی بندھوں کے لیے سنسار میں منہ دکھانے کو اِستھان نہیں رہتا۔ کوئی اپمان اس دُسسہ (گستاخ) کوئی وِپتّی (مصیبت) اس سے بھیشن (خوفناک) نہیں۔ کسی بھی ویادھی (مرض) کی اس سے بھینکر کلپنا (تصوّر) نہیں کی جا سکتی۔ لطف تو یہ ہے کہ جو لوگ بیٹیوں کے وِواہ کی کٹھنائیوں کو بھوگ چکے ہوتے ہیں وہی اپنے بیٹوں کے وِواہ کے اَوسر پر بالکل بھول جاتے ہیں کہ ہمیں کتنی ٹھوکریں کھانی پڑیں تھیں، ذرا بھی سہانبھوتی (ہمدردی) نہیں پرکٹ کرتے، بلکہ کنیا کے وِواہ میں جو تاوان اُٹھایا تھا اسے چکروِردھی (دُہرے) بیاج کے ساتھ بیٹے کے وِواہ میں وصول کرنے پر کٹی بدھ (پختہ ارادہ) ہوجاتے ہیں۔ کتنے ہی ماتا پتا اس چنتا میں گھُل گھُل کر اکال مرتو کو پراپت ہوجاتے ہیں، کوئی سنیاس گرہن کر لیتا ہے، کوئی بوڑھے کے گلے کنیا کو منڈھ کر اپنا گلہ چھڑاتا ہے، پاتر (اچھا) کوپاتر (بُرا) کے وچار کرنے کا موقع کہاں، ٹھیل مٹھیل ہے۔

منشی گلزاری لال ایسے ہی ہتبھاگے (بدنصیب) پتاؤں میں تھے۔ یوں (ویسے) ان کی اِستھتی بُری نہ تھی دو ڈھائی سو روپیہ مہینہ وکالت سے پیٹ لیتے تھے، پر خاندانی آدمی تھے، اُدار ہردئے، بہت کفایت کرنے پر بھی معقول بچت نہ ہوسکتی تھی۔ سمبندھیوں کا آدرستکار (خاطر تواضع) نہ کریں تو نہیں بنتا، مِتروں کی خاطرداری نہ کریں تو نہیں بنتا۔ پھر ایشور کے دیے ہوئے دو تین پُتر تھے، ان کا پالن پوشن شکشن (تعلیم) کا بھار تھا، کیا کرتے پہلی کنیا کا وِواہ انھوں نے اپنی حیثیت کے انوسار (مطابق) اچھی طرح کیا اور دوسری پُتری کا وِواہ ٹیڑھی کھیر ہو رہا تھا۔ یہ آوشیک تھا کہ وِواہ اچھے گھرانے میں ہو، انیتھا (ورنہ) لوگ ہنسیں گے اور اچھے گھرانے کے لیے کم سے کم پانچ ہزار کا تخمینہ تھا۔ ادھر پُتری سیانی ہوتی جاتی تھی وہ اناج جو لڑکے کھاتے تھے، وہ بھی کھاتی تھی، لیکن لڑکوں کو دیکھو تو جیسے سوکھے کا روگ لگا ہو۔ اور لڑکی شُکل پکش کا چاند ہورہی تھی۔ بہت دوڑ دوھوپ کرنے پر بے چارے کو ایک لڑکا ملا۔ باپ آبکاری کے وبھاگ (محکمہ) میں چار سو روپیہ کا نوکر تھا۔ لڑکا بھی سُشِکشِت (پڑھا لکھا)۔ اِستری سے آکر بولے لڑکا تو ملا اور گھربار ایک بھی کاٹنے یوگیہ (قابل) نہیں، پر کٹھنائی یہی ہے کہ لڑکا کہتا ہے، میں اپنا وِواہ نہ کروں گا، باپ نے کتنا سمجھایا، میں نے کتنا سمجھایا، اوروں نے سمجھایا، پر وہ ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ کہتا ہے۔ میں

کبھی وِواہ نہ کروں گا۔ سمجھ میں نہیں آتا وِواہ سے کیوں اتنی گھِرنا (نفرت) کرتا ہے۔ کوئی کارن نہیں بتلاتا، بس یہی کہتا ہے، میری اِچّھا۔ ماں باپ کا اکلوتا لڑکا ہے۔ ان کی پَرم اِچّھا ہے کہ اس کا وِواہ ہوجائے، پر کریں کیا؟ یوں انھوں نے پھلدان تو رکھ لیا ہے پر مجھ سے کہہ دیا ہے کہ لڑکا سُوبھاؤ (مزاج) کا ہٹیلا ہے، اگر نہ مانے گا تو پھلدان آپ کو لوٹا دیا جائے گا۔

اِستری نے کہا۔ تم نے لڑکے کو اکانت (تنہائی) میں بُلا کر پوچھا نہیں؟

گلزاری لال۔ بُلایا تھا۔ بیٹھا روتا رہا، پھر اُٹھ کر چلا گیا۔ تم سے کیا کہوں، اس کے پیروں پر گر پڑا، لیکن بِنا کچھ کہے اُٹھ کر چلا گیا۔

اِستری۔ دیکھو، اس لڑکی کے پیچھے کیا کیا جھیلنا پڑتا ہے؟

گلزاری لال۔ کچھ نہیں، آجکل کے لونڈے سیلانی ہوتے ہیں۔ انگریزی پُستکوں میں پڑھتے ہیں کہ ولایت میں کتنے ہی لوگ اَوِواہت (کنوارا) رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ بس یہی سنک سوار ہوجاتی ہے۔ کہ بَردُوَندھ (بجائے دو کے ایک) رہنے میں ہی جیون کی سکھ اور شانتی ہے۔ جتنی مصیبتیں ہیں وہ سب وِواہ ہی میں ہیں۔ میں بھی کالج میں تھا تب سوچا کرتا تھا کہ اکیلا رہوں گا اور مزے سے سیر سپاٹا کروں گا۔

اِستری۔ ہے واستو (حقیقت) میں بات یہی۔ وِواہ ہی تو ساری مصیبتوں کی جڑ ہے۔ تم نے وواہ نہ کیا ہوتا تو کیوں یہ چنتائیں ہوتیں میں بھی کنواری، رہتی تو چین کرتی۔

(۲)

اس کے ایک مہینے بعد منشی گلزاری لال کے پاس وَر (دولہا) نے یہ پتر لکھا پوجیہ ور! سادر پرینام،

میں آج بہت اَسمنجس (تذبذب) میں پڑ کر یہ پتر لکھنے کا ساہس کر رہا ہوں۔ اس دِھرشٹتا (گستاخی) کو چھما کیجیے گا۔

آپ کے جانے کے بعد سے میرے پتاجی اور ماتا جی دونوں مجھ پر دِواہ کرنے کے لیے ناناپرکار (مختلف انداز) سے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ماتا جی روتی ہیں پتا جی ناراض ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی ضد کے کارن وِواہ سے بھاگتا ہوں۔ کداچِت (کبھی کبھی) انھیں یہ بھی سندیہہ (شبہ) ہو رہا

ہے کہ میرا چرتر (کردار) بھرشٹ (خراب) ہوگیا ہے۔ میں واستوِک کارن بتاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ ان لوگوں کو دکھ ہوگا اور آشچریہ (حیرت) نہیں کہ شوک میں ان کے پرانوں (جان) پر ہی بن جائے۔ اس لیے اب تک میں نے جو بات گپت (چھپا کر) رکھی تھی وہ آج وِوش (بے بس) ہوکر آپ سے پرکٹ کرتا ہوں اور آپ سے سانگرہ نویدن کرتا ہوں کہ آپ اِسے گوپنیے (راز) سمجھیے گا۔ اور کسی دَشا میں بھی ان لوگوں کے کانوں میں اس کی بھنک نہ پڑنے دیجیے گا۔ جو ہونا ہے وہ تو ہوگا ہی، پہلے ہی سے کیوں انھیں شوک میں ڈباؤں۔ مجھے پانچ چھ مہینے سے یہ انوبھو ہو رہا ہے کہ میں چھئے (دِق) روگ سے گرست (مبتلا) ہوں اس کے سبھی لکشن (علامتیں) پرکٹ ہوتے جاتے ہیں ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ یہاں سب سے انوبھوی (تجربہ کار) جو دو ڈاکٹر ہیں، ان دونوں ہی سے میں نے اپنی آروگہ (بیمار نہ ہونے) پریکشا (جانچ) کرائی اور دونوں نے ہی اسپشٹ کہا کہ تمھیں سِل ہے اگر ماتا پتا سے یہ کہہ دوں تو وہ رو رو کر مرجائیں گے۔ جب یہ نشچے (یقینی) ہے کہ میں سنسار میں تھوڑے ہی دنوں کا مہمان ہوں تو میرے لیے وِواہ کی کلپنا کرنا بھی پاپ ہے۔ سمبھو (ممکن) ہے کہ میں وشیش پریتن کرکے سال دوسال جیوت رہوں۔ پر وہ دَشا اور بھی بھینکر ہوگی، کیونکہ اگر کوئی سنتان ہوئی تو وہ بھی میرے سنسکار سے اکال مِرتو پائے گی اور کداچت (کبھی کبھی) استری کو بھی اس روگ راکشس (جان لیوا بیماری) کا بھکشن (شکار) بننا پڑے۔ میرے اوِواہت رہنے سے جو بیتے گی، مجھ پر ہی بیتے گی۔ وِواہت ہوجانے سے میرے ساتھ اور کئی جیوؤں (جانوں) کا ناش (تباہ ہونا) ہوجائے گا۔ اِسی لیے آپ سے میری پرارتھنا (التجا) ہے کہ مجھے اس بندھن میں ڈالنے کے لیے آگرہ نہ کیجیے انیتھا آپ کو پچھتانا پڑے گا۔

سیوک (غلام)

ہزاری لال

پتر پڑھ کر گلزاری لال نے استری کی اُور (جانب) دیکھا اور بولے اس پتر کے وشے میں تمھارا کیا وچار ہے۔

اِستری۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بہانہ رچا ہے۔

گلزاری لال۔ بس بس ٹھیک یہی میرا بھی وچار ہے۔ اس نے سمجھا ہے کہ بیماری کا بہانہ کروں گا تو لوگ آپ ہی ہٹ جائیں گے۔ اصل میں بیماری کچھ نہیں۔ میں نے تو دیکھا ہی تھا، چہرہ چمک رہا تھا۔ بیمار کا منہ چھپا نہیں رہتا۔

اِستری۔ رام نام لے کے وِواہ کرو۔ کوئی کسی کا بھاگیہ تھوڑے ہی پڑھے بیٹھا ہے۔

گلزاری لال۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔

اِستری۔ نہ ہو کسی ڈاکٹر سے لڑکے کو دکھاؤ۔ کہیں سچ مچ یہ بیماری ہو تو بے چاری امبا کہیں کی نہ رہے۔

گلزاری لال۔ تم بھی پاگل ہوئی ہو کیا؟ سب حیلے حوالے ہیں۔ ان چھوکروں کے دل کا حال میں خوب جانتا ہوں۔ سوچتا ہوگا ابھی سیر سپاٹے کر رہا ہوں۔ وِواہ ہوجائے گا تو یہ گلچھرّے کیسے اُڑیں گے۔

اِستری۔ تو شُبھ مہورت دیکھ کر لگن بھجوانے کی تیاری کرو۔

(۳)

ہزاری لال بڑے دھرم سَنکٹ (کشمکش) میں تھے۔ اس کے پیروں میں زبردستی وِواہ کی بیڑی ڈالی جا رہی تھی اور وہ کچھ نہ کرسکتا تھا اس نے سُسر کو اپنا کچّا چِٹھا کہہ سنایا۔ مگر کسی نے اس کی باتوں پر وشواس نہ کیا۔ ماں باپ سے اپنی بیماری کا حال کہنے کا اسے ساہس نہ ہوتا تھا، نہ جانے ان کے دل پر کیا گزرے، نہ جانے کیا کر بیٹھیں؟ کبھی سوچتا کہ کسی ڈاکٹر کی شہادت لے کر سُسر کے پاس بھیج دوں۔ مگر پھر دھیان آتا، یدی ان لوگوں کو اس پر بھی وشواس نہ آیا تو؟ آجکل ڈاکٹری سند لے لینا کون سا مشکل کام ہے۔ سوچیں گے، کسی ڈاکٹر کو کچھ دے دلا کر لکھا لیا ہوگا۔ شادی کے لیے تو اتنا آگرہ ہو رہا تھا، ادھر ڈاکٹروں نے اسپشٹ کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے شادی کی تو تمھارا جیون سُوتر اور بھی نربل (کمزور) ہو جائے گا۔ مہینوں کی جگہ دِنوں میں وارا ۔ نیارا ہوجانے کی سمبھاؤنا (امکان) ہے۔

لگن آچکی تھی۔ وِواہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ مہمان آتے جاتے تھے اور ہزاری لال گھر سے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ کہاں چلا جاؤں؟ وِواہ کی کلپنا سے ہی اس کے پران سوکھ جاتے تھے آہ ! اس ابلہ کی کیا گتی (حالت) ہوگی؟ جب اسے یہ بات معلوم ہوگی تو وہ مجھے اپنے

من میں کیا کہے گی؟ کون اس پاپ کا پرائشچت کرے گا؟ نہیں اس ابلہ پر گھور اتیاچار نہ کروں گا۔ اسے ویدھوے (بیوگی) کی آگ میں نہ جلاؤں گا۔ میری زندگی ہی کیا، آج نہ مرا کل مروں گا، کل نہیں تو پرسوں، تو کیوں نہ آج ہی مرجاؤں۔ آج ہی جیون کا اور اس کے ساتھ ساری چنتاؤں کا، ساری وِپتیوں (مصیبتوں) کا انت کردوں۔ پتا جی روئیں گے امّاں پران تیاگ دیں گی۔ لیکن ایک بالکا کا جیون تو سپھل ہوجائے گا، میرے بعد کوئی ابھاگا اناتھ تو نہ روئے گا۔

کیوں نہ چل کر پتاجی سے کہہ دوں! وہ ایک دو دن دُکھی رہیں گے، امّاں جی دو ایک روز شوک سے نراہار رہ جائیں گی، کوئی چنتا نہیں۔ اگر ماتا پتا کے اتنے کشٹ سے ایک یُوَتی کی پران رکشا (زندگی کی حفاظت)۔ہوجائے تو کیا چھوٹی بات ہے؟

یہ سوچ کر وہ دھیرے سے اُٹھا اور آکر پتا کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ رات کے دس بج گئے تھے۔ بابو درباری لال چارپائی پر لیٹے ہوئے حقہ پی رہے تھے آج انھیں سارا دن دوڑتے گزرا تھا شامیانہ طے کیا، باجے والوں کو بیعانہ دیا آتش بازی، پھلواری آدی کا پربندھ کیا، گھنٹوں برہمنوں کے پاس سر مارتے رہے۔اس وقت ذرا کمر سیدھی کر رہے تھے کہ سہسا (اچانک) ہزاری لال کو سامنے دیکھ کر چونک پڑے۔ اس کا اُترا ہوا چہرہ، سجل (نم) آنکھیں اور کنٹھت مکھ دیکھا تو چِنتِت (فکرمند) ہوکر بولے۔ کیوں لالو، طبیعت تو اچھی ہے نہ؟ کچھ اداس معلوم ہوتے ہو۔

ہزاری لال۔میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، پر بھئے ہوتا ہے کہ کہیں آپ اَپرسنّ (ناراض) نہ ہوں۔

درباری لال۔ سمجھ گیا وہی پرانی بات ہے نا؟ اس کے سوا کوئی دوسری بات ہو تو شوق سے کہو۔

ہزاری لال۔ کھید (افسوس) ہے کہ میں اُسی وِشئے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

درباری لال۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ مجھے اس بندھن میں نہ ڈالیے، میں اس کے اَیوگیہ (ناقابل) ہوں، میں یہ بھار سہہ نہیں کرسکتا، بیڑی میری گردن کو توڑ دے گی، آدی یا اور کوئی نئی بات؟

ہزاری لال۔ جی نہیں، نئی بات ہے۔ میں آپ کی آگیہ پالن (حکم بجا لانے) کے لیے سب

پرکار سے تیار ہوں۔ پر ایک ایسی بات ہے، جسے میں نے اب تک چھپایا تھا اسے بھی پرکٹ کردینا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد آپ جو کچھ نشچے کریں گے اسے میں شِرودھاریہ (سر جھکا دینا) کروں گا۔

ہزاری لال نے بڑے ونیت (التجا) شبدوں میں اپنا آشے (مدعا) کہا ڈاکٹروں کی رائے بھی بیان کی اور انت میں بولے۔ ایسی دشا میں مجھے پوری آشا ہے کہ آپ مجھے وِواہ کرنے کے لیے بادھیہ (مجبور) نہ کریں گے۔

درباری لال نے پتر کے مکھ کی اُور غور سے دیکھا، کہیں زردی کا نام نہ تھا اس کتھن (بات) پر وشواس نہ آیا پر اپنا اوِشواس (غیر یقین) چھپانے اور اپنا ہارِدِک شوک پرکٹ کرنے کے لیے وہ کئی منٹ تک گہری چنتا میں مگن رہے۔ اس کے بعد پیڑت (دکھی) کنٹھ (گلے) سے بولے۔ بیٹا، اس دشا میں تو وِواہ کرنا اور بھی آوشیک ہے ایشور نہ کرے کہ ہم وہ بُرا دن دیکھنے کے لیے جیتے رہیں۔ پر وِواہ، ہوجانے سے تمھاری کوئی نشانی تو رہ جائے گی۔ ایشور نے کوئی سنتان دے دی تو وہی ہمارے بڑھاپے کی لاٹھی ہوگی۔ اسی کا منہ دیکھ دیکھ کر دل کو سمجھائیں گے۔ جیون کا کچھ آدھار (سہارا) تو رہے گا۔ پھر آگے کیا ہوگا یہ کون کہہ سکتا ہے؟ ڈاکٹر کسی کی کرم ریکھا (تقدیر کا لکھا) تو نہیں پڑھے ہوتے۔ ایشور کی لیلا اپرم پار ہے ڈاکٹر اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ تم نشچنت (بے غم) ہوکر بیٹھو، ہم جو کچھ کرتے ہیں کرنے دو۔ بھگوان چاہیں گے تو سب کلیان (اچھا) ہی ہوگا۔

ہزاری لال نے اس کا کوئی اُتر نہیں دیا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں کنٹھا وِرودھ کے کارن منہ تک نہ کھول سکا۔ چپکے سے آکر اپنے کمرے میں لیٹ رہا۔

تین دن اور گزرے گئے۔ پر ہزاری لال کچھ نشچے نہ کرسکا۔ وِواہ کی تیاریاں پوری ہوگئیں تھیں آنگن میں منڈپ گڑگیا تھا۔ ڈال گہنے صندوقوں میں رکھے جاچکے تھے۔ منتریئی کی پوجا ہوچکی تھی اور دُوار پر باجے کا شور مچا ہوا تھا محلے کے لڑکے جمع ہوکر باجا سنتے تھے اور الاّس سے اِدھر اُدھر دوڑتے تھے۔

سندھیا ہوگئی تھی۔ بارات آج رات کی گاڑی سے جانے والی تھی۔ باراتیوں نے اپنے وسترابھوشن (زیور کپڑے) پہننے شروع کیے کوئی نائی سے بال بنواتا تھا اور چاہتا تھا کہ خط ایسا صاف ہوجائے مانو وہاں بال کبھی تھے ہی نہیں، بوڑھے اپنے پکّے بالوں کو اُکھڑوا کر

جوان بننے کی چیشٹھا (کوشش) کر رہے تھے۔ تیل، صابن، ابٹن کی لوٹ مچی ہوئی تھی اور ہزاری لال بغیچہ میں ایک ورکش کے نیچے اُداس بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ کیا کروں؟

اتم نشچے کی گھڑی سر پر کھڑی تھی۔ ایک ایک شن بھی وِلمب کرنے کا موقع نہ تھا۔ اپنی ویدنا (من کا دُکھ) کس سے کہے، کوئی سننے والا نہیں تھا۔

اس نے سوچا ہمارے ماں باپ کتنے اَدُور درشی (ناسمجھ) ہیں، اپنی امنگ میں انھیں اتنا بھی نہیں سوجھتا کہ ودھو (دلہن) پر کیا گزرے گی۔ ودھو کے ماتا پتا بھی اتنے اندھے ہو رہے ہیں کہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتے، جان کر نہیں جانتے۔

کیا یہ وِواہ ہے؟ کداپی (ہرگز) نہیں۔ یہ تو لڑکی کو کنویں میں ڈالنا ہے، بھاڑ میں جھونکنا ہے، کُند چھرے سے ریتنا ہے۔ کوئی آتما اتنی دُسسہہ (گستاخ) اتنی ہردئے وِدارک (بے دردانہ) نہیں ہوسکتی جتنی ویدھوے بیوگی اور یہ لوگ جان بوجھ کر اپنی پُتری کو ویدھوے کے اگنی کنڈ میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ ماتا پتا ہیں؟ کداپی (ہرگز) نہیں۔ یہ لڑکی کے شترو (دشمن) ہیں قصائی ہیں، بدِھک (جان لینے والے) ہیں۔ ہتیارے ہیں، کیا ان کے لیے کوئی دنڈ نہیں؟ جو جان بوجھ کر اپنی پرِیے سنتان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگتے ہیں، اس کے لیے کوئی دنڈ نہیں؟ سماج بھی انھیں دنڈ نہیں دیتا، کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ہائے!

یہ سوچ کر ہزاری لال اُٹھا اور ایک اُور چپ چاپ چل دیا۔ اس کے مکھ پر تیج (غصہ) چھایا ہوا تھا اس نے آتم بلیدان (جان کی قربانی) سے اس کشٹ کو نوارن (دور) کرنے کا دِرڑھ (پختہ) سنکلپ (ارادہ) کرلیا تھا۔ اُسے مرتو کا لیشماتر (ذرا سا) بھی بھئے نہ تھا وہ اس دشا کو پہنچ گیا جب ساری آشائیں مرتو پر ہی اولمبت (ختم) ہوجاتی ہیں۔

اس دن سے پھر کسی نے ہزاری لال کی صورت نہیں دیکھی۔ معلوم نہیں زمیں کھا گئی یا آسمان۔ ندیوں میں جال ڈالے گئے، کنوؤں میں بانس پڑگئے، پولیس میں حلیہ گیا، سماچار پتروں میں وِگیپتی (اشتہار) نکالی گئی، پر کہیں پتہ نہ چلا۔

کئی ہفتوں کے بعد، چھاونی ریلوے اسٹیشن سے ایک میل پشچم کی اُور سڑک پر کچھ ہڈیاں ملیں۔ لوگوں کو انومان (قیاس) ہوا کہ ہزاری لال نے گاڑی کے نیچے دب کر جان دی، پر نشچت روپ (تصدیق سے) کچھ نہ معلوم ہوا۔

(۴)

بھادو کا مہینہ تھا اور تیج کا دن۔ گھروں میں صفائی ہو رہی تھی سوبھاگیہ وتی رمنیاں سولہہ شرنگھار کیے گنگا اسنان کرنے جارہی تھیں۔ امبا اسنان کرکے لوٹ آئی تھی اور تُلسی کے کچّے چبوترے کے سامنے کھڑی ویدنا (دعا) کر رہی تھی۔ پتی گر یہہ (شوہر کے ساتھ رہنا) میں اِسے یہ پہلی ہی تیج تھی، بڑی امنگوں سے ورت رکھا تھا۔ سہسا اس کے پتی نے اندر آکر اسے سہاس نیتروں سے دیکھا اور بولا۔ منشی درباری لال تمھارے کون ہوتے ہیں، یہ ان کے یہاں سے تمھارے لیے تیج پٹھونی آئی ہے ابھی ڈاکیہ دے گیا ہے۔

یہ کہہ کر اس نے ایک پارسل چارپائی پر رکھ دیا۔ درباری لال کا نام سنتے ہی امبا کی آنکھیں سجل (بھیگ) ہوگئیں۔ وہ لپکی ہوئی آئی اور پارسل کو ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی پر اس کی ہمت نہ پڑی کہ اسے کھولے۔ پچھلی اِسمرتیاں (یادیں) جیوت ہوگئیں، ہردے میں ہزاری لال کے پرتی شردھا (عزت) کا ایک اُدگار (سمندر) سا اُٹھ پڑا۔ آہ! یہ اسی دیوآتما (فرشتہ صفت) کے آتم بلیدان (خود کی قربانی) کا پُنیت (ثواب سے بھرا) پھل ہے کہ مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ ایشور انھیں سدگتی (جزائے خیر) دیں۔ وہ آدمی نہیں، دیوتا تھے، جس نے میرے کلیان (بھلائی) کی نمت (لیے) اپنے پران تک سمرپن (سونپنا) کردیے۔

پتی نے پوچھا۔ درباری لال تمھارے چچا ہیں۔

امبا۔ ہاں۔

پتی۔ اس پتر میں ہزاری لال کا نام لکھا ہے، یہ کون ہے۔

امبا۔ یہ منشی درباری لال کے بیٹے ہیں۔

پتی۔ تمھارے چچرے بھائی؟

امبا۔ نہیں، میرے پرم دیالو، اڈھارک، جیون داتا، مجھے اتھاہ جل میں ڈوبنے سے بچانے والے، مجھے سَوبھاگیہ (خوش نصیبی) کا وردان دینے والے۔

پتی نے اس بھاؤ سے کہا مانو کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی ہو۔ آہ! میں سمجھ گیا۔ واستو میں وہ منُشیہ نہیں دیوتا تھے۔

یہ افسانہ ہندی میں "پریم پرمود" میں شائع ہوا۔ رسم خط بدل کر اردو میں یہ پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

شطرنج کی بازی

نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا لکھنؤ عیش و عشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے امیر و غریب سبھی رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں۔ تو کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رندی و مستی کا زور تھا۔ اُمورِ سیاست میں، شعر و سخن میں، طرزِ معاشرت میں، حرفت و صنعت میں، تجارت و تبادلہ میں، سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔ اراکینِ سلطنت مے خواری کے غلام ہو رہے تھے، شعرا بوسہ و کنار میں مست، اہل خرقہ کلابتوں اور چکن بنانے میں، اہل سیف تیتر بازی میں، اہل روزگار سُرمہ و مسّی، عطر و تیل کی خرید و فروخت میں غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا سب کی آنکھوں میں ساغر و جام کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، علم و حکمت کی کن کن ایجادوں میں مصروف ہے، بروبحر پر مغربی اقوام کس طرح حاوی ہوتی جاتی ہے، اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بٹیر لڑ رہے ہیں۔ تیتروں میں پالیاں ہو رہی ہیں۔ کہیں چوسر ہو رہی ہے، پو بارہ کا شور مچا ہوا ہے، کہیں شطرنج کے معرکے چھڑے ہوئے ہیں۔ فوجیں زیر و زبر ہو رہی ہیں۔ نواب کا حال اس سے بدتر تھا وہاں گتوں اور تالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔ حظ نفس کے نئے نئے لٹکے، نئے نئے نسخے سوچے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فقراء خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کی بجائے مدک اور چانڈو کے مزے لیتے تھے، رئیس زادے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اربابِ نشاط سے تلمذ کرتے تھے، فکر کو جولانِ عقل کو رسا اور ذہن کو تیز کرنے کے لیے، شطرنج کیمیا سمجھاجاتا تھا۔ اب بھی اس قوم کے لوگ کہیں کہیں موجود ہیں جو اس دلیل کو بڑے شد و مد سے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے اگر مرزا سجاد علی اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے تو کسی ذی فہم کو اعتراض کرنے کا کوئی موقعہ نہ تھا ہاں جُہلا اُنھیں جو چاہیں سمجھیں، دونوں صاحبوں کے پاس موروثی جاگیریں تھیں۔ فکرِ معاش سے آزاد تھے، آخر اور کرتے ہی کیا، طلوع سحر ہوتے ہی

دونوں صاحب ناشتہ کرکے بساط پر بیٹھ جاتے۔ مہرے بچھا لیتے اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے پھر انھیں خبر نہ ہوتی تھی کہ کب دوپہر ہوا۔ کب سہ پہر۔ کب شام۔ گھر میں سے بار بار آدمی آکر کہتا تھا کھانا تیار ہے۔ یہاں سے جواب ملتا تھا چلو آتے ہیں دسترخوان بچھاؤ۔ مگر شطرنج کے سامنے قورمے اور پلاؤ کے مزے بھی پھیکے تھے، یہاں تک کہ باورچی مجبور ہوکر کھانا کمرے ہی میں رکھ جاتا تھا اور دونوں دوست، دونوں کام ساتھ ساتھ کرکے اپنی باریک نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا ہی رہ جاتا اس کی یاد ہی نہ آتی تھی۔ مرزا سجاد علی کے مکان میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا اس لیے انھیں کے دیوان خانے میں معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کے گھر کے اور لوگ اس مشغلہ سے خوش تھے، ہرگز نہیں محلّہ میں گھر کے نوکر چاکروں میں، مہریوں، ماماؤں میں برابر حاسدانہ حرف گیریاں ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منحوس کھیل ہے گھر کو تباہ کرکے چھوڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کو اس کی چاٹ پڑے، آدمی نہ دین کے کام کا رہتا ہے نہ دنیا کے کام کا۔ بس اُسے دھوبی کا کتا سمجھو۔ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ بُرا مرض ہے۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحب بھی آئے دن اس مشغلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھیں۔ حالانکہ اُنھیں اُس کے موقعے مشکل سے ملتے۔ وہ سوتی رہتی تھیں کہ ادھر بازی جم جاتی تھی۔ رات کو سوجاتی تھیں تب کہیں مرزا جی گھر میں آتے تھے۔ ہاں جولاہے کا غصّہ ڈاڑھی پر اُتارا کرتی تھیں۔ نوکروں کو جھڑکیاں دیا کرتیں۔ کیا میاں نے پان مانگے ہیں؟ کہہ دو آکر لے جائیں۔ کیا پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ کیا کہا ابھی کھانے کی فرصت نہیں ہے؟ کھانا لے جاکر سر پر پٹک دو۔ کھائیں یا کتوں کو کھِلائیں، یہاں اُن کے انتظار میں کون بیٹھا رہے گا۔ مگر لطف یہ تھا کہ اُنھیں اپنے میاں سے اتنی شکایت نہ تھی جتنی میر صاحب سے۔ وہ میر صاحب کو نکھٹو، بگاڑو، ٹکڑے خور وغیرہ ناموں سے یاد کیا کرتی تھیں۔ شاید مرزا جی بھی اپنے بریت کے اظہار میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سر ڈال دیتے تھے۔

ایک دن بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہونے لگا تو ماما سے کہا، جاکر مرزا جی کو بلا لا۔ کسی حکیم کے یہاں سے دوا لادیں۔ دوڑ جلدی کر، سر پھٹا جاتا ہے۔ ماما گئی۔ مرزا جی نے کہا چل ابھی آتے ہیں۔ بیگم صاحب کو اتنی تاب کہاں کہ ان کے سر میں درد ہو اور میاں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہوں۔ چہرہ سُرخ ہوگیا اور ماما سے کہا کہ جاکر کہہ کہ ابھی چلیے

ورنہ وہ خود حکیم صاحب کے یہاں چلی جائیں گی کچھ ان کے آنکھوں راستہ نہیں دیکھا ہے۔ مرزا جی بڑی دلچسپ بازی کھیل رہے تھے۔ دو ہی کشتوں میں میر صاحب کی مات ہوئی جاتی تھی۔ بولے کیا ایسا دم لبوں پر ہے ذرا صبر نہیں آتا۔ حکیم صاحب کوئی چھو منتر کر دیں گے کہ ان کے آتے ہی آتے درد سر دفع ہوجائے گا۔

میر صاحب نے فرمایا۔ ارے تو جاکر ذرا سن ہی آیئے نہ ! عورتیں نازک مزاج ہوتی ہی ہیں۔

مرزا۔ جی ہاں کیوں نہ چلا جاؤں۔ دو کشتوں میں آپ کی مات ہوتی ہے۔

میر۔ جی اس بھروسے نہ رہیے گا، وہ چال سوچی ہے کہ آپ کے مہرے دھرے رہیں۔ اور مات ہوجائے پر جایئے، کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لیے ان کا دل دُکھائیے گا۔

مرزا۔ جی چاہتا ہے اسی بات پر مات کردوں۔

میر۔ میں کھیلوں گا ہی نہیں۔ آپ پہلے جاکر سن آئیں۔

مرزا۔ ارے یار جانا پڑے گا حکیم کے یہاں۔ درد ورد خاک نہیں ہے۔ مجھے دق کرنے کا حیلہ ہے۔

میر۔ کچھ بھی ہو ان کی خاطر تو کرنی ہی پڑے گی۔

مرزا۔ اچھا ایک چال اور چل لوں۔

میر۔ ہرگز نہیں۔ جب تک آپ سُن نہ آئیں گے۔ میں مہروں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔

مرزا صاحب مجبور ہوکر اندر گئے تو بیگم صاحب نے کراہتے ہوئے کہا۔ تمھیں نگوڑا شطرنج اتنا پیارا ہے کہ چاہے کوئی مر بھی جائے پر اُٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ شطرنج ہے کہ میری سوکن ہے۔ نوج کوئی تم جیسا نرموہیا ہو۔

مرزا۔ کیا کروں، میر صاحب مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکلوں سے گلا چھڑا کر آیا ہوں۔

بیگم۔ کیا جیسے خو نکھٹو ہیں ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں، اُن کے بھی تو بال بچے ہیں کہ سب کا صفایا کردیا۔

مرزا۔ بڑا لتی آدمی ہے جب آکر سر پر سوار ہوجاتا ہے۔ تو مجبور ہوکر مجھے بھی کھیلنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم۔ دُتکاز کیوں نہیں دیتے کتے کی طرح۔

مرزا۔ سبحان اللہ برابر کے آدمی ہیں۔ عمر میں رتبہ میں مجھ سے دو انگل اونچے۔ لحاظ کرنا ہی پڑتا ہے۔

بیگم۔ تو میں ہی دُتکارے دیتی ہوں ناراض ہوجائیں گے ہوجائیں، کون میری روٹیاں چلاتے ہیں۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ (ماما سے) عباسی جا شطرنج اُٹھا لا۔ میر صاحب سے کہہ دینا میاں اب نہ کھیلیں گے۔ آپ تشریف لے جائیں۔ اب پھر منہ نہ دکھایئے گا۔

مرزا۔ ہائیں ہائیں کہیں ایسا غضب نہ کرنا، کیا ذلیل کراؤگی کیا۔ ٹھہر عباسی، کم بخت کہاں دوڑی جاتی ہے۔

بیگم۔ جانے کیوں نہیں دیتے۔ میرا ہی خون پیے جو روکے، اچھا اُسے روک لیا۔ مجھے روک لوتو جانوں یہ کہہ کر بیگم صاحبہ خود چلّاتی ہوئی دیوان خانہ کی طرف چلیں۔ مرزا جی کا چہرہ فق ہوگیا۔ ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بیوی کی منّتیں کرنے لگے، خدا کے لیے تمھیں شہیدِ کربلا کی قسم میری ہی میّت دیکھیے جو ادھر قدم رکھے۔ لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ مانی دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں پر یکایک نامحرم کے روبرو بے نقاب جاتے ہوئے پیر رُک گئے وہیں سے اندر کی طرف جھانکا۔ حسنِ اتفاق سے کمرہ خالی تھا۔ میر صاحب نے حسبِ ضرورت دو چار مہرے تبدیل کردیے تھے، اور اُس وقت اپنی صفائی جتانے کے لیے۔ باہر چبوترہ پر چہل قدمی کر رہے تھے، پر کیا تھا۔ بیگم صاحبہ کو منہ مانگی مراد ملی، اندر پہنچ کر بازی اُلٹا دی۔ مہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے کچھ باہر تب دروازہ اندر سے بند کرکے کنڈی لگا دی۔ میر صاحب دروازے پر تو تھے ہی۔ مہرے باہر پھینکے جاتے دیکھے۔ پھر چوڑیوں کی جھنکار سُنی تو سمجھ گئے بیگم صاحبہ بگڑ گئیں۔ چپکے سے گھر کی راہ لی۔

مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا، تم نے غضب کر دیا۔

بیگم۔ اب مُوا ادھر آئے تو کھڑے کھڑے نکال دوں۔ گھر نہیں چکلہ سمجھ لیا ہے۔ اتنی لو اگر خدا سے لگاتے تو ولی ہوجاتے۔ آپ لوگ تو شطرنج کھیلیں میں یہاں چولھے چکّی کی فکر میں سر کھپاؤں، لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ جاتے ہو حکیم صاحب کے یہاں کہ اب بھی تامل ہے۔

مرزا جی گھر سے نکلے تو حکیم صاحب کے یہاں کے بدلے میر صاحب کے گھر پہنچے اور معذرت آمیز لہجہ میں، با دلِ پُر درد سارا ماجرا کہہ سنایا۔

میر صاحب ہنس کر بولے۔ اتنا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب دردِ سر کا پیغام ماما لائی تھی کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں مگر بڑی غصہ ور معلوم ہوتی ہیں۔ اُف! اتنی تمکنت! آپ نے اُنھیں بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ یہ مناسب نہیں۔ انھیں اس سے کیا مطلب کہ آپ باہر کیا کرتے ہیں، خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے، مردوں کی باتوں میں دخل دینے کا انھیں کیا مجاز! میرے یہاں دیکھیے۔ کبھی کوئی چوں بھی نہیں کرتا۔

مرزا۔ خیر یہ تو بتایئے اب کہاں جماؤ ہوگا۔

میر۔ اب کیا غم ہے، اتنا بڑا گھر پڑا ہوا ہے۔ بس یہیں جمے گی۔

مرزا۔ لیکن بیگم صاحبہ کو کیسے مناؤں گا۔ جب گھر پر بیٹھا رہتا تھا تب تو اتنی خفگی تھی گھر سے چلا آؤں گا تو شاید زندہ نہ چھوڑیں۔

میر۔ اجی بکنے دیجیے، دوچار دن میں خود بخود سیدھی ہوجائیں گی۔ ہاں آپ بھی ذرا تن جایئے۔

(۲)

میر صاحب کی بیگم صاحبہ کسی وجہ سے میر صاحب کے گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں اس لیے وہ اُن کے مشغلہء تفریح کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی انھیں جانے میں دیر ہوجاتی، یا کچھ السلاتے تو سرود بہ مستاں یاد دہانیدن کے مصداق انھیں آگاہ کردیا کرتی تھیں۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گمان ہوگیا تھا کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق، متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں، لیکن جب ان کے دیوان خانے میں بساط بچھنے لگی، اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحب کی آزادی میں ہرج واقع ہونے لگا تو انھیں بڑی تشویش دامن گیر ہوئی۔ دن کے دن دروازہ پر جھانکنے کو بھی ترس جاتی تھیں سوچنے لگیں کیوں کر یہ بلا سر سے ٹلے؟

ادھر نوکروں میں بھی کانا پھوسی ہونے لگی، اب تک دن بھر پڑے پڑے خراٹے لیتے تھے گھر میں کوئی آئے کوئی جائے ان سے مطلب تھا نہ سروکار۔ مشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا اب آٹھوں پہر کی دھونس ہوگئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا۔ کبھی پانی لانے

کا کبھی برف لانے کا کبھی تمباکو بھرنے کا حقہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہردم گرم رہتا تھا۔ سب جا جاکر بیگم صاحبہ سے کہتے، حضور میاں کا شطرنج تو ہمارے جی کا جنجال ہوگیا دن بھر دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑے جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کردی، گھڑی دو گھڑی کھیل لیا چلو چھٹی ہوئی اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے جسے اس کی چاٹ پڑجاتی ہے کبھی نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے یہاں تک کہ ایک کے پیچھے محلے کے محلے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ محلّہ والے ہردم ہمیں لوگوں کو ٹوکا کرتے ہیں شرم سے گڑجانا پڑتا ہے۔ بیگم صاحبہ کہتیں مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ پر کروں کیا؟ میرا کیا بس ہے؟

محلّہ میں جو دو چار بڑے بوڑھے آدمی تھے وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اب خیریت نہیں ہے۔ جب ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہوگئی۔ لچھن بُرے ہیں۔

ملک میں واویلا مچا ہوا تھا۔ رعایا دن دہاڑے لٹتی تھی پر کوئی اُس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھینچی چلی آتی تھی۔ اور یہاں سامانِ عیش کے بہم پہنچانے میں صرف ہوجاتی تھی۔ بھانڈ۔ نقال۔ کتھک۔ اربابِ نشاط کی گرم بازاری تھی۔ ساقنوں کی دُوکانوں پر اشرفیاں برستی تھیں۔ رئیس زادے ایک ایک دم کی ایک ایک اشرفی پھینک دیتے تھے۔ مصارف کا یہ حال اور انگریز کمپنی کا قرضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس کی ادائیگی کو فکر نہ تھی یہاں تک کہ سالانہ خراج بھی نہ ادا ہوسکتا تھا۔ رزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا۔ دھمکیاں دیتا۔ مگر یہاں لوگوں پر نفس پروری کا نشہ سوار تھا۔ کسی کے کانوں پر جوں نہ رینگتی تھی۔

خیر میرصاحب کے دیوان خانے میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گزر گئے، نت نئے نئے نقشے حل کیے جاتے ،نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور مسمار کیے جاتے، کبھی کبھی کھیلنے کھیلتے آپس میں جھڑپ ہوجاتی توتو میں میں کی نوبت پہنچ جاتی پر یہ شکررنجیاں بہت جلد رفع ہوجاتی تھیں کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی روٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے میرصاحب بساط اُٹھا کر اپنے گھر میں آبیٹھتے اور قسمیں کھاتے کہ اب کبھی شطرنج کے نزدیک نہ جائیں گے مگر صبح ہوتے ہی دونوں دوست پھر مل بیٹھتے۔ نیند ساری بدمزگیوں کو دور کردیتی تھی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے شطرنج کے دلدل میں غوطے کھا رہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار وردی پہنے اسلحہ سے لیس میر صاحب کا نام پوچھتا آپہنچا۔ میر صاحب کے ہوش اوڑے، اوسان خطا ہوگئے، خدا جانے کیا بلا سر پر آئی۔ گھر کے دروازے بند کر لیے اور نوکروں سے کہا کہہ دو گھر میں نہیں ہیں۔

سوار نے پوچھا۔ گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں۔ کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے!

خدمت گار۔ یہ میں نہیں جانتا۔ گھر میں سے یہی جواب ملا ہے۔ کیا کام ہے؟

سوار۔ کام تجھے کیا بتاؤں، حضور میں طلبی ہے۔ شاید فوج کے لیے کچھ سپاہی مانگے گئے ہیں، جاگیردار ہیں کہ مذاق ہے۔

خدمت گار۔ اچھا تو تشریف لے جایئے۔ کہہ دیا جائے گا۔

سوار۔ کہنے سُننے کی بات نہیں ہے۔ میں کل فوراً آؤں گا، اور تلاش کر کے لے جاؤں گا۔ اپنے ہمراہ حاضر کرنے کا حکم ہوا ہے۔

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہوگئی۔ کانپتے ہوئے مرزا جی سے بولے، اب کیا ہوگا؟

مرزا۔ بڑی مصیبت ہے کہیں میری طلبی بھی نہ ہو۔

میر۔ کم بخت کل پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔

مرزا۔ قہر آسمانی ہے اور کیا۔ کہیں سپاہیوں کی مانگ ہوئی تو بن موت مرے، یہاں تو جنگ کا نام سنتے ہی تپ چڑھ آتی ہے۔

میر۔ یہاں تو آج سے دانہ پانی حرام سمجھیے۔

مرزا۔ بس یہی تدبیر ہے کہ اُس سے ملیے ہی نہیں، دونوں آدمی غائب ہوجائیں، سارا شہر چھانتا پھرے۔ کل سے گومتی پار کسی ویرانے میں نقشہ جمے۔ وہاں کسے خبر ہوگی حضرت آکر اپنا سا منہ لے کر لوٹ جائیں گے۔

میر۔ بس بس آپ کو خوب سوجھی۔ واللہ۔ کل سے گومتی پار کی ٹھہرے۔

ادھر بیگم صاحبہ سوار سے کہہ رہی تھیں تم نے خوب بہروپ بھرا۔

اُس نے جواب دیا۔ ایسے گاؤدیوں کو تو چٹکیوں پر نچاتا ہوں۔ اس کی ساری عقل اور ہمت تو شطرنج نے چر لی۔ اب دیکھ لینا جو کبھی بھول کر بھی گھر رہے۔ صبح کا گیا پہر رات کو آئے گا۔

(۳)

اُس دن سے دونوں دوست منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور بغل میں ایک چھوٹی سی دری دبائے ڈبے میں گلوریاں بھرے، گومتی پار ایک پُرانی ویران مسجد میں جا بیٹھتے جو شاید عہد مغلیہ کی یادگار تھی۔ راستہ میں چلم، تمباکو، دریا لے لیے، اور مسجد میں پہنچے۔ دری بچھی۔ حقہ بھر کر بساط پر جا بیٹھتے۔ پھر انھیں دین و دنیا کی فکر نہ رہتی تھی۔ کشت، شہ، پیٹ لیا۔ ان الفاظ کے سوا ان کے منہ سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا۔ کوئی چلہّ کش بھی اتنے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا ہوگا دوپہر کو جب بھوک معلوم ہوتی تو دونوں حضرت گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی نانبائی کی دُکان پر کھانا کھا لیتے، اور ایک چلم حقہ پی کر پھر محوِ شطرنج بازی۔ کبھی کبھی تو انھیں کھانے کی سُدھ بھی نہ رہتی تھی۔

ادھر ملک میں سیاسی پیچیدگیاں روز بروز پیچیدہ تر ہوتی جاتی تھیں۔ کمپنی کی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھی چلی آتی تھیں، شہر میں ہلچل مچا ہوا تھا۔ لوگ اپنے اپنے بال بچّوں کو لے کر دیہاتوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ پر ہمارے دونوں شطرنج باز دوستوں کو غم وزد اور غم کالا سے کوئی واسطہ نہ تھا وہ گھر چلتے تو گلیوں میں ہوجاتے کہ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑجائے۔ محلے والوں کو بھی ان کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی، یہاں تک کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی مرزا صاحب انھیں کشت پر کشت دے رہے تھے کہ دفعتاً کمپنی کی فوج سامنے کی سڑک پر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ قرض کی علت میں سلطنت ہضم کرلینا چاہتی تھی۔ وہی مہاجنی چال تھی، جس سے آج ساری کمزور قومیں پا بہ زنجیر ہو رہی ہیں۔

میر صاحب۔ انگریزی فوجیں آرہی ہیں۔

مرزا۔ آنے دیجیے، کشت بچائیے۔ یہ کشت۔

میر۔ ذرا دیکھنا چاہیے، آڑ سے دیکھیں، کیسے قوی ہیکل جوان ہیں۔ دیکھ کر سینہ تھراتا ہے۔

مرزا۔ دیکھ لیجیے گا، کیا جلدی ہے۔ پھر کشت۔

میر۔ توپ خانہ بھی ہے، کوئی پانچ ہزار آدمی ہوں گے، سُرخ چہرہ جیسے لال بندر۔

مرزا۔ جناب حیلے نہ کیجیے یہ کشت۔
میر۔ جب گھر چلنے کا وقت آئے گا تو دیکھی جائے گی۔ یہ کشت اور مات۔
فوج نکل گئی یاروں نے دوسری بازی بچھا دی۔ مرزا جی بولے آج کھانے کی کیسی رہے گی؟
میر۔ آج روزہ ہے کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے۔
میر۔ شہر میں کچھ نہ ہو رہا ہوگا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہوکر آرام کر رہے ہوں گے۔
حضور جانِ عالم بھی استراحت فرماتے ہوں گے، یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہو۔
اب کی دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے۔ اب کی مرزا جی کی بازی کمزور تھی، اس اثنا میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علی شاہ معزول کردیے گئے تھے اور فوج انھیں گرفتار کیے لیے جاتی تھی، شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا، نہ کشت و خون یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔ نواب گھر سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی روتی پیٹتی سُسرال جاتی ہے، بیگمیں روئیں، نواب روئے، مامائیں مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ ازل سے کسی ملک میں کسی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز، اتنی بے ضرر نہ ہوئی ہوگی۔ کم ازکم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں، یہ وہ اہنسا نہ تھی جس پر ملائک خوش ہوتے ہیں، یہ وہ پست ہمتی، وہ نامردی تھی جس پر دیویاں روتی ہیں، لکھنؤ کا فرماں روا قیدی بنا چلا جاتا تھا، اور لکھنؤ عیش کی نیند میں مست تھا۔ یہ سیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔
مرزا نے کہا۔ حضور عالی کو ظالموں نے قید کرلیا ہے۔
میر۔ ہوگا۔ آپ کوئی قاضی ہیں۔ یہ لیجیے شہ۔
مرزا۔ حضرت ذرا ٹھہریے، اس وقت بازی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوتی۔ حضور عالی خون کے آنسو روتے جاتے ہوں گے۔ لکھنؤ کا چراغ آج گُل ہوگیا۔
میر۔ رویا ہی چاہیں، یہ عیش قیدِ فرنگ میں کہاں میسّر۔ یہ شہ۔
مرزا۔ کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں جاتے۔ کتنی سخت مصیبت ہے، بلائے آسمانی۔
میر۔ ہاں ہے ہی، پھر کشت بس دوسری کشت میں مات ہے، بچ نہیں سکتے۔
مرزا۔ آپ بڑے بے درد ہیں واللہ! ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہوتا۔ ہائے

حضور جان عالم اب کمال کا کوئی قدرداں نہ رہا۔ لکھنؤ بھی ویران ہوگیا۔

میر۔ پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچائیے پھر حضور پُرنور کا ماتم کیجیے گا۔ یہ کشت اور مات، لانا ہاتھ۔

نواب کو لیے ہوئے فوج سامنے سے نکل گئی، ان کے جاتے ہی مرزا جی نے نئی بازی بچھا دی ہار کی چوٹ بُری ہوتی ہے، میر صاحب نے کہا۔ آیئے نواب صاحب کی حالتِ زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں، لیکن مرزا جی کی وفاداری اور اطاعت شعاری اپنی ہار کے ساتھ غائب ہوگئی تھی۔ وہ شکست کا انتقام لینے کے لیے بے صبر ہو رہے تھے۔

(۴)

شام ہوگئی مسجد کے کھنڈر میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کیا، ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے چمٹ کر نمازِ مغرب ادا کرنے لگیں، دونوں کھلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے، گویا دو خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں۔ مرزا جی متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے اور اس چوتھی بازی کا رنگ بھی اچھا نہ تھا وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کرکے خوب سنبھل کر، طبیعت پر خوب زور دے دے کر کھیلتے تھے لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑجاتی تھی کہ ساری بازی بگڑجاتی، ادھر میر صاحب غزلیں پڑھتے تھے، ٹھمریاں گاتے تھے، چٹکیاں لیتے تھے، آواز کستے تھے، ضلع اور جگت میں کمال دِکھاتے تھے۔ ایسے خوش تھے گویا کوئی دفینہ ہاتھ آگیا ہے، مرزا صاحب ان کی یہ خوش فعلیاں سُن سُن کر جھنجلاتے تھے اور بار بار تیوری چڑھا کر کہتے آپ چال نہ تبدیل کیا کیجیے۔ یہ کیا کہ چال چلے اور فوراً بدل دی جو کچھ کرنا ہو، ایک بار خوب غور کرکے کیجیے۔ جناب آپ میرے مہرے پر انگلی کیوں رکھے رہتے ہیں۔ مہرے کو بے لاگ چھوڑ دیا کیجیے۔ جب تک دل میں چال کا فیصلہ نہ ہوجائے مہرہ کو ہاتھ نہ لگایا کیجیے۔ حضرت آپ ایک ایک چال آدھ آدھ گھنٹے میں کیوں چلتے ہیں۔ اس کی بند نہیں جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگیں اس کی مات سمجھی جائے، پھر آپ نے چال بدلی؟ مہرہ وہیں رکھ دیجیے۔

میر صاحب کا فرزی پٹا جاتا تھا، بولے میں نے چال چلی کب تھی؟

مرزا۔ آپ کی چال ہوچکی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ مہرہ اسی گھر میں رکھ دیجیے۔

میر۔ اُس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے مہرے کو ہاتھ سے چھوڑا کب تھا؟

مرزا۔ آپ قیامت تک مہرے کو نہ چھوڑیں تو کیا چال ہی نہ ہوگی۔ فرزی پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔

میر۔ دھاندلی آپ کرتے ہیں ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے، دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتا۔

مرزا۔ یہ بازی آپ کی مات ہوگئی۔

میر۔ میری مات کیوں ہونے لگی۔

مرزا۔ تو آپ مہرہ اُسی گھر میں رکھ دیجیے جہاں پہلے رکھا تھا۔

میر۔ وہاں کیوں رکھوں، نہیں رکھتا۔

مرزا۔ آپ کو رکھنا پڑے گا۔

میر۔ ہرگز نہیں۔

مرزا۔ رکھیں گے تو آپ کے فرشتے۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔

بات بڑھ گئی۔ دونوں اپنی ٹیک کے دھنی تھے، نہ یہ دبتا تھا نہ وہ۔ تکرار میں لامحالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں جن کا منشاء ذلیل اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔ مرزا جی نے فرمایا، اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلا ہوتا تو آپ آئین اور قاعدے سے واقف ہوتے، وہ ہمیشہ گھانس چھیلا کیے آپ کیا کھاکر شطرنج کھیلیے گا۔ ریاست شے دیگر ہے۔ جاگیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہوجاتا۔

میر۔ گھانس آپ کے ابّا جان چھیلتے ہوں گے، یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑھیاں اور پشتیں گزر گئیں۔

مرزا۔ اجی جائیے۔ نواب غازی الدین کے یہاں باورچی گری کرتے کرتے عمر گزر گئی۔ اس طفیل میں جاگیر پاگئے۔ آج رئیس بننے کا شوق چرایا ہے۔ رئیس بننا دل لگی نہیں ہے۔

میر۔ کیوں اپنے بزرگوں کے منہ میں کالکھ لگا رہے ہو۔ وہی باورچی رہے ہوں گے۔ ہمارے بزرگ تو نواب کے دسترخوان پر بیٹھتے تھے ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔

مرزا۔ بے حیاؤں کو شرم بھی نہیں آتی۔

میر۔ زبان سنبھالیے ورنہ بُرا ہوگا۔ یہاں ایسی باتیں سُننے کا عادی نہیں ہیں۔ کسی نے آنکھ

دکھائی اور ہم نے دیا تلا ہوا ہاتھ۔ بھنڈارا کھل گیا ہے۔

مرزا۔ آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے، تو سنبھل جایئے۔ تقدیر آزمائی ہوجائے ادھر یا ادھر۔

میر۔ ہاں ہاں آجاؤ۔ تم سے دبتا کون ہے۔

دونوں دوستوں نے کمر سے تلواریں نکال لیں۔ ادنیٰ و اعلیٰ سبھی کٹار خنجر پیش قبض شیر بچہ باندھتے تھے، دونوں عیش کے بندے تھے مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری ان میں عنقا تھی مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کر بھر ہوئی تھی۔ ان کے سیاسی جذبات فنا ہوگئے تھے۔ بادشاہ کے لیے، سلطنت کے لیے، قوم کے لیے کیوں مریں؟ کیوں اپنی میٹھی نیند میں خلل ڈالیں مگر انفرادی جذبات میں مطلق خوف نہ تھا بلکہ وہ قوی تر ہوگئے تھے۔ دونوں نے پیترے بدلے لکڑی اور گتکہ کھیلے ہوئے تھے۔ تلواریں چمکیں۔ چھپا جھپ کی آواز آئی، اور دونوں زخم کھا کر گر پڑے، دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اپنے بادشاہ کے لیے جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری۔ انھیں دونوں آدمیوں نے شطرنج کے وزیر کے لیے اپنی گردنیں کٹا دیں۔

اندھیرا ہوگیا تھا بازی بچھی ہوئی تھی دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے ان پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے ہیں۔

چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی بوسیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگورے اور سربسجود مینار ان لاشوں کو دیکھتے تھے اور انسانی زندگی کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے جس میں سنگ و خشت کا ثبات بھی نہیں۔

یہ افسانہ ہندی ماہ نامہ مادھوری اکتوبر1924 میں شائع ہوا اور اردو میں زمانہ کانپور دسمبر 1924 میں شائع ہوا، ہندی میں مان سرو ور3 اور اردو میں خواب و خیال میں شامل ہے۔

سوا سیر گیہوں

کسی گاؤں میں شنکر نامی ایک کورمی کسان رہتا تھا۔ سیدھا سادہ غریب آدمی تھا، اپنے کام سے کام، نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں۔ چھکّا پنجا نہ جانتا تھا، چھل کپٹ کی اُسے چھوت بھی نہ لگی تھی، ٹھگے جانے کی فکر نہ تھی۔ وڈیا نہ جانتا تھا، کھانا ملا تو کھا لیا نہ ملا تو چربن پر قناعت کی۔ چربن بھی نہ ملا تو پانی پی لیا اور رام کا نام لے کر سو رہا۔ مگر جب کوئی مہمان دروازے پر آجاتا تھا تو اُسے یہ غنا کا راستہ ترک کردینا پڑتا تھا، خصوصاً جب کوئی سادھو مہاتما آجاتے تھے تو اُسے لازماً دنیاوی باتوں کا سہارا لینا پڑتا۔ خود بھوکا سو سکتا تھا۔ مگر سادھو کو کیسے بھوکا سُلاتا۔ بھگوان کے بھگت ٹھہرے۔

ایک روز شام کو ایک مہاتما نے آکر اُس کے دروازے پر ڈیرا جمایا۔ چہرہ پُر جلال تھا، پیتامبر گلے میں، جٹا سر پر، پیتل کا کمنڈل ہاتھ میں، کھڑاؤں پیر میں، عینک آنکھوں پر، غرضیکہ پورا بھیس اُن مہاتماؤں کا سا تھا جو رؤسا کے محلوں میں ریاضت، ہوا گاڑیوں پر مندروں کا طواف اور یوگ (مراقبہ) میں کمال حاصل کرنے کے لیے لذیذ غذائیں کھاتے ہیں! گھر میں جو کا آٹا تھا، وہ انھیں کیسے کھلاتا؟ زمانۂ قدیم میں جَو کی خواہ کچھ اہمیت رہی ہو۔ مگر زمانۂ حال میں جَو کی خورش مہاتما لوگوں کے لیے ثقیل اور دیر ہضم ہوتی ہے۔ بڑی فکر ہوئی کہ مہاتما جی کو کیا کھلاؤں؟ آخر طے کیا کہ کہیں سے گیہوں کا آٹا اُدھار لاؤں، گاؤں بھر میں گیہوں کا آٹا نہ ملا۔ گاؤں بھر میں سب آدمی ہی آدمی تھے، دیوتا ایک بھی نہ تھا، پس وہاں دیوتاؤں کی خورش کیسے ملتی؟ خوش قسمتی سے گاؤں کے پروہت جی کے یہاں تھوڑے سے گیہوں مل گئے۔ اُن سے سوا سیر گیہوں اُدھار لیے اور بیوی سے کہا کہ پیس دے۔ مہاتما نے کھایا۔ لمبی تان کر سوئے اور صبح آشرواد دے کر اپنا راستہ لیا۔

پروہت جی سال میں دو بار کھلیانی لیا کرتے تھے۔ شنکر نے دل میں کہا کہ سوا سیر گیہوں کیا لوٹاؤں پنسیری کے بدلے کچھ زیادہ کھلیانی دے دوں گا۔ یہ بھی سمجھ جائیں گے، میں بھی سمجھ جاؤں گا۔ چیت میں جب پروہت جی پہنچے تو انھیں ڈیڑھ پنسیری کے قریب

گیہوں دے دیا۔ اور اپنے کو سبکدوش سمجھ کر اس کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ پروہت جی نے بھی پھر کبھی نہ مانگا۔ سیدھے سادے شنکر کو کیا معلوم تھا کہ یہ سوا سیر گیہوں چکانے کے لیے مجھے دوبارہ جنم لینا پڑے گا؟

سات سال گزر گئے۔ پروہت جی برہمن سے مہاجن ہوئے، شنکر کسان سے مزدور ہوگیا۔ اس کا چھوٹا بھائی منگل اس سے الگ ہوگیا تھا۔ ایک ساتھ رہ کر دونوں کسان تھے، الگ ہوکر دونوں مزدور ہوگئے تھے۔ شنکر نے بہت چاہا کہ نفاق کی آگ بھڑکنے نہ پاوے۔ مگر حالات نے اس کو مجبور کردیا۔ جس وقت الگ چولھے جلے وہ پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ آج سے بھائی بھائی دشمن ہوجائیں گے۔ ایک روئے گا، دوسرا ہنسے گا، ایک کے گھر غمی ہوگی تو دوسرے کے گھر گلگلے پکیں گے۔ محبت کا رشتہ، خون کا رشتہ، دودھ کا رشتہ، آج ٹوٹا جاتا ہے۔ اُس نے سخت محنت کرکے خاندانی عزت کا یہ درخت لگایا تھا، اُسے اپنے خون سے سینچا تھا، اس کا جڑ سے اُکھڑنا دیکھ کر اُس کے دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔ سات روز تک اُس نے دانے کی صورت بھی نہ دیکھی۔ دن بھر جیٹھ کی دھوپ میں کام کرتا اور رات میں منہ لپیٹ کر سو رہتا۔ اس سخت رنج اور ناقابل برداشت تکلیف نے خون کو جلا دیا، گوشت اور چربی کو گھلا دیا، بیمار پڑا تو مہینوں چارپائی سے نہ اُٹھا۔ اب گزر بسر کیسے ہو؟ پانچ بیگھے کے آدھے کھیت رہ گئے۔ ایک بیل رہ گیا کھیتی کیا خاک ہوتی؟ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ کھیتی صرف نام بھر رہ گئی، معاش کا سارا بار مزدوری پر آپڑا۔

سات سال گزر گئے۔ ایک دن شنکر مزدوری کرکے لوٹا تو راستہ میں پروہت جی نے ٹوک کر کہا۔ شنکر کل آکے اپنے بیج بینک کا حساب کر لے۔ تیرے یہاں ساڑھے پانچ من گیہوں کب سے باقی پڑے ہیں۔ اور تو دینے کا نام نہیں لیتا۔ کیا ہضم کرنے کی نیت ہے کیا؟

شنکر نے تعجب سے کہا۔ میں نے تم سے کب گیہوں لیے تھے جو ساڑھے پانچ من ہوگئے؟ تم بھولتے ہو۔ میرے یہاں نہ کسی کا چھٹانک بھر اناج ہے، نہ ایک پیسہ اُدھار۔

پروہت۔ اسی نیت کا تو یہ پھل بھوگ رہے ہو کہ کھانے کو نہیں جڑتا۔

یہ کہہ کر پروہت جی نے اُس سوا سیر گیہوں کا ذکر کیا جو آج سے سات سال قبل شنکر کو دیئے تھے۔ شنکر سن کر ساکت رہ گیا۔ ایشور میں نے انھیں کتنی بار کھلیانی دی،

انھوں نے میرا کون سا کام کیا، جب پوتھی پترا دیکھنے، ساعت شگون بچارنے دوار پر آتے تھے تو کچھ نہ کچھ دچھنا لے ہی جاتے تھے۔ اتنا سوارتھ ! سوا سیر اناج کو انڈے کی طرح سے کر آج یہ بھوت کھڑا کردیا جو مجھے نگل ہی جائے۔ اتنے دنوں میں ایک بار بھی کہہ دیتے تو میں گیہوں دے ہی دیتا۔ کیا اسی نیت سے چپ بیٹھے رہے؟ بولا۔ مہاراج نام لے کر تو میں نے اتنا اناج نہیں دیا، مگر کئی بار کھلیانی میں سیر دو دو سیر دے دیا ہے۔ اب آج ساڑھے پانچ من مانگتے ہیں، میں کہاں سے دوں گا؟

پروہت۔ لیکھا جو جو۔ بکسیس سَو سَو، تم نے جو کچھ دیا ہوگا کھلیانی میں دیا ہوگا، اُس کا کوئی حساب نہیں چاہے ایک کی جگہ چار پنسیری دے دو، تمھارے نام ہی میں ساڑھے پانچ من لکھا ہوا ہے۔ جس سے چاہے حساب لگوا لو۔ دے دو تو تمھارا نام جھیک (کاٹ) دوں، نہیں تو اور بڑھتا رہے گا۔

شنکر۔ پانڈے! کیوں ایک غریب کو ستاتے ہو؟ میرے کھانے کا ٹھکانا نہیں، اتنا گیہوں کس کے گھر سے دوں گا؟

پروہت۔ جس کے گھر سے چاہے لاؤ، میں چھٹانک بھر بھی نہ چھوڑوں گا۔ یہاں نہ دوگے، بھگوان کے گھر تو دوگے؟

شنکر کانپ اُٹھا۔ ہم پڑھے لکھے لوگ ہوتے تو کہہ دیتے ”اچھی بات ہے، ایشور کے گھر ہی دیں گے، وہاں کی تول یہاں سے کچھ بڑی تو نہ ہوگی۔ کم سے کم اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں پھر اس کی کیا فکر؟“ مگر شنکر اتنا عقل مند، اتنا چالاک نہ تھا۔ ایک تو قرض وہ بھی برہمن کا! بہی میں نام رہے گا تو سیدھے نرک میں جاؤں گا۔ اس خیال سے ہی اُس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ بولا۔ مہاراج تمھارا جتنا ہوگا، یہیں دوں گا۔ ایشور کے یہاں کیوں دوں؟ اس جنم میں تو ٹھوکر کھا ہی رہا ہوں، اُس جنم کے لیے کیوں کانٹے بوؤں؟ مگر یہ کوئی نیاؤ نہیں ہے۔ تم نے رائی کا پربت بنا دیا، برہمن ہوکے تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اُسی گھڑی تگادا کرکے لے لیا ہوتا تو آج میرے اوپر اتنا بڑا بوجھ کیوں پڑتا؟ میں تو دے دوں گا۔ لیکن تمھیں بھگوان کے یہاں جواب دینا پڑے گا۔

پروہت۔ وہاں کا ڈر تمھیں ہوگا، مجھے کیوں ہونے لگا؟ وہاں تو سب اپنے بھائی بند ہیں۔ رشی منی سب تو برہمن ہی ہیں۔ جو کچھ بنے بگڑے گی، سنبھال لیں گے تو کب

دیتے ہو؟

شنکر۔ میرے پاس دھرا تو ہے نہیں، کسی سے مانگ چانگ کر لاؤں گا تبھی دوں گا۔

پروہت۔ میں یہ نہ مانوں گا۔ سات سال ہوگئے۔ اب ایک دن کا بھی ملاحظہ نہ کروں گا۔ گیہوں نہیں دے سکتے تو دستاویز لکھ دو۔

شنکر۔ مجھے تو دینا ہے۔ چاہے گیہوں لو۔ چاہے دستاویز لکھاؤ۔ کس حساب سے دام رکھوگے؟

پروہت۔ بازار جاؤ، پانچ سیر کا ہے، تمھیں سوا پانچ سیر کا کاٹ دوں گا؟

شنکر۔ جب دے ہی رہا ہوں تو باجار بھاؤ کاٹوں گا۔ پاؤ بھر چھڑا کر کیوں بُرا بنوں؟

حساب لگایا گیا تو گیہوں کی قیمت ساٹھ روپے ہوئی۔ ساٹھ کا دستاویز لکھا گیا، تین روپیہ سیکڑہ سود۔ سال بھر میں نہ دینے پر سود کی شرح ساڑھے تین روپے سیکڑہ۔ آٹھ آنے کا اسٹامپ، ایک روپیہ دستاویز کی تحریر شنکر کو علاوہ دینی پڑی۔

سارے گاؤں نے پروہت جی کی مذمت کی مگر سامنے نہیں، مہاجن سے سبھی کا کام پڑتا ہے۔ اُس کے منہ کون لگے؟

شنکر نے سال بھر تک سخت ریاضت کی۔ میعاد سے قبل اس نے روپے ادا کرنے کا برت سا کر لیا۔ دوپہر کو پہلے بھی چولھا نہ جلتا تھا۔ صرف چربن پر بسر ہوتی تھی اب وہ بھی بند ہوا۔ صرف لڑکے کے لیے رات کو روٹیاں رکھ دی جاتیں۔ ایک پیسہ روز کی تمباکو پی جاتا تھا۔ یہی ایک لت تھی جسے وہ کبھی نہ چھوڑ سکا تھا۔ اب وہ بھی اس کٹھن برت کے بھینٹ ہوگئی۔ اُس نے چلم پٹک دی۔ حقّہ توڑ دیا اور تمباکو کی ہانڈی چور چور کر ڈالی۔ کپڑے پہلے بھی ترک کے انتہائی حد تک پہنچ چکے تھے، اب وہ باریک ترین قدرتی کپڑوں میں منسلک ہوگئے۔ ماگھ کی ہڈیوں تک میں سرایت کرجانے والی سردی کو اُس نے آگ کے سہارے کاٹ دیا۔ اس اٹل ارادہ کا نتیجہ اُمید سے بڑھ کر نکلا۔ سال کے آخر تک اُس کے پاس ساٹھ روپے جمع ہوگئے۔ اس نے سمجھا کہ پنڈت جی کو اتنے روپے دے دوں گا اور کہوں گا، مہاراج باقی روپے بھی جلد ہی آپ کے سامنے حاضر کروں گا۔ پندرہ کی تو اور بات ہے۔ کیا پنڈت جی اتنا بھی نہ مانے گا؟ اس نے روپے لیے اور لے جاکر پنڈت جی کے قدموں پر رکھ دیے۔

پنڈت جی نے متعجب ہوکر پوچھا۔ کسی سے اُدھار لیے کیا؟

شنکر۔ نہیں مہاراج ! آپ کی اسیس سے اب کی مجوری اچھی ملی۔

پنڈت۔ لیکن یہ تو ساٹھ ہی ہیں۔

شنکر۔ ہاں مہاراج، اتنے ابھی لے لیجیے باقی میں دو تین مہینے میں دے دوں گا۔ مجھے اُرن کر دیجیے۔

پنڈت۔ اُرن تو جبھی ہو گے جب میری کوڑی کوڑی چکا دو گے۔ جاکر میرے پندرہ اور لاؤ۔

شنکر۔ مہاراج۔ اتنی دَیا کرو۔ اب سانجھ کی روٹیوں کا بھی ٹھکانا نہیں ہے۔ گاؤں میں ہوں تو کبھی نہ کبھی دے ہی دوں گا۔

پنڈت۔ میں یہ روگ نہیں پالتا۔ نہ بہت باتیں کرنا جانتا ہوں۔ اگر میرے پورے روپے نہ ملیں گے تو آج سے بڑھے تیں روپے سیکڑہ کا بیاج چلے گا۔ اتنے روپے چاہے اپنے گھر میں رکھو چاہے میرے یہاں چھوڑ جاؤ۔

شنکر۔ اچھا، جتنا لایا ہوں اتنا رکھ لیجیے۔ میں جاتا ہوں کہیں سے پندرہ اور لانے کی پھکر کرتا ہوں۔

شنکر نے سارا گاؤں چھان مارا مگر کسی نے روپے نہ دیے۔ اس لیے نہیں کہ اس کا اعتبار نہ تھا، یا کسی کے پاس روپے نہ تھے بلکہ پنڈت جی کے شکار کو چھیڑنے کی کسی کو ہمت نہ تھی۔

عمل کے بعد ردعمل کا قاعدہ قدرتی ہے۔ شنکر سال بھر تک تپسیا کرنے پر بھی جب قرض بے باق کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اُس کی احتیاط مایوسی کی شکل میں تبدیل ہوگئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ جب اتنی تکلیف اُٹھانے پر بھی سال بھر میں ساٹھ روپے سے زیادہ نہ جمع کرسکا تو اب اور کون سا اُپائے ہے جس سے اُس کے دونے روپے جمع ہوں۔ جب سر پر قرض کا بوجھ ہی لدنا ہے تو کیا من بھر اور کیا سوا من کا، اُس کی ہمت پست ہوگئی۔ محنت سے نفرت ہوگئی۔ امید ہی حوصلہ پیدا کرنے والی ہے۔ امید رونق ہے، طاقت ہے، زندگی ہے۔ امید ہی دنیا کے متحرک کرنے والی قوت ہے۔ شنکر مایوس ہوکر بے پروا ہوگیا۔ وہ ضرورتیں جن کو اُس نے سال بھر تک ٹال رکھا تھا، اب دروازے پر کھڑی ہونے والی بھکارنیں نہ تھیں بلکہ سر پر سوار ہونے والی چڑیلیں تھیں جو اپنا چڑھاوا لیے بغیر جان ہی نہیں چھوڑتیں۔ کپڑوں میں پیوند لگنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب شنکر کو حساب ملتا تو

وہ روپے جمع نہ کرتا۔ کبھی کپڑے لاتا اور کبھی کوئی کھانے کی چیز جہاں پہلے تمباکو ہی پیا کرتا تھا، وہاں اب گانجہ اور چرس کا چسکا بھی لگا۔ اُسے اب روپے ادا کرنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ گویا اُس پر کسی کا ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ پہلے لرزہ آجانے پر بھی وہ کام کرنے ضرور جاتا تھا اب کام پر نہ جانے کا بہانا تلاش کیا کرتا تھا۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ پنڈت جی مہاراج نے ایک بار بھی تقاضہ نہ کیا۔ وہ ہوشیار شکاری کی طرح تیر بہ ہدف نشانہ لگانا چاہتے تھے، پہلے سے شکار کو بھڑکا دینا اُن کے شیوہ کے خلاف تھا۔

ایک روز پنڈت جی شنکر کو بلایا۔ حساب دکھایا۔ ساٹھ روپے جو جمع تھے وہ منہا کرنے پر اب بھی شنکر کے ذمہ ایک سو بیس روپے نکلے؟

اتنے روپے تو اُسی جنم میں دوں گا۔ اس جنم میں نہیں ہو سکتا۔

پنڈت۔ میں اسی جنم میں لوں گا۔ اصل نہ سہی، سود تو دینا ہی پڑے گا۔

شنکر۔ ایک بیل ہے وہ لے لیجیے۔ ایک جھونپڑی ہے وہ لے لیجیے۔ اور میرے پاس رکھا کیا ہے؟

پنڈت۔ مجھے بیل بدھیا لے کر کیا کرنا ہے۔ مجھے دینے کو تمھارے پاس بہت کچھ ہے۔

شنکر۔ اور کیا ہے، مہاراج!

پنڈت۔ کچھ نہیں ہے۔ تم تو ہو؟ آخر تم بھی کہیں مزدوری کرنے جاتے ہی ہو، مجھے بھی کھیتی کے لیے ایک مزدور رکھنا ہی پڑتا ہے۔ سود میں تم ہمارے یہاں کام کیا کرو۔ جب سبیتھا ہو اصل بھی دے دینا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تم کسی دوسری جگہ کام کرنے نہیں جاسکتے۔ جب تک میرے روپے نہ چکا دو۔ تمھارے پاس کوئی جائداد نہیں ہے، اتنی بڑی گٹھری میں کس اعتبار پر چھوڑ دوں؟ کون اس کا ذمہ لے گا تم مجھے مہینے مہینے سُود دیتے جاؤ گے؟ اور کہیں کما کر جب تم مجھے سود بھی نہیں دے سکتے تو اصل کی کون کہے؟

شنکر۔ مہاراج، سود میں تو کام کروں گا اور کھاؤں گا کیا؟

پنڈت۔ تمھاری گھر والی ہے، لڑکے ہیں، کیا وہ ہاتھ پیر کٹا کر بیٹھیں گے؟ تمھیں آدھ سیر جَو روز چربن کے لیے دے دیا کروں گا۔ اوڑھنے کو سال میں کمل پاجاؤ گے۔

ایک سلوکا بھی بنوا دیا کروں گا۔ اور کیا چاہیے؟ یہ سچ ہے کہ اور لوگ تمھیں چھ آنے روز دیتے ہیں۔ لیکن مجھے ایسی غرض نہیں ہے۔ میں تو تمھیں اپنے روپے بھرانے کے لیے رکھتا ہوں۔

شنکر نے کچھ دیر تک گہرے سوچ میں پڑے رہنے کے بعد کہا۔ مہاراج، یہ تو جنم بھر کی گلامی ہوئی۔

پنڈت۔ گلامی سمجھو چاہے مجبوری سمجھو، میں اپنے روپے بھرائے بِنا تمھیں نہیں چھوڑوں گا۔ تم بھاگو گے تو تمھارا لڑکا بھرے گا۔ ہاں جب کوئی نہ رہے گا، تب کی بات دوسری ہے۔

اس فیصلہ کی کہیں اپیل نہ تھی۔ مزدور کی ضمانت کون کرتا؟ کہیں پناہ نہ تھی، بھاگ کر کہاں جاتا؟ دوسرے روز سے اُس نے پنڈت جی کے یہاں کا کام کرنا شروع کر دیا۔ سوا سیر گیہوں کی بدولت عمر بھر کے لیے غلامی کی بیڑیاں پاؤں میں ڈالنی پڑیں۔ اُس بدنصیب کو اب اگر کسی خیال سے تسکین ہوتی تھی تو اسی سے کہ یہ سب میرے پچھلے جنم کا بھوگ ہے۔ عورت کو وہ کام کرنے پڑتے تھے جو اس نے کبھی نہ کیے تھے۔ بچّے دانہ دانہ کو ترستے تھے۔ لیکن شنکر چپ دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کرسکتا تھا، وہ گیہوں کے دانے کسی دیوتا کی بددعا کی طرح تمام عمر اُس کے سر سے نہ اُترے۔

شنکر نے پنڈت جی کے یہاں بیس برس تک غلامی کرنے کے بعد اس غم کدہ سے رحلت کی۔ ایک سو بیس ابھی تک اُس کے سر پر سوار تھے۔ پنڈت جی نے اس غریب کو ایشور کے دربار میں تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا وہ اتنے بے درد اور بے انصاف نہ تھے۔ پس اُنھوں نے اُس کے جوان بیٹے کی گردن پکڑی۔ آج تک وہ پنڈت جی کے یہاں کام کرتا ہے۔ اُس کا اُودھار کب ہوگا، ہوگا بھی یا نہیں، ایشور ہی جانے۔

ناظرین! اس قصّہ کو فرضی نہ سمجھیے۔ یہ سچّا واقعہ ہے۔ ایسے شنکروں اور ایسے پروہتوں سے دنیا خالی نہیں ہے۔

یہ افسانہ پہلی بار ماہنامہ 'چاند' کے نومبر1924 کے شارہ میں شائع ہوا۔ ہندی میں مان سرودر 4 اور اردو میں 'فردوس خیال' میں شامل ہے۔

مایۂ تفریح

کالجوں میں جتنی خوش فعلیاں ہوتی رہتی ہیں اگر ان کا سرمایہ فراہم کیا جائے تو نہایت دلچسپ ہو۔ وہاں بیشتر طلبا معاش کی فکر سے آزاد ہوتے ہیں۔ بعض تو امتحان کی فکر سے بھی آزاد ہوتے ہیں۔ اُنھیں خوش وقتی، خوش گپی اور خوش گزاری کے سوا وہاں اور کوئی شغل نہیں رہتا، اس کا عملی جوش کبھی کالج کے ڈرامیٹک کلب میں ظاہر ہوتا ہے۔ کبھی خاص تقریبوں کے موقعہ پر، باقی وقت اپنے اور اپنے احباب کے لیے سامانِ تفریح مہیّا کرنے میں صرف ہوتا ہے۔ کالج میں جہاں کسی صاحب نے کسی خاص صیغہ میں غیر معمولی انہاک کا اظہار کیا! بہ استثناء کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال، اور وہ مایۂ تفریح بنا۔ اگر کوئی صاحب دھرم کرم کے بڑے پابند ہیں اور پاٹ کرنے میں منہمک رہتے ہیں، بلا ناغہ نمازیں ادا کرتے ہیں۔ تو انھیں مایۂ تفریح بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اگر کوئی صاحب کتابوں کے عاشق ہیں مطالعہ میں سعیٔ بلیغ کرتے ہیں تو سمجھ لیجیے ان کی تضحیک کے لیے کسی گوشہ میں سازشیں ہو رہی ہیں۔ الغرض کالج میں آزاد منش، آزاد رو، کھلے، دبے آدمیوں کے لیے کوئی وقت نہیں۔ ان سے کوئی مزاحم نہیں ہوتا۔ لیکن ملّاؤں اور پنڈتوں کی وہاں مٹی خراب ہے۔

مہاشے چکردھر الہ آباد کے ایک ممتاز کالج کے طالب علم تھے۔ ایم۔ اے۔ کلاس میں فلسفہ پڑھتے تھے۔ مگر عالم با عمل کے مصداق مزخرفات اور مکروہات سے کوسوں بھاگتے تھے۔ قومیت کے نشے میں مخمور رہتے ہندو معیار تہذیب کی سادگی اور پاکیزگی پر جان دیتے تھے۔ نکٹائی، کالر، واسکٹ وغیرہ سے انھیں دلی نفرت تھی۔ سیدھا سادھا موٹا کرتا پہنتے اور چرودھے جوتے پر قناعت کرتے تھے۔ صبح اُٹھ کر روزانہ سندھیا اور ہون کرتے تھے اور پیشانی پر چندن کا ٹیکہ بھی لگایا کرتے تھے۔ سر گھٹاتے تھے مگر لمبی چوٹی رکھ چھوڑی تھی جو چٹیل میدان کے کسی جھنکاڑ درخت کی طرح نمایاں تھی۔ ان کا دعویٰ تھا کہ چوٹی رکھنے میں قدیم ہندو رشیوں نے اپنی ہمہ دانی کا روشن ثبوت دیا ہے۔ چوٹی کے راستے جسم کی

غیر ضروری اور مضر حرارت خارج ہوتی رہتی ہے۔ اور مقناطیسی اثرات جسم کے اندر نفوذ کرتے ہیں۔ کھانا ہمیشہ اپنے ہاتھ سے پکا کر کھاتے اور بہت زود ہضم اور سادہ، ان کا قول تھا کہ غذا کا اخلاقی نشو و نما پر بہت نمایاں اثر پڑتا ہے۔ غیر قومی چیزوں سے کمال احتراز کرتے تھے کبھی کرکٹ یا ہاکی کے قریب نہ جاتے، انگریزی تہذیب کو عیوب سے پُر سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ انگریزی لکھنے اور بولنے میں بھی حتی الامکان تامل کرتے تھے۔ جس کا اثر یہ تھا کہ ان کی انگریزی بہت کمزور تھی اور سیدھا سا خط بھی مشکل سے لکھ سکتے تھے۔ اگر ان میں کوئی شوق تھا تو پان کا۔ اس کے اوصاف کے قائل تھے اور سنسکرت اشلوکوں سے اپنے دعویٰ کی تائید کرتے تھے۔

کالج کے بے فکروں کو اتنا صبر کہاں کہ ایسا شکار دیکھیں اور اُس پر نشانہ نہ ماریں۔ آپس میں سرگوشیاں ہونے لگیں کہ اس موذی کو سیدھے راستہ پر لانا چاہیے، کیسا پنڈت بنا پھرتا ہے، کسی کو خیال ہی میں نہیں لاتا، اپنے سوا اور سب کو قومیت سے خارج، انسانیت سے عاری سمجھتا ہے۔ اس کی ایسی مٹی پلید کرو کہ یہ سارا افلاطونی پن بھول جائے۔

حسنِ اتفاق سے موقع بھی اچھا ملا۔ کالج کھلنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ایک اینگلو انڈین نازنین فلسفہ کے کلاس میں شریک ہوئی۔ سیب کا شگفتہ رنگ۔ بھرا ہوا بدن۔ بیباک نگاہیں۔ توبہ شکن تبسم۔ اُس پر خوش رنگ پوشاک۔ جماعت کے لڑکوں کو دل بستگی کا سامان ہاتھ آیا لوگ تاریخ اور زبان چھوڑ چھوڑ کر فلسفہ کی جماعت میں شریک ہونے لگے۔ سب کی نگاہیں اسی ماہ رو کی طرف لگی رہتی تھیں، سب اس کی ایک نگاہ ناز کے متمنی، اس کی ایک نوائے شیریں کے شیدا تھے۔ مگر جیسا قاعدہ ہے محتاط دلوں پر حُسن کا جادو جب چل جاتا ہے تو پھر وارا نیارا کر کے چھوڑتا ہے۔ اور لوگ تو نظارہ بازی میں محو رہتے تھے مگر پنڈت چکر دھر اشتیاق سے بے قرار، جذبۂ صادق سے دل ریش، روئے یار کی طرف تاکتے بھی جھجکتے تھے۔ کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑجائے تو اس تلک اور چوٹی پر پھبتیاں اُڑنے لگیں۔ نہایت گرسنہ نگاہوں سے دیکھ لیتے مگر آنکھیں چُرائے ہوئے، سر جھکائے ہوئے کہ کہیں پردہ فاش نہ ہوجائے۔ راز طشت از بام نہ ہوجائے۔

مگر دائی سے پیٹ کیا چھپے گا۔ یاروں نے پنڈت جی کی محبت کی نظر پہچان ہی لی۔ منہ مانگی مراد پائی، باچھیں کھل گئیں۔ ان سے دو صاحبوں نے راہ و رسم بڑھانی شروع کی۔

رابطہ اتحاد مضبوط کیا، جب سمجھ گئے کہ ان پر ہمارا اعتبار جم گیا شکار نشانہ کی زد میں ہے تو ایک روز دونوں نے بیٹھ کر لیڈیوں کے انداز میں پنڈت جی کے نام یہ خط لکھا۔

مائی ڈیر چکردھر۔ بہت دنوں سے ارادہ کر رہی ہوں کہ آپ کو خط لکھوں۔ پر اس خوف سے کہ آپ مجھے اپنے دل میں بیباک سمجھیں گے، اب تک ضبط کرتی رہی لیکن اب نہیں رہا جاتا، آپ نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو کردیا ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کی صورت نگاہ سے نہیں اُترتی۔ آپ کی زاہدانہ صورت اور نورانی سَر اور سادہ پوشش ہر دم آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی ہے، مجھے طبعاً تکلف سے نفرت ہے اور یہاں جسے دیکھتی ہوں تکلف اور تصنع کے رنگ میں ڈوبا پاتی ہوں۔ جسے دیکھیے میرے عشق کا دم بھرتا ہے۔ پر میں ان عشاق سے خوب واقف ہوں۔ یہ سب کے سب نظرباز شہدے ہیں۔ صرف آپ ایک ایسے وجود ہیں، جس میں مجھے جذبۂ صادق اور دل دردمند کی جھلک نظر آتی ہے۔ کیا میرا یہ خیال غلط ہے؟

بار بار جی چاہتا ہے کہ آپ سے کچھ باتیں کرتی۔ مگر آپ مجھ سے اس قدر دور بیٹھتے ہیں کہ گفتگو کا مطلق موقعہ نہیں ہوتا۔ براہِ خدا کل سے میرے قریب بیٹھا کیجیے اور کچھ نہ سہی تو آپ کے قریب ہی سے میرے دل پُرارمان کو تشفی ہوتی رہے گی۔

اس خط کو پڑھ کر چاک کردیجیے گا، اور اس کا جواب لکھ کر لائبریری میں تیسری الماری کے نیچے رکھ دیجیے گا۔

آپ کی

"لوسی"

یہ خط ڈاک میں ڈال دیا گیا اور لوگ بہ نظر غائر دیکھنے لگے کہ اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ انھیں زیادہ انتظار کی زحمت نہ اُٹھانی پڑی دوسرے ہی دن کالج میں آکر پنڈت جی کو لوسی کے بغل میں بیٹھنے کی فکر ہوئی۔ وہی دونوں حضرات جنھوں نے اُن سے راہ و رسم پیدا کی تھی لوسی کے قریب بیٹھا کرتے تھے۔ ایک صاحب کا نام تھا گرور سہائے اور

دوسرے صاحب کا مرزا نعیم اللہ۔ چکردھر نے جاکر گرور سہائے سے کہا یار تم میری جگہ جا بیٹھو مجھے یہاں بیٹھنے دو۔

نعیم۔ کیوں؟ آپ کو کچھ رشک ہوتا ہے کیا؟

چکردھر۔ رشک وشک نہیں، وہاں پروفیسر صاحب کا لکچر سنائی نہیں دیتا۔ میری سماعت میں ذرا فرق ہے۔

گرور۔ آپ کی سماعت میں کب سے فرق آگیا۔ پہلے تو آپ کو یہ شکایت نہ تھی۔

نعیم۔ اور پھر پروفیسر صاحب تو یہاں سے اور دور ہوجائیں گے۔

چکردھر۔ دور ہوجائیں گے تو کیا یہاں اچھا رہے گا، مجھے کبھی کبھی جھپکیاں آجاتی ہیں۔ سامنے بیٹھتے خوف ہوتا ہے کہ کہیں ان کی نگاہ نہ پڑجائے۔

نعیم۔ اچھی بات ہے بیٹھیے، مگر یہ سمجھ لیجیے کہ میں انتہائی نفس کشی سے کام لے رہا ہوں کوئی دوسرا لاکھ روپے بھی دیتا تو یہ جگہ نہ چھوڑتا۔

گرور۔ جناب یہ بہشت ہے بہشت، مگر آپ کی خاطر منظور ہے۔

پنڈت جی بہت ممنون ہوئے اور وہاں جا بیٹھے۔ تھوڑی دیر کے بعد لوسی بھی آکر اپنی جگہ پر جا بیٹھی، اب پنڈت جی بار بار اس کی طرف منتظر نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ کچھ باتیں کرے اور وہ ہے کہ لکچر سننے میں ہمہ تن غرق۔ آپ نے سمجھا شاید شرم مانع ہے۔ اُس کے ٹیبل کی طرف بار بار منہ پھیرنے لگے، اسے ان کے پان چبانے سے شاید نفرت ہوتی تھی، بار بار منہ پھیر لیتی تھی، مگر پنڈت جی کی فکر اتنی رسا نہ تھی۔ اس قدر خوش تھے گویا چرخ ہفتم پر ہیں۔ سب کو رعونت آمیز نظروں سے دیکھتے تھے گویا زبانِ حال سے کہتے تھے۔ تمھیں یہ مقام کہاں نصیب، ایں جانب کا سا بلند اقبال کیا کوئی ہوگا۔

دن تو گزرا، شام کو پنڈت جی خلاف معمول نعیم کے کمرے میں آئے اور بولے کیوں یار ایک لیٹر رائٹر کی ضرورت ہے، کس کا لیٹر رائٹر سب سے اچھا ہے؟

نعیم نے پُر معنی انداز سے پوچھا۔ لیٹر رائٹر لے کر کیا کیجیے گا؟

گرور سہائے۔ فضول، نعیم خود کسی لیٹر رائٹر سے کم ہیں۔

چکردھر (کچھ شرماتے ہوئے) اچھا کوئی محبت آمیز خط لکھا جائے، تو اس کا القاب کیا ہو؟

نعیم۔ ڈارلنگ لکھتے ہیں اور بہت ہی پیارا ہو تو ڈیر ڈارلنگ لکھ سکتے ہیں۔

چکردھر۔ اور خاتمہ کیسے کرنا چاہیے۔

نعیم۔ اگر بہت پیارا معشوق ہو تو لکھیے Your Dying Lover اگر معمولی محبت ہو تو لکھ سکتے ہیں۔Your for ever ۔

چکردھر۔ کچھ آداب بھی تو ضرور ہوگا؟

نعیم۔ بے شک بلا آداب کے بھی کوئی خط ہوتا ہے، اور وہ بھی محبت کا خط، معشوق کے لیے آداب میں بہت پُر اثر لفظوں کی ضرورت ہے آپ لکھ سکتے ہیں۔

God give you ever lasting beauty. May you remain happy and lovely.

پنڈت چکردھر نے رات کو کمرہ بند کرکے خوب بنا بنا کر خط لکھا، اسے عطر میں بسایا اور دوسرے دن اُسے لائبریری میں الماری کے نیچے رکھ آئے، یار لوگ تو تاک میں تھے ہی خط اوڑا لائے اور اُسے مزے لے لیکر پڑھا۔

(۲)

اس واقعہ کے تین دن کے بعد چکردھر کو پھر ایک خط ملا، لکھا تھا۔

مائی ڈیر چکردھر! تمھارا محبت نامہ ملا بار بار آنکھوں سے لگایا، بوسہ دیا۔ آہ! کتنی دل آویز خوشبو تھی، خدا کرے ہماری محبت ہمیشہ ایسی ہی تازہ اور معطر رہے، آپ کو شکایت ہے کہ میں آپ سے باتیں کیوں نہیں کرتی، پیارے محبت باتوں سے نہیں ہوتی دلوں سے ہوتی ہے۔ جب میں تمھاری طرف سے منہ پھیر لیتی ہوں تو میرے دل پر جو کچھ گزرتی ہے وہ میں ہی جانتی ہوں، آپ کو معلوم نہیں کتنی آنکھیں ہر وقت ہماری طرف لگی رہتی ہیں، ذرا بھی شبہ ہوا اور ہمیں دائمی مفارقت کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے بہت احتیاط کی ضرورت ہے، میری تم سے ایک التجا ہے، معاف کرنا، میں تمھیں انگریزی لباس میں دیکھنے کی بہت مشتاق ہو رہی ہوں، یوں تو تم کسی لباس میں رہو میرے پیارے لختِ جگر ہو، خاص کر تمھارا سادہ کُرتا مجھے بہت ہی پیارا معلوم ہوتا ہے مگر بچپن سے جس لباس کے دیکھنے کی عادی ہو رہی ہو

اُسی لباس میں تمھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم مایوس نہ کروگے میں نے تمھارے لیے ایک واسکٹ اپنے ہاتھوں سے سی ہے۔ اُسے میری محبت کی ناچیز نشانی سمجھ کر قبول کرو۔

تمھاری

"لوسی"

خط کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا پیکٹ تھا، واسکٹ اسی میں رکھی ہوئی تھی۔ یاروں نے آپس میں چندہ کرکے بڑی فیاضی سے ۳۵ روپے کی رقم جمع کی تھی۔ پنڈت چکردھر یہ تحفہ اور خط پاکر کتنے باغ باغ ہوئے اس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ کالج میں چھٹی ہوئی تو انھوں نے یہ واسکٹ لاکر اپنے دوستوں کو دِکھایا۔ پھر تو اُس کی سارے بورڈنگ ہاؤس میں نمائش ہوئی۔ لوگوں نے اس کی تراش کی، سلائی کی خوب تعریفیں کیں۔ حالانکہ اُس کا رنگ اتنا شوخ تھا کہ کوئی متین آدمی پہننا گوارا نہ کرتا چکردھر کو لوگوں نے پورب رُخ کھڑا کرکے اچھی ساعت میں یہ واسکٹ زیب تن کرایا۔ آپ ریشہ خطمی ہوگئے جو دیکھتا تھا تعریفوں کے پُل باندھ دیتا تھا۔ برادر تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے بالکل یوسف ثانی معلوم ہوتے ہو۔ کیا چہرہ دمکنے لگا گویا تپایا ہوا کندن ہے۔ ایک واسکٹ پر یہ جوبن ہے۔ کہیں پورا لباس انگریزی ہو تو کیا پوچھنا۔ مسیں لوٹ پوٹ ہوجائیں۔ آخر صلاح ہوئی کہ چل کر ان کے لیے ایک انگریزی سوٹ بنوانا چاہیے، کالج کی ایک جماعت ان کے ساتھ سوٹ خریدنے چلی۔ پنڈت مالدار تھے، ایک انگریزی دُکان سے بیش قیمت سوٹ لیا گیا۔ رات کو اس خوشی میں گانا بجانا ہوا۔ دوسرے دن دس بجے لوگوں نے پنڈت جی کو سوٹ پہنایا۔ آپ اپنی وضعداری کی شان قائم رکھنے کے لیے بولے۔ مجھے تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔ آپ لوگوں کو نہ جانے یہ لباس کیوں پسند ہے۔

نعیم۔ ذرا آئینہ میں صورت دیکھیے تو معلوم ہو، خاصے شہزادے معلوم ہوتے ہو۔ تمھارے حُسن پر ہمیں رشک آتا ہے۔ خدا نے آپ کو ایسا تو حُسن دیا اور اُسے آپ موٹے کرتے میں چھپائے ہوئے تھے۔

چکردھر کو نکٹائی باندھنے کا شعور نہ تھا۔ گرور سہائے سے بولے۔ بھئی اِسے بھی تو بنا دو۔

گرور سہائے نے نکٹائی اتنی سخت باندھی کہ پنڈت جی کو تنفس دشوار ہوگیا تھا۔ ''بولے یار بہت تنگ ہے۔''

گرور۔ اس کا فیشن ہی یہ ہے ہم کیا کریں۔ ڈھیلی ٹائی عیب میں داخل ہے۔

نعیم۔ تم نے پھر بھی ڈھیلی کردی۔ ہم تو اس سے کہیں کس کر باندھتے ہیں۔

چکردھر۔ یہاں تو سانس لینی مشکل ہے۔

نعیم۔ اور ٹائی کا منشا کیا ہے، اسی لیے تو باندھی جاتی ہے کہ آدمی زور زور سے سانس نہ لے۔

چکردھر کی جان عذاب میں تھی۔ آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ چہرہ بھی سُرخ ہوگیا تھا مگر ٹائی کو ڈھیلا کرنے کی ہمّت نہ پڑتی تھی۔ اس فیشن سے آپ کالج میں چلے تو طلبا کا ایک جم غفیر متین اور مودبانہ انداز سے آپ کے پیچھے پیچھے چلا۔ گویا نوشہ کے جلو میں باراتی اصحاب جارہے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف تاکتا تھا اور رومال منہ پر دے کر ہنستا تھا۔ مگر پنڈت جی کو کیا خبر وہ اپنی دُھن میں مست تھے اکڑ اکڑ کر چل رہے تھے۔ اس شان سے آکر کلاس میں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد لوسی بھی آئی۔ انھیں اس لباس میں دیکھا متحیر ہوئی لبوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ پنڈت جی نے سمجھا یہ اس کی خوشی کا اظہار ہے، بار بار مسکرا کر اس کی طرف تاکتے اور پُر معنی نگاہوں سے دیکھتے۔ پر وہ مطلق مخاطب نہ ہوتی تھی۔

پنڈت جی کی معاشرت اور مذہبی جوش اور قوم پرستی میں بڑی سرعت سے انقلاب ہوا۔ سب سے پہلے چوٹی کا صفایا ہوا۔ انگریزی فیشن کے بال ترشوائے گئے۔ لوگوں نے کہا کہ جناب؟ آپ تو فرماتے تھے کہ چوٹیوں سے مقناطیسی کشش جسم میں داخل ہوتی ہے اب وہ کس راستے سے جائے گی۔

پنڈت جی نے عاقلانہ انداز سے مسکرا کر کہا۔ میں آپ لوگوں کو بے وقوف بناتا تھا۔ کیا میں اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب محض ڈھکوسلا ہے مجھے دل میں اس پر اعتقاد تھوڑا ہی تھا۔ آپ لوگوں کو چکمہ دینا چاہتا تھا۔

نعیم۔ واللہ آپ ایک ہی شاطر نکلے۔ ہم تو آپ کو بہت سیدھا سادھا آدمی سمجھتے تھے مگر آپ ایک ہی حضرت نکلے۔

چکردھر۔ دیکھتا تھا کہ لوگ کیا کہتے ہیں۔

چوٹیوں کے ساتھ سندھیا ہون بھی بند ہوا، ہون کُنڈ کمرہ میں چارپائی کے نیچے پھینک دیا گیا۔ اس کے بعد سگرٹ کے جلے ہوئے ٹکڑے رکھنے کا کام دینے لگا۔ جس سے آسن پر بیٹھ کر ہون کیا کرتے تھے وہ پائیدان تھا۔ اب روزانہ صابون ملتے سر میں تیل ڈالتے، بال سنوارتے سگرٹ پیتے، یار لوگ انھیں چنگ پر چڑھاتے رہتے تھے۔ تجویز ہوئی کہ ان حضرت سے واسکٹ کے روپے وصول کرنے چاہیئں۔ معہ سود کے وصول ہوں پھر کیا تھا لوسی کی جانب سے ایک خط لکھ دیا گیا، کہ آپ کی تبدیل وضع سے مجھے جتنی مسرت ہوئی اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہوسکتا، مجھے آپ سے ایسی ہی امید تھی، اب ماشاء اللہ آپ اس قابل ہوگئے ہیں کہ کوئی یورپین لیڈی آپ کے ساتھ بیٹھنا فخر سمجھے گی، اب یہ التجا ہے کہ مجھے اپنے اس مہربانی اور لازوال محبت کی کوئی یادگار مرحمت فرمایئے جسے میں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں۔ میں کوئی بیش قیمت چیز نہیں، صرف آپ کی یادگار چاہتی ہوں۔

چکر دھر نے دوستوں سے مشورہ کیا کہ اپنی بیوی کے لیے کچھ سوغات بھیجنا چاہتا ہوں۔ کیا بھیجنا مناسب ہوگا۔

نعیم۔ جناب یہ تو ان کی تعلیم اور تہذیب پر منحصر ہے، اگر تعلیم یافتہ ہیں تو کوئی بیشِ قیمت سبک وضعدار چیز بھیجیے یا کئی چیزیں ہو۔ مثلاً رومال، رسٹ واچ، لیونڈر کی شیشی، فینسی کنگھے، آئینہ، لاکٹ، بروچ وغیرہ اور اگر خدا نخواستہ گنوارن ہیں تو کسی دوسرے آدمی سے پوچھیے، مجھے گنواریوں کے مذاق کا علم نہیں۔

چکردھر۔ جناب انگریزی تک پڑھی ہوئی ہے۔

نعیم۔ تو پھر میری صلاح پر عمل کیجیے۔

شام کو احباب چکردھر کے ساتھ بازار گئے اور ڈھیر کی ڈھیر چیزیں خرید لائے۔ سب کے سب اعلیٰ قسم کی۔ کوئی پچھتر۷۵ روپے خرچ ہوئے مگر پنڈت نے اُف نہ کی خندہ پیشانی سے روپے نکالے۔ لوٹتے وقت نعیم نے کہا۔ افسوس ہمیں ایسی خوش مذاق بیوی نہ ملی۔

نعیم۔ جناب دوستی کے معنی تو یہ ہیں کہ ایک بار ہمیں ان سے بھی نیاز حاصل ہو، کیوں پنڈت جی آپ اس میں کچھ ہرج سمجھتے ہیں۔

چکردھر۔ والدین نہ ہوتے تو کوئی ہرج نہ تھا، ابھی تو میں ان کا محتاج ہوں، اتنی آزادی

کیوں کر برتوں۔

نعیم۔ خیر خدا انھیں جلد دار فانی سے نجات دے۔

راتوں رات پیکٹ بنا اور پنڈت جی علی الصباح اُسے لے جاکر لائبریری میں رکھ آئے۔ لائبریری سویرے ہی کھل جاتی تھی کوئی دقت نہ ہوئی۔ انھوں نے ادھر مُنہ پھیرا۔ اُدھر یاروں نے مال اوڑایا اور چمپت ہوئے، نعیم کے کمرہ میں اس کی چندہ کے اعتبار سے تقسیم ہوئی۔ کسی نے گھڑی پائی کسی نے رومال، کسی نے کچھ۔ ایک ایک روپے کے عوض پانچ پانچ روپے ہاتھ لگے۔

(۳)

عشاق غضب کے صابر ہوتے ہیں۔ پنڈت بے چارے اتنے مصارف کثیر کے بعد بھی معشوقہ دل فریب سے ہم کلام ہونے کا موقع نہ پاسکے، عجیب معشوقہ تھی جو خطوں میں تو قند و شکر گھول دیتی تھی مگر روبرو ایک نظر دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی۔ بے چارے بہت چاہتے کہ خود پیش قدمی کروں پر ہمت نہ پڑتی۔ مخمصے میں پھنسے ہوئے تھے۔ مگر باوجود ان شکستوں کے مایوس نہ تھے۔ ہَون سندھیا تو چھوڑ ہی بیٹھے تھے، نئے فیشن کے بال کٹ ہی چکے تھے، کوٹ پتلون ڈاٹے صاحب بنے گھوما کرتے۔ غلط سلط انگریزی بھی بولتے۔ راتوں کو انگریزی محاورات کی کتاب لے کر سبق کی طرح رٹتے، نیچے درجوں میں غریب نے اتنی جفاکشی سے سبق، نہ یاد کیا تھا، ہر کہیں رٹے ہوئے جملوں کو موقع بے موقع استعمال کیا کرتے، دو چار بار لوسی کے سامنے بھی انگریزی بگھارنے لگے۔ جس سے ان کی لیاقت کا پردہ اور بھی فاش ہوگیا۔

مگر ظالموں کو اب بھی ان پر رحم نہ آیا، ایک دن چکردھر کے پاس لوسی کا دوسرا خط پہنچا۔ جس میں بہت عذر اور التجا کے بعد یہ استدعا کی گئی تھی کہ میں نے آپ کو کبھی "فٹ بال یا کریکٹ کھیلتے نہیں دیکھا، انگریز جنٹلمین کے لیے مردانہ ورزشوں اور کھیلوں میں مشاق ہونا چاہیے، مجھے امید ہے کہ آپ میری یہ ناچیز درخواست منظور فرمائیں گے۔ انگریزی وضع و قطع میں، تقریر میں اب کالج میں کوئی آپ کا ہمسر نہیں رہا۔ میں چاہتی ہوں کہ کھیل کے میدان میں بھی کوئی آپ کا ثانی نہ ہو۔ ٹینس ضرور کھیلیے کہ شاید آپ کو کبھی میرے ساتھ لیڈیوں کے مقابلہ میں کھینا پڑے تو اُس وقت آپ کی اور آپ سے

زیادہ میری سبکی ہوگی۔"

دس بجے پنڈت جی کو یہ خط ملا۔ دوپہر کو جوں ہی تفریح کی چھٹی ملی آپ نے نعیم سے جاکر کہا یار ذرا فٹ بال نکال دو۔ نعیم فٹ بال کے کپتان بھی تھے۔ مسکرا کر بولے خیر تو ہے اس دوپہر میں فٹ بال لے کر کیا کیجیے گا۔ یوں تو آپ کبھی میدان کی طرف جھانکتے بھی نہ تھے۔ آج اس جلتی دھوپ میں کھیلنے کا ایسا کیا شوق چرایا ہے۔

پنڈت۔ آپ سے اس سے کیا غرض۔ آپ گیند نکال دیجیے۔ میں گیند میں بھی آپ لوگوں کو نیچا دکھاؤں گا۔

نعیم۔ جناب کہیں چوٹ چپیٹ آئے گی، مفت میں پریشان ہوجیے گا۔ ہمارے ہی سر مرہم پٹی کا بار پڑے گا۔ خدا کے لیے اس وقت رہنے دیجیے۔

پنڈت۔ آخر چوٹ تو مجھے لگے گی۔ آپ کا اس میں کیا نقصان ہوتا ہے۔ آپ کو ذرا سا گیند نکال دینے میں اتنا تکلف ہے۔

نعیم نے گیند نکال دیا اور پنڈت جی اس جلتی دوپہری میں مشق کرنے لگے۔ بار بار گرتے تھے بار بار تالیاں پڑتی تھیں مگر وہ اپنی دُھن میں ایسے مست تھے کہ خبر ہی نہ ہوتی تھی۔ اس اثناء میں آپ نے لوسی کو آتے دیکھ لیا۔ باچھیں کھل گئیں۔ اور بھی جوش دکھانے لگے۔ بار بار پیر چلاتے تھے۔ مگر نشانہ خالی جاتا تھا۔ پیر پڑتے بھی تھے تو گیند پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ اور لوگ آکر گیند کو ایک ٹھوکر میں آسمان تک پہنچا دیتے تو آپ کہتے میں زور سے ماروں تو اس سے بھی اوپر جائے۔ لیکن فائدہ کیا۔ لوسی دو تین منٹ تک کھڑی ان کی بوکھلاہٹ پر ہنستی رہی آخر نعیم سے بولی۔ ول نعیم۔ اس پنڈت کو کیا ہوگیا ہے، روز ایک نہ ایک سوانگ بھرا کرتا ہے۔ دماغ میں فتور تو نہیں پڑگیا؟

نعیم نے کہا۔ معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

شام کو سب لوگ بورڈنگ ہاؤس میں آئے تو یار لوگوں نے جاکر پنڈت جی کو مبارک باد دی۔ یار ہو بڑے خوش نصیب۔ ہم لوگ فٹ بال کو کالج کے کنگرے پہنچاتے رہے مگر کسی نے تعریف نہ کی۔ تمھارے کھیل کی سب تعریف کی اور خاص کر لوسی نے، وہ تو کہتی تھیں جس سٹائل سے یہ کھیلتے ہیں ویسے میں نے بہت کم ہندوستانیوں کو کھیلتے دیکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ آکسفورڈ کا کوئی مشاق کھلاڑی ہے۔ بہت خوش ہوئی۔

چکردھر۔ اور بھی کچھ بولیں۔ کیا کہا سچ بتاؤ۔
نعیم۔ اجی اب صاف صاف نہ کہلوائیے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے ٹٹی کی آڑ سے شکار کھیلا۔ بڑے ہشیار ہو یار۔ ہم لوگ منہ تاکتے رہے اور تم میدان مار لے گئے۔ جبھی آپ روز رنگ بدلا کرتے تھے۔ اب یہ عقدہ کُھلا، واقعی خوش نصیب ہو۔
چکر دھر۔ میں اسی قاعدہ سے گیند میں ٹھوکر مارتا تھا جیسے کتاب میں لکھا ہے۔
نعیم۔ جبھی تو بازی مار لے گئے بھئی۔ اور نہیں کیا، ہم آپ سے کسی بات میں کم ہیں۔ یار تمھاری جیسی شکل و صورت کہاں سے لائیں۔
چکردھر۔ بہت بناؤ نہ۔ میں ایسا کہاں کا بڑا حسین ہوں۔
نعیم۔ اجی وہ نتیجے سے ہی ظاہر ہے۔ یہاں صابون اور تیل لگاتے لگاتے بھور ہوا جاتا ہے اور کچھ اثر نہیں ہوتا۔ آپ کا رنگ بلا ہر اور پھٹکری کے چوکھا ہے۔
چکر دھر۔ کچھ اور تو نہیں کہتی تھیں۔
نعیم۔ نہیں اور تو کچھ نہیں کہا۔ ہاں اتنا دیکھا کہ جب تک کھڑی رہی آپ ہی کی طرف اس کی ٹکٹکی لگی ہوئی تھی۔

پنڈت جی کی باچھیں کھلی جاتی تھیں، سینہ پھولا جاتا تھا۔ جنھوں نے ان کی وہ نورانی صورت دیکھی ہے عرصہ تک یاد رکھیں گے۔ حالانکہ اس مسرت بے اندازہ کی قیمت بھی انھیں معقول ادا کرنی پڑی کیونکہ اب کالج کا سشن ختم ہونے والا تھا اور احباب کو پنڈت جی کے ماتھے ایک بار دعوت کھانے کی آرزو باقی تھی۔ تجویز ہونے کی دیر تھی، تیسرے دن ان کے نام محبت نامہ آپہنچا۔

۔ جدائی کا زمانہ آرہا ہے، نہ جانے آپ کہاں ہوں گے۔ اور میں کہاں ہوں گی۔ میں چاہتی تھی کہ اس غیرفانی محبت کی یادگار میں ایک پُرتکلف دعوت ہو۔ اگر مصارف آپ کے لیے ناقابلِ برداشت ہوں تو میں اُس کا پورا بار لینے کو تیار ہوں۔ اس دعوت میں میں اور میری سکھیاں آئیں گی۔ کالج کے طلبا اور پروفیسر مدعو ہوں گے۔ اور پھر الوداع کہنے کا وقت آئے گا۔ کاش آپ کا مذہب اور آپ کی معاشرت اور میرے والدین رضامند ہوجاتے تو ہمیں اتنا مایوس نہ ہونا پڑتا۔ والسلام

"آپ کی لوسی"

چکردھر خط پاتے ہی بوکھلا اُٹھے دوستوں سے کہا بھئی چلتے چلاتے مل کر کھانا تو کھالیں، مس لوسی کو بھی بلایا جائے، اگرچہ ان کے پاس اس وقت روپے نہیں تھے۔ گھر والے ان کے غیر معمولی تقاضوں سے پریشان ہوگئے تھے۔ مگر پنڈت جی کی غیرت یہ کب تسلیم کرتی تھی کہ دعوت کا بار مس لوسی پر رکھا جائے۔ اس کے لیے تو ان کی جان حاضر تھی۔ سسرال سے نہ جانے کیا کیا سوانگ رچ کر روپے منگوائے اور دعوت کی تیاریاں وسیع پیمانے پر ہونے لگیں۔ کارڈ چھپوائے گئے، کھانا پروسنے والوں کے لیے نئی وردیاں بنوائی گئیں۔ کھانا انگریزی بھی ہو اور ہندوستانی بھی۔ انگریزی کھانے کے لیے کنکس ہوٹل سے معاملہ طے کیا گیا۔ اس میں بہت سہولیت ہوئی حالانکہ قیمت گراں تھی لیکن دردِ سر سے نجات ہوئی ورنہ سارا بار مرزا نعیم اور ان کے دوست گردھر پر پڑتا۔ ہندوستانی کھانوں کے منتظم گردھر قرار پائے۔

کامل دو ہفتے تیاریاں ہوا کیں۔ نعیم اور گردھر تو کالج میں محض تفریح کے لیے تھے پڑھنا پڑھانا تو اُنھیں تھا نہیں۔ یوں ہی فضول تضیعِ اوقات کیا کرتے تھے۔ دعوت کے سلسلے میں مشاعرے کی رائے بھی پاس ہوگئی، شعراء کو کارڈ بھی تقسیم کردیے گئے۔ القصہ شاندار ضیافت کا انتظام ہوا۔ احباب نے خوب بڑھ کر ہاتھ مارے، مسیں بھی دو تین کھینچ لائی گئیں۔ مرزا نعیم لوسی کو گھیر گھار کر لے ہی آئے۔

مگر افسوس ہے کہ دعوت کا انجام پنڈت جی کے حق میں اچھا نہ ہوا۔ بے چارے کی تقدیر میں چلتے چلاتے ذلّت اور خفّت لکھی تھی۔ یاروں کو تو مشغلہ تفریح تھا۔ اور اس غریب کی جان پر بن رہی تھی۔ سوچے اب تو رخصت ہوتے ہی ہیں شاید پھر کبھی ملاقات نہ ہو۔ اب کس دن کے لیے صبر کروں۔ دل کی بھڑاس نکال کیوں نہ لوں۔ کلیجہ چیر کر دِکھا کیوں نہ دوں۔ یہ ولولے پنڈت جی کے سینۂ بے قرار میں موجزن ہو رہے تھے اور لوگ تو کھانا زہر مار کر رہے تھے اور یہ عاشق ناکام بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کیوں کر یہ آرزو پوری ہو۔ اب تکلف کیوں؟ حجاب کیوں؟ نالۂ خاموش کیوں؟ گریۂ پنہاں کیوں؟ بیٹھے بیٹھے کلیجہ مضبوط کیا اور موقع کی تاک میں لگے رہے۔ جب دعوت ختم ہوگئی، پان الائچی تقسیم کی جا چکی، رخصتی تقریریں ہوچکیں۔ مس لوسی نے بھی اپنی شیریں زبانی کا کمال دکھایا اور اُدھر مشاعرہ گرم ہوا تو پنڈت جی چپکے سے مس لوسی کے پیچھے ہوئے اور راستہ میں اُسے جا

پکڑا۔ وہ انھیں بدحواس اور دوڑے آتے دیکھ کر سہم اُٹھی کہ کوئی واردات تو نہیں ہوگئی۔ بولی۔ ول پنڈت جی کیا بات ہے آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ خیریت تو ہے؟

پنڈت جی کا گلا بھر آیا، بولے۔ اب آپ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جاؤں گا۔ کیسے صبر کروں گا۔ مجھے تو خوف ہے کہ میرے حواس میں فتور نہ پڑ جائے۔

لوسی نے حیرت میں آکر پوچھا۔ آپ کا منشا کیا ہے۔ آپ بیمار ہیں کیا؟

چکردھر۔ آہ ڈیر ڈارلنگ، تم پوچھتی ہو میں بیمار ہوں۔ میں مر رہا ہوں۔ نیم جان ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے لوسی کا ہاتھ پکڑنا چاہا وہ ان کی وحشت دیکھ کر گھبرا اُٹھی پھر غصہ میں آکر بولی۔ آپ ہم سے ایسی توہین کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو کفِ افسوس ملنا پڑے گا۔

چکردھر۔ لوسی۔ دیکھو چلتے چلاتے اتنی بے رخی اور کج ادائی نہ کرو۔ میں نے کس کس طرح یہ کلفت کے دن کاٹے ہیں۔ میرا دل ہی جانتا ہے۔ بس تمھارے خطوط میرے لیے آبِ حیات کا کام کرتے تھے اور نہ اب تک کب کا چل بسا ہوتا۔

لوسی۔ میرے خطوط! میرے خط کیسے۔ میں نے آپ کو کب خط لکھے؟

چکردھر۔ اتنی جلد نہ بھول جاؤ ڈیر ڈارلنگ۔ اتنی بے دردی نہ کرو۔ تمھارے وہ محبت کے خطوط جو تم نے مجھے لکھے ہیں میری زندگی میں یادگار رہیں گے۔ تمھاری فرمائش سے یہ وضع بنائی، اپنا سندھیا ہَون چھوڑا یہ معاشرت اختیار کی۔ دیکھو یہ ستم ظریفانہ مذاق نہ کرو ذرا کلیجے پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کیسی دھڑکن ہو رہی ہے۔

لوسی۔ تم بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو۔ یا کسی نے تمھیں احمق تو نہیں بنایا ہے۔ میں نے تمھیں کوئی خط نہیں لکھے۔ ہٹ جاؤ راستہ سے۔

مگر پنڈت جی ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ ان سے معشوقانہ غمزے کر رہی ہے۔ اُس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔ اب کی اُسے غصہ آیا۔ اُس نے زور سے ایک چانٹا ان کے منہ میں رسید کیا اور غضبناک لہجہ میں بولی۔ احمق ہٹ جا راستہ سے ورنہ ابھی پولیس کانسٹبل کو بلاتی ہوں۔

بے چارے پنڈت چانٹا کھاکر چوندھیا گئے، وہ تو ہوا ہوگئی۔ آپ وہیں زمین پر بیٹھ کر سارے واقعات کا دل میں تبصرہ کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ انھیں سوجھا کہیں کالج کے لوگوں

نے تو یہ مذاق نہیں کیا ہے۔ ضرور ایسا ہی ہے۔ ورنہ اسے اتنی پُرغضب ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ اُف ! ظالموں نے بڑا غچّا دیا۔ خوب جھانسا دیا۔ جبھی سب مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتے تھے۔ وہاں سے غصّے میں بھرے ہوئے آئے اور نعیم سے بولے۔ تم بڑے دغاباز ہو انتہا درجے کے شریر، مکار، حرام، مفسد، متفنی، کمینے۔ اس کا پھل نہ ملے تو کہنا۔ سڑ سڑ کر مروگے۔

نعیم۔ آخر کچھ بات تو کہیے۔ یا گالی ہی دیتے جایئے گا۔

گردھر۔ کیا بات ہوئی کہیں لوسی سے آپ نے کچھ کہا تو نہیں۔

چکردھر۔ اُسی کے پاس سے آرہا ہوں۔ چانٹا کھاکر، ذلیل اور رسوا ہوکر۔ تم دونوں نے مل کر مجھے خوب الو بنایا اس کا بدلہ نہ لیا تو کہنا۔

نعیم۔ اس سے آپ نے کیا کہا؟

چکردھر۔ کہا کیا تمھارا سر۔ اپنی داستانِ عشق سناتا رہا۔ اس پر اس نے ایسا چانٹا رسید کیا کہ کان بھنّا اُٹھے۔ ہاتھ بھی ظالم کے پتھر ہیں۔

گردھر۔ غضب ہی ہوگیا۔ آپ چونچ ہی ہے، آپ کے ساتھ اب ہم لوگوں پر بھی آفت آئے گی۔ کہیں اُس نے پرنسپل صاحب سے شکایت کردی تو نہ اِدھر کے ہوں گے نہ اُدھر کے اور جو کہیں اپنے کسی انگریز آشنا سے کہے گی۔ تو جان کے لالے پڑجائیں گے۔ بڑے بے وقوف ہو، اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ یہ سب دل لگی تھی۔

چکردھر۔ دل لگی تمھارے لیے تھی۔ میرے لیے تو موت ہے۔ پانچ سو رپے کے قریب تم لوگ لے مرے، امسال پاس ہونا بھی غیر ممکن ہے۔ بدنام ہوا یہ الگ۔ یہ دل لگی تھی۔ ایسی بھی دل لگی ہوتی ہے۔ میں تم لوگوں سے سمجھوں گا۔ اور میں چاہے نہ سمجھوں۔ ایشور تو سمجھے گا ہی۔

نعیم۔ خیر بگڑنے کا موقع بہت ہے پھر اطمینان سے بگڑ لیجیے گا۔ اب یہ بتایئے کہ مس لوسی نے اگر پرنسپل سے کہا تو کیا حشر ہوگا۔ تینوں آدمی نکال دیے جائیں گے۔ نوکری سے بھی ہاتھ دھونا پڑے گا۔

چکردھر۔ میں ساری داستان بے کم و کاست بیان کردوں گا۔

گردھر۔ کیوں یار دوستی کے یہی معنی ہیں۔

چکردھر۔ جی ہاں ایسے دوستوں کی یہی سزا ہے۔

ادھر تو رات بھر مشاعرہ کا بازار گرم رہا۔ یہاں یہ تکڑم بیٹھا راہِ فرار سوچ رہا تھا۔ پرنسپل کے کانوں تک بات نہ پہنچے ورنہ قہر ہوجائے گا۔ انگریز والی بات ہے نہ جانے کیا کر بیٹھے آخر بہت ردوکد کے بعد یہ رائے طے پائی کہ مرزا نعیم اور گردھر علی الصباح مس لوسی کے پاس جائیں اور اس سے معذرت کریں اور اس توہین کے لیے وہ جو تاوان طلب کرے، ادا کریں۔

چکردھر۔ میں ایک کوڑی نہ دوں گا۔

نعیم۔ یہاں تو کفن کو کوڑی نہیں ہے۔

گردھر۔ تو پھر اس کے پاس جانا بیکار ہے۔ وہ بلا تاوان لیے نہ مانے گی۔

نعیم۔ بھائی چکردھر خدا کے لیے اس وقت بخل نہ کرو۔ ورنہ ہم تینوں کی مٹی خراب ہوگی۔ جو کچھ ہوا اسے معاف کرو۔ گزشتہ را صلوٰت۔ اب آگے کی فکر کرو۔

چکردھر۔ وہی نہ ہوگا کہ نکال دیا جاؤں گا۔ دُکان کھول لوں گا تمھاری تو مٹی خراب ہوگی۔ اس شرارت کا مزہ چکھو گے۔ اف کیسا چکمہ دیا ہے۔

بارے بہت منت اور خوشامد کے بعد پنڈت جی سیدھے ہوئے۔ نعیم علی الصباح مس لوسی کے بنگلہ پر پہنچے۔ مگر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ پرنسپل کے بنگلہ پر گئی ہے۔ اب کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ اب خیریت نہیں پرنسپل نے سنا تو کچا ہی کھا جائے گا۔ نمک تک نہ ڈھونڈھے گا۔ اس کم بخت پنڈت کی بدولت عذاب میں مبتلا ہوئے۔ اس بیہودے کو سوجھی کیا۔ کہ چلا مس لوسی سے عشق جتانے۔ بَن بلاؤ کی سی تو آپ کی صورت ہے۔ اور شوق ہے سیمیں کے عاشق بننے کا، ستم تو یہ ہے کہ اپنے ساتھ ہمیں بھی ڈبوئے دیتا ہے۔ کہیں لوسی سے راستہ میں ملاقات ہوگی تو شاید منت سماجت سے مان جائے، مکان پر پہنچ چکی ہے تو کوئی امید نہیں۔ پھر بائیسکل پر بیٹھے اور بے تحاشا پرنسپل کے بنگلہ کی طرف چلے۔ ایسے تیز جا رہے تھے کہ اگر بائیسکل ٹھوکر کھاجاتی تو ہڈی پسلی کا پتہ نہ لگتا۔ مگر افسوس! راستہ میں لوسی کا پتہ نہیں۔ آدھا راستہ طے ہوا۔ مایوسی کا غلبہ ہونے لگا۔ پھر ہمت کرکے چلے دفعتاً دیکھا کہ وہ پرنسپل کے بنگلہ کے احاطہ میں داخل ہوا چاہتی ہے۔ کلیجہ لبوں تک آگیا۔ زور سے پکارا مس ٹرنر! ہیلو مس ٹرنر۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔

مس لوسی نے پیچھے پھر کر دیکھا۔ نعیم کو پہچان کر ٹھہر گئی۔ اور بولی۔ مجھ سے اس پنڈت کی سفارش کرنے تو نہیں آئے ہو۔ میں پرنسپل سے اس کی شکایت کرنے جا رہی ہوں۔

نعیم۔ تو پہلے مجھے اور گردھر کو پستول کا نشانہ بنا لو۔ پھر جانا۔

لوسی۔ تم نے میرا کیا نقصان کیا ہے۔ اس پنڈت نے میری توہین کی۔ حد درجہ کی گستاخی۔

نعیم۔ لوسی، تمھارے مجرم ہم لوگ ہی ہیں وہ بے چارہ تو ہمارے ہاتھ کا کھلونا تھا۔ یہ ساری شرارت ہم لوگوں کی تھی۔

لوسی۔ You naughty boy.

نعیم۔ سچ کہتا ہوں۔ ہم لوگ تو اُسے تفریح کا مشغلہ بنائے ہوئے تھے۔ اس کی ذرا خبر نہ تھی کہ وہ تمھیں چھیڑنے لگے گا۔ خدا کے لیے اب معاف کرو۔ ورنہ ہم تینوں کا خون تمھاری گردن پر ہوگا۔

لوسی۔ خیر تم کہتے ہو تو پرنسپل سے نہ کہوں گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ پنڈت میرے روبرو بیس مرتبہ کان پکڑ کر اُٹھے بیٹھے۔ اور مجھے سو روپے اس بے ادبی کے تاوان کے طور پر دے۔

نعیم۔ لوسی اتنی بے رحمی نہ کرو۔ یہ سمجھو اُس غریب کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی۔ کاش تم اتنی حسین نہ ہوتیں۔

لوسی۔ (مسکرا کر) خوشامد کرنا کوئی تم سے سیکھ لے۔

نعیم۔ تو واپس چلو۔ تاوان تو میں دلادوں گا۔ لیکن تمھاری پہلی شرط سخت ہے۔ نہایت سخت، بے چارہ زہر کھاکر مرجائے گا۔ ہاں اس کے عوض میں پچاس دفعہ کان پکڑ کر اُٹھ بیٹھ سکتا ہوں۔

لوسی۔ تم چھٹے ہوئے شہدے ہو تمھیں شرم کہاں، میں اسی کو خفیف کرنا چاہتی ہوں۔ بدمعاش میرا ہاتھ پکڑنا چاہتا تھا۔

نعیم۔ ذرا بھی رحم نہ کروگی؟

لوسی۔ مطلق نہیں۔

کوئی چارہ نہ تھا۔ نعیم لوسی کو بورڈنگ ہاؤس میں لائے۔ پنڈت کے سامنے یہ تجویز

پیش کی گئی۔ تو غریب بلبلا اُٹھا۔ لوسی کے پیروں پر گر پڑا اور سسک کر رونے لگا۔ نعیم اور گردھر بھی اپنے فعل پر نادم ہوئے۔ بارے لوسی کو درد آیا۔ پہلی شرط معاف کردی۔ رہی دوسری شرط پنڈت نے گھر پر بیماری کا تار دیا اور روپے منگا کر لوسی کے حوالے کیے تب جا کے گلا چھوٹا۔

اس سانحہ کے بعد ایک ہفتہ کالج اور کھلا رہا۔ مگر پنڈت کو کسی نے مسکراتے نہیں دیکھا۔ بے چارے مغموم اور متفکر بیٹھے رہا کرتے تھے۔ لوسی کا نام زبان پر آتے ہی جھلا اُٹھتے تھے۔ اور بے نقط سنانے لگتے تھے۔

نعیم اور گردھر نے بھی کان پکڑے کہ اب کبھی ایسی فتنہ انگیزی نہ کریں گے۔

اس سال پنڈت جی فیل ہوگئے۔ مگر اس کالج میں نہ آئے۔ شاید علی گڑھ چلے گئے۔

یہ افسانہ پہلے ہندی ماہنامہ 'مادھوری' نومبر1924 'ونود' کے عنوان سے اور بعد میں زمانہ کانپور فروری1925 میں مایۂ تفریح کے عنوان سے شائع ہوا۔ ہندی میں مان سروور 3 اور اردو میں 'خواب خیال' میں شامل ہے۔

تینتر

آخر وہی ہوا جس کی آشنکا تھی، جس کی چنتا میں گھر کے سبھی لوگ اور وشیشتہ پرسوتا (زچہ) پڑی ہوئی تھی۔ تین پُتروں کے پشچات کنیا کا جنم ہوا۔ ماتا سَور میں سوکھ گئیں۔ پتا باہر آنگن میں سوکھ گئے اور پتا کی وِردھا ماتا سَور دُوار پر سوکھ گئیں۔ انَرتھ، مہا انَرتھ بھگوان ہی کُشل (خیر) کریں تو ہو؟ یہ پُتری نہیں راکششی ہے اس اَبھاگنی کو اسی گھر میں آنا تھا۔ آنا تھا تو کچھ دن پہلے کیوں نہ آئی۔ بھگوان ساتویں شترو کے گھر بھی تینتر کا جنم نہ دے۔

پتا کا نام تھا پنڈت دامُودر دَت، شِکشت آدمی تھے۔ شکشہ وبھاگ (محکمۂ تعلیم) ہی میں نوکر بھی تھے۔ مگر اس سنسکار کو کیسے مِٹا دیتے، جو پرمپرا سے ہردئے میں جما ہوا تھا، کہ تیسرے بیٹے کی پیٹھ پر ہونے والی کنیا اَبھاگنی ہوتی ہے۔ یہ پِتا کو لیتی ہے یا ماتا کو، یا اپنے کو، ان کی وِردھا ماتا لگی نوجات (پیدا ہوا بچہ) کنیا کو پانی پی پی کر کوسنے، کلمُہی ہے، کلمُہی۔ نہ جانے کیا کرنے آئی ہے یہاں۔ کسی بانجھ کے گھر جاتی تو اس کے دن پھر جاتے۔

دامودردتؔ دل میں تو گھبرائے ہوئے تھے پر ماتا کو سمجھانے لگے۔ اماں تینتر۔ تینتر کچھ نہیں بھگوان کی جو اِچھا ہوتی ہے، وہی ہوتا ہے ایشور چاہیں گے تو سب کُشل ہی ہوگا۔ گانے والیوں کو بلا لو، نہیں لوگ کہیں گے تین بیٹے ہوئے تو کیسے پھولی پھرتی تھیں۔ ایک بیٹی ہوگئی تو گھر میں کُہرام مچ گیا۔

ماتا۔ ارے بیٹا تم کیا جانو ان باتوں کو، میرے سِر تو بیت چکی ہے۔ پران نہوں میں سمایا ہوا ہے۔ تینتر ہی کے جنم سے تمھارے دادا کا دیہانت ہوا۔ تب ہی سے تینتر کا نام سنتے ہی میرا کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔

دامودر۔ اس کشٹ کے نوارن (نجات) کا بھی کوئی اُپائے (حل) ہوگا؟

ماتا۔ اُپائے بتانے کو تو بہت ہیں، پنڈت جی سے پوچھو تو کوئی نہ کوئی اُپائے بتا دیں گے، پر اس سے کچھ ہوتا نہیں۔ میں نے کون سے انوشٹھان (پوجا پاٹ) نہیں کیے،

پر پنڈت جی کی تو مٹھیاں گرم ہوئیں۔ یہاں جو سر پر پڑنا تھا۔ وہ پڑ ہی گیا۔ اب ٹکے کے پنڈت رہ گئے ہیں ججمان مرے یا جیے ان کی بلا سے ان کی دکشنا (معاوضہ) ملنی چاہیے۔ (دھیرے سے) لڑکی دُبلی پتلی بھی نہیں ہے۔ تینوں لڑکوں سے ہشٹ۔ پشٹ ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں ہیں، پتلے پتلے لال ہونٹ ہیں جیسے گلاب کی پتی۔ گورا چٹا رنگ ہے لمبی سی ناک ہے۔ کلمُہی نہلاتے سَمئے روئی بھی نہیں ٹکر ٹکر تاکتی رہی یہ سب لچھن کچھ اچھے تھوڑے ہی ہیں۔

داموردت کے تینوں لڑکے سانولے تھے، کچھ وشیش (خاص) روپ وان بھی نہ تھے۔ لڑکی کے رُوپ کا نکھان سن کر ان کا چت کچھ پرسن ہوا۔ بولے۔ اماں جی، تم بھگوان کا نام لے کر گانے والیوں کو بلا بھیجو، گانا بجانا ہونے دو۔ بھاگیہ میں جو کچھ ہے، وہ تو ہوگا ہی۔

ماتا۔ جی تو ہُلستا (خوش) نہیں، کروں کیا؟

دامودر۔ گانا نہ ہونے سے کشٹ کا نوارن (خاتمہ) تو ہوگا نہیں، کہ ہو جائے گا۔ اگر اتنے سستے جان چھوٹے تو نہ کراؤ گانا۔

ماتا۔ بلائے لیتی ہوں بیٹا، جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوگیا۔

اتنے میں دائی نے سَوَر میں سے پکار کر کہا۔ بہو جی کہتی ہیں، گانا وانا کرانے کا کام نہیں ہے۔

ماتا۔ بھلا ان سے کہو چپ بیٹھی رہیں۔ باہر نکل کر من مانی کریں گی۔ بارہ ہی دن ہیں بہت دن نہیں ہیں۔ بہت اتراتی پھرتی تھی۔ یہ نہ کروں گی وہ نہ کروں گی، دیوی کیا ہے، دیوتا ہے، مردوں کی باتیں سن کر وہی رٹ لگانے لگتی تھی، تو اب چپکے سے بیٹھتی کیوں نہیں میمیں تو تینتر کو اَشُبھ (بُرا) نہیں مانتی اور اب سب باتوں میں میموں کی برابری کرتی ہے تو اس بات میں بھی کریں۔

یہ کہہ کر ماتا جی نے نائن کو بھیجا کہ جاکر گانے والیوں کو بلا لا، پڑوس میں بھی کہتی جانا۔ سویرہ ہوتے ہی بڑا لڑکا سوکر اُٹھا اور آنکھیں ملتا ہوا جاکر دادی سے پوچھنے لگا۔ بڑی اماں کل اماں کو کیا ہوا؟

ماتا۔ لڑکی تو ہوئی ہے۔

بالک خوشی سے اچھل کر بولا۔ اوہو ہو پنجنیا پہن پہن کر چھن چھن چلے گی۔ ذرا مجھے دکھا دو دادی جی۔

ماتا۔ ارے کیا سور میں جائے گا۔ پاگل ہوگیا ہے کیا؟

لڑکے کی اُتسکتا (بے چینی) نہ مانی۔ سور کے دُوار پر جاکر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ اماں ذرا بچّی کو مجھے دکھا دو۔

دائی نے کہا۔ بچّی ابھی سوتی ہے۔

بالک۔ ذرا دکھا دو گود میں لے کر۔

دائی نے کنیا اسے دکھا دی تو وہاں سے دوڑتا ہوا اپنے چھوٹے بھائیوں کے پاس پہنچا، اور انھیں جگا جگا کر خوشخبری سنائی۔

ایک بالک۔ ننّھی سی ہوگی۔

بڑا۔ بالکل ننّھی سی، بس جیسے بڑی گڑیا۔ ایسی گوری ہے کہ کیا کسی صاحب کی لڑکی ہوگی۔ یہ لڑکی میں لوں گا۔

سب سے چھوٹا بولا۔ اَم کو بی دِکا دو۔

تینوں مل کر لڑکی کو دیکھنے آئے اور وہاں سے بغلیں بجاتے اُچھلتے، کودتے باہر آئے۔

بڑا۔ دیکھا کیسی ہے۔

منجھلا۔ کیسے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔

چھوٹا۔ اِسے ہمیں تو دینا۔

بڑا۔ خوب دُوار پر بارات آئے گی، ہاتھی، گھوڑے، باجے، آتش بازی۔

منجھلہ اور چھوٹے ایسے مگن ہو رہے تھے مانو وہ منوہر درشیہ (منظر) آنکھوں کے سامنے ہے، ان کے سرل نیتر منو الاّس (خوشی) سے چمک رہے تھے۔

منجھلہ بولا۔ پھلواریاں بھی ہوں گی۔

چھوٹا۔ اَم بی پھول لیں گے۔

(۲)

چھٹی بھی ہوئی برہی بھی ہوئی، گانا بجانا، کھانا کھلانا، دینا دِلانا سب کچھ ہوا۔ پر رسم پوری کرنے کے لیے، دل سے نہیں، خوشی سے نہیں۔ لڑکی دن دن دربل (دبلی) اور

اَسوستھ (کمزور) ہوتی جاتی تھی۔ ماں اسے دونوں وقت افیون کھلا دیتی اور بالیکا دن اور رات نشے میں بے ہوش پڑی رہتی۔ ذرا بھی نشہ اُترتا تو بھوک سے وِکل (بے تاب) ہوکر رونے لگتی۔ ماں کچھ اوپری دودھ پلا کر افیون کھلا دیتی۔ آشچریہ (حیرت) کی بات تو یہ تھی کہ اب کے اس کی چھاتی میں دودھ ہی نہیں اُترا۔ یوں۔اسے دودھ دیر سے اُترتا تھا۔ پر لڑکوں کی بیر اسے نانا پرکار (مختلف النوع) کی دودھ وردھک (دودھ سے بنی) اوشدھیاں کھلائی جاتیں، بار بار شِشو (بچّہ) کو چھاتی سے لگایا جاتا، یہاں تک کہ دودھ اُتر ہی آتا تھا، پر اب کے یہ آیوجنائیں (تدبیریں) نہ کیں گئیں۔ پھول سی بچّی کمہلاتی جاتی تھی۔ ماں تو کبھی اس کی اُور تاکتی بھی نہ تھی۔ ہاں نائن کبھی چٹکیاں بجا کر چمکارتی تو شِشو (بچّہ) کے مکھ پر ایسی دینیئے (دردمندانہ) ایسی کرون (ترس آمیز) ویدنا اَنکِت (ابھرتا) دکھائی دیتی کہ وہ آنکھیں پوچھتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ بہو سے کچھ کہنے سننے کا ساہس نہ پڑتا۔ بڑا لڑکا سِدھو بار بار کہتا۔ اماں بچّی کو دو تو باہر سے کھلا لاؤں۔ پر ماں اسے جھڑک دیتی تھی۔

تین چار مہینے ہوگئے۔ داموردت رات کو پانی پینے اُٹھے تو دیکھا کہ بالکا جاگ رہی ہے۔ سامنے طاق پر میٹھے تیل کا دیپک جل رہا تھا۔ لڑکی ٹکٹکی باندھے اسی دیپک کی اُور دیکھتی تھی، اور اپنا انگھوٹھا چوسنے میں مگن تھی۔ چُبھ چُبھ کی آواز آرہی تھی۔ اس کا مکھ مرجھایا ہوا تھا پر وہ نہ روتی تھی، نہ ہاتھ پیر پھینکتی تھی، بس انگوٹھا پینے میں ایسی مگن تھی مانو اس میں سُدھا رس (امرت) بھرا ہوا ہے۔ وہ ماتا کے استنوں کی اور منہ بھی نہیں پھیرتی تھی، مانو اس کا ان پر کوئی ادھکار (حق) نہیں اس کے لیے وہاں کوئی آشا نہیں۔ بابو صاحب کو اس پر دَیا آئی۔ اس بے چاری کا میرے گھر جنم لینے میں کیا دوش ہے؟ مجھ پر یا اس کی ماتا پر جو کچھ بھی پڑے، اس میں اِس کا کیا اپرادھ (قصور)؟ ہم کتنی نِردیتا (ظلم) کر رہے ہیں کہ کچھ کلپت (تصور) اَنشٹھ کے کارن اس کا اتنا ترسکار کر رہے ہیں۔ مانا کہ کچھ اَمنگل (برا) ہو بھی جائے تو کیا اس کے بھئے سے اس کے پراں لے لیے جائیں گے؟ اگر اپرادھی (ملزم) ہے تو میرا پراربدھ ہے۔ اس ننھے سے بچّے کے پرتی ہماری کٹھورتا کیا اِیشور کو اچھی لگتی ہوگی؟ انھوں نے اسے گود میں اُٹھا لیا اور اس کا مکھ چومنے لگے۔ لڑکی کو کداچت (یقیناً) پہلی بار سچّے اِسنیہ (پیار) کا گیان ہوا۔ وہ ہاتھ پیر اچھال کر غوں، غوں کرنے لگی۔ اور دیپک کی اور ہاتھ پھیلانے لگی۔ اسے جیون جیوتی سی مل گئی۔

پراتہ کال دامودردت نے لڑکی کو گود میں اُٹھا لیا اور باہر لائے۔ اِستری نے بار بار کہا۔ اسے پڑی رہنے دو ایسی کون سی بڑی سندر ہے اَبھاگن رات دن تو پران کھاتی رہتی ہے۔ مر بھی نہیں جاتی کہ جان چھوٹ جائے، کِنتو دامودردت نے نہ مانا۔ اسے باہر لائے اور اپنے بچّوں کے ساتھ بیٹھ کر کھلانے لگے۔ ان کے مکان کے سامنے تھوڑی سی زمین پڑی ہوئی تھی۔ پڑوس کے کسی آدمی کی ایک بکری اس میں آکر چرا کرتی تھی۔ اس سمئے بھی وہ چر رہی تھی۔ بابو صاحب نے بڑے لڑکے سے کہا۔ سِدھوّ ذرا اس بکری کو پکڑو تو، اسے دودھ پلائیں، شاید بھوکی ہے بے چاری۔ دیکھو تمھاری ننّھی سی بہن ہے نہ؟ اسے روز ہوا میں کھلایا کرو۔

سِدھوّ کو دلّگی ہاتھ آئی اس کا چھوٹا بھائی بھی دوڑا۔ دونوں نے گھیر کر بکری کو پکڑا اور اس کا کان پکڑے ہوئے سامنے لائے۔ پِتا نے شِشو کا منہ بکری کے تھن میں لگا دیا۔ لڑکی چُبلانے لگی اور ایک چھن (لمحہ) میں دودھ کی دھار اس کے منہ میں جانے لگی۔ مانو ٹمٹماتے دیپک میں تیل پڑجائے۔ لڑکی کا منہ کھِل اُٹھا۔ آج شاید پہلی بار اس کی شدھا ترِپت (روحانی سکون) ہوئی تھی۔ وہ پِتا کی گود میں ہُمک ہُمک کر کھیلنے لگی۔ لڑکوں نے بھی اسے خوب نچایا کُدایا۔

اس دن سے سِدھوّ کو منورنجن کا ایک نیا وِشئے مل گیا۔ بالکوں کو بچّوں سے بہت پریم (پیار) ہوتا ہے اگر کسی گھونسلے میں چڑیا کا بچّہ دیکھ پائیں تو باربار وہاں جائیں گے۔ دیکھیں گے کہ ماتا بچّے کو کیسے دانا چگاتی ہے۔ بچّہ کیسے چونچ کھولتا ہے، کیسے دانا لیتے سمے پَروں کو پھڑپھڑا کر چیں چیں کرتا ہے۔ آپس میں بڑے گمبھیر بھاؤ سے اس کی چرچہ کریں گے، اپنے اَنّے (دوسرے) ساتھیوں کو لے جاکر اسے دکھائیں گے۔ سِدھوّ تاک میں لگا رہتا، جیو ہی ماتا بھوجن بنانے یا اسنان کرنے جاتیں تُرنت بچے بچّی کو لے کر آتا اور بکری کو پکڑ کر اس کے تھن میں شِشو کا منہ لگا دیتا، کبھی دن میں دو دو تین تین بار پلاتا۔ بکری کو بُھسی، چوکر کھِلا کر ایسے پَرچا (ہلا) لیا کہ وہ سویم چوکر کے لوبھ سے چلی آتی اور دودھ دے کر چلی جاتی۔ اسی بھانتی کوئی ایک مہینہ گزر گیا لڑکی ہَشٹ پُشٹ ہوگئی، مکھ پُشپ کے سمان وکسِت ہوگیا۔ آنکھیں جگ اُٹھیں، شِشو کال (بچپن) کی سرل آبھا (چمک) مَن کو ہَرنے لگی۔

ماتا اسے دیکھ دیکھ کر چکت (حیران) ہوتی تھی۔ کسی سے کچھ کہہ تو نہ سکتی۔ پر دل میں اسے آشنکا ہوتی تھی کہ اب یہ مرنے کو نہیں، ہم ہی لوگوں کے سر جائے گی۔ کداچت (یقیناً) ایشور اس کی رکشا کر رہے ہیں جبھی تو دن دن نکھرتی آتی ہے، نہیں اب تک ایشور کے گھر پہنچ گئی ہوتی۔

مگر دادی ماتا سے کہیں زیادہ چنتت (فکرمند) تھیں۔ اسے بھرم ہونے لگا کہ وہ بچّی کو خوب دودھ پلا رہی ہے۔ سانپ کو پال رہی ہے۔ شیشو کی اُور آنکھ اُٹھاکر بھی نہ دیکھتی۔ یہاں تک کہ ایک دن کہہ بیٹھی۔ لڑکی کا بڑا چھوہ کرتی ہو؟ ہاں بھائی، ماں ہو کہ نہیں، تم نہ چھوہ کروگی تو کرے گا کون؟

اماں جی، ایشور جانتے ہیں جو میں اسے دودھ پلاتی ہوں؟

"ارے تو میں منع تھوڑے ہی کرتی ہوں۔ مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ مفت میں اپنے اوپر پاپ لوں، کچھ میرے سر تو جائے گی نہیں۔"

"اب آپ کو وِشواس ہی نہ آئے تو کوئی کیا کرے؟"

"مجھے پاگل سمجھتی ہو، وہ ہوا پی پی کر ایسی ہو رہی ہے۔"

"بھگوان جانے اماں، مجھے تو آپ آچرج ہوتا ہے۔"

بہو نے بہت نردوشِتا جتائی۔ کنتو وِردھا ساس کو وِشواس نہ آیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ میری شنکا کو نرمُول (بیکار) سمجھتی ہے، مانو مجھے اس بچّی سے کوئی بیر ہے اس کے مَن میں یہ بھاؤ اَنکورِت ہونے لگا کہ اُسے کچھ ہوجائے تب یہ سمجھے کہ میں جھوٹ نہیں کہتی تھی وہ جن پرانیوں (لوگوں) کو اپنے پرانیوں سے بھی پریے سمجھتی تھی انھیں لوگوں کی امنگل کامنا کرنے لگی۔ کیول اس لیے کہ میری شنکائیں (شبہات) ستیہ ہوجائیں۔ وہ یہ تو نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مرجائے، پر اتنا اوشئے چاہتی تھی کہ کسی بہانے سے میں چیتا دوں کہ دیکھا تم نے میرا کہا نہ مانا یہ اسی کا پھل ہے۔ ادھر کی اُور سے جیوں جیوں (جیسے جیسے) یہ دُویش بھاؤ پرکٹ ہوتا تھا بہو کا کنیا کے پُرتی اسنہ بڑھتا تھا۔ ایشور سے مناتی رہتی تھی کہ کسی بھانتی ایک سال کُشل سے کٹ جاتا تو ان سے پوچھتی۔ کچھ لڑکی کا بھولا بھالا چہرہ، کچھ اپنے پتی کا پریم واتسلیہ دیکھ کر بھی اسے پُروتساہن (حوصلہ) ملتا تھا۔ وِچتر دَشا ہو رہی تھی نہ دل کھول کر پیار ہی کرسکتی تھی نہ سمپورن ریتی (پورے طریقے) سے نردے (بے رحم) ہوتے

ہی بنتا تھا۔ نہ ہنستے بنتا تھا نہ روتے۔

اس بھانتی دو مہینے اور گزر گئے اور کوئی انشٹھ (بُرا) نہ ہوا۔ تب تو وِردھا ساس کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ بہو کو دو چار دن جُور (بخار) بھی نہیں آجاتا کہ میری شنکا کی مریادا (لاج) رہ جائے۔ پُتر بھی کسی دن پیرگاڑی پر سے نہیں گر پڑتا، نہ بہو کے میکہ ہی سے کسی کے سُوَرگواس (انتقال) کی سُناونی آتی ہے۔ ایک دن دامودردَت نے کھلے طور پر کہہ بھی دیا کہ اماں، یہ سب ڈھکوسلا ہے تینتر لڑکیاں کیا دنیا میں ہوتی ہی نہیں، تو سب کے سب ماں باپ مر ہی جاتے ہیں؟ انت میں اس نے اپنی شنکاؤں کو یتھارتھ (صحیح) سدھ (ثابت) کرنے کی ایک ترکیب سوچ نکالی۔ ایک دن دامودردَت اسکول سے آئے تو دیکھا کہ اماں جی کھاٹ پر اچیت (بے دم) پڑی ہوئی ہیں۔ استری انگیٹھی میں آگ رکھے ان کی چھاتی سینک رہی ہے اور کوٹھری کے دُوار اور کھڑکیاں بند ہیں۔ گھبرا کر کہا اماں جی کیا دَشا ہے؟

اِستری۔ دوپہر ہی سے کلیجے میں ایک شُول (درد) اُٹھ رہا ہے بے چاری بہت تڑپ رہی ہیں۔

دامودر۔ میں جاکر ڈاکٹر صاحب کو بلا لاؤں نا؟ دیر کرنے سے شاید روگ بڑھ جائے۔ اماں جی، اماں جی کیسی طبعیت ہے۔

ماتا نے آنکھیں کھولیں اور کراہتے ہوئے بولی۔ بیٹا تم آگئے؟ اب نہ بچوں گی، ہائے بھگوان اب نہ بچوں گی۔ جیسے کوئی کلیجہ میں برچھی چبھا رہا ہو۔ ایسی پیڑا کبھی نہ ہوئی تھی۔ اتنی عمر بیت گئی ایسی پیڑا نہیں ہوئی۔

اِستری۔ یہ کلمُہی چھوکری نہ جانے کس منحوس گھڑی میں پیدا ہوئی۔

ساس۔ بیٹا سب بھگوان کرتے ہیں، یہ بے چاری کیا جانے۔ دیکھو میں مرجاؤں تو اسے کشٹ مت دینا۔ اچھا ہوا میرے سر آئی۔ کسی کے سر تو جاتی ہی، میرے ہی سر سہی۔ ہائے بھگوان اب نہ بچوں گی۔

دامودر۔ جاکر ڈاکٹر بلا لاؤں، ابھی لوٹا آتا ہوں۔

ماتا جی کو کیول اپنی بات کی مریادا نبھانی تھی، روپیہ نہ خرچ کرانے تھے، بولی۔ نہیں بیٹا ڈاکٹر کے پاس جاکر کیا کروگے؟ ارے، وہ کوئی ایشور ہے۔ ڈاکٹر امرت پلا دے گا، دس

ہیں وہ بھی لے جائے گا۔ ڈاکٹر وید سے کچھ نہ ہوگا۔ بیٹا تم کپڑے اتار میرے پاس بیٹھ کر بھاگوت پڑھو۔ اب نہ بچوں گی ہائے رام۔

دامودر۔ تینتر بری چیز۔ میں سمجھتا تھا کہ ڈھکوسلا ہی ڈھکوسلا ہے۔

اِستری۔ اسی لیے میں اسے کبھی منہ نہیں لگاتی تھی۔

ماتا۔ بیٹا بچوں کو آرام سے رکھنا، بھگوان تم لوگوں کو سکھی رکھے۔ اچھا ہوا میرے ہی سر آئی۔ تم لوگوں کے سامنے میرا پرلوک ہوجائے گا۔ کہیں کسی دوسرے کے سر جاتی تو کیا ہوتا رام۔ بھگوان نے میری بنتی (دعا) سن لی۔ ہائے! ہائے!!

دامودردت کو نشچئے ہوگیا کہ اب اماں نہ بچیں گی۔ بڑا دُکھ ہوا۔ اس کے من کی بات ہوتی تو وہ ماں کے بدلے تینتر کو نہ سُوکار (قبول) کرتے۔ جس جننی نے جنم دیا نانا پرکار کے کشٹ جھیل کر ان کا پالن پوشن کیا اکال ویدھوے (نہ ختم ہونے والی بیوگی) کو پراپت ہوکر بھی ان کی شکشا کا پربندھ کیا اس کے سامنے دودھ منہی بچی کا کیا مُولیہ تھا جس کے ہاتھ کا ایک گلاس پانی بھی وہ نہ جانتے تھے۔ شوکاتر ہو کپڑے اُتار اور ماں کے سرہانے بیٹھ کر بھاگوت کی کتھا سنانے لگے۔

رات کو بہو بھوجن بنانے چلی تو ساس سے بولی۔ اماں جی تمھارے لیے تھوڑا سا سابودانہ چھوڑ دوں؟

ماتا نے وینگ (طنز) کرکے کہا۔ بیٹی انّ بنا نہ مارو، بھلا سابودانہ مجھ سے کھایا جائے گا۔ جاؤ تھوڑی پوریاں چھان لو۔ پڑے پڑے جو کچھ اِچھا ہوگی کھا لوں گی۔ کچوریاں بھی بنا لینا۔ مرتی ہوں تو بھوجن کو ترس ترس کیوں مروں۔ تھوڑی ملائی بھی منگوا لینا، چوک کی ہو۔ پھر تھوڑے کھانے آؤں گی بیٹی۔ تھوڑے سے کیلے منگوا لو۔ کلیجہ کے درد میں کیلے کھانے سے آرام ہوتا ہے۔

بھوجن کے سمئے پیڑا شانت ہوگئی لیکن آدھا گھنٹے کے بعد پھر زور سے ہونے لگی۔ آدھی رات کے سمئے کہیں جاکر ان کی آنکھ لگی۔ ایک سپتاہ (ہفتہ) تک ان کی یہی دَشا رہی، دن بھر پڑی کراہا کرتی، بس بھوجن کے سمئے ذرا ویدنا کم ہوجاتی۔ دامودردَت سرہانے بیٹھے پنکھا جھلتے اور ماتر ویوگ (ماں کے غم) کے آگت (آگے) شوک سے روتے۔ گھر کی مہری نے محلہ بھر میں یہ خبر پھیلا دی پڑوسنیں دیکھنے آئیں تو سارا الزام بالکا کے سر گیا۔

ایک نے کہا۔ یہ تو کہو بڑی کُشل ہوئی کہ بڑھیا کے سر گئی نہیں تو تینتر ماں باپ دو میں سے ایک کو لے کر تبھی شانت ہوتی ہے۔ دیو نہ کرے کسی کے گھر تینتر کا جنم ہو۔

دوسری بولی۔ میرے تو تینتر کا نام سنتے ہی روئے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بھگوان بانجھ رکھے پر تینتر نہ دے۔

ایک سپتاہ کے بعد وِردھا کا کشٹ نوارن ہوا۔ مرنے میں کوئی کسر نہ تھی، وہ تو کہو پُرکھاؤں کا پنیہ پرتاپ تھا۔ برہمنوں کو گئودان دیا گیا۔ دُرگا پاٹھ ہوا تب کہیں جاکے سنکٹ کٹا۔

یہ افسانہ چاند کے دسمبر1924 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سروور3 میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

ڈگری کے روپے

نعیم اور کیلاش میں اتنی دماغی، اخلاقی اور سوشل تفاوت تھی، جتنی دو انسانوں میں ہوسکتی ہے۔ نعیم بڑا بھاری درخت تھا، کیلاش باغ کا نازک پودا، نعیم کو کریکٹ، فٹ بال، سیر و شکار کا شوق تھا، کیلاش کو مطالعہ کتب کا۔ نعیم شوخ، پُرگو، آزاد، مذاق پسند اور عیش پرست نوجوان تھا۔ اسے کل کی فکر کبھی نہ ستاتی تھی، مدرسہ اس کے لیے کھیل کا مقام تھا اور کبھی کبھی بنچ پر کھڑے ہونے کا بھی۔ اس کے برخلاف کیلاش تنہائی پسند، سست، ورزش سے کوسوں دور بھاگنے والا، کھیل کود سے بچنے والا، انجام اندیش اور معیار پرست تھا۔ وہ مستقبل کے خیالات سے پریشان رہتا تھا۔ نعیم ایک ذی ثروت اور اعلیٰ عہدہ والے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ کیلاش ایک معمولی کاروباری شخص کے کئی لڑکوں میں سے ایک۔ اسے کتابوں کے لیے کافی روپیہ نہ ملتا تھا، اوروں سے مانگ کر کام نکالا کرتا تھا۔ ایک کے لیے زندگی کا آرام خواب تھا اور دوسرے کے لیے مصیبت کا پہاڑ، مگر اس باہمی اختلاف کے ہوتے ہوئے بھی ان دونوں میں گہری دوستی اور خالص بے غرضانہ محبت تھی۔ کیلاش مرجاتا مگر نعیم کا رہین منت نہ بنتا، اور نعیم مرجاتا مگر کیلاش سے بے اعتنائی نہ کرتا۔ نعیم کی خاطر سے کیلاش کبھی کبھی پاک و صاف ہوا کا لطف اُٹھا لیا کرتا۔ کیلاش کے خاطر سے نعیم بھی کبھی کبھی مستقبل کا خواب دیکھ لیا کرتا تھا۔ مرزا نعیم کے لیے سرکاری عہدے کا دروازہ کھلا ہوا تھا، مستقبل کوئی، تھاہ ساگر نہ تھا۔ کیلاش کو اپنے ہاتھوں سے کنواں کھود کر پانی پینا تھا، جس کے خیال ہی سے اس کا دل پریشان ہوجاتا تھا۔

(۲)

کالج سے نکلنے کے بعد نعیم کو شعبہ حکومت میں ایک بڑا عہدہ مل گیا اگرچہ وہ تیسرے درجہ میں پاس ہوا تھا۔ کیلاش اول درجہ میں پاس ہوا تھا مگر اس کو برسوں ایڑیاں رگڑنے، خاک چھاننے اور کنوئیں جھانکنے پر بھی کوئی کام نہ ملا۔ حتیٰ کہ مجبور ہوکر اسے اپنے قلم کا سہارا لیا۔ اس نے ایک اخبار نکالا۔ ایک نے حکومت اور اقتدار کا راستہ اختیار کیا

جس کا مقصد زر تھا اور دوسرے نے خدمتِ خلق کا جس کا نتیجہ شہرت، تکلیف اور کبھی کبھی قید کی اذیت ہوا کرتی ہے، نعیم کو اس کے دفتر کے باہر کوئی نہ جانتا تھا، مگر وہ بنگلہ میں رہتا تھا۔ موٹر پر سوار ہوکر ہوا خوری کرتا۔ تھیٹر دیکھتا اور گرما میں نینی تال کی سیر کو جاتا۔ کیلاش کو کل دنیا جانتی تھی مگر اس کا رہائشی مکان خام تھا اور سواری کے لیے اس کے اپنے پیر، بچّوں کے لیے دودھ بھی مشکل سے ملتا، ترکاری سبزی میں کفایت کرنی پڑتی، نعیم کے لیے سب سے زیادہ خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ اس کے صرف ایک لڑکا تھا مگر کیلاش کے لیے سب سے زیادہ بدنصیبی کی بات کثیر الاولادی تھی جو اسے پنپنے نہ دیتی تھی۔ دونوں دوستوں میں خط و کتابت ہوتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی دونوں میں ملاقات بھی ہوجاتی تھی۔ نعیم کہتا تھا کہ یار تمھیں مزے میں ہو، ملک اور قوم کی کچھ خدمت تو کر رہے ہو۔ یہاں تو شکم پرستی کے سوا اور کسی کام کے نہ ہوئے۔ تم جدھر نکل جاتے ہو لوگ دعائیں دیتے ہیں یہاں چاروں طرف سے گالیاں ہی گالیاں ہیں۔

کیلاش خوب سمجھتا تھا کہ یہ صرف نعیم کا انکسار ہے۔ یہ میری بدحالی سے مغموم ہوکر میری اس طریقہ پر تشفی کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ اپنی واقعی حالت کو اس سے چھپانے کی ناکامیاب کوشش کرتا تھا۔

وشنو پور کی ریاست میں کہرام مچا ہوا تھا۔ ریاست کا منیجر اپنے بنگلہ میں ٹھیک دوپہر کے وقت قتل کردیا گیا تھا۔ اگرچہ قاتل مفرور تھا مگر حکّام کو شک تھا کہ کنور صاحب کی ترغیب ہی سے یہ خون ہوا ہے۔ کنورصاحب ابھی بالغ نہ ہوئے تھے۔ ریاست کا انتظام کورٹ آف وارڈس کے ذریعے ہوتا تھا۔ منیجر پر کنور صاحب کی نگرانی کی ذمہ داری بھی تھی، عیش پسند کنور کو منیجر کا دخل دینا سخت ناگوار ہوتا تھا، دونوں میں برسوں کی کبیدگی تھی، یہاں تک کہ کئی بار سخت کلامی کی نوبت بھی آپہنچی تھی۔ پس کنور صاحب پر شک ہونا بالکل قدرتی امر تھا۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے لیے حاکم ضلع نے مرزا نعیم کو تعینات کیا۔ کسی پولیس کے اہلکار کی معرفت تحقیقات کرانے میں کنور صاحب کی توہین کا اندیشہ تھا۔

نعیم کو تقدیر سازی کا زرّیں موقع ملا، وہ نہ بے لوث تھا نہ عقلمند سبھی اس کے طرز معاشرت کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ اگر کوئی جانتا تھا تو حکّام سرکاری۔ کنور صاحب نے منہ مانگی مراد پائی۔ نعیم جب وشنو پور پہنچا تو اس کی حد سے زیادہ خاطر مدارات ہوئی، نذریں گزرنے لگیں۔ اردلی، چپراسی، پیشکار، سائیس، باورچی، خدمت گار سبھی کی زبانیں تر اور مٹھیاں

گرم ہونے لگیں۔ کنور صاحب کے اہالی موالی رات دن گھیرے رہتے، گویا داماد سسرال آیا ہو۔

ایک روز علی الصباح کنور صاحب کی ماں آکر نعیم کے سامنے دست بستہ کھڑی ہوگئیں۔ نعیم لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا، ریاضت، پاکیزہ روی اور بیوگی کے اس آبدار مجسمہ کو دیکھ نعیم اُٹھ بیٹھا۔ رانی نے اس کو مامتا بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ حضور میرے بیٹے کی زندگی آپ کے ہاتھ ہے۔ آپ ہی اس کے تقدیر کا فیصلہ کرنے والے ہیں۔ آپ کو اسی ماں کی قسم ہے جس کے آپ لائق بیٹے ہیں کہ میرے بیٹے کی حفاظت کیجیے گا۔ میں اپنا تن من دھن آپ کے پیروں پر نثار کرتی ہوں۔

خودغرضی اور رحم کے اتصال نے نعیم کو پورے طور پر مسخر کرلیا۔

(۳)

انھیں دنوں کیلاش نعیم سے ملنے آیا، دونوں دوست بڑے تپاک سے گلے ملے۔ نعیم نے باتوں باتوں یہ سارا حال کہہ سنایا اور کیلاش پر اپنے طرزِ عمل کی واجبیت ثابت کرنی چاہی۔

کیلاش نے کہا۔ میری رائے میں گناہ ہمیشہ گناہ ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔

نعیم۔ اور میری رائے ہے کہ اگر گناہ سے کسی کی جان بچتی ہو تو وہ عین ثواب ہے۔ کنور صاحب ابھی نوجوان شخص ہیں۔ نہایت ہونہار، عقلمند، سخی، اور ہمدرد ہیں۔ آپ ان سے ملیں تو خوش ہوجائیں۔ وہ نہایت منکسر مزاج ہیں۔ منیجر واقعی بدمزاج تھا، خواہ مخواہ کنور صاحب کو تنگ کیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک موٹر کے لیے اس نے روپے منظور نہ کیے نہ منظوری کی سفارش کی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کنور صاحب کا یہ کام واجبی ہے۔ لیکن بحث یہ ہے کہ انھیں مجرم ثابت کرکے کالے پانی کی ہوا کھلائے جاوے یا بے قصور ثابت کرکے ان کی جان بچائی جاوے۔ اور بھائی تم سے تو کوئی پردہ نہیں ہے، پورے بیس ہزار کی رقم ہے۔ بس مجھے اپنی رپورٹ میں یہ لکھ دینا ہوگا کہ ذاتی عناد کے سبب یہ واقعہ ہوا ہے، راجا صاحب کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو شہادتیں مل سکیں انھیں میں غائب کردیا۔ مجھے اس کام کے لیے تعینات کرنے میں حکام کی ایک مصلحت تھی۔ کنور صاحب ہندو ہیں، اس لیے کسی

ہندو حاکم تعنیات نہ کر کے حاکم ضلع نے یہ کام میرے سپرد کیا۔ یہ فرقہ وارانہ عناد مجھے بے لوث ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ میں نے دو چار موقعوں پر کچھ تو حکام کی ترغیب سے اور کچھ اپنی طبیعت سے مسلمانوں کی طرفداری کی جس سے یہ مشہور ہو گیا کہ میں ہندوؤں کا دشمن ہوں۔ ہندو لوگ تو مجھے جانب داری کا اوتار سمجھتے ہیں۔ یہ خیال مجھے الزامات سے بری کرنے کے لیے کافی ہے۔ بتلاؤ، ہوں قسمت ور کہ نہیں؟

کیلاش۔ اگر کہیں بات ظاہر ہوگئی تو؟

نعیم۔ یہ میری سمجھ کا پھیر، میری تحقیقات کا قصور، بشریت کے ایک اٹل قانون کا نمونہ ہوگا۔ میں کوئی عالمِ کل تو ہوں نہیں۔ میری نیت پر آنچ نہ آنے پاوے گی۔ مجھ پر رشوت ستانی کا شبہ نہ ہو سکے گا۔ آپ اس کے عملی پہلو پر نہ جایئے، صرف اخلاقی پہلو پر نگاہ رکھیے۔ آیا کام حکمت عملی کے مطابق ہے یا نہیں؟ روحانی اصولوں کو نہ کھینچ لایئے گا، صرف حکمت عملی کے اصولوں سے اسے جانچیے۔

کیلاش۔ اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دیگر رؤساء کو بھی ایسی بداعمالیوں کی تحریک ہوگی۔ دولت سے بڑے بڑے پاپوں پر پردہ پڑسکتا ہے۔ اس خیال کی اشاعت کا نتیجہ کتنا خوفناک ہوگا، اس کا آپ خود اندازہ کرسکتے ہیں۔

نعیم۔ جی نہیں، میں یہ قیاس نہیں کرسکتا۔ رشوت اب بھی نوّے ۹۰ فیصدی مقدمات کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ پھر گناہوں کا خوف ہر دل میں موجود ہے۔

دونوں دوستوں میں دیر تک اس موضوع پر بحث ہوتی رہی لیکن کیلاش کا منصفانہ خیال نعیم کے مذاق اور تمسخر سے پیش نہ پاسکا۔

(۴)

وشنوپور کے قتل پر اخبارات میں رائے زنی ہونے لگی۔ سبھی ہم آواز ہوکر راجا صاحب ہی کو ملزم قرار دیتے اور سرکار کو راجا صاحب کی نا واجب طرف داری کرنے کی مجرم لیکن ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیتے تھے کہ ابھی یہ مقدمہ زیر تجویز ہے۔ پس اس پر کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی۔

مرزا نعیم نے اپنی تحقیقات کو صحیح دکھلانے کے لیے پورا ایک مہینہ گزار دیا۔ جب

ان کی رپورٹ شائع ہوئی تو سیاسی فضا میں تہلکا مچ گیا۔ عوام کا شبہ یقین کے درجے پر پہنچ گیا۔

کیلاش کے سامنے اب ایک پیچیدہ مسئلہ نمود ہوا۔ ابھی تک اس نے اس معاملے میں بالکل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ وہ یہ طے نہ کرسکتا تھا کہ کیا لکھوں۔ گورنمنٹ کی طرفداری کرنا، اپنی روح کو پامال کرنا تھا، دل کی آزادی کو قربان کرنا تھا۔ مگر خاموش رہنا اور بھی ہتک آمیز تھا۔ آخر جب معاصرین میں سے دو چار نے اس پر حملہ کرنے شروع کیے کہ اس کا سکوت بے وجہ نہیں ہے تو اس کے لیے کنارہ کش رہنا دشوار ہوگیا۔ اس کے ذاتی اور قومی فرائض میں سخت جد و جہد ہونے لگی۔ اس دوستی کو جس کا بیج پچیس سال قبل دل میں بویا گیا تھا۔ اور اب جو ایک گھنے بھاری درخت کی صورت اختیار کرچکی تھی۔ دل سے نکالنا دل کو چیر ڈالنا تھا۔ وہ دوست جو اُس کے دُکھ میں دُکھی اور سکھ میں سکھی ہوتا تھا۔ جس کا فیاض دل ہمیشہ اس کی مدد کے لیے تیار رہتا تھا۔ جس کے گھر میں جاکر وہ اپنی تفکرات کو بھول جاتا تھا، جس کے گلے لگ کر وہ اپنی تکلیفوں سے نجات پاجاتا تھا۔ جسے دیکھنے ہی سے اسے تشفی استواری اور تازگی نصیب ہوتی تھی۔ اسی دوست کی جڑ کھودنے پڑے گی، وہ بُری ساعت تھی، جب میں نے اخباری دنیا میں قدم رکھا، ورنہ آج اس "دھرم سنکٹ" میں کیوں پڑتا؟ کتنی زبردست بے اعتباری کا کام ہوگا۔ اعتبار دوستی کا خاص جزو ہے۔ نعیم نے مجھ پر ہمیشہ اعتبار کیا ہے، اس نے مجھ سے کبھی پردہ نہیں رکھا۔ اس کی ان پوشیدہ باتوں کو ظاہر کرنا اس کے ساتھ کتنی زبردست نا منصفی ہوگی، نہیں میں دوستی کو کلنک نہ لگاؤں گا۔ اس کی سفیدی کو داغ دار نہ ہونے دوں گا، دوستی کی بیخ کنی نہ کروں گا۔ ایشور وہ دن نہ لاوے کہ میرے ہاتھوں نعیم کو نقصان پہنچے۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اگر مجھ پر کوئی مصیبت پڑے تو نعیم میرے لیے جان تک دے دینے کو تیار ہوجائے گا۔ اسی دوست کی میں دنیا کے سامنے توہین کروں، اس کی گردن پر کلہاڑا چلاؤں۔ ایشور مجھے وہ دن نہ دِکھانا۔

لیکن قومی فرض کی بات بھی کمزور نہ تھی۔ اخبار کا اڈیٹر ہمیشہ کے قاعدوں کے مطابق قوم کا خادم ہے۔ وہ جو کچھ دیکھتا ہے قومی وسیع النظری سے۔ وہ جو کچھ سوچتا ہے اس پر بھی قومیت کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ہمیشہ قومی خیالات کو وسیع فضا میں گھومتے رہنے

سے شخصی اہمیت کا دائرہ اس کی نگاہوں میں بہت تنگ ہوجاتا ہے۔ وہ شخصیت کو ہیچ، حقیر اور نا قابلِ توجہ خیال کرنے لگتا ہے۔ شخصیت کو قومیت پر قربان کرنا اس کی روش کا مقدم ترین اقتضاء ہے، حتیٰ کہ وہ اکثر اپنی غرض کو قوم پر نچھاور کر دیتا ہے، اس کی زندگی کا مقصدِ عظیم اور اس کا معیار پاکیزہ ہوتا ہے، وہ اُن زبردست شخصیتوں کا مقلد ہوتا ہے، جنھوں نے قوموں کو بنایا اور سنوارا ہے، جن کا نام امر ہوگیا ہے، جو مظلوم قوموں کے لیے نجات دہندہ ثابت ہوچکیں ہیں۔ وہ حتیٰ الامکان کوئی کام ایسا کرتا جس سے اس کے پیشروؤں کی چمکتی ہوئی شہرت میں داغ لگ جانے کا اندیشہ ہو۔ کیلاش سیاسی دنیا میں بہت کچھ عزت و شہرت حاصل کرچکا تھا۔ اس کی رائے عزت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی۔ اس کے بے خوف خیالات نے، اس کی غیر جانب دارانہ رایوں نے اسے اڈیٹروں کی جماعت کا پیشوا بنا دیا تھا۔ پس اس موقع پر دوستی کا نباہ صرف اس کی پسندیدہ روش اور معیار ہی کے خلاف نہیں، اس کے دلی جذبات کے بھی منافی تھا۔ اس میں اس کی توہین تھی، پستی تھی، بزدلی تھی! یہ فرض کے راستہ سے منحرف ہونا اور سیاسی حلقہ سے ہمیشہ کے لیے خارج ہوجانا تھا۔ ایک شخص کی خواہ وہ مجھے کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو، قوم کے سامنے کیا ہستی ہے؟ نعیم کے بننے یا بگڑنے سے قوم پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ لیکن حکومت کی خودمختارانہ روش اور زیادتیوں پر پردہ ڈالنا قوم کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔ اسے اس کی پروا نہ تھی کہ میری رائے زنی کا ظاہرہ کوئی اثر ہوگا یا نہیں۔ اڈیٹر کی نگاہ میں اپنی رائے شیر کی گرج کی مانند معلوم ہوتی ہے۔ وہ شاید سمجھتا ہے کہ میرا قلم حکومت کو، ساری دنیا کو ہلا دے گا۔ شاید میرے قلم کی جنبش سے پورا برہمانڈ کانپ اُٹھے گا، میرے خیالات کا ظہور انقلابِ عظیم پیدا کردے گا۔ نعیم میرا دوست ہے، مگر قوم میری دیوی ہے کیا اپنے دوست کی حفاظت کے لیے اپنی ناقابلِ پرستش دیوی کو مہلک چوٹ پہنچاؤں؟

کئی روز تک کیلاش کے شخصی اور ادارتی فرائض میں مجادلہ ہوتا رہا۔ آخر قومیت نے شخصیت کو شکست دی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ میں اس راز کی اصلی ہیت ظاہر کردوں گا۔ حکومت کے غیرذمہ دارانہ حرکتوں کو عوام کے سامنے کھول کر رکھ دوں گا، حکومت کے اہلکاروں کی خودغرضیوں کا نمونہ دکھا دوں گا۔ دنیا پر روشن کردوں گا کہ سرکار کن آنکھوں سے دیکھتی ہے اور کن کانوں سے سنتی ہے۔ اس کی ناقابلیت اور اس کی کمزوری کو ثابت

کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کون مثال مل سکتی ہے؟ نعیم میرا دوست ہے تو ہوا کرے۔ قوم کے مقابلے میں وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس نقصان کے خیال سے میں قومی فرض سے کیوں منہ موڑوں؟ اپنی آتما کو کیوں بگاڑوں؟ اپنی آزادی کو کیوں بدنام کروں؟ آہ! جان سے عزیز نعیم! آج تم جیسے عزیز دوست کو میں فرض پر قربان کرتا ہوں مگر تمھاری جگہ اگر میرا خاص لڑکا ہوتا تو اسے بھی اس فرض کی درگاہ میں قربان کردیتا!!

دوسرے روز سے کیلاش نے اس المناک واقعہ پر لکھنا شروع کیا جو کچھ اس نے نعیم سے سنا تھا وہ سب ایک سلسلۂ مضامین کی شکل میں شائع ہونے لگا۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے؟ دوسرے اڈیٹروں کے یہاں قیاس، دلیل اور بحث کی بناء پر اپنی رائے قائم کرنی پڑتی تھی اور اس لیے وہ کتنی ہی فضول اور قابلِ اعتراض باتیں لکھ ڈالتے تھے وہاں کیلاش کی رائے عین ثبوتوں سے مزین ہوتی تھی۔ وہ بڑے پتے کی باتیں کہتا تھا اور ایسی بے خوفی سے جو روشن ضمیری کا اظہار کرتی تھی۔ اس کے مضامین میں طول کم، تفتیش زیادہ ہوتی تھی۔ اس نے نعیم کو بھی نہ چھوڑا، اس کی حرص و طمع کا خوب مضحکہ اُڑایا۔ یہاں تک کہ ان روپیوں کی تعداد بھی لکھ دی جو اس ناجائز معاملہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے دی گئی تھی۔ سب سے مزے کی بات یہ تھی کہ اس نے نعیم سے ایک قومی جاسوس کی ملاقات کا بھی تذکرہ کیا تھا۔ جس نے نعیم کو روپے لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ آخر میں سرکار کو بھی چنوتی دی کہ اگر اس میں ہمت ہو تو میرے ثبوت کی تردید کرے، اتنا ہی نہیں، اس نے وہ گفتگو بھی حرف بہ حرف شائع کردی جو اس کے اور نعیم کے درمیان ہوئی، رانی کا نعیم کے پاس آنا، اس کے پیروں پڑنا، کنور صاحب کا نعیم کے پاس انواع و اقسام کے تحائف لے کر جانا، ان سبھی باتوں نے اس کے مضامین میں ایک جاسوسی ناول کا لطف پیدا کردیا۔

ان مضامین نے سیاسی فضا میں ہلچل پیدا کردی۔ اڈیٹر صاحبان کو حکام پر نشانہ لگانے کے لیے ایسے موقع بڑی خوش قسمتی سے ملتے ہیں۔ جگہ جگہ اس حکومت کے کرتوت کی مذمت کرنے کے لیے جلسے ہونے لگے۔ کئی ممبروں نے قانونی مجالس میں اس بارہ میں سوال کرنے کی نوٹس دی۔ حکام کو کبھی ایسی منہ کی نہ کھانی پڑی تھی۔ آخر انھیں اپنی عزت کی حفاظت کے لیے اس کے سوا اور کوئی تدبیر نہ سوجھی کہ وہ مرزا نعیم کو کیلاش پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ چلانے کے لیے مجبور کریں۔

کیلاش پر استغاثہ دائر ہوا۔ مرزا نعیم کی طرف سے سرکار پیروی کرتی تھی۔ کیلاش خود ہی پیروی کر رہا تھا۔ انصاف کے خاص محافظ وکیل صاحبان (وکیل بیرسٹر وغیرہ) نے کسی نا معلوم سبب سے ان کی پیروی کرنا منظور نہ کیا۔ حاکم کو مجبور ہوکر کیلاش کو قانونی سند نہ رکھنے پر بھی اپنے مقدمے کی پیروی کی اجازت دینی پڑی۔ مقدمہ مہینوں تک چلتا رہا۔ عوام میں سنسنی پھیل گئی۔ روز ہزاروں آدمی عدالت میں جمع ہوتے تھے، بازاروں میں مقدمہ کی خبر پڑھنے کے لیے اخباروں کی لوٹ ہوتی تھی، ہوشیار پڑھنے والے پڑھے ہوئے اخباروں سے گھڑی رات جاتے جاتے دوگنے پیسے کھڑے کر لیتے تھے۔ کیوں اس وقت تک اخبار فروشوں کے پاس ایک پرچہ نہ رہ جاتا تھا، جن باتوں کا علم پہلے اخبارات کے محض اِنے گِنے گاہکوں کو تھا ان پر اب عوام رائے زنی کرنے لگے۔ نعیم کی مٹی کبھی اتنی پلید نہ ہوئی تھی، گلی گلی، گھر گھر، اسی کا چرچا تھا۔ عوام کا غصہ اسی پر مرکوز ہوگیا تھا۔ وہ دن بھی یادگار رہے گا۔ جب دونوں سچے اور ایک دوسرے پر جان دینے والے دوست عدالت میں بالمقابل کھڑے ہوئے اور کیلاش نے مرزا نعیم سے جرح شروع کی۔ کیلاش کو ایسی روحانی تکلیف ہو رہی تھی گویا وہ نعیم کی گردن پر تلوار پھیرنے جارہا ہے اور نعیم کے لیے وہ سخت آزمائش کی گھڑی تھی۔ دونوں کے چہرے اُترے ہوئے تھے، ایک کا دلی تکلیف سے اور دوسرے کا خوف سے۔ نعیم ظاہرہ خوش ہونے کی کوشش کرتا تھا، کبھی کبھی خشک ہنسی بھی ہنستا تھا، لیکن کیلاش، آہ اس غریب کے دل پر جو گزر رہی تھی، اسے کون جان سکتا ہے؟

کیلاش نے پوچھا۔ آپ اور میں ساتھ پڑھتا تھا۔ اسے آپ تسلیم کرتے ہیں؟

نعیم۔ ضرور تسلیم کرتا ہوں۔

کیلاش۔ ہم دونوں میں اتنا میل جول تھا کہ ہم آپس میں کوئی پردہ نہ رکھتے تھے۔ اسے بھی آپ تسلیم کرتے ہیں؟

نعیم۔ ضرور تسلیم کرتا ہوں۔

کیلاش۔ جن دنوں آپ اس معاملہ کی تفتیش کر رہے تھے میں آپ سے ملنے گیا تھا، اسے بھی آپ تسلیم کرتے ہیں؟

نعیم۔ ضرور تسلیم کرتا ہوں۔

کیلاش۔ کیا آپ نے اس وقت مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ کنور صاحب کی تحریک سے یہ قتل ہوا ہے؟

نعیم۔ ہرگز نہیں۔

کیلاش۔ آپ کی زبان سے یہ الفاظ نہیں نکلے تھے کہ بیس ہزار کی تھیلی ہے؟

نعیم ذرا بھی نہ جھجھکا، ذرا بھی محجوب نہ ہوا، اس کی زبان میں ذرا بھی لکنت نہ ہوئی، آواز میں ذرا بھی لغزش نہ پیدا ہوئی، اس کے چہرہ پر بے اطمینانی، پریشانی یا بے صبری کی کوئی بھی علامت نظر نہ آئی وہ ساکت کھڑا رہا۔ کیلاش نے بہت ڈرتے ڈرتے یہ سوال کیا تھا، اسے خوف تھا کہ نعیم اس کا جواب نہ دے سکے گا۔ لیکن نعیم نے بے خوفی سے کہا۔ ممکن ہے، آپ نے مجھ سے خواب میں باتیں سُنی ہوں۔

کیلاش ایک لمحہ کے لیے دنگ ہوگیا۔ پھر اس نے حیرت سے نعیم کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ کیا آپ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ میں نے دو چار موقعوں پر مسلمانوں کی طرفداری کی ہے اور اسی لیے ہندوؤں کا مخالف سمجھ کر اس تحقیقات کا کام میرے سپرد کیا گیا ہے؟

نعیم ذرا بھی نہ جھجھکا، استقلال اور سکون کے لہجے میں بولا۔ واقعی آپ کا تخیل نہایت تعجب خیز ہے۔ برسوں تک آپ کے ساتھ رہنے پر بھی مجھے یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ آپ میں واقعاتی کی ایسی حیرت انگیز قوت ہے۔

کیلاش نے اور کوئی سوال نہ کیا۔ اسے اپنی ہار کا غم نہ تھا، غم جو تھا نعیم کی اخلاقی زوال کا۔ وہ گمان بھی نہ کرسکتا تھا کہ کوئی شخص اپنے منہ سے کہی ہوئی بات سے ایسی بے حیائی کے ساتھ انکار کرسکتا ہے۔ اور وہ بھی اسی شخص کے منہ پر جس سے وہ بات کہی گئی ہو۔ یہ انسانی کمزوری کی انتہا ہے۔ وہ نعیم جس کا ظاہر و باطن ایک تھا، جس کے قول و فعل میں فرق نہ تھا، جس کی تقریر دلی جذبات کا آئینہ تھی، وہ نعیم، وہ سادہ خود دار، راست باز نعیم ایسا جھوٹا اور مکّار ہوسکتا ہے! کیا غلامی کے سانچے میں ڈھل کر انسان اپنی انسانیت کھو بیٹھتا ہے؟ کیا یہ نیک اوصاف کو معکوس بنا دینے کی مشین ہے؟

عدالت نے نعیم کو بیس ہزار روپیوں کی ڈگری دے دی! کیلاش پر گویا بجلی گری!

(۶)

اس فیصلہ پر سیاسی دنیا میں پھر کہرام مچا۔ سرکار کے جانب دار اخبارات نے کیلاش

کو فریبی بتلایا، عوام کی طرف والوں نے نعیم کو شیطان کہا۔ نعیم کی دیدہ نے سرکاری انصاف کی نگاہوں میں خواہ اسے بے قصور ٹھہرایا ہو مگر عوام کی نظروں میں تو اُسے اور بھی ذلیل کردیا۔ کیلاش کے پاس ہمدردی کے خطوط اور تار آنے لگے۔ اخبارات میں اس کی ہمت اور راست بازی کی تعریف ہونے لگی۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے اور عدالت کے فیصلہ پر اظہارِ ناراضگی کیا گیا۔ مگر سوکھے بادلوں سے تو زمین سیراب نہیں ہوتی۔ روپے کہاں سے آئیں اور وہ بھی ایک دم بیس ہزار! معیار پرستی کی یہ قیمت ہے۔ قومی خدمت، مہنگا سودا ہے۔ بیس ہزار! اتنے روپے تو کیلاش نے شاید خواب میں بھی نہ دیکھے ہوں اور اب وہی دینے پڑیں گے! کہاں سے دے گا؟ اتنے روپیوں کے سود ہی سے وہ کسبِ معاش کی تفکرات سے نجات پاسکتا تھا۔ اسے اپنے اخبار میں اپنی مصیبت کا رونا روکر چندہ فراہم کرنے سے نفرت تھی۔ میں نے اپنے گاہکوں کی صلاح لے کر اس شیر سے مورچہ نہیں لیا تھا۔ منیجر کی وکالت کرنے کے لیے کسی نے میرا گلا نہیں دبایا تھا۔ میں نے اپنا فرض سمجھ کر حکام کو للکارا تھا۔ جس کام کے لیے میں تنہا ذمہ دار ہوں اس کا بار اپنے گاہکوں پر کیوں ڈالوں؟ بے انصافی ہے۔ ممکن ہے عوام میں تحریک کرنے سے دو چار ہزار روپے ہاتھ آجائیں۔ مگر یہ ادارتی معیار کے خلاف ہے۔ اس سے میری شان میں بٹا لگتا ہے۔ دوسروں کو یہ کہنے کا کیوں موقع دوں کہ اور کے ماتھے پکوڑیاں کھائیں تو کیا بڑا جگ جیت لیا؟ جب جانتے کہ اپنے بل بوتے پر گرجتے۔ بے خوفی سے رائے زنی کرنے کا سہرا تو میرے سر بندھا، اس کی قیمت دوسروں سے کیوں وصول کروں؟ میرا اخبار بند ہوجائے، میں پکڑکر قید کیا جاؤں، میرا مکان قرق کیا جاوے، برتن وغیرہ نیلام ہوجائیں یہ سب مجھے منظور ہے جو کچھ سر پر پڑے گی بھگت لوں گا، مگر کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤں گا۔

طلوعِ آفتاب کا وقت تھا۔ مشرق سے نورانی شعاعیں ایسی دوڑی چلی آتی تھیں۔ جیسے آنکھ میں آنسوؤں کی لڑیاں سرد ہوا کلیجے میں یوں لگتی تھی جیسے کسی کے آہ و بکا کی آواز، سامنے کا میدان کسی مغموم دل کی طرح نورانی تیروں سے بند رہا تھا۔ مکان میں وہ خاموشی تھی جو گھر کے مالک کے خاموش گریہ کی خبر دیتی ہے۔ نہ لڑکوں کا شور وغل تھا اور نہ ماں کی سکوں گستر لفظی دھمکیاں۔ جب چراغ بجھ رہا ہو تو گھر میں اُجالا کہاں سے آوے؟ یہ اطمینان کا اثر نہیں، غم کا اثر تھا، کیونکہ آج ہی قرق امین کیلاش کے مال و اسباب کو نیلام

کرنے کے لیے آنے والا تھا۔

اس دلی رنج سے بے قرار ہوکر کہا۔ آہ! آج میری پبلک زندگی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ جس مکان کی تعمیر میں اپنی زندگی کے پچیس سال لگا دیے وہ آج تباہ برباد ہوجائے گا۔ اخبار کی گردن پر چھری پھرجاوے گی۔ میرے پیروں میں ذلت و مضحکہ کی بیڑیاں پڑجائیں گی۔ چہرے پر کالکھ لگ جائے گی۔ یہ سکوں بخش مکان اوجڑ جائے گا اور یہ مغموم کنبہ کسی مرجھائے ہوئے پھول کی پنکھڑیوں کی طرح بکھر جائے گا۔ دنیا میں اس کے لیے کہیں بھی سہارا نہیں ہے۔ عوام کی یاد میں قیام نہیں ہوتی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں میری خدمات سہو کی تاریکی میں جذب ہوجائیں گی، کسی کو میرا خیال بھی نہ رہے گا۔ کوئی میری مصیبت پر آنسو بہانے والا بھی نہ ہوگا۔

دفعتاً اس کو یاد آیا کہ آج کے لیے ابھی افتتاحیہ مضمون لکھنا ہے آج اپنے ہمدرد ناظرین کو خبر دوں کہ یہ اس اخبار کی زندگی کا آخری دن ہے، اسے پھر آپ کی خدمت میں پہنچنے کا افتخار نہ حاصل ہوگا۔ ہم سے متعدد خطائیں سرزد ہوئی ہوں گی، آج ہم ان کے لیے آپ سے معافی کے خواستگار ہیں۔ آپ نے ہمارے ساتھ جو رفاقت اور ہمدردی کی ہے اس کے لیے ہم ہمیشہ آپ کے ممنون رہیں گے۔ ہمیں کسی سے کوئی شکایت نہیں، کیونکہ یہ خوش نصیبی انھیں کا حصہ ہے جو اپنے فرض کے راستہ پر اٹل رہتے ہیں۔ افسوس یہی ہے کہ ہم قوم کے لیے اس سے بھی زیادہ قربانی کرنے کے قابل نہ ہوسکے۔ اس مضمون کو شروع سے آخیر تک سوچ کر کرسی سے اُٹھا ہی تھا کہ کسی کے پیروں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ گردن اُٹھاکر دیکھا تو مرزا نعیم تھے! وہی ہنس مکھ صورت، وہی دلآویز تبسم، وہی شوخی بھریں آنکھیں، آتے ہی کیلاش کے گلے سے لپٹ گیا۔

کیلاش نے گلا چھڑاتے ہوئے کہا۔ ”کیا میرے زخم پر نمک چھڑکنے آئے ہو، میری لاش کو پیروں سے ٹھکرانے آئے ہو؟“

نعیم نے اس کی گردن کو اور زور سے دبا کر کہا۔ اور کیا، محبت کے یہی تو مزے ہیں۔

کیلاش۔ مجھ سے مذاق نہ کرو۔ بھرا بیٹھا ہوں، مار بیٹھوں گا۔

نعیم کی آنکھیں آب گوں ہوگئیں۔ بولا۔ آہ ظالم! میں تیری زبان سے یہی سخت لفظ

سننے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ جی بھر کر کوسو، خوب گالیاں دو مجھے اس میں نغمہ شیریں کا مزہ آرہا ہے۔

کیلاش۔ اور ابھی جب قرق امین میرا گھر بار نیلام کرنے آوے گا تو کیا ہوگا؟ بولو۔ اپنی جان بچا کر تو الگ ہوگئے۔

نعیم۔ ہم دونوں مل کر خوب تالیاں بجائیں گے اور اسے بندر کی طرح نچا دیں گے۔

کیلاش۔ تم اب پٹوگے۔ میرے ہاتھوں سے ظالم! تجھے میرے بچوں پر بھی رحم نہ آیا۔

نعیم۔ تم بھی تو چلے مجھی سے زور آزمائی کرنے۔ کوئی وقت تھا، جب بازی تمھارے ہاتھ رہتی تھی۔ اب میری ہے۔ تم نے موقع و محل کا تو خیال نہیں کیا بس مجھ پر برس پڑے۔

کیلاش۔ سچائی کی ذلت کرنا میرے اصولوں کے سراسر خلاف تھا۔

نعیم۔ اور سچائی کا گلا گھونٹنا میرے اصول کے عین مطابق۔

کیلاش۔ ابھی ایک پورا کنبہ تمھارے گلے مڑھ دوں گا، تو اپنی قسمت کو روؤگے۔ دیکھنے میں تمھارا نصف بھی نہیں ہوں، مگر بچے پیدا کرنے میں تم جیسے تین سے بھی زیادہ وزنی ہوں۔ پورے سات بچے ہیں۔ کم نہ زیادہ۔

نعیم اچھا لاؤ کچھ کھلاتے پلاتے ہو یا تقدیر کا مرثیہ ہی گائے جاؤگے، تمھارے سر کی قسم بہت بھوکا ہوں، گھر سے بلا کھائے ہی چل پڑا تھا۔

کیلاش۔ یہاں آج سولہوں ڈنڈ ایکادشی ہے۔ سب کے سب غم میں بیٹھے ہوئے اسی عدالتی جلاد کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ کھانے پینے کا کیا ذکر؟ تمھارے بیگ میں کچھ ہو تو نکا لو، آج ساتھ بیٹھ کر کھالیں، پھر تو زندگی بھر کا رونا ہی ہے۔

نعیم۔ پھر تو ایسی شرارت نہ کروگے؟

کیلاش۔ واہ۔ یہ تو اپنے بال بال میں سرایت کر گئی ہے۔ جب تک سرکار حیوانی طاقت سے ہم پر حکومت کرتی رہے گی، ہم اس کی برابر مخالفت کرتے رہیں گے۔ افسوس یہی ہے کہ مجھے اس کا موقع ہی نہ ملے گا۔ مگر تمھیں بیس ہزار میں سے بیس بھی نہ ملیں گے۔ یہاں ردّی کے انبار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

نعیم۔ اجی میں تم سے بیس ہزار کے بجائے اس کا پانچ گنا وصول کرلوں گا۔ تم ہو کس پھیر

میں۔

کیلاش۔ منہ دھو رکھیے۔

نعیم۔ مجھے روپیوں کی ضرورت ہے آؤ، کچھ سمجھوتہ کرلو۔

کیلاش۔ کنور صاحب کے بیس ہزار روپے ہضم کر گئے، پھر بھی آسودگی نہیں ہوئی۔ بد ہضمی ہو جائے گی۔

نعیم۔ روپیہ سے روپیہ کی بڑھتی ہے، آسودگی نہیں ہوتی۔ آؤ کچھ معاملہ کرلو، سرکاری اہلکاروں کی معرفت معاملہ کرنے میں اور بھی زیرباری ہوگی۔

کیلاش۔ ارے تو کیا معاملہ کرلوں، یہاں کاغذوں کے سوا اور کچھ ہو بھی تو!

نعیم۔ میری بیباقی بھر کو بہت ہے۔ اچھا اسی بات پر سمجھوتہ کرلو کہ میں جو چیز چاہوں لے لوں۔ پھر رونا نہیں۔

کیلاش۔ اجی تم سارا دفتر سر پر اُٹھا لے جاؤ، گھر اٹھا لے جاؤ۔ مجھے پکڑ لے جاؤ۔ اور بیٹھے ٹکڑے کھلاؤ۔ قسم لے لو جو ذرا چوں و چرا کروں۔

نعیم۔ نہیں، میں صرف ایک چیز چاہتا ہوں۔ صرف ایک چیز؟

کیلاش کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ سوچنے لگا کہ میرے پاس ایسی کون سی بیش قیمت چیز ہے؟ کہیں مجھ سے مسلمان ہونے کو تو نہ کہے گا۔ یہی ایمان ایک چیز ہے۔ جس کی قیمت ایک سے لے کر بے شمار روپیوں تک رکھی جا سکتی ہے۔ خیر ذرا دیکھوں تو حضرت کہتے کیا ہیں؟

اس نے پوچھا۔ کیا چیز؟

نعیم۔ مسز کیلاش سے ایک منٹ تک تنہائی میں گفتگو کرنے کی اجازت۔

کیلاش نے نعیم کے سر پر ایک چپت لگا کر کہا۔ پھر وہی شرارت سیکڑوں بار تو دیکھ چکے ہو، ایسی کون اِندر کی پری ہے۔

نعیم۔ وہ جو کچھ بھی ہو، معاملہ کرتے ہو تو کرو۔ مگر یاد رکھنا تنہائی کی شرط ہے۔

کیلاش۔ منظور ہے! پھر جو ڈگری کے روپے طلب کیے گئے تو نوچ ہی کھاؤں گا۔

نعیم۔ دل سے منظور ہے!

کیلاش۔ (آہستہ سے) مگر یار! نازک مزاج عورت ہے، کوئی بے ہودہ مذاق نہ کر بیٹھنا۔

نعیم۔ جی، ان باتوں میں مجھے آپ کی نصیحت کی حاجت نہیں مجھے کمرے میں لے تو چلیے۔
کیلاش۔ سر نیچا کیے رہنا۔
نعیم۔ اجی آنکھوں میں پٹی باندھ دو۔

کیلاش کے مکان پر پردہ نہ تھا، اُما مغموم بیٹھی ہوئی تھی۔ دفعتاً نعیم اور کیلاش کو دیکھ کر چونک پڑی، بولی۔ آئے مرزا جی، اب کے تو بہت دنوں میں یاد کیا۔

کیلاش۔ نعیم کو وہیں چھوڑ کر کمرہ کے باہر نکل آیا لیکن پردہ کے آڑ سے چھپ کر دیکھنے لگا کہ ان میں کیا باتیں ہوتی ہیں۔ اسے کچھ بدگمانی نہ تھی صرف حیرت تھی۔
نعیم۔ ہم سرکاری آدمیوں کو اتنی فرصت کہاں؟ ڈگری کے روپے وصول کرنے تھے اس لیے چلا آیا ہوں۔
اُما۔ کہاں تو مسکرا رہی تھی، کہاں روپے کا نام سنتے ہی اس کا چہرہ فق ہوگیا۔ متانت سے بولی۔ ہم لوگ خود اسی فکر میں ہیں۔ کہیں روپے ملنے کی امید نہیں ہے اور ان کو عوام سے اپیل کرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔
نعیم۔ اجی، آپ کہتی کیا ہیں؟ میں نے سب روپے پائی پائی وصول کر لیے۔

اُما نے متحیر ہوکر کہا۔ سچ! ان کے پاس روپے کہاں تھے؟
نعیم۔ ان کی ہمیشہ سے یہی عادت ہے۔ آپ سے کہہ رکھا ہوگا کہ میرے پاس کوڑی نہیں ہے۔ لیکن میں نے چٹکیاں بجاتے وصول کرلیا، آپ اُٹھیے اور کھانے کا انتظام کیجیے۔
اُما۔ روپے بھلا کیا دیے ہوں گے۔ مجھے اعتبار نہیں ہوتا۔
نعیم۔ آپ سیدھے مزاج کی ہیں اور وہ ایک ہی کائیاں، اسے تو میں ہی خوب جانتا ہوں، اپنی غریبی کے دُکھڑے سنا سنا کر آپ کو چکما دیا کرتا ہوگا۔

کیلاش مسکراتے ہوئے کمرہ میں آئے اور بولے۔ اچھا اب نکلیے باہر! یہاں بھی اپنی شیطنت سے باز نہیں آئے؟
نعیم۔ روپیوں کی رسید تو لکھ دوں۔
اُما۔ کیا تم نے روپے دے دیے؟ کہاں ملے؟
کیلاش۔ پھر کبھی بتلا دوں گا۔ اُٹھیے حضرت!
اُما۔ بتلاتے کیوں نہیں، کہاں ہے؟ مرزا جی سے کون سا پردہ ہے؟

کیلاش۔ تم اُما کے سامنے میری توہین کرنا چاہتے ہو؟

نعیم۔ تم نے ساری دنیا کے سامنے میری توہین نہیں کی؟

کیلاش۔ تمھاری توہین کی تو اس کے لیے بیس ہزار روپے نہیں دینے پڑے؟

نعیم۔ میں بھی اسی ٹکسال کے روپے دے دوں گا۔ اُما! میں روپے پا گیا۔ ان بے چارے کا پردہ ڈھکا رہنے دو۔

یہ افسانہ 'مادھوری' کے جنوری 1925 کے شمارے میں شائع ہوا۔ ہندی میں مان سرودر 3 اور اردو میں 'فردوس خیال' میں شامل ہے۔

دِھکّار

اَناتھ اور بدھوا مانی کے لیے جیون میں اب رونے کے سوا دوسرا اولمب (سہارا) نہ تھا۔ وہ پانچ ہی ورس کی تھی جب پتا کا دیہانت (انتقال) ہوگیا۔ ماتا نے کسی طرح اس کا پالن کیا۔ سولہ برس کی اوستھا میں محلے والوں کی مدد سے اس کا بواہ بھی ہوگیا، پر سال کے اندر ہی ماتا اور پتی دونوں بدا ہوگئے۔ اس وپتی میں اسے اپنے چاچا بنشی دھر کے سوا اور کوئی ایسا نظر نہ آیا جو اسے آشرئے (سہارا) دیتا۔ بنشی دھر نے اب تک جو بیوہار کیا تھا، اس سے یہ آشا نہ ہوسکتی تھی کہ وہاں وہ شانتی کے ساتھ رہ سکے گی۔ پر، وہ سب کچھ سہنے اور سب کرنے کو تیار تھی۔ وہ گالی جھڑکی، مارپیٹ سب سہہ لے گی، کوئی اس پر سندیہہ تو نہ کرے گا، اس پر متھیا لانچھن (غلط تہمتیں) تو نہ لگے گا، شہدوں اور لچّوں سے اس کی رکھشا ہوگی۔ بنشی دھر کو کُل مریادا کی کچھ چنتا ہوئی۔ مانی کی یاچنا (درخواست) کو اسویکار (رد) نہ کرسکے۔

لیکن دوچار مہینوں میں ہی مانی کو معلوم ہوگیا کہ اس گھر میں بہت دنوں تک اس کا نباہ نہ ہوگا۔ وہ گھر کا سارا کام کرتی، اشاروں پر ناچتی، سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی، پر نہ جانے کیوں چچا اور چچی دونوں اس سے جلتے رہتے۔ اس کے آتے ہی مہری الگ کردی گئی۔ نہلانے دُھلانے کے لیے ایک لونڈا تھا، اسے بھی جواب دیا گیا۔ پر مانی سے اتنا اُبار (بچت) ہونے پر بھی چچا اور چچی نہ جانے کیوں اس سے منہ پھلائے رہتے۔ چچا گھڑکیاں جماتے، کبھی چچی کوستیں۔ یہاں تک کہ اس کی چچیری بہن للتا بھی بات بات پر اسے گالیاں دیتی۔ گھر بھر میں کیول اس کے چچیرے بھائی گوکل کو ہی اس سے سہانبھوتی (ہمدردی) تھی۔ اسی کی باتوں میں کچھ آتمیتا (انسانیت) کچھ اِسنہ (محبت) کا پرچئے (شناخت) ملتا تھا۔ وہ اپنی ماتا کا سوبھاؤ (عادت) جانتا تھا۔ اگر وہ اسے سمجھانے کی چیشٹا (کوشش) کرتا یا کھلّم کھلّا مانی کا پکش لیتا، تو مانی کو ایک گھڑی گھر میں رہنا کٹھن ہوجاتا۔ اس لیے اس کی سہانبھوتی مانی ہی کو دلاسا دینے تک رہ جاتی تھی۔ وہ کہتا۔ بہن، مجھے کہیں نوکر ہوجانے دو، پھر تمھارے

کشٹوں (پریشانیوں) کا انت (خاتمہ) ہوجائے گا۔ تب دیکھوں گا کون تمھیں ترچھی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ جب تک پڑھتا ہوں، تبھی تک تمھارے برے دن ہیں۔ مانی یہ اِسنیہ میں ڈوبی باتیں سُن کر پُلکت ہوجاتی (خوشی سے بھرجاتی) اور اس کا رُواں رُواں گوکل کو آشیرواد (دُعا) دینے لگتا۔

آج للتا کا بیاہ ہے۔ سویرے سے ہی مہمانوں کا آنا شروع ہوگیا ہے۔ گہنوں کی جھنکار سے گھر گونج رہا ہے۔ مانی بھی مہمانوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔ اُس کی دیہہ پر کوئی بھی آبھوشن نہیں ہے اور نہ اسے سندر کپڑے ہی دیے گئے ہیں، پھر بھی اس کا مکھ پرسن ہے۔

آدھی رات ہوگئی تھی۔ بواہ کا مہورت نکٹ آگیا۔ جنواسے سے چڑاوے کی چیزیں آئیں۔ سبھی عورتیں اُتسک (بے چین) ہوہوکر ان چیزوں کو دیکھنے لگیں۔ للتا کو آبھوشن پہنائے جانے لگے۔ مانی کے ہردئے میں بڑی اِچھا ہوئی کہ جاکر بدھو (دلہن) کو دیکھے۔ ابھی کل جو بالیکا تھی اسے آج بدھو بھیس میں دیکھنے کی اِچھا نہ روک سکی۔ وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں گھسی۔ سہسا اس کی چاچی نے جھڑک کر کہا۔ تجھے یہاں کس نے بلایا تھا، نکل جا یہاں سے!

مانی نے بڑی بڑی یاتنائے سہی تھی، پر آج وہ جھڑکی اس کے ہردئے میں بان کی طرح چبھ گئی۔ اس کا من اسے دھکارنے لگا۔ تیرے چھچھورے پن کا یہی پُرسکار ہے۔ یہاں سہاگیوں کے بیچ میں ترے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ کھسیائی ہوئی کمرے سے نکلی اور ایکانت میں بیٹھ کر رونے کے لیے اوپر جانے لگی۔ سہسا زینے پر اس کی اندرناتھ سے مُٹھبھیڑ ہوگئی۔ اندرناتھ گوکل کا سہپاٹھی اور پرم مِتر تھا۔ وہ بھی نیوتے میں آیا ہوا تھا۔ اسی وقت گوکل کو کھوجنے کے لیے اوپر آیا تھا۔ مانی کو وہ دو ایک بار دیکھ چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ یہاں اس کے ساتھ بڑا دربیوہار (بُرا سلوک) کیا جاتا ہے۔ چاچی کی باتوں کی بھنک اس کے کان میں پڑگئی تھی۔ مانی کو اوپر جاتے دیکھ کر وہ اس کے چِت کا بھاؤ سمجھ گیا اور اسے سانتونا دینے (حوصلہ دینے) کے لیے اوپر آیا، مگر دروازہ بھیتر سے بند تھا۔ اس نے کواڑ کو درار سے بھیتر جھانکا۔ مانی میز کے پاس کھڑی رو رہی تھی۔

اس نے دھیرے سے کہا۔ مانی دوار کھول دو!

مانی اس کی آواز سُن کر کونے میں چھپ گئی اور گمبھیر سُور (آواز) میں بولی۔ کیا ہے؟

اندرناتھ نے گدگد سور میں کہا۔ تمھارے پیروں پڑتا ہوں مانی کھول دو۔

یہ اِسنیہ میں ڈوبا ہوا ونے (درخواست) مانی کے لیے ابھوت پورو (نیا) تھا۔ اس نردئے (ظالم) سنسار میں کوئی اس سے ایسی ونتی بھی کرسکتا ہے، اس کی اسے سوپن میں بھی کلپنا (تصور) نہ کی تھی۔ مانی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دوار کھول دیا۔ اندرناتھ جھپٹ کر کمرے میں گھسا، دیکھا کہ چھت کے پنکھے کے کڑے سے ایک رسّی لٹک رہی ہے۔ اس کا ہردئے کانپ اُٹھا۔ اس نے ترنت جیب سے چاقون نکال کر رسّی کاٹ دی اور بولا، کیا کرنے جا رہی تھی مانی؟ جانتی ہو اس اپرادھ کا کیا دنڈ ہے؟

مانی نے گردن جھکا کر کہا۔ اس دنڈ سے کوئی اور دنڈ کٹھور (سخت) ہوسکتا ہے؟ جس کی صورت سے لوگوں کو گھِرنا (نفرت) ہو، اسے مرنے پر بھی اگر کٹھور دنڈ دیا جائے، تو میں یہی کہوں گی کہ ایشور کے دربار میں نیائے کا نام بھی نہیں ہے۔ تم میری دشا کا انوبھو (اندازہ) نہیں کرسکتے۔

اندرناتھ کی آنکھیں سجل (پُرآب) ہوگئیں! مانی کی باتوں میں کتنا کٹھور ستیہ (کڑا سچ) بھرا ہوا تھا۔ بولا۔ سدا یہ دن نہیں رہیں گے مانی۔ اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ سنسار میں تمھارا کوئی نہیں ہے تو یہ تمھارا بھرم ہے۔ سنسار میں کم سے کم ایک منشیہ ایسا ہے جسے تمھارے پران اپنے پرانوں سے بھی پیارے ہیں۔

سہسا گوکل آتا ہوا دکھائی دیا۔ مانی کمرے سے نکل گئی۔ اندرناتھ کے شبدوں نے اس کے من میں ایک طوفان اُٹھا دیا تھا۔ اس کا کیا آشئے (مقصد) ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر بھی آج اسے اپنا جیون سارتھک (با مقصد) معلوم ہو رہا تھا۔ اس اندھکار مئے جیون میں ایک پرکاش کا اُدے ہوگیا۔

(۲)

اندر ناتھ کو وہاں بیٹھے اور مانی کو کمرے سے جاتے دیکھ کر گوکل کو کھٹک گیا۔ اس کی تیوریاں بدل گئیں۔ کٹھور سور (سخت لہجے) میں بولا۔ تم یہاں کب آئے؟

اندرناتھ نے اوِچلِت بھاو (گھبرا کر) سے کہا۔ تمھیں کو کھوجتا ہوا یہاں آیا تھا۔ تم

یہاں نہ ملے تو نیچے لوٹا جا رہا تھا۔ اگر میں چلا گیا ہوتا تو اس وقت تمھیں یہ کمرہ بند ملتا اور پنکھے کے کڑے میں ایک لاش لٹکتی ہوئی نظر آتی۔

گوکل نے سمجھا، یہ اپنے اپرادھ (جرم) کو چھپانے کے لیے کوئی بہانہ نکال رہا ہے۔ تیر کنٹھ سے بولا۔ تم یہ وشواس گھات (دغا بازی) کروگے، مجھے ایسی آشا نہ تھی۔

اندرناتھ کا چہرہ لال ہوگیا۔ وہ آویش (غصّے) میں آکر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ نہ مجھے یہ آشا تھی کہ تم مجھ پر اتنا بڑا لانچھن رکھ دوگے۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ تم مجھے اتنا نیچ اور کٹل (غلط) سمجھتے ہو۔ مانی تمھارے لیے ترسکار (ذلت) کی وستو ہو، میرے لیے وہ شردھا (عقیدت و احترام) کی وستو ہے اور رہے گی۔ مجھے تمھارے سامنے اپنی صفائی دینے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن مانی میرے لیے اس سے کہیں پوتر (پاکیزہ) ہے، جتنی تم سمجھے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ اس وقت تم سے یہ باتیں کہوں۔ اس کے لیے اور انوکول پرستھیتیوں (سازگار حالات) کی راہ دیکھ رہا تھا، لیکن معاملہ آپڑنے پر کہنا ہی پڑ رہا ہے۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ مانی کا تمھارے گھر میں کوئی آدر (عزت) نہیں، لیکن تم لوگ اسے اتنا نیچ اور تیاجیہ (چھوڑی جانے والی شئے) سمجھتے ہو، یہ آج تمھاری ماتا جی کی باتیں سن کر معلوم ہوا۔ کیول اتنی سی بات کے لیے کہ وہ چڑھاوے کے گہنے دیکھنے چلی گئی تھی، تمھاری ماتا نے اسے اس بری طرح جھڑکا، جیسے کوئی کتّے کو بھی نہ جھڑکے گا۔ تم کہوگے اسے میں کیا کروں، میں کر ہی کیا سکتا ہوں، جس گھر میں ایک اناتھ استری پر اتنا اتیاچار (ظلم) ہو، اس گھر کا پانی پینا بھی حرام ہے۔ اگر تم نے اپنی ماتا کو پہلے ہی دن سمجھا دیا ہوتا، تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ تم اس الزام سے نہیں بچ سکتے۔ تمھارے گھر میں آج بواہ کا اُتسو ہے، میں تمھارے ماتا پتا سے کچھ بات چیت نہیں کرسکتا۔ لیکن تم سے کہنے میں کوئی سنکوچ (جھجک) نہیں ہے کہ میں مانی کو اپنی جیون سہچری (ساتھی) بناکر اپنے کو دھنیہ سمجھوں گا۔ میں نے سمجھا تھا اپنا کوئی ٹھکانا کرکے تب یہ پرستاؤ کروں گا، پر مجھے بھئے ہے کہ اور ولمب کرنے میں شاید مانی سے ہاتھ دھونا پڑے، اس لیے تمھیں اور تمھارے گھر والوں کو چنتا مکت کرنے کے لیے میں آج ہی یہ پرستاو کیے دیتا ہوں۔

گوکل کے ہردئے میں اندرناتھ کے پرتی ایسی شردھا کبھی نہ ہوئی۔ اس پر ایسا سندیہہ کرکے وہ بہت ہی لجّت ہوا۔ اس نے یہ انوبھو بھی کیا کہ ماتا کے بھئے سے میں مانی کے

وِشئے میں تٹستھ (غیر جانبدار) رہ کر کایرتا (بزدلی) کا دوشی (مجرم) ہوا ہوں۔ یہ کیول کایرتا تھی اور کچھ نہیں۔ کچھ جھینپتا ہوا بولا۔ اگر اماں نے مانی کو اس بات پر جھڑکا تو یہ ان کی مورکھتا ہے، میں ان سے اَوسر ملتے ہی پوچھوں گا۔

اندرناتھ۔ اب پوچھنے پاچھنے کا سمے نکل گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مانی سے اس وِشے میں صلاح کر کے مجھے بتلا دو! میں نہیں جانتا کہ اب وہ یہاں چھن بھر بھی رہے۔ مجھے آج معلوم ہوا کہ وہ گروینی پرکرتی (انا پرست) کی استری ہے اور سچ پوچھو تو میں اس کے سوبھاؤ (عادت) پر مگدھ ہو گیا ہوں۔ ایسی استری اتیاچار نہیں سہہ سکتی۔

گوکل نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ لیکن تمھیں معلوم ہے۔ وہ بدھوا (بیوہ) ہے۔

جب ہم کسی کے ہاتھوں اپنا اسادھارن ہِت (غیر معمولی فائدہ) ہوتے دیکھتے ہیں تو ہم اپنی برائیاں اس کے سامنے کھول کر رکھ دیتے ہیں۔ ہم اسے دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی اس کرپا (کرم) کے سروتھا اَیوگیہ (مکمل طور پر قابل) نہیں ہے۔

اندرناتھ نے مسکرا کر کہا۔ جانتا ہوں، سن چکا ہوں اور اس لیے تمھارے بابو جی سے کچھ کہنے کا مجھے ساہس نہیں ہوا، لیکن نہ جانتا تو بھی اس کا میرے نشچے پر کوئی اثر نہ پڑتا۔ مانی ودھوا ہی نہیں، اچھوت ہو اس سے بھی گئی بیتی اگر کچھ ہو سکتی ہے، وہ بھی ہو پھر بھی میرے لیے وہ رمنی رتن (قیمتی) ہے۔ ہم چھوٹے موٹے کاموں کے لیے تجربے کار آدمی کھوجتے ہیں، مگر جس کے ساتھ ہمیں جیون یاترا کرنی ہے، اس میں تجربے کا ہونا عیب سمجھتے ہیں۔ میں نیاے کا گلا گھوٹنے والوں میں نہیں ہوں۔ وِپتی (مشکلات) سے بڑھ کر تجربہ سکھانے والا کوئی ودھیالہ آج تک نہیں کھلا ہے۔ جس نے اس ودھیالہ میں ڈگری لے لی اس کے ہاتھوں میں ہم نشچنت (مطمئن) ہو کر جیون کی باگ ڈور دے سکتے ہیں۔ کسی رمنی (حسینہ) کا بدھوا ہونا میری آنکھوں میں دوش (خامی) نہیں، گُن (خوبی) ہے۔

گوکل نے پرسنّ ہو کر کہا۔ لیکن تمھارے گھر کے لوگ؟

اندرناتھ نے دِرڑھتا سے کہا۔ مَیں اپنے گھر والوں کو اتنا مورکھ نہیں سمجھتا کہ اس وِشے میں آپتّی (اعتراض) کریں، لیکن وے آپتّی کریں تو میں اپنی قسمت اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا پسند کرتا ہوں۔ میرے بڑوں کو مجھ پر انیکوں ادھیکار ہیں۔ بہت سی باتوں میں میں ان کی اِچّھا کو قانون سمجھتا ہوں، لیکن جس بات کو میں اپنی آتما کے وکاس کے لیے شبھ سمجھتا

ہوں، اس میں کسی سے دبنا نہیں چاہتا، میں اس گورَو کا آنند اُٹھانا چاہتا ہوں کہ میں سُوینہ اپنے جیون کا نرماتا (بنانے والا) ہوں!

گوکل نے کچھ شنکت (مشکوک) ہوکر کہا۔ اور اگر مانی نامنظور کرے۔

اندرناتھ کو یہ شنکا بالکل نرمول (بے بنیاد) جان پڑی۔ بولے۔ تم اس سمے بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو گوکل۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ مانی آسانی سے منظور نہ کرے گی۔ وہ اس گھر میں ٹھوکریں کھائے گی، جھڑکیاں سہے گی، گالیاں سنے گی۔ پر اسی گھر میں رہے گی۔ یُگوں کے سنسکاروں کو مٹا دینا آسان نہیں ہے، لیکن ہمیں اس کو راضی کرنا پڑے گا۔ اس کے من میں سنچت (موجود) سنسکاروں کو نکالنا پڑے گا۔ میں بدھواؤں کے پُنر بواہ (دوبارہ شادی) کے پکش (حق) میں نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ پتی ورت (شوہر پرستی) کا یہ آلوکک آدرش (ماورائی مثال) سنسکار کا امولیہ (بیش قیمت) رتن ہے اور ہمیں سوچ سمجھ کر اس پر آگھات (وار) کرنا چاہیے، لیکن مانی کے وِشے میں وہ بات ہی نہیں اُٹھتی۔ پریم اور بھکتی نام سے نہیں، ویکتی سے ہوتی ہے۔ جس پُروش کی اس نے صورت بھی نہیں دیکھی، اس سے اسے پریم نہیں ہوسکتا کیول رسم کی بات ہے۔ اس آڈمبر (نمائش) کی اس دکھاوے کی ہمیں پرواہ نہ کرنی چاہیے۔ دیکھو شاید، تمھیں کوئی بلا رہا ہے۔ میں چلتا ہوں۔ دو تین دن میں پھر ملوں گا، مگر ایسا نہ ہو کہ تم سنکوچ میں پڑکر سوچتے وچارتے رہ جاؤ اور دن نکلتے چلے جائیں۔

گوکل نے اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ میں پرسوں خود ہی آؤں گا۔

(۳)

بارات بدا ہوگئی تھی۔ مہمان بھی رخصت ہوگئے تھے۔ رات کے نو بج گئے تھے بواہ کے بعد کی نیند مشہور ہے گھر کے سبھی لوگ سرشام سے سو رہے تھے۔ کوئی چارپائی پر، کوئی تخت پر، کوئی زمین پر، جسے جہاں جگہ مل گئی، وہیں سو رہا تھا۔ کیول مانی گھر کی دیکھ بھال کر رہی تھی، اور اوپر گوکل اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سماچار پتر پڑھ رہا تھا۔

سہسا گوکل نے پکارا۔ مانی، ایک گلاس ٹھنڈا پانی تو لانا، بڑی پیاس لگی ہے۔

مانی پانی لے کر اوپر گئی اور میز پر پانی رکھ کر لوٹنا ہی چاہتی تھی کہ گوکل نے کہا۔ ذرا مانی، تم سے کچھ کہنا ہے۔

مانی نے کہا۔ ابھی فرصت نہیں ہے بھائی، سارا گھر سو رہا ہے۔ کہیں کوئی گھس آئے تو لوٹا تھالی بھی نہ بچے!

گوکل نے کہا۔ گھس آنے دو، میں تمھاری جگہ ہوتا تو چوروں سے مل کر چوری کروا دیتا۔ مجھے اسی وقت اندرناتھ سے ملنا ہے۔ میں نے اس سے آج ملنے کا وچن دیا ہے۔ دیکھو سنکوچ مت کرنا، میں جو بات، پوچھ رہا ہوں اس کا جلد اُتر دینا۔ دیر ہوگی تو وہ گھبرائے گا۔ اندرناتھ کو تم سے پریم ہے، یہ تم جانتی ہونا؟

مانی نے منہ پھیر کر کہا۔ یہی بات کہنے کے لیے مجھے بلایا تھا۔ میں کچھ نہیں جانتی۔

گوکل۔ خیر، یہ وہ جانے اور تم جانو۔ وہ تم سے وواہ کرنا چاہتا ہے۔ ویدک ریتی سے بواہ ہوگا۔ تمھیں سویکار ہے؟

مانی کی گردن شرم سے جھک گئی۔ وہ کچھ جواب نہ دے سکی۔

گوکل نے پھر کہا۔ دادا اور اماں سے یہ بات نہیں کہی گئی، اس کا کارن تم جانتی ہی ہو۔ وہ تمھیں گھڑکیاں دے دے کر، جلا جلا کر چاہے مار ڈالیں، پر بواہ کرنے کی سمّتی (رائے) کبھی نہ دیں گے۔ اس سے ان کی ناک کٹ جائے گی۔ اس لیے اب اس کا نرنّے (فیصلہ) تمھارے اوپر ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں، تمھیں سویکار کرلینا چاہیے۔ اندرناتھ تم سے پریم کرتا ہے ہی، یوں بھی نشکلنک چرتر (بے داغ کردار) کا آدمی ہے اور بلا کا دلیر۔ بھَے تو اسے چھو ہی نہیں گیا۔ مجھے تمھیں سوکھی دیکھ کر سچّا آنند ہوگا۔

مانی کے ہردئے میں ایک ویگ (لہر) اُٹھ رہا تھا۔ مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔

گوکل نے اب کی کھیج کر کہا۔ دیکھو مانی، یہ چپ رہنے کا سمئے نہیں ہے، سوچتی کیا ہو؟

مانی نے کانپتے ہوئے سُور میں کہا۔ ہاں!

گوکل کے ہردئے کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ مسکرانے لگا۔ مانی شرم کے مارے وہاں سے بھاگ گئی۔

(۴)

شام کو گوکل نے اپنی ماں سے کہا۔ امّاں، اندرناتھ کے گھر آج کوئی اتسو ہے۔ اس کی ماتا اکیلی گھبرا رہی تھیں کہ کیسے کام ہوگا؟ میں نے کہا مانی کو بھیج دوں گا، تمھاری آگیا

(اجازت) ہو تو مانی کو پہنچا دوں۔ کل پرسوں تک چلی آئے گی۔

مانی اسی وقت وہاں آگئی۔ گوکل نے اس کی اُور کنکھیوں سے تاکا۔ مانی لجا سے گڑ گئی۔ بھاگنے کا راستہ نہ ملا۔

ماں نے کہا۔ مجھ سے کیا پوچھتے ہو، وہ جائے تو لے جاؤ۔

گوکل نے کہا۔ کپڑے پہن کر تیار ہوجاؤ، تمھیں اندرناتھ کے گھر چلنا ہے۔

مانی نے آپتی کی۔ میرا جی اچھا نہیں ہے، میں نہ جاؤں گی۔

گوکل کی ماں نے کہا۔ چلی کیوں نہیں جاتی، کیا وہاں کوئی پہاڑ کھودنا ہے۔

مانی ایک سفید ساڑی پہن کر تانگے میں بیٹھی، تو اس کا ہردئے کانپ رہا تھا اور باربار آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے، اس کا ہردئے بیٹھا جاتا تھا، مانو ندی میں ڈوبنے جارہی ہو۔

تانگا کچھ دور نکل گیا تو اس نے گوکل سے کہا۔ بھیا میرا جی نہ جانے کیسا ہو رہا ہے لوٹ چلو، تمھارے پیر پڑتی ہوں۔

گوکل نے کہا۔ تو پاگل ہے۔ وہاں سب لوگ تیری راہ دیکھ رہے ہیں اور تو کہتی ہے لوٹ چلو۔

مانی۔ میرا من کہتا ہے کوئی انشٹھ (بُرا) ہونے والا ہے۔

گوکل۔ اور میرا من کہتا ہے تو رانی بننے جا رہی ہے۔

مانی۔ دس پانچ دن ٹھہر کیوں نہیں جاتے۔ کہہ دینا مانی بیمار ہے۔

گوکل۔ پاگلوں کی سی باتیں نہ کرو۔

مانی۔ لوگ کتنا ہنسیں گے؟

گوکل۔ میں شبھ کاریہ (اچھے کام) میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔

مانی۔ اماں تمھیں گھر میں گھسنے نہ دیں گی۔ میرے کارن تمھیں بھی جھڑکیاں ملیں گی۔

گوکل۔ اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ ان کی تو یہ عادت ہی ہے۔

تانگا پہنچ گیا۔ اندرناتھ کی ماتا وچار شیل (سوجھ بوجھ والی) مہیلا تھیں۔ انھوں نے آکر بدھو کو اُتارا اور بھیتر لے گئیں۔

(۵)

گوکل یہاں سے گھر چلا تو گیارہ بج رہے تھے۔ ایک اُور تو شبھ کاریہ کے پورا کرنے

کا آنند (لطف) تھا، دوسری اُور بھئے تھا کہ کل مانی نہ جائے گی تو لوگوں کو کیا جواب دوں گا۔ اس نے نشچے کیا چل کر صاف صاف کہہ دوں۔ چھپانا بیر تھ (بے کار) ہے۔ آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں تو سب کچھ کہنا ہی پڑے گا۔ آج ہی کیوں نہ کہہ دوں۔

یہ نشچے کرکے وہ گھر میں داخل ہوا۔

ماتا نے کواڑ کھولتے ہوئے کہا۔ اتنی رات کیا کرنے لگے؟ اسے بھی کیوں نہ لیتے آئے، کل سویرے چوکا برتن کون کرے گا؟

گوکل نے سر جھکا کر کہا۔ وہ تو شاید لوٹ کر اب نہ آوے اماں۔ اس کے وہیں رہنے کا پربندھ ہو گیا ہے۔

ماتا نے آنکھ پھاڑ کر کہا۔ کیا بکتا ہے، بھلا وہ وہاں کیسے رہے گی؟

گوکل۔اندرناتھ سے اس کا وواہ ہوگیا۔

ماتا مانو آکاش سے گر پڑی۔ انھیں کچھ سُدھ نہ رہی کہ میرے منہ سے کیا نکل رہا ہے گلا نگار(خاندان کو تباہ کرنے والا) بھڑوا، حرام زادہ اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ یہاں تک کہ گوکل کا دھریہ (صبر) چرم سیما (انتہائی حدود) کا اُلنگھن (خلاف ورزی) کرگیا۔ اس کا منہ لال ہوگیا، تیوریاں بڑھ گئی۔ بولا۔ اماں بس کرو، اب مجھ میں اس سے زیادہ سُننے کی سامرتھ (طاقت) نہیں ہے۔ اگر میں نے کوئی انوچت کرم (غلط کام) کیا ہوتا تو آپ کی جوتیاں کھاکر بھی سر نہ اُٹھاتا، مگر میں نے کوئی انوچت کرم نہیں کیا۔ میں نے وہی کیا جو ایسی دشا میں مِرا کرتبیہ (فرض) تھا اور جو ہر ایک بھلے آدمی کو کرنا چاہیے۔ تم مورکھ ہو، تمھیں کچھ نہیں معلوم کہ سمئے کی کیا پرگتی (ترقی) ہے۔ اس لیے اب تک میں نے دھیریہ کے ساتھ تمھاری گالیاں سنیں۔ تم نے، اور مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ پتا جی نے بھی، مانی کے جیون کو نارکیے (دوزخی) بنا رکھا تھا۔ تم نے اسے ایسی ایسی تاڑنائیں دیں جو کوئی اپنی شترو کو بھی نہ دے گا۔ اس لیے نا کہ وہ تمھاری آشرت (سرپرستی میں) تھی؟ اس لیے نا کہ وہ اناتھنی تھی؟ اب وہ تمھاری گالیاں کھانے نہ آوے گی۔ جس دن تمھارے گھر وواہ کا اتسو ہو رہا تھا، تمھارے ہی ایک کٹھو واکیہ (سخت جملوں) سے آہت (بددل) ہوکر وہ آتم ہتیا (خودکشی) کرنے جا رہی تھی۔ اندرناتھ اس سمے اوپر نہ پہنچ جاتے تو آج ہم، تم اور سارا گھر حوالات میں بیٹھے ہوتے۔

ماتا نے آنکھیں مٹکا کر کہا۔ آہا! کتنے سپوت بیٹے ہو تم کہ سارے گھر کو سنکٹ (پریشانی) سے بچا لیا۔ کیوں نہ ہو! ابھی بہن کی باری ہے کچھ دن مجھے لے جاکر کسی کے گلے باندھ آنا۔ پھر تمھاری چاندی ہوجائے گی۔ یہ روزگار سب سے اچھا ہے۔ پڑھ لکھ کر کیا کروگے۔

گوکل مرم۔ ویدنا (دکھ) سے تلملا اُٹھا۔ ویتھت کنٹھ (غمگین لہجے) سے بولا۔ ایشور نہ کرے کہ کوئی بالک تم جیسی ماتا کے گربھ (کوکھ) سے جنم لے۔ تمھارا منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔

یہ کہتا ہوا وہ گھر سے نکل پڑا اور انمتوں (پاگلوں) کی طرح ایک طرف چل کھڑا ہوا۔ زور کے جھونکے چل رہے تھے، پر اسے ایسا معلوم ہورہا تھا کہ سانس لینے کے لیے ہوا نہیں ہے۔

(٦)

ایک سپتاہ بیت گیا، پر گوکل کا کہیں پتہ نہیں۔ اندرناتھ کو بمبئی میں ایک جگہ مل گئی۔ وہ وہاں۔چلا گیا تھا۔ وہاں رہنے کا پربندھ (انتظام) کرکے وہ اپنی ماتا کو تار دے گا اور تب ساس اور بہو وہاں چلی جائے گی۔ بنشی دھر کو پہلے سندیہہ (شک) ہوا کہ گوکل اندرناتھ کے گھر چھپا ہوگا۔ پر جب وہاں پتہ نہ چلا تو انھوں نے سارے شہر میں کھوج، پوچھ شروع کی۔ جتنے ملنے والے، اسنیہی (دوست و احباب)، سمبندھی (رشتے دار) تھے، سبھی کے گھر گئے، پر سب جگہ سے صاف جواب پایا۔ دن بھر دوڑ دھوپ کر شام کو گھر آتے تو استری کو آڑے ہاتھوں لیتے۔ اور کوسو لڑکے کو، پانی پی پی کر کوسو۔ نہ جانے تمھیں کبھی بدھی آئے گی بھی یا نہیں۔ گئی تھی چڑیل، جانے دیتی۔ ایک بوجھ سر سے ٹلا۔ ایک مہری رکھ لو کام چل جائے گا۔ جب وہ نہ تھی تو گھر کیا بھوکوں مرتا تھا۔ بدھواؤں کے پُنر بواہ (دوبارہ شادی) چاروں اُور تو ہورہے ہیں، یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ ہمارے بس کی بات ہوتی تو اس بدھوا بواہ کے پکش پاتیوں (بیواؤں کی شادی کے طرفداروں) کو دیش سے نکال دیتے، شاپ دے کر جلا دیتے، لیکن یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔ پھر تم سے اتنا بھی نہ ہوسکا کہ مجھ سے تو پوچھ لیتیں۔ میں جو اُچت سمجھتا کرتا۔ کیا تم نے یہ سمجھا تھا، میں دفتر سے لوٹ کر آؤں گا ہی نہیں، وہیں میری انتیشٹھی (موت) ہوجائے گی۔ بس لڑکے پر

ٹوٹ پڑیں۔ اب روؤ، خوب دل کھول کر۔

سندھیا ہوگئی تھی۔ بنشی دھر استری کو پھٹکاریں سنا کر دوار پر اڈیگ کی دشا (تشویش کی حالت) میں ٹہل رہے تھے۔ رہ رہ کر مانی پر کرودھ آتا تھا۔ اسی راکھشی کے کارن میرے گھر کا سروناش (برباد) ہوا۔ نہ جانے کس بُری ساعت میں آئی کہ گھر کو مٹا کر چھوڑا! وہ نہ آئی ہوتی تو آج، کیوں یہ بُرے دن دیکھنے پڑتے۔ کتنا ہونکار، کتنا پرتبھا شالی (باصلاحیت) لڑکا تھا۔ نہ جانے کہاں گیا۔

یکایک ایک بڑھیا ان کے سمیپ (قریب) آئی اور بولی۔ بابو صاحب۔ یہ خط لائی ہوں۔ لے لیجیے۔ بنشی دھر نے لپک کر بڑھیا کے ہاتھ سے پتر لے لیا، ان کی چھاتی آشا سے دھک دھک کرنے لگی۔ گوکل نے شاید یہ پتر لکھا ہوگا۔ اندھیرے میں کچھ نہ سوجھا، پوچھا۔ کہاں سے لائی ہے؟

بُڑھیا نے کہا۔ وہی بابو جی حسین گنج میں رہتے ہیں، جو بمبئی میں نوکر ہیں، انہی کی بہو نے بھیجا ہے۔

بنشی دھر نے کمرے میں جاکر لیمپ جلایا اور پتر پڑھنے لگے۔ مانی کا خط تھا۔ لکھا تھا۔ پوجیہ چاچا جی۔ ابھاگنی مانی کا پرنام سویکار کیجیے۔

مجھے یہ سن کر اتینت دکھ ہوا کہ گوکل بھیا کہیں چلے گئے اور اب تک ان کا پتہ نہیں ہے۔ میں اس کا کارن ہوں۔ یہ کلنک میرے ہی مکھ پر لگنا تھا، وہ بھی لگ گیا۔ میرے کارن آپ کو اتنا شوک ہوا اس کا مجھے بہت دُکھ ہے، مگر بھیا آویں گے آوشئے (ضرور)، اس کا مجھے وشواس ہے۔ میں اسی نو بجے والی گاڑی سے بمبئی جارہی ہوں۔ مجھ سے جو کچھ اپرادھ ہوئے ہیں، انھیں چھما کیجیے گا اور چاچی سے میرا پرڑام کہیے گا۔ میری ایشور سے یہی پرارتھنا (دُعا) ہے کہ گوکل بھیا سکشل گھر لوٹ آویں۔ ایشور کی اِچھّا ہوئی تو بھیا کے بواہ میں آپ کے چرنوں کے درشن کروں گی۔

ونشی دھر نے پتر پھاڑ کر پُرزے پُرزے کرڈالا۔ گھڑی میں دیکھا تو آٹھ بج رہے تھے۔ ترنت کپڑے پہنے۔ سڑک پر آکر یکہ کیا اور اسٹیشن چلے۔

(۷)

بمبئی میل پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ مسافروں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ خونچے

والوں کی چیخ پکار سے کان میں پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ گاڑی چھوٹنے میں تھوڑی ہی دیر تھی۔ مانی اور اس کی ساس ایک زنانے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ مانی سجل نیتروں (پُر آب نگاہوں) سے سامنے تک رہی تھی۔ اتیت (ماضی) چاہے دُکھد ہی کیوں نہ ہو، اس کی اسمرتیاں (یادیں) مدُھر (لطیف) ہوتی ہیں۔مانی آج ان بُرے دنوں کو اسمرن (یاد) کر کے سوکھی ہورہی تھی۔ گوکل سے اب نہ جانے کب بھینٹ ہوگی۔ چاچا جی آجاتے ان کے درشن (دیدار) کرلیتی۔ کبھی کبھی بگڑتے تھے تو کیا اس کے بھلے ہی کے لیے ڈانٹتے تھے۔ وہ آویں گے نہیں۔ اب تو گاڑی چھوٹنے میں تھوڑی ہی دیر ہے۔ کیسے آویں، سماج میں ہلچل نہ مچ جائے گی۔ بھگوان کی اِچھّا ہوگی تو اب کی جب یہاں آؤں گی تو ضرور ان کے درشن کروں گی۔

ایکاایک اس نے لالہ بنشی دھر کو آتے دیکھا۔ وہ گاڑی سے نکل کر باہر کھڑی ہوگئی اور چاچاجی کی اُور بڑھی۔ ان کے چرنوں پر گرنا چاہتی تھی کہ وہ پیچھے ہٹ گئے اور آنکھیں نکال کر بولے۔ مجھے مت چھو، دور رہ ابھاگنی کہیں کی۔ منہ پہ کالک لگا کر مجھے پتر لکھتی ہے۔ تجھے موت بھی نہیں آئی! تو نے میرے کُل کا سروناش کردیا۔ آج تک گوکل کا پتہ نہیں ہے۔ تیرے ہی کارن وہ گھر سے نکلا اور تو ابھی تک میری چھاتی پر مونگ دلنے کو بیٹھی ہے۔ تیرے لیے کیا گنگا میں پانی نہیں ہے؟ میں تجھے ایسی کُلٹا، ایسی ہرجائی سمجھتا، تو پہلے دن ہی تیرا گلا گھونٹ دیتا۔ اب مجھے اپنی بھکتی دکھلانے چلی ہے۔ تجھ جیسی پاپشٹھاؤں (گناہ گاروں) کا مرنا اچھا ہے، پرتھوی کا بوجھ کم ہوجائے گا۔

پلیٹ فارم پر سیکڑوں آدمیوں کی بھیڑ لگ گئی تھی، اور بنشی دھر نرلجّ بھاؤ (بے شرمی) سے گالیوں کی بوچھار کر رہے تھے۔ کسی کی سمجھ نہ آتا تھا، کیا ماجرا ہے، پر من میں سب لالہ کو دھکار رہے تھے۔

مانی پاشان (قدیم) مورتی کے سامان کھڑی تھی۔ مانو وہ جم گئی ہو۔ اس کا سارا ابھمان (ناز) چور چور ہوگیا۔ ایسا جی چاہتا تھا، دھرتی پھٹ جائے اور میں سماجاؤں، کوئی وجر (بجلی) گراکر اس کے جیون ادھم جیون (بے غیرت زندگی) کا انت (خاتمہ) کردے۔ اتنے آدمیوں کے سامنے اس کا پانی اُتر گیا! اس کی آنکھوں سے آنسو کی ایک بوند بھی نہ نکلی، ہردئے میں آنسو نہ تھے۔ اس کی جگہ ایک داوانل (آتش) سا دہک رہا تھا جو مانو ویگ (تیزی) سے

مستشک (دماغ) کی اُور بڑھتا جاتا تھا۔ سنسار میں کون جیون اتنا ادھم ہوگا۔

ساس نے پکارا۔ بہو، اندر آجاؤ۔

گاڑی چلی تو ماتا نے کہا۔ ایسا بے شرم آدمی میں نے نہیں دیکھا۔ مجھے تو ایسا کرودھ آرہا تھا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔

مانی نے سر اوپر نہ اُٹھایا۔

ماتا پھر بولی۔ نہ جانے ان سڑیلوں کو کب بدھی آئے گی۔ اب تو مرنے کے دن بھی آگئے۔ پوچھو، تیرا لڑکا بھاگ گیا تو ہم کیا کریں، اگر ایسے پاپی نہ ہوتے یہ بجر ہی کیوں گرتا۔

مانی نے پھر منہ نہ کھولا۔ شاید اسے کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ شاید اسے اپنے استِتو (وجود) کا گیان (علم) بھی نہ تھا۔ وہ ٹکٹکی لگائے کھڑکی کی اُور تاک رہی تھی۔ اس اندھکار میں اسے نہ جانے کیا سوجھ رہا تھا۔

کانپور آیا۔ ماتا نے پوچھا۔ بیٹی، کچھ کھائے گی؟ تھوڑی سی مٹھائی کھالو، دس کب بج گئے۔

مانی نے کہا۔ ابھی تو بھوک نہیں ہے اماں، پھر کھالوں گی۔

ماتا سوئی۔ مانی بھی لیٹی، پر چاچا کی وہ صورت آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی اور ان کی باتیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ آہ! میں اتنی نیچ ہوں، ایسی پِتت (کمینی)، کہ مرے مرجانے سے پرتھوی کا بھار ہلکا ہوجائے گا! کیا کہا تھا، تو اپنے ماں باپ کی بیٹی ہے تو پھر منہ مت دکھانا۔ نہ دکھاؤں گی۔ جس منہ پر کالِما لگی ہوئی ہو اسے کسی کو دکھانے کی اِچھّا بھی نہیں ہے۔

گاڑی اندھکار کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ مانی نے اپنا ٹرنک کھولا اپنے آبھوشن نکال کر اس میں رکھ دیے۔ پھر اندرناتھ کا چتر نکال کر اسے دیر تک دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں گروَ (غرور) کی ایک جھلک سی دکھائی دی۔ اس نے تصویر رکھ دی اور آپ ہی آپ۔ نہیں ۔ نہیں، میں تمھارے جیون کو کلنکت نہیں کرسکتی۔ تم دیو تُلیہ ہو، تم نے مجھ پر دیا کی ہے! میں اپنے پورو سنسکاروں (پُرانے دھبوں) کا پرائشچت (کفارہ ادا) کر رہی تھی۔ تم نے مجھے اُٹھا کر ہردئے سے لگا لیا۔ لیکن میں تمھیں کلنکت نہ کروں گی۔ تمھیں مجھ سے

پریم ہے۔ تم میرے لیے انادر (بے عزتی)، اپمان، نندا (ملامت) سب سہہ لوگے، پر میں تمھارے جیون کا بھار نہ بنوں گی۔

گاڑی اندھکار کو چیرتی چلی جا رہی تھی۔ مانی آکاش کی اُور اتنی دیر تک دیکھتی رہی کہ سارے تارے ادِرشیہ (غائب) ہوگئے اور اندھکار میں اسے اپنی ماتا کا سوروپ دکھائی دیا۔ ایسا اُجول (صاف)، ایسا پرتیکش (واضح) کہ اس نے چونک کر آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کمرے کے اندر دیکھا تو ماتا جی سو رہی تھیں۔

(۸)

نہ جانے کتنی رات گزر چکی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آہٹ سے ماتا جی کی آنکھ کھل گئی۔ گاڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی، مگر بہو کا پتہ نہ تھا۔ وہ آنکھیں مل کر اُٹھ بیٹھیں اور پکارا بہو! بہو! کوئی جواب نہ ملا۔

ان کا ہردئے دھک دھک کرنے لگا۔ اوپر برتھ پر نظر ڈالی، پیشاب خانے میں دیکھا، بینچوں کے نیچے دیکھا، بہو کہیں نہ تھی۔ تب وہ دُوار پر آکر کھڑی ہوگئی۔ شنکا ہوئی، یہ دُوار کس نے کھولا؟ کوئی گاڑی میں تو نہیں آیا! ان کا جی گھبرانے لگا۔ انھوں نے کواڑ بند کردیے اور زور زور سے رونے لگیں۔ کس سے پوچھیں؟ ڈاک گاڑی اب نہ جانے کتنی دیر میں رُکے گی۔ کہتی تھی، بہو مردانی گاڑی میں بیٹھو۔ پر میرا کہنا نہ مانا۔ کہنے لگی، اما جی، آپ کو سونے کی تکلیف ہوگی۔ یہی آرام دے گئی؟

سہسا اسے خطرے کی زنجیر یاد آئی۔ اس نے زور زور سے کئی بار زنجیر کھینچی۔ کئی منٹ بعد گاڑی رُکی۔ گارڈ آیا۔ پڑوس کے کمرے سے دوچار آدمی اور بھی آئے۔ پھر لوگوں نے سارا کمرہ تلاش کیا۔ نیچے تختے کو دھیان سے دیکھا۔ رکت (خون) کا کوئی چنہ (نشان) نہ تھا۔ اسباب کی جانچ کی۔ بستر، صندوق، صندوقچی، برتن سب موجود تھے۔ تالے بھی سب کے بند تھے۔ کوئی چیز غائب نہ تھی۔ اگر باہر سے کوئی آدمی آتا تو چلتی گاڑی سے جاتا کہاں؟ ایک استری کو لے کر گاڑی سے کود جانا اسمبھو(ناممکن) تھا۔ سب لوگ ان لچھنوں سے اسی نتیجے پر پہنچے کہ مانی دوار کھول کر باہر جھانکنے لگی ہوگی۔ اور مُٹھیا ہاتھ سے چھوٹ جانے کے کارن گر پڑی ہوگی۔ گارڈ بھلا آدمی اس نے نیچے اُتر کر ایک میل تک سڑک کے دونوں طرف تلاش کیا۔ مانی کا کوئی نشان نہ ملا۔ رات کو اس سے زیادہ اور کیا کیا جاسکتا تھا۔

ماتا جی کو کچھ لوگ آگرہ پوروک ایک مردانے ڈبے میں لے گئے۔ یہ نشچے ہوا کہ ماتا جی اگلے اسٹیشن پر اُتر پڑیں اور سویرے ادھر اُدھر دور تک دیکھ بھال کی جائے۔ وپتّی (مصیبت) میں ہم پرموکھاپیکشی (دوسروں پر بہت زیادہ منحصر) ہوجاتے ہیں۔ ماتا جی اس کا منہ دیکھتیں، کبھی اس کا۔ اس کی یاچنا (التجا) سے بھری ہوئی آنکھیں مانو سب سے کہہ رہی تھیں۔ کوئی میری بچّی کو کھوج کیوں نہیں لاتا؟ ہائے! ابھی تو بے چاری کی چُندری بھی نہیں میلی ہوئی تھی۔ کیسے کیسے سادھوں (امیدوں) اور ارمانوں سے بھری پتی کے پاس جا رہی تھی! کوئی اس دشٹھ (ظالم) بنشی دھر سے جاکر کہتا کیوں نہیں۔ لے تیری منو بھلاشا (دلی آرزو) پوری ہوگئی۔جو تو چاہتا تھا، وہ پورا ہوگیا۔ کیا اب بھی تیری چھاتی نہیں جُڑاتی (ٹھنڈی ہوتی)!

وردھا (بوڑھی) بیٹھی رو رہی تھی اور گاڑی اندھکار کو چیرتی چلی گئی۔

(۹)

رویوار کا دن تھا۔ سندھیا سے اندرناتھ دو تین مِتروں کے ساتھ اپنے گھر کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا۔ آپس میں ہاسیہ پری ہاس (ہنسی مزاق) ہو رہا تھا۔ مانی کا آگمن (آمد) اس پری ہاس (مذاق) کا وشے (موضوع) تھا۔

ایک مِتر بولے۔ کیوں اندر تم نے تو ویواہک جیون کا کچھ انوبھو کیا ہے، ہمیں کیا صلاح دیتے ہو؟ بنائیں کہیں گھونسلا یا یوں ہی ڈالیوں پر بیٹھے بیٹھے دن کاٹیں۔ پتر پتریکاؤں کو دیکھ کر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ویواہک جیون اور نرک میں کچھ تھوڑا ہی سا انتر ہے۔

اندرناتھ نے مسکراکر کہا۔ یہ تو تقدیر کا کھیل ہے بھائی، سولہوں آنا تقدیر کا۔ اگر ایک دشا میں ویواہک جیون نرک تُلیہ ہے، تو دوسری دشا میں سورگ سے کم نہیں۔

دوسرے متر بولے۔ اتنی آزادی تو بھلا کیا ہوگی؟

اندرناتھ۔ اتنی کیا، اس کا شتانش (دسواں حصّہ) بھی نہ رہے گی۔ اگر تم روز سینما دیکھ کر بارہ بجے گھر لوٹنا چاہتے ہو، نو بجے سوکر اُٹھنا چاہتے ہو اور دفتر سے چاہے لوٹ کر تاش کھیلنا چاہتے ہو، تو تمھیں بواہ کرنے سے کوئی سکھ نہ ہوگا۔ اور جو ہر مہینے سوٹ بنواتے ہو، تب شاید سال بھر بھی نہ بنواسکو۔

شری متی جی تو آج رات کی گاڑی سے آرہی ہیں؟

ہاں میل سے۔ میرے ساتھ چل کر انھیں ریسیو کروگے نا؟

یہ بھی پوچھنے کی بات ہے! اب گھر کون جاتا ہے، مگر کل دعوت کھلانی پڑے گی۔

سہسا تار کے چپراسی نے آکر اندرناتھ کے ہاتھ میں تار کا لفافہ رکھ دیا۔

اندرناتھ کا چہرہ کھل اُٹھا۔ جھٹ تار کھول کر پڑھنے لگا۔ ایک بار پڑھتے ہی اس کا ہردے دھک سے ہوگیا، سانس رک گئی، سر گھومنے لگا۔ آنکھوں کی روشنی لپت (ختم) ہوگئی، جیسے وشو (دنیا) پر کالا پردہ پڑ گیا ہو۔ اس نے تار کو متروں کے سامنے پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دونوں مترون نے گھبرا کر تار اُٹھا لیا اور اسے پڑھتے ہی ہت بدُھی (خبط العقل) سے ہی دیوار کی اُور تاکنے لگے۔ کیا سوچ رہے تھے اور کیا ہوگیا!

تار میں لکھا تھا۔ مانی گاڑی سے کود پڑی۔ اس کی لاش لال پور سے تین میل پر پائی گئی۔ میں لال پور میں ہوں۔ ترنت آؤ۔

ایک متر نے کہا۔ کسی شترو نے جھوٹی خبر نہ بھیج دی ہو۔

دوسرے متر نے کہا۔ ہاں، کبھی کبھی لوگ ایسی شرارتیں کرتے ہیں۔

اندرناتھ نے شونیہ نیتروں سے ان کی اُور دیکھا، پر منہ سے کچھ بولے نہیں! کئی منٹ تک تینوں آدمی نروارک (بے زبان) نسپند (بے حرکت) بیٹھے رہے۔ ایکاایک اندرناتھ کھڑے ہوگئے اور بولے۔ میں اسی گاڑی سے جاؤں گا۔

بمبئی سے نو بجے رات کو گاڑی چھوٹتی تھی۔ دونوں مترون نے چٹ پٹ بستر آدی باندھ کر تیار کردیا۔ ایک نے بستر اُٹھایا، دوسرے نے ٹرنک۔ اندرناتھ نے چٹ پٹ کپڑے پہنے اور اسٹیشن چلے۔ نراشا (ناامیدی) آگے تھی، آشا (امید) روتی ہوئی پیچھے۔

(۱۰)

ایک سپتاہ گزر گیا تھا۔ لالہ بنشی دھر دفتر سے آکر دوار پر بیٹھے ہی تھے کہ اندرناتھ نے آکر پرنام کیا۔ بنشی دھر اسے دیکھ کر چونک پڑے، اس کے اپیکشت (بے امید) آگمن (آمد) پر نہیں، اس کی وکرت دشا (بگڑی ہوئی حالت) پر، مانو ویتراگ شوک سامنے کھڑا ہو، مانو کوئی ہردئے سے نکلی ہوئی آہ مرتمان ہوگئی ہو۔

بنشی دھر نے پوچھا۔ تم بمبئی چلے گئے تھے نا؟

اندرناتھ نے جواب دیا۔ جی ہاں، آج ہی آیا ہوں۔

بنشی دھر نے تیکھے سور میں کہا۔ گوکل کو تو تم لے بیٹے!

اندرناتھ نے اپنی انگوٹھی کی اُور تاکتے ہوئے کہا۔ وہ میرے گھر پر ہیں۔

بنشی دھر کے اداس مکھ پر ہرش (خوشی) کا پرکاش دوڑ گیا۔ بولے تو یہاں کیوں نہیں آئے؟ تم سے کہاں اس کی بھینٹ ہوئی؟ کیا بمبئی چلا گیا تھا؟

جی نہیں، کل میں گاڑی سے اُترا تو اسٹیشن پر مل گئے۔

تو جاکر لوا آؤنا، جو کیا اچھا کیا۔

یہ کہتے ہوئے وہ گھر میں دوڑے۔ ایک چھن میں گوکل کی ماتا نے اسے اندر بلایا۔

وہ اندر گیا تو ماتا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ تم بیمار تھے کیا بھیا؟ چہرہ کیوں اتنا اُترا ہے۔

اندرناتھ نے کچھ اُتر نہ دیا۔

گوکل کی ماتا نے پانی کا لوٹا رکھ کر کہا۔ ہاتھ، منہ دھو ڈالو بیٹا، گوکل ہے تو اچھی طرح؟ کہاں رہا اتنے دن! تب سے سینکڑوں منتیں مان ڈالیں۔ آیا کیوں نہیں؟

اندرناتھ نے ہاتھ منہ دھوتے ہوئے کہا۔ میں نے تو کہا تھا چلو، لیکن ڈر کے مارے نہیں آتے۔

اور تھا کہاں اتنے دن؟

کہتے تھے، دیہاتوں میں گھومتا رہا۔

تو کیا تم اکیلے بمبئی سے آئے ہو؟

جی نہیں، اماں بھی آئی ہیں۔

گوکل کی ماتا نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ مانی تو اچھی طرح ہے؟

اندرناتھ نے ہنس کر کہا۔ جی ہاں، اب وہ بڑے سکھ سے ہیں۔ سنسار کے بندھنوں سے چھوٹ گئی۔

ماتا نے اوشواس کرکے کہا۔ چل نٹ کھٹ کہیں کا۔ بے چاری کو کوس رہا ہے، مگر اتنی جلدی بمبئی سے لوٹ کیوں آئے؟

اندرناتھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ کیا کرتا! ماتا جی کا تار بمبئی میں ملا کہ مانی نے گاڑی سے کود کر پران دے دیے! وہ لال پور میں پڑی ہوئی تھیں، دوڑا ہوا آیا۔ وہیں داہ

کریا کی۔ آج گھر چلا آیا۔ اب میرا اپرادھ چھما کیجیے۔

وہ اور کچھ نہ کہہ سکا۔ آنسوؤں کے ویگ نے گلا بند کردیا۔ جیب سے ایک پتر نکال کر ماتا کے سامنے رکھتا ہوا بولا۔ ان کے صندوق میں یہی پتر ملا ہے۔

گوکل کی ماتا کئی منٹ تک مرماہت سی بیٹھی زمین کی اُور تاکتی رہیں۔ شوک اور اس سے ادھک پشچاتاپ نے سر کو دبا رکھا تھا۔ پھر پتر اُٹھا کر پڑھنے لگیں۔

سوامی!

جب یہ پتر آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا تب تک میں اس سنسار سے بدا ہوجاؤں گی! میں بڑی ابھاگنی ہوں میرے لیے اس سنسار میں استھان نہیں ہے۔ آپ کو بھی میرے کارن کلیش اور نندا ہی نندا ملے گی۔ میں نے سوچ کر دیکھا اور یہی نشچئے کیا کہ میرے لیے مرنا ہی اچھا ہے۔ مجھ پر آپ نے جو دَیا کی تھی، اس کے لیے آپ کو کیا پرتی دان کروں؟ جیون میں میں نے کبھی کسی وستو کی اِچّھا نہیں کی، پرنتو مجھے دُکھ ہے کہ آپ کے چرنوں پر سر رکھ کر نہ مرسکی۔ میری انتم یاچنا ہے کہ میرے لیے آپ شوک نہ کیجیے گا۔ ایشور آپ کو سدا سکھی رکھے۔

ماتا جی نے پتر رکھ دیا اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ برآمدے میں بنشی دھر نِسپند (بے حرکت) کھڑے تھے اور جیسے مانی لجّانت ان کے سامنے کھڑی تھی۔

یہ افسانہ ماہنامہ چاند کے فروری 1925 کے شمارے میں شائع ہوا مان سرووَر نمبر 1 میں شامل ہے۔ ہندی سے رسم خط بدل کر پہلی بار اردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔

حسرت

رات بھگت مال پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب نیند آگئی۔ کیسے کیسے عارف کامل تھے، جن کے لیے خدا کی بندگی ہی سب کچھ تھی۔ جو اسی میں محو رہتے تھے۔ ایسی معرفت بڑے ریاض سے نصیب آتی ہے۔ کیا میں وہ ریاض نہیں کرسکتی؟ اس زندگی میں میرے لیے اور کیا ہے؟ جسے زیوروں سے اُلفت ہو وہ جانے۔ یہاں تو انھیں دیکھ کر آنکھیں پھوٹتی ہیں۔ جو زر و مال پر جان دیتا ہو وہ جانے۔ یہاں تو اس کے ذکر ہی سے بخار سا چڑھ جاتا ہے۔ کل پگلی سوشیلا نے کتنے اُمنگوں سے میرا سنگار کیا تھا۔ کتنی محبت سے میرے بالوں میں پھول گوندھتے تھے۔ کتنا منع کرتی رہی۔ نہ مانی۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔ جتنی دیر اُس کے ساتھ ہنسی تھی۔ اُس سے کہیں زیادہ دیر تک روئی۔ دُنیا میں ایسا بھی کوئی آدمی ہے جو اپنی بیوی کی آرائش اور سنگار دیکھ کر سر سے پاؤں تک جل اُٹھے۔ کون ایسی عورت ہے، جو اپنے شوہر کے منہ سے یہ الفاظ سُنے۔ تم میری عاقبت بگاڑوگی۔ اور کچھ نہیں۔ تمھارے رنگ ڈھنگ کہے دیتے ہیں۔ اور اُس کا دل زہر کھا لینے کو نہ چاہے۔ مگر دُنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں۔ میں نیچے چلی گئی۔ اور بھگت مال پڑھنے لگی۔ اب کرشن ہی کی سیوا کروں گی۔ انھیں کو اپنا سنگار دکھاؤں گی۔ وہ تو دیکھ کر نہ جلیں گے۔ وہ تو میرے دل کا حال جانتے ہیں۔

(۲)

ایشور! میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں، تم علیم ہو! میرے دل کا حال جانتے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ اُن کے اشارہ پر چلوں۔ انھیں میرے کسی فعل سے میرے کسی برتاؤ سے شکایت نہ ہو۔ وہ بے قصور ہیں۔ میرے ماں باپ کی بھی کوئی خطا نہیں۔ میری تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا وہ ہوا۔ لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی میں انھیں گھر میں آتے دیکھتی ہوں تو میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔ چہرہ پر مُردنی سی چھا جاتی ہے۔ دل میں ایک گرمی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ شاید دشمن کو دیکھ کر بھی کسی کے دل میں اتنی تپش نہ ہوتی ہوگی۔ وہ دو

ایک دن کے لیے کہیں چلے جاتے ہیں۔ تو دل پر سے ایک بوجھ سا اُٹھ جاتا ہے۔ ہنستی بھی ہوں، بولتی بھی ہوں۔ زندگی میں کچھ مزہ آنے لگتا ہے۔ لیکن اُن کے آنے کی خبر پاتے ہی پھر وہی مُردنی، وہی حسرت، وہی تپش !,دل کی حالت ایسی کیوں ہے؟ کہہ نہیں سکتی۔ مجھے تو ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید زندگی سابق میں میرے اور ان کے درمیان قلبی منافرت تھی۔ اُسی منافرت کا انتقام لینے کے لیے اُنھوں نے مجھ سے شادی کی ہے۔ ہمارے دلوں پر وہی دیرینہ جذبات غالب ہیں۔ نہیں تو وہ مجھے دیکھ دیکھ کر کیوں جلتے۔ اور میں ان کی صورت سے کیوں بیزار رہتی؟ شادی کا تو یہ منشا نہیں ہوا کرتا۔ میں اپنے گھر اس سے کہیں خوش تھی۔ شاید میں اپنے گھر زندگی بھر آرام سے رہتی۔ مگر اس رواج کا بُرا ہو۔ جو لڑکیوں کو کسی نہ کسی مرد کے گلے باندھ دینا لازمی سمجھتا ہے۔ اُسے کیا خبر کہ کتنی بدنصیب عورتیں اس کے نام کو رو رہی ہیں۔ ارمانوں اور تمناؤں سے بھرے ہوئے کتنے دل اُس کے بے رحم پیروں تلے روندے جا رہے ہیں۔ عورت کے لیے اُس کا شوہر کتنے شیریں تخیلات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ مرد میں جو کچھ محامد ہے، مستحسن ہے۔ قابلِ ستائش ہے۔ اُس کی زندہ تصویر اس لفظ کی یاد آتے ہی اُس کی نظروں کے سامنے آکر کھڑی ہوجاتی ہے۔ لیکن میرے لیے یہ لفظ کیا ہے؟ جگر کی ایک خلش، پہلو میں چبھنے والی ایک پھانس، آنکھوں میں کھٹکنے والی کرکری، دل کو تڑپانے والا کلمہ سخت۔ سوشیلا کو ہمیشہ بشاش دیکھتی ہوں۔ ہمیشہ شگفتہ۔ وہ کبھی اپنی عُسرت کا گلہ نہیں کرتی۔ گہنے نہیں ہیں۔ کپڑے نہیں ہیں۔ بھاڑے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہے۔ اپنے ہاتھوں گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ پھر بھی اس کے ماتھے پر کبھی میل نہیں دیکھتی۔ اگر اپنے بس کی بات ہوتی تو آج اپنی دولت کو اُس کے افلاس سے بدل لیتی۔ اپنے پیارے شوہر کو مسکراتے ہوئے گھر میں آتے دیکھ کر اُس کی ساری فکر، سارے بے دلی کافور ہوجاتی ہے۔ سینہ میں پھریریاں سی اُڑنے لگتی ہیں۔ اُن کی ایک ہم آغوشی میں وہ کیفیت ہے۔ جس پر تینوں لوک کی دولت کو قربان کردوں۔

(۳)

آج مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ میں نے پوچھا۔ آخر تم نے مجھ سے کس لیے شادی کی تھی؟ یہ سوال مہینوں سے میرے دل میں تڑپ رہا تھا۔ پر ضبط کرتی چلی آتی تھی۔ آج پیالہ لبریز ہوگیا۔ وہ کچھ بوکھلا سے گئے۔ جیسے کسی نے اُن کی پگڑی اُتار لی ہو۔ کھسیں نکال

کر بولے۔ "گھر سنبھالنے کے لیے، گرہستی کا بوجھ اُٹھانے کے لیے اور نہیں کیا عیش اُڑانے کے لیے۔" گھرنی کے بغیر یہ گھر آپ کو بھوت کا ڈیرا سا معلوم ہوتا تھا۔ نوکر چاکر گھر کی چیزیں غائب کردیتے تھے۔ جو چیز جہاں رہتی تھی۔ وہیں پڑی رہ جاتی تھی۔ کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ تو اب معلوم ہوا کہ میں اس گھر کی حفاظت کرنے کے لیے لائی گئی ہوں۔ مجھے اس گھر کی چوکیداری کرنی چاہیے اور اپنی قسمت کو سراہنا چاہیے۔ کہ یہ ساری جائداد میری ہے۔ خاص چیز دولت ہے۔ میں تو محض خزانہ کا سانپ ہوں۔ ایسے گھر میں آج ہی آگ لگ جائے۔ سب کچھ جل کر خاک سیاہ ہوجائے۔ اب تک تو میں تقاضائے بشری سے یہاں کی نگرانی کرتی تھی۔ اتنی تو نہیں جتنی وہ چاہتے ہیں۔ پر کچھ نہ کچھ ضرور کرتی تھی۔ لیکن اب کسی چیز کو چھونے کی قسم کھاتی ہوں۔ یہ میں جانتی ہوں کوئی آدمی گھر کی حفاظت کے لیے شادی نہیں کرتا۔ اور ان حضرت نے مجھے چڑھانے کے لیے یہ بات کہی۔ لیکن سوشیلا ٹھیک کہتی ہے۔ عورت کے بغیر انھیں گھر سُونا سُونا لگتا ہوگا۔ جیسے پنجرے سے چڑیا اُڑ گئی ہو۔ یہ ہے ہم لوگوں کی خوش نصیبی!

(۴)

معلوم نہیں مجھ پر اتنا شبہ کیوں ہوتا ہے۔ جب سے تقدیر اس گھر میں لائی ہے۔ انھیں برابر اپنی طرف شبہ آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پاتی ہوں۔ اس کی وجہ؟ ذرا بال سنوارے اور اُن کے تیوروں پر بل پڑے۔ ذرا کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوئی اور انھیں بخار چڑھا۔ کہیں آتی نہیں، کہیں جاتی نہیں۔ کسی سے بولتی نہیں۔ پھر بھی اتنا شبہ۔ یہ ذلت اب نہیں سہی جاتی۔ مجھے یہ اتنی چھچھوری سمجھتے ہیں! سوشیلا ہاٹ بازار بھی جاتی ہے۔ میلے ٹھیلے بھی دیکھتی ہے۔ باغ باغیچوں میں بھی گھومتی ہے۔ اس کا شوہر خوش ہوتا ہے۔ یہاں بدگمانی کی جاتی ہے۔ شاید یہ حضرت سمجھتے ہیں کہ میں پنجرے سے نکل بھاگنا چاہتی ہوں۔ اپنے اختیار کے باہر کوئی کام کر بیٹھنے سے ہمارے دل کی یہی کیفیت ہوجاتی ہے۔ فقیر مسندِ شاہی پر بیٹھ کر کبھی چین کی نیند نہیں سو سکتا۔ اُسے در و دیوار سے بھی بے وفائی کی بو آئے گی۔ میں سمجھتی ہوں جوان بیویوں کے بوڑھے شوہروں کا یہی حال ہوتا ہے۔

آج سوشیلا کے اصرار سے میں ٹھاکر جی کی جھانکی دیکھنے جا رہی تھی۔ اب یہ معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ پھوہڑ بہو بن کر باہر نکلنا اپنی ہنسی اُڑانا ہے۔ لیکن آپ

اُسی وقت نہ جانے کدھر سے ٹپک پڑے۔ اور میری طرف سخت نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ کہاں کی تیاری ہے؟

میں نے کہہ دیا۔ ٹھاکر جی کی جھانکی دیکھنے جا رہی ہوں۔ یہ سنتے ہی تیوریاں بدل کر بولے۔ تمھارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو عورت اپنے شوہر کی خدمت نہیں کرسکتی۔ اُسے دیوتاؤں کے درشن سے ثواب کے بدلے عذاب ہوتا ہے۔ مجھ سے اڑنے چلی ہے۔ کل کی چھوکری! میں عورتوں کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔

ایسا غصہ آیا کہ بس اب کیا کہوں۔ اسی وقت کپڑے اُتار ڈالے۔ اور ٹھان لی کہ اب کبھی درشن کرنے نہ جاؤں گی۔ اس بدگمانی کی بھی کوئی انتہا ہے۔ ان کی بدگمانی کا جواب تو یہی تھا کہ اسی وقت گھر سے چل کھڑی ہوتی۔ پھر دیکھتی یہ میرا کیا کرلیتے۔ مگر صبر عورت کی خمیر ہے۔

انھیں میری دل گرفتگی اور انقباض پر تعجب ہوتا ہے۔ شاید مجھے دل میں احسان فراموش سمجھتے ہیں۔ اتنی کثیر جائداد اور اتنی دولت دیکھ کر مجھے پھولا نہ سمانا چاہیے تھا۔ آٹھوں پہر ان کا جس گاتے رہنا چاہیے تھا۔ میں یہ تو کرتی نہیں۔ اُلٹے اور منہ لٹکائے رہتی ہوں۔ ہے یہ تعجب کی بات یا نہیں۔ کبھی کبھی مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ یہ کیا جانیں کہ عورت کی زندگی میں کوئی ایسی بھی چیز ہے۔ جسے کھو کر اُس کی نظروں میں جنت بھی دوزخ ہو جاتی ہے۔

(۵)

تین دن سے بیمار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں، بچنے کی کوئی اُمید نہیں نمونیا ہوگیا ہے۔ پر مجھے نہ جانے کیوں مطلق غم نہیں ہے۔ میں اتنی سنگ دل کبھی نہ تھی۔ میرے دل کا درد نہ جانے کہاں چلا گیا۔ کسی بیمار کو دیکھ کر میرا دل رقت سے پگھل جاتا تھا۔ میں کسی کا رونا نہیں سُن سکتی تھی۔ - وہی میں ہوں۔ کہ آج تین دن سے اُنھیں بغل کے کمرے میں پڑے کراہتے سنتی ہوں۔ اور ایک بار بھی دیکھنے نہ گئی۔ آنکھ میں آنسو کا ذکر ہی کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ان سے میرا کوئی ناتا نہیں مجھے کوئی بے وفا سمجھے، دغا شعار سمجھے، بے عصمت سمجھے، پر مجھے تو یہ کہنے میں ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ ان کی بیماری سے مجھے حاسدانہ مسرت ہوتی ہے۔ انھوں نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ میں اسے شادی کے

پاکیزہ نام سے موسوم نہ کروں گی۔ یہ قید ہی ہے۔ میں اتنی فراخ دل نہیں ہوں کہ جس نے مجھے قید میں ڈال رکھا ہو اُس کی پُوجا کروں۔ جو مجھے لات مارے اس کے پیروں کو چوموں۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے ایشور انھیں میرے ساتھ یہ بے رحمی کرنے کی سزا دے رہے ہیں۔ میں بے حجاب ہوکر کہتی ہوں کہ میری ان کے ساتھ شادی نہیں ہوئی۔ عورت کسی کے گلے باندھ دیئے جانے سے ہی بیاہتا نہیں ہوجاتی۔ وہی تعلق شادی کہلانے کا مستحق ہے جس میں کم سے کم ایک بار تو دل نشۂ محبت سے مخمور ہوجائے۔ سُنتی ہوں۔ حضرت اپنے کمرے میں پڑے پڑے مجھے کوسا کرتے ہیں۔ اپنی بیماری کا سارا بخار مجھ پر نکالتے ہیں۔ لیکن یہاں اس کی پروا نہیں۔ جس کا جی چاہے یہ جائداد لے جائے۔ دولت لے جائے...... مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

(۶)

آج تین مہینے ہوئے میں بیوہ ہوگئی۔ کم سے کم لوگ یہی کہتے ہیں۔ جس کا جو جی چاہے سمجھے، پر میں تو اپنے کو جو کچھ سمجھتی ہوں وہ سمجھتی ہوں۔ میں نے چوڑیاں نہیں توڑی۔ کیوں توڑوں؟ مانگ میں سیندور پہلے بھی نہ ڈالتی تھی اب بھی نہیں ڈالتی۔ بوڑھے بابا کی تکفین اُن کے سپوت بیٹے نے کی۔ میں پاس تک نہ پھٹکی۔ گھر میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ کوئی میری مانگ چوٹی دیکھ کر ناک سکوڑتا ہے۔ کوئی میرے زیوروں کو دیکھ کر آنکھیں مٹکاتا ہے۔ میرے ہونٹوں کی سُرخی پر کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ انھیں چڑانے کے لیے میں اور بھی خوش رنگ ساڑیاں پہنتی ہوں۔ اور بھی بنتی سنورتی ہوں۔ مجھے غم کیوں ہو۔ میں تو قید سے چھوٹ گئی۔ ادھر کئی دن تک سوشیلا کے گھر گئی۔ چھوٹا سا مکان ہے۔ نہ کوئی آرائش، نہ سجاوٹ، نہ کوئی فرنیچر، چارپائیاں تک نہیں، پر سوشیلا کتنے چین سے رہتی ہے۔ اس کی زندگی پر کیوں نہ رشک آئے۔ جب دیکھو آنکھیں مسکراتی رہتی ہیں۔ ہونٹوں پر ہلکا تبسم کھیلتا رہتا ہے۔ باتوں سے پریم کے پھول جھڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خوشی، چاہے کتنی ہی عارضی کیوں نہ ہو۔ دل پر ہمیشہ کے لیے ایک نقش چھوڑ جاتی ہے۔ اُسے کوئی فراموش نہیں کرسکتا۔ اس کی یاد آخر تک روح کو معطر کرتی رہتی ہے۔ دل کے تاروں کو آخر تک مرتعش رکھتی ہے۔

ایک دن میں نے سوشیلا سے کہا۔ اگر تیرا شوہر تجھے چھوڑکر پردیس چلا جائے تو تو

شاید روتے روتے مرجائے۔

سوشیلا نے متین انداز سے جواب دیا۔ نہیں بہن! مروں گی نہیں۔ ان کی یاد میری روح کو تازہ رکھے گی۔ چاہے انھیں برسوں لگ جائیں۔

میں بھی ویسی ہی محبت کی پیاسی ہوں۔ اِسی خلش، اسی تڑپ کے لیے میں بھی بے چین ہوں۔ میں بھی ایسی ہی کوئی چوٹ چاہتی ہوں۔ جس سے دل کے تار ہمیشہ بجتے رہیں۔

(۷)

رات روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ نہ جانے کیوں دل بھربھر آتا تھا۔ اپنی زندگی ایک کفِ دست ریگستان سی، بے برگ و بار معلوم ہو رہی تھی۔ جہاں بگولوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہیں ہریالی نہیں۔ کہیں تازگی نہیں۔ گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ جی ایسا بے چین ہو رہا تھا کہ کہیں اُڑ جاؤں۔ آج کل سیر تماشے کی جانب بھی دل راغب نہیں ہوتا۔ کیا چاہتی ہوں۔ میں خود نہیں جانتی۔ لیکن میں جو نہیں جانتی وہ میرے ایک ایک عضو کو معلوم ہے۔ میں اپنے تخیلات کی زندہ تصویر ہوں۔ میرا ایک ایک عضو میرے دردِ نہاں کا آئینہ بنا ہوا ہے۔

(۸)

میرے دل کا اضطراب اُس حد تک پہنچ گیا ہے۔ جب آدمی کو بدنامی کی نہ شرم رہتی ہے اور نہ خوف۔ جن حریص ماں باپ نے مجھے کنوئیں میں ڈھکیلا۔ جس بے رحم نے میری مانگ میں سیندور ڈالنے کا سوانگ کیا۔ اُن کے یے میرے دل سے بار بار بددُعا نکلتی ہے۔ میں انھیں شرمندہ کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے منہ میں کالکھ لگا کر ان کا منہ کالا کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی جان دے کر انھیں قتل کرانا چاہتی ہوں۔ میری بیکسی غائب ہوگئی ہے۔ میرے دل میں انتقام کا شعلہ دہک رہا ہے۔

گھر کے سب آدمی سو رہے تھے۔ میں چپکے سے نیچے اُتری، دروازہ کھولا اور گھر سے نکلی جیسے کوئی آدمی گرمی سے بے تاب ہوکر گھر سے نکلے اور کسی کُھلی ہوئی جگہ کی طرف دوڑے۔ اُس مکان میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔

سڑک پر سناٹا تھا۔ دکانیں بند ہوچکی تھیں۔ دفعتاً ایک بڑھیا نظر آئی۔ میں ڈری کہیں

چڑیل نہ ہو۔ اُس نے میرے قریب آکر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور بولی۔

"کس کی راہ دیکھ رہی ہو بیٹی؟"

میں چڑ کر کہا۔ "موت کی۔"

بڑھیا۔ تمھارے نصیب میں تو ابھی زندگی کے بڑے سکھ لکھے ہیں۔ اندھیری رات گزر گئی۔ صبح کا اُجالا نظر آرہا ہے۔

میں نے کہا۔ "اندھیرے میں بھی تمھاری آنکھیں اتنی تیز ہیں کہ نوشتہ تقدیر پڑھ لیتی ہو؟"

بڑھیا۔ آنکھوں سے نہیں بیٹا! عقل سے پڑھتی ہوں۔ دھوپ میں چونڈے نہیں سفید کیے ہیں۔ تمھارے بُرے دن گئے۔ اور اچھے دن آرہے ہیں۔ ہنسو مت بیٹا، یہی کام کرتے اتنی عمر گزر گئی۔

اسی بڑھیا کے بدولت جو عورتیں ندی میں ڈوبنے جا رہی تھیں۔ وہ آج سکھ کے سیج پر سو رہی ہیں۔ جو زہر کا پیالہ پینے کو تیار تھیں، وہ آج دودھ کی کلیاں کر رہی ہیں۔ اس لیے اتنی رات گئے نکلتی ہوں کہ اپنے ہاتھوں کسی بدنصیب کا بھلا ہوجائے تو کردوں۔ کسی سے کچھ نہیں مانگتی۔ بھگوان کا دیا سب کچھ گھر میں ہے صرف یہی آرزو ہے کہ اپنے ہاتھوں کسی کی بھلائی ہوجائے۔ جنھیں دولت کی آرزو ہے۔ انھیں دولت، جنھیں اولاد کی آرزو ہے، انھیں اولاد، بس اور کیا کہوں۔ وہ منتر بتا دیتی ہوں کہ ساری تمنائیں پوری ہوجائیں۔

میں نے کہا۔ مجھے نہ دولت کی آرزو ہے۔ نہ اولاد کی۔ میری تمنا تمھارے بس کی بات نہیں۔

بڑھیا ہنسی، بیٹی جو تم چاہتی ہو وہ میں جانتی ہوں۔ تم وہ چیز چاہتی ہو۔ جو دنیا میں نایاب ہے۔ جو دولت و ثروت کو حقیر سمجھتی ہے۔ اور روکھی روٹیوں میں مگن رہتی ہے۔ جو کبھی اتنی مضبوط ہے کہ ساری دنیا کی طاقت اُسے جیت نہیں سکتی۔ اور کبھی اتنی کمزور کہ ایک لفظ اُسے جڑ سے کھود سکتا ہے۔ تم محبت کی پیاسی ہو۔ میں تمھیں اس کشتی پر بٹھا سکتی ہوں جو تمھیں منزل مقصود پر پہنچا دے۔

میں نے اشتیاق سے کہا۔ تمھارا گھر کہاں ہے اماں؟

بڑھیا۔ بہت نزدیک ہے بیٹی! تم چلو تو میں اپنی آنکھوں پر بٹھا کر لے چلوں۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ امید کی دیوی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

اس کے بعد کیا ہوا اِس کا ذکر نہ کروں گی۔ اس بڑھیا نے مجھے دغا دی۔

میں سوشیلا بننا چاہتی تھی۔ وہ تقدیر میں نہ تھا۔ لیکن اس گری ہوئی حالت میں بھی، میں اس سے کہیں زیادہ خوش ہوں جتنی اس وقت تھی۔ جب میں سہاگن تھی۔ ہنستی تو نہیں۔ لیکن روتی بھی نہیں۔ ہاں ایک حسرت ہمیشہ دل پر چھائی ہوئی رہتی ہے۔

سوشیلا کی یاد برابر آتی رہتی ہے۔ کتنی پاکیزہ تھی اس کی زندگی! اس مسرت کی ایک چٹکی میرے لیے اکسیر ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ چٹکی کون دے گا۔ مجھے تو اب ایسا کوئی دیوتا یا ولی نہیں دکھائی دیتا۔ سوشیلا کو دیکھ کر اب شاید میرا سر خود بخود جُھک جائے گا۔

یہ افسانہ ماہنامہ 'چاند' کے مئی 1925 کے شمارہ میں 'نرک کا سال' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اردو میں 'پریم چالیسی' اور ہندی میں مان سروور 3 میں شامل ہے۔

مندر اور مسجد

چودھری عطرت علی ''کڑے'' کے بڑے جاگیردار تھے۔ ان کے بزرگوں نے شاہی زمانے میں انگریزی سرکار کی بڑی بڑی خدمتیں کی تھیں۔ ان کے بدلے میں یہ جاگیر ملی تھی۔ اپنے سُوپربندھ (حسن انتظام) سے انھوں نے اپنی ملکیت اور بھی بڑھا لی تھی اور اب اس علاقے میں ان سے زیادہ دھنی مانی (متمول معزز) کوئی آدمی نہ تھا۔ انگریز حکّام جب علاقے میں دورہ کرنے جاتے تو چودھری صاحب کی مزاج پرسی کے لیے ضرور آتے تھے۔ مگر چودھری صاحب خود کسی حاکم کو سلام کرنے نہ جاتے، چاہے وہ کمشنر ہی کیوں نہ ہو۔ انھوں نے کچہریوں میں نہ جانے کا ورت (عہد) سا کرلیا تھا۔ کسی اجلاس، دربار میں بھی نہ جاتے تھے۔ کسی حاکم کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اور اس کی ہر ایک بات پر ''جی حضور'' کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ یتھا سادھیہ (اپنی عزت کے لیے) کسی معاملے۔ مقدمے میں نہ پڑتے تھے، چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو! یہ کام سولہوں آنے مختاروں کے ہاتھ میں تھا، وے ایک کے سو کریں یا سو کا ایک۔ فارسی اور عربی کے عالم تھے شرع کے بڑے پابند، سود کو حرام سمجھتے، پانچوں وقت کی نماز ادا کرتے، تیسوں روزے رکھتے اور نِتہ (روز) قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ مگر دھارمک سنکنیرتا (مذہبی کوتہ نظری) کہیں چھو تک نہیں گئی تھی۔ پراتہ کال گنگا اسنان کرنا ان کا نِتہ (روز) کا نیم (اصول) تھا۔ پانی برسے، پالا پڑے، پر پانچ بجے وہ کوس بھر چل کر گنگا تٹ پر اوَشیَہ پہنچ جاتے۔ لوٹتے وقت اپنی چاندی کی صراحی گنگا جل سے بھر لیتے اور ہمیشہ گنگا جل پیتے۔ گنگا جل کے سوا وہ اور کوئی پانی پیتے ہی نہ تھے۔ شاید کوئی یوگی یتی بھی گنگا جل پر اتنا شردھا (عقیدت) نہ رکھتا ہوگا۔ ان کا سارا گھر بھیتر سے باہر تک، ساتویں دن گئو کے گوبر سے لیپا جاتا تھا۔ اتنا ہی نہیں، ان کے یہاں باغیچے میں ایک پنڈت بارہوں ماس درگا پاٹھ کیا کرتے تھے۔ سادھو سنیاسیوں کا آدر ستکار (عزت و احترام) تو ان کے یہاں جتنی اُدارتا (فیاضی) اور بھکتی سے کیا جاتا تھا اس پر راجوں کو بھی آشچریہ (تعجب) ہوتا تھا۔ یوں کہیے کہ

شاید روتے روتے مرجائے۔

سوشیلا نے متین انداز سے جواب دیا۔ نہیں بہن! مروں گی نہیں۔ ان کی یاد میری روح کو تازہ رکھے گی۔ چاہے انھیں برسوں لگ جائیں۔

میں بھی ویسی ہی محبت کی پیاسی ہوں۔ اِسی خلش، اسی تڑپ کے لیے میں بھی بے چین ہوں۔ میں بھی ایسی ہی کوئی چوٹ چاہتی ہوں۔ جس سے دل کے تار ہمیشہ بجتے رہیں۔

(۷)

رات روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ نہ جانے کیوں دل بھر بھر آتا تھا۔ اپنی زندگی ایک کفِ دست ریگستان سی، بے برگ و بار معلوم ہو رہی تھی۔ جہاں بگولوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہیں ہریالی نہیں۔ کہیں تازگی نہیں۔ گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ جی ایسا بے چین ہو رہا تھا کہ کہیں اُڑ جاؤں۔ آج کل سیر تماشے کی جانب بھی دل راغب نہیں ہوتا۔ کیا چاہتی ہوں۔ میں خود نہیں جانتی۔ لیکن میں جو نہیں جانتی وہ میرے ایک ایک عضو کو معلوم ہے۔ میں اپنے تخیلات کی زندہ تصویر ہوں۔ میرا ایک ایک عضو میرے درد نہاں کا آئینہ بنا ہوا ہے۔

(۸)

میرے دل کا اضطراب اُس حد تک پہنچ گیا ہے۔ جب آدمی کو بدنامی کی نہ شرم رہتی ہے اور نہ خوف۔ جن حریص ماں باپ نے مجھے کنوئیں میں ڈھکیلا۔ جس بے رحم نے میری مانگ میں سیندور ڈالنے کا سوانگ کیا۔ اُن کے یے میرے دل سے بار بار بددُعا نکلتی ہے۔ میں انھیں شرمندہ کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے منہ میں کالکھ لگا کر ان کا منہ کالا کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی جان دے کر انھیں قتل کرانا چاہتی ہوں۔ میری بیکسی غائب ہوگئی ہے۔ میرے دل میں انتقام کا شعلہ دہک رہا ہے۔

گھر کے سب آدمی سو رہے تھے۔ میں چپکے سے نیچے اُتری، دروازہ کھولا اور گھر سے نکلی جیسے کوئی آدمی گرمی سے بے تاب ہوکر گھر سے نکلے اور کسی کھلی ہوئی جگہ کی طرف دوڑے۔ اُس مکان میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔

سڑک پر سناٹا تھا۔ دکانیں بند ہوچکی تھیں۔ دفعتاً ایک بڑھیا نظر آئی۔ میں ڈری کہیں

چڑیل نہ ہو۔ اُس نے میرے قریب آکر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اور بولی۔

"کس کی راہ دیکھ رہی ہو بیٹی؟"

میں چڑ کر کہا۔ "موت کی۔"

بڑھیا۔ تمھارے نصیب میں تو ابھی زندگی کے بڑے سکھ لکھے ہیں۔ اندھیری رات گزر گئی۔ صبح کا اُجالا نظر آرہا ہے۔

میں نے کہا۔ "اندھیرے میں بھی تمھاری آنکھیں اتنی تیز ہیں کہ نوشتہ تقدیر پڑھ لیتی ہو؟"

بڑھیا۔ آنکھوں سے نہیں بیٹا! عقل سے پڑھتی ہوں۔ دھوپ میں چونڈے نہیں سفید کیے ہیں۔ تمھارے بُرے دن گئے۔ اور اچھے دن آرہے ہیں۔ ہنسو مت بیٹا، یہی کام کرتے اتنی عمر گزر گئی۔

اسی بڑھیا کے بدولت جو عورتیں ندی میں ڈوبنے جا رہی تھیں۔ وہ آج سکھ کے سیج پر سو رہی ہیں۔ جو زہر کا پیالہ پینے کو تیار تھیں، وہ آج دودھ کی کلیاں کر رہی ہیں۔

اس لیے اتنی رات گئے نکلتی ہوں کہ اپنے ہاتھوں کسی بدنصیب کا بھلا ہوجائے تو کردوں۔ کسی سے کچھ نہیں مانگتی۔ بھگوان کا دیا سب کچھ گھر میں ہے صرف یہی آرزو ہے کہ اپنے ہاتھوں کسی کی بھلائی ہوجائے۔ جنھیں دولت کی آرزو ہے۔ انھیں دولت، جنھیں اولاد کی آرزو ہے، انھیں اولاد، بس اور کیا کہوں۔ وہ منتر بتا دیتی ہوں کہ ساری تمنائیں پوری ہوجائیں۔

میں نے کہا۔ مجھے نہ دولت کی آرزو ہے۔ نہ اولاد کی۔ میری تمنا تمھارے بس کی بات نہیں۔

بڑھیا ہنسی، بیٹی جو تم چاہتی ہو وہ میں جانتی ہوں۔ تم وہ چیز چاہتی ہو۔ جو دنیا میں نایاب ہے۔ جو دولت و ثروت کو حقیر سمجھتی ہے۔ اور روکھی روٹیوں میں مگن رہتی ہے۔ جو کبھی اتنی مضبوط ہے کہ ساری دنیا کی طاقت اُسے جیت نہیں سکتی۔ اور کبھی اتنی کمزور کہ ایک لفظ اُسے جڑ سے کھود سکتا ہے۔ تم محبت کی پیاسی ہو۔ میں تمھیں اس کشتی پر بٹھا سکتی ہوں جو تمھیں منزل مقصود پر پہنچا دے۔

میں نے اشتیاق سے کہا۔ تمھارا گھر کہاں ہے اماں؟

بڑھیا۔ بہت نزدیک ہے بیٹی! تم چلو تو میں اپنی آنکھوں پر بٹھا کر لے چلوں۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ امید کی دیوی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

اس کے بعد کیا ہوا اِس کا ذکر نہ کروں گی۔ اس بڑھیا نے مجھے دغا دی۔

میں سوشیلا بننا چاہتی تھی۔ وہ تقدیر میں نہ تھا۔ لیکن اس گری ہوئی حالت میں بھی، میں اس سے کہیں زیادہ خوش ہوں جتنی اس وقت تھی۔ جب میں سہاگن تھی۔ ہنستی تو نہیں۔ لیکن روتی بھی نہیں۔ ہاں ایک حسرت ہمیشہ دل پر چھائی ہوئی رہتی ہے۔

سوشیلا کی یاد برابر آتی رہتی ہے۔ کتنی پاکیزہ تھی اس کی زندگی! اس مسرت کی ایک چٹکی میرے لیے اکسیر ہوسکتی ہے۔ لیکن وہ چٹکی کون دے گا۔ مجھے تو اب ایسا کوئی دیوتا یا ولی نہیں دکھائی دیتا۔ سوشیلا کو دیکھ کر اب شاید میرا سر خود بخود جُھک جائے گا۔

یہ افسانہ ماہنامہ 'چاند' کے مئی 1925 کے شمارہ میں 'نرک کا سال' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اردو میں 'پریم چالیسی' اور ہندی میں مان سروور 3 میں شامل ہے۔

مندر اور مسجد

چودھری عطرت علی ''کڑے'' کے بڑے جاگیردار تھے۔ ان کے بزرگوں نے شاہی زمانے میں انگریزی سرکار کی بڑی بڑی خدمتیں کی تھیں۔ ان کے بدلے میں یہ جاگیر ملی تھی۔ اپنے سُوپربندھ (حسن انتظام) سے انھوں نے اپنی ملکیت اور بھی بڑھا لی تھی اور اب اس علاقے میں ان سے زیادہ دھنی مانی (متمول معزز) کوئی آدمی نہ تھا۔ انگریز حکّام جب علاقے میں دورہ کرنے جاتے تو چودھری صاحب کی مزاج پرسی کے لیے ضرور آتے تھے۔ مگر چودھری صاحب خود کسی حاکم کو سلام کرنے نہ جاتے، چاہے وہ کمشنر ہی کیوں نہ ہو۔ انھوں نے کچہریوں میں نہ جانے کا ورت (عہد) سا کرلیا تھا۔ کسی اجلاس، دربار میں بھی نہ جاتے تھے۔ کسی حاکم کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اور اس کی ہر ایک بات پر ''جی حضور'' کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ یتھا سادھیہ (اپنی عزت کے لیے) کسی معاملے۔ مقدمے میں نہ پڑتے تھے، چاہے اپنا نقصان ہی کیوں نہ ہوتا ہو! یہ کام سولہوں آنے مختاروں کے ہاتھ میں تھا، وے ایک کے سو کریں یا سو کا ایک۔ فارسی اور عربی کے عالم تھے شرع کے بڑے پابند، سود کو حرام سمجھتے، پانچوں وقت کی نماز ادا کرتے، تیسوں روزے رکھتے اور نِتہ (روز) قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ مگر دھارمک سنکیرتا (مذہبی کوتہ نظری) کہیں چھو تک نہیں گئی تھی۔ پراتہ کال گنگا اسنان کرنا ان کا نِتہ (روز) کا نیم (اصول) تھا۔ پانی برسے، پالا پڑے، پر پانچ بجے وہ کوس بھر چل کر گنگا تٹ پر اوشیہ پہنچ جاتے۔ لوٹتے وقت اپنی چاندی کی صراحی گنگا جل سے بھر لیتے اور ہمیشہ گنگا جل پیتے۔ گنگا جل کے سوا وہ اور کوئی پانی پیتے ہی نہ تھے۔ شاید کوئی یوگی یتی بھی گنگا جل پر اتنا شردھا (عقیدت) نہ رکھتا ہوگا۔ ان کا سارا گھر بھیتر سے باہر تک، ساتویں دن گئو کے گوبر سے لیپا جاتا تھا۔ اتنا ہی نہیں، ان کے یہاں باغیچے میں ایک پنڈت بارہوں ماس درگا پاٹھ کیا کرتے تھے۔ سادھو سنیاسیوں کا آدر ستکار (عزت و احترام) تو ان کے یہاں جتنی اُدارتا (فیاضی) اور بھکتی سے کیا جاتا تھا اس پر راجوں کو بھی آشچریہ (تعجب) ہوتا تھا۔ یوں کہیے کہ

سداورت چلتا تھا۔ ادھر مسلمان فقیروں کا کھانا باورچی خانے میں پکتا تھا اور کوئی سو سوا سو آدمی نت ایک دسترخوان پر کھاتے تھے۔ اتنا دان پنیہ کرنے پر بھی ان پر کسی مہاجن کا ایک کوڑی کا بھی قرض نہ تھا۔ نیت کی کچھ ایسی برکت تھی کہ دن دن انتی (ترقی) ہی ہوتی تھی۔ ان کی ریاست میں عام حکم تھا کہ مُردوں کو جلانے کے لیے کسی یگیہ یا بھوج کے لیے، شادی بیاہ کے لیے سرکاری جنگل سے جتنی لکڑی چاہے کاٹ لو۔ چودھری صاحب سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ ہندو آسامیوں کی بارات میں ان کی اُور سے کوئی نہ کوئی ضرور شریک ہوتا تھا۔ نیوتے کے روپے بندھے ہوئے تھے، لڑکیوں کے وواہ میں کنیا دان کے روپے مقرر تھے، ان کو ہاتھی، گھوڑے، تنبو، شامیانے، پالکی نالکی، فرش جازیمیں، پنکھے چنور، چاندی کے محفلی سامان اس کے یہاں سے بنا کسی دِقت کے مل جاتے تھے، مانگنے بھر کی دیر رہتی تھی۔ اس دانی، اُدار، یشوی (نیک) آدمی کے لیے پرجا بھی پرانڑ دینے کو تیار رہتی تھی۔

(۲)

چودھری صاحب کے پاس ایک راجپوت چپراسی تھا بھجن سنگھ۔ پورے چھ فٹ کا جوان تھا، چوڑا سینا، بانے کا لٹھیت، سیکڑوں کے بیچ سے مار کر نکل آنے والا۔ اسے بھئے تو چھو بھی نہیں گیا تھا۔ چودھری صاحب کو اس پر اسیم (بے حد) وشواس (یقین) تھا، یہاں تک کہ حج کرنے گئے تو اسے بھی ساتھ لے گئے تھے۔ ان کے دشمنوں کی کمی نہ تھی، آس پاس کے سبھی زمیندار ان کی شکتی اور کیرتی سے جلتے تھے۔ چودھری صاحب کے خوف کے مارے وے اپنے آسامیوں پر من مانا اتیاچار نہ کرسکتے تھے، کیوں کہ وہ نربلوں (کمزوروں) کا پکش (اُورا) لینے کے لیے سدا تیار رہتے تھے۔ لیکن بھجن سنگھ ساتھ ہو، تو انھیں دشمن کے دوار پر بھی سونے میں کوئی شنکا نہ تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ دشمنوں نے انھیں گھیر لیا اور بھجن سنگھ اکیلا جان پر کھیل کر انھیں بے داغ نکال لایا ایسا آگ میں کود پڑنے والا آدمی کسی نے کم دیکھا ہوگا۔ وہ کہیں باہر جاتا تو جب تک خیریت سے گھر نہ پہنچ جائے، چودھری صاحب کو شنکا بنی رہتی کہ کہیں کسی سے لڑ نہ بیٹھا ہو۔ بس پالتو میڈے کی سی دشا تھی، جو زنجیر سے چھوٹتے ہی کسی نہ کسی سے ٹکر لینے دوڑتا ہے۔ تینوں لوک میں چودھری صاحب کے سوا اس کی نگاہوں میں اور کوئی تھا ہی نہیں۔ بادشاہ کہو، مالک کہو،

دیوتا کہو، جو کچھ تھے چودھری صاحب تھے۔

مسلمان لوگ چودھری صاحب سے جلا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے دین سے پھر گئے ہیں ایسا وِچتر جیون سدھانت (زندگی کا عجیب نظریہ) ان کی سمجھ میں کیوں کر آتا۔ مسلمان، اگر سچا مسلمان ہے تو گنگا جل کیوں پیے، سادھوؤں کا آدرستکار کیوں کرے، درگا پاٹھ کیوں کروائے؟ ملاؤں میں ان کے خلاف ہنڈیاں پکتی رہتی تھیں اور ہندوؤں کو زک دینے کی تیاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ آخر یہ رائے طئے پائی کہ ٹھیک جنم اشٹمی کے دن ٹھاکردوارے پر حملہ کیا جائے اور ہندوؤں کا سر نیچا کردیا جائے، دِکھا دیا جائے کہ چودھری صاحب کے بل پر پھولے پھولے پھرنا تمھاری بھول ہے۔ چودھری صاحب کر ہی کیا لیں گے۔ اگر انھوں نے ہندوؤں کی حمایت کی تو ان کی خبر لی جائے گی، سارا ہندوپن نکل جائے گا۔

(۳)

اندھیری رات تھی، کڑے کے بڑے ٹھاکر دوارے میں کرشن کا جنم اتسو منایا جا رہا تھا۔ ایک وردھ مہاتما پوپلے منہ سے تنبورے پر دُھرپد الاپ رہے تھے اور بھکت جن ڈھول مجیرے لیے بیٹھے تھے کہ ان کا گانا بند ہو، تو ہم اپنا کیرتن شروع کریں۔ بھنڈاری پرساد بنا رہا تھا۔ سینکڑوں آدمی تماشا دیکھنے کے لیے جمع تھے۔

سہسا مسلمانوں کا ایک دل لاٹھیاں لیے ہوئے آپہنچا، اور مندر پر پتھر برسانا شروع کیے۔ شور مچ گیا۔ پتھر کہاں سے آتے ہیں! یہ پتھر کون پھینک رہا ہے! کچھ لوگ مندر کے باہر نکل کر دیکھنے لگے۔ مسلمان لوگ تو گھات میں بیٹھے ہی تھے، لاٹھیاں جمانی شروع کیں۔ ہندوؤں کے ہاتھ میں اس سمئے ڈھول مجیرے کے سوا اور کیا تھا۔ کوئی مندر میں آچھپا، کوئی کسی دوسری طرف بھاگا۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔

چودھری صاحب کو بھی خبر ہوئی۔ بھجن سنگھ سے بولے۔ ٹھاکر، دیکھو تو کیسا شور و غل ہے؟ جاکر بدمعاشوں کو سمجھا دو اور نہ مانیں تو دو چار ہاتھ چلا بھی دینا، مگر خون خچّر نہ ہونے پائے۔

ٹھاکر یہ شورو غل سن سن کر دانت پیس رہے تھے، دل پہ پتھر کی سل رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ آدیش (حکم) سنا تو منہ مانگی مراد پائی۔ شترو بھجن ڈنڈا کندھے پر رکھا اور

لپکے ہوئے مندر پہنچے۔ وہاں مسلمانوں نے گھور اپدرو (فساد) مچا رکھا تھا۔ کئی آدمیوں کا پیچھا کرتے ہوئے مندر میں گھس گئے تھے، اور شیشے کے سامان توڑ پھوڑ رہے تھے۔

ٹھاکر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا، سر پر خون سوار ہوگیا۔ للکارتے ہوئی مندر میں گھس گیا اور بدمعاشوں کو پیٹنا شروع کیا۔ ایک طرف تو وہ اکیلا اور دوسری طرف پچاسوں آدمی! لیکن واہ رے شیر! اکیلے سب کے چھکے چھڑا دیے، کئی آدمیوں کو مار گرایا۔ غصے میں اسے اس وقت کچھ نہ سوجھتا تھا کسی کے مرنے جینے کی پروا نہ تھی۔ معلوم نہیں، اس میں اتنی شکتی کہاں سے آگئی تھی۔ اسے ایسا جان پڑتا تھا کہ کوئی دیوی شکتی میری مدد کر رہی ہے۔ کرشن بھگوان سویم اس کی رکشا کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ دھرم سنگرام میں منشیوں سے آلوکک کام ہوجاتے ہیں۔

ادھر ٹھاکر کے چلے آنے کے بعد چودھری صاحب کو بھے ہوا کہ کہیں ٹھاکر کسی کا خون نہ کر ڈالے، اس کے پیچھے خود بھی مندر میں آپہنچے۔ دیکھا تو کہرام مچا ہوا ہے۔ بدمعاش لوگ اپنی جان لے لے کر بے تحاشہ بھاگے جا رہے ہیں، کوئی پڑا کراہ رہا ہے، کوئی ہائے ہائے کر رہا ہے۔ ٹھاکر کو پکارنا ہی چاہتے تھے کہ سہسا ایک آدمی بھاگا ہوا آیا اور ان کے سامنے آتا آتا زمین پر گر پڑا۔ چودھری صاحب نے اسے پہچان لیا، اور دنیا ان کی آنکھوں میں اندھیری ہوگئی۔ یہ ان کا اکلوتا داماد اور ان کی جائیداد کا وارث شاہد حسین تھا!

چودھری نے دوڑ کر شاہد کو سنبھالا اور زور سے بولے۔ ٹھاکر، ادھر آؤ۔ لالٹین ...... لالٹین! آہ یہ تو میرا شاہد ہے!

ٹھاکر کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لالٹین لے کر باہر نکلے۔ شاہد حسین ہی تھے۔ ان کا سر کٹ گیا تھا اور رکت اچھلتا ہوا نکل رہا تھا۔

چودھری نے سر پیٹتے ہوئے کہا۔ ٹھاکر، تم نے میرا چراغ ہی گل کردیا۔

ٹھاکر نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ مالک، بھگوان جانتے ہیں، میں نے پہچانا نہیں۔

چودھری۔ نہیں، میں تمھارے اوپر الزام نہیں رکھتا۔ بھگوان کے مندر میں کسی کو گھسنے کا اختیار نہیں ہے۔ افسوس یہی ہے کہ خاندان کا نشان مٹ گیا، اور تمھارے ہاتھوں! تم نے میرے لیے ہمیشہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھی، اور خدا نے تمھارے ہی ہاتھوں میرا ستیاناش کرا دیا۔

چودھری صاحب روتے جاتے تھے اور یہ باتیں کہتے جاتے تھے۔ ٹھاکر گلانی اور پشچاتاپ (ندامت) سے گڑا جاتا تھا۔ اگر اس کا اپنا لڑکا مارا گیا ہوتا، تو اسے اتنا دکھ نہ ہوتا۔ آہ! میرے ہاتھوں میرے مالک کا سروناش ہوا! جس کے پسینے کی جگہ وہ خون بہانے کو تیار رہتا تھا، جو اس کا سوامی ہی نہیں اِشٹ تھا، جس کے ذرا سے اشارے پر وہ آگ میں کود سکتا تھا، اسی کے ونش کی اس نے جڑ کاٹ دی! وہ اس کی آستین کا سانپ نکلا! روندھے ہوئے کنٹھ سے بولا۔ سرکار، مجھ سے بڑھ کر اَبھاگا اور کون ہوگا۔ میرے منہ میں کالِک لگ گئی۔

یہ کہتے کہتے ٹھاکر نے کمر سے چُھرا نکال لیا۔ وہ اپنی چھاتی میں چُھرا گھونپ کر کالیما کو رکت سے دھونا ہی چاہتے تھے کہ چودھری صاحب نے لپک کر چُھرا ان کے ہاتھوں سے چھین لیا اور بولے۔ کیا کرتے ہو ہوش سنبھالو۔ یہ تقدیر کے کرشمے ہیں۔ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں۔ خدا کو جو منظور تھا وہ ہوا میں اگر خود شیطان کے بہکانے میں آکر مندر میں گھستا اور دیوتا کی توہین کرتا، اور تم مجھے پہچان کر بھی قتل کردیتے، تو میں اپنا خون معاف کردیتا۔ کسی کے دین کی توہین کرنے سے بڑا اور کوئی گناہ نہیں ہے۔ گو اس وقت میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے، اور یہ صدمہ میری جان ہی لے کر چھوڑے گا، پر خدا گواہ ہے کہ مجھے تم سے ذرا بھی ملال نہیں ہے۔ تمھاری جگہ میں ہوتا، تو میں بھی یہی کرتا، چاہے میرے مالک کا بیٹا ہی کیوں نہ ہوتا۔ گھر والے مجھے طعنوں سے چھیدیں گے، لڑکی رو رو کر مجھ سے خون کا بدلہ مانگے گی، سارے مسلمان میرے خون کے پیاسے ہوجائیں گے، میں کافر اور بے دین کہا جاؤں گا، شاید کوئی دین کا پکّا نوجوان مجھے قتل کرنے پر بھی تیار ہوجائے، لیکن میں حق سے منہ نہ موڑوں گا۔ اندھیری رات ہے، اسی دم یہاں سے بھاگ جاؤ، اور میرے علاقے کی کسی چھاونی میں چھپ جاؤ۔ وہ دیکھو، کئی مسلمان چلے آرہے ہیں۔ میرے گھر والے بھی ہیں۔ بھاگو بھاگو!

(۴)

سال بھر بھجن سنگھ چودھری صاحب کے علاقے میں چھپا رہا۔ ایک اُور مسلمان لوگ اس کی ٹوہ میں لگے رہتے تھے۔ دوسری اُور پولیس۔ لیکن چودھری اسے ہمیشہ چھپاتے رہتے تھے۔ اپنے سماج کے طعنے سہے، اپنے گھر والوں کا ترسکار (لعنتیں) سہا، پولیس کے وار سہے،

ملاؤں کی دھمکیاں سہیں، پر بھجن سنگھ کی خبر کسی کے کانوں کان نہ ہونے دی۔ ایسے وفادار سوامی بھکت سیوک کو وہ جیتے جی نردے قانون کے پنجے میں نہ دینا چاہتے تھے۔ ان کے علاقے کی چھاؤنیوں میں کئی بار تلاشیاں ہوئیں۔ ملاؤں نے گھر کے نوکروں، ماماؤں، لونڈیوں کو ملایا۔ لیکن چودھری نے ٹھاکر کو اپنے احسانوں کی بھانتی چھپائے رکھا۔

لیکن ٹھاکر کو اپنے پرانوں کی رکھشا کے لیے چودھری صاحب کو سنکٹ میں پڑے دیکھ کر اسہائے ویدنا (ناقابل برداشت تکلیف) ہوتی تھی۔ اس کے جی میں بار بار آتا تھا، چل کر مالک سے کہہ دوں۔ مجھے پولیس کے حوالے کر دیجیے۔ لیکن چودھری صاحب بار بار اسے چھپے رہنے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔

جاڑوں کے دن تھے۔ چودھری صاحب اپنے علاقے کا دورہ کر رہے تھے اب وہ مکان پر بہت کم رہتے تھے۔ گھر والوں کے شبد بانوں سے بچنے کا یہی اُپائے تھا۔ رات کو کھانا کھاکر لیٹے ہی تھے کہ بھجن سنگھ آکر سامنے کھڑا ہوگیا۔ اس کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ چودھری صاحب دیکھ کر چونک پڑے۔ ٹھاکر نے کہا۔ سرکار اچھی طرح ہیں۔

چودھری۔ ہاں، خدا کا فضل ہے۔ تم تو بالکل پہچانے ہی نہیں جاتے۔ اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟

ٹھاکر۔ مالک، اب تو چھپ کر نہیں رہا جاتا۔ حکم ہو تو جاکر عدالت میں حاضر ہوجاؤں۔ جو بھاگیہ میں لکھا ہوگا، وہ ہوگا۔ میرے کارن آپ کو اتنی حیرانی ہو رہی ہے، یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔

چودھری۔ نہیں ٹھاکر، میرے جیتے جی نہیں۔ تمھیں جان بوجھ کر بھاڑ کے منہ میں نہیں ڈال سکتا۔ پولیس اپنی مرضی کے موافق شہادتیں بنائے گی، اور مفت میں تمھیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ تم نے میرے لیے بڑے بڑے خطرے سہے ہیں۔ اگر میں تمھارے لیے اتنا بھی نہ کرسکوں، تو مجھ سے بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہوگا؟ اس بارے میں اب پھر مجھ سے کچھ مت کہنا۔

ٹھاکر۔ کہیں کسی نے سرکار ....

چودھری۔ اس کا بالکل غم نہ کرو۔ جب تک خدا کو منظور نہ ہوگا، کوئی میرا بال بھی بانکا نہیں کرسکتا۔ تم اب جاؤ۔ یہاں ٹھہرنا خطرناک ہے۔

ٹھاکر۔ سنتا ہوں، لوگوں نے آپ سے ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔

چودھری۔ دشمنوں کا دور رہنا ہی اچھا۔

لیکن ٹھاکر کے دل میں جو بات جم گئی تھی، وہ نہ نکلی۔ اس ملاقات نے اس کا ارادہ اور بھی پکا کر دیا۔ انھیں میرے کارن یوں مارے مارے پھرنا پڑ رہا ہے۔ یہاں ان کا کون اپنا بیٹھا ہوا ہے؟ جو چاہے آکر حملہ کرسکتا ہے۔ میری اس زندگی کو دھتکار!

پراتہ کال ٹھاکر ضلع حاکم کے بنگلے پر پہنچا۔ صاحب نے پوچھا۔ تم اب تک چودھری کے کہنے سے چھپا تھا؟

ٹھاکر۔ نہیں، ہجور اپنی جان کے خوف سے۔

(۵)

چودھری صاحب نے یہ خبر سنی، تو سناٹے میں آگئے۔ اب کیا ہو؟ اگر مقدمہ کی پیروی نہ کی گئی تو ٹھاکر کا بچنا مشکل ہے۔ پیروی کرتے ہیں، تو اسلامی دنیا میں تہلکا پڑجاتا ہے۔ چاروں طرف سے فتوے نکلنے لگیں گے۔ ادھر مسلمانوں نے ٹھان لی کہ اسے پھانسی دلا کر ہی چھوڑیں گے۔ آپس میں چندے کی اپیل کی، دوار دوار جھولی باندھ کر گھومے۔ اس پر قومی مقدمے کا رنگ چڑھایا گیا مسلمان وکیلوں کو نام لوٹنے کا موقع ملا۔ آس پاس کے ضلعوں سے جہاد میں شریک ہونے کے لیے آنے لگے۔

چودھری صاحب نے بھی پیروی کرنے کا نشچئے کیا، چاہے کتنی ہی آفتیں کیوں نہ سر پر آپڑیں۔ ٹھاکر انھیں انصاف کی نگاہ میں بے قصور معلوم ہوتا تھا اور بے قصور کی رکشا کرنے میں انھیں کسی کا خوف نہ تھا۔ گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور شہر میں جاکر ڈیرا جما دیا۔

چھ مہینے تک چودھری صاحب نے جان لڑاکر مقدمے کی پیروی کی۔ پانی کی طرح روپے بہائے، آندھی کی طرح دوڑے۔ وہ سب کیا جو زندگی میں کبھی نہ کیا تھا، اور نہ پیچھے کبھی کیا۔ اہلکاروں کی خوشامدیں کیں۔ وکیلوں کے ناز اُٹھائے، حاکموں کو نظریں دیں اور ٹھاکر کو چھڑا لیا۔ سارے علاقے میں دھوم مچ گئی۔ جس نے سنا، دنگ رہ گیا۔ اسے کہتے ہیں شرافت! اپنے نوکر کو پھانسی سے اُتار لیا۔

لیکن سامپردائک دویش (فرقہ وارانہ حسد) نے اسی ست کاریہ (حق پرستی کے کام)

کو اور ہی آنکھوں سے دیکھا۔ مسلمان جھلائے، ہندوؤں نے بغلیں بجائیں۔ مسلمان سمجھے، ان کی رہی سہی مسلمانی بھی غائب ہوگئی۔ ہندوؤں نے خیال کیا اب ان کی شُدھی کر لینی چاہیے، اسی کا موقع آ گیا۔ ملاؤں نے اور زور شور سے تبلیغ کی ہانک لگانی شروع کی، ہندوؤں نے بھی سنگٹھن کا جھنڈا اُٹھایا۔ مسلمانوں کی مسلمانی جاگ اُٹھی اور ہندوؤں کا ہندوتو۔ ٹھاکر کے قدم بھی اس ریلے میں اُکھڑ گئے۔ منچلے تھے ہی، ہندوؤں کے مکھیا بن بیٹھے۔ زندگی میں کبھی ایک لوٹا جل تک شیو کو نہ چڑھایا تھا، اب دیوی دیوتاؤں کے نام پر لٹھ چلانے کے لیے اُدھت ہوگئے۔ شدھی کرنے کو کوئی مسلمان نہ ملا، تو دو ایک چماروں ہی کی شدھی کرا ڈالی۔ چودھری صاحب کے دوسرے نوکروں پر بھی اثر پڑا، جو مسلمان کبھی مسجد کے سامنے کھڑے نہ ہوتے تھے، وے پانچوں وقت کی نماز ادا کرنے لگے، جو ہندو کبھی مندروں میں جھانکتے بھی نہ تھے، وے دونوں وقت سندھیا کرنے لگے۔

بستی میں ہندوؤں کی سنکھیا ادھک تھی۔ اس پر ٹھاکر بھجن سنگھ بنے ان کے مکھیا، جن کی لاٹھی کا لوہا سب مانتے تھے۔ پہلے مسلمان سنکھیا میں کم ہونے پر بھی، ان پر غالب رہتے تھے، کیونکہ وے سنگٹھت (منتظم) نہ تھے، لیکن اب وے سنگٹھت ہوگئے تھے، بھلا مٹھی بھر مسلمان ان کے سامنے کیا ٹھہرتے۔

ایک سال اور گزر گیا۔ پھر جنم اشٹمی کا اتسو آیا۔ ہندوؤں کو ابھی تک اپنی ہار بھولی نہ تھی۔ گپت روپ سے برابر تیاریاں ہوتی رہتی تھیں۔ آج پراتہ کال ہی سے بھکت لوگ مندر میں جمع ہونے لگے۔ سب کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں، کتنے ہی آدمیوں نے کمر میں چھرے چھپا لیے تھے۔ چھیڑ کر لڑنے کی رائے پکی ہوگئی تھی۔ پہلے کبھی اس اتسو میں جلوس نہ نکلا تھا۔ آج دھوم دھام سے جلوس بھی نکلنے کی ٹھہری۔

دیپک جل چکے تھے۔ مسجدوں میں شام کی نماز ہونے لگی تھی۔ جلوس نکلا۔ ہاتھی گھوڑے، جھنڈے جھنڈیاں، باجے گاجے، سب ساتھ تھے۔ آگے آگے بھجن سنگھ اپنے اکھاڑے کے پٹھوں کو لیے اکڑتے چلے جاتے تھے۔

جمعہ مسجد سامنے دکھائی دی۔ پٹھوں نے لاٹھیاں سنبھالیں، سب لوگ سترک (مستعد) ہوگئے۔ جو لوگ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تھے، آکر سمٹ گئے۔ آپس میں کچھ کانا پھوسی ہوئی۔ باجے اور زور سے بجنے لگے۔ جے جے کار کی دھونی اور زور سے اُٹھنے لگی۔ جلوس

مسجد کے سامنے آپہنچا۔

سہسا ایک مسلمان نے مسجد سے نکل کر کہا۔ نماز کا وقت ہے، باجے بند کردو۔

بھجن سنگھ۔ باجے نا بند ہوں گے۔

مسلمان۔ بند کرنے پڑیں گے۔

بھجن سنگھ۔ تم اپنی نماز کیوں نہیں بند کردیتے؟

مسلمان۔ چودھری صاحب کے بل پر مت پھولنا۔ اب کہ ہوش ٹھنڈے ہوجائیں گے۔

بھجن سنگھ۔ چودھری صاحب کے بل پر تم پھولو، یہاں اپنے ہی بل کا بھروسا ہے۔ یہ دھرم کا معاملہ ہے۔

اتنے میں کچھ اور مسلمان نکل آئے، اور باجے بند کرنے کا آگرہ کرنے لگے، اِدھر اور زور سے باجے بجنے لگے۔ بات بڑھ گئی۔ ایک مولوی نے بھجن سنگھ کو کافر کہہ دیا۔ ٹھاکر نے اس کی داڑھی پکڑ لی۔ پھر کیا تھا۔ سورما لوگ نکل پڑے، مارپیٹ شروع ہوگئی۔ ٹھاکر ہلاّ مار کر مسجد میں گھس گئے، اور مسجد کے اندر مارپیٹ ہونے لگی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ میدان کس کے ہاتھ رہا۔ ہندو کہتے تھے، ہم نے کھدیڑ کھدیڑ کر مارا، مسلمان کہتے تھے، ہم نے وہ مار ماری کہ پھر سامنے نہیں آئیں گے۔ پر ان وواددوں (بحث و تکرار) کے بیچ ایک بات سب مانتے تھے اور وہ تھی ٹھاکر بھجن سنگھ کی آلوکک ویرتا۔ مسلمانوں کا کہنا تھا کہ ٹھاکر نہ ہوتا تو ہم کسی کو زندہ نہ چھوڑتے، ہندو کہتے تھے کہ ٹھاکر سچ مچ مہاویر کا اوتار ہے۔ اس کی لاٹھیوں نے ان سبوں کے چھکے چھڑا دیے۔

اتسو سماپت ہوچکا تھا۔ چودھری صاحب دیوان خانے میں بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے تھے۔ ان کا مکھ لال تھا، تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ "خدا کا گھر" ناپاک کیا گیا! یہ خیال رہ رہ کر ان کے کلیجے کو مسوستا تھا۔

خدا کا گھر ناپاک کیا گیا! ظالموں کو لڑنے کے لیے کیا نیچے میدان میں جگہ کافی نہ تھی! خدا کے پاک گھر میں یہ خون خچر! مسجد کی یہ بے حرمتی! مندر بھی خدا کا گھر ہے اور مسجد بھی۔ مسلمان کسی مندر کو ناپاک کرنے کے لیے جس سزا کے لائق ہیں، کیا ہندو مسجد کو ناپاک کرنے کے لیے اسی سزا کے لائق نہیں؟ اور یہ حرکت ٹھاکر نے کی! اسی قصور کے لیے تو اس نے میرے داماد کو قتل کیا تھا مجھے معلوم ہوتا کہ اس کے ہاتھوں اپنا فعل ہوگا،

تو اسے پھانسی پر چڑھنے دیتا۔ کیوں اس کے لیے اتنا حیران، اتنا بدنام، اتنا زیربار ہوتا۔ ٹھاکر میرا وفادار نوکر ہے۔ اس نے بارہا میری جان بچائی ہے۔ میرے پسینے کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتا ہے۔ لیکن آج اس نے خدا کے گھر کو ناپاک کیا ہے، اور اسے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ اس کی سزا کیا ہے؟ جہنم جہنم کی آگ کے سوا اس کی اور کوئی سزا نہیں ہے۔ جس نے خدا کے گھر کو ناپاک کیا، اس نے خدا کی توہین کی۔ خدا کی توہین!

سہسا ٹھاکر بھجن سنگھ آکر کھڑے ہوگئے۔

چودھری صاحب نے ٹھاکر کو کرودھومت (غصہ اگلتی ہوئی) آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

تم مسجد میں گھسے تھے؟

بھجن سنگھ۔ سرکار، مولوی لوگ ہم لوگوں پر ٹوٹ پڑے۔

چودھری۔ میری بات کا جواب دو جی۔ تم مسجد میں گھسے تھے؟

بھجن سنگھ۔ جب ان لوگوں نے مسجد کے بھیتر سے ہمارے اوپر پتھر پھینکنا شروع کیا تب ہم لوگ انھیں پکڑنے کے لیے مسجد میں گھس گئے۔

چودھری۔ جانتے ہو، مسجد خدا کا گھر ہے؟

بھجن سنگھ۔ جانتا ہوں ہجور، کیا اتنا بھی نہیں جانتا۔

چودھری۔ مسجد خدا کا ویسا ہی پاک گھر ہے، جیسے مندر۔

بھجن سنگھ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔

چودھری۔ اگر کوئی مسلمان مندر کو ناپاک کرنے کے لیے گردن زدنی ہے تو ہندو بھی مسجد کو ناپاک کرنے کے لیے گردن زدنی ہے۔

بھجن سنگھ اس کا بھی کچھ جواب نہ دے سکا۔ اس نے چودھری صاحب کو کبھی اتنے غصے میں نہ دیکھا تھا۔

چودھری۔ تم نے میرے داماد کو قتل کیا، اور میں نے تمھاری پیروی کی۔ جانتے ہو کیوں؟ اسی لیے کہ میں اپنے داماد کو اس سزا کا لائق سمجھتا تھا جو تم نے اسے دی۔ اگر تم نے میرے بیٹے کو، یا مجھی کو اس قصور کے لیے مار ڈالا ہوتا تو میں تم سے خون کا بدلہ نہ مانگتا۔ وہ قصور آج تم نے کیا ہے۔ اگر کسی مسلمان نے مسجد میں تمھیں جہنم میں پہنچا دیا ہوتا تو مجھے سچی خوشی ہوتی لیکن تم بے حیاؤں کی طرح وہاں سے بچ کر

نکل آئے۔ کیا تم سمجھتے ہو خدا تمھیں اس فعل کی سزا نہ دے گا؟ خدا کا حکم ہے کہ جو اس کی توہین کرے، اس کی گردن مار دینی چاہیے۔ یہ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے۔ چور اگر سزا نہ پاوے تو کیا وہ چور نہیں ہے؟ تم مانتے ہو یا نہیں کہ تم نے خدا کی توہین کی ہے؟

ٹھاکر اس اپرادھ سے انکار نہ کرسکے۔ چودھری صاحب کے ست سنگ نے ہٹھ دھرمی کو دور کردیا تھا۔ بولے۔ ہاں صاحب یہ قصور تو ہوگیا۔

چودھری۔ اس کی جو سزا تم دے چکے ہو، وہ سزا خود لینے کے لیے تیار رہو؟

ٹھاکر۔ میں نے جان بوجھ کر تو دولہا میاں کو نہیں مارا تھا۔

چودھری۔ تم نے نہ مارا ہوتا، تو میں اپنے ہاتھوں سے مارتا، سمجھ گئے! اب میں تم سے خدا کی توہین کا بدلہ لوں گا۔ بولو میرے ہاتھوں چاہتے ہو یا عدالت کے ہاتھوں۔ عدالت سے کچھ دنوں کے لیے سزا پاؤ گے۔ میں قتل کردوں گا۔ تم میرے دوست ہو، مجھے تم سے مطلق کینہ نہیں ہے۔ میرے دل کو کتنا رنج ہے، یہ خدا کے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا۔ لیکن میں تمھیں قتل کروں گا۔ میرے دین کا یہ حکم ہے۔

یہ کہتے ہوئے چودھری صاحب تلوار لے کر ٹھاکر کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ وچتر درشیہ تھا۔ ایک بوڑھا آدمی، سر کے بال پکے، کمر جھکی، تلوار لیے ایک دیو کے سامنے کھڑا تھا۔ ٹھاکر لاٹھی کے ایک ہی وار سے ان کا کام تمام کرسکتا تھا۔ لیکن اس نے سر جھکا دیا۔ چودھری کے پرتی اس کے روم روم میں شردھا تھی۔ چودھری صاحب اپنے دین کے اتنے پکے ہیں؟ اس کی اس نے کبھی کلپنا (تصور) تک نہ کی تھی۔ اسے شاید دھوکا ہوگیا تھا کہ یہ دل سے ہندو ہے۔ جس سوامی نے اسے پھانسی سے اُتار لیا، اسی کے پرتی ہنسا (تشدد) یا پرتی کار کا بھاؤ اس کے من میں کیوں کر آتا؟ وہ دلیر تھا، اور دلیروں کی بھانتی نشکپٹ تھا۔ اسے اس سمئے کرودھ نہ تھا، پشچاتاپ تھا۔ مرنے کا بھے نہ تھا، دُکھ تھا۔

چودھری صاحب ٹھاکر کے سامنے کھڑے تھے۔ دین کہتا تھا۔ مارو۔ سجنتا کہتی تھی۔ چھوڑو۔ دین اور دھرم میں سنگھرش (کشمکش) ہو رہا تھا۔

ٹھاکر نے چودھری کا اسمنجس دیکھا۔ گدگد کنٹھ سے بولا۔ مالک آپ کی دیا مجھ پر ہاتھ نہ اُٹھانے دے گی۔ اپنے پالے ہوئے سیوک کو آپ مار نہیں سکتے۔ لیکن یہ سر آپ کا

ہے، آپ نے اسے بچایا تھا، آپ اسے لے سکتے ہیں، یہ میرے پاس آپ کی امانت تھی۔ وہ امانت آپ کو مل جائے گی۔ سویرے میرے گھر کسی کو بھیج کر منگوا لیجیے گا۔ یہاں دوں گا، تو ایدرو کھڑا ہوجائے گا۔ گھر پر کون جانے گا، کس نے مارا۔ جو بھول چوک ہوئی ہو چھما کیجیے گا۔

یہ کہتا ہوا ٹھاکر وہاں سے چلا گیا۔

یہ افسانہ ماہنامہ مادھوری اپریل 1925 کے شمارے میں شائع ہوا۔ 'گپت دھن نمبر2' میں شامل ہے۔ یہاں رسم خط بدل کر اردو میں شائع کیا جا رہا ہے۔

وشواس

ان دنوں مس جوشی بمبئی سبھئے سماج کی رادھیکا تھی۔ تھی تو وہ ایک چھوٹی سی کنیا پاٹھ شالہ کی ادھیاپیکا پر اس کا ٹھاٹ باٹ، مان سمان بڑی بڑی دھن رانیوں کو بھی لجت کرتا تھا۔ وہ ایک بڑے محلے میں رہتی تھی، جو کسی زمانے میں ستارا کے مہاراج کا نواس استھان (قیام گاہ) تھا۔ وہاں سارے دن نگر کے رئیسوں، راجوں، راج کرمچاریوں (سرکاری اہل کاروں) کا تانتا لگا رہتا تھا۔ وہ سارے پرانت (علاقے) کے دھن اور کیرتی (شہرت) کے اپاسکوں (پجاریوں) کی دیوی تھی۔ اگر کسی کو خطاب کا خبط تھا تو وہ مِس جوشی کی خوشامد کرتا تھا۔ اچھا عہدہ دلانے کے دُھن تھی تو وہ مِس جوشی کی آرادھنا (قصیدہ خوانی) کرتا تھا۔ سرکاری عمارتوں کے ٹھیکے، نمک، شراب، افیم، آدی سرکاری چیزوں کے ٹھیکے، لوہے لکڑی، کل پُرزے آدی (وغیرہ) کے ٹھیکے سب مِس جوشی کے ہاتھوں ہوتا تھا۔ جس وقت وہ اپنی عربی گھوڑوں کی فٹن پر سیر کرنے نکلتی تو رئیسوں کی سواریاں آپ راستے سے ہٹ جاتی تھیں، بڑے بڑے دُکاندار کھڑے ہو ہوکر سلام کرنے لگتے تھے۔ وہ روپ وتی (حسین) تھی، لیکن نگر میں اس سے بڑھ کر روپ وتی رمنیاں (حسن و جمال کی دیویاں) بھی تھیں۔ وہ سُشِکشت (پڑھی لکھی) تھی واکیہ چتر (حاضر جواب) تھی۔ گانے میں نپن (ماہر)، ہنستی تو انوکھی چھوی (انوکھے انداز) سے بولتی تو نرالی چھٹا (چمک) سے، تاکتی تو بانکی چتون سے، لیکن ان گنوں (خصوصیت) میں اس کا ایکادھپتیے نہ تھا (تنہا مالک نہ تھی)۔ اس کی پرتِشٹھا (حیثیت) شکتی (طاقت) اور کیرتی (شہرت) کا کچھ اور ہی رہسئے (راز) تھا۔ سارا نگر ہی نہیں، سارے پرانت کا بچّہ بچّہ جانتا تھا کہ بمبئی کے گورنر مسٹر جوہری مس جوشی کے بِنا داموں کے غلام ہیں۔ مِس جوشی کا آنکھوں کا اشارہ ان کے لیے نادرشاہی حکم ہے۔ وہ تھیٹروں میں، دعوتوں میں، جلسوں میں، مِس جوشی کے ساتھ سائے کی بھانتی رہتے اور کبھی کبھی ان کی موٹر رات کے سناٹے میں مِس جوشی کے مکان سے نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس پریم میں واسنا کی ماترا (مقدار) ادھِک ہے یا بھکتی (عقیدت) کی، یہ کوئی نہیں جانتا۔ لیکن

مسٹر جوہری وِواہت (شادی شدہ) ہیں اور مِس جوشی ودھوا (بیوہ)، اس لیے جو لوگ ان کے پریم کو کلوشت (ناجائز) کہتے ہیں وے ان پر کوئی اتیاچار نہیں کرتے۔

بمبئی کی ویستھاپکا سبھا (مجلس انتظامیہ) نے اناج پر کر لگا دیا تھا اور جنتا کی اُور سے اس کا وِرودھ (مخالفت) کرنے کے لیے ایک وراٹ سبھا (بڑا جلسہ) ہو رہی تھی۔ سبھی نگروں سے پرجا کے پرتندھی (نمائندے) اس میں سملت (شامل) ہونے کے لیے ہزاروں کی سنکھیا (تعداد) میں آئے تھے۔ مِس جوشی کے وشال بھون (بڑی عمارت) کے سامنے، چوڑے میدان میں ہری ہری گھاس پر بمبئی کی جنتا اپنی فریاد سنانے کے لیے جمع تھی۔ ابھی تک سبھا پتی نہ آئے تھے اس لیے لوگ بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ کوئی کرمچاریوں (اہلکاروں) پر آکشیپ (الزام تراشی) کرتا تھا، کوئی دیش کی استھتی (حالات) پر، کوئی اپنی دینتا (غربت) پر۔ اگر ہم لوگوں میں اکڑنے کا ذرا بھی سامرتھیہ (قوت) ہوتا تو مجال تھی کہ یہ کر (ٹیکس) لگا دیا جاتا، ادھیکاریوں کا گھر سے باہر نکلنا مشکل ہوجاتا۔ ہمارا ضرورت سے زیادہ سیدھا پن ہمیں ادھیکاریوں کے ہاتھ کھلونا بنائے ہوئے ہیں۔ وے (وہ) جانتے ہیں کہ انھیں جتنا دباتے جاؤ، اُتنا دبتے جائیں گے، سر نہیں اُٹھاسکتے۔ سرکار نے بھی اپدرو (ہنگامے) کی آشنکا (خدشے) سے شستر پولیس (مسلحہ پولیس) بلا لی ہے۔ اس میدان کے چاروں کونوں پر سپاہیوں کے دَل (گروپ) پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ ان کے افسر گھوڑوں پر سوار، ہاتھ میں ہنٹر لیے، جنتا کے بیچ میں نشنک (بے خوف و خطر) بھاؤ سے گھوڑے دوڑاتے پھرتے تھے، مانو صاف میدان ہے۔ مِس جوشی کے اونچے برآمدے میں نگر کے سبھی بڑے بڑے رئیس اور راجیہ ادھیکاری تماشہ دیکھنے کے لیے بیٹھے ہوئے تھے۔ مِس جوشی مہمانوں کا آدرستکار (عزت و احترام) کر رہی تھیں۔ اور مسٹر جوہری، آرام کرسی پر لیٹے، اس جن سموہ (عوامی ہجوم) کو گھرنا (نفرت) اور بھئے (خوف) کی درشٹی (نظر) سے دیکھ رہے تھے۔

سہسا (اچانک) سبھاپتی مہاشے آپٹے ایک کرائے کے تانگے پر آتے دکھائی دیے۔ چاروں طرف ہلچل مچ گئی، لوگ اُٹھ اُٹھ کر ان کا سواگت کرنے دوڑے اور انھیں لاکر منچ (اسٹیج) پر بیٹھا دیا۔ آپٹے کی اوستھا (عمر) تیس پینتس ورش سے ادھک (زیادہ) نہ تھی۔ دُبلے پتلے آدمی تھے، مکھ پر چنتا کا گاڑھا رنگ چڑھا ہوا، بال بھی پک چلے تھے، پر مکھ پر سرل ہاسئے (ہلکے تبسم) کی ریکھا جھلک رہی تھی۔ وہ ایک سفید موٹا کرتا پہنے تھے، نہ پاؤں میں

جوتے تھے، نہ سر پر ٹوپی۔ اس اردھ نگن (نیم برہنہ)، دُربل، نستیج (بے رعب) پرانی (انسان) میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ سمست جنتا (تمام لوگ) اس کی پوجا کرتی تھی، اس کے پیروں پر سر رگڑتی تھی۔ اس ایک پرانی کے ہاتھوں میں اتنی شکتی (طاقت) تھی کہ وہ چھن ماتر (ایک پل) میں ساری مِلوں کو بند کراسکتا تھا، شہر کا سارا کاروبار مٹ سکتا تھا۔ ادھیکاریوں کو اس کے بھئے سے نیند نہ آتی تھی، رات کو سوتے سوتے چونک پڑتے تھے۔ اس سے زیادہ بھینکر جنتو (خطرناک جانور) ادھیکاریوں کی درشٹی میں دوسرا نہ تھا۔ یہ پرچنڈ شاسن شکتی (انتظامیہ کی زبردست طاقت) اس ایک ہڈی کے آدمی سے تھرتھر کانپتی تھی، کیوں کہ اس ہڈی میں ایک پوتر (پاکیزہ) نشکلنک (صاف)، بلوان اور دِویہ آتما (پُرنور روح) کا نواس (قیام) تھا۔

(۲)

آپٹے نے منچ پر کھڑے ہوکر پہلے جنتا کو شانت چت (پرسکون) رہنے اور اہنسا ورت (عدم تشدد) پالن کرنے کا آدیش (حکم) دیا۔ پھر دیش کی راجنیتک استھتی (سیاسی صورت حال) کا ورنن (بیان) کرنے لگے۔ سہسا (اچانک) ان کی درشٹی سامنے مِس جوشی کے برآمدے کی اُور (طرف) گئی تو ان کا پرجا دُکھ پیڑت ہردئے (عوام کے دکھ میں ڈوبا ہوا دل) تلملا اُٹھا۔ یہاں اگنت پرانڑی (بے شمار لوگ) اپنی وپتی (مصیبت) کی فریاد سنانے کے لیے جمع تھے اور وہاں میزوں پر چائے بسکٹ، میوے اور پھل، برف اور شراب کی ریل پیل تھی۔ وے (وہ) ان اَبھاگوں (بدقسمتوں) کو دیکھ دیکھ ہنستے اور تالیاں بجاتے تھے۔ جیون میں پہلی بار آپٹے کی زبان قابو سے باہر ہوگئی۔ میگھ کی بھانتی (بادل کی طرح) گرج کر بولے۔

اُدھر تو ہمارے بھائی دانے دانے کو محتاج ہو رہے ہیں، ادھر اناج پر کر (ٹیکس) لگایا جارہا ہے، کیول (صرف) اسی لیے کہ راج کرمچاریوں (سرکاری نوکروں) کے حلوے پوریوں میں کمی نہ ہو۔ ہم جو دیش کے راجا ہیں، جو چھاتی پھاڑ کر دھرتی سے دھن نکالتے ہیں، بھوکوں مرتے ہیں، اور وے لوگ، جنھیں ہم نے اپنے سکھ اور شانتی کی ویوستھا (انتظام) کرنے کے لیے رکھا ہے، ہمارے سوامی بنے ہوئے شرابوں کی بوتلیں اُڑاتے ہیں۔ کتنی انوکھی بات ہے کہ سوامی بھوکوں مرے اور سیوک شراب اُڑائیں، میوے کھائیں اور اٹلی اور اسپین کی مٹھائیاں چلیں! یہ کس کا اپرادھ (قصور) ہے؟ کیا سیوکوں کا نہیں؟ کداپی (بالکل)

نہیں، ہمارا یہی اپرادھ (قصور) ہے کہ ہم نے اپنے سیوکوں کو اتنا ادھیکار (حق) دے رکھا ہے۔ آج ہم اُچّ سور (بہ آواز بلند) میں یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم یہ گرور (ظالمانہ) اور جٹل (سخت) ویوہار (برتاؤ) نہیں سہہ سکتے۔ یہ ہمارے لیے اسہائے (ناقابل برداشت) ہے کہ ہم اور ہمارے بال بچے دانوں کو ترسیں اور کرمچاری لوگ، ولاس (عیش و عشرت) میں ڈوبے ہوئے ہمارے کرون۔ کرندن کی ذرا بھی پروا نہ کرتے ہوئے وہار (لہو و لعب) کریں۔ یہ اسہائے ہے کہ ہمارے گھروں میں چولہے نہ جلیں اور کرمچاری لوگ تھیٹروں میں عیش کریں، ناچ رنگ کی محفلیں سجائیں، دعوتیں اُڑائیں، وشیاؤں پر کنچن (دولت) کی ورشا (بارش) کریں۔ سنسار میں ایسا اور کون دیش ہوگا، جہاں پرجا تو بھوکوں مرتی ہو اور پردھان کرمچاری (افسران) اپنی پریم کریڈاؤں (محبت کی رنگ للیوں) میں مگن ہو جہاں استریاں گلیوں میں ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہوں اور ادھیاپکاؤں (استانیاں) کا ویش دھارن کرنے والی ویشیائیں آمود پرمود (عیش و عشرت) کے نشے میں چور ہوں۔ ایکایک ایک شستر (مسلحہ) سپاہیوں کے دل (دستے) میں ہلچل پڑگئی۔ ان کا افسر حکم دے رہا تھا۔ سبھا بھنگ (منتشر) کردو، نیتاؤں کو پکڑ لو، کوئی نہ جانے پائے۔ یہ وِرودھاتمک (باغیانہ) ویاکھیان (تقریر) ہے۔

مسٹر جوہری نے پولیس کے افسر کو اشارے سے بلا کر کہا۔ اور کسی کو گرفتا کرنے کی ضرورت نہیں آپٹے ہی کو پکڑو۔ وہ ہمارا شترو (دشمن) ہے۔

پولیس نے ڈنڈے چلانے شروع کیے اور کئی سپاہیوں کے ساتھ جاکر افسر نے آپٹے کو گرفتار کرلیا۔

جنتا نے تیوریاں بدلیں۔ اپنے پیارے نیتا کو یوں گرفتار ہوتے دیکھ کر ان کا دھریہ (حوصلہ) ہاتھ سے جاتا رہا۔

لیکن اسی وقت آپٹے کی للکار سنائی دی۔ تم نے اہنسا ورت (عدم تشدد کا عہد) لیا ہے اور اگر کسی نے اس ورت (عہد) کو توڑا تو اس کا دوش (گناہ) میرے سر ہوگا۔ میں تم سے سوِنئے انورودھ (انتہائی عاجزی سے درخواست) کرتا ہوں کہ اپنے اپنے گھر جاؤ۔ ادھیکاریوں نے وہی کیا جو ہم سمجھتے تھے۔ اس سبھا سے ہمارا جو اُدّیشیہ (مقصد) تھا وہ پورا ہوگیا۔ ہم یہاں بلوا کرنے نہیں، کیول سنسار کی نیتک سہانوبھُوتی (اخلاقی ہمدردی) پراپت (حاصل) کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے، اور ہمارا اُدّیشیہ پورا ہوگیا۔

ایک چھن (پل) میں سبھا بھنگ ہوگئی اور آپٹے پولیس کے حوالات میں بھیج دیے گئے۔

(۳)

مسٹر جوہری نے کہا۔ بچّہ بہت دنوں کے بعد پنجے میں آئے ہیں، راج دروہ (بغاوت) کا مقدمہ چلا کر کم سے کم ۱۰ سال کے لیے انڈمان بھیجوں گا۔

مس جوشی۔ اس سے کیا فائدہ؟

کیوں؟ اس کو اپنے کیے کی سزا مل جائے گی۔

لیکن سوچیے ہمیں اس کا کتنا مولیہ (قیمت) دینا پڑے گا۔ ابھی جس بات کو گنے گنائے لوگ جانتے ہیں وہ سارے سنسار میں پھیلے گی اور ہم کہیں منہ دکھانے لائق نہ رہیں گے۔ آپ اخباروں کے سنواد داتاؤں (نمائندوں) کی زبان تو نہیں بند کرسکتے۔

کچھ بھی ہو، میں اسے جیل میں سڑانا چاہتا ہوں۔ کچھ دنوں کے لیے تو چین کی نیند نصیب ہوگی۔ بدنامی سے تو ڈرنا ہی ویرتھ (بے کار) ہے ہم پرانت (علاقے) کے سارے سماچار پتروں (اخباروں) کو اپنے سداچار (اعلا کردار) کا راگ الاپنے کے لیے مول لے سکتے ہیں ہم پرتیک (ہر ایک) لانچھن (الزام) کو جھوٹ ثابت کرسکتے ہیں، آپٹے پر متھیا دوشارونپڑ (جھوٹی الزام تراشی) کا آروپ (الزام) لگا سکتے ہیں۔

میں اس سے سہج اُپائے (آسان تدبیر) بتلا سکتی ہوں۔ آپ آپٹے کو میرے ہاتھ میں چھوڑ دیجیے۔ میں اس سے ملوں گی اور ان ینتروں سے، جن کا پریوگ (استعمال) کرنے میں ہماری جاتی (قوم) سِدھ ہست (ماہر) ہے، اس کے آنترک بھاوؤں (اندرونی احساسات) اور وچاروں کی تھاہ لے کر آپ کے سامنے رکھ دوں گی۔ میں ایسے پرمان (ثبوت) کھوج نکالنا چاہتی ہوں، جن کے اُتّر (جواب) میں اسے منہ کھولنے کا ساہس (ہمت) نہ ہو، اور سنسار کی سہانوبھوتی (ہمدردی) اس کے بدلے ہمارے ساتھ ہو۔ چاروں اُور سے یہی آواز آئے کہ یہ کپٹی (فریبی) اور دھورت (مکار) تھا اور سرکار نے اس کے ساتھ وہی بیوہار کیا ہے جو ہونا چاہیے۔ مجھے وشواس ہے کہ وہ شڈینتر کاریوں کا مکھیا ہے اور میں اسے سِدّھ (ثابت) کردینا چاہتی ہوں۔ میں اسے جنتا کی درشٹی میں دیوتا نہیں بنانا چاہتی، اس کو راکھشس کے روپ میں دکھانا چاہتی ہوں۔

یہ کام اتنا آسان نہیں ہے، جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ آپٹے راجنیتی (سیاست) میں بڑا چتر (چالاک) ہے۔ ایسا کوئی پُرش نہیں ہے، جس پر یووتی (نوجوان لڑکی) اپنی موہنی (محبت کا اثر) نہ ڈال سکے۔

اگر تمھیں وشواس ہے کہ تم یہ کام پورا کر دکھاؤگی، تو مجھے کوئی آپتی (اعتراض) نہیں ہے۔ میں تو کیول اسے دنڈ (سزا) دینا چاہتا ہوں۔

تو حکم دے دیجیے کہ وہ اسی وقت چھوڑ دیا جائے۔

جنتا کہیں یہ تو نہ سمجھے گی کہ سرکار ڈر گئی؟

نہیں، میرے خیال میں تو جنتا پر اس ویوہار کا بہت اچھا اثر پڑے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ سرکار نے جمت (رائے عامہ) کا سمّان (احترام) کیا ہے۔

لیکن تمھیں اس کے گھر جاتے لوگ دیکھیں گے تو من (دل) میں کیا کہیں گے۔

مجھے تو اب بھی بھئے (خطرہ) ہے کہ وہ تمھیں سندیہہ (شک) کی درشٹی سے دیکھے گا اور تمھارے پنجے میں نہ آئے گا، لیکن تمھاری اِچھّا (آرزو) ہے تو آزما دیکھو۔

یہ کہہ کر مسٹر جوہری نے مس جوشی کو پریم مئے نیتروں (محبت بھری نظروں) سے دیکھا، ہاتھ ملایا اور چلے گئے۔

آکاش پر تارے نکلے ہوئے تھے، چیت کی شیتل (شفاف) سُکھد (آرام دہ) وایو (ہوا) چلی رہی تھی، سامنے کے چوڑے میدان میں سناٹا چھایا ہوا تھا، لیکن مس جوشی کو ایسا معلوم ہوا مانو آپٹے منچ پر کھڑا بول رہا ہے۔ اس کا شانت (پرسکون)، سومیہ (شاندار)، وشادمئے (رنجیدہ) سوروپ اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔

پراتہ کال مس جوشی اپنے بھون سے نکلی، لیکن اس کے وستر (کپڑے) بہت سادھارن (سادہ) تھے اور آبھوشن (زیورات) کے نام شریر پر ایک دھاگا بھی نہ تھا۔ النکار وہین (غیر مزین) ہوکر اس کی چھوی (پیکر) سوچّھ (شفاف)، نرمل جل (صاف پانی) کی بھانتی اور بھی نکھر گئی۔ اس نے سڑک پر آکر تانگا لیا اور چلی۔

آپٹے کا مکان غریبوں کے ایک دور کے محلے میں تھا۔ تانگے والا مکان کا پتہ جانتا تھا۔ کوئی دقت نہ ہوئی۔ مِس جوشی جب مکان کے دُوار پر پہنچی تو نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کنڈی کھٹکھٹائی۔ ایک ادھیڑ عورت نے نکل

کر دُوار کھول دیا۔ مِس جوشی اس گھر کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ ایک کنارے چارپائی پڑی ہوئی تھی۔ ایک ٹوٹی الماری میں کچھ کتابیں چُنی ہوئی تھیں، فرش پر لکھنے کا ڈیسک تھا اور ایک رسّی کی الگنی پر کپڑے لٹک رہے تھے۔ کمرے کے دوسرے حصّے میں ایک لوہے کا چولہا تھا اور کھانے کے برتن پڑے ہوئے تھے۔ ایک لمبا، تڑنگا آدمی، جو اسی ادھیڑ عورت کا پتی تھا، بیٹھا ایک ٹوٹے ہوئے تالے کی مرمت کر رہا تھا اور ایک پانچ چھ ورش کا تیجسوی (پُرجلال) بالک آپٹے کی پیٹھ پر چڑھنے کے لیے ان کے گلے میں ہاتھ ڈال رہا تھا۔ آپٹے اسی لوہار کے ساتھ اسی کے گھر میں رہتے تھے۔ سماچار پتروں (اخباروں) میں لیکھ (مضمون) لکھ کر جو کچھ ملتا اسے دے دیتے اور اس بھانتی (طرح) گریہہ پربندھ (گھریلو بندوبست) کی چنتاؤں (فکروں) سے چھٹی پاکر جیون (زندگی) ویاتیت (بسر) کرتے تھے۔

مِس جوشی کو دیکھ کر آپٹے ذرا چونکے پھر کھڑے ہوکر ان کا سواگت (خیر مقدم) کیا اور سوچنے لگے کہ کہاں بٹھاؤں۔ اپنی دَردرتا (غربت) پر آج انھیں جتنی لاج آئی اتنی اور کبھی نہ آئی تھی۔ مس جوشی ان کا اسمنجس (پریشانی) دیکھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور ذرا رکھائی سے بولی۔ میں بِنا بُلائے آپ کے یہاں آنے کے لیے چھما (معافی) مانگتی ہوں۔ کنتو کام ایسا ضروری تھا کہ میرے آئے بِنا پورا نہ ہوسکتا۔ کیا میں ایک منٹ کے لیے آپ سے ایکانت (اکیلے) میں مِل سکتی ہوں۔

آپٹے نے جگناتھ کی اُور دیکھ کر کمرے سے باہر چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اس کی استری بھی چلی گئی۔ کیول بالک رہ گیا۔ وہ مس جوشی کی اُور باربار اُتسک (مضطرب) آنکھوں سے دیکھتا تھا مانو پوچھ رہا ہو کہ تم آپٹے دادا کی کون ہو؟

مِس جوشی نے چارپائی سے اُتر کر زمین پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ آپ کچھ انومان (اندازہ) کرسکتے ہیں کہ میں اس وقت کیوں آئی ہوں؟

آپٹے نے جھینپتے ہوئے کہا۔ آپ کی کرپا (کرم) کے سوا اور کیا کارن (سبب) ہوسکتا ہے؟

مس جوشی۔ نہیں، سنسار اتنا اُدار (وسیع القلب) نہیں ہوا کہ آپ جسے گالیاں دیں وہ آپ کو دھنیہ واد (شکریہ) دے۔ آپ کو یاد ہے کہ کل آپ نے اپنے ویاکھیان (تقریر) میں مجھ پر کیا کیا اکشیپ (تہمتیں) کیے تھے۔ میں آپ سے زور دے کر کہتی ہوں

کہ وے آکشیپ کرکے آپ نے مجھ پر گھور اتیاچار (بڑا ظلم) کیا ہے۔ آپ جیسے سہردئے (دل والے)، شیلوان (بامروت)، ودوان (عالم) آدمی سے مجھے ایسی آشا (امید) نہ تھی۔ میں ابلہ ہوں، میری رکھشا (حفاظت) کرنے والا کوئی نہیں ہے؟ کیا آپ کو اُچت (مناسب) تھا کہ ایک ابلہ پر متھیا رُوپن کریں (تہمتیں لگائیں)؟ اگر میں پُروش ہوتی تو آپ سے ڈوئل کھیلنے (مقابلہ کرنے) کا آگرہ (اصرار) کرتی۔ ابلہ ہوں اس لیے آپ کی سجنتا (شرافت) کو اسپرش کرنا ہی مرے ہاتھ میں ہے۔ آپ نے مجھ پر جو لانچھن لگائے ہیں، وے سروتھا (زیادہ تر) نرمل ہیں۔

آپٹے نے درڑھتا (پختگی) سے کہا۔ انومان (اندازے) تو باہری پرمانوں (ثبوتوں) سے ہی کیا جاتا ہے۔

مس جوشی۔ باہری پرمانوں سے آپ کسی انتستل (اندرون) کی بات نہیں جان سکتے۔

آپٹے۔ جس کا بھیتر (اندر) باہر ایک نہ ہو، اسے دیکھ کر بھرم (شک) میں پڑجانا سوبھاوک (فطری) ہے۔

مس جوشی۔ ہاں، تو وہ آپ کا بھرم ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آپ اس کلنک کو مٹا دیں جو آپ نے مجھ پر لگایا ہے۔ آپ اس کے لیے پرائشچت (کفارہ ادا) کریں گے؟

آپٹے۔ اگر نہ کروں تو مجھ سے بڑا دُرآتما (بدطینت) سنسار میں نہ ہوگا۔

مس جوشی۔ آپ مجھ پر وشواس (یقین) کرتے ہیں۔

آپٹے۔ میں نے آج تک کسی رمنی (حسینہ) پر اوشواس نہیں کیا۔

مس جوشی۔ کیا آپ کو سندیہہ (شک) ہورہا ہے کہ میں آپ کے ساتھ کوشل (چھل) کر رہی ہوں؟

آپٹے نے مس جوشی کی اُور اپنے سدئے (کریمانہ)، سجل (پرآب)، سرل (صاف)، نیتروں سے دیکھ کر کہا۔ بائی جی۔ میں گنوار اور اَشِشٹ پرانی (غیر مہذب انسان) ہوں، لیکن ناری جاتی کے لیے میرے ہردے میں جو آدر (احترام) ہے، وہ اس شردھا (عقیدت) سے کم نہیں ہے، جو مجھے دیوتاؤں پر ہے۔ میں نے اپنی ماتا کا مکھ نہیں دیکھا، یہ بھی نہیں جانتا کہ میرا پتا کون تھا، کنتو (لیکن) جس دیوی کے دیا وِرکھش (شجر کرم) کی چھایا میں میرا پالن پوشن ہوا۔ ان کی پریم مورتی آج تک میری آنکھوں کے سامنے ہے اور ناری کے پرتی

میری بھکتی (عقیدت) کو سجوئے (زندہ) رکھے ہوئے ہے۔ میں ان شبدوں (الفاظ) کو منہ سے نکالنے کے لیے اتینت (بہت) دکھی اور لجّت (نادم) ہوں جو آویش (غصے) میں نکل گئے، اور میں آج ہی سماچار پتروں میں کھید پرکٹ (اظہار افسوس) کرکے آپ سے چھما کی پرارتھنا کروں گا۔

مِس جوشی کو اب تک سوار تھی (لالچی) آدمیوں سے سابقہ پڑا تھا، جن کے چکنے چپڑے شبدوں میں مطلب چھپا ہوا تھا۔ آپٹے کے سرل وشواس پر اس کا چت (دل) آنند (خوشی) سے گدگد ہوگیا۔ شاید وہ گنگا میں کھڑی ہوکر اپنے انیہ مِتروں (دوستوں) سے یہ کہتی تو اس کے فیشنبل ملنے والوں میں سے کسی کو اس پر وشواس نہ آتا۔ سب منہ کے سامنے تو ہاں ہاں کرتے، پر باہر نکلتے ہی اس کا مذاق اُڑانا شروع کرتے۔ ان کپٹی مِتروں (فریبی دوستوں) کے سمکّھ (مقابل) یہ آدمی تھا جس کے ایک ایک شبد میں سچائی جھلک رہی تھی جس کے انت استل (اندرون) سے نکلتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

آپٹے اسے چپ دیکھ کر کسی اور چنتا میں پڑے ہوئے تھے۔ انھیں بھئے (خطرہ) ہو رہا تھا۔ اب میں چاہے کتنی چھما مانگوں، مس جوشی کے سامنے کتنی صفائیاں پیش کروں۔ میرے آکشیپوں (تہمتوں) کا اثر کبھی نہ مٹے گا۔

اسی بھاؤ نے اگیات روپ (نامعلوم طریقے) سے انھیں اپنے وِشئے کی گپت (مخفی) باتیں کہنے کی پریرنا (اکسایا) کی، جو ان میں اس کی درشٹی میں لگھو (کمتر) بنا دے، جس سے وہ بھی انھیں نیچ سمجھنے لگے، اس کو سنتوش (اطمینان) ہوجائے کہ یہ بھی کلوشت آتما (سیاہ قلب) ہے۔ بولے۔ میں جنم سے آبھاگا (بدقسمت) ہوں۔ ماتا پِتا کا تو منہ ہی دیکھنا نصیب نہ ہوا، جس دیا شیل مہیلا (کرم فرما عورت) نے مجھے آشرے دیا تھا، وہ بھی مجھے ۱۳ ورش کی اوستھا (عمر) میں اناتھ چھوڑ کر پرلوک سدھار گئی۔ اس سمئے (وقت) میرے سر پر جو کچھ بیتی اسے یاد کرکے اتنی لجّا آتی ہے کہ کسی کو منہ نہ دکھاؤں۔ میں نے دھوبی کا کام کیا، موچی کا کام کیا، گھوڑے کی سائیسی کی، ایک ہوٹل میں برتن مانجھتا رہا، یہاں تک کہ کتنی ہی بار چھُودھا (بھوک) سے ویاکل (بے چین) ہوکر بھیک مانگی۔ مزدوری کرنے کو بُرا نہیں سمجھتا، آج بھی مزدوری ہی کرتا ہوں۔ بھیک مانگنی بھی کسی کسی دشا میں چھمیہ (قابل معافی) ہے، لیکن، میں نے اس اوستھا میں ایسے ایسے کرم کیے، جنھیں کہتے لجّا آتی ہے۔

چوری کی، وشواس گھات کیا، یہاں تک کہ چوری کے اپرادھ میں قید کی سزا بھی پائی۔

مِس جوشی نے سجل نین (نم دیدہ) ہوکر کہا۔ آپ یہ سب باتیں مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟ میں ان کا الیکھ (بیان) کرکے آپ کو کتنا بدنام کرسکتی ہوں، اس کا آپ کو بھئے نہیں ہے؟

آپٹے نے ہنس کر کہا۔ نہیں، آپ سے مجھے یہ بھئے نہیں ہے؟

مِس جوشی۔ اگر میں آپ سے بدلا لینا چاہوں تو؟

آپٹے۔ جب میں اپنے اپرادھ پر لجّت ہوکر آپ سے چھما مانگ رہا ہوں، تو میرا اپرادھ رہا ہی کہاں، جس کا آپ مجھ سے بدلا لیں گی۔ اس سے تو مجھے بھئے ہوتا ہے کہ آپ نے مجھے چھما نہیں کیا۔ لیکن یدی (اگر) میں نے آپ سے چھما نہ مانگی ہوتی تو مجھ سے بدلا نہ لے سکتیں۔ بدلہ لینے والے کی آنکھیں یوں سجل نہیں ہوجایا کرتیں۔ میں آپ کو کپٹ کرنے کے ایوگیہ (قابل نہیں) سمجھتا ہوں۔ آپ یدی (اگر) کپٹ (دغا) کرنا چاہیں تو یہاں کبھی نہ آتیں۔

مس جوشی۔ میں آپ کا بھید لینے ہی کے لیے آئی ہوں۔

آپٹے۔ تو شوق سے لیجیے۔ میں بتلا چکا ہوں کہ میں نے چوری کے اپرادھ میں قید کی سزا پائی تھی۔ ناسک کی جیل میں رکھا گیا تھا۔ میرا شریر دربل تھا، جیل کی کڑی محنت نہ ہوسکتی تھی اور ادھیکاری لوگ مجھے کامچور سمجھ کر بینتوں سے مارتے تھے۔ آخر ایک دن میں رات کو جیل سے بھاگ کھڑا ہوا۔

مس جوشی۔ آپ تو چھپے رستم نکلے!

آپٹے۔ ایسا بھاگا کہ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ آج تک میرے نام وارنٹ جاری ہیں اور ۵۰۰ روپے انعام بھی ہے۔

مس جوشی۔ تب تو میں آپ کو ضرور پکڑا دوں گی۔

آپٹے۔ تو پھر میں آپ کو اپنا اصل نام بھی بتلائے دیتا ہوں۔ میرا نام دامودر مودی ہے۔ یہ نام پولیس سے بچنے کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔

بالک اب تک تو چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ مس جوشی کے منہ سے پکڑانے کی بات سن کر وہ سجگ ہوگیا۔ انھیں ڈانٹ کر بولا۔ ہمالے دادا کو کون پکلے گا؟

مس جوشی۔ سپاہی اور کون؟
بالک۔ ہم سپاہی کو مالیں گے۔
یہ کہہ کر وہ کونے سے اپنے کھیلنے کا ڈنڈا اُٹھا لایا اور آپٹے کے پاس ویروچت بھاؤ (شجاعانہ تاثر) سے کھڑا ہوگیا، مانو سپاہیوں سے ان کی رکھشا (حفاظت) کر رہا ہے۔
مس جوشی۔ آپ کا رکھشک (محافظ) تو بڑا بہادر معلوم ہوتا ہے۔
آپٹے۔ اس کی بھی ایک کتھا ہے۔ سال بھر ہوتا ہے، یہ لڑکا کھو گیا تھا۔ مجھے راستے میں ملا۔ میں پوچھتا پاچھتا یہاں لایا۔ اسی دن سے ان لوگوں سے میرا اتنا پریم ہوگیا کہ میں اس کے ساتھ رہنے لگا۔
مس جوشی۔ آپ انومان کرسکتے ہیں کہ آپ کا ورِتانت (حال) سن کر میں آپ کو کیا سمجھ رہی ہوں۔
آپٹے۔ وہی، جو میں واستو (حقیقت) میں ہوں۔ نیچ، کمینہ، دُھرت (مکار) ....
مس جوشی۔ نہیں، آپ مجھ پر پھر انیائے (زیادتی) کر رہے ہیں۔ پہلا انیائے تو چھما کرسکتی ہوں، یہ انیائے چھما نہیں کرسکتی۔ اتنی پرتی کول (مخالفانہ) دشاؤں (صورتوں) میں پڑکر بھی جس کا ہردئے اتنا پوتر (پاکیزہ)، اتنا نِشکپٹ (مکر سے عاری)، اتنا سدئے (رحم دل) ہو وہ آدمی نہیں دیوتا ہے۔ بھگوان، آپ نے مجھ پر جو آکشیپ (تہمت لگائی) کیے وہ ستیہ (صحیح) ہیں۔ میں آپ کے انومان (انداز) سے کہیں بھرشٹ (بدکار) ہوں۔ میں اس یوگیہ (قابل) بھی نہیں ہوں کہ آپ کی اُور تانک سکوں۔ آپ نے اپنے ہردئے کی وشالتا (اپنی وسیع القلبی) دکھا کر میرا اصلی سوروپ میرے سامنے پرکٹ (ظاہر) کردیا۔ مجھے چھما کیجیے، مجھ پر دیا (رحم) کیجیے۔
یہ کہتے کہتے وہ ان کے پیروں پر گر پڑی۔ آپٹے نے اسے اُٹھا لیا اور بولے۔
مس جوشی ایشور کے لیے مجھے لجّت نہ کرو۔
مس جوشی نے گدگد کنٹھ (مسرت آمیز لہجے) سے کہا۔ آپ ان دُشٹوں (بدکاروں) کے ہاتھ سے میرا اڈّھار (مجھے آزاد) کیجیے۔ مجھے اس یوگیہ (قابل) بنائیے کہ آپ کی وشواس پاتری (یقین کے قابل) بن سکوں۔ ایشور ساکھشی (گواہ) ہے کہ مجھے کبھی کبھی اپنی دشا پر کتنا دکھ ہوتا ہے۔ میں بار بار چیشٹا (کوشش) کرتی ہوں کہ اپنی دشا سدھاروں، اس

وِلاسیتا (عیش و عشرت) کے جال کو توڑ دوں، جو میری آتما کو چاروں طرف سے جکڑے ہوئے ہے، پر دُربل (کمزور) آتما اپنے نشچئے (فیصلوں) پر استھت (قائم) نہیں رہتی۔ میرا پالن پوشن جس ڈھنگ سے ہوا، اس کا یہ پرنیام (نتیجہ) ہونا سوبھاوک (فطری) سا معلوم ہوتا ہے۔ میری اُچ شکشا (اعلیٰ تعلیم) نے گریہنی جیون (گھریلو زندگی) سے میرے من میں گھرنا (نفرت) پیدا کردی۔ مجھے کسی پُرش کے اَدھین (ماتحت) رہنے کا وچار (خیال) آسوبھاوک (غیر فطری) جان پڑتا تھا۔ میں گریہنی (گھر والی) کی ذمہ داریوں اور چنتاؤں (فکروں) کو اپنی مانسک سواد ھینتا (خیالات کی آزادی) کے لیے وش تُلیہ (زہر کے مترادف) سمجھتی تھی۔ میں ترک بدُھی (عقلی دلائل) سے اپنے استِتو (وجود) کو مٹا دینا چاہتی تھی، میں پروشوں کی بھانتی سوتنتر (آزاد) رہنا چاہتی تھی۔ کیوں کسی کی پابند ہوکر رہوں؟ کیوں اپنی اِچھاؤں (خواہشوں) کو کسی وِیکتی (فرد) کے سانچے میں ڈھالوں؟ کیوں کسی کو یہ کہنے کا ادھیکار (حق) دوں کہ تم نے یہ کیوں کیا، وہ کیوں کیا؟ دامپتیہ (گھریلو زندگی) میری نگاہ میں تچھ وستو (حقیر چیز) تھی۔ اپنے ماتا پِتا کی آلوچنا (تنقید) کرنا میرے لیے اُچت (صحیح) نہیں، ایشور انھیں سدگتی دے، ان کی رائے کسی بات پر نہ ملتی تھی۔ پِتا ودوان (عالم) تھے، ماتا کے لیے، کالا اکشر بھینس برابر تھا۔ اُن میں رات دن واد وواد (تکرار) ہوتا رہتا تھا۔ پِتا جی ایسی استری سے وواہ (شادی) ہوجانا اپنے جیون (زندگی) کا سب سے بڑا دربھاگیہ (بدقسمتی) سمجھتے تھے۔ وہ یہ کہتے کبھی نہ تھکتے تھے کہ تم میرے پاؤں کی بیڑی بن گئی، نہیں تو میں نہ جانے کہاں اُڑ کر پہنچا ہوتا۔ ان کے وچار (خیال) سے سارا دوش (غلطی) ماتا جی کے اشکشا (جہالت) کے سر تھا۔ وہ اپنی ایک ماتر پُتری (اکلوتی لڑکی) کو مورکھا ماتا (احمق ماں) کے سنسرگ سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ ماں کبھی مجھ سے کچھ کہتیں تو پِتا ان پر ٹوٹ پڑتے۔ تم سے کتنی بار کہہ چکا کہ لڑکی کو ڈانٹو مت، وہ سویم اپنا بھلا بُرا سوچ سکتی ہے، تمھارے ڈانٹنے سے اس کے آتم سمّان (عزت نفس) کو کتنا دھکّا لگے گا، یہ تم نہیں جان سکتیں۔ آخر ماتا جی نے نراش (نا امید) ہوکر مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا اور کداچت (شاید) اسی شوک (غم) میں چل بسیں۔ اپنے گھر کی اشانتی دیکھ کر مجھے وواہ سے اور بھی گھرنا (نفرت) ہوگئی۔ سب سے بڑا اثر مجھ پر میرے کالج کی لیڈی پرنسپل کا ہوا جو سویم (خود) اوِیواہت (غیر شادی شدہ) تھیں۔ میرا تو اب یہ وچار (خیال) ہے کہ یووکوں کا شکشا (تعلیم) کا بھار

کیول آدرش چرتروں (مثالی کرداروں) پر رکھنا چاہیے۔ ولاس میں رت (عیش و عشرت میں غرق)ں کالجوں کے شوقین پروفیسر ودیارتھیوں پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈال سکتے۔ میں اس وقت ایسی بات آپ سے کہہ رہی ہوں پر ابھی گھر جاکر سب بھول جاؤں گی۔ میں جس سنسار میں ہوں، اس کی جلوایو (آب ہوا) ہی دوشت (خراب) ہے۔ وہاں سبھی مجھے کیچڑ میں لت پت دیکھنا چاہتے ہیں۔ میرے ولاساسکت (عیش و عشرت میں مگن) رہنے میں ہی ان کا سوارتھ (مطلب) ہے۔ آپ وہ پہلے آدمی ہیں جس نے مجھ پر وشواس (یقین) کیا ہے، جس نے مجھ سے نشکپٹ ویوہار (دیانت داری کا سلوک) کیا ہے۔ ایشور کے لیے اب مجھے بھول نہ جایئے گا۔

آپٹے نے مس جوشی کی اور ویدنا پورن (غم زدہ) درشٹی سے دیکھ کر کہا۔ اگر میں آپ کی کچھ سیوا (خدمت) کرسکوں تو یہ میرے لیے سوبھاگیہ (خوش قسمتی) کی بات ہوگی۔ مس جوشی! ہم سب مٹی کے پتلے ہیں، کوئی نردوش نہیں۔ منشئے (انسان) بگڑتا ہے تو پرستتھیوں (حالات) سے، یا پورو سنسکاروں (ماضی کے رسم و رواج) سے۔ پرستتھیوں کا تیاگ کرنے سے ہی ہم بچ سکتا ہے، سنسکاروں سے گرنے والے منشئے کا مارگ (راستہ) اس سے کہیں کٹھن (مشکل) ہے۔ آپ کی آتما سُندر (روح لطیف) اور پوتر (پاکیزہ) ہے، کیول پرستتھیوں (حالات) نے اسے کہرے کی بھانتی ڈھک لیا ہے۔ اب وویک کا سوریہ اودے ہوگیا ہے۔ ایشور نے چاہا تو کہرا بھی پھٹ جائے گا۔ لیکن سب سے پہلے ان پرستتھیوں کا تیاگ کرنے کو تیار ہوجایئے۔

مس جوشی۔ یہی آپ کو کرنا ہوگا۔

آپٹے نے چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ویدھ (مسیحا) روگی (بیمار) کو زبردستی دوا پلاتا ہے۔

مس جوشی۔ میں سب کچھ کروں گی۔ میں کڑوی سے کڑوی دوا پیوں گی یدی (اگر) آپ پلائیں گے۔ کل آپ میرے گھر آنے کی کرپا (مہربانی) کریں گے، شام کو؟

آپٹے۔ اوشے (ضرور) آؤں گا۔

مس جوشی نے وداع لیتے ہوئے کہا۔ بھولیے گا نہیں، میں آپ کی راہ دیکھتی رہوں گی۔ اپنے رکھشک کو بھی لایئے گا۔

یہ کہہ کر اس نے بالک کو گود میں اُٹھا لیا اور اسے گلے سے لگا کر باہر نکل آئی۔ گرو (ناز) کے مارے اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا، ہوا میں اُڑی جا رہی ہے۔ پیاس سے تڑپتے ہوئے منُشئے کو ندی کا تٹ نظر آنے لگا تھا۔

(۴)

دوسرے دن پراتہ کال مس جوشی نے مہمانوں کے نام دعوتی کارڈ بھیجے اور اُتسو (جشن) منانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ مسٹر آپٹے کے سمان میں پارٹی دی جا رہی تھی۔ مسٹر جوہری نے کارڈ دیکھا تو مسکرائے۔ اب مہاشے اس جال سے بچ کر کہاں جائیں گے؟ مس جوشی نے انھیں پھنسانے کی یہ اچھی ترکیب نکالی۔ اس کام میں نپن (ماہر) معلوم ہوتی ہے۔ میں نے سمجھا تھا، آپٹے چالاک آدمی ہوگا، مگر ان آندولن کاری (تحریک چلانے والے) ودروہیوں (باغیوں) کو بکواس کرنے کے سوا اور کیا سوجھ سکتی ہے۔

چار ہی بجے سے مہمان لوگ آنے لگے۔ نگر کے بڑے بڑے ادھیکاری، بڑے بڑے ویاپاری (کاروباری)، بڑے بڑے وددان (عالم)، پردھان سماچار پتروں کے سمپادک (بڑے اخباروں کے نمائندے)، اپنی اپنی مہلاؤں کے ساتھ آنے لگے۔ مس جوشی نے آج اپنے اچھے سے اچھے وستر (کپڑے) اور آبھوشن (زیورات) نکالے ہوئے تھے، جدھر نکل جاتی تھی معلوم ہوتا تھا، ارون پرکاش کی چھٹا (صبح کی لالی) چلی آرہی ہے۔ بھون میں چاروں طرف سے سگندھ (خوشبو) کی لپٹیں آرہی تھیں اور مدھر سنگیت کی دھونی ہوا میں گونج رہی تھی۔

پانچ بجتے بجتے مسٹر جوہری آپہنچے اور مس جوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر بولے۔ جی چاہتا ہے تمھارے ہاتھ چوم لوں۔ اب مجھے وشواس ہوگیا کہ یہ مہاشے تمھارے پنجے سے نہیں نکل سکتے۔

مسز پیٹٹ بولیں۔ مس جوشی دلوں کا شکار کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔

مسٹر سہراب جی۔ میں نے سنا ہے، آپٹے بالکل گنوار سا آدمی ہے۔

مسٹر بھروچا۔ کسی یونیورسٹی میں شکشا ہی نہیں پائی، سبھیتا (تہذیب) کہاں سے آتی؟

مسز بھروچا۔ آج اسے خوب بنانا چاہیے۔

مہنت ویر بھدر داڑھی کے بھیتر سے بولے۔ میں نے سنا ہے ناستک (ملحد) ہے۔ ورناشرم (دین) دھرم (مذہب) کا پالن نہیں کرتا۔

مس جوشی۔ ناستک (ملحد) تو میں بھی ہوں۔ ایشور پر میرا بھی وشواس نہیں ہے۔
مہنت۔ آپ ناستک ہوں، پر آپ کتنے ہی ناستکوں کو آستک (خدا پرست) بنا دیتی ہیں۔
مسٹر جوہری۔ آپ نے لاکھ کی بات کہی مہنت جی!
مسز بھروچا۔ کیوں مہنت جی، آپ کو مس جوشی ہی نے آستک بنایا ہے کیا؟

سہسا آپٹے باہر سے بالک کی انگلی پکڑے ہوئے بھون میں داخل ہوئے۔ وہ پورے فیشنیبل رئیس بنے ہوئے تھے۔ بالک بھی کسی رئیس کا لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ آج آپٹے کو دیکھ کر لوگوں کو ودِت (محسوس) ہوا کہ وہ کتنا سندر، سجیلا آدمی ہے۔ مکھ کا شوریہ ٹپک رہا تھا، پور پور سے ششٹتا (تہذیب) جھلکتی تھی، معلوم ہوتا تھا وہ اسی سماج میں پلا ہے۔ لوگ دیکھ رہے تھے کہ وہ کہیں چوکے اور تالیاں بجائیں۔ کہیں پھسلے اور قہقہے لگائیں، پر آپٹے منجھے ہوئے کھلاڑی کی بھانتی جو قدم اُٹھاتا تھا وہ سدھا ہوا، جو ہاتھ دکھلاتا تھا وہ جما ہوا۔ لوگ اسے پہلے تچھ (ذلیل) سمجھتے تھے، اب اس سے ایرشیا (حسد) کرنے لگے، اس پر پھبتیاں اُڑانی شروع کیں۔ لیکن آپٹے اس کلا (فن) میں بھی ایک نکلا۔ بات منہ سے نکلی اور اس نے جواب دیا، پر اس کے جواب میں مالِنیہ (ابتذال) یا کٹوتا (جھنجھلاہٹ) کا لیش (ذرہ) بھی نہ ہوتا تھا۔ اس کا ایک ایک شبد سرل سوچھ (صاف) چت کو پرسن (خوش) کرنے والے بھاؤں (انداز) میں ڈوبا ہوتا تھا۔ مس جوشی اس کی واکیہ چاتری (حاضر جوابی) پر پھول اُٹھتی تھیں۔

سہراب جی۔ آپ نے کس یونیورسٹی میں شکشا پائی تھی؟
آپٹے۔ یونیورسٹی میں شکشا پائی ہوتی تو آج میں شکشا وبھاگ (شعبۂ تعلیم) کا ادھیکش (صدر) نہ ہوتا۔
مسز بھروچا۔ میں تو آپ کو بھینکر جنتو (خطرناک جانور) سمجھتی تھی؟

آپٹے مسکرا کر کہا۔ آپ نے مجھے مہیلاؤں کے سامنے نہ دیکھا ہوگا۔

سہسا مس جوشی اپنے سونے کے کمرے میں گئی اور اپنے سارے وستر آبھوشن اتار پھینکے۔ اس کے مکھ سے شبھ (سعد) سنکلپ (عہد) کا تیج نکل رہا تھا۔ نیتروں سے دبی جیوتی پرسفوٹت (پھوٹ) ہو رہی تھی، مانو کسی دیوتا نے اسے وردان دیا ہو۔ اس نے سجے ہوئے کمرے کو گھرنا نیتروں سے دیکھا، اپنے آبھوشنوں کو پیروں سے ٹھکرا دیا اور ایک موٹی صاف

ساڑی پہن کر باہر نکلی۔ آج پراتہ کال ہی اس نے یہ ساڑی منگا لی تھی۔

اسے اس نئی ویش (لباس) میں دیکھ کر سب لوگ چکت (حیرت زدہ) ہوگئے۔ کایا پلٹ کیسی؟ سہسا کسی کی آنکھوں کو وشواس نہ آیا، کنتو مسٹر جوہری بغلیں بجانے لگے۔ مس جوشی نے پھنسانے کے لیے کوئی نیا سوانگ رچا ہے۔

مِتروں! آپ کو یاد ہے، پرسوں مہاشئے آپٹے نے مجھے کتنی گالیاں دی تھیں۔ یہ مہاشئے کھڑے ہیں۔ آج میں انھیں اس درویوہار (بدسلوکی) کا دنڈ (سزا) دینا چاہتی ہوں۔ میں کل ان کے مکان پر جاکر ان کے جیون کے سارے گپت رہسیوں (پوشیدہ رازوں) کو جان آئی۔ یہ جو جنتا کی بھیڑ میں گرجتے پھرتے ہیں، میرے ایک ہی نشانے میں گر پڑے میں ان رہسیوں کے کھولنے میں اب ولمب (دیر) نہ کروں گی، آپ لوگ ادھیر (بے چین) ہورہے ہوں گے۔ میں نے جو کچھ دیکھا، اتنا بھینکر ہے کہ اس کا ورتانت (بیان) سن کر شاید آپ لوگوں کو مورچھا (بے ہوشی) آجائے گی۔ اب مجھے لیش ماتر بھی سندیہہ (ذرہ برابر بھی شک) نہیں ہے کہ یہ مہاشئے پکّے ودروہی ہیں۔

مسٹر جوہری نے تالی بجائی اور تالیوں سے ہال گونج اُٹھا۔

مس جوشی۔ لیکن راج کے دروہی نہیں، انیائے (ناانصافی) کے دروہی، دمن (استحصال) کے دروہی، ابھیمان (گھمنڈ) کے دروہی ......

چاروں اُور سناٹا چھا گیا۔ اور لوگ چکت ہوہوکر ایک دوسرے کی اُور تاکنے لگے۔

مس جوشی۔ مہاشئے آپٹے نے گپت روپ سے شستر جمع کیے ہیں اور گپت روپ سے ہتیائیں (قتل) کی ہیں۔

مسٹر جوہری نے تالیا بجائیں اور تالیوں کا دونگڑا پھر برس گیا۔

مس جوشی۔ لیکن کس کی ہتیا؟ دُکھ کی، دردرتا (مفلسی) کی، پرجا کے کشٹھوں (مصیبتوں) کی، ہٹ دھرمی کی اور اپنے سوارتھ (خودغرضی) کی۔

چاروں اُور پھر سناٹا چھا گیا اور لوگ چکِت ہوہوکر ایک دوسرے کی اُور تاکنے لگے، مانو انھیں اپنے کانوں پر وشواس نہیں ہے۔

مس جوشی۔ مہاراج آپٹے نے گپت روپ سے ڈکیتیاں کی ہیں اور کر رہے ہیں۔

اب کے کسی نے تالی نہ بجائی، لوگ سننا چاہتے تھے کہ دیکھیں آگے کیا کہتی ہے۔

انھوں نے مجھ پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے، میرا سب کچھ اپہرن (اغوا) کر لیا ہے، یہاں تک کہ اب میں نرادھار (بے اساس) ہوں اور ان کے چرنوں (قدموں) کے سوا میرے لیے اور کوئی آشرے (سہارا) نہیں ہے۔ پرانڑ دھار (جاندار)! اس ابلہ کو اپنے چرنوں میں استھان دو، اسے ڈوبنے سے بچاؤ۔ میں جانتی ہوں، تم مجھے نراش نہ کروگے۔

یہ کہتے کہتے وہ جاکر آپٹے کے چرنوں میں گرپڑی۔ ساری منڈلی استمبھت (دنگ) رہ گئی۔

(۵)

ایک سپتاہ (ہفتہ) گزر چکا تھا۔ آپٹے پولیس کی حراست میں تھے۔ ان پر ابھیوگ (مقدمہ) چلانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارے پرانت میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ نگر میں روز سبھائیں ہوتی تھیں، پولیس روز دس پانچ آدمیوں کو پکڑتی تھی۔ سماچار پتروں میں زوروں کے ساتھ وادوواد ہو رہا تھا۔

رات کے نو بج گئے تھے۔ مسٹر جوہری راج بھون میں میز پر پر بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے کہ مس جوشی کو کیوں کر واپس لائیں؟ اسی دن سے ان کی چھاتی پر سانپ لوٹ رہا تھا۔ اس کی صورت ایک چھن (لمحہ) کے لیے آنکھوں سے نہ اترتی تھی۔

وہ سوچ رہے تھے، اس نے میرے ساتھ ایسی دغا کی! میں نے اس کے لیے کیا کچھ نہ کیا؟ اس کی کون سی اِچھّا تھی، جو میں نے پوری نہیں کی اور اسی نے مجھ سے بے وفائی کی۔ نہیں، کبھی نہیں، میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ دنیا چاہے بدنام کرے، ہتیارا کہے، چاہے مجھے پد (عہدے) سے ہاتھ دھونا پڑے، لیکن آپٹے کو نہ چھوڑوں گا۔ اس روڑے کو راستے سے ہٹا دوں گا، اس کانٹے کو پہلو سے نکال باہر کروں گا۔

سہسا کمرے کا دوار کھلا اور مس جوشی نے پرویش کیا۔ مسٹر جوہری ہکّا بکّا کر کرسی پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ سوچ کر کہ شاید مس جوشی ادھر سے نراش ہوکر میرے پاس آئی ہیں، کچھ روکھے، لیکن نمر بھاؤ (نرم انداز) سے بولے۔ آؤ بالا، تمھاری یاد میں بیٹھا تھا۔ تم کتنی ہی بے وفائی کرو، پر تمھاری یاد میرے دل سے نہیں نکل سکتی۔

مس جوشی۔ آپ کیول (صرف) زبان سے کہتے ہیں۔

مسٹر جوہری۔ کیا دل چیر کر دکھا دوں؟

مس جوشی۔ پریم پرینگار (انتقام) نہیں کرتا، پریم سے دُر آگرہ (سختی) نہیں ہوتا۔ آپ میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں نا اس پر بھی آپ کہتے ہیں، میں تمھاری یاد کرتا ہوں۔ آپ نے میرے سوامی کو حراست میں ڈال رکھا ہے یہ پریم ہے! آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ اگر آپ سمجھ رہے ہوں کہ ان سختیوں سے ڈر کر میں آپ کی شرن میں آجاؤں گی تو آپ کا بھرم ہے۔ آپ کو اختیار ہے کہ آپنے کو کالے پانی بھیج دیں، پھانسی پر چڑھا دیں، لیکن اس کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ وہ میرے سوامی ہیں، میں ان کو اپنا سوامی سمجھتی ہوں۔ انھوں نے اپنی وشال اُدارتا (عظیم فیاضی) سے میرا اڈھار (نجات) کیا۔ آپ مجھے وشے کے پھندوں میں پھساتے تھے، میری آتما کو کلشت کرتے تھے۔ کبھی آپ کو یہ خیال آیا کہ اس کی آتما پر کیا بیت رہی ہوگی؟ آپ مجھے آتم شونیہ (بے روح) سمجھتے تھے۔ اس دیوپُروش نے اپنی نرمل سوچھ آتما کے آکرشن (کشش) سے مجھے پہلی ملاقات میں کھینچ لیا۔ میں اس کی ہوگئی اور مرتے دم تک اسی کی رہوں گی۔ اس مارگ سے اب آپ مجھے نہیں ہٹا سکتے۔ مجھے ایک سچی آتما کی ضرورت تھی، وہ مجھے مل گئی۔ اسے پاکر اب تینوں لوک کی سمپدا (اثاثہ) میری آنکھوں میں تچھ (حقیر) ہے۔ میں ان کے بیوگ (ہجر) میں چاہے پران دے دوں، پر آپ کے کام نہیں آسکتی۔

مسٹر جوہری۔ مس جوشی! پریم اُدار نہیں ہوتا، چھماشیل نہیں ہوتا۔ میرے لیے تم سردَسو (سب کچھ) ہو، جب تک میں سمجھتا ہوں کہ تم میری ہو۔ اگر تم میری نہیں ہوسکتی تو مجھے اس کی کیا چنتا ہوسکتی ہے کہ تم کس دَشا میں ہو؟

مس جوشی۔ یہ آپ کا انتم نشچئے ہے؟

مسٹر جوہری۔ اگر میں کہہ دوں کہ ہاں تو؟

مس جوشی نے سینے سے پستول نکال کر کہا۔ تو پہلے آپ کی لاش زمین پر پھڑکتی ہوگی اور آپ کے بعد میری۔ بولیے یہ آپ کا انتم نشچئے ہے؟

یہ کہہ کر مس جوشی نے جوہری کی طرف پستول سیدھا کیا۔ جوہری کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مسکرا کر بولے۔ کیا تم میرے لیے کبھی اتنا ساہس کرسکتی تھیں؟ کداپی (بالکل) نہیں۔ اب مجھے وشواس ہوگیا کہ میں تمھیں نہیں پاسکتا۔ جاؤ تمھارا آپنے تمھیں

مبارک ہو۔ اس پر سے ابھوگ اُٹھا لیا جائے گا۔ پوتر پریم ہی میں یہ ساہس ہے۔ اب مجھے وشواس ہوگیا کہ تمھارا پریم پوتر ہے۔ اگر کوئی پرانا پاپی بھوشیہ وانی (پیشن گوئی) کرسکتا ہے تو میں کہتا ہوں، وہ دن دور نہیں ہے جب تم اس بھون کی سوامنی ہوگی۔ آپنے نے مجھے پریم کے چھیتر میں نہیں، راجنیتی کے چھیتر میں بھی پراست کردیا۔ سچا آدمی ایک ملاقات میں ہی جیون بدل سکتا ہے، آتما کو جگا سکتا ہے اور اگیان کو مٹاکر پرکاش کی جیوتی پھیلا سکتا ہے، یہ آج سدھ (ثابت) ہوگیا۔

یہ افسانہ ماہنامہ چاند کے اپریل 1929 کے شمارے میں شائع ہوا۔ مان سروور 3 میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جارہا ہے۔

تہذیب کا راز

یوں تو میری سمجھ میں دنیا کی ایک ہزار ایک باتیں نہیں آتیں، جیسے لوگ علی الصباح اُٹھتے ہی بالوں پر چُھرا کیوں چلاتے ہیں؟ کیا اب مردوں میں بھی اِتنی نزاکت آگئی ہے کہ بالوں کا بوجھ اُن سے نہیں سنبھلتا؟ ایک ساتھ ہی سبھی پڑھے لکھے لوگوں کی آنکھیں کیوں کمزور ہوگئی ہیں؟ دماغ کی کمزوری ہی اس کا سبب ہے یا اور کچھ؟ لوگ خطابوں کے لیے اتنے کیوں حیران ہوتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس وقت مجھے ان باتوں سے مطلب نہیں۔ میرے دل میں ایک نیا سوال اُٹھ رہا ہے اور اُس کا جواب مجھے کوئی دیتا۔ سوال یہ ہے کہ مہذب کون ہے اور نا مہذب کون؟ تہذیب کی علامتیں کیا ہیں؟ سرسری نظر سے دیکھیے تو اس سے زیادہ آسان اور کوئی سوال ہی نہ ہوگا۔ بچّہ بچّہ اس کا جواب دے سکتا ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھیے تو سوال اتنا آسان نہیں معلوم ہوتا۔ اگر کوٹ پتلون پہننا، ٹائی، ہیٹ، کالر لگانا، میز پر بیٹھ کر کھانا، دن میں تیرہ بار قہوہ یا چائے پینا اور سگار پیتے ہوئے چلنا تہذیب ہے تو اُن گوروں کو بھی مہذب کہنا پڑے گا جو سڑکوں پر شام کو کہیں کہیں ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ شراب کے نشہ سے آنکھیں سُرخ، پیر لڑکھڑاتے ہوئے، راستہ چلنے والوں کو خواہ مخواہ چھیڑنے کی دُھن، کیا اُن گوروں کو مہذب کہا جاسکتا ہے؟ کبھی نہیں! تو یہ ثابت ہوا کہ تہذیب کوئی اور چیز ہے۔ اُس کا جسم سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا دل سے۔

(۲)

میرے اِنے گِنے دوستوں میں ایک رائے رتن کشور بھی ہیں۔ آپ بہت ہی نیک دل، بہت ہی سخی، بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور ایک بہت بڑے عہدے دار ہیں۔ بہت اچھی تنخواہ پانے پر بھی اُن کی آمدنی خرچ کے لیے کافی نہیں ہوتی۔ ایک چوتھائی تنخواہ تو بنگلے ہی کے نذر ہوجاتی ہے۔ اس لیے آپ اکثر متفکر رہتے ہیں۔ رشوت تو نہیں لیتے۔ کم از کم میں نہیں جانتا۔ حالانکہ کہنے والے سمجھتے ہیں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ سفر خرچ بڑھانے کے

لیے دورے پر زیادہ رہتے ہیں، یہاں تک کہ اُس کے لیے ہر سال بجٹ کے کسی دوسری مد سے روپے نکالنے پڑتے ہیں۔ اُن کے افسر کہتے ہیں کہ اتنا دورہ کیوں کرتے ہو۔ تو جواب دیتے ہیں کہ اس ضلع کا کام ہی ایسا ہے کہ جب تک خوب دورے نہ کیے جاویں۔ رعایا ٹھیک ہی نہیں رہ سکتی۔ لیکن لطف تو یہ ہے کہ رائے صاحب اتنے دورے واقعی نہیں کرتے، جتنے وہ اپنے روز نامچہ میں درج کرتے ہیں۔ اُن کے پڑاؤ شہر سے پچاس میل پر ہوتے ہیں۔ خیمے وہاں گڑے رہتے ہیں، عملے وہاں پڑے رہتے ہیں۔ اور رائے صاحب گھر پر دوستوں کے ساتھ غپ شپ کرتے رہتے ہیں۔ مگر کس کی مجال ہے کہ رائے صاحب کی نیک نیتی پر شک کرسکے۔ اُن کے مہذب ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہوسکتا۔

ایک روز میں اُن سے ملنے گیا۔ اُس وقت وہ اپنے گھسیارہ دمڑی کو ڈانٹ رہے تھے۔ دمڑی رات دن کا نوکر تھا۔ لیکن روٹی کھانے گھر جایا کرتا تھا۔ اُس کا گھر تھوڑی دُور پر گاؤں میں تھا۔ کل رات کو کسی سبب سے یہاں نہ آسکا تھا۔ اِسی لیے ڈانٹ پڑ رہی تھی۔

رائے صاحب۔ جب ہم تمھیں رات دن کے لیے رکھے ہوئے ہیں تو تم گھر پر کیوں رہے؟ کل کے پیسے کٹ جائیں گے۔

دمڑی۔ حضور! ایک مہمان آگئے تھے، اسی سے نہ آسکا۔

رائے صاحب۔ تو کل کے پیسے اُسی مہمان سے لو۔

دمڑی۔ سرکار، اب کبھی ایسی کھتا (خطا) نہ ہوگی۔

رائے صاحب۔ بک بک مت کرو۔

دمڑی۔ ہجور ....

رائے صاحب۔ دو روپے جُرمانہ۔

دمڑی روتا ہوا چلا گیا۔ روزہ بخشوانے آیا تھا۔ نماز گلے پڑگئی۔ دو روپے جُرمانہ ٹھونک دیا گیا۔ خطا یہی تھی کہ بے چارہ قصور معاف کرانا چاہتا تھا۔

یہ ایک رات غیر حاضر ہونے کی سزا تھی، بے چارہ دن بھر کا کام کرچکا تھا۔ رات کو یہاں سویا نہ تھا۔ اُس کی یہ سزا! اور گھر بیٹھے بھتے اُڑانے والوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ کوئی سزا نہیں دیتا ہے؟ سزا تو ہے اور ایسی ہے کہ عمر بھر یاد رہے مگر پکڑنا تو مشکل ہے۔ دمڑی بھی اگر ہوشیار ہوتا تو ذرا رات رہے آکر کوٹھری میں سوجاتا۔ پھر کسے خبر ہوتی کہ

وہ رات میں کہاں رہا؟ مگر غریب اتنا چالاک نہ تھا۔

(۳)

دمڑی کے پاس کل چھ بسوہ زمین تھی۔ مگر اتنے ہی آدمیوں کا خرچ بھی تھا۔ اُس کے دو لڑکے، دو لڑکیاں اور بیوی سب کھیتی میں لگے رہتے تھے۔ پھر بھی پیٹ کی روٹیاں نہیں میسر ہوتی تھیں۔ اتنی زمین کیا سونا اُگل دیتی؟ اگر سب کے سب گھر سے نکل کر مزدوری کرنے لگتے تو آرام سے رہ سکتے تھے۔ لیکن موروثی کسان مزدور کہلانے کی بے عزتی گوارہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس بدنامی سے بچنے کے لیے دو بیل باندھ رکھے تھے۔ اس کی تنخواہ کا کثیر حصہ بیلوں کے چارہ دانہ ہی میں صرف ہوجاتا تھا۔ یہ ساری تکلیفیں منظور تھیں مگر کھیتی چھوڑکر مزدور بن جانا منظور نہ تھا۔ کسان کی جو عزت ہے وہ کہیں مزدور کی ہوسکتی ہے، خواہ وہ ایک روپے روز ہی کیوں نہ کمائے؟ کسانی کے ساتھ مزدوری کرنا اتنی ذلت کی بات نہیں دروازہ پر بندھے ہوئے بیل اُس کی عزت قائم رکھتے ہیں مگر بیلوں کو بیچ کر پھر کہاں مُنہ دِکھانے کی جگہ رہ سکتی ہے؟

ایک روز رائے صاحب اُسے ٹھنڈ سے کانپتا دیکھ کر بولے کپڑے کیوں نہیں بنواتا، کانپ کیوں رہا ہے؟

دمڑی۔ سرکار پیٹ کی روٹی بھی تو پوری نہیں پڑتی کپڑے کہاں سے بنواؤں؟

رائے صاحب۔ بیلوں کو بیچ کیوں نہیں ڈالتا؟ سیکڑوں بار سمجھا چکا۔ لیکن نہ جانے کیوں اتنی موٹی سی بات تیری سمجھ میں نہیں آتی؟

دمڑی۔ سرکار، برادری میں کہیں منہ دکھانے کے لایک نہ رہوں گا۔ لڑکی کی سگائی نہ ہونے پاوے گی۔ ٹاٹ باہر کردیا جاؤں گا؟

رائے صاحب۔ ان ہی حماقتوں سے تو تم لوگوں کی یہ دُرگت ہو رہی ہے۔ ایسے آدمیوں پر رحم کرنا بھی گناہ ہے۔ (میری طرف مڑکر) کیوں منشی جی اس پاگل پن کا بھی کوئی علاج ہے؟ جاڑوں میں مر رہے ہیں۔ مگر دروازے پر بیل ضرور بندھیں گے۔

میں نے کہا۔ جناب، یہ تو اپنی اپنی سمجھ ہے۔

رائے صاحب۔ ایسی سمجھ کو دور سے سلام کیجیے۔ میرے یہاں کئی پشتوں سے جنم اشٹمی کا جشن منایا جاتا تھا، کئی ہزار روپیوں پر پانی پھر جاتا تھا، گانا ہوتا تھا، دعوتیں ہوتی

تھیں۔ رشتہ داروں کو نوید وغیرہ بھیجا جاتا تھا، غرباء کو کپڑے بانٹے جاتے تھے۔ والد صاحب کے بعد اوّل ہی سال میں نے یہ جلسہ بند کردیا۔ فائدہ کیا؟ مفت چار پانچ ہزار کی چپت پڑتی تھی۔ کل قصبہ میں واویلا مچا، آوازے کسے گئے، کسی نے ناستک بھی کہا، کسی نے عیسائی بنایا۔ لیکن یہاں ان باتوں کی کیا پروا؟ آخر چند روز میں سارا کہرام مٹ گیا۔ اجی بڑی دل لگی تھی! قصبہ میں کسی کے یہاں شادی ہو تو لکڑی مجھ سے لے۔ پشتہا پشت سے یہ رسم چلی آتی تھی۔ والد صاحب تو اوروں سے درخت خرید خرید کر اس رسم کو نبھاتے تھے۔ تھی حماقت یا نہیں؟ میں نے فوراً لکڑی دینا بند کردیا۔ اس پر بھی لوگ بہت روئے دھوئے، مگر دوسروں کا رونا دھونا سنوں یا اپنا نفع نقصان دیکھوں؟ اس لکڑی ہی سے کم از کم پانچ سو سالانہ کی بچت ہوگئی۔ اب کوئی بھول کر بھی ان چیزوں کے لیے مجھے دق کرنے نہیں آتا۔

میرے دل میں پھر سوال پیدا ہوا، دونوں میں کون مہذب ہے؟ خاندانی وقار پر جان دینے والا جاہل دمڑی یا روپے پر خاندانی وقار کو قربان کرنے والے رائے رتن کشور؟

(۴)

رائے صاحب کے اجلاس میں ایک بڑے معرکہ کا مقدمہ پیش تھا۔ شہر کا ایک رئیس قتل کے الزام، ماخوذ تھا۔ اُس کی ضمانت کے لیے رائے صاحب کی خوشامدیں ہونے لگیں۔ عزّت کی بات تھی۔ رئیس کا حکم تھا کہ چاہے ریاست فروخت ہوجاوے مگر اس مقدمہ سے بے داغ نکل آؤں۔ ڈالیاں لگائی جانے لگیں۔ سفارشیں پہنچائی گئیں۔ مگر رائے صاحب پر کوئی اثر نہ ہوا۔ رئیس کے آدمیوں کو علانیہ رشوت کا تذکرہ کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، آخر جب کوئی بس نہ چلا تو رئیس کی بیوی نے رائے صاحب کی بیوی سے مل کر سودا کرنے کی ٹھان لی۔

رات کے دس بجے تھے۔ دونوں خاتون میں گفتگو ہونے لگی، بیس ہزار کی بات چیت تھی۔ رائے صاحب کی بیوی تو اتنی خوش ہوئیں کہ اُسی وقت رائے صاحب کے پاس دوڑی ہوئی آئیں اور کہنے لگیں۔ لے لو، لے لو، تم نہ لوگے تو میں لے لوں گی۔

رائے صاحب نے کہا۔ اتنی بے صبر نہ ہو۔ وہ تمھیں اپنے دل میں کیا سمجھیں گی؟ کچھ اپنی عزت کا خیال بھی ہے یا نہیں؟ مانا کہ رقم بڑی ہے اور اس سے میں یکبارگی

تمھارے آئے دن کی فرمائشوں سے چھٹکارا پاجاؤں گا لیکن ایک سویلین کی عزت بھی تو کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ تمھیں پہلے بگڑ کر کہنا چاہیے تھا کہ مجھ سے ایسی بے ہودہ باتیں کہتی ہو تو یہاں سے چلی جاؤ میں اپنے کانوں سے نہیں سننا چاہتی۔

بیوی۔ یہ تو میں نے پہلے ہی کیا۔ بگڑ کر خوب کھری کھوٹی سُنائی۔ کیا اتنا بھی نہیں جانتی؟

بے چاری میرے پیروں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

رائے صاحب۔ یہ کہنا تھا کہ رائے صاحب سے کہوں گی تو مجھے کچّا ہی چبا جائیں گے؟

یہ کہہ کر رائے صاحب نے جوش محبت سے بیوی کو گلے لگا لیا۔

بیوی۔ اجی، میں نہ جانے ایسی کتنی باتیں کہہ چکی مگر وہ کسی طرح ٹالے نہیں ٹلتی۔ رو رو کر جان دے رہی ہے۔

رائے صاحب۔ اُس سے وعدہ تو نہیں کرلیا؟

بیوی۔ وعدہ! میں تو روپے لے کر صندوق میں رکھ آئی۔ نوٹ تھے۔

رائے صاحب۔ کتنی بڑی احمق ہو۔ نہ معلوم ایشور تمھیں سمجھ بھی دے گا یا نہیں؟

بیوی۔ اب کیا دے گا؟ دینا ہوتا تو دے نہ دی ہوتی؟

رائے صاحب۔ ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے مجھ سے کہا تک نہیں۔ اور روپے لے کر صندوق میں داخل کر دیے۔ اگر کسی طرح بات کھل جائے تو کہیں کا نہ رہوں۔

بیوی۔ تو بھئی سوچ لو۔ اگر کچھ گڑبڑ ہو تو میں جاکر روپے واپس کردوں۔

رائے صاحب۔ پھر وہی حماقت! ارے، اب تو جو کچھ ہونا تھا وہ ہوچکا۔ ایشور پر بھروسہ کر کے ضمانت لینی پڑے گی۔ جانتی ہو، یہ سانپ کے منہ میں انگلی ڈالنی ہے۔ یہ بھی جانتی ہو کہ مجھے ایسی باتوں سے کتنی نفرت ہے۔ پھر بھی بے صبر ہوجاتی ہو۔ اب کی بار تمھاری حماقت سے میرا برت ٹوٹ رہا ہے، میں نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اب اس معاملہ میں ہاتھ نہ ڈالوں گا مگر تمھاری حماقت کے آگے جب میری کچھ چلنے پاوے۔

بیوی۔ تو میں جاکر لوٹائے دیتی ہوں۔

رائے صاحب۔ اور میں جاکر زہر کھائے لیتا ہوں۔

اِدھر تو میاں بیوی میں یہ ناٹک ہو رہا تھا اُدھر دمڑی اُسی وقت اپنے گاؤں کے مکھیا

کے کھیت میں جوار کاٹ رہا تھا۔ آج وہ رات بھر کی چھٹی لے کر گھر گیا تھا۔ دیکھا کہ بیلوں کے لیے چارہ کا ایک تنکا بھی نہیں ہے ابھی تنخواہ ملنے میں کئی دن کی دیر تھی مول لے نہ سکتا تھا۔ گھر والوں نے دن کو کچھ گھاس چھیل کر کھلائی تو تھی۔ مگر اونٹ کے منہ میں زیرہ، اتنی گھاس سے کیا ہوسکتا تھا۔ دونوں بیل بھوکے کھڑے تھے۔ دمڑی کو دیکھتے ہی دونوں پونچھیں کھڑی کرکے ہنکارنے لگے۔ جب وہ پاس گیا تو دونوں اُس کی ہتھیلیاں چاٹنے لگے۔ بے چارہ دمڑی من مسوس کر رہ گیا۔ سوچا کہ اس وقت تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ سویرے کسی سے کچھ اُدھار لے کر چارہ لاؤں گا۔

لیکن جب گیارہ بجے رات کو اُس کی آنکھ کُھلی تو دیکھا کہ دونوں بیل ابھی تک ناند پر کھڑے ہیں۔ چاندنی رات تھی۔ دمڑی کو معلوم ہوا کہ دونوں اُس کی طرف التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کو بھوک سے دُکھی دیکھ کر اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کسان کو اپنے بیل اپنے لڑکے کی طرح پیارے ہوتے ہیں۔ وہ انھیں جانور نہیں بلکہ اپنا دوست اور مددگار سمجھتا ہے۔ بیلوں کو بھُوکا کھڑا دیکھ کر اُس کی نیند اُچٹ گئی۔ آخر وہ کچھ سوچتا ہوا اُٹھا۔ ہنسیا نکالی اور چارے کی فکر میں چلا۔ گاؤں کے باہر باجرا اور جوار کے کھیت کھڑے تھے۔ دمڑی کے ہاتھ کانپنے لگے۔ لیکن بیلوں کی یاد نے اُسے کام پر آمادہ کر دیا۔ چاہتا تو کئی بوجھ کاٹ سکتا تھا لیکن وہ چوری کرتے ہوئے بھی چور نہ تھا۔ اس نے اُتنا ہی چارہ کاٹا جتنا بیلوں کے لیے رات بھر کو کافی ہو۔ سوچا کہ اگر کسی نے دیکھ بھی لیا تو اُس سے کہہ دوں گا کہ بیل بھوکے تھے اس لیے کاٹ لیا۔ اُسے یقین تھا کہ تھوڑے سے چارے کے لیے کوئی مجھے پکڑ نہیں سکتا، میں کچھ بیچنے کے لیے تو کاٹ نہیں رہا ہوں، پھر ایسا بے درد کون ہے جو مجھے پکڑ لے؟ بہت کرے گا اپنے دام لے لے گا۔ اس نے بہت سوچا چارہ کا قلیل ہونا ہی اُسے چوری کے الزام سے بچانے کے لیے کافی تھا۔ چور اتنا کاٹتا جتنا اُس سے اُٹھ سکتا، اُسے کسی نفع نقصان سے کیا مطلب؟ گاؤں کے لوگ دمڑی کو چارہ لیے دیکھ کر بگڑتے ضرور مگر کوئی اُس پر چوری کا الزام نہ لگاتا۔ لیکن اتفاق سے حلقہ کے تھانہ کا سپاہی اُدھر آنکلا وہ قریب کے ایک بنیے کے یہاں جُوا ہونے کی خبر پاکر کچھ اینٹھنے کی فکر میں آیا تھا۔ دمڑی کو چارہ سر پر اُٹھاتے دیکھا تو اُسے شک ہوا۔ اتنی رات گئے کون چارہ کاٹتا ہے؟ ہو نہ ہو، کوئی چوری سے کاٹ رہا ہے۔ ڈانٹ کر بولا۔ کون چارہ لیے جاتا ہے؟

کھڑا رہ!

دمڑی نے چونک کر پیچھے دیکھا تو پولیس کا سپاہی! ہاتھ پیر پھول گئے۔ کانپتا ہوا بولا۔ "سرکار تھوڑا ہی سا کاٹا ہے۔" دیکھ لیجیے۔

سپاہی۔ تھوڑا کاٹا ہو یا بہت، ہے تو چوری۔ کھیت کس کا ہے؟

دمڑی۔ بلدیو مہتو کا۔

سپاہی نے سمجھا تھا، شکار پھنسا، اس سے کچھ اینٹھوں گا۔ مگر وہاں کیا رکھا تھا۔ پکڑ کر گاؤں میں لایا اور جب وہاں بھی کچھ ہاتھ آتا نہ دکھائی دیا تو تھانہ لے گیا۔ تھانہ دار نے چالان کردیا۔ مقدمہ رائے صاحب ہی کے اجلاس میں پیش ہوا۔

رائے صاحب نے دمڑی کو ماخوذ دیکھا تو ہمدردی کے بجائے سختی سے کام لیا۔ بولے۔ یہ میری بدنامی کی بات ہے۔ تیرا کیا بگڑا؟ سال چھ مہینے کا سزا ہوجائے گی؟ شرمندہ تو مجھے ہونا پڑ رہا ہے، لوگ یہی تو کہتے ہوں گے کہ رائے صاحب کے آدمی ایسے بدمعاش اور چور ہیں۔ تو میرا نوکر نہ ہوتا تو میں ہلکی سزا دیتا لیکن تو میرا نوکر ہے۔ اس لیے سخت سے سخت سزا دوں گا۔ میں یہ نہیں سن سکتا کہ رائے صاحب نے اپنے ملازم کے ساتھ رعایت کی۔

یہ کہہ کر رائے صاحب نے دمڑی کو چھ ماہ کی قید سخت کا حکم سُنایا۔

اُسی روز انھوں نے اس قتل کے مقدمہ میں ضمانت لے لی۔ میں نے دونوں داستانیں سُنیں اور میرے دل میں یہ خیال اور بھی پختہ ہوگیا کہ تہذیب صرف ہنر کے ساتھ عیب کرنے کا نام ہے۔ آپ بُرے سے بُرا کام کریں۔ لیکن اگر آپ اُس پر پردہ ڈال سکتے ہیں تو آپ مہذب ہیں، شریف ہیں، جنٹلمین ہیں۔ اگر آپ میں یہ وصف نہیں تو آپ نامہذب ہیں، دہقانی ہیں، بدمعاش ہیں۔ یہی تہذیب کا راز ہے۔

یہ افسانہ پہلی بار 'مادھوری' کے مارچ 1925 میں 'سبھیتا کا رہسیہ' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ہندی میں مان سرودور 4 اور اردو میں 'فردوس خیال' میں شامل ہے۔

بھاڑے کا ٹٹّو!

آگرہ کالج کے میدان میں شام کو دونوں جوان ہاتھ میں ہاتھ دیے ٹہل رہے تھے۔ ایک کا نام جسونت تھا اور دوسرے کا رمیش۔ جسونت قد و قامت کا اونچا اور طاقت ور تھا اُس کے چہرہ پر باقاعدگی اور صحت کی جھلک تھی۔ رمیش پستہ قد چھریرے بدن کا، بے رونق اور کمزور تھا، دونوں میں کسی بات پر مَباحثہ ہو رہا تھا۔

جسونت نے کہا۔ میں آتما کے مقابلے میں دولت کی کوئی وقعت نہیں سمجھتا۔

رمیش بولا۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔

جسونت۔ ہاں، دیکھ لینا، تم طعنے دیتے رہو، لیکن میں دکھلا دوں گا کہ میں دولت کو کتنی حقیر سمجھتا ہوں۔

رمیش۔ خیر دکھلا دینا۔ میں تو روپیہ کو اتنا حقیر نہیں سمجھتا روپے کے لیے آج پندرہ برس سے کتابیں چاٹ رہا ہوں، روپے کے لیے والدین، عزیز، رشتہ دار، سب سے علاحدہ یہاں پڑا ہوا ہوں۔ نہ جانے ابھی کتنی سلامیاں دینی پڑیں گی، کتنی خوشامد کرنی پڑے گی۔ کیا اس میں روحانی زوال نہ ہوگا۔ میں تو اتنے بلند معیار پر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہاں تو اگر کسی مقدمہ میں اچھی رشوت ملے تو شاید چھوڑ نہ سکوں۔ کیا تم چھوڑ دو گے؟

جسونت۔ میں اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں گا اور مجھے یقین ہے کہ تم جتنے پست بنتے ہو اتنے نہیں ہو۔

رمیش۔ میں اُس سے کہیں پست تر ہوں جتنا کہتا ہوں۔

جسونت۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ اپنے فائدہ کے لیے تم کسی کو نقصان پہنچاسکو گے۔

رمیش۔ بھائی دنیا میں معیارانہ روش صرف سنیاسی ہی اختیار کرسکتا ہے۔ میں تو نہیں کرسکتا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر تمھیں دھکا دے کر تم سے بازی جیت سکوں تو تمھیں ضرور گرا دوں گا۔ اور بُرا نہ مانو تو کہہ دوں کہ تم بھی مجھے ضرور گرا دوگے۔

خودغرضی کا ترک کرنا مشکل ہے۔

جسونت۔ تو میں کہوں گا کہ تم بھاڑے کے ٹٹو ہو۔

رمیش۔ اور میں کہوں گا کہ تم کاٹھ کے الو۔

(۲)

جسونت اور رمیش ایک ساتھ ہی اسکول میں داخل ہوئے اور ایک ہی ساتھ ڈگریاں لے کر کالج سے نکلے۔ جسونت کسی قدر کم فہم، مگر بلا کا محنتی تھا۔ جس کام کو ہاتھ میں لیتا اس سے چمٹ جاتا اور اُسے پورا ہی کر کے چھوڑتا۔ رمیش تیز تھا مگر کاہل۔ گھنٹہ بھر تک بھی جم کر بیٹھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ ایم ۔ اے تک تو وہ آگے رہا اور جسونت پیچھے، محنت دانائی سے ہارتی رہی۔ لیکن سول سروس میں پانسا پلٹ گیا، جسونت سب کام چھوڑ کر کتابوں سے لگ گیا۔ گھومنا، پھرنا، سیر و تفریح، کھیل تماشے، سرکس تھیٹر، یار دوست سب سے منہ موڑ کر گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا۔ رمیش دوستوں کے ساتھ غپ شپ اُڑاتا اور کرکٹ کھیلتا رہا۔ کبھی کبھی تفریحاً کتابیں بھی دیکھ لیتا۔ شاید اسے یقین تھا کہ اب کے بھی میری تیز فہمی بازی لے جائے گی۔ اکثر جاکر جسونت کو دق کرتا، اس کی کتاب بند کر دیتا، کہتا کیوں جان دے رہے ہو؟ سول سروس کوئی مایۂ نجات تو ہے نہیں جس کے لیے دنیا سے ترکِ تعلق کر لیا جاوے۔ یہاں تک کہ جسونت اُسے آتے دیکھتا تو دروازہ بند کر لیتا۔

آخر امتحان کا دن آپہنچا۔ جسونت نے سب کچھ یاد کیا تھا مگر کسی سوال کا جواب سوچنے لگتا تو اُسے معلوم ہوتا کہ میں نے جتنا پڑھا تھا وہ سب بھول گیا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ رمیش پیشتر سے کچھ سوچنے کا عادی نہ تھا۔ سوچتا کہ جب پرچہ سامنے آوے گا، اس وقت دیکھا جاوے گا۔ وہ خود اعتباری سے پھولا پھولا۔ پھرتا تھا۔

امتحان کا نتیجہ شائع ہوا تو سست کچھوا تیز خرگوش سے بازی مار لے گیا۔

اب رمیش کی آنکھیں کھلیں، مگر وہ مایوس نہ ہوا۔ قابل شخص کے لیے شہرت و دولت کی کمی نہیں، اُسے اس کا یقین تھا۔ اس نے قانونی امتحان کی تیاری شروع کی اور اگرچہ اُس نے زیادہ محنت نہ کی پھر بھی اول درجہ میں پاس ہوا۔ جسونت نے اُس کو مبارک باد کا تار بھیجا۔ وہ اب ایک ضلع کا حاکم ہوگیا تھا۔

(۳)

دس سال گزر گئے۔ جسونت دل و جان سے کام کرتا تھا اور اس کے افسر اُس سے بہت خوش تھے۔ مگر افسر جس قدر خوش تھے، ماتحت اُسی قدر نا خوش رہتے تھے۔ وہ خود جتنی محنت کرتا تھا، ماتحتوں سے بھی اتنی ہی محنت لینا چاہتا تھا۔ خود جتنا بے لوث تھا، ماتحتوں کو بھی اتنا ہی بے لوث بنانا چاہتا تھا۔ ایسے لوگ بڑے کار گزار سمجھے جاتے ہیں جسونت کی کارگزاری کا افسروں پر سکہ جمتا جاتا تھا۔ پانچ ہی سال میں وہ ضلع کا جج بنا دیا گیا۔

رمیش اتنا خوش نصیب نہ تھا۔ وہ جس اجلاس میں وکالت کرنے جاتا وہیں ناکامیاب رہتا۔ حاکم کو وقتِ مقررہ پر آنے میں دیر ہوجاتی تو خود ہی چل دیتا اور پھر بلانے سے بھی نہ آتا۔ کہتا۔ اگر حاکم وقت کی پابندی نہیں کرتا تو میں کیوں کروں؟ مجھے کیا غرض پڑی ہے کہ گھنٹوں اُس کا اجلاس پر کھڑا اُس کی راہ دیکھا کروں؟ بحث اتنی بے خوفی سے کرتا کہ خوشامد پسند حکام کی نگاہوں میں اُس کی یہ بے خوفی گستاخی معلوم ہوتی۔ تحمل اُسے چھو تک نہیں گیا تھا۔ حاکم ہو یا مقابل کا وکیل، جو اُس کے منہ لگتا اُسی کی خبر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار وہ ضلع کے جج سے بھی لڑ بیٹھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی سند چھین لی گئی۔ مگر مؤکلوں کے دل میں اس کی عزت ویسی ہی قائم و برقرار رہی۔

اب اُسے آگرہ کالج میں پروفیسری کا عہدہ مل گیا۔ مگر بدقسمتی نے وہاں بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ پرنسپل سے پہلے ہی روز جھگڑا ہوگیا۔ پرنسپل کا اصول تھا کہ طلباء کو سیاسی اُمور سے علاحد رہنا چاہیے۔ وہ اپنے کالج کے کسی معلّم کو کسی سیاسی جلسوں میں شریک نہ ہونے دیتے۔ رمیش پہلے روز سے اس حکم کی علانیہ مخالفت کرنے گا۔ اس کا قول تھا کہ اگر کسی سیاسی جلسوں میں جانا چاہیے تو طلباء کو۔ یہ بھی اُن کی تعلیم کا ایک جزو ہے۔ دیگر ممالک میں طلباء نے ملکی حالت کو تبدیل کر دیا ہے تو اس ملک میں ان کی زبان کیوں بند کی جاتی ہے؟ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی رمیش کو استعفاء دینا پڑا۔ مگر طلباء پر جو اُس کا اثر تھا اس میں ذرا بھی کمی نہ واقع ہوئی۔

اس طرح کچھ تو اس کے مزاج اور کچھ موجودہ حالات نے رمیش کو مار مار کر حکیم بنا دیا۔ پہلے موکلوں کی طرف ہوکر عدالت سے لڑا، پھر طلباء کی جانب داری کرکے پرنسپل

سے عداوت مول لی اور اب رعایا کا ساتھ دے کر سرکار کو چنوتی دی۔ وہ فطرتاً بے خوف، معیار پرست، راست باز اور خود دار تھا۔ ایسے شخص کے لیے رعایا کا خادم بننے کے سوا اور چارہ کار ہی کیا تھا؟ اخباروں میں واقعات حاضرہ پر اس کے مضامین نکلنے لگے۔ اس کی رائے اتنی صاف، اتنی جامع اور اتنی پُراثر ہوتی تھی کہ جلد ہی اس کی شہرت پھیل گئی۔ لوگ مان گئے کہ اِس فضا میں ایک نئی طاقت کا ظہور ہوا ہے، حکام اس کے مضامین پڑھ کر تلملا اُٹھتے تھے، اُس کا نشانہ اتنا ٹھیک بیٹھتا تھا کہ اُس سے بچنا ناممکن تھا، مبالغے تو اُن کے سروں پر ہوکر بالا بالا نکل جاتے تھے، جو صرف دور ہی سے اُن کا تماشا دیکھ سکتے تھے امور معلومہ کی وہ تحقیر کرسکتے تھے۔ یہ سب ہتھیار اُن کے پاس تک پہنچتے ہی نہ تھے راستے ہی میں گرجاتے تھے۔ مگر رمیش کے نشانے ٹھیک سروں پر بیٹھتے اور حکّام میں تہلکہ اور کہرام برپا کردیتے تھے۔

ملک کی سیاسی حالت نازک ہو رہی تھی۔ جسونت اپنے قدیم دوست کے مضامین کو پڑھ پڑھ کر کانپ اُٹھتے تھے۔ اندیشہ ہوتا تھا کہ وہ کہیں قانون کے زد میں نہ آجائے، بار بار اُسے محتاط رہنے کی تاکید کرتے، بار بار منتیں کرتے کہ ذرا اپنے قلم کو اور نرم کردو اور جان بوجھ کر کیوں قانونی سانپ کے منہ میں انگلی ڈالتے ہو؟ لیکن رمیش کو لیڈری کا نشہ چڑھا ہوا تھا۔ وہ ان باتوں کا جواب تک نہ دیتا تھا۔

پانچویں سال جسونت تبدیل ہوکر آگرہ کالج گیا۔

(۴)

ملک کی سیاسی حالت نازک ہورہی تھی۔ خفیہ پولیس نے ایک طوفان کھڑا کردیا تھا۔ اس کی فرضی داستانیں سُن سُن کر حکام کی روح فنا ہو رہی تھی۔ کہیں اخباروں کا منہ بند کیا جاتا تھا، کہیں رعایا کے لیڈروں کا۔ خفیہ پولیس نے اپنا الّو سیدھا کرنے کے لیے حکام کے اس طرح کان بھرے کہ اُنھیں ہر ایک آزاد خیال شخص خونی اور قاتل نظر آتا تھا۔

رمیش یہ اندھیر دیکھ کر خاموش بیٹھنے والا انسان نہ تھا۔ جیوں جیوں حکام کی خودمختاری بڑھتی جاتی تھی، اس نسبت سے اس کے جوش میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ روز کہیں نہ کہیں لکچر دیتا اور عموماً اُس کے سامنے لکچر باغیانہ جذبات سے مملو ہوتے تھے۔ صاف اور کھری بات کہنا ہی بغاوت ہے۔ اگر کسی کا سیاسی لکچر باغیانہ نہیں سمجھا گیا تو سمجھ لو کہ

اس نے اپنے اندرونی جذبات کو چھپا رکھا ہے۔ اس کے دل میں جو کچھ ہے اُسے زبان پر لانے کی ہمت اس میں نہیں ہے۔ رمیش نے دلی جذبات کو مخفی رکھنا سیکھا ہی نہ تھا۔ رعایا کا لیڈر بن کر جیل اور پھانسی سے ڈرنا کیا؟ جو آفت آنی ہو آوے۔ وہ سب کچھ سہنے کو تیار بیٹھا تھا۔ حکام کی نظروں میں بھی وہی سب سے زیادہ کھٹک رہا تھا۔

ایک روز جسونت نے رمیش کو اپنے یہاں بلا بھیجا۔ رمیش کے جی میں تو آیا کہ کہہ دیں تمھیں آتے کیا شرم آتی ہے؟ آخر ہو تو غلام ہی! لیکن پھر کچھ سوچ کر کہلا بھیجا کہ کل شام کو آؤں گا۔ دوسرے روز وہ ٹھیک چھ بجے جسونت کے بنگلے پر جا پہنچا۔ کسی سے اس کا ذکر نہ کیا۔ کچھ تو خیال تھا کہ لوگ کہیں گے، میں افسروں کی خوشامد کرتا ہوں اور کچھ یہ کہ شاید جسونت کو اس سے کچھ نقصان پہنچے۔

وہ جسونت کے بنگلے پر پہنچا تو چراغ جل چکے تھے۔ جسونت نے آکر اُسے گلے سے لگا لیا۔ آدھی رات تک دونوں دوستوں میں خوب باتیں ہوتی رہیں۔ جسونت نے اتنے دنوں میں ملازمت سے جو تجربے حاصل کیے تھے وہ سب بیان کیے۔ رمیش کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ جسونت کے سیاسی خیالات کتنی ہی باتوں پر میرے خیالات سے بھی زیادہ آزاد ہیں۔ اس کا یہ خیال بالکل غلط نکلا کہ وہ بالکل تبدیل ہوگیا ہوگا، وفاداری کا راگ الاپتا ہوگا۔

رمیش نے کہا۔ بھلے آدمی! جب اتنا جلے ہوئے ہو تو پھر ملازمت ترک کیوں نہیں کردیتے؟ اور کچھ نہ سہی اپنی ضمیر کی پاسداری تو کرسکو گے۔

جسونت۔ میری فکر بعد کو کرنا، اس وقت اپنی فکر کرو۔ میں نے تمھیں ہوشیار کرنے کو بلایا ہے۔ اس وقت سرکار کی نگاہوں میں تم بے طرح کھٹک رہے ہو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں تم گرفتار نہ کرلیے جاؤ۔

رمیش۔ اس کے لیے تو تیار بیٹھا ہوں۔

جسونت۔ آخر آگ میں کودنے سے فائدہ کیا؟

رمیش۔ نفع نقصان دیکھنا میرا کام نہیں۔ میرا کام تو اپنے فرض کو انجام دینا ہے۔

جسونت۔ ضدی تو تم ہمیشہ کے ہو مگر موقع نازک ہے، سنبھلے رہنا ہی اچھا ہے۔ اگر میں دیکھتا کہ عوام میں واقعی بیداری ہے تو تم سے پیشتر میدان میں آتا، مگر جب دیکھتا ہوں کہ اپنے مرنے سے جنت دیکھنا ہے تو آگے قدم رکھنے کی ہمت نہیں پڑتی۔

دونوں دوستوں میں دیر تک گفتگو ہوئی کالج کے دن یاد آئے۔ ہم سبق لوگوں کے لیے کالج کے مشاغل کی قدیم یاد تفریح اور مذاق کا سرچشمہ ہوا کرتی ہے۔ پروفیسروں پر رائے زنی ہوئی۔ کون کون ہم سبق کیا کر رہا ہے، اس کا تذکرہ ہوا۔ بالکل یہی معلوم ہوتا تھا کہ دونوں اب بھی کالج کے لڑکے ہیں، متانت نام کو بھی نہ تھی۔

رات زیادہ ہوگئی۔ کھانا کھاتے کھاتے ایک بج گیا۔ جسونت نے کہا۔ اب کہاں جاؤگے، یہیں سو رہو۔ اور باتیں ہوں۔ تم تو کبھی آتے بھی نہیں۔

رمیش تو رمتا جوگی تھا ہی۔ کھانا کھا کر باتیں کرتے کرتے سوگیا۔ آنکھ کھلی تو نو بج گئے تھے۔ جسونت سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

اُسی رات کو آگرہ میں سنگین ڈاکہ پڑا۔

(۵)

رمیش دس بجے گھر پہنچے تو دیکھا کہ ان کا مکان پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ اُنھیں دیکھتے ہی ایک افسر نے وارنٹ دکھلایا، فوراً گھر کی تلاشی ہونے لگی معلوم نہیں کیوں کر رمیش کے میز کی دراز میں ایک پستول نکل آیا۔ پھر کیا تھا، ہاتھوں میں ہتھکڑی پڑگئی۔ اب کس کو اُن کے ڈاکہ میں شریک ہونے سے انکار ہوسکتا تھا؟ اور بھی کتنے ہی لوگوں پر آفت آئی۔ سبھی خاص خاص لیڈر چن لیے گئے۔ مقدمہ چلایا گیا۔

اوروں کی بات ایشور جانے مگر رمیش بے قصور تھا۔ اس کا اُس کے پاس ایسا زبردست ثبوت تھا، جس کی سچائی سے کسی کو انکار نہ ہوسکتا تھا۔ مگر کیا وہ اس ثبوت سے کام لے سکتا تھا؟

رمیش نے سوچا کہ جسونت خود ہی میرے وکیل کی معرفت صفائی کے گواہوں میں اپنا نام لکھانے کو کہے گا۔ مجھے بے قصور جانتے ہوئے وہ مجھ کو جیل کبھی نہ جانے دے گا۔ وہ اتنا سنگ دل نہیں ہے لیکن دن گزرتے جاتے تھے اور جسونت کی طرف سے اس طرح کی کوئی بات نہ کہی جاتی تھی۔ رمیش کو خود ہی اس کا نام لکھاتے ہوئے پس و پیش ہوتا تھا، نہ جانے اس میں اُسے کیا دقت پیش آوے۔ اپنی بچت کے لیے وہ اُسے تکلیف میں نہ مبتلا کرنا چاہتے تھے۔

جسونت سنگ دل نہ تھے، بے حس بھی نہ تھے۔ لیکن بے عمل ضرور تھے۔ انھیں

اپنے عزیز دوست کے بے قصور مارے جانے پر رنج ہوتا تھا، کبھی کبھی رو دیتے تھے مگر یہ جرأت نہ ہوتی تھی کہ صفائی دے کر اُسے چھُڑا لیں نہ جانے حکام کو کیا خیال ہو۔ کہیں یہ سمجھنے لگیں کہ میں بھی اِن سازش کرنے والوں سے ہمدردی رکھتا ہوں، میرا بھی اُن سے کچھ تعلق ہے۔ یہ میرے ہندوستانی ہونے کی سزا ہے۔ جان بوجھ کر زہر نگلنا پڑ رہا ہے۔ پولیس نے حکام کے دلوں پر ایسا سکہ جما لیا ہے کہ خواہ میری شہادت سے رمیش بری بھی ہوجاوے اور مجھ پر علانیہ کوئی شبہ بھی نہ کیا جاوے مگر یہ خیال دلوں سے کیوں کر دور ہوگا کہ میں نے صرف ایک ہم وطن کی بریت کے لیے جھوٹی شہادت دی؟ اور وہ ہم وطن بھی کون جو بغاوت میں ماخوذ ہے۔

اسی حیص بیص میں ایک مہینہ گزر گیا۔ ادھر مجسٹریٹ نے یہ مقدمہ جسونت ہی کے اجلاس میں بھیج دیا۔ ڈاکہ میں کئی خون ہوگئے تھے اور مجسٹریٹ کو اُتنی سخت سزائیں دینے کا اختیار نہ تھا جتنی اُس کی تجویز میں دی جانی چاہیے تھیں۔

(۶)

جسونت اب بڑے مخمصہ میں پڑا۔ اُس نے چھٹی لینی چاہی۔ لیکن منظور نہ ہوئی۔ سول سرجن انگریز تھا۔ اس وجہ سے اُس کا سارٹیفکٹ لینے کی ہمت نہ پڑی۔ بلا سر پر آپڑی تھی اور اس سے بچنے کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔

قسمت کا اُلٹ پھیر دیکھیے۔ ساتھ کھیلے اور ساتھ پڑھے ہوئے دو دوست ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ صرف ایک کٹگھرا درمیان میں حائل تھا۔ مگر ایک کی جان دوسرے کی مٹھی میں تھی۔ دونوں کی آنکھیں کبھی چار نہ ہوتیں دونوں سر نیچا کیے رہتے تھے۔ اگرچہ جسونت انصاف کنندہ تھا اور رمیش ملزم، مگر واقعی حالت بالکل مختلف تھی۔ جسونت کی آتما ندامت، پشیمانی اور روحانی تکلیف سے تڑپ رہی تھی اور رمیش کا چہرہ معصومیت کی چمک سے منور تھا۔

دونوں دوستوں میں کتنا فرق تھا۔ ایک کتنا فراخ دل تھا، دوسرا کتنا خود غرض۔ رمیش چاہتا تو ابھی عدالت میں اس رات کی بات کہہ دیتا لیکن جسونت جانتا تھا کہ رمیش پھانسی سے بچنے کے لیے بھی اس شہادت کا سہارا نہ لے گا جسے میں مخفی رکھنا چاہتا ہوں۔ جب تک مقدمہ کی پیشیاں ہوتی رہیں، رمیش کو سخت بے چینی محسوس ہوتی رہی۔

اس کے ضمیر اور اس کی خود غرضی میں روزانہ کشمکش ہوتی رہتی تھی۔ مگر فیصلہ کے روز تو اس کی وہی حالت ہو رہی تھی جو کسی قتل کے ملزم کی ہو۔ اجلاس پر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ وہ تین بجے کچہری پہنچا۔ ملزم اپنے قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ رمیش بھی آج ہر روز سے زیادہ اُداس تھا۔ اس کے کارزارِ حیات میں موقع آگیا تھا۔ جب اُس کا سر تلوار کی دھار کے نیچے ہوگا۔ اب تک خوف لطیف شکل میں تھا، آج اُس نے کثیف صورت اختیار کرلی تھی۔

جسونت نے استقلال آمیز لہجے میں فیصلہ سُنایا، جب اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے کہ رمیش چندر کو سات برس کی قید سخت تو اس کا گلا بھر آیا۔ اُس نے تجویز میز پر رکھ دی۔ کرسی پر بیٹھ کر پسینہ پوچھنے لگا، حیا سے اُمڈے ہوئے آنسوؤں کو پونچھا۔ پھر اُس سے آگے وہ اپنے فیصلہ کو نہ پڑھ سکا۔

(۷)

رمیش جیل سے نکل کر پکا انقلاب پسند بن گیا جیل کی تاریک کوٹھری میں تمام دن کی سخت محنت کے بعد، وہ غریبوں کی فلاح اور اصلاح کے منصوبے باندھا کرتا تھا۔ سوچتا کہ انسا کیوں گناہ کرتا ہے؟ اس لیے نہ کہ دنیا میں اس قدر افتراق ہے۔ کوئی عالیشان محلوں میں رہتا ہے اور کسی کو درخت کا سایہ بھی میسر نہیں۔ کوئی ریشم و جواہرات سے منڈھا ہوا ہے، کسی کو پھٹا کپڑا بھی نصیب نہیں۔ ایسی بے انصاف دنیا میں اگر چوری، ہتیا اور اَدھرم ہے تو یہ کس کا قصور ہے؟ وہ ایک ایسی انجمن قائم کرنے کا خواب دیکھتا تھا جس کا کام دنیا سے اس افتراق کو ناپید کردینا ہو۔ دنیا سب کے لیے ہے اور اس میں سب کو راحت و آرام سے بسر کرنے کا مساوی حق ہے۔ نہ ڈاکہ، ڈاکہ ہے، نہ چوری، چوری۔ دولت مند اگر اپنی دولت کو خوشی سے نہیں بانٹ دیتا تو اس کی مرضی کے خلاف تقسیم کرلینے میں کیا گناہ؟ دولت مند اُسے گناہ کہتا ہے تو کہے۔ اس کا بنایا ہوا قانون اگر سزا دینا چاہتا ہے تو دے۔ ہماری عدالت بھی علاحدہ ہوگی۔ اس کے سامنے وہ سبھی لوگ ملزم ہوں گے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ راحت کے سامان ہیں۔ ہم بھی انھیں سزا دیں گے ہم بھی اُن سے سخت محنت لیں گے۔ جیل سے نکلتے ہی اُس نے اُسی جماعتی انقلاب کا اعلان کردیا۔ خفیہ انجمن قائم ہونے لگی، ہتھیار جمع کیے جانے لگے اور چند ہی روز بعد ڈاکہ کا بازار گرم ہوگیا۔

پولیس نے اُن کا سراغ لگانا شروع کیا۔ ادھر انقلاب پسندوں نے پولیس پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ اُن کی طاقت روز بروز بڑھنے لگی مگر سارا کام اتنی ہوشیاری سے ہوتا تھا کہ کسی کو ملزموں کا کچھ سراغ نہ ملتا۔ رمیش کہیں غربا کے لیے دواخانے کھولتا۔ کہیں بینک، ڈاکہ کے روپے سے اُس نے علاقے خریدنے شروع کیے۔ جہاں کوئی علاقہ نیلام ہوتا وہ اُسے فوراً خرید لیتا۔ تھوڑے دنوں میں اس کے پاس ایک بڑی جائداد ہوگئی۔ اُس کا نفع صرف غرباء کی امداد میں صرف ہوتا تھا۔ طرفہ یہ کہ سبھی کو معلوم تھا کہ یہ رمیش کی کرامات ہے مگر کسی کو منہ کھولنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ مہذب جماعت کے نگاہوں میں رمیش سے زیادہ قابلِ نفرت اور کوئی شخص ساری دنیا میں نہ تھا۔ لوگ اس کا نام سن کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ شاید اُسے پیاسا مرتا دیکھ کر کوئی ایک قطرہ پانی بھی اس کے حلق میں نہ ٹپکاتا، لیکن کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے کاموں پر علانیہ اعتراض کرسکے۔

اِس طرح کئی سال گزر گئے۔ سرکار نے ڈاکوؤں کا پتا لگانے کے لیے بڑے بڑے انعامات مشتہر کیے۔ یورپ سے خفیہ پولیس کے ہوشیار آدمیوں کو بلاکر اس کام پر تعینات کیا گیا۔ لیکن غضب کے ڈاکو تھے جن کی حکمتوں کے آگے کسی کی کچھ نہ چلتی تھی۔

مگر رمیش خود اپنے اصولوں پر عامل نہ رہ سکا۔ جیوں جیوں دن گزرتے تھے اُسے احساس ہوتا تھا۔ میرے مقلدوں میں بے اطمینانی بڑھ رہی ہے۔ اُن میں بھی جو زیادہ ہوشیار اور جری تھے وہ دوسروں پر رعب جماتے اور مالِ غنیمت میں. برابر کا حصہ نہ دیتے تھے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ رمیش سے بھی جلنے لگے وہ اب شاہانہ تزک و احتشام سے رہتا تھا لوگ کہتے کہ اُسے ہماری کمائی میں یوں تصرف کرنے کا کیا حق ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپس میں پھوٹ پڑگئی۔

رات کا وقت تھا، سیاہ گھٹا چھائی ہوئی تھی، آج ڈاک گاڑی میں ڈاکہ پڑنے والا تھا۔ پروگرام پیشتر سے تیار کر لیا گیا تھا۔ پانچ بہادر نوجوان اس کام کے لیے منتخب کیے گئے۔

دفعتاً ایک جوان نے کھڑے ہوکر کہا۔ آپ بار بار مجھی کو کیوں چنتے ہیں؟ حصہ لینے والے تو سبھی ہیں، میں ہی کیوں اپنی جان کو بار بار جوکھم میں ڈالوں؟

رمیش نے استقلال سے کہا۔ یہ تجویز کرنا میرا کام ہے کہ کون کہاں بھیجا جاوے تمھارا کام صرف میرے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔

جوان۔ اگر مجھ سے کام زیادہ لیا جاتا ہے تو مجھے حصہ بھی کیوں زیادہ نہیں دیا جاتا؟

رمیش نے اُس کے تیور دیکھے اور چپکے سے پستول ہاتھ میں لے کر بولے۔ اس کا فیصلہ وہاں سے لوٹنے پر ہوگا۔

جوان۔ میں جانے سے پہلے اس کا فیصلہ چاہتا ہوں۔

رمیش نے اس کا جواب نہ دیا۔ وہ پستول سے اس کا کام تمام کردینا چاہتے ہی تھے کہ وہ فوراً کھڑکی سے نیچے کود پڑا اور بھاگا۔ کود پھاند میں کوئی اس کا ثانی نہ تھا۔ چلتی ریل گاڑی سے کود پڑنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

وہ وہاں سے سیدھا خفیہ پولیس کے افسر کے پاس پہنچا۔

(۸)

جسونت نے بھی پنشن لے کر وکالت شروع کی تھی۔ عدالت کے سبھی لوگوں سے اُن کا تعارف تھا۔ اُن کی وکالت بہت جلد چمک اُٹھی۔ جسونت کے پاس لاکھوں روپے تھے۔ انھیں پنشن بھی کثیر ملتی تھی۔ وہ چاہتے تو گھر بیٹھے خوشی سے زندگی کے بقیہ دن بسر کردیتے۔ ملک و قوم کی کچھ خدمت کرنی بھی اُن کے لیے مشکل نہ تھی۔ ایسے ہی لوگوں سے بے غرضانہ خدمت کی امید کی جاسکتی ہے۔ مگر جسونت نے ساری عمر روپیہ کمانے ہی میں گزاری تھی۔ اور اب کوئی ایسا کام نہ کرسکتے تھے جس کا ثمرہ روپے کی صورت میں نہ ملے۔

یوں تو سبھی مہذب لوگ رمیش سے نفرت کرتے تھے۔ لیکن جسونت سب سے بڑھا ہوا تھا۔ کہتا تھا کہ اگر کبھی رمیش پر مقدمہ چلے گا تو میں بلا فیس کے سرکار کی طرف سے پیروی کروں گا۔ علانیہ رمیش پر طعنہ زنی کیا کرتا۔ یہ آدمی نہیں، شیطان ہے۔ دیو ہے، ایسے آدمی کا تو منہ نہ دیکھنا چاہیے اُف اس کے ہاتھوں کتنے بھلے گھروں کا ستیاناس ہوگیا، کتنے بھلے آدمیوں کی جانیں گئیں۔ کتنی عورتیں بیوہ ہوگئیں، کتنے بچّے یتیم ہوگئے! آدمی نہیں بھوت ہے! میرا بس چلے تو اُسے گولی مار دوں، جیتا چنوا دوں۔

(۹)

سارے شہر میں غوغا مچا ہوا تھا۔ رمیش بابو پکڑ لیے گئے۔ بات سچّی تھی رمیش سچ مچ گرفتار ہوگیا تھا، اسی شخص نے جو رمیش کے سامنے سے کود کر بھاگا تھا، پولیس کے افسر

سے سارا ماجرا من و عن بیان کردیا تھا۔ استحصال بالجبر اور قتل کی کیسی پُرمعصیت کیسی شیطنیت آمیز اور کیسے رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان تھی۔

مہذب جماعت بغلیں بجاتی تھی۔ سیٹھوں کے مکانوں میں گھی کے چراغ جلتے تھے۔ اُن کے سروں پر شمشیر برہنہ لٹکتی رہتی تھی، آج وہ ہٹ گئی تھی۔ اب وہ خواب شیریں کے مزے اُٹھا سکتے تھے۔

اخباروں میں رمیش کے ہتھکنڈے چھپنے لگے۔ وہ باتیں جو اب تک خوف کے سبب سے کسی کی زبان پر نہ آتی تھیں۔ اب اخبارات میں شائع ہونے لگیں۔ اُنھیں پڑھ کر پتہ چلتا تھا کہ رمیش نے کتنا اندھیر مچا رکھا تھا۔ کتنے ہی راجے اور رؤساء اس کو ماہوار ٹیکس دیا کرتے تھے۔ اس کا پُرزہ پہنچتا کہ فلاں تاریخ کو اتنے روپے بھیج دو، پھر کس کی مجال تھی کہ اس کی حکم عدولی کرسکے؟ وہ عوام کے فائدے کے لیے جو کام کرتا تھا اس کے لیے بھی امراء سے چندے لیے جاتے تھے۔ رقم لکھنا رمیش کا کام تھا۔ امراء کو بلا چوں و چرا وہ رقمیں دے دینی پڑتی تھیں۔

لیکن مہذّب سوسائٹی ہی خوش تھی، عوام اسی قدر غمگین تھے۔ اب کون پولیس والوں کے مظالم سے اُن کی حفاظت کرے گا؟ کون سیٹھوں کے دست درازیوں سے انھیں بچائے گا؟ کون ان کے لڑکوں کے لیے صنعت و حرفت کے مدرسے کھولے گا؟ وہ اب کس کے بل پر کودیں گے؟ وہ اب بے یار و مددگار تھے وہی اُن کا سہارا تھا۔ اب وہ کس کا منہ تاکیں گے؟ کس کو اپنی فریاد سنائیں گے؟

پولیس شہادتیں جمع کر رہی تھی۔ سرکاری وکیل زوروں سے مقدمہ چلانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ لیکن رمیش کی جانب سے وکیل نہ کھڑا ہوتا تھا۔ سارے ضلع میں ایک ہی شخص تھا جو اسے قانونی پنجہ سے چھڑا سکتا تھا۔ وہ تھا جسونت، لیکن جس کے نام سے کانوں پر انگلی رکھتا تھا کیا اس کی وکالت کرنے کھڑا ہوگا؟ ناممکن!

رات کو نو بجے تھے۔ جسونت کے کمرے میں ایک عورت داخل ہوئی۔ جسونت اخبار پڑھ رہا تھا۔ بولا کیا چاہتی ہو؟

عورت۔ اپنے شوہر کے لیے ایک وکیل۔

جسونت۔ تمھارا شوہر کون ہے؟

عورت۔ وہی جو آپ کے ساتھ پڑھتا تھا اور جس پر ڈاکہ کا جھوٹا مقدمہ چلایا جانے والا ہے۔

جسونت نے چونک کر پوچھا۔ تم رمیش کی بیوی ہو؟

عورت۔ ہاں۔

جسونت۔ میں اُن کی وکالت نہیں کر سکتا؟

عورت۔ آپ کو اختیار ہے۔ آپ اپنے ضلع کے آدمی ہیں، میرے شوہر کے دوست بھی رہ چکے ہیں۔ اس لیے سوچا تھا، کیوں باہر والوں کو بلاؤں۔ مگر اب الہ آباد یا کلکتہ سے ہی کسی کو بلاؤں گی۔

جسونت۔ محنتانہ نہ دے سکو گی؟

عورت نے فخر سے کہا۔ بڑے سے بڑے وکیل کا محنتانہ کیا ہوتا ہے؟

جسونت۔ تین ہزار روپے روزانہ۔

عورت۔ بس آپ اس مقدمہ کو لے لیں، میں آپ کو تین ہزار روپے روزانہ دوں گی۔

جسونت۔ تین ہزار روپے روزانہ؟

عورت۔ ہاں، اور اگر آپ نے اُن کو چھڑا لیا تو پچاس ہزار روپے آپ کو شکرانہ کے طور پر اور دوں گی۔

جسونت کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اگر مقدمہ دوماہ بھی چلا تو کم ازکم ایک لاکھ روپے سیدھے ہوجائیں گے۔ شکرانہ اوپر سے ! پورے دو لاکھ کی گوڑی ہے۔ اتنی دولت تو ساری عمر میں بھی جمع نہ کرپائے تھے، مگر دُنیا کیا کہے گی؟ اپنا ضمیر بھی تو نہیں اجازت دیتا۔ ایسے شخص کو قانون کے پنجہ سے چھڑانا بے شمار آدمیوں کا خون کرنا ہے۔ لیکن دو لاکھ کا معاملہ ہے۔ کچھ رمیش سزا یاب ہوجانے سے اس جماعت کا خاتمہ تو ہوا نہیں جاتا اس کے چیلے تو رہیں گے ہی۔ شاید وہ اب اور بھی ہنگامہ برپا کریں۔ پھر میں دو لاکھ کی گوڑی کیوں جانے دوں؟ لیکن مجھے کہیں منہ دکھانے کی جگہ نہ رہے گی۔ نہ سہی۔ جس کا جی چاہے خوش ہو، جس کا جی چاہے ناراض۔ یہ دو لاکھ تو نہیں چھوڑے جاتے، کچھ میں کسی کا گلا تو دباتا نہیں، چوری تو کرتا نہیں۔ ملزموں کا بچانا تو میرا فرضِ منصبی ہے؟

دفعتاً عورت نے پوچھا۔ آپ کیا جواب دیتے ہیں؟

جسونت۔ میں کل جواب دوں گا۔ ذرا سوچ لوں۔
عورت۔ نہیں مجھے اتنی فرصت نہیں ہے۔ اگر آپ کو کچھ اُلجھن ہو تو صاف صاف کہہ دیجیے۔ میں دوسرا بند و بست کروں۔

جسونت کو زیادہ سوچنے کا موقع نہ ملا۔ جلدی کا فیصلہ اپنے ہی فائدہ کی جانب جھکتا ہے۔ یہاں نقصان کا امکان نہیں ہوتا۔

جسونت۔ آپ کچھ روپے پیشگی دے سکتی ہیں؟
عورت۔ روپیوں کا مجھ سے بار بار ذکر نہ کیجیے۔ ان کی جان کے سامنے روپے کی ہستی کیا ہے؟ آپ جتنی رقم چاہیں مجھ سے لے لیں۔ آپ چاہے اُنھیں چھڑا نہ سکیں۔ مگر سرکار کے دانت ضرور کھٹے کردیں؟
جسونت۔ میں ہی وکیل ہوجاؤں گا۔ کچھ پُرانی دوستی کا نباہ بھی تو کرنا چاہیے۔

(۱۰)

پولیس نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ سینکڑوں شہادتیں پیش کیں۔ مخبر نے تو پوری داستان ہی سُنا دی۔ لیکن جسونت نے کچھ ایسی دلیلیں کیں۔ شہادتوں کو کچھ اس طرح لغو ثابت کیا اور مخبر کی کچھ ایسی خبر لی کہ رمیش بے داغ چھوٹ گئے۔ اُن پر کوئی جرم نہ ثابت ہوسکا۔ جسونت جیسے محتاط اور دانا وکیل کا اُن کی پیروی میں کھڑا ہوجانا ہی اس امر کا ثبوت تھا کہ سرکار نے غلطی کی۔

شام کا وقت تھا۔ رمیش کے دروازے پر شامیانہ لگا ہوا تھا۔ غرباء کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ دوستوں کی دعوت ہو رہی تھی۔ یہ رمیش کی رہائی کا جشن تھا۔ جسونت کا چاروں طرف سے شکریہ ادا کیا جا رہا تھا۔ رمیش کو مبارک باد دیا جا رہا تھا۔ جسونت بار بار رمیش سے بولنا چاہتا تھا، مگر رمیش اس کی جانب سے منہ پھیر لیتے تھے۔ اب تک اُن دونوں میں ایک بات بھی نہ ہوئی تھی۔

آخر جسونت نے ایک بار جھنجھلاکر کہا۔ تم تو مجھ سے اس طرح اینٹھے ہوئے ہو۔ جیسے میں نے تمھارے ساتھ کوئی برائی کی ہے۔
رمیش۔ اور آپ کیا سمجھتے ہیں کہ میرے ساتھ بھلائی کی ہے؟
پہلے آپ نے میری دنیا بگاڑی تھی۔ اب کی میری عاقبت بگاڑی، پہلے معاف کیا ہوتا

تو میری زندگی سدھر جاتی۔ اور اب جیل جانے دیتے تو عاقبت بن جاتی۔
جسونت۔ یہ تو نہ کہو گے کہ مجھے اس معاملہ میں کتنی ہمت سے کام لینا پڑا۔
رمیش۔ آپ نے ہمت سے کام لیا۔ خودغرضی سے کام لیا۔ آپ اپنی غرض کے معتقد ہیں۔
میں تو آپ کو بھاڑے کا ٹٹو سمجھتا ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بہت بڑا استعمال کیا،
لیکن اُسے آپ کی زندگی سے تبدیل کرنے کو کسی حالت میں بھی تیار نہیں ہوں،
آپ مجھ سے شکریہ کی امید نہ رکھیں۔

یہ افسانہ پہلی بار 'مادھوری' کے جولائی 1925 میں شائع ہوا۔ ہندی میں مان سروور 3 اور اردو مجموعہ 'فردوسِ خیال' میں شامل ہے۔

ماتا کا ہردے

مادھوی کی آنکھوں میں سارا سنسار اندھیرا ہو رہا تھا۔ کوئی اپنا مددگار نہ دکھائی دیتا تھا۔ کہیں آشا کی جھلک نہ تھی۔ اس نردھن گھر میں وہ اکیلی پڑی روتی تھی۔ اور کوئی آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔ اس کے پتی کو مرے ہوئے۔ ۲۲ ورش ہوگئے تھے۔ گھر میں کوئی سمپتی نہ تھی۔ اس نے نہ جانے کس تکلیفوں سے اپنے بچّے کو پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ وہی جوان بیٹا آج اس کی گود سے چھین لیا گیا تھا اور چھیننے والے کون تھے! اگر مرتیو نے چھینا ہوتا تو وہ صبر کرتی۔ موت سے کسی کو دویش (بیر) نہیں ہوتا۔ مگر سوارتھیوں کے ہاتھوں یہ اتیاچار اسہائے (ناقابل برداشت) ہورہا تھا۔ اس گھور سنتاپ (گہرے غم) کی دشا (حالت) میں اس کا جی رہ رہ کر اتنا وِکل (بے تاب) ہوجاتا کہ اسی سمئے چلوں اور اس اتیاچاری سے اس کا بدلہ لوں جس نے اس پر یہ نِشٹھر آگھات کیا ہے۔ ماروں یا مرجاؤں۔ دونوں ہی میں سنتوش ہوجائے گا۔ کتنا سندر، کتنا ہونہار بالک تھا! یہی اس کے پتی کی نشانی، اس کے جیون کا آدھار، اس کی عمر بھر کی کمائی تھی۔ وہی لڑکا اس وقت جیل میں پڑا نہ جانے کیا کیا تکلیفیں جھیل رہا ہوگا۔ اور اس کا اپرادھ کیا تھا؟ کچھ نہیں۔ سارا محلّہ اس پر جان دیتا تھا۔ ودھیالہ کے ادھیاپک اس پر جان دیتے تھے۔ اپنے بیگانے سبھی تو اسے پیار کرتے تھے۔ کبھی اس کی کوئی شکایت سننے ہی میں نہیں آئی۔ ایسے بالک کی ماتا ہونے پر انیہ ماتائیں اسے بدھائی دیتی تھیں۔ کیسا سجن، کیسا اُدار، کیسا پرمارتھی (سچّا)! خود بھوکوں سو رہے مگر کیا مجال کہ دوار پر آنے والے اتیتھی کو روکھا جواب دے۔ ایسا بالک کیا اس یوگیہ تھا کہ جیل میں جاتا۔ اس کا اپرادھ یہی تھا، وہ کبھی کبھی سننے والوں کو اپنی دکھی بھائیوں کا دکھڑا سنایا کرتا تھا۔ اتیاچار سے پیڑت پرانوں کی مدد کے لیے ہمیشہ تیار رہتا تھا۔ کیا یہی اس کا اپرادھ تھا؟ دوسروں کی سیوا کرنا بھی اپرادھ ہے؟ کسی اتیتھی کو آشرئے دینا بھی اپرادھ ہے؟

اس یووک کا نام آتمانند تھا۔ دُربھاگیہ وش اس میں وے سبھی سدگن (اچھائیاں) تھے جو جیل کا دوار کھول دیتے ہیں۔ وہ نربھیک (نڈر) تھا، اسپشٹ وادی (صاف) تھا، ساہسی

(حوصلہ مند) تھا، سودیش پریمی تھا، نہ سوارتھ (بے غرض) تھا۔ کرتویہ پرائینا (فرائض اور ذمہ داریوں کو پورا کرنے والا) تھا۔ جیل جانے کے لیے انہی گنوں کی ضرورت ہے۔ سوادھین (آزاد) پرانیوں کے لیے وے گن سورگ کے دوار کھول دیتے ہیں، پرادھینوں (غلاموں) کے لیے نرک کے! آتمانند کے سیوا کاریہ (خدمت) نے، اس کی وکترتاؤں (تقریروں) نے اور اس کے راجنتک لیکھوں (سیاسی مضامین) نے اسے سرکاری کرمچاریوں کی نظروں میں چڑھا دیا تھا۔ سارا پولیس وبھاگ نیچے سے اوپر تک اس سے سترک (ہوشیار) رہا کرتا تھا۔ سب کی نگاہیں اسی پر لگی رہتی تھیں۔ آخر ضلع میں ایک بھینکر ڈاکے نے انھیں اِچھتا اوسر پردان (خواہش کے مطابق موقع عطا) کردیا۔ آتمانند کے گھر کی تلاشی ہوئی، کچھ پتر اور لیکھ ملے، جنھیں پولیس نے ڈاکے کا بیجک سدھ کیا۔ لگ بھگ ۲۰ یووکوں کی ایک ٹولی پھانس لی گئی۔ آتمانند اس کا مکھیا ٹھہرایا گیا شہادتیں ہوئیں۔ اس بے کاری اور گرانی کے زمانے میں آتما سے زیادہ سستی اور کون وستو ہوسکتی ہے! بیچنے کو اور کسی کے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ نام ماتر کا پرلوبھن دے کر اچھی سی اچھی شہادتیں مل سکتی ہیں، اور پولیس کے ہاتھ پڑکر تو نکرشٹ سے نکرشٹ گواہیاں بھی دیویای کا مہتو (اہمیت) پراپت کرلیتی ہیں۔ شہادتیں مل گئیں، مہینے بھر تک مقدمہ چلا، مقدمہ کیا چلا ایک سوانگ چلتا رہا اور سارے ابھیکتوں (ملزموں) کو سزائیں دے دی گئیں۔ آتمانند کو سب سے کٹھور دنڈ ملا ے ورش کا کٹھن کاراواس! مادھوی روز کچہری جاتی، ایک کونے میں بیٹھی ساری کارروائی دیکھا کرتی۔ مانوی چرتر (پُرشکوہ کردار) کتنا دُربل، کتنا نردئے، کتنا نیچ ہے، اس کا اسے اب تک انومان بھی نہ ہوا تھا۔ جب آتمانند کو سزا سنا دی گئی اور وہ ماتا کو پرنام کرکے سپاہیوں کے ساتھ چلا تو مادھوی مورچھت ہوکر زمین پر گر پڑی۔ دو چار دیالو سجنوں نے اسے ایک تانگے پر بیٹھا کر گھر تک پہنچایا۔ جب سے وہ ہوش میں آئی ہے اس کے ہردئے میں شول سا اُٹھ رہا ہے۔ کسی طرح دھیریہ نہیں ہوتا۔ اس گھور آتم ویدنا کی دشا (سخت تکلیف کی حالت) میں اب اپنے جیون کا کیول ایک لکشے (مقصد) دکھائی دیتا ہے اور وہ اس اتیاچار کا بدلہ ہے۔

اب تک پتر اس کی جیون کا آدھار تھا۔ اب شترو سے بدلہ لینا ہی اس کے جیون کا آدھار ہوگا۔ جیون میں اب اس کے لیے کوئی آشا نہ تھی۔ اس اتیاچار کا بدلہ لے کر وہ اپنا جنم سپھل (کامیاب) سمجھے گی۔ اس ابھاگے نرپشاچ (مردنما شیطان) باگچی نے جس طرح

اسے رکت کے آنسو رُلائے ہیں اسی بھانتی یہ بھی اسے رُلائے گی۔ ناری ہردئے کومل ہے، لیکن کیول انوکول دشا میں، جس دشا میں پُروش دوسروں کو دباتا ہے، استری شیل اور وِنے کی دیوی ہوجاتی ہے۔ لیکن جس کے ہاتھوں اپنا سروناش ہوگیا اس کے پرتی استری کی پروش سے کم گھرِنا اور کرودھ نہیں ہوتا ہے۔ انتر اتنا ہی ہے کہ پُروش شستروں سے کام لیتا ہے، استری کوشل (مہارت) سے۔

رات بھیگتی جاتی تھی اور مادھوی اُٹھنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اس کا دکھ پرتی کار (بدلہ) کے آویش میں ولین (حل) ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس کے سوا اسے اور کسی بات کی یاد ہی نہ رہی۔ اس نے سوچا کیسے یہ کام ہوگا۔ کبھی گھر سے نہیں نکلی۔ ویدھویہ کے ۲۲ سال اس گھر میں کٹ گئے، لیکن اب نکلوں گی۔ زبردستی نکلوں گی، بھیکارن بنوں گی، ٹہلنی بنوں گی، جھوٹ بولوں گی، سب کوکرم کروں گی۔ ست کرم کے لیے سنسار میں استھان نہیں۔ ایشور نے نراش ہوکر کداچت اس کی اُور سے منہ پھیر لیا ہے۔ جبھی تو یہاں ایسے ایسے اتیاچار ہوتے ہیں اور پاپیوں کو دنڈ نہیں ملتا۔ اب انھیں ہاتھوں سے اسے دنڈ دوں گی۔

(۲)

سندھیا کا سمئے تھا کہ لکھنؤ کے ایک سجے ہوئے بنگلے میں مِتروں کی محفل سجی ہوئی تھی۔ گانا بجانا ہو رہا تھا۔ ایک طرف آتشبازیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسرے کمرے میں میزوں پر کھانا چنا جا رہا تھا۔ چاروں طرف پولیس کے کرمچاری نظر آتے تھے۔ وہ پولیس کے سپرٹینڈنٹ مسٹر باگچی کا بنگلہ ہے۔ کئی دن ہوئے انھوں نے ایک معرکے کا مقدمہ جیتا تھا۔ افسروں نے خوش ہوکر ان کی ترقی کردی تھی۔ اور اسی کی خوشی میں یہ اتسو منایا جا رہا تھا۔ یہاں آئے دن ایسے اتسو ہوتے رہتے تھے۔ مفت کے گویے مِل جاتے تھے، مفت کی آتش بازی، پھل اور میوے اور مٹھائیاں آدھے داموں پر بازار سے آجاتی تھیں اور چٹ دعوت ہوجاتی تھی۔ دوسروں کے جہاں سو لگتے، وہاں ان کا دس میں کام چل جاتا تھا۔ دوڑ دھوپ کرنے کو سپاہیوں کی فوج تھی ہی۔ اور یہ معرکے کا مقدمہ کیا تھا؟ وہ جس میں نراپرادھ (بے جرم) یووکوں کو بناوٹی شہادت سے جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

گانا سماپت ہونے پر لوگ بھوجن کرنے بیٹھے۔ بے گار کے مزدور اور پلّے دار جو بازار سے دعوت اور سجاوٹ کے سامان لائے تھے، روتے یا دل میں گالیاں دیتے چلے گئے

تھے، پر ایک بڑھیا ابھی تک دوار پر کھڑی ہوئی تھی۔ اتیہ مزدوروں کی طرح وہ جھنجھنا کر کام نہ کرتی تھی۔ حکم پاتے ہی خوش دل مزدور کی طرح دوڑ دوڑ کر حکم بجا لاتی تھی۔ یہ مادھوی تھی، جو اس سمئے مجورنی کا ویش دھارن کر کے اپنا گھاتک سنکلپ پورا کرنے آئی تھی۔

مہمان چلے گئے۔ محفل اُٹھ گئی۔ دعوت کا سامان سمیٹ دیا گیا چاروں اُور سناٹا چھا گیا، لیکن مادھوی ابھی تک یہیں بیٹھی تھی۔

سہسا مسٹر باگچی نے پوچھا۔ بڈھی تو یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ تجھے کچھ کھانے کو مل گیا؟

مادھوی۔ ہاں جوُر مل گیا۔

باگچی۔ تو جاتی کیوں نہیں؟

مادھوی۔ کہاں جاؤں سرکار، میرا کوئی گھردوار تھوڑے ہی ہے۔ حکم ہو تو یہیں پڑی رہوں۔ پاؤ بھر آٹے کی پروستی ہو جائے ہجور۔

باگچی۔ نوکری کرے گی؟

مادھوی۔ کیوں نہ کروں گی سرکار، یہی تو چاہتی ہوں۔

باگچی۔ لڑکا کھلا سکتی ہے؟

مادھوی۔ ہاں ہجور، یہ میرے من کا کام ہے۔

باگچی۔ اچھی بات ہے۔ تو آج ہی سے رہ۔ جا گھر میں دیکھ، جو کام بتائے وہ کر۔

(۳)

ایک مہینہ گزر گیا۔ مادھوی اتنا تن من سے کام کرتی ہے کہ سارا گھر اس سے خوش ہے۔ بہو جی کا مزاج بہت چڑچڑا ہے۔ وہ دن بھر کھاٹ پر پڑی رہتی ہیں اور بات بات پر نوکروں پر جھلایا کرتی ہیں۔ لیکن مادھوی ان کی گھڑکیوں کو بھی سہرش (خوشی سے) سہہ لیتی ہے۔ اب تک مشکل سے کوئی دائی ایک سپتاہ سے ادھک نہ ٹھہری تھی۔ مادھوی ہی کا کلیجہ ہے۔ جلی کٹی سن کر بھی مکھ پر میل نہیں آنے دیتی۔

مسٹر باگچی کے کئی لڑکے ہو چکے تھے، پر یہی سب سے چھوٹا بچہ بچ رہا تھا۔ بچے پیدا تو ہشٹ پشٹ (تندرست) ہوتے، کنتو جنم لیتے ہی انھیں اک نہ اک روگ لگ جاتا تھا اور کوئی دو چار مہینے، کوئی سال بھر جی کر چل دیتے تھے۔ ماں باپ دونوں اس ششو (بچّے) پر

پران(جان) دیتے تھے۔ اسے ذرا زکام بھی ہو تو دونوں وکل ہوجاتے۔ استری پروش دونوں شکشت (تعلیم یافتہ) تھے، پر بچّے کی رکھشا کے لیے ٹونا ٹوٹکا، دُعا تعویذ جنتر منتر ایک سے بھی انھیں انکار نہ تھا۔

مادھوی سے یہ بالک اتنا ہل گیا کہ ایک چھن کے لیے بھی اس کی گود سے نہ اُترتا۔ وہ کہیں ایک چھن کے لیے چلی جاتی تو رو رو کر دنیا سر پر اُٹھا لیتا۔ وہ سلاتی تو سوتا، وہ دودھ پلاتی تو پیتا، وہ کھیلاتی تو کھیلتا، اسی کو وہ اپنی ماں سمجھتا۔ مادھوی کے سوا اس کے لیے سنسار میں اور کوئی اپنا نہ تھا۔ باپ کو تو وہ دن بھر میں کیول دوچار بار دیکھتا اور سمجھتا یہ کوئی پردیسی آدمی ہے۔ ماں آلسیہ اور کمزوری کے مارے گود میں لے کر ٹہل نہ سکتی تھی۔ اسے وہ اپنی رکشا کا بھار سنبھالنے کے یوگیہ نہ سمجھتا تھا، اور نوکر چاکر اسے گود میں لیتے تو اتنی بیدردی سے کہ اس کے کومل انگوں میں پیڑا ہونے لگتی تھی۔ کوئی اسے اوپر اچھال دیتا تھا، یہاں تک کہ ابودھ شِشو کا کلیجہ منہ کو آجاتا تھا۔ ان سبھوں سے وہ ڈرتا تھا۔ کیول مادھوی تھی جو اس کے سوبھاؤ کو سمجھتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کب کیا کرنے سے بالک پرسن ہوگا۔ اس لیے بالک کو بھی اس سے پریم تھا۔

مادھوی نے سمجھا تھا، یہاں کنچن برستا ہوگا، لیکن اسے دیکھ کر کتنا وسمے (افسوس) ہوا کہ بڑی مشکل سے مہینے کا خرچ پورا پڑتا ہے۔ نوکروں سے ایک ایک پیسے کا حساب لیا جاتا تھا، او بہودھا (اکثر) آوشیک وستویں (ضروری چیزیں) بھی ٹال دی جاتی تھیں۔ ایک دن مادھوی نے کہا۔ بچے کے لیے کوئی تیز گاڑی کیوں نہیں منگوا دیتی۔ گود میں اس کی باڑھ ماری جاتی ہے۔

مسز باگچی نے کنٹھت ہوکر کہا۔ کہاں سے منگوا دوں؟ کم سے کم ۵۰ ۔ ۶۰ روپے میں آئے گی۔ اتنے روپے کہاں ہیں؟

مادھوی۔ مالکن، آپ بھی ایسا بات کہتی ہیں!

مسز باگچی۔ جھوٹ نہیں کہتی۔ بابو جی کو پہلی استری سے پانچ لڑکیاں اور ہیں۔ سب اس سمئے الہ آباد کے ایک اسکول میں پڑھ رہی ہیں۔ بڑی کی عمر ۱۵ ۔ ۱۶ ورش سے کم نہ ہوگی۔ آدھا ویتن (تنخواہ) تو ادھر ہی چلا جاتا ہے۔ پھر ان کی شادی کی بھی تو فکر ہے۔ پانچوں کے وواہ میں کم سے کم ۲۵ ہزار لگیں گے۔ اتنے روپے کہاں سے

آئیں گے۔ میں چنتا کے مارے مری جاتی ہوں۔ مجھے کوئی دوسری بیماری نہیں ہے کیول یہی چنتا کا روگ ہے۔

مادھوی۔ گھوس (رشوت) بھی تو ملتی ہے۔

مسزباگچی۔ بوڑھا، ایسی کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔ یہی کیوں، سچ پوچھو تو اسی گھوس نے ہماری درگتی (بُری حالت) کر رکھی ہے۔ کیا جانے اوروں کو کیسے ہضم ہوتی ہے۔ یہاں تو جب ایسے روپے آتے ہیں تو کوئی نہ کوئی نقصان بھی اوشئے ہوجاتا ہے۔ ایک آتا ہے تو دو لے کر جاتا ہے۔ بار بار منع کرتی ہوں، حرام کی کوڑی گھر میں نہ لایا کرو، لیکن میری کون سنتا ہے۔

بات یہ تھی کہ مادھوی کو بالک سے اسنہہ ہوتا جاتا تھا۔ اس کے امنگل کی کلپنا (برائی کا تصور) بھی وہ نہ کرسکتی تھی۔ اب اسی کی نیند سوتی اور اسی کی نید جاگتی تھی۔ اپنے سروناش کی بات یاد کرکے ایک چھن کے لیے اسے باگچی پر کرودھ تو ہو آتا تھا اور گھاؤ پھر ہرا ہوجاتا تھا، پر من پر کُلشت بھاؤں (غضب ناک احساس) کا آدھپتیہ (غلبہ) نہ تھا۔ گھاؤ بھر رہا تھا، کیول ٹھیس لگنے سے درد ہوجاتا تھا۔ اس میں سویم ٹیس یا جلن نہ تھی۔ اس پریوار پر اسے دیا آتی تھی۔ سوچتی، بے چارے یہ چھین جھپٹ نہ کریں تو کیسے گزارا ہو۔ لڑکیوں کا وواہ کہاں سے کریں گے۔ استری کو جب دیکھو بیمار رہتی ہے۔ اس پر بابو جی کو ایک بوتل شراب بھی روز چاہیے۔ یہ لوگ تو سویم ابھاگے ہیں۔ جس کے گھر میں ۵۔۵ کنواری کنیائیں ہوں، بالک ہو ہوکر مرجاتے ہوں، گھرنی سدا بیمار رہتی ہو، سوامی شراب کا لتی ہو، اس پر تو یوں ہی ایشور کا کوپ (عذاب) ہے۔ ان سے تو میں ابھاگنی ہی اچھی!

(۴)

دربل بالکوں کے لیے برسات بری بلا ہے۔ کبھی کھانسی ہے، کبھی جور، کبھی دست۔ جب ہوا میں شیت (ٹھنڈ) بھری ہو تو کوئی کہاں تک بچائے۔ مادھوی ایک دن اپنے گھر چلی گئی تھی۔ بچہ رونے لگا تو ماں نے ایک نوکر کو دیا، اسے باہر سے بہلا لا۔ نوکر نے باہر لے جاکر ہری ہری گھاس میں بیٹھا دیا۔ پانی برس کر نکل گیا تھا۔ بھومی گیلی ہو رہی تھی۔ کہیں کہیں پانی بھی جمع ہو گیا تھا۔ بالک کو پانی میں چھپاکے لگانے سے زیادہ پیارا اور کون کھیل ہوسکتا ہے۔ خوب پریم سے اُمگ اُمگ کر پانی میں لوٹنے لگا۔ نوکر بیٹھا اور آدمیوں کے ساتھ

گپ شپ کرتا رہا۔ اس طرح گھنٹوں گزر گئے۔ بچّے نے خوب سردی کھائی۔ گھر آیا تو اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ رات مادھوی کا کلیجہ سن سے ہوگیا۔ سوامنی کو جگا کر بولی۔ دیکھو تو بچّے کو کیا ہوگیا ہے۔ کیا سردی وردی تو نہیں لگ گئی۔ ہاں سردی ہی تو معلوم ہوتی ہے۔

سوامنی ہکبکا کر اُٹھ بیٹھی اور بالک کی خرخراہٹ سنی تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ بھینکر آواز اس نے کئی بار سنی تھی اور اسے خوب پہچانتی تھی۔ ویگدہ (گھبرا) ہوکر بولی۔ ذرا آگ جلاؤ۔ تھوڑا سا چوکر لاکر ایک پوٹلی بناؤ سینکنے سے لابھ ہوتا ہے۔ ان نوکروں سے تنگ آگئی۔ آج کہار ذرا دیر کے لیے باہر لے گیا تھا، اسی نے سردی میں چھوڑ دیا ہوگا۔

ساری رات دونوں بالک کو سینکتی رہیں۔ کسی طرح سویرا ہوا مسٹر باچگی کو خبر ملی تو سیدھے ڈاکٹر کے یہاں دوڑے۔ خیریت اتنی تھی کہ جلد احتیاط کی گئی۔ تین دن میں بچہ اچھا ہوگیا، لیکن اتنا دربل ہوگیا تھا کہ اسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ سچ پوچھو تو مادھوی کی تپسیا نے بالک کو بچایا۔ ماتا سوتی، پتا سوجاتا، کنتو مادھوی کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ کھانا پینا تک بھول گئی۔ دیوتاؤں کی منوتیاں کرتی تھی، بچّے کی بلائیں لیتی تھی، بالکل پاگل ہوگئی تھی۔ یہ وہی مادھوی ہے جو اپنے سروناش کا بدلہ لینے آئی تھی۔ اَپکار (برائی) کی جگہ اُپکار (بھلائی) کر رہی تھی۔ وش پلانے آئی تھی، سُودھا (امرت) پلا رہی تھی۔ منُوش میں دیوتا کتنا پربل (طاقت ور) ہے!

پراتہ کال کا سمئے تھا۔ مسٹر باچگی ششو کے جھولے کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ استری کے سر میں پیڑا ہو رہی تھی۔ وہیں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی اور مادھوی سمیپ (قریب) بیٹھی بچّے کے لیے دودھ گرم کر رہی تھی۔ سہسا باچگی نے کہا۔ بوڑھا، ہم جب تک جئیں گے تمھارا لیش گائیں گے۔ تم نے بچے کو جلا لیا۔

استری۔ یہ دیوی بن کر ہمارا کشٹ نوارن (مصیبتوں کو دور) کرنے کے لیے آگئی۔ یہ نہ ہوتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔ بوڑھا، تم سے میری ایک دنتی ہے۔ یوں تو مرنا جینا پراربدھ (تقدیر) کے ہاتھ ہے، لیکن اپنا اپنا پُورا بھی بڑی چیز ہے۔ میں اَبھاگنی ہوں۔ اب کہ تمھارے ہی پونیہ (پاکیزگی)، پرتاپ (اقبال) سے بچّہ سنبھل گیا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ ایشور اسے ہمارے ہاتھ سے چھین نہ لے۔ سچ کہتی ہوں بوڑھا، مجھے اس کو گود میں لیتے ڈر لگتا ہے۔ اسے تم آج سے اپنا بچّہ سمجھو۔ تمھارا ہوکر

شاید بچ جائے، ہم ابھاگے ہیں ہمارا ہوکر اس پر نتیہ کوئی نہ کوئی سنکٹ آتا رہے گا۔ آج سے تم اس کی ماتا ہوجاؤ۔ تم اسے اپنے گھر لے جاؤ۔ جہاں چاہے لے جاؤ تمھاری گود میں دے کر مجھے پھر کوئی چنتا نہ رہے گی۔ واستو میں تمھیں اس کی ماتا ہو میں تو راکھششی ہوں۔

مادھوی۔ بہو جی، بھگوان سب کشل کریں گے، کیوں جی اتنا چھوٹا کرتی ہو؟

مسٹر باگچی۔ نہیں نہیں بوڑھی ماتا، اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ میں مستِک (ذہن) سے تو ان باتوں کو ڈھکونسلا ہی سمجھتا ہوں، لیکن ہردئے سے انھیں دور نہیں کرسکتا۔ مجھے سویم میری ماتا جی نے ایک دھوبن کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔ میرے تین بھائی مر چکے تھے۔ میں جو بچ گیا تو ماں باپ نے سمجھا بیچنے سے ہی اس کی جان بچ گئی۔ تم اس ششو کو پالو پوسو۔ اسے اپنا پُتر سمجھو۔ خرچ ہم برابر دیتے رہیں گے۔ اس کی کوئی چنتا مت کرنا۔ کبھی کبھی جب ہمارا جی چاہے گا، آکر دیکھ لیا کریں گے۔ ہمیں وشواس ہے کہ تم اس کی رکھشا ہم لوگوں سے کہیں اچھی طرح کرسکتی ہو۔ میں کُکرمی (بدمعاشی) ہوں۔ جس پیشے میں ہوں اس میں کُکرم کیے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ جھوٹی شہادتیں بنانی ہی پڑتی ہیں، نرپرادھوں کو پھسانا ہی پڑتا ہے۔ آتما اتنی دربل ہوگئی ہے کہ پرلوبھن (لالچ) میں پڑ ہی جاتا ہوں، جانتا ہوں کہ برائی کا پھل بُرا ہی ہوتا ہے، پر ستتھی سے مجبور ہوں۔ اگر نہ کروں تو آج نالائق بناکر نکال دیا جاؤں۔ انگریز ہزاروں بھولیں کریں، کوئی نہیں پوچھتا۔ ہندوستانی ایک بھول بھی کر بیٹھے تو سارے افسر اس کے سر ہوجاتے ہیں۔ ہندوستانیوں کو تو کوئی بڑا پد نہ ملے۔ وہی اچھا پد پاکر تو ان کی آتما کا پتن (تنزل) ہوجاتا ہے۔ ان کو ہندوستانیت کا دوش مٹانے کے لیے کتنی ہی ایسی باتیں کرنی پڑتی ہیں جن کا انگریز کے دل میں کبھی خیال ہی نہیں پیدا ہوسکتا۔ تو بولو، سویکار کرتی ہو؟

مادھوی گد گد ہوکر بولی۔ بابو جی، آپ کی اِچھا ہے تو مجھ سے بھی جو کچھ بن پڑے گا آپ کی سیوا کردوں گی۔ بھگوان بالک کو امر کریں، میری تو ان سے یہی ونتی ہے۔

مادھوی کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سورگ کے دوار سامنے کھلے ہیں اور سورگ کی دیویاں آنچل پھیلا پھیلا کر آشیرواد دے رہی ہیں، مانو اس کے انت استھل (اندرون) میں

پرکاش کی لہریں سی اُٹھ رہی ہیں۔ اسی اسنہہ مئے (پیار بھری) سیوا میں کتنی شانتی تھی۔

بالک ابھی تک چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ مادھوی نے دودھ گرم ہوجانے پر اسے جھولے پر سے اُٹھایا، تو چلا پڑی۔ بالک کی دیہہ ٹھنڈی ہوگئی تھی اور منہ پر پیلاپن آگیا تھا جسے دیکھ کر کلیجہ ہل جاتا ہے، کنٹھ سے آہ نکل آتی ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ جس نے ایک بار دیکھا ہے پھر کبھی نہیں بھول سکتا۔ مادھوی نے ششو کو گود سے چمٹا لیا، حالانکہ نیچے اُتار دینا چاہیے تھا۔

کہرام مچ گیا۔ ماں بچّے کو گلے سے لگائے روتی تھی، پر اُسے زمین پر نہ سلاتی تھی۔ کیا باتیں ہو رہی تھیں اور کیا ہوگیا۔ موت کو دھوکھا دینے سے آنند آتا ہے۔ وہ اس وقت کبھی نہیں آتی جب لوگ اس کی راہ دیکھتے ہوتے ہیں۔ روگی جب سنبھل جاتا ہے، جب وہ پتھیہ لینے لگتا ہے، اُٹھنے بیٹھنے لگتا ہے، گھر بھر خوشیاں منانے لگتا ہے، سب کو وشواس ہوجاتا ہے کہ سنکٹ ٹل گیا، اس وقت گھات میں بیٹھی ہوئی موت سر پر آپڑتی ہے یہی اس کی نٹھر لیلا ہے۔

آشاؤں کے باغ لگانے میں ہم کتنے کُشل ہیں۔ یہاں ہم رکت کے بیج بوکر سدھا کے پھل کھاتے ہیں۔ اگنی سے پودھوں کو سینچ کر شیتل چھاہ میں بیٹھتے ہیں۔ ہاں، مند بدھی!

دن بھر ماتم ہوتا رہا، باپ روتا تھا، ماں تڑپتی تھی اور مادھوی باری باری سے دونوں کو سمجھاتی تھی۔ یدی اپنے پران دے کر وہ بالک کو جلا سکتی تو اس سمئے اپنا دھنیہ بھاگ سمجھتی۔ وہ اہِت (بُرائی) کا سنکلپ (قصد) کرکے یہاں آئی تھی اور آج جب اس کی منوکامنا (دلی تمنا) پوری ہوگئی اور اسے خوشی سے پھولا نہ سمانا چاہیے تھا، اسے اس سے کہیں گھور پیڑا ہو رہی تھی جو اپنے پُتر کی جیل یاترا سے ہوئی تھی۔ رُلانے آئی تھی اور خود روتی جا رہی تھی۔ ماتا کا ہردئے دَیا کا آگار ہے۔ اسے جلاؤ تو اس میں دَیا کی ہی سگندھ نکلتی ہے۔ پیسو تو دَیا کا ہی رس نکلتا ہے۔ یہ دیوی ہے۔ وپتّی کی کرور لیلائیں بھی اس سُوچھ (صاف) نِرمل (شفاف) سُروت کو مِلن (گندا) نہیں کرسکتیں۔

یہ افسانہ مادھوری کے جولائی 1925 کے شمارے میں شائع ہوا مان سروور 3 میں شامل ہے۔ رسم خط بدل کر اردو میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

جنّت کی دیوی

لیلا نے جس دن سُسرال میں قدم رکھا اُسی دن سے اس کا امتحان شروع ہوا۔ وہ سبھی کام جس کی اُس کے گھر تعریف ہوتی تھی۔ یہاں ممنوع تھے۔ اُسے بچپن سے تازہ ہوا پر جان دینا سکھلایا گیا تھا۔ یہاں منہ کھولنا بھی گناہ تھا۔ بچپن سے سکھایا گیا تھا کہ روشنی ہی زندگی ہے۔ یہاں روشنی ہوا تھی۔ کمروں میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ روشنی اندر نہ آجائے گی! مجال کیا کہ بہو اپنی اندھیری کوٹھری کے دروازہ پر کھڑی ہوجائے۔ یا کبھی چھت پر ٹہل سکے۔ ساس جی دنیا سر پر اُٹھا لیتیں۔ اُنھیں بکنے کا مرض تھا۔ دال میں ذرا سا نمک کا زیادہ ہونا۔ اُن کی زبان کو دن بھر مصروف رکھنے کے لیے کافی تھا۔ موٹی تازی خاتون تھیں۔ چھینٹ کا گھیردار لہنگا پہنے۔ پاندان بغل میں رکھے گہنے سے لدی ہوئی۔ سارے دن بروٹھے میں بیٹھی رہتی تھیں۔ کیا مجال کہ گھر کے اندر ان کی مرضی کے خلاف ایک پتی بھی ہلے۔ بہو کی نئی نئی عادتیں دیکھ کر جلتی رہتی تھیں۔ اب کاہے کو آبرو رہے گی۔ نہ جانے اس کے دیس میں کون لوگ بستے ہیں۔ گہنے نہیں پہنتی۔ رنگین کپڑے نہیں بھاتے۔ یہ بھی کوئی اچھے لچھن ہیں۔ لیلا کے پیچھے سیتا سرن پر بھی پھٹکار پڑتی ۔ تجھے چاندنی میں سونا اچھا لگتا ہے کیوں؟ تو بھی اپنے کو مرد کہے گا؟ وہ مرد کیا کہ عورت اس کے کہنے میں نہ رہے! دن بھر گھر میں گھسا رہتا ہے۔ منہ میں زبان نہیں ہے! سمجھاتا کیوں نہیں؟

سیتا سرن کہتا۔ اماں جب کوئی میرے سمجھانے سے مانے تب تو!

ماں۔ مانے گی کیوں نہیں۔ مرد کو چاہیے کہ کڑی نگاہ سے دیکھ لے تو عورت کانپ اُٹھے۔

سیتا سرن۔ تم تو سمجھاتی ہی رہتی ہو۔

ماں۔ میری اُسے کیا پروا۔ سمجھتی ہوگی۔ بڑھیا چار دن میں مر جائے گی۔ تب تو میں مالکن ہو ہی جاؤں گی۔

سیتا سرن مسکرایا۔ شاید اماں کا بس ہوتا تو وہ مرنے کے بعد بھی بہو کو مالکن نہ ہونے دیتیں۔ مرتیں ہی کیوں؟

گرمی کے دن تھے۔ اور شام کا وقت۔ باہر ہوا چلتی تھی۔ اندر جسم پُھنکا جاتا تھا۔ لیلا اندر بیٹھی ایک کتاب دیکھ رہی تھی کہ سیتا سرن نے آکر کہا۔ یہاں تو بڑی گرمی ہے۔ باہر بیٹھو۔

لیلا۔ یہ گرمی اُن طعنوں سے ٹھنڈی ہے۔ جو ابھی سُننے پڑیں گے۔

سیتا سرن۔ آج اگر وہ بولیں تو میں بھی بگڑ جاؤں گا۔

لیلا۔ تب تو میرا گھر میں رہنا بھی مشکل ہوجائے گا۔

سیتا سرن۔ بلا سے۔ الگ رہیں گے۔

لیلا۔ میں تو مر بھی جاؤں تو الگ ہونے کا نام نہ لوں۔

سیتاسرن نے اس کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ تمھیں اس گھر میں آکر بہت دُکھ سہنا پڑا لیلا۔ میں تمھارے لائق نہ تھا۔ تم نے پہلے جنم میں ضرور کوئی پاپ کیا تھا۔

لیلا نے شوہر کے ہاتھوں سے کھیلتے ہوئے شرما کر کہا۔ یہاں نہ آتی تو تم کہاں ملتے؟

(۲)

پانچ سال گزر گئے۔ لیلا دو بچوں کی ماں ہوگئی۔ لڑکے کا نام جانکی سرن، لڑکی کا کامنی۔ دونوں بچّے گھر کو گلزار کیے رہتے تھے۔ لڑکی دادا سے ملتی تھی۔ لڑکا دادی سے۔ دونوں شوخ اور شریر تھے۔ گالی دے بیٹھنا۔ مُنہ چڑا دینا۔ تو اُن کی معمولی حرکت تھی۔ دن بھر کھاتے۔ اور آئے دن بیمار پڑے رہتے۔ لیلا نے خود تو سبھی آفتیں جھیل لی تھیں۔ لیکن لڑکوں کی عادت کا بگڑنا اُسے بہت بُرا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اس کی سُنتا کون تھا۔ بچوں کی ماں ہوکر اب گھر میں اس کی کوئی ہستی ہی نہ تھی۔ جو کچھ تھے بچے تھے۔ اُسے کسی بچے کو ڈانٹنے کا مجاز نہ تھا۔ ساس پھاڑ کھاتی تھی۔

سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کی صحت اب اور بھی خراب ہوگئی تھی۔ زچہ خانہ میں اُسے وہ سبھی مظالم سہنے پڑے جو جہالت، رسم اور ضعیف الاعتقادی نے زچہ کی حفاظت کے لیے گھڑ رکھے ہیں۔ اس کال کوٹھری میں جہاں نہ ہوا کا گزر تھا۔ نہ روشنی کا، نہ صفائی کا۔ چاروں طرف عفونت، سیل اور گندگی بھری ہوئی تھی۔ اس کا نازک جسم گھل گیا۔ ایک بار جو کسر رہ گئی تھی۔ وہ دوسری بار پوری ہوگئی۔ چہرہ زرد پڑگیا۔ آنکھیں

دھنس گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا بدن میں خون ہی نہیں رہا۔ صورت ہی بدل گئی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ ایک طرف آم پکے۔ دوسری طرف خربوزے۔ ان دونوں پھلوں کی ایسی اچھی فصل پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اب کی ان میں اتنی مٹھاس نہ جانے کہاں سے آگئی تھی کہ کتنا ہی کھاؤ جی نہ بھرے۔ سنت سرن کے علاقہ سے خربوزے اور آم کے ٹوکرے بھرے چلے آتے تھے۔ سارا گھر خوب اُچھل اُچھل کھاتا تھا۔ بابو صاحب پُرانی ہڈی کے آدمی تھے۔ سویرے ایک سیکڑے آموں کا ناشتہ کرتے۔ پھر پنسیری بھر خربوزے چٹ کرجاتے۔ مالکن بھی اُن سے پیچھے رہنے والی نہ تھیں۔ ایک وقت کا کھانا بند کردیا۔ اناج سڑنے والی چیز نہیں۔ آج نہیں کل خرچ ہوجائے گا۔ آم اور خربوزے تو ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ شُدنی تھی اور کیا۔ یوں ہی ہر سال دونوں چیزوں کی ریل پیل ہوتی تھی۔ پر کسی کو کبھی کوئی شکایت نہ ہوتی تھی۔ کبھی معدہ میں گرانی معلوم ہوئی تو ہڑ کی پھنکی مار لی۔ ایک دن سنت سرن کے پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ آپ نے اس کی پرواہ نہ کی۔ آم کھانے بیٹھ گئے۔ سیکڑا پورا کرکے اُٹھے ہی تھے کہ قے ہوئی۔ گر پڑے۔ پھر تو تِل تِل پر قے اور دست ہونے لگے۔ ہیضہ ہوگیا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ پر اُس کے آنے کے پہلے بابو صاحب چل بسے۔ لوگ لاش کو سُپرد خاک کرکے لوٹے تو مالکن کو بھی قے اور دست ہو رہے تھے۔ پھر دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ لیکن سورج نکلتے نکلتے وہ بھی سدھار گئیں۔ میاں بیوی میں کبھی مفارقت نہ ہوئی تھی۔ سنسار سے بھی ساتھ ساتھ رخصت ہوئے صبح کو شوہر۔ شام کو بیوی۔

لیکن مصیبت کا ابھی خاتمہ نہ ہوا تھا۔ تیسرے دن دونوں بچے دادا دادی کے لیے روتے روتے بیٹھک میں جا پہنچے۔ وہاں ایک آلے پر ایک خربوزہ کٹا ہوا پڑا تھا۔ دو تین قلمی آم بھی کٹے رکھے تھے۔ ان پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ کامنی نے ایک تپائی پر چڑھ کر دونوں چیزیں اُتار لیں۔ اور دونوں نے مل کر کھائیں۔ شام ہوتے ہوتے دونوں کو ہیضہ ہوگیا۔ اور دونوں ماں باپ کو روتا چھوڑ چل دیے۔

تین دن پہلے جہاں چاروں طرف چہل پہل تھی وہاں اب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی کے رونے کی آواز بھی نہ سُنائی دیتی تھی۔ روتا ہی کون؟ لے دے کے کُل دو آدمی رہ گئے تھے۔ اور اُنھیں رونے کی بھی سُدھ نہ تھی۔

(۳)

لیلا کی صحت پہلے بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اب تو وہ اور بھی بے جان ہوگئی۔ بچوں ہی میں اُس کی جان بستی تھی۔ جب وہ ہی نہ رہے تو مرنا اور جینا برابر تھا۔ رات دن یہی منایا کرتی کہ بھگوان یہاں سے لے چلو۔ لیکن بُلانے سے موت کیا آتی ہے؟

سیتا سرن پہلے تو بہت رویا دھویا۔ یہاں تک کہ گھر چھوڑکر بھاگا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے تھے۔ طبیعت سنبھلتی جاتی تھی۔ اولاد کا غم تو کچھ ماں ہی کو ہوتا ہے۔ پہلے ہی کی طرح دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق ہونے لگا۔ یاروں نے اور بھی چنگ پر چڑھایا۔ سیر سپاٹے ہونے لگے۔ کہاں تو لیلا کو روتے دیکھ بے قرار ہوجاتا تھا۔ کہاں اب اُسے غمگیں اور اُداس دیکھ کر جھنجھلا اُٹھتا۔ زندگی رونے ہی کے لیے تو نہیں ہے۔ ایشور نے لڑکے دیے تھے۔ ایشور ہی نے چھین لیے۔ کیا لڑکوں کے پیچھے اپنی جان بھی دے دیں۔ لیلا اُس کے منہ سے یہ باتیں سن کر حیرت میں آجاتی۔ باپ کے منہ سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں۔ دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں۔

ہولی کے دن تھے۔ مردانے میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ احباب کی دعوت کے سامان کیے گئے تھے۔ اندر لیلا زمین پر پڑی ہوئی رو رہی تھی۔ تیوہاروں کے دن اُسے روتے ہی کٹتے تھے۔ آج بچے ہوتے تو اچھے اچھے کپڑے پہنے کیسے اُچھلتے پھرتے! بچے ہی نہ رہے تو کہاں کی تیج اور کہاں کا تیوہار۔ یکایک سیتا سرن نے آکر کہا۔ کیا دن بھر روتی ہی رہو گی؟ ذرا کپڑے تو بدل ڈالو۔ آدمی بن جاؤ۔ یہ کیا گت بنا رکھی ہے۔

لیلا نے کہا۔ تم جاؤ اپنی محفل میں بیٹھو۔ تمھیں میری کیا فکر پڑی ہے۔

سیتا سرن۔ کیا دنیا میں اور کسی کے لڑکے نہیں مرتے؟ تمھارے ہی سر یہ مصیبت پڑی ہے۔

لیلا۔ یہ بات کون نہیں جانتا۔ اپنا اپنا دل ہی تو ہے۔

سیتا سرن۔ میرے ساتھ بھی تو تمھارا کچھ فرض ہے؟

لیلا نے تعجب سے شوہر کی طرف دیکھا۔ گویا اس کا مطلب نہیں سمجھی۔ پھر منہ پھیر کر رونے لگی۔

سیتا سرن۔ میں اب اس نحوست کا خاتمہ کردینا چاہتا ہوں۔ اگر تمھارا اپنے دل پر قابو نہیں

ہے تو میرا بھی اپنے دل پر قابو نہیں ہے۔ میں زندگی بھر ماتم نہیں منا سکتا۔

لیلا۔ تم راگ رنگ میں مگن رہتے ہو۔ میں منع تو نہیں کرتی۔ میں روتی ہوں تو کیوں نہیں رونے دیتے؟

سیتا سرن۔ میرا گھر رونے کے لیے نہیں ہے۔

لیلا۔ اچھی بات ہے۔ تمھارے گھر میں نہ روؤں گی۔

(۴)

لیلا نے میکے کی تیاری شروع کی۔ ماں باپ کیا ایک ٹکڑا روٹی نہ دیں گے؟ لیکن ذرا ہی دیر میں اُس کا خیال پلٹ گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس وقت یہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ ان کے سر راگ رنگ کا بھوت سوار ہے۔ اِدھر میں گئی۔ اُدھر یہ گھر مٹی میں ملا۔ مُفت خورے پیچھے پڑے ہی ہوئے ہیں۔ دو چار مہینے میں وارا نیارا ہوجائے گا۔ اگر انھیں کوئی بیماری ہوجاتی۔ تو کیا اس حالت میں انھیں چھوڑ کر میں چلی جاتی؟ کبھی نہیں۔ میں دل و جان سے ان کی خدمت کرتی۔ مانا انھیں ظاہری بیماری نہیں ہے۔ مگر دل کی بیماری تو اُس سے بھی زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ جو آدمی رونے کی جگہ ہنسے اور ہنسنے کی جگہ روئے اُس کے دیوانہ ہونے میں کیا شبہ ہے؟

ہاں ! مجھے اپنا غم بھول جانا ہوگا .... روؤں گی .... رونا تو میری تقدیر میں لکھا ہوا ہے۔ مگر ہنس ہنس کر۔ اپنی تقدیر سے لڑوں گی۔ جو جاتے رہے اُن کے نام کو رونے کے سوا اور کیا کرسکتی ہوں۔ لیکن جو ہے اُسے نہ جانے دوں گی۔

آ ...... اے ٹوٹے ہوئے دل ! آج تیرے ٹکڑوں کو جمع کرکے ایک مزار بناؤں اور اپنے غم کو اسی میں دفن کردوں۔

لیلا ساری رات بیٹھی دل سے یہی باتیں کر رہی تھی۔ اُدھر مردانے میں دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ سیتا سرن نشہ میں چور، کبھی گاتا تھا، کبھی تالیاں بجاتا تھا۔ اُن کے قہقہوں سے دیواریں ہلی جاتی تھیں۔

پچھلے پہر محفل میں سناٹا چھا گیا۔ لیلا نے سوچا شاید لوگ سوگئے۔ معلوم نہیں دروازہ بند کیا یا کھلا ہی چھوڑ دیا۔ شاید لوگ کہیں چلے گئے۔ کوئی سنک سوار ہوئی ہوگی۔ جاکر دہلیز سے مردانے کمرہ میں جھانکا۔ احباب رخصت ہوگئے تھے۔ صرف ایک حسینہ مسند پر

جلوہ افروز تھی۔ اور سیتا سرن اس کے سامنے جُھکا ہوا۔ اُس سے بہت دھیرے دھیرے باتیں کر رہا تھا۔ حسینہ کے چہرہ پر آنکھوں میں شرارت آمیز تغافل تھا۔ سیتا سرن شیفتگی اور از خودر فتگی کی تصویر۔ ایک بھولا بھالا دل ایک فریب شعار نازنین کے ہاتھوں لُٹا جاتا تھا۔ لیلا کی دولت اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک سارقہ اُٹھائے لیے جاتی تھی۔ لیلا کے جسم میں رعشہ آگیا۔ ایسی وحشت سوار ہوئی کہ اسی وقت جاکر اس فاحشہ کو دُھتکاروں اور کھڑے کھڑے نکال دوں۔ نسائیت کا وہ تار جو عرصے سے مفلوج ہو رہا تھا۔ یکبارگی مرتعش ہو اُٹھا۔ پر لیلا نے ضبط کیا۔ اور اُلٹے پاؤں اندر لوٹ آئی۔ آفتاب کی زرنگار شعاعیں کمرہ میں آئیں تو لیلا کو آئینے کے سامنے کھڑے دیکھا! آج کئی مہینوں کے بعد لیلا نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اُس کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ غم نے اُس کی صورت ہی تبدیل کردی تھی۔ اُس حسینہ کے سامنے وہ ایسی لگتی تھی۔ جیسے ترو تازہ گلاب کے سامنے جوہی کا پُھول۔

(۵)

سیتا سرن کا خمار دوپہر کو ٹوٹا تو سامنے لیلا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اُس کی انوکھی چھب آنکھوں میں سما گئی۔ ایسے خوش ہوئے گویا ایک مدت کے فراق کے بعد اُس سے وصال ہوا ہو۔ اُنھیں کیا معلوم تھا کہ یہ رُوپ بھرنے کے پہلے لیلا نے کتنے آنسو بہائے ہیں۔ بالوں میں یہ پھول گونتھنے کے پہلے آنکھوں سے کتنی موتی پروئے ہیں۔ اُن کا پشیمان دل اُس کی دل جوئی کرنے کے لیے بے قرار ہو اُٹھا۔ جوشِ محبت سے مخمور ہوکر لیلا کو گلے لگا لیا۔ اور مسکرا کر بولے۔ آج تو تم مسلح ہوکر آئی ہو لیلا۔ کہاں بھاگوں؟

لیلا نے اپنے دل کی طرف انگلی دِکھا کر کہا۔ یہاں آبیٹھو! بہت بھاگے بھاگے پھرتے ہو۔ اب تمھیں باندھ کر رکھوں گی۔

باہر سے کسی دوست کے آنے کی خبر آئی۔ سیتا سرن چلنے لگے تو لیلا نے اُن کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میں نہ جانے دوں گی۔

سیتا سرن۔ ابھی آتا ہوں۔

لیلا۔ مجھے ڈر لگتا ہے تم کہیں چل نہ دو۔

سیتا سرن۔ نہیں لیلا۔ تم نے مجھے باندھ لیا۔ اب ہل نہیں سکتا۔

سیتا سرن باہر آئے تو دوست صاحب بولے۔ اب تک سوتے ہی رہے کیا۔ اس وقت تو وہاں چلنے کی ٹھہری تھی نہ ؟

سیتا سرن نے بے نیازی کی شان سے کہا۔ چلنے کو تو تیار ہوں لیکن لیلا جانے نہیں دیتی۔

دوست۔ نرے گاؤدی ہی رہے۔ آگئے بیوی کے پنجے میں۔

سیتا سرن۔ ہاں بھئی آگیا۔ اُس نے گھر سے نکال دیا تھا۔ تب چھاؤں ڈھونڈھتا پھرتا تھا۔ اب اُس نے دروازہ کھول دیا ہے۔ اور کھڑی بلا رہی ہے۔

دوست۔ اجی یہاں وہ لطف کہاں ! گھر کو لاکھ سجاؤ تو کیا باغ ہوجائے گا۔

سیتا سرن۔ بھئی گھر باغ تو نہیں ہوسکتا۔ مگر سورگ ہوسکتا ہے۔ مجھے اس وقت اپنی فرومائیگی پر جتنی ندامت ہو رہی ہے۔ وہ میں ہی جانتا ہوں۔ جس غم میں اُس نے اپنی دلرُبائیوں کو لٹا دیا۔ اپنی خوشیوں کو فنا کردیا۔ اُسی غم کو میرا ایک اشارہ پاکر فراموش کردیا۔ جانتے ہو کیوں؟ اسی لیے کہ میں بہک نہ جاؤں۔ وہ جنت کی دیوی ہے۔ اور مجھ جیسے شوریدہ سروں کی حفاظت کرنے ہی کے لیے بھیجی گئی ہے۔

یہ افسانہ پہلی بار 'چاند' کے ستمبر 1925 میں 'سورگ کی دیوی' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ہندی میں مان سروور 3 اور اردو میں 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔

چوری

ہائے بچپن! تیری یاد نہیں بھولتی! وہ کچّا ٹوٹا گھر، وہ پوال کا بستر، وہ برہنہ جسم، برہنہ پا کھیتوں میں گھومنا، آم کے درختوں پر چڑھنا ساری باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔ کھیتھے جوتے پہن کر اس وقت جتنی خوشی ہوتی تھی، اب فلیکس کے جوتوں سے بھی نہیں ہوئی، گرم پتیلے رس میں جو لذت تھی، وہ اب گلاب کے شربت میں بھی نہیں۔ چربن اور کچے بیروں میں جو ذائقہ تھا وہ اب شیر برنج اور انگور میں بھی نہیں ملتا؟

میں اپنے چچا زاد بھائی ہلدھر کے ساتھ دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا، میری عمر آٹھ سال کی ہوگی ہلدھر! (وہ اب بہشت میں ہے) مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ ہم دونوں علی الصباح باسی روٹیاں کھا کر دوپہر کے لیے مٹر اور جَو کا چربن لے کر، کوئی حاضری کا رجسٹر تو تھا ہی نہیں، اور نہ غیر حاضری کا جرمانہ دینا پڑتا تھا، پھر خوف کس بات کا؟ کبھی تو تھانہ کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے، کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے، کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑی کی بہار دیکھتے، گاڑیوں کے وقت کا جتنا علم ہم کو تھا اتنا شاید ٹائم ٹیبل کو بھی نہ تھا۔ راستہ میں شہر کے ایک مہاجن نے ایک باغ لگوانا شروع کیا تھا وہاں ایک کنواں کھد رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے لیے ایک دلچسپ تماشہ تھا بڈھا مالی ہمیں اپنی جھونپڑی میں بڑی محبت سے بٹھاتا تھا۔ ہم اس سے جھگڑ جھگڑ کر اس کا کام کرتے۔ کہیں بالٹی لیے پودوں کو سینچ رہے ہیں۔ کہیں کھرپی سے کیارہ گوڑ رہے ہیں .... کہیں مقراض سے بیلوں کی پتیاں چھانٹ رہے ہیں ان کاموں میں کتنا لطف تھا، مالی بچّوں کی فطرت کا عالم تھا ہم سے کام لیتا مگر اس طرح کہ گویا ہم پر کوئی احسان کر رہا ہے۔ جتنا کام وہ دن بھر میں کرتا اسے ہم گھنٹہ بھر میں ختم کردیتے اب وہ مالی نہیں ہے لیکن باغ ہرا بھرا ہے اس کے پاس سے ہوکر گزرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ ان درختوں کے گلے مل کر روؤں اور کہوں، پیارے! تم مجھے بھول گئے ہو مگر میں تم کو نہیں بھولا۔ میرے دل میں

تمھاری یاد ابھی تک زندہ ہے اتنی ہی تازہ جتنے تمھارے پتے! بے غرضانہ محبت کے تم جیتے جاگتے مجسمہ ہو۔

کبھی کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے مگر مولوی صاحب سے ایسا بہانا کردیتے کہ ان کی چڑھی ہوئی تیوریاں اُتر جائیں، اتنی تخیلی قوت آج ہوتی تو ایسا ناول لکھ مارتا کہ لوگ دنگ رہ جاتے اب تو یہ حال ہے کہ بہت سر کھپانے کے بعد کوئی کہانی سوجھتی ہے، خیر ہمارے مولوی صاحب درزی تھے، مولوی گیری صرف شوقیہ کرتے تھے، ہم دونوں بھائی اپنے گاؤں کے کرمی کہاروں سے ان کی خوب تعریف کرتے یا کہیے کہ ہم لوگ مولوی صاحب کے سفری ایجنٹ تھے، ہماری کوشش سے مولوی صاحب کو جب کچھ کام مل جاتا تو ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ جس روز کوئی اچھا بہانا نہ سوجھتا اس روز مولوی صاحب کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لے جاتے، کبھی سیر آدھ سیر پھلیاں توڑ لیں تو کبھی دس پانچ گنے، کبھی جو یا گیہوں کی ہری ہری بالیں لے لیں۔ ان تحفہ جات کو دیکھتے ہی مولوی صاحب کا غصہ فرو ہوجاتا، جب ان چیزوں کی فصل نہ ہوتی تو ہم سزا سے بچنے کی کوئی اور ہی تدبیر سوچتے۔ مولوی صاحب کو چڑیوں کا شوق تھا، مکتب میں شیاما، بلبل، وہیل اور چنڈولوں کے پنجرے لٹکے رہتے تھے، ہمیں سبق یاد ہو یا نہ ہو مگر چڑیوں کو یاد ہوجاتے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی وہ بھی پڑھا کرتی تھیں۔ ان چڑیوں کے لیے بیشن تیار کرنے میں ہم لوگ کافی حوصلہ کا اظہار کرتے تھے، مولوی صاحب سب لڑکوں کو پتنگے پکڑ کر لانے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ ان چڑیوں کو پتنگوں سے دلی رغبت تھی، کبھی کبھی ہماری بلا پتنگوں کے ہی سر چلی جاتی تھی، ان کی قربانی کرکے ہم مولوی صاحب کی قہر آلود شخصیت کو خوش و خرم بنا دیا کرتے تھے۔

ایک روز صبح ہم دونوں بھائی تالاب میں منہ دھونے گئے تو ہلدھر نے کوئی سفید سی چیز مٹھی میں لے کر دکھائی، میں نے لپک کر مٹھی کھولی تو اس میں ایک روپیہ تھا۔ میں نے متحیر ہوکر پوچھا۔ یہ روپیہ تمھیں کہاں ملا؟

ہلدھر۔ اماں نے طاق پر رکھا تھا، چارپائی کھڑی کرکے نکال لایا۔

مکان میں کوئی صندوق یا الماری تو تھی نہیں، روپے پیسے ایک بلند طاق پر رکھ دیے جاتے تھے۔ ایک روز قبل چچا صاحب نے سَن فروخت کیا تھا اسی کے روپے زمیندار کو دینے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ہلدھر کو نہ جانے کیسے سراغ مل گیا۔ جب گھر کے سب

لوگ اپنے دھندوں میں مصروف ہوگئے تو اس نے چارپائی کھڑی کی اور اس پر چڑھ کر ایک روپیہ نکال لایا۔

اس وقت تک ہم نے کبھی روپیہ چھوا تک نہ تھا۔ وہ روپے دیکھ کر خوشی و خوف کے جو جذبات دل میں پیدا ہوئے وہ ابھی تک یاد ہیں ہمارے لیے روپے ایک نایاب چیز تھی، مولوی صاحب کو ہمارے یہاں سے صرف بارہ آنے ملا کرتے تھے۔ مہینہ کے آخر میں چچا صاحب خود جاکر پیسے دے آتے تھے۔ ہمارا اتنا بھی اعتبار نہ تھا۔ وہی ہم آج ایک روپیہ کے کامل بادشاہ تھے بھلا کون ہمارے گھمنڈ کا اندازہ کرسکتا ہے، لیکن مار کھانے کا خوف ہماری خوشی میں مخل ہو رہا تھا، روپے بے شمار تو تھے نہیں، چوری کا کھل جانا ایک مسلمہ امر تھا۔ چچا صاحب کے غصّے کا بھی مجھے تو نہیں مگر ہلدھر کو مجسم احساس ہوچکا تھا یوں تو ان سے زیادہ سیدھا سادھا آدمی دنیا میں نہ تھا، چچی صاحبہ نے ان کی حفاظت کا ذمہ نہ لے رکھا ہوتا تو کوئی بنیا انھیں بازار میں فروخت کرسکتا تھا مگر جب غصّہ آجاتا تو پھر انھیں کچھ نہ سوجھتا۔ اور تو اور، چچی صاحبہ بھی ان کے غصّہ کا مقابلہ کرتی ہوئی ڈرتی تھیں، ہم دونوں نے کئی منٹ تک انھیں امور پر غور کیا اور آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ آئی ہوئی لکشمی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے، ایک تو ہم پر شبہ ہو ہی گا نہیں اور اگر ہوا بھی تو ہم صاف انکار کر جائیں گے۔ کہیں گے ہم روپیہ لے کر کیا کرتے؟ ہماری ''ننگا جھولی'' لے لیجیے۔ شاید زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرتے تو ہمارا یہ ارادہ فسخ ہوجاتا اور وہ خوفناک نظارہ سامنے نہ آتا جسے بعد میں دیکھنا نصیب ہوا مگر اس وقت ہم میں اس طرح غور کرنے کی سکت ہی نہ تھی۔

منہ ہاتھ دھوکر ہم دونوں گھر گئے اور ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا اگر کہیں اس وقت تلاشی کی نوبت آئی تو پھر ایشور ہی مالک ہے۔ لیکن سب لوگ اپنا اپنا کام کر رہے تھے، کوئی ہم سے نہ بولا، ہم نے ناشتہ بھی نہ کیا چربن بھی نہ لیا، کتاب بغل میں دبائی اور مکتب کو روانہ ہوگئے۔

برسات کے دن تھے، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے، ہم دونوں خوش خوش مکتب چلے جارہے تھے، آج کونسل کی منسٹری پاکر بھی شاید اتنی خوشی نہ ہو، ہزاروں منصوبے باندھتے تھے، ہزاروں ہوائی قلعے تعمیر کرتے تھے، ایسا موقعہ بڑی خوش قسمتی سے نصیب ہوا

تھا، زندگی میں پھر شاید ہی ایسا موقع نصیب ہو، پس روپیہ کو اس طرح صرف کرنا چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دنوں تک چل سکے، اگرچہ ان دنوں پانچ آنہ سیر بہت عمدہ مٹھائی ملتی تھی اور شاید آدھ سیر مٹھائی میں ہم دونوں آسودہ ہوجاتے مگر یہ خیال ہوا کہ مٹھائی کھائیں گے تو روپیہ آج ہی غائب ہوجاوے گا، کوئی سستی چیز کھانی چاہیے کہ مزہ بھی آئے، پیٹ بھی بھرے اور پیسے بھی کم خرچ ہوں آخر امرودوں پر ہماری نظر پڑی، ہم دونوں راضی ہوگئے، دو پیسے کے امرود لیے، سستا وقت تھا، بڑے، بڑے بارہ امرود ملے، ہم دونوں کے کرتوں کے دامن بھر گئے، جب بلدھر نے کنجڑن کے ہاتھ میں روپیہ رکھا تو اس نے شبہ سے دیکھ کر پوچھا۔ روپیہ کہاں پایا، لا لا؟ چُرا تو نہیں لائے؟

جواب ہمارے پاس تیار تھا۔ زیادہ نہیں تو دو تین کتابیں تو پڑھ ہی چکے تھے، علم کا کچھ کچھ اثر ہوچلا تھا میں نے فوراً کہا مولوی صاحب کی تنخواہ دینی ہے گھر میں پیسے نہ تھے تو چچا صاحب نے روپے دے دیا۔

اس جواب نے کنجڑن کا شبہ دور کردیا، ہم دونوں نے ایک پُلیا پر بیٹھ کر خوب امرود کھائے مگر اب ساڑھے پندرہ آنے پیسے کہاں لے جائیں؟ ایک روپیہ تو چھپا لینا اتنا مشکل کام نہ تھا، یہ پیسوں کا ڈھیر کہاں چُھپتا؟ نہ کمر میں اتنی جگہ تھی، اور نہ جیب میں اتنی گنجائش انھیں اپنے پاس رکھنا اپنی چوری کا ڈھنڈھورا پیٹنا ہے، بہت سوچنے کے بعد یہ طے کیا کہ بارہ آنے مولوی صاحب کو دے دیے جائیں بقیہ ساڑھے تین آنے کی مٹھائی اُڑائیں، یہ فیصلہ کرکے ہم لوگ مکتب پہنچے۔ آج کئی روز بعد گئے تھے، مولوی نے پکڑ کر پوچھا۔ اتنے دن کہاں رہے۔

میں نے کہا۔ مولوی صاحب، گھر میں غمی ہوگئی تھی۔

یہ کہتے ہوئے میں نے بارہ آنے ان کے سامنے رکھ دیے، پھر کیا پوچھنا تھا، پیسے دیکھتے ہی مولوی صاحب کی باچھیں کھل گئیں، مہینہ ختم ہونے میں ابھی کئی دن باقی تھے۔ عموماً مہینہ گزر جانے اور بار بار تقاضے کرنے پر کہیں پیسے ملتے تھے اب کے اتنا جلد پیسے پاکر ان کا خوش ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی، ہم نے اور لڑکوں کی طرف فخریہ نگاہوں سے دیکھا، گویا کہہ رہے ہوں۔ ”ایک تم ہو کہ مانگنے پر بھی پیسے نہیں دیتے، ایک ہم ہیں کہ پیشگی دے دیتے ہیں۔“

ہم ابھی سبق پڑھ ہی رہے تھے کہ معلوم ہوا، آج تالاب کا میلہ ہے دوپہر سے چھٹی ہوجائے گی، مولوی صاحب میلے میں بلبل لڑانے جاویں گے یہ خبر سنتے ہی ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا، بارہ آنے تو بینک میں جمع کر ہی چکے تھے، ساڑھے تین آنوں میں میلا دیکھنے کی ٹھہری، خوب بہار رہے گی، مزے سے ریوڑیاں کھائیں گے ''گول گپّے'' اُڑائیں گے، جھولے پر چڑھیں گے اور شام کو گھر پہنچے گے، لیکن مولوی صاحب نے ایک سخت شرط یہ لگا دی تھی کہ سب لڑکے چھٹی کے پہلے اپنا اپنا سبق سنا دیں جو سبق نہ سنا سکے گا اس کو چھٹی نہ ملے گی، نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے تو چھٹی مل گئی مگر ہلدھر قید کرلیے گئے اور کئی لڑکوں نے سبق سُنا دیا تھا۔ وہ سبھی میلا دیکھنے چل پڑے، میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا، پیسے میرے ہی پاس تھے۔ اس لیے میں نے ہلدھر کو ساتھ لینے کا انتظار نہ کیا، یہ طے ہوگیا تھا کہ وہ چھٹی پاتے ہی میلے میں آجاویں اور دونوں ساتھ ساتھ میلا دیکھیں۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ جب تک وہ نہ آئیں گے ایک پیسہ بھی نہ خرچ کروں گا لیکن کیا معلوم تھا، کہ بدقسمتی کچھ اور ہی دکھلانے کو ہے۔ مجھے میلا پہنچے ہوئے ایک گھنٹہ سے زیادہ گزر گیا مگر ہلدھر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کیا ابھی تک مولوی صاحب نے چھٹی نہیں دی یا راستہ بھول گئے؟ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک کی طرف دیکھتا تھا، تنہا میلا دیکھنے میں جی بھی نہ لگتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی ہو رہا تھا کہ کہیں چوری کھُل تو نہیں گئی اور چچا صاحب ہلدھر کو پکڑ کر گھر تو نہیں لے گئے؟ آخر جب شام ہوگئی تو میں نے کچھ ریوڑیاں کھائیں اور ہلدھر کے حصّے کے پیسے جیب میں رکھ آہستہ آہستہ گھر چلا، راستہ میں خیال آیا کہ مکتب ہوتا چلوں، شاید ہلدھر ابھی وہیں پر ہوں، مگر وہاں سناٹا تھا، ہاں، ایک لڑکا کھیلتا ہوا ملا اس نے مجھے دیکھتے ہی زور سے قہقہہ لگایا، اور بولا۔ ''بچّہ گھر، جاؤ تو کیسی مار پڑتی ہے، تمھارے چچا آئے تھے، ہلدھر کو مارتے مارتے لے گئے ہیں، اجی، ایسا تان کر گھونسا مارا کہ کیوں ہلدھر منہ کے بل گر پڑے، یہاں سے گھسیٹتے لے گئے ہیں، تم نے مولوی صاحب کی تنخواہ دے دی تھی وہ بھی لے لی۔ ابھی سے کوئی حیلہ سوچ لو ورنہ بے بھاؤ کی پڑیں گی۔''

میرے حواس جاتے رہے، بدن کا خون خشک ہوگیا، وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ ہو رہا تھا۔ پیر من من بھر کے ہوگئے، گھر کی طرف ایک ایک قدم چلنا مشکل ہوگیا، دیوی دیوتاؤں کے جتنے نام یاد تھے سبھی کی منّت مانی، کسی کو لڈو کسی کو پیڑے، کسی کو بتاشے،

گاؤں کے پاس پہنچا تو گاؤں کے ڈیہہ کا سمرن کیا کیونکہ اپنے حلقہ میں ڈیہہ کی مرضی ہی سب پر سبقت رکھتی ہے۔

یہ سب کچھ کیا مگر جیوں جیوں گھر پر نزدیک آتا، دل کی دھڑکن بڑھتی جاتی تھی، گھٹائیں امنڈتی آتی تھیں، معلوم ہوتا کہ آسمان پھٹ کر گراہی چاہتا ہے، دیکھتا تھا کہ لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں، مویشی بھی دم اُٹھائے گھر کی طرف اچھلتے کودتے چلے جاتے تھے، چڑیاں اپنے گھونسلوں کی طرف اُڑی چلی جاتی تھیں، لیکن میں اسی سُست رفتاری سے چلا جاتا تھا گویا پیروں میں طاقت ہی نہیں تھی جی چاہتا تھا کہ زور کا بخار ہوجاوے یا کہیں چوٹ لگ جاوے لیکن کہنے سے دھوبی گدھے پر نہیں چڑھتا، بلانے سے موت بھی نہیں آتی، بیماری کا تو کہنا ہی کیا۔ کچھ نہ ہوا اور باوجود سُست رفتاری کے گھر سامنے آہی گیا۔ اب کیا ہو؟ ہمارے دروازے پر املی کا ایک گھنا درخت تھا۔ اسی کی آڑ میں چھپ گیا کہ ذرا اور اندھیرا ہوجاوے تو چپکے سے اندر گھُس جاؤں اور ماں کے کمرے میں پلنگ کے نیچے جا بیٹھوں جب سب لوگ سوجائیں گے تو ماں سے ساری داستان کہہ سناؤں۔ ماں کبھی نہیں مارتیں، ذرا ان کے سامنے جھوٹ موٹ روؤں گا تو وہ اور بھی پگھل جاویں گی رات گزر جانے پر پھر کون پوچھتا ہے۔ صبح تک سب کا غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا، اگر یہ منصوبہ پورا ہوجاتا، تو اس میں شک نہیں کہ میں بے داغ بچ جاتا، مگر وہاں تو خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے ایک لڑکے نے دیکھ لیا اور میرے نام کی رٹ لگائے ہوئے سیدھا میرے گھر کے اندر کو بھاگا، اب میرے لیے کوئی امید نہ رہی، ناچار گھر میں داخل ہوا تو دفعتاً میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی جیسے مار کھایا ہوا کتا کسی کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھ کر خوف سے چلانے لگتا ہے بروٹھے میں والد صاحب بیٹھے تھے، والد صاحب کی صحت ان دنوں کچھ خراب ہوگئی تھی، چھٹی لے کر گھر آئے ہوئے تھے، یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انھیں شکایت کیا تھی، مگر وہ مونگ کی دال کھاتے تھے اور شام کے وقت شیشے کے گلاس میں ایک بوتل میں سے کچھ انڈیل انڈیل کر پیتے تھے شاید یہ کسی تجربہ کار حکیم کی بتلائی ہوئی دوا تھی۔ دوائیں سب بدبو دار اور تلخ ہوتی ہیں، یہ دوا بھی بُری ہی تھی مگر والد صاحب نہ جانے کیوں اس دوا کو مزہ لے لے کر پیتے تھے، ہم جو دوا پیتے ہیں تو ایک ہی گھونٹ میں آنکھیں بند کرکے پی جاتے ہیں مگر شاید اس دوا کا اثر آہستہ آہستہ پینے ہی سے ہوتا ہے،

والد صاحب کے پاس گاؤں کے دو تین اور کبھی کبھی چار پانچ اور مریض بھی ہوجاتے تھے اور گھنٹوں دوا پیتے رہتے تھے کھانا کھانے کے لیے مشکل سے اُٹھتے تھے، اس وقت بھی وہ دوا پی رہے تھے، مریضوں کا مجمع لگا رہتا تھا، مجھے دیکھتے ہی والد صاحب نے سُرخ آنکھیں کرکے پوچھا کہاں تھے اب تک؟

میں نے دبی زبان سے کہا۔ کہیں تو نہیں۔

"اب چوری کی عادت سیکھ رہا ہے، بول تو نے روپیہ چرایا یا نہیں؟"

میری زبان بند ہوگئی، سامنے شمشیر برہنہ ناچ رہی تھی، لفظ بھی منہ سے نکلتے ڈرتا تھا، والد صاحب نے زور سے ڈانٹ کر پوچھا بولتا کیوں نہیں، تو نے روپیہ چرایا یا نہیں؟

میں نے جان پر کھیل کر کہا۔ میں نے کہاں ....۔

منہ سے پوری بات نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ والد صاحب خوفناک شکل بنائے دانت پیستے جھپٹ کر اوٹھے اور ہاتھ اُٹھائے میری طرف بڑھے، میں زور سے چلا کر رونے لگا ایسا چلایا کہ والد صاحب سہم گئے ان کا ہاتھ اُٹھا ہی رہ گیا، شاید سمجھے کہ جب ابھی سے اس کا یہ حال ہے تو طمانچہ پڑجانے پر کہیں اس کی جان ہی نہ نکل جاوے۔ میں نے جو دیکھا کہ میری حکمت کام کرگئی تو اور بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ اتنے میں اس مجمع کے دو تین آدمیوں نے والد صاحب کو پکڑ لیا اور میری طرف اشارہ کیا کہ بھاگ جا، بچّے اکثر ایسے مواقع پر اور بھی مچل جاتے ہیں اور مفت مار کھاتے ہیں، میں نے عقلمندی سے کام لیا۔

لیکن اندر کا منظر اس سے کہیں زیادہ خوفناک تھا، میرا تو خون سرد ہوگیا۔ ہلدھر کے دونوں ہاتھ ایک کھمبے سے بندھے تھے، سارے بدن میں مٹی لگی ہوئی تھی اور وہ ابھی تک سسک رہے تھے۔ شاید وہ صحن بھر میں لوٹے تھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سارا صحن ان کے آنسوؤں سے تر ہوگیا ہے، چچی ہلدھر کو ڈانٹ رہی تھیں اور والدہ بیٹھی مسالہ پیس رہی تھیں، سب سے پہلے مجھ پر چچی کی نگاہ پڑی، بولیں، لو وہ بھی آگیا کیوں رے، روپیہ تو نے چرایا تھا کہ اس نے؟

میں نے بے دھڑک ہوکر کہا۔ ہلدھر نے۔

والدہ بولیں۔ اگر اسی نے چرایا تھا تو تونے گھر آکر کسی سے کہا کیوں نہیں؟

اب جھوٹ بولے بغیر بچنا مشکل ہے، میں تو سمجھتا ہوں کہ جب آدمی کو جان کا

خطرہ ہو تو جھوٹ بولنا قابلِ معافی ہے، ہلدھر مار کھانے کے عادی تھے دو چار گھونسے پڑجانے سے ان کا کچھ نہ بگڑ سکتا تھا۔

میں نے مار کبھی نہ کھائی تھی، میرا تو دو چار ہی گھونسوں میں کام تمام ہوجاتا پھر ہلدھر نے بھی تو اپنے بچانے کے لیے مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی ورنہ چچی مجھ سے یہ کیوں پوچھتیں کہ روپیہ تو نے چرایا یا ہلدھر نے؟ کسی بھی اُصول کے مطابق اس وقت میرا جھوٹ بولنا قابلِ تعریف نہیں تو قابلِ تعریف ضرور تھا میں نے فی الفور کہا، ہلدھر کہتے تھے، کسی سے بتایا تو مار ہی ڈالوں گا۔

ماں۔ دیکھا، وہی بات نکلی نہ، میں تو کہتی تھی کہ بچّے کی ایسی عادت نہیں پیسہ تو ہاتھ سے چھوتا ہی نہیں، مگر سب لوگ مجھی کو اُلّو بنانے لگے۔

ہلدھر۔ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ بتاؤ گے تو ماروں گا؟

میں۔ وہی تالاب کے کنارے تو۔

ہلدھر۔ اماں، بالکل جھوٹ ہے۔

چچی۔ جھوٹ نہیں، سچ ہے۔ جھوٹا تو تو ہے اور تو سارا سنسار سچّا ہے۔ تیرا نام نکل گیا ہے نہ۔ تیرا باپ بھی نوکری کرتا، باہر سے روپے کما لاتا، چار آدمی اسے بھلا مانس کہتے تو تو بھی سچّا ہوتا۔ اب تو تو ہی جھوٹا ہے جس کے بھاگ میں مٹھائی لکھی تھی اس نے مٹھائی کھائی، تیرے بھاگ میں تو لات کھانا ہی لکھا تھا۔

یہ کہتے ہی چچی نے ہلدھر کو کھول دیا اور ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی، میرے بارے میں محبت آمیز رائے زنی کرکے ماں نے پانسہ پلٹ دیا تھا ورنہ ابھی نہ جانے بے چارے پر کتنی مار پڑتی، میں نے ماں کے پاس بیٹھ کر اپنی بے گناہی کا راگ خوب الاپا۔ میری سیدھی سادی ماں مجھے سچائی کا اوتار سمجھتی تھی، انھیں یقین کامل ہوگیا کہ سارا قصور ہلدھر کا ہے۔ ایک لمحہ بعد میں گڑ چربن لیے ہوئے کوٹھری سے باہر نکلا، ہلدھر بھی اسی وقت چیوڑا چباتے ہوئے باہر نکلے، ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے اور اپنی اپنی سرگزشت سنانے لگے۔ میری سرگزشت سکھ بھری تھی اور ہلدھر کی دُکھ بھری انجام دونوں کا ایک تھا گڑ اور چربن۔

یہ افسانہ پہلی بار 'مادھوری' کے ستمبر 1925 کے شمارہ میں شائع ہوا۔ ہندی میں مان سروور 5 اور اردو میں 'پریم چالیسی' میں شامل ہے۔

سزا

شام کا وقت تھا۔ کچہری برخاست ہوگئی تھی۔ اہل کار اور چپراسی جیبیں کھنکھاتے گھر جا رہے تھے۔ خاکروب جگہ جگہ کوڑے ٹٹول رہا تھا کہ شاید کہیں پیسے ویسے مل جائیں۔ کچہری کے برآمدوں میں سانڈوں نے وکیلوں کی جگہ لے لی تھی۔ درختوں کے نیچے محرروں کی جگہ کتّے بیٹھے نظر آتے تھے۔ اسی وقت ایک بڈھا آدمی پھٹے پُرانے کپڑے پہنے لاٹھی ٹیکتا ہوا جنٹ صاحب کے بنگلہ پر پہنچا اور سائبان میں کھڑا ہوگیا۔ جنٹ صاحب کا نام مسٹر جی سنہا تھا۔ اردلی نے دور ہی سے للکارا۔ کون سائبان میں کھڑا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟

بڈھا۔ غریب بامہن ہوں بھیا، صاحب سے بھینٹ ہوگی؟

اردلی۔ صاحب تم جیسوں سے نہیں ملا کرتے!

بڈھا لاٹھی پر کمر سیدھی کرکے بولا۔ ”کیوں بھائی! ہم سڑے ہیں۔ یا ڈاکو چور ہیں۔ یا ہمارے منہ میں کچھ لگا ہوا ہے؟“

اردلی۔ بھیک مانگ کر مقدمہ لڑنے آئے ہوگے؟

بڈھا۔ تو کوئی بُرائی کی ہے؟ اگر گھر بیچ کر مقدمہ نہیں لڑتے تو کوئی گناہ کرتے ہیں؟ یہاں تو مقدمہ لڑتے لڑتے عمر گزر گئی۔ لیکن گھر کا پیسہ نہیں خرچا۔ میاں کی جوتی میاں کا سر کرتے ہیں۔ دس بھلے مانسوں سے مانگ کر ایک کو دے دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گاؤں بھر نام سے کانپتا ہے۔ کسی نے ذرا بھی ٹرپر کی اور میں نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ سمجھتے کیا ہو!

اردلی۔ کسی بڑے آدمی سے سابقہ نہیں پڑا ابھی!

بڈھا۔ اجی! کتنے ہی بڑوں کو بڑے گھر بھجوا دیا۔ تم ہو کس پھیر میں۔ سیدھا ہائیکورٹ تک جاتا ہوں۔ کوئی میرے منہ کیا آئے گا بے چارا؟ گانٹھ سے تو کوڑی جاتی نہیں، پھر ڈریں کیوں؟ جس کی چیز پر دانت لگائے اپنا کرکے چھوڑا۔ سیدھے سے نہ دیا تو عدالت میں گھسیٹ لائے۔ اور رگید رگید کر مارا۔ اپنا کیا بگڑتا ہے۔ تو صاحب سے

اطلاع کرتے ہو کہ میں ہی پکاروں؟

اردلی نے دیکھا۔ یہ آدمی یوں ٹلنے والا نہیں۔ تو جاکر صاحب سے اُس کی اطلاع کی۔ صاحب نے حلیہ دریافت کیا اور خوش ہوکر کہا۔ فوراً بلا لاؤ۔

اردلی۔ حضور! بالکل خستہ حال ہے۔

صاحب۔ گدڑی ہی میں لعل ہوتے ہیں۔ جاکر بھیج دو۔

مسٹر سنہا ادھیڑ آدمی تھے۔ بہت ہی حلیم۔ بہت ہی دور اندیش۔ باتیں بہت کم کرتے تھے۔ رعونت اور بدمزاجی جو حکومت کا جزو سمجھی جاتی ہے۔ اُن کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ انصاف اور رحم کے فرشتے معلوم ہوتے تھے۔ قیافہ شناس ایسے تھے کہ آدمی کی صورت دیکھتے ہی پہچان جاتے تھے۔ ڈیل ۔ ڈول دیوؤں جیسا اور رنگ آبنوس کاسا۔ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے پیچوان پی رہے تھے۔ بڈھے نے جاکر سلام کیا۔

سنہا۔ تم ہو جگت پانڈے! آؤ بیٹھو! تمھارا مقدمہ تو بہت ہی کمزور ہے۔ بھلے آدمی! جعل بھی نہ کرتے بنا؟

جگت۔ ایسا نہ کہیں حضور! غریب آدمی ہوں مرجاؤں گا۔

سنہا۔ کسی وکیل مختار سے صلاح بھی نہ لے لی؟

جگت۔ اب تو سرکار کی پناہ میں آیا ہوں۔

سنہا۔ سرکار کیا مِسل بدل دیں گے۔ یا نیا قانون بنائیں گے۔ تم دھوکا کھا گئے۔ میں کبھی قانون کے باہر نہیں جاتا۔ جانتے ہو نہ! کبھی اپیل سے میری تجویز ردّ نہیں ہوتی۔

جگت۔ بڑا دھرم ہوگا سرکار! (سنہا کے پیروں پر گنیوں کی ایک پوٹلی رکھ کر، بڑا دُکھی ہوں سرکار۔!!

سنہا۔ (مسکرا کر) یہاں بھی اپنی چالبازی سے نہیں چوکتے؟ نکالو ابھی اور۔ اُوس سے پیاس نہیں بجھتی۔ بھلا دہائی تو پوری کرو۔

جگت۔ بہت تنگ ہوں۔ دین بندھو!

سنہا۔ ڈالو ڈالو کمر میں ہاتھ بھلا میرے نام کی تو عزت رکھ۔

جگت۔ لُٹ جاؤں گا سرکار!

سنہا۔ لُٹیں تمھارے دشمن جو علاقہ بیچ کر لڑتے ہیں۔ تمھارے ججمانوں کا بھگوان بھلا کریں۔

تمھیں کس بات کی کمی ہے۔

مسٹر سنہا اس معاملہ میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتے تھے۔ جگت نے دیکھا کہ یہاں کائیاں پن سے کام نہ چلے گا۔ تو چپکے سے پانچ گنیاں اور نکالیں۔ لیکن انھیں مسٹر سنہا کے پیروں پر رکھتے وقت اُس کی آنکھوں سے خون نکل آیا۔ یہ اُس کی سالہا سال کی کمائی تھی۔ برسوں پیٹ کاٹ کر۔ تن جلا کر۔ خواہشات کو روک کر۔ جھوٹی گواہیاں دے کر یہ اندوختہ مہیا کیا تھا۔ اُس کا ہاتھوں سے نکلنا جان نکلنے سے کم صدمہ کی بات نہ تھی۔

جگت پانڈے کے چلے جانے کے بعد تقریباً نو بجے شب کے جنٹ صاحب کے بنگلہ پر ایک تانگہ آکر رُکا اور اُس پر سے پنڈت ستیہ دیو اُترے جو راجا صاحب شیو پور کے مختار تھے۔

مسٹر سنہا نے مُسکرا کر کہا۔ آپ شاید اپنے علاقہ میں غریبوں کو نہ رہنے دیں گے۔ اتنا ظلم!

ستیہ دیو۔ غریب پرور! یہ کہیے کہ غریبوں کے مارے اب علاقہ میں ہمارا رہنا دوبھر ہو رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں سیدھی اُنگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ زمیندار کو کچھ نہ کچھ سختی کرنی ہی پڑتی ہے۔ مگر اب یہ حال ہے کہ ہم نے ذرا چوں بھی کی تو انھیں غریبوں کی تیوریاں بدل جاتی ہیں۔ سب مفت میں زمین جوتنا چاہتے ہیں۔ لگان مانگیے تو فوجداری کا دعویٰ کرنے کو تیار!

اب اسی جگت پانڈے کو لیجیے۔ گنگا قسم حضور! سراسر جھوٹا دعویٰ ہے۔ حضور سے کوئی بات چھپی تو رہ نہیں سکتی۔ اگر جگت پانڈے یہ مقدمہ جیت گیا۔ تو ہمیں بوریا بندھنا چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ اب حضور ہی بسائیں تو بس سکتے ہیں۔ راجا صاحب نے حضور کو سلام کہا ہے اور عرض کی ہے کہ اس معاملہ میں جگت پانڈے کی ایسی خبر لیں کہ وہ بھی یاد کرے۔

مسٹر سنہا اُبرو سکوڑ کر کہا۔ قانون میرے گھر تو نہیں بنتا؟

ستیہ دیو۔ حضور کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔

یہ کہہ کر گنیّوں کی ایک گڈی نکال کر میز پر رکھ دی۔ مسٹر سنہا نے گڈی کو آنکھوں سے شمار کرکے فرمایا۔ انھیں میری طرف سے راجا صاحب کی نذر کردیجیے گا۔ آخر

آپ کوئی وکیل تو کریں گے ہی۔ اُسے کیا دیجیے گا؟

ستیہ دیو۔ یہ تو حضور کے اختیار میں ہے۔ جتنی ہی پیشیاں ہوں گی۔ اُتنا ہی صرفہ بڑھے گا۔

سنہا۔ میں چاہوں تو مہینوں لٹکا سکتا ہوں۔

ستیہ دیو۔ بیشک! اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔

سنہا۔ پانچ پیشیاں بھی ہوئیں تو آپ کے کم سے کم ایک ہزار تو اُڑ ہی جائیں گے۔ آپ یہاں اُس کا آدھا ہی پورا کردیجیے۔ تو ایک ہی پیشی میں فیصلہ ہوجائے گا۔ آدھی رقم بچ جائے گی۔

ستیہ دیو نے دس گنیاں اور نکال کر میز پر رکھ دیں اور فخر کے ساتھ بولے۔ حکم ہو تو راجا صاحب سے کہہ دوں .... آپ اطمینان رکھیں۔ صاحب کی نظر عنایت ہوگئی ہے۔ مسٹر سنہا نے تیز آواز میں فرمایا۔ جی نہیں! یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں کسی شرط پر یہ رقم نہیں لے رہا ہوں۔ میں کروں گا وہی جو قانون کی منشا ہوگی۔ خلاف قانون جو بھر بھی نہیں جاسکتا۔ یہی میرا اصول ہے۔ آپ لوگ میری خاطر کرتے ہیں۔ یہ آپ کی شرافت ہے۔ میں اُسے اپنا دشمن سمجھوں گا۔ جو میرا ایمان خریدنا چاہے۔ میں جو کچھ لیتا ہوں سچائی کا انعام سمجھ کر لیتا ہوں۔

(۲)

جگت پانڈے کو یقین کامل تھا کہ میری جیت ہوگی۔ لیکن تجویز سُنی تو ہوش اُڑ گئے۔ دعویٰ خارج ہوگیا۔ اُس پر خرچ کی چپت علاحدہ۔ میرے ساتھ یہ چال! اگر لالہ صاحب کو اس کا مزا نہ چکھایا تو برہمن نہیں۔ ہیں کس پھیر میں؟ سارا رُعب بھلا دوں گا۔ یہاں گاڑھی کمائی کے روپیہ ہیں۔ کون ہضم کرسکتا ہے؟ ہڈیاں پھوڑ پھوڑ کر نکلیں گے۔ اسی دروازہ پر سر پٹک کر مرجاؤں گا۔

اُسی دن شام سے جگت پانڈے مسٹر سنہا کے بنگلہ کے سامنے مقیم ہوگئے وہاں برگد کا ایک گھنا درخت تھا۔ مقدمہ والے وہیں ستّو، چبینا کھاتے اور دوپہری اُسی کے سایہ میں گزارتے تھے۔ جگت پانڈے اُن سے مسٹر سنہا کی دل کھول کر ہجو کرتا۔ نہ کچھ کھاتا نہ پیتا۔ بس لوگوں کو اپنی رام کہانی سنایا کرتا۔ جو سُنتا وہ جنٹ صاحب کو چار بُری، بھلی سناتا اور کہتا آدمی نہیں شیطان ہے۔ اس کو تو ایسی جگہ مارے کہ جہاں پانی نہ ملے۔ روپیہ کے روپیہ

لیے اوپر سے ڈگری معہ خرچ کردی؟ یہی کرنا تھا تو روپیہ کاہے کو نگلے تھے! یہ ہے ہمارے بھائی بندوں کا حال۔ یہ اپنے کہلاتے ہیں! ان سے تو انگریز اچھے۔ اسی طرح شکایتیں دن بھر ہوا کرتیں۔ جگت پانڈے کے پاس دن بھر جمگھٹ سا لگا رہتا۔

اس طرح چار دن گزر گئے۔ مسٹر سنہا کو بھی خبر ہوئی۔ دیگر راشی اہلکاروں کی طرح آپ بھی شاندار آدمی تھے۔ ایسے بے فکر رہتے۔ گویا کہ اُن میں یہ بُرائی چھو بھی نہیں گئی ہے۔ جب کہ وہ قانون سے شمہ بھر بھی نہ ٹلتے تھے۔ تو اُن پر رشوت ستانی کا شک ہو ہی کیوں کرسکتا تھا۔ اور اگر کوئی کرتا بھی تو اُس کی مانتا کون؟ ایسے ہوشیار کھلاڑی کے خلاف کوئی ضابطہ کی کارروائی کیسے ہوتی؟ مسٹر سنہا اپنے افسروں سے بھی خوشامد کا برتاؤ نہ کرتے۔ اس سے حکام بھی اُن کی عزت کرتے تھے۔ مگر جگت پانڈے نے وہ منتر پھونکا تھا جس کا اُن کے پاس کوئی اُتار نہ تھا۔ ایسے بے ڈھب آدمی سے آج تک انھیں سابقہ نہ پڑا تھا۔ اپنے نوکروں سے پُوچھتے بڈھا کیا کہہ رہا ہے؟ نوکر لوگ یگانگت ظاہر کرنے کے لیے جھوٹ کے پُل باندھ دیتے۔ حضور! کہتا تھا۔ ''بھوت بن کر لگوں گا میری بیدی بنے تو سہی۔ جس دن مروں گا۔ ایک کے سو جگت پانڈے ہوں گے۔ مسٹر سنہا پکے منکر تھے۔ مگر ان باتوں کو سُن سُن کر کچھ خوف زدہ سے ہوجاتے۔ اور اُن کی اہلیہ تو تھر تھر کانپنے لگتیں۔ وہ نوکروں سے بار بار کہتیں۔ اُس سے جاکر پوچھو کیا چاہتا ہے؟ جتنے روپیہ چاہے لے لے۔ ہم سے جو مانگے دیں گے۔ بس یہاں سے چلا جائے۔ لیکن مسٹر سنہا آدمیوں کو اشارہ سے روک دیتے تھے۔ اُنھیں ابھی تک اُمید تھی کہ بڈھا بھوک پیاس سے عاجز آکر چلا جائے گا۔ اس سے زیادہ یہ ڈر تھا کہ میں ذرا بھی نرم پڑا اور نوکروں نے مجھے اُلّو بنایا۔

چھٹے دن معلوم ہوا کہ جگت پانڈے کا بول بند ہوگیا ہے۔اُس سے ہلا تک نہیں جاتا۔ چپ چاپ پڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔ شاید آج رات کو دم نکل جائے۔ مسٹر سنہا نے لمبی سانس لی اور انتہائی فکر میں ڈوب گئے۔ اہلیہ نے چشم پُر آب ہوکر کہا۔ ''تمھیں میرے سر کی قسم جاکر کسی طرح اس بَلا کو ٹالو۔ بڈھا مرگیا تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ اب روپیہ کا منہ نہ دیکھو دو چار ہزار بھی دینے پڑیں۔ تو دے کر اُسے راضی کرو۔ تمھیں جاتے شرم آتی ہو تو میں چلی جاؤں۔''

سنہا۔ جانے کا ارادہ تو میں کئی دن سے کر رہا ہوں۔ لیکن جب دیکھتا ہوں وہاں جماؤ لگا رہتا

ہے۔ چاہے کتنی ہی بڑی آفت کیوں نہ آپڑے۔ تم دو چار ہزار کو کہتی ہو۔ میں دس پانچ ہزار دینے کو تیار ہوں۔ لیکن وہاں جا نہیں سکتا۔ نہیں معلوم کیسی منحوس گھڑی میں میں نے اُس سے روپیہ لیے تھے۔ جانتا کہ یہ اتنا فساد کھڑا کرے گا۔ تو پھاٹک میں گھُسنے ہی نہ دیتا۔ دیکھنے میں تو ایسا سیدھا معلوم ہوتا تھا کہ گئو ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ آدمی پہچاننے میں دھوکا کھایا۔

اہلیہ۔ تو میں ہی چلی جاؤں؟ شہر کی طرف سے آؤں گی۔ اور سب آدمیوں کو ہٹا کر کے علاحدہ باتیں کروں گی۔ کسی کو خبر نہ ہوگی کہ کون ہے۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے؟

مسٹر سنہا نے مشتبہ انداز سے کہا۔ تاڑنے والے تاڑ ہی جائیں گے، چاہے تم کتنا ہی چھپاؤ۔

اہلیہ۔ تاڑ جائیں گے تاڑ جائیں۔ اب اس کو کہاں تک ڈریں۔ بدنامی ابھی کیا کم ہو رہی ہے جو اور ہو جائے گی۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ تم نے روپے لیے۔ یونہی کوئی کسی پر جان نہیں دیتا۔ پھر اب بیکار شان کیوں کرو۔

مسٹر سنہا اب اندرونی خلش کو نہ دبا سکے۔ بولے۔ پیاری! یہ بیکار کی .... شان نہیں ہے۔ چور کو عدالت میں بید کھانے سے یا عورت کو رسوائی سے اتنی شرم نہیں آتی۔ جتنی کسی حاکم کو اپنی رشوت ستانی کا پردہ فاش ہونے سے آتی ہے۔ وہ زہر کھا کر مرجائے گا۔ لیکن دُنیا کے سامنے اپنا پردہ فاش نہ کرے گا۔ زندہ کھال کھنچنے یا کولہو میں پیلے جانے کے علاوہ اور کوئی ایسی سزا نہیں ہے۔ جو اُس سے اپنے جُرم کا اقبال کرا سکے۔ اس کا تو مجھے ذرا بھی ڈر نہیں ہے کہ برہمن بھُوت بن کر ہمیں ستائے گا۔ یا ہمیں اس کی بیدی بناکر پوجنی پڑے گی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ گناہ کی سزا بھی اکثر نہیں ملتی۔ لیکن برھم ہتیا سر پر لیتے ہوئے روح تھراتی ہے۔ بس اتنی بات ہے۔ میں آج رات کو موقع دیکھ کر جاؤں گا۔ اور اس مصیبت کر ٹالنے کے لیے جو کچھ ہو سکے گا، کروں گا۔ اطمینان رکھو!!

(۳)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ مسٹر سنہا گھر سے نکلے اور تنہا جگت پانڈے کو منانے چلے۔ برگد کے نیچے بالکل سناٹا تھا۔ تاریکی اس قدر تھی گویا کہ رات کی دیوی یہیں سو رہی

ہو۔ جگت پانڈے کی سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ گویا موت زبردستی گھسیٹے لیے جاتی ہو۔ مسٹر سنہا کے رونگٹے کھڑے ہوگئے بڈھا کہیں مر تو نہیں رہا ہے؟ پاکٹ لیمپ نکالی اور جگت کے نزدیک جاکر بولے۔ پانڈے جی! کہو کیا حال ہے؟

جگت پانڈے نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اُٹھنے کی ناکامیاب کوشش کرکے بولا۔ میرا حال پوچھتے ہو؟ دیکھتے نہیں ہو مر رہا ہوں۔

سنہا۔ تو اس طرح کیوں جان دیتے ہو؟

جگت۔ تمھاری یہی مرضی ہے تو میں کیا کروں؟

سنہا۔ میری تو یہ خواہش نہیں۔ ہاں تم البتہ میرا سب کچھ تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔ آخر میں تمھارے ڈیڑھ سو روپے ہی تو لیے ہیں۔ اتنے روپوں کے لیے تم اتنا ستیاہ گرہ کر رہے ہو۔

جگت۔ ڈیڑھ سو روپے کی بات نہیں ہے۔ جی! تم نے مجھے مٹی میں ملا دیا۔ میری ڈگری ہوگئی ہوتی تو مجھے دس بیگہ زمین مل جاتی۔ اور سارے علاقہ میں نام ہوجاتا۔ تم نے میرے ڈیڑھ سو نہیں لیے۔ میرے پانچ ہزار بگاڑ دیے۔ پُورے پانچ ہزار۔ لیکن یاد رکھنا یہ گھمنڈ نہ رہے گا۔ کہے دیتا ہوں .... ستیاناش ہوجائے گا۔ اس عدالت میں تمھارا راج ہے۔ لیکن ایشور کے دربار میں برہمنوں کا ہی راج ہے۔ برہمن کی دولت لے کر کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔

مسٹر سنہا نے بہت افسوس اور شرم ظاہر کی۔ بہت خوشامد درآمد سے کام لیا اور آخر میں پوچھا۔ سچ بتلاؤ۔ پانڈے کتنے روپے پاجاؤ تو میرا قصور معاف کرو۔

جگت پانڈے اس مرتبہ زور لگا کر اُٹھ بیٹھے۔ اور بڑی بے صبری سے بولے۔ "پانچ ہزار سے کوڑی کم نہ لوں گا۔"

سنہا۔ پانچ ہزار تو بہت ہوتے ہیں۔ اس قدر ظلم نہ کرو۔

جگت۔ نہیں! اس سے کم نہ لوں گا۔

مسٹر سنہا کو اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ روپے لانے گھر چلے۔ لیکن گھر پہنچتے پہنچتے نیت بدل گئی۔ ڈیڑھ کے عوض پانچ ہزار دیتے قلق ہوا۔ دل میں کہنے لگے۔ مرتا ہے مرجانے دو۔ کہاں کی برہم ہتیا۔ اور کیسا پاپ! یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ بدنامی ہی نہ ہوگی؟

سرکاری ملازم تو یونہی بدنام ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات تھوڑے ہی ہے۔ بچّا کیسے اُٹھ بیٹھے تھے۔ سمجھا ہوگا۔ اچھا اُلّو پھنسا۔ اگر چھ دن کی فاقہ کشی سے پانچ ہزار ملیں تو میں مہینہ میں کم سے کم پانچ مرتبہ یہ عمل کروں۔ پانچ ہزار نہیں کوئی مجھے ایک ہی ہزار دے دے یہاں تو مہینہ بھر ناک رگڑتا ہوں تب جاکے چھ سو کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔

وہ چارپائی پر لیٹنا ہی چاہتے تھے کہ ان کی بیوی صاحبہ آکر کھڑی ہوگئیں۔ ان کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ آنکھیں سہمی ہوئیں۔ رہ رہ کر کانپ اُٹھتی تھیں۔ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے بولیں۔ آدھی رات تو ہوگئی؟ تم جگت پانڈے کے پاس چلے جاؤ۔ میں نے ابھی ایسا بُرا خواب دیکھا ہے کہ ابھی تک کلیجہ دھڑک رہا ہے۔ جان مصیبت میں پڑی ہوئی تھی۔ جاکے کسی طرح اسے ٹالو۔

مسٹر سنہا۔ وہیں سے تو چلا آرہا ہوں۔ مجھے تم سے زیادہ فکر ہے۔ ابھی آکر کھڑا ہی ہوا تھا کہ تم آگئیں۔

بیوی۔ اچھا! تو تم گئے تھے! کیا باتیں ہوئیں۔ راضی ہوا؟

سنہا۔ پانچ ہزار روپیہ مانگتا ہے۔

بیوی۔ پانچ ہزار!

سنہا۔ کوڑی کم نہیں کرتا۔ اور میرے پاس اس وقت ایک ہزار سے زیادہ نہ ہوں گے۔

بیوی صاحبہ نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ جتنا مانگتا ہے۔ اتنا ہی دے دو۔ کسی طرح گلوخلاصی تو ہو۔ تمھارے پاس روپے نہ ہوں تو میں دے دوں گی۔ ابھی سے خواب دکھائی دینے لگے ہیں۔ مرا تو جان کیسے بچے گی۔ بولتا چالتا ہے نہ؟

مسٹر سنہا آبنوس تھے تو اُن کی بیوی چندن! سنہا اُن کے غلام تھے۔ اُن کے اشاروں پر چلتے تھے۔ بیوی صاحبہ بھی سیاسیات زوجی میں ماہر تھیں۔ حسن بے خبری میں نفاق ہے۔ حسینہ کبھی بھولی نہیں ہوتی۔ وہ انسان کے نفس پر اور آسن جمانا خوب جانتی ہے۔

سنہا۔ تو لاؤ دیتا آؤں۔ لیکن آدمی بڑا کاٹھان ہے۔ کہیں روپے لے کر سب کو دکھاتا پھرے تو؟

بیوی۔ اس کو اسی وقت یہاں سے بھگانا ہوگا!

سنہا۔ تو نکالو دے ہی دوں۔ زندگی میں یہ بات بھی یاد رہے گی۔

بیوی صاحبہ نے بے اعتباری کے انداز سے کہا۔ چلو میں بھی چلتی ہوں۔ اس وقت کون دیکھتا ہے۔

بیوی سے زیادہ شوہر کے محسوسات کا علم اور کسی کو نہیں ہوتا۔ مسٹر سنہا کے جذبات کو اُن کی بیوی صاحبہ خوب جانتی تھیں۔ کون جانے روپیہ لے کر راستہ میں کہیں چھپا دیں اور کہہ دیں کہ دے آئے۔ یا کہنے لگیں روپے لے کر بھی نہیں ٹلتا۔ تو میں کیا کروں گی۔ جاکر صندوق سے نوٹوں کے پُلندے نکالے اور انھیں چادر میں چھپا کر مسٹر سنہا کے ساتھ چلیں۔ سنہا کے منہ پر جھاڑو سی پھری ہوئی تھی۔ لالٹین لیے پچھتاتے چلے جاتے تھے۔ پانچ ہزار نکلے جاتے ہیں، پھر اتنے روپے کب ملیں گے۔ کون جانتا ہے! اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ کمبخت مر ہی جاتا۔ بلا سے بدنامی ہوتی کوئی میری جیب سے روپے تو نہ چھین لیتا۔ ایشور کرے مر گیا ہو!

ابھی دونوں آدمی پھاٹک ہی تک آئے تھے کہ دیکھا جگت پانڈے لاٹھی ٹیکتا چلا آتا ہے۔ اُس کی صورت اتنی ہیبت ناک تھی گویا کہ قبرستان سے کوئی مردہ بھاگا چلا آتا ہو۔

ان کو دیکھتے ہی جگت پانڈے بیٹھ گیا اور ہانپتا ہوا بولا۔ بڑی دیر ہوئی۔ لائے؟

بیوی صاحبہ بولیں۔ مہاراج! ہم تو آہی رہے تھے۔ تم نے کیوں تکلیف کی۔ روپیہ لے کر سیدھے گھر چلے جاؤ گے نہ؟

جگت۔ ہاں ہاں۔ سیدھا گھر جاؤں گا۔ کہاں ہیں روپے دیکھوں! بیوی صاحبہ نے نوٹوں کا پُلندہ باہر نکالا اور لالٹین دکھا کر بولیں۔ گن لو پُورے پانچ ہزار روپے ہیں!

پانڈے نے پُلندہ لیا اور اُلٹ پَلٹ کر اُسے دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمکنے لگیں۔ ہاتھوں میں نوٹوں کو تولتا ہوا بولا۔ پُورے پانچ ہزار ہیں!

بیوی۔ پورے گِن لو؟

جگت۔ پانچ ہزار میں تو ٹوکری بھر جائے گی (ہاتھوں سے بتلا کر) اتنے سارے ہوئے پانچ ہزار۔

سنہا۔ کیا اب بھی تمھیں یقین نہیں آتا؟

جگت۔ ہیں ہیں۔ پُورے ہیں پورے پانچ ہزار۔ تو اب جاؤں، بھاگ جاؤں؟

یہ کہہ کر وہ پُلندہ لیے کئی قدم لڑکھڑاتا ہوا چلا۔ جیسے کوئی شرابی۔ اور تب دھم سے

زمین پر گر پڑا۔ مسٹر سنہا لپک کر اُٹھانے دوڑے تو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ اور مُنہ زرد پڑ گیا ہے۔ بولے۔ پانڈے .... پانڈے! کیا کہیں چوٹ آگئی؟

پانڈے نے ایک بار منہ کھولا۔ جیسے مرتی ہوئی چڑیا سر لٹکا کر چونچ کھول دیتی ہے۔ زندگی کا آخری تاگا بھی ٹوٹ گیا۔ ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور نوٹوں کا پُلندہ چھاتی پر رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں بیوی صاحبہ بھی آپہنچیں اور لاش دیکھ کر چونک پڑیں۔

بیوی۔ اسے کیا ہوگیا ہے؟

سنہا۔ مرگیا ہے۔ اور کیا ہوگیا؟

بیوی۔ (سر پیٹ کر) مرگیا! ہائے بھگوان! اب کہاں جاؤں؟

یہ کہہ کر وہ بنگلہ کی طرف بڑی تیزی سے چلیں۔ مسٹر سنہا نے بھی نوٹوں کا پُلندہ مُردہ کی چھاتی پر سے اُٹھا لیا اور چلے۔

بیوی۔ یہ روپے اب کیا ہوں گے؟

سنہا۔ خیرات کردوں گا۔

بیوی۔ گھر میں مت رکھنا۔ خبردار! ہائے بھگوان!!

(۴)

دوسرے دن سارے شہر میں خبر مشہور ہوگئی۔ جگت پانڈے نے جنٹ صاحب پر جان دے دی اُس کی لاش اُٹھی۔ تو ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ مسٹر سنہا کو کُھلّم کھلا گالیاں دی جارہی تھیں۔

شام کے وقت مسٹر سنہا کچہری سے آکر بیٹھے تھے کہ نوکروں نے آکر کہا۔ سرکار ہم کو چھٹی دی جائے۔ ہمارا حساب کردیجیے۔ ہماری برادری کے لوگ دھمکاتے ہیں کہ تم اگر جنٹ صاحب کی نوکری کروگے۔ تو حقہ، پانی بند ہوجائے گا۔

سنہا نے جھلا کر کہا۔ کون دھمکاتا ہے؟

کہار۔ کس کس کا نام بتائیں سرکار۔ سبھی تو کہتے ہیں۔

رسوئیاں۔ حضور! مجھے تو لوگ دھمکاتے ہیں کہ مندر میں نہ گھسنے پاؤ گے!

سنہا۔ ایک مہینہ کی نوٹس دیئے بغیر تم نہیں جاسکتے۔

سائیس۔ حضور! برادری سے بگاڑ کرکے ہم لوگ کہاں جائیں گے۔ ہمارا آج سے استعفا ہے۔

حساب جب چاہے کر دیجیے گا۔

مسٹر سنہا نے بہت دھمکایا۔ پھر دلاسا دینے لگے۔ لیکن نوکروں نے ایک نہ سُنی۔ آدھ گھنٹہ کے اندر سبھوں نے اپنا اپنا راستہ لیا۔ مسٹر سنہا دانت پیس کر رہ گئے۔ لیکن حاکموں کا کام کب رُکتا ہے۔ اُنھوں نے اُسی وقت کوتوال کو خبر دی اور کئی آدمی بیگار میں پکڑ آئے۔ کام چل نکلا۔

اُسی دن سے مسٹر سنہا اور ہندو سماج میں کشمکش شروع ہوگئی۔ دھوبی نے کپڑے دھونا بند کردیئے۔ گوالے نے دودھ لانے میں پہلو تہی کی۔ حجّام نے حجامت بنانا چھوڑا۔ ان مصیبتوں پر بیوی صاحبہ کا رونا دھونا اور بھی غضب تھا۔ انھیں روزانہ ڈراونے خواب دکھائی پڑتے۔ رات کو ایک کمرے سے دوسرے میں جاتے جان نکلتی تھی۔ کسی کا ذرا سر بھی درد کرتا تو ناخونوں میں جان سما جاتی۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اپنے رشتہ داروں نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ ایک دن سالے آئے۔ لیکن بغیر پانی پیئے واپس چلے گئے۔ اسی طرح ایک دن بہنوئی صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے پان تک نہ کھایا۔ مسٹر سنہا بڑے استقلال سے یہ ساری بے عزتی برداشت کرتے تھے۔ اب تک اُن کا مالی نقصان نہ ہوا تھا۔ غرض کے باولے جھک مار کر آتے ہی تھے۔ اور نذر و نذرانہ ملتا ہی تھا۔ پھر متفکر ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

لیکن اہل برادری سے نفاق کرنا پانی میں رہ کر مگر سے بیر کرنا ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا موقع ضرور ہی آجاتا ہے۔ جب ہم کو اہل برادری کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ مسٹر سنہا کو بھی سال بھر کے اندر ہی ایسا موقع آپڑا۔ یہ اُن کی لڑکی کی شادی تھی۔ یہی وہ معاملہ ہے کہ بڑے بڑے شان و شوکت والوں کا گھمنڈ چور چور کردیتا ہے۔ آپ کسی کے آنے جانے کی پرواہ نہ کریں۔ حقّہ، پانی، بھوج، بھات، میل جول۔ کسی بات کی پرواہ نہ کریں۔ مگر لڑکی کی شادی تو نہ ٹلنے والی بلا ہے۔ اُس سے بچ کر آپ کہاں جائیں گے۔ مسٹر سنہا کو اس بات کا دغدغہ تو پہلے ہی سے تھا کہ تربینی کی شادی میں رُوکاٹیں پڑیں گی۔ لیکن اُنھیں اطمینان تھا کہ دولت کی لامتناہی طاقت اس مشکل کو حل کردے گی۔ کچھ دنوں تک انھوں نے جان بوجھ کر ٹالا کہ شاید اس آندھی کا زور کچھ کم ہوجائے۔ لیکن جب تربینی کا سولہواں سال ختم ہوا۔ تو ٹال مٹول کی گنجائش نہ رہی۔ پیغام بھیجنے لگے۔ لیکن جہاں پیغام

جاتا وہیں جواب ملتا ہمیں منظور نہیں۔ جن گھروں میں سال بھر پیشتر اُن کا پیغام پاکر لوگ اپنی قسمت پر ناز کرتے۔ وہیں سے اب سوکھا جواب ملتا تھا ہمیں منظور نہیں۔ مسٹر سنہا دولت کا لالچ دیتے۔ زمین نذر کرنے کو کہتے۔ لڑکے کو ولایت بھیج کر اُونچے درجہ کی تعلیم دلانے کی تجویز پیش کرتے۔ لیکن اُن کی ساری تجاویز کا ایک ہی جواب ملتا۔ ہم کو منظور نہیں۔ اعلیٰ خاندانوں کا یہ رویہ دیکھ کر مسٹر سنہا اُن خاندانوں میں پیغام بھیجنے لگے۔ جن کے ساتھ بیٹھ کر پیشتر انھیں کھانا کھانے میں بھی گریز تھا۔ لیکن وہاں بھی انھیں وہی جواب ملا۔ ہمیں منظور نہیں یہاں تک کہ کئی جگہ وہ خود دوڑ دوڑ کر گئے۔ لوگوں کی منتیں کیں۔ پر یہی جواب ملا۔ صاحب! ہمیں منظور نہیں۔

شاید برادری سے نکالے ہوئے خاندانوں میں اُن کا پیغام منظور کرلیا جاتا۔ پر مسٹر سنہا جان بوجھ کر مکھی نہیں نگلنی چاہتے تھے۔ ایسے لوگوں سے رشتہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ جن کا برادری میں کوئی شمار نہ تھا۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔

مسز سنہا چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھیں۔ تربینی کھانا بنا رہی تھی۔ اور مسٹر سنہا بیوی کے پاس فکر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ بار بار اُسے دیکھتے اور سوچنے لگتے تھے۔ بڑی دیر کے بعد روہنی نے آنکھیں کھولیں اور بولیں۔ اب نہ بچوں گی۔ پانڈے میری جان لے کر چھوڑے گا۔

"ہاتھ میں کیسا کاغذ ہے۔"

سنہا۔ یشوداانندن کے پاس سے خط آیا ہے۔ پاجی کو یہ خط لکھتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ میں نے اس کی نوکری لگائی۔ شادی کرائی۔ اور آج اس کا مزاج اتنا بڑھ گیا ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میری لڑکی سے کرنا پسند نہیں کرتا۔ کمبخت کی قسمت کُھل جاتی!

بیوی۔ بھگوان، اب لے چلو یہ دُرگت نہیں دیکھی جاتی ...... انگور کھانے کو جی چاہتا ہے۔ منگوائے ہیں کہ نہیں؟

سنہا۔ میں خود جاکر لیتا آیا ہوں۔

یہ کہہ کر اُنھوں نے انگور کی طشتری بیوی کے پاس رکھ دی۔ وہ اُٹھا اُٹھا کر کھانے لگیں۔ جب طشتری خالی ہوگئی۔ تو بولیں۔ اب کس کے یہاں پیغام بھیجوگے؟

سنہا۔ کس کے یہاں بتلاؤں، میری سمجھ میں تو کوئی ایسا آدمی نہیں رہ گیا۔ ایسی برادری میں رہنے سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ برادری کے باہر رہوں۔ میں نے ایک برہمن سے رشوت لی۔ اس سے مجھے انکار نہیں۔ لیکن کون رشوت نہیں لیتا۔ اپنے موقع پر کوئی نہیں چوکتا۔ برہمن نہیں خود ایشور ہی کیوں نہ ہو۔ رشوت خور اُنھیں بھی چوس ہی لیں گے۔

رشوت دہندہ اگر نا اُمید ہوکر جان دے دے۔ تو میری کیا خطا؟ اگر کوئی میرے فیصلہ سے ناراض ہوکر زہر کھالے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔ اس پر بھی میں اس کا کفارہ ادا کرنے کو تیار ہوں۔

برادری جو سزا دے اُسے منظور کرنے کو تیار ہوں۔ سب سے کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے جو کفارہ چاہو کرالو .... پر کوئی نہیں سنتا۔ سزا خطا کے مطابق ہونی چاہیے۔ نہیں تو یہ نا انصافی ہے۔

اگر کسی مسلمان کا چُھوا ہوا کھانا کھانے کے لیے برادری مجھے عبور دریائے شور کی سزا دینا چاہے تو میں اُسے کبھی نہ مانوں گا۔ پھر خطا اگر ہے تو میری ہے۔ میری لڑکی نے کیا خطا کی ہے۔ میری خطا کے لیے میری لڑکی کو سزا دینا سراسر بعید از انصاف ہے۔

بیوی۔ مگر کروگے کیا؟ کوئی پنچایت کیوں نہیں کرتے؟

سنہا۔ پنچایت میں بھی تو وہی برادری کے مُکھیا لوگ ہی ہوں گے اُن سے مجھے انصاف کی امید نہیں۔ در حقیقت اس عتاب کا سبب حسد ہے۔ مجھے دیکھ کر سب جلتے ہیں۔ اور اسی بہانے سے مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو خوب سمجھتا ہوں۔

بیوی۔ دل کی خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ یہ ارمان لیے دُنیا سے جانا پڑے گا۔ ایشور کی جیسی مرضی۔ تمھاری باتوں سے مجھے ڈر لگتا ہے کہ میری بچّی کی نہ جانے کیا حالت ہوگی۔

مگر تم سے میری آخری درخواست یہی ہے کہ برادری سے باہر نہ جانا۔ نہیں تو پرلوک میں بھی میری روح کو تسکین نہ ہوگی۔ یہی رنج میری جان لے رہا ہے۔

ہائے میری بچّی !.............. ہائے میری بچّی ....!!

یہ افسانہ پہلی بار 'چاند' کے اکتوبر1925 کے شمارے میں 'دنڈ' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اردو میں 'پریم چالیسی' اور ہندی میں مان سرودر8 میں شامل ہے۔

حرفِ آخر:

پریم چند کے افسانوں کو "پریم پچاسا" کے عنوان سے چھ جلدوں (جلد9 سے جلد14) میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جو افسانے صرف ہندی میں شائع ہوئے ہیں، اور جن کا اردو ترجمہ پریم چند کے زمانے میں بھی شائع نہیں ہوا تھا، وہ ان جلدوں میں شامل ہیں۔ ان افسانوں کے اصل متن کو برقرار رکھتے ہوئے محض رسم خط تبدیل کیا گیا ہے۔ مشکل الفاظ کے معنی قوسین میں دے دیے گئے ہیں۔

اس جلد میں شامل حسبِ ذیل افسانوں کو اردو رسم خط میں منتقل کرنے کا کام ڈاکٹر ظہیر رحمتی، گلِ رعنا صدیقی اور عصمت پروین نے کیا ہے۔

ڈاکٹر ظہیر رحمتی: سہاگ کی ساڑی، ناگ پوجا، گپت دَھن، گریہہ داہ، دھِکّار، وشواس، مندر اور مسجد، ماتا کا ہردے۔

گلِ رعنا صدیقی: آبھوشن، ایک آنچ کی کسر، چکما، بَیر کا اَنت۔

عصمت پروین: پُوروسنسکار، بوڑم، آپ بیتی، سیلانی بندر، نبی کا نیتی نرواہ، مکتی دھن، نے راشیہ، اُدّھار، تینتر۔

(ڈاکٹر رحیل صدیقی)

پریم چند کے ادبی کارناموں پر تحقیقی کام کرنے والوں میں مدن گوپال کی اہمیت مسلم ہے پریم چند کے خطوط کے حوالے سے بھی انھیں اولیت حاصل ہے۔ ان کی پہلی کتاب انگریزی میں بہ عنوان "پریم چند" 1944 میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اسی کتاب کی وجہ سے غیر ممالک میں بھی پریم چند کے بارے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ "ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ لندن" نے لکھا ہے کہ مدن گوپال وہ شخصیت ہے جس نے مغربی دنیا کو پریم چند سے روشناس کرایا۔ اردو، ہندی ادیبوں کو غیر اردو ہندی حلقے سے متعارف کرانے میں مدن گوپال نے تقریباً نصف صدی صرف کی ہے۔

مدن گوپال کی پیدائش اگست 1919 میں (ہانسی) ہریانہ میں ہوئی۔ 1938 میں سینٹ اسٹیفن کالج سے گریجویشن کیا۔ انھوں نے تمام زندگی علم و ادب کی خدمت میں گزاری۔ انگریزی، اردو اور ہندی میں تقریباً 60 کتابوں کے مصنف ہیں۔ پریم چند پر اکسپرٹ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ویسے پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا کے ماہر ہیں۔ مختلف اخبارات، سول ملیٹری گزٹ لاہور، اسٹیٹس مین اور جن ستہ میں بھی کام کیا۔ بعدازاں حکومتِ ہند کے پبلکیشن ڈویژن کے ڈائرکٹر کی حیثیت سے 1977 میں ریٹائر ہوئے اس کے علاوہ دینک ٹریبون چندی گڈھ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے 1982 میں سبکدوش ہوئے۔